سب رس



نشان ٹپہ اصفیہ (۱۵۳)

"اِدارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

زیرِ ادارت

صاحبزادہ میر محمّد علی خاں میکشؔ

بہ اہتمام

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو
مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے
سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اُردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہہ رسالہ کم از کم ۴۸ صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعۂ ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعۂ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲ — اقبال نمبر ۱۴

اخراجات ٹپہ ذمہ خریدار

سب رس

جلد (۱) شمارہ (۷)

جولائی سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

ایک اہم تاریخی گروپ



نشستہ ۲- حبیب الرحمن خاں شیروانی ۳- محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار ۴- عبدالرحمن خاں شیروانی (والد حبیب الرحمن خاں) ۵- محسن الملک ۶- عزیز مرزا ۷- الطاف حسین حالی ۸- حکیم اجمل خاں ۹- وقار الملک ۱۰- سر اکبر حیدری میاں شاہدین ہمایوں -

استادہ وسط گروپ میں نذیر احمد - پروفیسر آرنلڈ (استاد اقبال مرحوم) - شبلی نعمانی - نظام الدین حسن - مسعود علی محوی وغیرہ کرسیوں کے بالکل پیچھے

فرش پر نشستہ سیدھی طرف - سر عبد القادر

اداریہ

اعانت واستفادہ اربابِ ملک "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کی علمی وادبی خدمات سے ناواقف نہیں ہیں۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہہ ہے کہ ملک میں اُردو زبان وادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ چنانچہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے بنیادی مقصد کو لئے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

حیدرآباد جیسے مقام میں جو اجتماعی اداروں کی ناکامیوں کے باعث بدنام ہے، اِس ادارہ کا کامیابی کے ساتھ ترقی کرنا ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے تعجب خیز ہو لیکن ہم جیسے رجائیت پسندوں کے لئے جو کسی طرح احساسِ پستی میں مبتلا نہیں ہیں یہہ کوئی باعثِ حیرت واقعہ نہیں ہے محض اس غلط تصور کے سیلاب میں بہہ کر کہ ہماری اجتماعی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اجتماعی عملیت کے مفاد سے فائدہ نہ اٹھانا، احساسِ ترقی کو مجروح کرنا ہے۔ انفرادی کوشش ہو یا اجتماعی، اگر وہ خلوصِ عمل اور احساسِ خدمت گذاری کے ساتھ کی جائے تو اس کی ناکامی کا گمان بھی ایک غلط اندازہ ہے۔ "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" نے اگر کامیابی حاصل کی ہے تو اس کی وجہ محض اس کے مدیرِ عمومی کے خلوصِ عمل اور جذبۂ خدمت گزاری اور ان کے شریک کار اصحاب کی مخلصانہ معاونت میں پوشیدہ ہے

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" نے اپنے سات سال کے خاموش عمل سے یہہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر خلوصِ نیت کے ساتھ انفرادی مساعی کو اجتماعی مرکز پر لانے کی کوشش کی جائے تو ملک کی ہر قوت پذیرائی کے لئے تیار ہے۔ "ادارہ" نے اپنے قلیل عرصۂ حیات میں بیاسی معیاری کتابیں شائع کیں اور اس کی جانب سے تقریباً دس کتابیں عنقریب شائع ہوں گی۔ اس نے ملک کے ترقی پسند انشا پردازوں میں ایک جذبۂ عمل پیدا کر دیا ہے اور اس طرح وہ ملک کا واحد ادبی اِدارہ بن گیا ہے

خدا کا شکر ہے کہ اب اس کی بنیادیں مضبوط ہو گئی ہیں اور مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اِس منزل پر پہنچ کر ضرورت تھی کہ اس کے دائرۂ عمل میں وسعت دی جاتی، چنانچہ ادارہ کی مجلسِ مؤسسین نے اس کا دامن تمام ملک پر پھیلانے کا ارادہ کیا ہے۔ ادارہ کے قواعد اور اس کے متعلق معلومات علحدہ کتابی صورت میں شائع کی جا رہی ہیں اور اِس طرح ہر اہلِ ملک کو اس کی اعانت کا موقع دیا جا رہا ہے۔

"سب رس" ادارہ کی ناقابلِ انکار خدمات کی ستائش کرتے ہوئے اہلِ ملک سے پُر زور سفارش کرتا ہے کہ وہ اِس ادارہ کی رکنیت قبول کر کے نہ صرف اس کی ترقی میں مدد دیں بلکہ اس کی علمی وعملی کوششوں سے خود بھی مستفید ہوں۔

خواب کی تعبیر۔ ہماری توقعات کا مرکز ہمیشہ نوجوان نسل رہا کی ہے۔ عمل کی اس دنیا میں جہاں ہنگاموں کے بغیر، زندگی موت سے بدتر ہے۔ ہر قدم پر شباب چاہئے۔ اس لئے ہم اپنی نوجوان برادری کی تنظیم اور اجتماعیت کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے خوابوں کی ایک خوش گوار تعبیر "انجمنِ ترقیٔ طلبہ" ہے انتخابات میں بحث واتفاق اور شخصیتوں کی نظر فریبیوں کو نظر انداز کر کے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہہ نوخیز انجمن جو اپنے ذوقِ کار میں ترقی کا ایک جذبۂ بے پایاں رکھتی ہے، نوجوانوں کی اجتماعیت کے راستہ میں پہلا قدم ہے لیکن کامیاب قدم۔ یہہ امر بھی ہمارے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ اس کے کارکن اپنی برادری کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔

انجمن کی سالانہ رپورٹ ہمارے سامنے ہے جس کو ریاض احمد صاحب نے جو اپنے تجربوں کو رہنما بنانے کے مدعی ہیں، مرتب کیا ہے۔ بلاشبہ رپورٹ امید افزا ہے۔ اور اِس سال جب کہ اس کے صدر ہمارے قدیم کرم فرما قاضی محی الدین صاحب غازی اور معتمد سالمین بن عمر صاحب ہیں، اس کا مستقبل زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ "سب رس" کی تائید اور ہمدردی ہمیشہ اس انجمن کے ساتھ رہے گی۔

کچھ اپنے متعلق ۔ "اقبال نمبر" غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ پندرہ دن کی قلیل مدت میں ہم نے اس کو مرتب کیا تھا، اگرچہ تصاویر کی اشاعت میں بعض اتفاقی حالات کے باعث تاخیر ہوی اور ہم اس قابل نہیں رہ سکے کہ یہہ نمبر وقت پر شایع کر سکتے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس نمبر کے

اچھے مضامین اور نظموں پر بعض اہلِ ذوق حضرات نے انعامات دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ انتخاب کے لئے ایک مجلس تشکیل دی گئی ہے۔ جب ہم کو اس کے ہاں سے جواب وصول ہوگا ہم مستحق انعام مضامین اور نظموں کا اعلان کردیں گے۔

مسٹر خلیل کا بنایا ہوا سرورق ابھی تک تیار نہ ہوسکا۔ حیدرآباد میں باوجود علمی و ادبی ترقی کے ابھی طباعتی دشواریاں اسی طرح باقی ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ اس کی وجہہ یہہ نہیں ہے کہ ہمارا ملک طباعتی ترقی کے لئے سازگار نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہہ کہ اس کی جانب توجہہ نہیں کی گئی اچھا ہوگا اگر ہمارے طباعتی ادارے ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر اپنے مطبعوں میں ہر طرح کی طباعت کا انتظام کریں۔

اس شمارہ میں جو تصویر شائع ہورہی ہے وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے جس کے لئے ہم مولوی سجاد مرزا صاحب ام اے (کنٹب) پرنسپل ٹرینگ کالج کے شکرگذار ہیں یہہ تصویر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں لی گئی تھی اور اس میں ہندوستان کے تقریباً وہ تمام مشاہیر ہیں جنھوں نے اردو کی مخلصانہ خدمت کی ہے۔

اچھی صورت بھی کیا بری شئے ہے ۔ ہر دیدہ زیب رسالے کے لئے یہہ شکایت کوئی نئی نہیں ہے کہ وہ خریدار صاحبین کے ہاں پہنچتے پہنچتے راستہ ہی میں سے غائب ہوجاتا ہے۔ تاہم دفتر سب رس نے اس کی انتہائی کوشش کی کہ ایسی شکایت کا موقع نہ ملے۔ بلدہ کے خریدار صاحبین کو تو ہمارا آدمی رسالے پہنچا آتا ہے لیکن اضلاع کے خریدار صاحبین کی متواتر شکایتیں دفتر پر وصول ہورہی ہیں کہ انھیں رسالہ نہیں ملتا۔ حالانکہ دفتر صدر عامل ٹپہ خانہ جات حیدرآباد نے ہم بذریعۂ مراسلہ نشان ع۱۸۵۵ مورخہ ۹ر امرداد ۱۳۴۵ف یہہ اطمینان دلایا ہے کہ "سب رس" کی باضابطہ تقسیم کے لئے ٹپہ خانہ جات کو خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے باوجود ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ہمارے ہاں کوئی شکایت وصول ہوتی ہے ہماری ذمہ داری اس قدر ہے کہ ہم احتیاط کے ساتھ تمام خریدار صاحبین کے نام رسالے ڈاک کے سپرد کردیں اور اس ذمہ داری سے ہم غافل نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی تاریخ معینہ تک ہمیں رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ملتی ہے تو ہم دوسرا رسالہ روانہ کردیتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات غلط پتے بھجواتے ہیں یا وقت گزرنے کے بعد اطلاع دیتے ہیں جب تک آپ کا تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوگا یہہ دشواری بدستور باقی رہے گی۔ آپ رسالہ نہ ملنے کی صورت میں اگر مقامی ٹپہ خانے سے بھی استفسار کریں تو ممکن ہے کہ آئندہ اس قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آسکے۔

ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ رسالے بھجواتے ہیں، اور آپ ان کو نہ پاکر ہمیں قابلِ الزام ٹھہراتے ہیں نہ آپ کی شکایت بجا، نہ ہماری غلطی ثابت۔ قصور سب رس کا ہے کہ وہ دیدہ زیب بھی ہے اور دلکش بھی۔

محبوبیہ کارخانۂ جلد سازی سے ۔ "عرضِ حال" کی ایک کاپی وصول ہوئی ہے۔ "محبوبیہ کارخانہ جلد سازی" ہندوستان کا وہ واحد کارخانہ ہے جس نے "فن جلد سازی" کا ترقی یافتہ صورت میں احیاء کیا۔ اس کے کام کی خوش سلیقگی، نرخوں کی واجبیت اور وعدہ کی پابندیوں سے وہ اصحاب اچھی طرح واقف ہیں جنھوں نے ہماری طرح اس کی خدمات سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ کارخانے کو شکایت ہے کہ اس کو نفع نہیں مل رہا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو کچھ عرصہ کے بعد اس کو بند کردینا پڑے گا۔ ہم اربابِ ملک کو اس کارخانے کی اعانت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے وجود میں ایک ملکی صنعت کی ترقی کے علاوہ ان کارآموز طلباء کی زندگی کا سوال بھی پوشیدہ ہے جو اس کارخانے سے وظائف حاصل کرکے فن جلد سازی حاصل کرتے ہیں۔

میکش

غزل

محوِ دیدار ہوں کیا پوچھتے ہو تم مجھ کو
جلوۂ حسن کی کثرت نے کیا گُم مجھ کو

قطرۂ اشک میں ہے لذتِ صد خُم مجھ کو
سوزِ دل ساز ہے نالہ ہے ترنّم مجھ کو

زخم کہتا ہے زمانہ نہیں ہمدردی کا
آنکھ روتی ہے تو آتا ہے تبسّم مجھ کو

لبِ خاموش سے کہتی ہے یہہ تصویر اُن کی
کہ نزاکت سے نہیں تابِ تکلّم مجھ کو

حال یہہ ہے کہ مجھے خود نہ رہی یاد اپنی
پھر گلہ کیا ہے اگر بھول گئے تم مجھ کو

عمر بھر پیاس میں گذری ہے مری اے ساقی
سب کو دے ساغر و میناؤ سبوؤ خُم مجھ کو

کیا نظر آؤں کسی کو چمنِ عالم میں
بوئے گل ہوں میں لطافت نے کیا گُم مجھ کو

ہوش کو ساتھ نہ لینا تھا رہِ الفت میں
خود ہیں کھوئے ہوے کر دیں نہ کہیں گُم مجھ کو

محفلِ ماتم و عشرت میں مری شرکت کیا
نالہ آتا ہے نہ آتا ہے ترنّم مجھ کو

نور آنکھوں کا بڑھایا جو ترے جلووں نے
نظر آنے لگے ذرے مہ و انجم مجھ کو

تنگ آ کر میں رہا گوشۂ عزلت میں جلیلؔ
مثلِ عنقا مری شہرت نے کیا گُم مجھ کو

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

رباعی

کیا دامنِ صد چاک بھی سل سکتا ہے
کیا غنچۂ پژمردہ بھی کھل سکتا ہے
امجدؔ کچھ ہم بھی جمع کرلیں گے ضرور
سکّوں سے اگر سکون مل سکتا ہے

امجدؔ

راز

عشق اک راز ہے اس راز کا اظہار نہ کر — اپنی آنکھوں کو مرے دوست گہربار نہ کر
ضبط، پابندیٔ آئینِ وفاداری ہے — صبر، تمہیدِ رضا، شیوۂ دلداری ہے
عظمتِ درد کا احساس تجھے لازم ہے — عصمتِ عشق کا کچھ پاس تجھے لازم ہے

تو نے اس جنسِ گراں مایہ کو ارزاں سمجھا
جو حقیقت تھی اسے خوابِ پریشاں سمجھا

تو گرفتارِ محبت ہے ابھی دل تیرا — ڈوبنے والے ابھی دور ہے ساحل تیرا
دلِ نازک ابھی آدابِ وفا کیا جانے — سوزِ پنہاں میں تڑپنے کا مزا کیا جانے

ارے ناداں نہیں روتے ہیں بھری محفل میں
جی بھر آتا ہے تو رو لیتے ہیں دل ہی دل میں

چاہنا کیا ہے، جوانی کا گناہِ رنگیں — حسن کیا، سادہ محبت کی نگاہِ رنگیں
سوز، تفسیرِ حدیثِ غمِ پنہانی ہے — گریہ، جذباتِ پرستش کی فراوانی ہے

تیرے اشکوں نے بتایا ہے ترا راز مجھے
دولتِ کون و مکاں مل گئی ہے سازؔ مجھے

صمد رضوی سازؔ

میرے احباب

دل کی بات دل ہی میں رکھتے ہیں۔ ظاہری طور پر سب سے اچھی طرح ملتے ہیں۔ صفائی اور نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بہت ہی خاموش، سمجھدار اور گہرے آدمی ہیں۔ خیالات بہت بلند، اور معلومات بہت وسیع ہیں، کام کرنے کی بہت صلاحیت ہے لیکن ماحول نے ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے گزرے ہوئے واقعات، چند مضامین اور تھوڑے سے بہت خطوط ہر کسی کو بار بار بڑے شوق سے سناتے ہیں۔ اخبارات و رسائل سے بہت دلچسپی ہے خصوصاً "رہبر" کے بہت مداح ہیں۔ سیاسی اور معاشی مسائل کو خوب سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھاتے ہیں۔ مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن چھپواتے نہیں۔ کبھی بہت "یار باش" تھے لیکن اب گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ اس عمر ہی میں دنیا سے بیزار آگئے ہیں۔ زندگی کے تلخ تجربوں اور مسلسل ناکامیوں نے ان کا دل بجھا دیا ہے۔ کسی دلچسپی میں حصہ نہیں لیتے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی ہندوستانی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ اپنے خاص خاص دوستوں سے جی بہلا لیتے ہیں۔ ان کا گھر ہم دوستوں کا کلب ہے۔

۲

بکتے ہیں۔ اور بکے جاتے ہیں۔ آپ کی بکواس سے سننے والا تنگ آجاتا ہے لیکن آپ چپ نہیں رہتے۔ سوچتے بالکل نہیں۔ بے سمجھے سوچے کسی پر اعتراض کر دیتے ہیں۔ جانتے تو کچھ نہیں لیکن ہر مسئلہ میں آپ کو دخل ہر وقت بحث کرنے تیار۔ بے موقع دخل در معقولات سے کبھی نہیں چوکتے۔ اکثر اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں، شرمندہ بھی ہوتے ہیں لیکن پھر اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔ مشہور ہونے کی خواہش تو بہت ہے لیکن صلاحیت مفقود۔ جہاں بھی مجمع دیکھا کود پڑتے ہیں اور نمایاں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجمع تالیوں سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہے۔ آپ بہت ہنستے ہیں خوش بھی ہوتے ہیں اور جھینپتے بھی ہیں لیکن اپنی حرکات سے باز نہیں آتے۔ "بدھو" کی طرح چمک کر ملتے ہیں۔ سب سے ملتے ہیں لیکن کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کسی کی برائی نہیں کرتے۔ بہت ہمدرد آدمی ہیں۔

۳

ہمیشہ ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اپنی لمبی ناک صاف کرنے میں انگلیوں کو ہر وقت مصروف رکھتے ہیں۔ آدمی لائق ہیں۔ انگریزی میں اپنی باتوں سے دوسروں کو مرعوب کر لینا چاہتے ہیں۔ بی۔ اے تھرڈ کلاس کامیاب کیا لیکن اپنے آپ کو سکنڈ کلاس گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ پانچ بجے شیروانی پہن لیتے ہیں۔ سات بجے سوٹ میں آتے ہیں۔ آج کل شوخ اور رنگین کپڑے پہننے کا بہت شوق ہو گیا ہے۔ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ بڑے لوگوں کی نقلیں اتارنے میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ ہمیشہ دلچسپ لطیفے سناتے ہیں۔ خود بھی ہنستے ہیں دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اکثر اپنے وہی پرانے مذاق دہراتے ہیں جس سے تکلیف ہوتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ متشکی ہیں۔ "ہارٹ فیلیر" سے بہت گھبراتے ہیں۔

۴

میرے بڑے قدیم دوست ہیں۔ بڑے شریف، سنجیدہ، غریب اور مسکین معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں بڑے "ذات شریف"۔ خیالات بہت بلند ہیں لیکن ان تک پہنچنے کی قطعاً صلاحیت نہیں۔ ہمیشہ سوچتے ہیں لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ بہت زیادہ حساس ہیں لیکن دوسروں کے احساسات کا پاس نہیں کرتے۔ اپنے متعلق غلط فہمی سے بہت بنتے اور جلاتے ہیں۔ دن میں کئی مرتبہ چہرہ کو پالش کرتے ہیں۔ عینک لگا کر اپنے آپ کو "حسن چیزے ہست" سمجھتے ہیں۔ آج کل اچھی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ مجمع سے گھبرا کر یا بات کرنے سے شرماتے ہیں۔ ہمیشہ شان کی لیتے۔ ہنستے ہیں حالانکہ ہیں کچھ نہیں۔ اکثر راتوں میں گھومتے ہیں۔ رات کی رانی کی خوشبو سے بہت متاثر اور محظوظ ہوتے ہیں۔ گھر پر عود کر

ہوٹلوں میں رہتے ہیں۔

۵

میرے نئے نئے دوست ہیں۔ رات دن گھومتے اور بھٹکتے پھرتے ہیں مشہور سیکل سوار ہیں۔ نہایت ہی سادہ، چلبلے اور زندہ دل آدمی ہیں۔ سوچتے زیادہ نہیں فوراً نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ کسی کی پروا نہیں کرتے سب کے متعلق اچھا خیال رکھتے ہیں کسی کو برا نہیں کہتے۔ اکثر محبت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں۔ جھوٹ بھی بولتے ہیں اور سچ بھی بولتے ہیں چھپتے بھی ہیں اور شرماتے بھی ہیں بالکل بے حس ہیں۔ بہت تن کر چلتے ہیں۔ ان کی ملاقات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن کسی کے دوست بن کر نہیں رہ سکتے جس سے ملتے ہیں اپنی سادگی شوخی اور دریا دلی سے مرعوب کر لیتے ہیں۔ آج کل اخبار بینی کا نیا نیا شوق ہے "گھر کی باتیں" پابندی سے پڑھتے ہیں۔

۶

سب سے اچھی طرح ملتے ہیں۔ بہت سادہ لوح نوجوان ہیں۔ تصنع یا بناوٹ نام کو نہیں۔ انگریزی ادب کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اردو ادب کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ کسی بڑے آدمی کی غلط سوانح عمری پڑھ کر فوراً تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کی تائید میں ایک مضمون بھی لکھ مارتے ہیں معلومات بالکل سطحی ہیں۔ غائر مطالعہ نہیں کرتے۔ انگریزی خوب لکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مطالعہ کو وسیع کریں تو بہترین انشا پرداز بن سکتے ہیں۔ دماغ بہت اچھا پایا ہے ترقی کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن محنت نہیں کرتے۔ ہر سال ایک دوست بدلتے ہیں۔

۷

ہمیشہ "میں میں" کرتے رہتے ہیں۔ .... اپنی "دیوانی" حرکات سے باز نہیں آتے۔ انگریزی پکچرز کے بڑے شیدا ہیں۔ گو انہیں سمجھ نہیں سکتے ہندوستانی فلم کی آپ کے پاس کوئی حقیقت نہیں حیدرآباد کے تمام سینما گھروں کے پروگرام ازبر کر لیتے ہیں۔ انگریزی ایکٹر اور ایکٹرسوں کے نام رٹنا، تمام موٹروں کے نمبر زبانی یاد کرنا، سلور پکچرز ایکٹرسوں کی تصاویر اسٹامپس اور پمفلٹ جمع کرنا آپ کا دلچسپ مشغلہ ہے انگریزی اخبارات اور رسائل بہت شوق سے دیکھتے ہیں لیکن صرف تصاویر اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی پروا نہیں کرتے آپ ہر جگہ موجود رہتے ہیں ہر کوئی آپ کو خواہ مخواہ چھیڑتا ہے۔

۸

آپ کی ہستی ایک تماشہ ہے۔ آپ ہوسٹل میں رہ کر کافی مشہور ہو چکے ہیں "شادی" کے نام سے گھبراتے ہیں تصنع اور بناوٹ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اپنے آپ کو نہایت ہی حسین سمجھتے ہیں۔ زنانی وضع کے جوتے پہننا، طرح طرح سے بالوں کو سنوارنا، گھڑی کو الٹا پلٹا کر کلائی پر باندھنا، دستی کو آستین میں رکھنا اور اس کو نمایاں کرنا۔ خراماں خراماں نئی نزاکت سے چلنا آپ کی خصوصیات ہیں اپنے مذاق کو اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ دوسروں پر اچھا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ آپ کی تفصیلات سے ناطقہ تنگ ہے۔ مجھ سے اور آپ سے کبھی نہیں بنتی مگر دشمنی بھی نہیں ہے۔ اکڑتے رہتے ہیں۔

۹

"مسخرا" معلوم ہوتے ہیں۔ ہیں تو بالشت بھر کے لیکن زبان گز بھر کی۔ بڑے چھوٹے، جاہل اور لائق کسی کا خیال نہیں کرتے سب سے بے تکلفی سے ملتے ہیں خواہ مخواہ گھستے ہیں۔ اپنے آپ کو بہت زیادہ روشن خیال، بہت زیادہ شائستہ بہت لائق اور سوشیل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں سے آپ کوسوں دور ہیں۔ بہت شریر ہیں۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے پر مائل رہتے ہیں۔ کسی کے باپ سے نہیں ڈرتے ان کی ہستی ہم دوستوں کے لئے "سامان دلچسپی" ہے بہت خوش باش اور زندہ دل آدمی ہیں۔ ہندوستانی ایکٹروں کی غرض میں رٹنا نقلیں اتارنا اور ٹھمریاں گنگنانا آپ کا رات دن کا مشغلہ ہے سارا دن گھر میں سوتے رہتے ہیں۔ شام میں بہت ہی شوخ کپڑے پہن کر چہرہ پر غازہ مل کر پابندی سے عابد روڈ پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ مجھ سے ہمیشہ جھگڑتے رہتے ہیں لیکن بہت جلد مل بھی جاتے ہیں کسی کو "الو" بنانے میں آپ استاد ہیں۔

سید منیر الدین مغربی

نیک نام خاں

نیک نام خاں کے جانشین موسیٰ خاں نے انگریزوں کو جو قول دیا تھا اس کی توثیق کر دی اور ٹرپلی کین واپس کر دیا۔ ۱۶۷۲ء میں ابوالحسن قطب شاہ نے کمپنی کو ایک اور فرمان عطا کیا تھا جس کی رو سے اس کو تمام اختیارات اور تجارتی حقوق حاصل ہو گئے تھے[1]۔ انگریز کمپنی کے مقابلہ میں نیک نام خاں کا حکمانہ طرز عمل بہت معنی خیز تھا۔ اس سے تمام تاجروں کی نظر میں گولکنڈہ کا بہت وقار بڑھ گیا۔ کمپنی کے ایک صدر ماس جیمبر نے کہا تھا کہ گولکنڈہ کی سلطنت بہت طاقتور ہے[2]۔

نیک نام خان کی وزارت

نیک نام خان کے کارنامے صرف کرناٹک تک محدود نہ تھے بلکہ اس نے مرکزی حکومت میں بھی وزارت کی بڑی خدمت انجام دی۔ بات یہ ہے کہ اس کی غیر معمولی وفاداری اور فرض شناسی اس کو مرکزی حکومت کی طرف بھی کھینچنے لگی۔ کرناٹک کی بیش بہا خدمات جن میں فوج کشی اور نظم و نسق دونوں شامل تھے روشنی میں آئیں تو حکومت یہ محسوس کرنے لگی کہ اس کی قابلیت سے مرکز میں بھی کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ ۱۶۵۶ء کی لڑائی کے بعد جو میر جملہ کی وجہ سے ہوئی تھی سلطنت کی سیاست پیچیدہ ہو گئی تھی۔ ایک طرف اندرونی سیاست کی یکسوئی ضروری تھی دوسری طرف مغلوں کے سیلاب کو روکنا تھا جو اس زمانہ میں بیجاپور پر امنڈ آرہا تھا۔ اس طرح مرکزی حکومت کے لئے بھی نیک نام خاں سے بہتر آدمی نہیں تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کو غالباً ۱۶۷۲ء میں گولکنڈہ طلب کیا۔ حدائق السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نیک نام خاں بادشاہ کے طلب پر گولکنڈہ آیا تو اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور احترام کیا گیا۔ اسی وقت اس کو نیک نام خاں کا خطاب عطا ہوا تھا جس سے وہ مشہور ہے اور مرکزی حکومت میں دیوان کی خدمت جلیلہ دی گئی۔ یہ ۱۶۷۰ء کا واقعہ ہے جو مدراس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ مارٹن اس کو ۱۶۷۰ء میں وزیر لکھتا ہے لیکن اس دیوانی خدمت کے ساتھ کرناٹک کی صوبہ داری بھی شامل تھی اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کام کے لئے کوئی دوسرا موزوں آدمی نہ تھا۔ اپنے ساتھ کرناٹک سے کئی زمیندار اور سردار بھی اپنے ساتھ لایا تھا جن کو شاہی اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ بعض لوگ واپس ہو گئے لیکن اکثر مرکزی حکومت میں مامور کر لئے گئے۔

کرناٹک کی سربراہی کے ساتھ دیوانی کے وظائف انجام دینا نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ ہے۔ اگرچہ حدائق السلاطین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "جناب خان وزارت آنجا تقریباً پانزدہ سال" وزارت کی خدمت انجام دی لیکن یہ بیان مبالغہ آمیز ہے غالباً اس میں غلطی سے کرناٹک کی صوبہ داری کی خدمت بھی شامل کر دی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ نیک نام خاں ۱۰۸۰ھ میں دیوان سلطنت ہوا تھا اور ۱۰۸۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا باقی زمانہ اس کی صوبہ داری کا ہے۔ لیکن اس بات کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ اس نے بحیثیت دیوان کے کیا کام کئے تھے اور سلطنت کو کیا فائدے پہنچے تھے۔ اس کی وزارتی کارگذاری کے متعلق تاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ "در نشست امور مملکت و رونق درگاہ سلطنت و ترفیہ حال سپاہ و رعایا مانند آصف برخاید بیضا نمود۔" ان الفاظ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین چیزیں ملتی ہیں

۱۔ مدراس قدیم کے اوراق پارینہ جلد اول ۲۹۲ (۲) مدراس قدیم کے اوراق پارینہ جلد اول ۱۹۷

اول اس نے امور سلطنت کے انصرام میں کافی دلچسپی لی جو اس کی وفاداری اور فرض شناسی سے بعید تر نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اس وقت صحیح اسلوب پر چلانے کی بہت ضرورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں نے اس میں بہت تدبر سے کام لیا تھا۔ دوسری چیز یہ تھی کہ اس نے رونق درگاہ سلطنت یعنے حکومت کا وقار بڑھایا جس کی بہت ضرورت تھی کیونکہ میر جملا اور اس کے خاندان کی سرکشی کی وجہ سے اس وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اور اس وقت سلطنت کا اولین مقصد تھا کہ اس وقار کو محفوظ کرے کیونکہ حکومت کے وقار کے بغیر مملکت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس سلسلہ میں اس کو کیا تدابیر اختیار کرنی پڑی تھیں ان کو روشنی میں لانا ممکن نہیں ہے لیکن کرناٹک کی صوبہ داری سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دکن میں بھی اس نے پُر زور طریقے اختیار کئے ہوں گے تیسری چیز ترفیہ حال سپاہ و رعایا ہے۔ فوج کی اصلاح و تنظیم اور عوام کے نئے رفاہ کے کام۔ اس کی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ فوج کی تنظیم اس کا بہت بڑا کام ہے۔ کرناٹک میں اس نے جن فوجوں کی رہنمائی کی تھی دوران مدت کارکردگی میں اور جہاں کہیں اس نے حملے کئے تھے وہ کامیاب ہوکر رہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں بھی اس نے فوج کو کارکرد بنانے کی بے حد کوشش کی کیونکہ مغلوں کے مقابلہ میں جو فوج یہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اس کی کارکردگی میں اکثر شبہ نہیں ہے کیونکہ جے سنگھ جیسے اعلیٰ سپہ سالار کو شکست فاش دی گئی تھی۔ اب رہا رفاہ عام کے کام۔ ان کی صراحت ممکن نہیں ہے کہ اس نے کیا کام کئے تھے لیکن اگر "مانند آصف زحبا ید بیضا نمود" کے الفاظ مبالغہ آمیز نہ سمجھے جائیں تو اس کی ترفیہ حال رعایا میں بھی کوئی اصلیت ہوتی چاہیئے۔

نیک نام خان نے دکن کے خارجی جوڑ توڑ میں بھی جو مغلوں کے سیلاب سے روز بروز پیچیدہ ہو رہے تھے بہت مدد دی تھی۔ علی عادل شاہ ثانی والئی بیجاپور کے عہد میں راجہ جے سنگھ کے ساتھ جو مغلوں کا سیلاب دکن میں امنڈ آیا پہلے تو اس کا مقصد سیواجی کی سرکوبی تھی اور بیجاپور سے یہ کہا گیا تھا کہ اس مقصد کی تکمیل میں مغلوں کا ساتھ دے۔ چونکہ سیواجی مغلوں کا مشترک دشمن تھا بیجاپور سے تعاون کے لئے آمادہ ہوگیا اور اپنی فوج بھی بھیجدی اور یہی بات ہے کہ صرف بیجاپور کے تعاون کی وجہ سے مغلوں کو سیواجی کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی تھی لیکن مشکل یہ ہوئی ۔ کہ سیواجی سے صلح ہوگئی تو بیجاپور پر وار ہونے لگے یہ مغلوں کی کھلی بدعہدی تھی۔ چونکہ ہمیشہ دکنی سلطنتوں کا مشترک نصب العین رہا تھا کہ ہر بیرونی دشمن کو اپنا مشترک دشمن سمجھتے تھے اس لئے عبداللہ قطب شاہ نے اس موقع پر بیجاپور کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا کیونکہ بیجاپور کے خاتمہ کے بعد گولکنڈہ پر ضرور آنچ آتی۔ اس لئے گولکنڈہ کی حکومت سمجھتی تھی کہ اس کی بقا بیجاپور کے ساتھ وابستہ ہے جس طرح شہنشاہ اکبر کے مقابلہ میں چاند بی بی کو اور جہانگیر کے عہد میں ملک عنبر کو مدد دی گئی تھی اسی طرح اورنگ زیب کے مقابلہ میں علی عادل شاہ کی مدد کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اور عجب اتفاق ہے کہ اس وقت گولکنڈہ میں نیکنام خان کی سی شخصیت موجود تھی جو اس کام کو پوری وفاداری کے ساتھ انجام دے سکتی تھی معرکۂ بیجاپور کے اس نازک موقع پر عبداللہ قطب شاہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ نیک نام خان کو بھیجا تھا جس طرح نیک نام خاں کی مخلصانہ فرض شناسی خود گولکنڈہ کو فائدہ پہنچاتی تھی اسی طرح دکن کے خارجی مسلک میں بھی مفید ہوئی پہلے بیجاپور کی امداد کے لئے شرزہ خان کو بھیجا گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر حکومت کو زیادہ اعتماد نہیں تھا اس لئے نیک نام خان کے تحت ایک بڑی فوج بھیجی گئی۔ جے سنگھ سے متعدد معرکے ہوئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر معرکہ میں نیک نام خان نے بیجاپوری سپہ سالاروں کے ساتھ برابر کا مقابلہ کیا۔ اور غالباً نیک نام خان کی رہنمائی تھی کہ جے سنگھ جیسے مغل سپہ سالار کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے اس قدر شکست فاش ہوئی کہ وہ شرم کے مارے راہی عدم ہوگیا۔ اور اس طریقہ سے دکن میں چاند بی بی اور ملک عنبر کی یاد تازہ ہوگئی۔ غالباً اسی وجہ سے بیجاپور کا مشہور مورخ ابراہیم زبیری (نیک نام خان کو ان الفاظ سے یاد کرتا ہے "نیک نام خان کہ در شجاعت و بسالت و کفایت و درایت ممتاز اقران و سرآمد اعیان بود" اور لڑائی ختم ہونے کے بعد

نیک نام خان صاحب را بہ نوازش ہائے سلطانی و خلعت ہائے خسروانی سرفراز و سربلند فرمودہ رخصت فرمودند۔

جس طرح نیک نام خان کی سیاسی زندگی درخشاں تھی اور سلطنت اس کا لوہا مانتی تھی اس کی خانگی زندگی بھی بڑی پاکیزہ اور قابلِ قدر تھی۔ جو لوگ اس کی گھریلو زندگی سے براہِ راست وابستہ تھے وہ اس کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں علی بن طیفور اور اس کے بھائی ابراہیم کو مطالعہ کرنے کا بہت موقع ملا تھا۔ یہ لوگ اس کے اخلاق و عادات کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ علی کہتا ہے کہ "نیک نام خان بہ انواع فضائل نفسانی و اصناف کمالات انسانی محلی بود۔ و از افعال ردیہ و اوصاف ذمیمہ مانند عجب نخوت وکبر دست محلیٰ" اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے اس میں بہترین فضائل کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غرور و بناوٹ بالکل نہ تھے اور وہ بہت فراخ دل اور فراخ حوصلہ واقع ہوا تھا۔ اس کی فیاضی کے بھی بہت سے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے پہلے اس نے چالیس ہزار ہون خیرات کئے تھے لیکن سب سے زیادہ اچنبے کی بات یہ ہے کہ اس کو علم کا چسکا بھی تھا۔ اپنی سیاسی اور مدنی مصروفیتوں کے باوجود اس نے علماؑ و فضلا کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا اور شعر و سخن کی بھی مشق کی تھی۔ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھا شاعر بھی تھا اس کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

رسید کار بجائے کہ آں سیہ چشماں | زشرم جامہ بہ تن در نگاہ می دوزند

ولہٗ

ستائش سزاوارِ مرد آوری است | کہ روز و شب و سال و ماہ آوری است

ولہٗ

پس ہر کمالے زوالے بود | خطِ یار بر عارض محضری است

ولہٗ

زنیکاں بد نیاید و ز بداں نیک | کہ روشن روشن و تاریک تاریک

ولہٗ

می رسد نفعم بہ ہر چیزے زوانِ حالم بے صلہ | لالہ رنگ از رو و آتش از دل و تن تاب برد

ولہٗ

(غزل) گر با تو دمے گدا نشیند | در سایۂ او ہما نشیند۔
آں را کہ بہ نزد خوش خوانی | چوں نور بہ دیدہ ہا نشیند۔
واں را کہ بہ رانی از در خویش | بیشش کہ رود کجا نشیند۔
گر یوسف من بہ صبح در شام | با طلعت پُر ضیا نشیند
خورشید ز رشکِ عارضِ او | در شام چو کہربا نشیند

نیک نام خاں کی زندگی کے تمام واقعات کو حصر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ گولکنڈہ کے مشاہیر میں سے ہے یہ نہ صرف ایک سپہ سالار بلکہ ایک بہت بڑا عالم اور مدبر بھی تھا جس زمانہ سے اس کا گولکنڈہ سے تعلق ہوا ہے اس کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی زندگی کا پہلا حصہ میر جملہ کے ساتھ گذرا تھا۔ اس زمانہ کے واقعات پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی لیکن میر جملہ کے جانے کے بعد اس نے سلطنت گولکنڈہ کی گراں بہا خدمات انجام دیں جو لائق ہر ستائش ہیں۔ میر جملہ کی وجہ سے کرناٹک اور مرکزی حکومت میں جو سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کو پوری قوت کے ساتھ فرو کیا۔ اپنی سپاہیانہ قابلیت سے کرناٹک کے نہ صرف کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کئے بلکہ وہاں بیش بہا اضافے بھی کئے۔ نیز انگریزی کمپنی سے اپنے پُر زور مطالبات وصول کر کے گولکنڈہ کا وقار قائم کر دیا۔ دوسری طرف مغل سلطنت کے مقابلہ میں گولکنڈہ کی لاج رکھ لی جو میر جملہ کی بے وفائی کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اس کے علاوہ نہ صرف مرکزی حکومت کو بڑھایا بلکہ بیجاپور کے ساتھ تعاون کر کے مغلوں کے مشہور جنرل جے سنگھ کو سخت شکستیں دیں اور دکن کی عزت رکھ لی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باوجود علم و فن میں بھی دلچسپی لیتا تھا خود شاعر تھا اور علما کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھاتا تھا جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی قبر کے کتبے میں بادشاہ نے "مغفرت پناہ جنت مکاں نیک نام خاں" کے الفاظ کندہ کئے اور

اس کے ایصالِ ثواب اور اس کی قبر کی روشنی کے لئے موضع جنواڑہ وقف کردیا جو گولکنڈہ سے قریب واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے دل میں اس کی کتنی وقعت تھی۔ خادم نے اس کے انتقال پر جو قطعہ تاریخ لکھا تھا اس کے الفاظ بہت پُر اثر ہیں۔

قطعہ۔
افسوس کہ نیک نام خاں رفت — سالار شہنشہ زماں رفت
صد حیف ازاں وزیر دانا — کز رفتنش از جہاں اماں رفت
صد فتنہ ز ہر کنارہ برخاست — تا رایت عدلش از جہاں رفت
چوں بود ز سالکان تجرید — برداشتہ دل ازیں و آں است
خادم پے سال او رقم زد — عیسیٰ زماں بہ آسماں رفت ۱۰۸۳ھ

لیکن نیک نام کی عظمت کا صحیح اندازہ غالباً اس مثنوی سے ہو سکتا ہے جو علی ابن طیفور نے اس کی تعریف میں لکھی تھی۔ اس کا ہر شعر معنی خیز ہے اور اس کی شخصیت پر صحیح روشنی ڈالتا ہے۔

خداوند جم قدر خورشید رائے — ز سر تا بہ پا محض لطف خدائے
دلش مخزن سر دانائیست — رخش مطلع نور بینائی است
بہ دانش فلاطون و جم پروری — بہ بینش ارسطو و اسکندری
کفش در سخا دست موسیٰ بود — دمش در شفا روح عیسیٰ بود
نسیمے ز خلقش برد گر بہار — بہ شاخ شگفتہ دہد برگ و بار
خرد را بہ دانا دلے جوہری — کرم را بہ دریا دلے گوہری
قضا از رضایش نہ پیچیدہ سر — فزائندہ قدر او شد قدر
چناں طبع او راستی پیشہ کرد — کہ از کج روی چرخ اندیشہ کرد
کفش را چہ نسبت بہ ابر بہار — کہ آں در فشان است ایں قطرہ بار
چو عزمش بہ تسخیر بندد کمر — ظفر بر رکابش بہ دارد نظر
چو فکرش بہ تدبیر گردد دمے — بہ یک دم مسخر کند عالمے
علم در شود تیغ او در مصاف — کند خاف وار تن آں چہ کاف
جہاں روشن از شمع تدبیر اوست — زماں گلشن از آب شمشیر اوست
فلاطوں شکوہے کہ دیں پرور است — صف لشکرش صد اسکندرش
جہاں را کہ تیغش حمایت بود — نمودار دستِ ولایت بود
چو در روزِ میداں شود کینہ خواہ — کند حلقہ در گوش ماہی و ماہ
بہ سر پنجہ با شیر شیری کند — بہ قدرت بہ گردوں دلیری کند
بہ خورشید تیغش بود تو اماں — بہ گردد بیک دم زمین آسماں
بہ عدل و شجاعت بہ حلم و بہ جود
چو در نیکوئی خود تمام آمدہ — خطابش ازاں نیک نام آمدہ

غزل

عبدالمجید صدیقی

دمِ آخر بھی دنیا کی پڑی ہے — ارے غافل اجل سر پر کھڑی ہے
نہ وہ آئیں نہ چین آئے نہ موت آئے — قیامت ہے کہ وعدے کی گھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوزِ غم کے ہاتھوں — چراغِ زندگی بس دو گھڑی ہے
سنبھالو میکشو اب شیشہ و جام — گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے
خبر محبوب کیا لیں ہم کسی کی — ہمیں تو آپ ہی اپنی پڑی ہے

راجہ محبوب راج محبوب
خلف لالہ گردہاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ

قسمت

میں تقریباً دو ماہ سے مسز اسپنسر کے مکان میں بہ حیثیت بورڈ مقیم تھا کہ ایک اور حیدر آبادی صاحب یہاں قیام کرنے کے لئے آئے ان کے جسم کی لاغری اور پژمردگی سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی کسی بیماری سے صحت یاب ہوئے ہیں اور تبدیلی کے خیال سے بنگلور آئے ہوئے ہیں کیونکہ یہ شہر ایک طرف بیمار لوگوں کے لئے صحت بخش ہے تو دوسری طرف نوجوان طبائع کے لئے تفریح اور دلچسپیوں کے وافر سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ میرے ہم وطن کا نام ارشاد احمد تھا یہ ہندوستانی نژاد تھے۔ عمر چالیس پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ آدمی متین اور سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ دو ایک روز میں ہم دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔ بظاہر دوستی کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ ہم دونوں حیدر آبادی تھے لیکن اس کے علاوہ بھی ایک چیز تھی۔ وہ یہ کہ ہماری طبیعتوں، ہمارے ذوق اور ہمارے خیالات میں بھی کافی ہم آہنگی تھی۔ گو ایف۔ اے تک اس نے تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ اس کی گفتگو میں ایک خاص لوچ تھا۔ انداز بیان نہایت شگفتہ تھا اور خیالات انتہائی سلجھے ہوئے تھے وہ کسی پائیگاہ کے علاقہ میں تحصیلدار تھا۔

ارشاد کے کردار کو واضح کرنے کی میں اس لئے کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے ایک ایسے تجربہ کو قلمبند کرنا ہے جو میرے بنگلور چھوڑنے کے ایک روز قبل اس نے بیان کیا تھا۔ واقعہ کی صداقت اور عدم صداقت سے مجھے بحث نہیں لیکن جن حالات کے تحت یہ بیان ہوا۔ اس کی تفصیل اس لئے بیان کرنی ضروری ہے کہ یہ چیز پس منظر کا کام دے سکتی ہے۔

ادھر میں نے غالباً مس ڈورا اسپنسر کا ذکر نہیں کیا۔ یہ مسز اسپنسر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ جو بہت خوش شکل اور گداز جسم کی تھی۔ اس کی عمر انیس بیس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن اس کے چہرے پر پھول کی سی تازگی تھی۔ بنگلور اگرچہ اینگلو انڈین لڑکیوں کو عام طور پر بدنام کیا جاتا ہے مگر مس ڈورا بظاہر ایسی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ کسی کانونٹ میں معلمہ تھی۔ اور اسے اپنی نیک نامی کا بڑا خیال تھا۔ ابتدا میں وہ مجھ سے مطلق مانوس نہ تھی اور نہ میں نے کبھی اس سے مانوس ہونے کی کوشش کی لیکن جس چیز نے اُسے میری طرف متوجہ کیا وہ اس کی طرف سے میری بے اعتنائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جتنا ان عورتوں کی طرف کوئی راغب ہوتا ہے ان کا دماغ آسمان پر چڑھتا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہم میں خاصی دوستی پیدا ہوگئی۔ اتنی کہ شام میں میرے ساتھ تنہا سیر و تفریح کو چلنے سے اسے کوئی عذر نہ ہوتا تھا۔ ارشاد کے آنے کے بعد بھی ہمارا یہی حال رہا۔

۲

بنگلور چھوڑنے کے ایک روز قبل حسب عادت پھر میں ارشاد سے باتیں کرتا بیٹھا تھا کہ مس ڈورا ایک سکھ نجومی کو لئے کمرہ میں داخل ہوئی اور میرے قریب آکر اس نے کہا کہ ہم بھی نجومی سے اپنی قسمت معلوم کریں۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ سکھ تو چلا گیا لیکن مس ڈورا خفیف سی ہوگئی۔ لیکن فوراً ارشاد نے بات بنا کر کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ اس طرح قسمت معلوم کرنے میں آپ کے سامنے اپنے ماضی کو بے نقاب کرنا پڑے گا جو ہمیں پسند نہیں۔ آپ ہم کو کیا سمجھیں گی؟" جو ارشاد نے ایک قہقہہ لگایا۔ مس ڈورا بھی ہنس پڑی اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔"

ہماری گفتگو کا تسلسل تو باقی نہیں رہا تھا لہٰذا مس ڈورا کے مذاق طبیعت اور ذوق کی مناسبت سے میں نے ارشاد کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔"

"مسئلہ تقدیر کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟ کیا جو چیزیں زمانۂ آئندہ میں ظہور پذیر ہونے والی ہیں ان کے متعلق انسان قبل از وقت سب رہیں قبل علم حاصل کر سکتا ہے؟"

ارشاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اور اس کی صورت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری سوچ میں ہے تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"قبل اس کے کہ میں آپ کے اس سوال کا جواب دوں، میں پہلے آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں؟"

"میرے کوئی خاص خیالات نہیں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے ماضی، حال یا مستقبل کے متعلق نجوم کے ذریعہ بہت سی چیزیں بیان کی جا سکتی ہیں مثال کے طور پر آپ پامسٹری ہی کو لیجئے۔"

"تو کیا پامسٹری پر آپ کو اعتقاد ہے؟"

جس طرح انسان کی صورت سے اس کے اندرونی خیالات اور جذبات کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے اسی طرح اس کے ہاتھ کو دیکھ کر اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر بھی خیال آرائی ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ میرا ماضی یا مستقبل میرے ہاتھ کی لکیروں پر منقش ہے مبالغہ ہے" میں نے مبہم طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"تو پھر پامسٹری پر اعتقاد کہاں رہا؟"

"اعتقاد تو بڑا لفظ ہے۔ مجھے اس علم سے دلچسپی ضرور ہے۔ لیکن اب تک مجھے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ اس کی پیشین گوئیاں صحیح نکلیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کیا آئندہ ہونے والی چیزوں کا علم حاصل کر کے انسان اُن سے کچھ فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے؟ کیا جو چیزیں اس کے لئے مقسوم ہو چکی ہیں وہ ہو کر نہیں رہتیں۔ کیا انسان کو اپنے افعال پر اختیار حاصل ہے یا وہ محض قدرت کا کھلونا ہے؟" میں نے نجوم کے متعلق سارے شکوک و شبہات کو ایک ساتھ پیش کر دیا۔

"آپ انسان کو ذی اختیار سمجھتے ہیں" ارشاد نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ "جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنے افعال پر بڑی حد تک اختیار حاصل ہے جو چیزیں ہمارے بس کی نہیں ہوتیں یا جن کے حصول میں ہمیں ناکامی سے سابقہ پڑتا ہے ان کو قسمت کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے اور ہم اپنی ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس قسمت پرستی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔" "یہ صحیح ہے لیکن .... وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا۔" "لیکن اس کے باوجود انسان مجبور محض ہے۔" میں نے اس کے جملہ کو ختم کرنے کی کوشش کی "نہیں۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں۔" اس نے اپنے خیالات سے چونک کر کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ ارشاد کی تامل آمیز گفتگو اور اس کی صورت سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص قسمت کا ضرور قائل ہے اور اس کو نجوم یا پامسٹری میں بھی کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ بحث کو کسی طرح ختم کرنے کے خیال سے میں نے مذاقاً اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ میری اس حرکت پر کچھ سہم سا گیا۔ اور بے ساختہ اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا "نہیں میں نے لوگوں کا ہاتھ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔" "کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟" "نہیں میں نے قسم کھالی ہے۔" "آخر کیوں؟"

"اس کی ایک خاص وجہ ہے جو میں آپ کو پھر کبھی تبلاؤں گا۔" "ایسا نہیں۔ اگر کچھ کہنا ہو تو ابھی کہہ ڈالیئے۔"

اس نے گھڑی کی طرف نظر اٹھائی۔ چار بج رہے تھے۔ "یہ ایک طولانی داستان ہے اور آپ لوگوں کی تفریح کا وقت قریب ہے۔"

اس نے معنی خیز نظروں سے میری صورت کو دیکھا۔

"آپ اس کی فکر نہ فرمائیں۔ مجھے تفریح کی پروا نہیں۔ اگر مس ڈورا جانا چاہتی ہیں تو شوق سے جا سکتی ہیں" میں نے مس ڈورا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اگر میرا یہاں ٹھہرنا ناگوار گزرتا ہے تو میں چلی جاتی ہوں" مس ڈورا نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں آپ شوق سے ٹھہر سکتی ہیں۔ یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ مس ڈورا سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ ہنسنے لگی۔ اس اثنا میں ملازم نے چاء کے لئے میز بچھا دی تھی۔ چاء سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد نے اپنا قصہ شروع کیا۔

"میری عمر بائیس سال کی تھی جب میں نے کالج کی تعلیم ختم کی۔ زمانۂ طالب علمی میں نہ معلوم مجھے کیوں پامسٹری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں نے اس فن پر بیسیوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاتھوں کے چربے لے کر میں ان کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس علم پر تھوڑا بہت عبور حاصل ہونے کے بعد پہلی چیز جس کا میں نے خود اپنے ہاتھ میں مطالعہ کیا وہ یہ تھا کہ پچیس سال کی عمر میں ایک خطرناک موت کی زد سے بال بال بچنے والا تھا۔ میری عمر کی لکیر صاف اور صریح طور پر قطع تھی اور اس جگہ ایک مربع تھا جو اس لکیر کے سلسلہ کو قائم کئے ہوئے تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں اس لکیر کا یہی حال تھا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ میری شمع حیات خاموش ہوتے ہوتے سنبھالا لے گی۔ اور یہ ایسا سنبھالا تھا جس میں مجھے سخت جسمانی اذیت پہنچنے والی تھی۔ یہ آخری چیز میرے لئے سخت پریشان کن تھی۔ علاوہ ازیں ایک ہلکی سی لکیر عمر کی انقطاع کو صحت کی لکیر کے ایک ستارے سے ملاتی تھی۔ یہ ستارہ بھی مربع تھا۔ گویا اس حادثہ سے میں صحت یاب بھی ہونے والا تھا۔ اس انکشاف کے بعد میرا جینا مشکل ہو گیا جس وقت میں نے چوبیسویں سال میں قدم رکھا میں اپنے اندر ایک گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا جو تنہائی میں میرے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی میں رات دن اسی سوچ میں رہتا تھا کہ قسمت کے اس شدنی امر کا وقت قریب آ گیا ہے۔

"آپ جانتے ہیں" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "کہ پامسٹری میں کسی واقعہ کے ظاہر ہونے کو دن اور وقت سے متعین کرنا ناممکن ہے۔ اور اس طرح یہ حادثہ چوبیس اور پچیس سال کی عمر کے درمیان کسی بھی وقت وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ بہر کیف جیسے جیسے دن گذرتے جا رہے تھے میں اپنے آپ کو موت سے قریب تر محسوس کر رہا تھا۔ ہر نیا دن میرے لئے موت اور زیست کا سوال ہوتا تھا اور میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ گھر سے باہر اگر دس قدم بھی جانا ہوتا تو میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا کہ مبادا میں کسی حادثہ کا شکار ہو جاؤں۔ میرے حزم واحتیاط کا یہ عالم تھا کہ میں نے موٹر، تانگہ اور دیگر سواریوں میں بیٹھنا ترک کر دیا تھا مجھے پامسٹری ہی سے نفرت ہونے لگی جس سے میری زندگی وبال جان ہو گئی تھی۔ دن بدن میری صحت خراب ہونے لگی آخر تنگ آ کر میں نے اپنی پریشانیوں کا حال ایک دوست سے کہا اور اس نے میرا خوب مضحکہ اڑایا۔ رفتہ رفتہ دوستوں اور عزیزوں میں یہ بات عام ہو گئی۔ بعض لوگوں نے بنانا شروع کیا۔ کوئی ولی کہتا، کوئی شیطان کہتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ میں زندگی سے بیزار ہو گیا تھا میں نے خود کشی کی ٹھان لی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں میرے ایک عزیز دوست ناصر کی شادی محبوب نگر میں تھی اور وہ میری شرکت پر مصر بھی تھے۔ میں اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے محبوب نگر چلا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد شادی سے فارغ ہو کر جب میں واپس ہونے لگا تو میرے ساتھ ناصر کے چھوٹے بھائی حامد بھی تھے۔ انھیں نہ معلوم کس نے میری پامسٹری سے واقفیت کا حال کہہ دیا تھا کہ پلیٹ فارم ہی سے یہ مجھے اپنا ہاتھ دکھلانے کی خواہش کر رہے تھے۔ اتفاق سے ٹرین میں ایک ایسے کمپارٹمنٹ میں جگہ مل گئی جس میں صرف

ایک اینگلو انڈین مرد اس کے ساتھ ایک حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی لیکن ٹرین کے روانہ ہونے تک اس میں اور دو لوگوں کا اضافہ ہوگیا۔ ایک ہندو مہاراج پریشانی میں اپنی بدوضع بیوی کے ساتھ اس ڈبہ میں گھس پڑے۔ جس وقت ٹرین محبوب نگر سے چلنے لگی تو ڈبہ میں ہم صرف چھ نفوس تھے۔ شام کا سہانا وقت تھا۔ افق مغرب میں سرخ اور سنہری رنگوں کے امتزاج نے فضا میں شعریت پیدا کر دی تھی۔ حد نظر تک جنگل و بیابان سبزہ زار بنے ہوئے تھے۔ فطرت کے اس پرسکون منظر میں اپنے دل کا سکون ڈھونڈ رہا تھا لیکن حامد سے رہا نہ گیا۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اس نے پھر دست سوال دراز کیا۔ ہرچند میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آیا۔ ڈبہ کے سارے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ ناچار مجھے حامد کا ہاتھ دیکھنا پڑا۔ پہلے میں نے ہاتھ کی عام ساخت اور ناخنوں سے بحث کرتے ہوئے اس کے کردار کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے۔ اس کے بعد ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھ کر میں نے اس کے کردار کی مزید وضاحت کی۔ اس کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے قبل میں نے حامد کی عمر کا اندازہ لگایا۔ وہ بائیس سال سے زاید نہ ہوگا۔ معاً میری نظر اس کی عمر کی لکیر پر پڑی میں نے دیکھا کہ اس کی عمر اور قسمت کی لکیریں بری طرح قطع تھیں جو ایک خطرناک موت کی طرف دلالت کر رہی تھیں اور جب میں نے حساب لگایا تو موت کا اکیس بائیس سال کی عمر میں واقع ہونا ظاہر ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ شخص اب تک زندہ کیسے ہے۔ میں نے حامد سے اس کی موت کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے اس کی جواں مرگی پر افسوس ہو رہا تھا۔ حامد کے ہاتھ کے دیکھنے کے بعد میں نے سگریٹ جلایا ہی تھا کہ اینگلو انڈین لڑکی بے تحاشہ میری طرف لپکی۔ ہر زمانہ اور تمدن میں دیکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے مستقبل کے معلوم کرنے میں مردوں سے آگے رہی ہیں۔ لڑکی نے لجائی ہوئی نظروں سے میری صورت کو دیکھا اور اپنے شفاف و بلورین ہاتھ میرے آگے بڑھا دیئے۔ مجھے انکار کرتے نہ بنی۔ یہ بڑی حسین لڑکی تھی عمر انیس بیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ جس وقت میں نے اس لڑکی کے نرم اور گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو میں نے اپنے جسم میں ایک قسم کی سنساہٹ سی محسوس کی۔ اس کی ہتھیلی میں سب سے پہلے میں نے شادی کی لکیر دیکھی کیوں کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اینگلو انڈین مرد سے اس کا آخر کیا رشتہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی شادی کی لکیر کی ابتدا ایک جزیرہ سے ہوئی ہے جس کے یہ معنی تھے کہ وہ شادی کے قبل کسی مرد کے ساتھ بھاگ جائے گی اور سخت مصیبتیں جھیلے گی۔ علاوہ ازیں یہ لکیر جو بہت مختصر تھی سیدھے جانے کے بجائے جو ایک نیک انجام کی علامت ہے اوپر کی طرف مڑ گئی تھی جس کا یہ مفہوم تھا کہ تادم زیست وہ شادی نہیں کرے گی۔ اس لکیر کے دیکھنے کے بعد میں نے دل میں خیال کیا کہ ممکن ہے دونوں شادی کے خیال سے اپنے گھر سے بھاگ رہے ہوں۔ اور جب میں نے لڑکی پر اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا ہاتھ پسینہ پسینہ ہوگیا تھا۔ دوسری اہم چیز جو میں نے اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھی وہ وہی موت کے علامات تھے جو حامد کے ہاتھ میں نظر آئے تھے۔ لڑکی کا کوئی مستقبل نہ تھا لیکن اس کو خوش کرنے کے لئے میں نے سرسری طور پر اس کی خوش بختی اور درازی عمر کا ذکر کیا اور اس طرح اس کے ہاتھ سے پیچھا چھڑایا۔

اس لڑکی کے بعد اینگلو انڈین مرد کی باری آئی۔ اب ہر نئے ہاتھ کے دیکھنے کے وقت میں ایک دہشت سی محسوس کرنے لگا کہ مبادا وہی موت کے علامات اس میں بھی نظر آئیں اور ہر ہاتھ جو میرے سامنے پیش ہو رہا تھا اس میں صریح طور پر یہ علامات موجود ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ہندو مہاراج اور ان کی بدوضع بیوی کے ہاتھوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور بڑا تعجب مجھے اس بات کا تھا کہ ان سب کی موت کا ان کی موجودہ عمروں ہی میں واقع ہونا ضروری تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریل کو ضرور کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے اور مجھے فوراً زنجیر کھینچ کر ریل کو ٹھیرا دینا چاہیئے۔ مجھے ان لوگوں کے سامنے ان کی موت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے

ہیبت ہو رہی تھی ورنہ اگر میں یہ چیز ظاہر کر دیتا تو ان میں سے ایک آدھ مجھ سے پہلے زنجیر کھینچنے میں پیش قدمی کر جاتا۔ ریل بلدہ کے نواح سے گزر رہی تھی۔ رات اندھیری اور ڈراؤنی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں...... ارشاد نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ایک ہاتھ کو اپنے منہ کے سامنے لاکر ایک جنبش دی۔ جیسے وہ کسی خوفناک واقعہ کی یاد کو اپنے دماغ سے محو کرنے کی کوشش کر رہا ہے

"میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور دو نرسیں میرے پلنگ سے لگی ہوئی کھڑی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ میں اسپتال میں ہوں۔ مجھ سے کہا گیا کہ ایک ریل کے حادثہ میں میرے دماغ پر سخت چوٹ آئی ہے اور یہ کہ میں بیہوشی کی حالت میں اسپتال میں شریک کیا گیا اور مکامل اڑتالیس گھنٹوں کے بعد مجھے ہوش آیا۔ میرا دماغ ماؤف تھا اور مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ ایک روز جب ناصر کو میں نے اپنے پلنگ کے قریب دیکھا تو ایک بجلی کی رو میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ معاً میرا دماغ کام کرنے لگ گیا اور میری یاد تازہ ہو گئی۔ لیکن میں نے خاموشی اختیار کی اور ایک انجان آدمی کی طرح ناصر سے حادثہ کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ پورٹر نے غلطی سے سگنل نیچا کر دیا تھا جس کی وجہ سے ٹرین ایک مال گاڑی سے جا ٹکرائی۔ میں نے عمداً اس سے اپنے ساتھیوں کی خیریت دریافت نہیں کی۔

اس واقعہ سے میری صحت پر بہت اثر پڑا اور میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔ لیکن ایک بے غیرت کی طرح میں زندہ ہوں اور اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔" آخری جملہ ارشاد نے بڑی مایوسی سے کہا۔ مس ڈور اس واقعہ سے اتنی متاثر ہوئی کہ بغیر کسی اظہار خیال کے وہ کمرے سے چلی گئی۔ میں نے بھی اس واقعہ سے اثر لیا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ارشاد نے کہا۔

"اس واقعہ کے سننے کے بعد آپ کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہو گی۔ خود مجھے اپنی ذات سے نفرت ہے۔" "اس میں نفرت کی کیا بات ہے اور مجھے آپ سے نفرت کیوں ہونے لگی؟" میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ "لیکن آپ مجھے اس حادثہ کا ذمہ دار ضرور ٹھیراتے ہیں۔" میں نے اس جملہ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ "کیا واقعاً آپ مجھے حادثہ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں" ۔ اس نے پھر اپنے سوال کا اعادہ کیا۔

"ہاں آپ آسانی سے زنجیر کھینچ سکتے تھے" "لیکن میں کہوں گا آپ میرے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ اس میں میرا قصور ہی کیا تھا جب فطرتاً میں کمزور واقع ہوا ہوں" "لیکن آدمی اپنی کمزوری پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔" "بشرطیکہ اس میں قابو حاصل کرنے کی طاقت ہو۔" "تو آپ کا خیال ہے آپ نے زنجیر نہیں کھینچی لہذا آپ زنجیر کھینچ ہی نہیں سکتے۔" "ہاں!" "اور کیا آپ کے ہاتھ میں یہ پہلے ہی سے منقوش تھا؟" وہ اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھنے لگا اور اس کے بعد بولا "یہ ایک انتہائی کمزور آدمی کے ہاتھ ہیں......" "ایسے کمزور آدمی کے ہاتھ جو خود کو یا کسی اور کو اپنے افعال میں مختار ہونا تسلیم نہیں کرتا" میں نے قطع کلام کیا۔ "آپ کے ہاتھ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ ہیں جو بھلے برے کی تمیز کر کے ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکتا ہے۔" "لیکن مجھے اس کا جواب دیجئے آیا زنجیر نہ کھینچنا پہلے ہی سے آپ کی قسمت میں لکھا تھا" "ہاں!"

"اور کیا آپ کے ہاتھوں میں ایسی کوئی لکیر تھی جس سے آپ کا زنجیر نہ کھینچنا ظاہر ہوتا تھا" "ایسا نہیں بلکہ آدمی سے جو فعل سرزد ہونے والے ہوتے ہیں وہ ہاتھ کی لکیروں سے ظاہر ہوتے ہیں اور جو افعال سرزد ہونے والے نہیں ہوتے ان کا ہاتھ سے ظاہر ہونا مشکل ہے۔"

"لیکن جو کام آدمی کر سکتا ہے اس کو نہ کرے تو اس ترک فعل سے جو نتائج ظاہر ہوں گے وہ اسی کے سر تھوپے جائیں گے۔" میں نے منطقی طریقۂ استدلال سے اس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ "یقیناً۔ لیکن میرا ہاتھ ایک ایسے آدمی کا ہاتھ ہے جس نے اپنی زندگی میں بڑی سخت تکالیف اٹھائی ہیں۔" "تو کیا آپ کا ہاتھ ایک ایسے آدمی کا ہاتھ ہے جس کی قسمت میں تکلیف اٹھانا لکھا ہے؟"

"میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور غالباً اس سے قبل میں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے" "میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام لوگوں کے ہاتھ ایسے ہی

جن کی قسمت میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔" لیکن اتنی نہیں جتنی کہ میں نے اٹھائی ہیں اور اٹھا رہا ہوں"۔ مجھے ارشاد کے اس استدلال سے تکلیف ہونے لگی اور اس بحث کو ختم کرنے کے لئے میں نے پھر اس سوال کو دھرایا جس کا ارشاد نے پوری طرح جواب نہیں دیا تھا۔

"لیکن یہ فرمایئے آپ کے ہاتھ میں کوئی ایسی لکیر تھی کہ آپ زنجیر نہیں کھینچ سکتے تھے"۔ ارشاد پریشان ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا اور اس کے بعد یہ جواب دیا۔"لیکن اُن لوگوں کے ہاتھ کی لکیروں میں موت کے علامات نمایاں تھے"۔

۲

بلدہ واپس ہونے کے بعد میں نے پھر سنجیدگی سے ارشاد کے بیان کئے ہوئے سارے واقعات پر غور کیا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ جب ارشاد کے دماغ پر چوٹ آئی تھی تو حادثہ کے پہلے کے واقعات اسے کیسے یاد رہے۔ حالت تعطل میں ممکن ہے اس کے دماغ نے یہ ساری چیزیں ایجاد کرلی ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے اُن لوگوں کے ہاتھوں کے علامات دیکھے ہی نہ ہوں۔ میرے شکوک اور شبہات میں اضافہ ہونے لگا۔ میں نے ارشاد کو ایک خط لکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسرے سال جب میں نے پھر گرمائی تعطیلات بسر کرنے بنگلور کا ارادہ کیا تو میں نے مس ڈورا اسپنسر کو اپنے قیام کا انتظام کرنے خط لکھا لیکن اس نے پہلے ہی سے لوگوں کی موجودگی کا ذکر کرتے ہوئے مجبوری کا اظہار کیا اور آخر میں یہ تحریر کیا کہ وہ خود ایک روز میں کسی کام سے بمبئی جارہی ہے۔ مجبوراً مجھے ایک ہوٹل میں اپنا انتظام کرنا پڑا۔ ایک روز میں کبن پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ شام ہوگئی تھی اور فضا تاریکی میں جذب ہورہی تھی۔ آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ حسین اینگلو انڈین لڑکیاں اپنے مرد قدر دانوں کے ساتھ محو گلگشت تھیں بنگلور کا پورا حسن زینت چمن بنا ہوا تھا۔ مجھے دور مس ڈورا کسی مرد کے ساتھ محو خرام نظر آئی۔ اور جب میں نے غور سے دیکھا تو ارشاد کو مس ڈورا کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں ان دونوں سے ملنے کے خیال سے آگے بڑھا۔ مجھے پہچان کر مس ڈورا نے اضطراری طور پر اپنی کمر سے ارشاد کا ہاتھ علحدہ کیا۔ مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ ان دونوں میں ایسا اختلاط کیسا پیدا ہوگیا۔ مس ڈورا بظاہر خاموش قسم کی لڑکی تھی اور میرے قیام تک وہ ارشاد سے مطلق مانوس نہ تھی بلکہ میرے سامنے وہ اس کا مضحکہ اُڑایا کرتی تھی۔

"بھئی تم کیسے آئے۔ آنے کی اطلاع بھی نہ دی"۔ ارشاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اطلاع کیسے دیتا جب آپ خط کا جواب دینے کے عادی ہی نہیں"۔ میں ہنسنے لگا۔ ارشاد خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

"کیوں؟ آپ خاموش ہوگئے؟" "آپ کا خط پڑھ کر مجھے سخت روحانی صدمہ ہوا۔ جو واقعات مجھ پر گزرے تھے میں نے من و عن آپ کے سامنے بیان کردیئے تھے۔ مجھے اپنا امتحان دینا تو مقصود نہیں تھا"۔ "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ کے واقعہ کے متعلق میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے آپ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ کیا حادثہ کے پہلے کے واقعات آپ کے دماغ کے خود ساختہ نہیں ہوسکتے"؟ "اگر ایسا ہوسکتا ہے تو آپ کا قیاس صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کے ہاتھوں پر وہ علامات دیکھے اور نہ میں اُن ہاتھوں کا مطالعہ ہی کیا وہ لوگ ریل میں نہیں تھے۔ میں خود بھی نہیں تھا اور نہ میرے کسی دوست کی محبوب نگر میں شادی تھی"۔ ارشاد نے بڑی متانت سے جواب دیا تو آپ مجھے بنانے لگے۔ اگر ایسا تھا تو آپ کو اس واقعہ کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی یہ محض آپ کا خلوص تھا جس نے مجھے اس واقعہ کے کہنے پر مجبور کیا۔ اپنے دل سے ایک خیالی بوجھ اُتارنے کی میں نے کوشش کی تھی لیکن آپ نے اس پر ایک حقیقی بوجھ عاید کردیا ہے۔ اور اب ضمیر کی یہ سرزنش میرے لئے ناقابل برداشت بن جائے گی۔ آپ جانتے ہیں میں ایک

کمزور طبیعت کا آدمی ہوں ۔ معلوم نہیں کس لہر میں میں نے کیا کہدیا۔" آپ جھوٹ کہتے ہیں" میں نے غصہ سے کہا۔
"آپ خفا کیوں ہو رہے ہیں" اس نے شفقت سے میرے شانہ پر ہاتھ رکھکر اور اپنی گفتگو کا سلسلہ قائم رکھتے ہوے کہنے لگا۔ بات یہ ہے کہ مجھے نہ پامسٹری میں دخل ہے اور نہ میرا ایسی چیزوں پر اعتقاد ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ آپ اس علم کی حمایت کر رہے ہیں تو محض بحث کی خاطر میں نے اس کی مخالفت شروع کی اور معاً میرے دماغ میں ایک انگریزی افسانہ کا پلاٹ آیا جو میں نے کسی رسالہ میں پڑھا تھا۔ اور میں نے نمک مرچ لگا کر اس کو آپ کے سامنے پیش کر دیا لیکن آپ یقین مانئے کہ آپ کو دھوکہ دیتے ہوئے میں نے کسی قسم کی خوشی محسوس نہیں کی۔ بس دل ہی دل میں نادم تھا کہ میں کس طرح آپ کے جذبات سے کھیل رہا ہوں"۔ اس میں ندامت کی تو کوئی بات نہیں لیکن میں آپ کی قابلیت کی داد دیتا ہوں"۔ "مجھے ایسی قابلیت پر بھی شرم آتی ہے۔ یہ محض آپ کا خیال ہی خیال ہے۔" آپ کی اس خوش گمانی کا میں شکر گذار ہوں۔ میں آپ کے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مجھے آپ اپنی غلطی کے اعتراف کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے جس کی میں معافی چاہتا ہوں لیکن ایک اور چیز ہے جس کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ آج ہماری دوستی ختم ہوگئی اور میں اس کو ختم بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں کی عمروں میں بڑا تفاوت ہے۔ علاوہ ازیں آپ کو ایک ایسے آدمی سے دوستی رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کسی بھی وقت اپنی کسی مضحکہ خیز داستان سے آپ کو دھوکہ دے سکتا ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو اس قدر خوار و ذلیل کر لوں خصوصاً ایسے شخص کی نظروں میں جس کے سامنے میں نے اپنا دل آئینہ کی طرح رکھ دیا تھا۔ میں آپ کو خدا حافظ کہتا ہوں۔ آپ اپنا راستہ لیجئے اور میں اپنا راستہ لیتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوے تیزی سے مس ڈورا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر وہ میرے سامنے سے چلا گیا۔

اس کے بعد مجھے بارہا خیال آیا کہ ممکن ہے ارشاد کا پہلا قصہ اصلیت پر مبنی ہو اور دوسری مرتبہ اس نے جھوٹ کہا ہو۔ یا یہ ممکن ہے کہ مس ڈورا کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے اس نے یہ عجیب و غریب قصہ ایجاد کیا۔ کم از کم میرا دماغ اس گتھی کے سلجھانے سے قاصر ہے۔

بدرالدین شکیب

رباعیات

(۱)

طوفانِ حیات سے ابھرنا سیکھو
دشواریٔ راہ سے گذرنا سیکھو
یوں راہِ عمل میں بےعمل کیا جینا
جینے کی تمنا ہے تو مرنا سیکھو

(۲)

سلجھا ہوا اک خیال پیدا کر لے
تہذیبِ نظامِ حال پیدا کر لے
ہو جائے گی ہموار طبیعت خود ہی
پہلے مگر اعتدال پیدا کر لے

حکیم محمود ماہر اکبرآبادی

تعلیمی سفر یورپ

(ڈائری کے دو ورق)

پنجشنبہ ۳ر جون ۱۹۳۷ء۔ آج گرمی کسی قدر زیادہ ہے۔ لیکن ڈک پر خوب ہوا چل رہی ہے۔ میں نے گھر خط لکھا۔ کل عدن سے ایک شیخ سوار ہوئے تھے۔ اس وقت اُن سے ملاقات ہوئی۔ تجارت کے سلسلہ میں شیخ عدن سے شام جا رہے ہیں۔ ان کے تین فرزند یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ خود ان کے معلومات نہایت وسیع ہیں لیکن وضع قطع بالکل قدیم۔ غالباً یہی وجہ ہے جدھر وہ جاتے ہیں اُدھر ہی سب کی نظریں اٹھتی ہیں۔ یوم جمعہ ۴ر جون۔ آج میری طبیعت بہت بہتر ہے۔ دن کے ایک بجے جہاز سوڈان پہنچا۔ ہم سب نے جلدی کرکے لنچ ختم کیا۔ سیڑھیوں پر سے اتر کر اسٹیشن پہونچے۔ زمین پر عربوں اور مصریوں نے بڑی بڑی سفید چادریں بچھا کر دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک دوکان سے میں نے مونگے کا پنجہ (درخت) اور گھونگے کے ہار خریدے۔ دکان والے نے پوچھا "آپ ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ جی ہاں میں ہندی مسلمان ہوں۔ وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ بڈھا آدمی تھا۔ مجھ سے کہا "کیا آپ میرے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھوگی؟" میں نے تعمیل کی بہت ہی خوش ہو رہا۔ پھر عربی میں ایک لمبی دعا پڑھی اور آخر میں کہا "ماشاء اللہ آپ مسلم ہو۔ میں بے حد خوش ہوا" دو سیپیاں مجھ کو مفت دے دیں اور کہا یہ میرا تحفہ ہے۔ میں نے قیمت دینے کی کوشش کی۔ ہرگز نہیں لی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئی کیونکہ اس وقت دھوپ خوب تیز ہو گئی تھی۔ سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ یہ لوگ انگریزی جانتے ہیں اور اردو میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ دو بڑی شاپیں بنی ہیں۔ ان میں مگرمچھ اور چیتے کے چمڑے آویزاں تھے۔ خاص قسم کے جوتے اور چپل رکھے تھے۔ تھیلیاں تھیں۔ لیکن قیمت بڑی گراں بتلا رہے تھے۔ ہمارے رفقا میں سے بعض لڑکیاں کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر سیر کے لئے کنارے کی دوسری طرف گئیں۔ وہاں انھوں نے باغ اور مچھلیاں دیکھیں۔ ہم نے ٹکٹ خریدے۔ ادھر اُدھر گھوم کر میں تو واپس چلی آئی۔ جہاز پر چہل پہل ہو رہی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ گورنر سوڈان کی سواری آ رہی ہے۔ جس کے لینے کو جہاز ٹھیرا تھا۔ تمام افسران جہاز استقبال کے لئے استادہ تھے۔ اتنے میں گورنر کی موٹر آ کر سیڑھیوں کے قریب ٹھیری۔ قدم جسم کے ساتھ گورنر اوپر تشریف لائے اور سب سے مصافحہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ہمارے شیخ بھی ایک طرف کھڑے تھے۔ اُن سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملائے اور کہا "شیخ اچھے تو ہو" اور بھی کچھ باتیں ہوئیں۔ شیخ جب اپنی کرسی پر واپس آ کر بیٹھے تو میں نے کہا گورنر آپ کے دوست معلوم ہوتے ہیں۔ جواب دیا "ہاں یہ شخص عدن کا گورنر رہ چکا ہے اس لئے اُس نے مجھ کو پہچانا" پانچ کے قریب جہاز سوڈان سے روانہ ہو گیا۔

۵ر جون روز شنبہ۔ آج حیدرآباد خط بھیجوں گی کیونکہ جہاز کے احکام ہیں کہ سویز کینال میں جس وقت جہاز پہونچے تو قواعد بین الاقوامی کی رو سے کوئی خط ڈاک میں نہ ڈالا جائے۔ مسز ..... نے اپنی پارٹی کی میٹنگ کی اور یورپ کے نظام العمل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مارسیلز پہنچتے ہی پیرس روانہ ہو جائیں گے وہاں سے سیدھے برسلز (بلجیم) جائیں گے۔ بہت ممکن ہے شاہ بلجیم کی ملاقات سے مشرف ہوں۔ انگلستان جانے کے بعد ہم کو ملک معظم شہنشاہ جارج ششم و ملکہ معظمہ الزبتھ کی خدمت میں باریابی حاصل ہوگی۔ فرانس۔ جرمنی۔ سوئیزرلینڈ۔ ناروے۔ سویڈن وغیرہ میں مختلف جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوں گے۔ تقریروں اور بحث مباحثوں میں حصہ لینا ہوگا۔ بالخصوص نیس میں بین الاقوامی طلبا کی کانفرنس کے موقع پر جس کے اجلاس ایک ہفتہ عشرہ تک ہوتے

رہیں گے اور آخر میں تمام نمائندے اپنے اپنے مظاہرات پیش کریں گے جس میں ہندوستانی نمائندوں کی جانب سے بھی ایک ڈرامہ یا زندہ تصاویر کا کوئی مظاہرہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ غرض کہ مسز دتا نے کہا ابھی سے سوچ رکھو کہ آپ کیا کرو گی۔

۶ جون یکشنبہ ۱۹۳۸ء۔ ۱۱ بجے دن کے جہاز بندر سویز پر ٹھیرا۔ بہت دور تک پل اور کٹہ بنا ہوا ہے۔ جہاز اس کے کنارے دن بھر چلتا رہا۔ ساحل پر زیادہ تر چیڑ کے درخت ہیں ان کے باریک باریک سبز و نقروی پتے ہلکی ہلکی ہواؤں میں لہلہا رہے تھے۔ بعض اوقات ان جنگلوں میں موٹریں دوڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کہتے ہیں کنارے پر کئی قصبے آباد ہیں مٹی کا رنگ ہلکا پیلا ریگستان کی طرح ہوتا ہے۔ شام سے سردی بڑھنے لگی۔ رات کے دو بجے لڑکیوں نے آکر جگا دیا کہ چلو مسز دتا تیار ہو گئی ہیں۔ بندر سعید پر اترنے ڈک نمبر (۱) پر بعجلت تمام جا کر جو دیکھا تو تقریباً سب آچکی تھیں۔ بجز ڈاکٹر الفریڈا اور ان کی ہمشیرہ کے۔ ان کو تلاش کرنے میں آدھا گھنٹہ صرف ہوا۔ آخر ان کا پتہ کھانے کے ہال میں لگا جہاں دونوں مٹھی چا ر نوش فرما رہی تھیں۔ خیر۔ ہم سب مل کر جہاز پر سے سیڑھیوں کے ذریعہ ایک مصنوعی پل پر اترے اور خدا خدا کر کے بندر پر صحیح سلامت پہنچ گئے اور ایک شاندار آراستہ دکان میں داخل ہوئے۔ جس میں سیکڑوں اشیا تھیں۔ اُور کوٹ، ریشمی کپڑے، مونگے اور کہربا کے زیورات۔ چمڑے کی تھیلیوں کے مختلف انواع کا ذخیرہ۔ لکڑی و ہاتھی دانت کا سامان۔ گراموفون ریکارڈ، ٹکٹ۔ پوسٹ کارڈ وغیرہ۔ میں نے چند ایسی چیزیں خریدیں جو ہندوستان میں کمیاب ہیں۔ ایک خط بذریعہ ہوائی ڈاک گھر روانہ کیا۔ گھومتے ہوئے پھر مصنوعی پل کی طرف واپس ہوئے۔ راستہ میں بیچنے والوں کا ہجوم تھا جو پیچھے پڑ جاتے ہیں اور زبردستی اپنی اشیاء فروخت کرنی چاہتے ہیں۔ عدن کے مانند یہاں بھی لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سامان لاتے ہیں اور رسیاں ڈک پر پھینکتے ہیں جن میں بورے کی ٹوکریاں لٹکا دی جاتی ہیں۔ ان کے ذریعہ اشیاء مثلاً جانمازیں۔ میز پوش۔ تکیے غلاف وغیرہ جہاز پر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ بندر سعید پر مصری پولیس پہرے پر تھی۔ ان کی گہری اُودی وردی ہوتی ہے اور سر پر ترکی ٹوپی یہاں کے باشندوں کی رنگت اور شکلیں ہندوستانیوں سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ عموماً سوٹ پہنتے ہیں۔ بعضوں کے لمبے لمبے کرتے ہوتے ہیں اور ان پر چھوٹے چھوٹے کوٹ زیب تن کرتے ہیں۔ اکثر عمارتیں چار منزلہ یا پانچ منزلہ ہیں۔ سوا چھ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ صبح کا منظر نہایت روح افزا اور دلکش تھا۔ ایک بہت ہی خوبصورت مسجد دکھلائی دے رہی تھی جس کی لاجوردی گنبدیں اور طلائی منار طلوع آفتاب سے درخشاں ہو کر آنکھوں کو چکا چوند کر رہے تھے۔ عظمت اسلام کا دل پر عمیق اثر ہو رہا تھا۔ اب تک تو مسلمین کی شکل نظر آتی رہی اور شان اسلام کا پتہ چلتا رہا۔

۷ جون دوشنبہ۔ آج دوپہر کے کھانے کے بعد میں ایک دلچسپ کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی "اسلام آن دی کروسیڈ" از محمد اسد نو مسلم انگریز۔ ایک مشنری میم بازو کی کرسی پر آکر بیٹھی اور مجھ سے مخاطب ہوئی مختلف مضامین پر مکالمہ شروع ہوا۔ میں نے کہا میں اس امر کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ مشنریوں نے ہندوستان کی یک گونہ خدمت کی ہے۔ دور دراز مقامات میں دشوار گذار دیہات میں آپنے ہسپتال بنائے ہیں۔ مدرسے قائم کئے ہیں۔ بے شک دہقان آپ کے وجود کو خدا کی نعمت سمجھتے ہوں گے۔ گو آپ کی اصل غرض اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے لیکن آپ کی ایثار نفسی عزم استقلال و بنی نوع انسان کی خدمت قابل ستایش و قابل رشک ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی اور کہا مدراس میں ہمارا ایک ایسا اسکول ہے جس میں گونگے اور بہرے تعلیم پاتے ہیں۔ ہم ان کو بات کرنا سکھاتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا اور کوئی ہنر بھی تاکہ وہ اس مدرسہ سے نکل کر بآسانی حصول معاش کر سکیں۔ بار خاطر بن کر نہ رہیں۔ میں نے کہا حقیقت میں

بڑی محنت کرنی پڑتی ہو گی۔

۸ر جون سہ شنبہ۔ آج نہایت شدّت کی ہوا چل رہی ہے۔ ڈک پر جاتے ہی طبیعت پریشان ہوجاتی ہے۔ کچھ طوفان کا سماں ہے۔ کیبن کے روشن دان بند کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ پانی اچھل اچھل کر اندر بھر جاتا۔

۹ر جون چہارشنبہ۔ آج سہ پہر میں جہاز مالٹا پہونچا۔ نیچے اترتے وقت ہم کو پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت ہوئی۔ سیڑھیوں سے متصل ایک سنجیدی کشتی لگادی گئی تھی۔ ہم سب اس میں بیٹھ کر کنارے پر پہونچے۔ ٹامس کُک کی موٹریں تیار تھیں ہم شہر دیکھنے گئے۔ اونچی اونچی پختہ عمارتیں ہیں اور سڑکیں نہایت صاف ستھری ہیں اکثر ان کے دونوں طرف پھولوں کے درخت لگے ہیں۔ شہر کے دو حصے ہیں۔ عربوں کے زمانے کا قدیم بلدہ جو اب تک موسوم بہ مدینہ ہے۔ دوسرے حصہ کو انگریزوں نے بسایا ہے۔ بعض سڑکیں مثل پلوں کے بلندی پر بنی ہیں۔ جس وقت موٹران پر سے گذرتی ہے تو دونوں جانب وادیوں میں ہزارہا مکان۔ کھیتیاں اور باغات دلفریب مناظر پر فضا تھے۔ یہاں کے سنترے اور نارنگیاں مشہور ہوتی ہیں۔ رہنما ہم کو گورنر کے باغ میں لے گیا۔ نہایت شاداب باغ ہے۔ پھول کثرت سے ہیں۔ سیکڑوں قسم کے بڑے اور تر و تازہ۔ رہنما کہہ رہا تھا دو راجاؤں نے جو برائے شرکت تاجپوشی شہنشاہ جارج ششم لندن جا رہے تھے یہاں سے پھولوں کے درخت خرید کر ہندوستان بھیجے ہیں۔ ہم نے سب سے بڑا کلیسا دیکھا۔ تمام سنگ مرمر کے مجسمے رکھے ہیں۔ سینٹ جان اور حضرت عیسٰی کی بہت سی تصویریں ہیں۔ ایک مقام پر ایشیا اور افریقہ کے مجسمے عجیب معلوم ہوئے۔ ایک تو بالکل برہمن کی شکل ہے پیشانی پر قشقے کھنچے ہیں سر پر چٹیا اور دوسری تصویر ایک حبشی کی ہے جس کے ہونٹ موٹے موٹے اور بال گھونگر والے ہیں۔ یہ بہت پرانا گرجا ہے۔ فرش رنگین مرمر کا ہے۔ چھت لاجوردی ہے اور تمام رنگین تصاویر سے مزیّن ہے۔ شہر کی دکانیں اکثر ہندوستانی طریقہ پر سجائی جاتی ہیں۔ ترکاری کی دکانوں پر ہری مرچیں کدو اور پیاز نظر آئی۔

خواتین عجیب غریب لباس پہن کر باہر نکلتی ہیں۔ یوں ہیں سیاہ ریشمی فراک ہوتا ہے اسی میں چھتری لگی ہوتی ہے اس کو "فائیدنا" کہتے ہیں۔ بلا تکلف چلتی پھرتی ہیں۔ کام کاج میں مصروف رہتی ہیں۔

۱۰ر جون پنجشنبہ۔ سہ پہر میں جہاز دو جزیروں کورسیکا اور سارڈینیا کے درمیان سے گذرا۔ پہاڑیاں اور مکانات دکھلائی دے رہے تھے۔ آج دن بھر خفیف ابر دھندلا دھندلا سا رہا۔ مطلع کسی وقت صاف نہیں ہوا۔

ہم نے اپنا سامان جما دیا۔ سوٹ کیس تیار کر لئے۔ کل صبح انشاء اللہ جہاز مارسیلز پر لنگر انداز ہو گا۔ تمام رفقا سمندر سے اکتا گئے لیکن خدا جانے کیوں مجھے بحری سفر مرغوب ہوا۔ الحمد للہ میری طبیعت ٹھیک ہے۔ اب میں صحت یاب ہو چکی ہوں۔

مسز صوفی

غزل

دردِ مستغنیٔ شفا ہیں ہم
اپنی آئی ہوئی قضا ہیں ہم

بھولنے والے یاد کرتے ہیں
بھول جانے کا آسرا ہیں ہم

ہے جفاؤں پہ بھی گمانِ وفا
کیسے نادیدۂ وفا ہیں ہم

دکھ بھری آہیں بے اثر نالے
ایک جہانِ خلا ملا ہیں ہم

ہستی و مرگ کے تصادم کی
ایک موہوم سی صدا ہیں ہم

راز قاسمی

غزل

حفیظ جالندھری

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

ذرّے کا حسن ذرہ نہیں آفتاب ہے
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ زیرِ نقاب ہے

ہے ایک ہی جھلک تو مری جانِ جستجو
کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہے سراب ہے

او مبتلائے زیست ٹھہر خود کشی نہ کر
تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے

روزِ الست کس نے کیا تھا مجھے پسند
میں ہوں یہ میری ہی نگہِ انتخاب ہے

ساقی تری نظر نے یہ کیا کر دیا مجھے
جیسے رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

کب تک رہے گی راز تری جلوہ گاہِ ناز
دیکھوں گا اب اسے جو یہاں باریاب ہے

ہے دستِ محتسب مرا جاں بخش ہجر میں
میں زہر پی رہا تھا وہ سمجھا شراب ہے

نشہ شراب میں ہے نہ مستی شباب میں
اس رنگ سے بہشت میں رہنا عذاب ہے

فکرِ غزل کا اب وہ زمانہ کہاں حفیظ
کہنے کا وقت ہے نہ سنانے کی تاب ہے

(غیر مطبوعہ)

مرسلہ قیصر عثمانی سابق مدیر مجلہ عثمانیہ ورنگل

ترجمہ از رباعیات عمر خیام

(۱)

آئی یہ صدا ہنگامِ سحر میخانہ کا اک کھلتے ہی در
اے مست و خراب دختِ عنب آوارہ و رسوا خستہ جگر
بس جاگ کہ بھرتے ہیں ساغر کیوں سوتے ہو ناحق خوابِ غفلت میں
دیکھ کہیں ہو جائے نہ ترا پیمانۂ جامِ حیات لبریز

(۲)

ہیں گتھی جو شام و سحر کی یہ دنیا آنی جانی ہے
تقدیر کے ہاتھوں انساں کو مہرے کی طرح شطرنج میں آج
گردش میں رکھا ہاں مات دیا یا شہ سے غرض اے دوست
چھپ جانا صندوق میں پھر سب کی آخری منزل شمشانی ہے

جناب بانو بیگم

خرقِ عادت، روحانیت، وجودِ باری تعالیٰ اور اسلام

جنوری ۱۹۳۰ء کے "سب رس" میں مذہبی اعتقادات اور درازیٔ عمر پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ دماغی پستی اور ضعف کا سب سے بہتر علاج کرنے والی چیز مذہب ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہمیں وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے اس قوت کے ساتھ نہیں حاصل ہو سکتی یعنی امید اور یہ وہ امید ہے جس کے بغیر ہماری زندگی تیرہ و تار رہتی ہے۔ مانا کہ بعض خارجی چیزیں بھی ہمارے غموں کو بھلانے میں مدد کر سکتی ہیں مثلاً موسیقی، فنونِ لطیفہ، ادب اور سائنس کے مشاغل یا اگر قوت ارادی بچپن ہی سے مضبوط کی جاتی رہی تو خوف و فکر کے خیالات سے ہم بہت کچھ بچ سکتے ہیں مگر سب سے مقدم میں تو مذہب ہی کو مانتا ہوں۔ اس پر حضرت زور صاحب نے فرمایا کہ آپ پہلے وجودِ باری تعالیٰ، روحانیت اور اسلام پر بھی تو کچھ فرمائیے، اعتقاد اور عمل بعد میں ہوگا، خاص کر خرقِ عادت پر کہ آپ فرقۂ رفاعیت میں بھی تو ایک زمانہ میں گھس چکے ہیں۔ اس کا جواب کچھ آسان کام نہ تھا۔ کہاں میں اور کہاں خرقِ عادت اور یوں ضربیں لگانے میں تو میں کیا، میرے مرکی اور چچیرے بھائی بھی خوب لگاتے ہیں۔ ہمارے حیدرآباد میں حضرت شمس الدین اور حضرت امجد ابھی زندہ ہیں وہاں پہنچیے اور اپنی صدا لگائیے۔ غرض وہ نہ مانے اور میری ہنسی اڑانے کے لئے کچھ لکھوا ہی لیا۔ آمدم برسرِ مطلب۔ خرقِ عادت اس قدر تو عجب نہیں جس قدر سورج، چاند، پہاڑ وغیرہ کا پیدا ہونا۔ وہ غیر معمولی اسباب کی وجہ یعنی عادتِ جاریہ کے خلاف ظہور میں آتا ہے۔ مگر اصولِ فطرت کے خلاف نہیں ہوتا، صرف اس پر کمال غالب ہوتا ہے۔ ابتدائے بچپن سے جیسے پہلے محسوسات پھر تمیز پھر عقل کا زمانہ آتا ہے۔ پھر جس طرح تمیز اور عقل کے مدرکات کے لئے حواس بیکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح قوتِ ملکیہ یا روحانی ادراک کے لئے عقل بے کار ہے۔ عقل صرف یہ ثابت کرتی ہے کہ جس طرح شاعری، صناعی، ایجاد وغیرہ میں فطری درجے ہوتے ہیں، انسان بھی یکساں نہیں ہوتے اور یہ قوت تزکیۂ نفس اور پاکیزگیٔ اخلاق سے حاصل ہوتی ہے۔ خرقِ عادت کو نہ ماننے کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ مگر کیا یہ تمام قوانینِ فطرت ضبط ہو چکے ہیں، نہیں۔ انکشاف ہوتا چلا جا رہا ہے۔ روح کا اقرار بعد از مشاہدات یورپ کی اکثر گذشتہ و موجودہ روحانی سوسائٹیاں کرنے لگی ہیں۔ کامل طور پر یہاں کی طرح مشاہدات کے بعد مانتا ہے کہ (۱) روح جسم سے جداگانہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے (۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علمِ موجودہ کی رو سے غیر معلوم تھیں۔ (۳) روح، حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے۔ یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے۔ (۴) روح آیندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ توہم اور تخیل کا اثر جسم پر پڑتا ہے، جیسے خوشی، وہم، غصہ، خیال وغیرہ۔ پس ہم بجائے مادہ پر مادہ کے ذریعہ اثر ڈالنے کے ان قوائے نفسانی کو قوی کر کے مادے پر وہی اثر ڈال سکتے ہیں نہ صرف اپنے اجسام پر بلکہ مادۂ عالم پر بھی، البتہ اغراضِ حسنہ کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

روحانیت کا ذکر خواہ مخواہ وجودِ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ کرتا ہے، خدا کا وجود عجیب ہے تو اس سے کہیں زیادہ سلسلۂ غیر متناہی عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ پس مجبوراً خدا ایک علت مانا گیا۔ مگر جب اس کے علم و ارادہ پر اعتراض ہوا یعنی یہ کہ حرکت مادہ ہی کا ایک خاصہ ہے تو عالم کے باقاعدہ مرتب اور منظم ہونے کا خیال آیا۔ جیسے کہ الفاظ کو باقاعدہ ملانے سے شعر بنتا ہے۔ اس ملانے والے میں علم و ارادہ ضرور ہوا۔ "گر حکیمے نیست این ترتیب چیست" جس طرح انسان میں مختلف اعضا و جوارح پر روح یا قوت حکمراں ہے اسی طرح عالم کے ہزاروں قوائے فطرت میں توفیق پیدا کرنے والا ایک خدا یعنی عقلِ اول اور قوتِ اعظم ہے۔

مانا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ خدا محسوسات سے بری اور ادراکِ انسانی سے باہر ہے۔ انسان حادث ٹھیرا اور خدائے تعالیٰ قدیم۔ کیا ہم

سب بس

جس کا نہ کوئی مقام ہے نہ جہت نہ جگہ۔ حادث اور قدیم کی بحثیں پڑھ ڈالیں اور جوہر عرض کی داستانیں چھان ڈالیں تو دیکھا کہ مقابلہ عقل و نورِ ایمان کا ہے اور بس۔ سائنس مادہ میں مستغرق ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ میں ہمارے مقالہ سے کوسوں دور۔ مذاہب کی طرف نظر دوڑائی تو جس خدا کو قوتِ اعظم اور عقلِ اوّل مان آئے تھے۔ اُسے کوئی تثلیث میں جکڑے ہوئے ہے۔ کوئی سیکڑوں خدا یا اوتاروں کو مان رہا ہے۔ کوئی ستارہ پرست ہے، کوئی یزداں و اہرمن، دو خدا تسلیم کرتا ہے۔ کوئی خدا کو انسان کے مشابہ مانتا ہے۔ کوئی خدا کو صاحبِ اولاد قرار دیتا ہے۔ اور کوئی ہر دن کے لئے الگ الگ خدا ٹھیراتا ہے۔ غرض جب مذہبِ فطری کی تلاش کی گئی تو اسلام ہی کو ایک ایسا پایا جو عقل ہی سے مذہب کو ماننے کو کہتا ہے اور ایسا اعتقاد پیش کرتا ہے جس کو عقل قبول کرتی ہے۔ یہاں دیکھا کہ سائنس سے علیحدہ رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ایک خدا ہے، قیامت ہے، نیکی و بدی ہے، ثواب و عذاب ہے، دل میں بہت سے وسوسے آئے کہ کاش یہاں نیکی ہی نیکی ہوتی، مگر غور کیا تو ہر برائی کو انسان کی بھلائی کے لئے ضروری اور تابع پایا۔ مثلاً آگ۔ غصہ۔ شہوت وغیرہ وغیرہ۔ کبھی آنکھیں بند کئے چپکے بیٹھے، نہیں تو یہ بھی خیال آجاتا ہے کہ یہاں اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا یعنی "اچھا اور برا" تو وہ کل ہی کہاں سے ہوتا۔ روح کو جب مان لیا تھا کہ فنا نہیں ہوتی تو اب سمجھ میں آیا کہ انسان کی زندگی بھی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ کیا معلوم آئندہ کیا ہو، اور عقل کو سمجھایا کہ تجھے علم ہی کتنا دیا گیا ہے۔ ابھی اور پڑھ، فلسفۂ اخلاق، تزکیۂ نفس۔ الٰہیات، قانونِ معاشرت، اصولِ تمدن وغیرہ سب تجھے قرآن میں ملیں گے۔ اور سن کہ اسلام ترقی و تمدن کا مانع نہیں بلکہ حامل ہے۔ سُن کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

(۱) خدا چاہتا ہے کہ تم پر اپنی نیکیاں ختم کر دے (۲) تمام آسمان اور زمین کی چیزوں کو تمہارا مسخر کیا۔ (۳) خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کئے یہ وعدہ کیا کہ ان کو خلافت دے گا۔ قرآن میں چھبیس[۲۶] جگہ مال کو خدا کا فضل کہا ہے۔ اکیس[۲۱] جگہ خیر بارہ[۱۲] جگہ حسنہ۔ اور بارہ جگہ رحمت کا لقب دیا ہے۔ محض اسلام کی تعلیم نے ان کو اغنیاء، عزم، استقلال اور حوصلہ کا مجسم پیکر بنا دیا۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وآلِ محمد۔ اہلِ حقیقت تاکید کرتے ہیں کہ اسرار عوام پر ظاہر نہ کئے جائیں، کیوں کہ دنیاوی خواہشیں ان میں عام ہیں۔ مادہ روحانیت ماتحت ہے اور مادئیں اس سے بیجا فائدہ اٹھا کر قانونِ فطرت میں رخنہ انداز نہ ہوں گے۔ علت میں بہ نسبت معلول کے مادیت کم ہوتی ہے۔ علت مخفی ہوتی ہے۔ جیسے جسم و جان، عقل و خیال، روحانیت یا غیر محسوسات میں ضرور نہیں کہ رویت کی آٹھ شرطیں موجود ہوں۔ ایک شئے موجود ہو اور نظر بھی آئے۔ فاصلہ ایک شئے کو چھوٹا دکھاتا ہے اور پھر غائب از نظر کر دیتا ہے۔ عالمِ محسوسات (موجودات) کے علاوہ ایک عالمِ مثال بھی ہے جسے ایک خاص طریقہ مثلاً سلطان الاذکار سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ روحانیت کا تعلق اس عالمِ مثال اور اس سے بھی اعلیٰ ایک عالم سے ہوتا ہے۔ منطقی دلائل اور وجدان میں فرق ہوتا ہے۔ شرابی ہی شراب کی لذت جانتا ہے۔ مبتدی کو شراب نہیں چکھتی۔ ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی یقین اور تشفی، حجت سے نہیں ملتی۔ دل میں نورِ ایمان اور خواہش کل کی ضرورت ہے۔ قوتِ متمیزہ ہی پیدا اس لئے ہوئی کہ نیک و بد کو پرکھے، بس "قطعی نیکی" ایک ہی ایمان ٹھیرا۔ اس لئے اول فکر پھر عمل پھر یقین کی ضرورت ہے۔ کرامت سے تو صرف جبری ایمان حاصل ہوگا یعنی گردن پکڑ کر بزور راہِ راست پر لانا۔ یہ اصلی نہیں، اس میں حجت کہاں۔ کیوں حضرت امجد درست ہے نا؟۔

محمد اشرف الحق

غزل

چاہتے ہیں سب کہ تم ظالم ہو قاتل بنو
اور میری آرزو یہ ہے کہ میرا دل بنو

دوست بن جاؤ اگر معشوق بن سکتے نہیں
یا تو دو دل کو سکوں یا خود سکونِ دل بنو

دیکھتے ہو آئینہ لیکن خدا ایسا کرے
اپنی ہی تیغِ ادا کے تم کبھی بسمل بنو

آرزوئے دل کا میری خون کرنا تھا اگر
تم سے یہ کس نے کہا تھا آرزوئے دل بنو

رنگِ عشق و حسن دکھلانا ہے دنیا کو تو پھر
میں اگر مجنوں بنوں تم صاحبِ محمل بنو

چشمِ یار روشن دلِ اشاد لیکن کس طرح
آنکھ میں رہ کر نظر سینے میں رہ کر دل بنو

ہے طلب دل کی تو پھر یہ منہ پہ گھونگٹ کس لئے
شرم کیا معشوق کیوں بنتے ہو تم سائل بنو

دل تو کیا ہے لوگ اپنی جان دیں ایمان دیں
ہاں مگر اتنی گذارش ہے کہ اس قابل بنو

سادگی منظورِ خاطر ہو تو ہو ہر ایک سے
اس قدر آسان ہو جاؤ کہ تم مشکل بنو

اور کیا تم سے کہوں میں اپنے دل کی آرزو
ہو سکے تم سے تو میری آرزوئے دل بنو

دشمنوں کے پاس کیوں جاتے ہو وہ خود سر آئیں
پھر رہے ہو کیوں مسافر کی طرح منزل بنو

ہے جو بدنامی کا ڈر تو ہاتھ میں تلوار کیا
اتنا دل گردہ اگر پیدا کرو قاتل بنو

غیر کا سر اور زانو پر تمہارے واہ وا
ہنس کے سب تم کو بتاتے ہیں سرِ محفل بنو

رندر ندوں میں تو زاہد زاہدوں میں ہو معینؔ
یعنے جس محفل میں جاؤ رونقِ محفل بنو

اعانت جنگ معین الدولہ معینؔ

آہستہ آہستہ

پریشاں ہو گئی واں زلفِ یار آہستہ آہستہ
ادھر ہونے لگا دل بیقرار آہستہ آہستہ

یہ کس کے حسنِ عالم تاب کی تاثیر ہے یارب
چلا دل چھوڑ کر صبر و قرار آہستہ آہستہ

ٹپکتا ہے لہو یاں دیدۂ پرنم سے تھم تھم کر
برستا ہے ادھر ابرِ بہار آہستہ آہستہ

سنبھل اے عندلیبِ زار بے تابی سے کیا حاصل
چمن میں رہ گئی فصلِ بہار آہستہ آہستہ

اے ہوا آواز آتی ہے کفن سے کشتۂ غم کے
لحد پر ڈال دے مشتِ غبار آہستہ آہستہ

بدر النساء بیگم

ترانۂ بہار

شباب ہے بہار کا، گھرا ہوا سحاب ہے — تڑپ رہی ہیں بجلیاں فضا میں اضطراب ہے
ہوائیں سُر بھرے ہیں یا ترانۂ رباب ہے — وفورِ حسن و عشق ہے جہاں تمام انقلاب ہے
شراب ہے شباب ہے، شباب ہے شراب ہے

ہر ایک ذرہ کی زباں پہ داستانِ عشق ہے — کہیں خیالِ حسن ہے کہیں خیالِ عشق ہے
بہار و باغ و یار و مے یہی جہانِ عشق ہے — بہار جانِ حسن ہے شراب جانِ عشق ہے
وہ دن میں آفتاب ہے یہ شب میں ماہتاب ہے

گلوں میں بلبلوں میں اب نہ چھیڑ ہے نہ جنگ ہے — بہار کا یہ فیض ہے شباب کا یہ ڈھنگ ہے
کسی کا رنگ کندنی کسی کا سرخ رنگ ہے — ہر ایک پھول ہو بہو شباب کی امنگ ہے
نہ زیست کا شمار ہے نہ عمر کا حساب ہے

چمن چمن ہے داستاں، صبا کا فیض عام ہے — خزاں! خزاں کا ان دنوں میں ذکر ہی حرام ہے
شباب زندگی پہ ہے نہ صبح ہے نہ شام ہے — کسی کو کوئی غم نہیں بہار اس کا نام ہے
نہ خوف ہے نہ فکر ہے نہ نیند ہے نہ خواب ہے

بچھے ہیں اور سرخ پھول بلبلوں کے پیار سے — صدائے نغمہ آ رہی ہے آج آبشار سے
نسیم خود ہی مست ہے گلہ نہیں ہزار سے — گلوں کی بو لپٹ گئی ہے دامنِ بہار سے
بسی ہوئی ہے سب زمیں یہ فیضِ اکتساب ہے

گلوں کو رازِ عشق کی خبر بھی ہے ذری ذری — سنا رہے ہیں، بلبلوں کو آج وہ کھری کھری
چمن کی ساری کیاریاں گلوں سے ہیں بھری بھری — فلک بھی ہے ہرا ہرا زمیں بھی ہے ہری ہری
شباب کی بہار ہے، بہار کا شباب ہے

گلوں کی اف رے کثرتیں کہ برگ بے نشاں ہوئے — یہ قابلِ بیان ولولوں کی داستاں ہوئے
یہ بلبلوں کی قسمتیں کہ وقفِ آشیاں ہوئے — یہ اوس پی کے ہیں پلے یہ دھوپ میں جواں ہوئے
چمن کا ذرہ ذرہ آج رشکِ آفتاب ہے

شہید یار جنگ شہید

شیطان کی آنت

غیر معمولی قابلیت اور معلومات والے مرد اگر کوشش کریں تو ایک عنوان پر گھنٹوں بول سکتے ہیں لیکن جہاں تک عورتوں کا اس فن سے تعلق ہے وہ "قابلیت اور غیر قابلیت" کی شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ اُنہیں کسی خاص عنوان کی بھی ضرورت نہیں۔ اور گھنٹوں بولنا تو اُن کے آگے ایک معمولی سی بات ہے۔ اگر انسان کے ساتھ کھانے پینے اور سونے جیسی ضروریات نہ لگی رہتیں تو ہفتوں مسلسل بول سکتیں۔ بعد میں کوئی اس لمبی چوڑی تقریر کو کسی عنوان کے تحت لانے کی کوشش کرے بھی تو دنیا کی کسی زبان میں ایسا لفظ یا کلمہ نہیں ملے گا جو اُن کی مقصد براری کر سکے۔

بقول کسے عورتوں کی زبان کا حال بھی بالکل ریس کورس کے گھوڑوں کا سا ہے۔ جس طرح جوکی کا وزن جتنا کم ہو اتنی ہی اُس کی دوڑ تیز ہوتی ہے اسی طرح بات جتنی بے قدر و قیمت ہو ان کی طراری میں اتنا ہی زور پایا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ گھر کی چار دیواری میں بند رہتی ہیں، روزمرّہ کے کاروبار میں مردوں کی طرح بولنے چالنے کا موقع نہیں ملتا پھر بھی ہے کوئی مائی کا لال جو مرد جوان سے وہ وہ بات بھی کر لے! اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ جیسی تو مرد کی لسانی کی مشق کے کافی مواقع ملنے پر بھی عورتوں کی طراری کے آگے تاب مقاومت نہیں۔ یا تو بات یہ ہے کہ گھر کے باہر سودا سلف کے لین دین، سرکاری کام کاج کے سلسلے اور کسب معاش کی دوڑ دھوپ میں انہیں بہت کچھ قوت ناطقہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ اور روز بروز ان کی زبانوں کے رگ پٹھے ڈھیلے ہوتے جاتے ہیں۔ یا پھر یہ ہے کہ عورتوں کی زبانوں میں قدرت ہی کی طرف سے چند ایسے عناصر رکھ دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے وہ صنفِ قوی کی زبانوں سے قوی تر ہیں۔ ضرور ان دونوں زبانوں کی ساخت اور تماش میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ غالباً جتنی قوت مرد کے ہاتھوں کو بخشی گئی ہے اُس قدر طاقت عورت کی زبان کو عطا ہوئی ہے۔ ایک طبقے کا ہاتھ چلتا ہے تو دوسرے طبقے کی زبان چلتی ہے۔

کسی تقریب میں ہزار مردوں کو دعوت دینا اور مٹھی بھر عورتوں کو بلانا قطعِ نظر اخراجات کے برابر ہے۔ بلکہ جتنی گڑبڑ زنانے میں مچی رہتی ہے مردانے میں اُس کی عُشرِ عشیر بھی نہیں رہتی۔ مردوں کا کیا ہے آئے 'سلام علیک ہوئی' کھائے پیئے اور چلتے بنے۔ یہاں مدتوں بعد ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ بولنے کے لئے مواد پکا پکایا موجود ہوتا ہے پھر کیا ہے اپنی رام کہانی شروع کرتی ہیں۔ ایک کے بچے نے "میں" کی تو ماں نے سہیلیوں سے کہا بہن لونڈے نے صورت کیا باپ کی پائی ہے گُن بھی وہی نکالے ہیں۔ چڑچڑا پن۔ ضد۔ ہٹ۔ غصہ کا نہ باپ ہی کی طرح ہے۔ ہاں تمہیں پرسوں کا واقعہ تو سنانا بھول ہی گئی۔ شنو نے چائے دان ہاتھ سے گرا کر توڑ دیا۔ چائے کا سٹ خریدے ہوئے پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے۔ اتنا خوبصورت سٹ کہ میں کیا کہوں تشتری کی گلابی رنگ کا حاشیہ۔ پیالیوں پر انگور کے رنگین خوشے اترے ہوئے۔ اتنا من بھاتا سٹ کہ اب تک میری کوفت نہیں ہٹی۔ ایک دن سوئیاں بٹنے والی گھر کی طرف آنکلی۔ میں نے اس کمبخت بابی شیخو سے بلا لانے کے لئے کہا۔ قیمت پر گھنٹہ بھر تکرار رہی۔ پہلے تو اس نے کہا ساڑھے پانچ روپیہ' پھر اُتارتے اُتارتے چار روپیہ پر راضی ہو گئی۔ احمد کے باپ کچہری گئے ہوئے تھے۔ میرے پاس بھی پیسے نہ تھے۔ سامنے زری کی ایک پرانی قمیض تھی وہی دیکر سٹ خرید لیا خدا جانے اس موئے نے کن ہاتھوں سے چائے دان اٹھایا تھا کہ باورچی خانہ کی دہلیز پار ہوتے ہوتے چھن سے چھوڑ دیا۔ ..... میں اس وقت بازو والے گھر کی ماما سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی بیگم صاحبہ نے اپنے میاں کی خواہش پر مچھلی پکانے کا حکم دیا ہے۔ بگھار کا سامان لانے بازار جا رہی ہے۔ بیگم صاحبہ نے ایک روپیہ سودا لانے کے لئے دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ آٹھ آنے سے زیادہ خرچ نہ کرے ..... میں اس کی باتیں سن ہی رہی تھی کہ چائے دان کے ٹوٹنے کی آواز سے چونکی۔ اُٹھ کر دیکھتی ہوں تو چینی کے ٹکڑے دہلیز اور سیڑھیوں پر بکھرے پڑے ہیں۔ آخر مال اپنا ہے۔ کس کو غم نہیں ہوتا۔ مارے غصے کے میں بھی جھنجلا اٹھی اور اُس لاپرواہ چھوکرے کی خوب خبر لی۔ میں نے پہلے دن ہی اس کی صورت دیکھ کر تاڑ لیا تھا کہ اس لونڈے سے گھر کا کام کاج نہ سنبھالا جائے گا۔

سب پیس
آرام طلب اور کاہل معلوم ہوتا ہے۔ کبھی اُس کی ماں کی عاجزی منت سماجت سے رحم آگیا اور میں نے "اُن" سے اُس کے نوکر رکھنے کی سفارش بھی کی
"وہ" ہمیشہ نوکروں کو ضمانت پر ملازم رکھنے والے میری سفارش پر اپنی شرط سے بھی باز آئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ جلا مرگ ایسا پاجی نکلے گا...... یہ چائے دان کا
ٹوٹنا تو خیر ایک ابھی کی بات ہے۔ اس کے پہلے کئی چینی کے برتن اس کی لاپروائی سے ٹوٹ گئے...... دنیا کے نوکروں کا کام ہوتا ہے۔ صبح تڑکے اٹھتے
ہیں جھاڑو جھٹکار دیکر سولے گلاس لے منھ کو ہر کاروں کی بیداری کا انتظار کرتے ہیں۔ اس موے کی نیند کو تو کچھ پوچھئے ہی نہیں... ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے ساری جوانی اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ مستی کا یہ عالم تھا کہ بستر سے اٹھ کر گھنٹہ بھر انگڑائیاں لینے میں گذر جاتا ہے...... بوا بہن اگر ایسے نوکر کو
اس کے قصور پر مار اتو ڑا تو کیا بیجا کیا۔ اُن کو دیکھو آتے ہی آتے لونڈے کی حمایت پر تل آئے۔ مجھے سخت و سُست کہنا شروع کر دیا... کہ تم کو ملازمین
کے ساتھ برتاؤ کرنا نہیں آتا... جیسے آپ تو نوشاہ کی اولاد ہی سے ہیں۔ اوپر سے کہتے ہیں چائے دان ٹوٹ تو کیا ہوا۔ غریب کو ٹھوکر لگی وہ تو کہو خود
مرتا مرتا بچ گیا... جیسے لاٹ صاحب کو اپنے پیسے کا تو کچھ درد ہی نہیں... کیا میں نے قاروں کا خزانہ اپنے جہیز میں لایا ہے یا خود انہیں روپیوں کے
درخت لگانے آتے ہیں بات کیا ہے... ساری ملامت میرے ہی سر تھوپ رہے ہیں کہ میں نے لڑکے کو خواہ مخواہ مارا۔ اور بندۂ خدا اس نمک حرام
کو ذرا ڈانٹ بھی نہیں بتلاتا کہ تو نے کیوں دیکھ بھال کر قدم نہیں رکھتا..... میں بھی آخر انسان ہوں کہاں تک صبر کرتی۔ بولی کہ نوکروں ہی سے تمھارا
کام کمل جاتا ہے تو پھر بیوی کی کیا ضرورت ہے۔ جٹکہ منگوا دو میکے چلی جاؤں گی۔ نوکروں کے منہ کے سامنے مجھے اپنی ذلت گوارا نہیں... بہن مجھے
کسی سے کچھ گلا نہیں۔ رونا ہے تو اپنی قسمت کا کہ ماں باپ نے جانتے بوجھتے کنوئیں میں جھونک دیا... بڑی خالہ نے اول ہی اس پیام کی مخالفت
کی تھی کہ خاندان کے باہر لڑکی دینا خطرناک بات ہے۔ کوئی اچھی طرح لڑکے کے اطوار و معادات سے واقف نہیں ہو سکتا... لیکن قسمت میں غم لکھا تھا
تو اس کا کیا علاج..... جیسے خاندان میں لڑکوں کا کال ہی پڑ گیا تھا.... چراغ لیکر تلاش کرنے کی ضرورت پڑی تھی... بات در اصل یہ تھی کہ
مال و دولت دیکھکر ہمارے ماں باپ کے منہ میں پانی آ گیا۔ اور جیسے لڑکی کے واسطے صرف دولت ہی کی ضرورت ہے۔ مجھے ان کے پلے ڈال دیا...
ہاں تو دیکھا میں نے جٹکے کے لئے کہا تو فوراً شبو کو بھیج پھاٹک پر سواری منگوا کر کھڑی ہی کر دی۔ اور اپنے کمرے سے آواز بھی دے رہے ہیں کہ جٹکہ
آ گیا تیار ہو جاؤ..... اس سے پہلے کہ میرے کہنے سے سواری منگواتے مجھے مناتے۔ سمجھاتے خفگی کی وجہ دریافت کرتے۔ اپنی غلطی پر ندامت ظاہر کرتے
یہاں تو کچھ نہیں۔ وہی اپنی اینٹھ اور اکڑ بازی...... زہر کھاؤں گی... میکے چلے جاؤں گی..... ابا کو خط لکھدوں گی.....
بیویاں ہزار کہتی ہیں کیا ان کا منشا خودکشی کرنے کا یا بھاگ جانے کا تھوڑی ہوتا ہے۔ یہ تو ایک بیویوں کی بات ہے جس کے سمجھنے کے لئے مردوں میں بڑی ہی
ضرورت ہے.... میں حیدرآباد میں.... باوا جان کلکتہ میں... بھلا جٹکے میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی... آخر اپنا سا منہ لیکر اپنے کمرے ہی میں بیٹھ رہی
اور امجد کے ہاتھ دو آنے بھیج جٹکہ واپس کر دیا..... ایسے جینے سے باز آئی۔ میں تو کہتی ہوں اب اور اس وقت مجھے موت آ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔

دیکھا آپ نے! بیگم صاحبہ نیچے کی "نیں" سے چلی تھیں اور کدھر کدھر سے ہوتے ہوئے کہاں پہونچ گئیں۔
غیبت کرنے بیٹھ جائیں گی تو زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیں گی۔ ایک ہی بات دس جگہ بیان کریں گی اور دس طریقوں سے بیان کریں گی
ایک چیز کی کہیں تعریف تو اسی چیز کی دوسری جگہ مذمت۔ ایک بات کی کہیں تائید تو اسی بات کی دوسری جگہ تردید..... شادی بیاہ میں انہیں
لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ مہر جوڑے یا جہیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ سخت سست گفتار نہ ہو۔ دعوت کھانے میں مزا نہیں ملتا جب تک کہ پکی ہوئی
چیزوں میں نقائص نہ نکالے جائیں۔
تقریبوں اور ملاقاتوں میں جا کر کافی مدت کے لئے بولنے کا مواد فراہم کر کے لاتی ہیں۔ مہمانوں کے ناک نقشے۔ لباس اور زیور کی نسبت

کوئی ایسی بات نہیں رہ جاتی جس کا وہ گھر آکر ذکر نہ کرتی ہوں۔ دوسروں کے لباس اور زیورات کی تعریف کر کر کے اپنے شوہروں کو غیرت دلاتی ہیں۔ صورتوں کا ذکر بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ اپنے شوہروں کے سامنے ایک ایک کا چہرہ اس وضاحت کے ساتھ بیان کریں گی کہ کوئی خالی چھوٹنے نہ پائے

اور اگر کسی خوبصورت مہمان کا ذکر ہو رہا ہو تو اس کے حسن کی تعریف میں یہ رعایت مدنظر رکھی جاتی ہے کہ شوہر کے دل پر اس سُنی سنائی شکل کا کوئی اثر نہ پڑ سکے۔ نہیں تو خود ایسی ویسی ہی لیکن شوہر کے سامنے کسی حسین عورت کا ذکر کریں گی تو اس کے حسن کو کسی طرح اپنے حسن سے بڑھنے نہ دیں گی..... چہرہ میری طرح کتابی ہے لیکن اس کا ذرا لمبوترا پن آ گیا ہے... گوری گٹی اچھی ہے مگر رنگ میں ملاحت نہیں.... ہاں آنکھیں بڑی نفیس ہیں، میری آنکھوں کو چھپا دُ اس کی آنکھوں کو نکالو..... اب ذرا شوہر اس اچھی صورت والی کی نسبت کچھ بار بار دریافت کرتے لطف تو جب ہی آتا ہے۔ فوراً پیشانی پر بھی بل جاتے ہیں۔ ناک بھوں چڑھا کر کہتی ہیں ایک دفعہ تو کہدیا کہ صرف رنگ گورا چٹا ہے ناک نقشہ تو ایسا ہی ہے... ہنستے وقت دانت تو ایسے بُرے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے پھاوڑے جا دئے ہیں..... بظاہر تو نہیں معلوم ہوتا لیکن غور سے دیکھو تو آنکھ چھوٹی بڑی ہے.... اُن کے حسن کا بڑا شہرہ سنتے تھے۔ بس دیکھ لیا (اپنی بچی کی طرف اشارہ کر کے جو اپنے سے کسی قدر بد شکل ہے) ہماری تصو کہیں اچھی ہے غرض ذرا شبہ ہو گیا کہ شوہر صاحب کے دل پر دوسری کی خوبصورتی کا کچھ اثر ہو گیا ہے تو پھر دیکھئے اس غریب کے نقائص کو مبالغہ کا ملمع چڑھا چڑھا کر اس طرح بیان کریں گی کہ اگر کوئی مصور اس بیان کے مطابق تصویر کھینچے تو "ڈائن" کی شکل اتر آئے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ شوہر کے چہرے پر شکلِ مذکور کی طرف سے نفرت کے جذبات نمایاں نہ ہو جائیں!

گاہے ماہے سیاسی باتیں بھی ہوا کرتی ہیں.... اخبار میں دیکھ لیا کہ ملک معظم ایڈورڈ ہشتم تخت سے دست بردار ہو گئے.... سنا ہے بڑا لاٹ تخت سے اتر گیا.... محبت ہو تو ایسی ہو۔ ملک دولت، عزت سب کچھ ہاتھوں سے چلی جائے لیکن عورت نہ جائے ہمارے ملک کے بھی مرد ہوئے ہیں۔ کہ گھر میں کوئی جوان کالا ٹھ نوکر ہوئی کہ بیوی کی طرف سے آنکھیں پھرنے لگی۔ اور مجال ہے کہ کوئی اُس کو کسی بات پر آنکھیں دکھا سکے۔ فوراً سرکار پشتی لینے موجود۔ کم از کم اب بھی یہ بے شرم انگریزوں سے سبق سیکھیں..... یہی وجہ ہے۔ دیکھو کہ ہندوستان کی حکومت ان موؤں کے ہاتھ سے نکل گئی۔

ان علمی مباحثے بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ کھیل حزنیہ ہو تو سینما ہال سے آنسو پونچھتی نکلتی ہیں۔ کھیل کے دوران میں ارے ارے ارے "ہائے ہو" کی برابر آواز بھی آتی رہتی ہے۔ گھر آ کر نہایت ہی غمناک صورت بنائے ہوئے سارے واقعات کا اعادہ کریں گی۔ ایک ہفتہ بعد تک شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں۔ ہیر رانجھا۔ یا اس قسم کے کسی اور بدنصیب عاشق و معشوق کا غم ان کے دلوں سے نہیں جاتا......... وہ بڑھیا بڑی خبیث تھی۔ .....کم بخت کو..... فرہاد کو جھوٹی خبر سنا دی کہ شیریں مر گئی..... وہ شاہ پور تھا ساری فساد کی جڑ..... ارے وہ خسرو جانا مرگ کیا کم تھا وعدہ کیا تھا تو پورا کرنا تھا وغیرہ وغیرہ۔

اکثر اوقات تو بالکل ہی مہمل باتوں پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں اور اگر کوئی کام کی بات نکل بھی گئی تو اس کا بے کار پہلوان کی گفتگو سے تعلق ہوتا ہے۔ خدا کے فضل سے یہ مسئلہ اب کل ہندی نہیں رہا تعلیم نسواں کی ترقی سے عورتوں کی باہم گفتگو کے ان تمام نقائص کا تو ازالہ ہو ہی رہا ہے۔ کبھی غیر تعلیم یافتہ طبقے میں بھی بعض اللہ کی بندیاں ایسی ہیں جو اپنے گھر کی بات کسی اور کے کانوں پڑنے نہیں دیتی۔ حتی الامکان بیکار باتوں سے پرہیز کرتی ہیں۔ پڑھنا لکھنا نہ آئے بھی تو اپنے شوہروں، بھائیوں اور تعلیم یافتہ بہنوں ہی سے موجودہ زمانے کی روش اور دنیا کا حال دریافت کر کے اس کی نسبت صحیح معلومات رکھتی ہیں۔ مگر سوال یہاں اکثریت اور اقلیت کا ہے۔ مٹھی بھر روشن خیالوں کی موجودگی اپنے صنف کے دامن سے اسی کمزوری کے دھبہ کو نہیں مٹا سکتی

اے کاش! ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں، ملاقاتوں تقریبوں اور گھروں میں فضول اور بیکار باتوں سے پرہیز کریں۔ اپنی ذہانت بچوں کی تعلیم و تربیت میں دکھلائیں۔ اپنے طبقے کے خیالات اور عقائد کی درستی میں طراری برتیں۔ اور اپنے گمراہ شوہروں کی اصلاح میں قدرے صلح آمیزی کے ساتھ اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کریں!

محمود قطبی

بھکارن

سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی بھکارن نے اپنے نادان اور معصوم بچوں کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گردن جھکالی۔ اس وقت اُس کے نیلے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"بدنصیب بچو! تم میری کوکھ سے کیوں پیدا ہوئے؟ کیا دنیا میں تمھارے لئے کوئی اور ماں نہ تھی؟"

"لوگ بڑے ہو کر کماتے ہیں اور کھاتے ہیں، تم بڑے ہو کر مانگو گے اور ذلیل ہو گے۔" تمھارے لئے اس پرسکون دنیا میں کوئی امید نہیں۔ آسمان تمھیں زمین پر رینگتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے جیسا کہ بچارے کیڑے رینگتے ہیں!

"تم ان کچی سڑکوں پر سونے کے لئے پیدا ہوئے ہو، جن پر عورتوں کی گاڑیاں بھی نہیں چل سکتیں۔ تمھاری قسمت میں پہننے کے لئے وہ چیتھڑے لکھے ہیں، جنھیں کنگال بیکار سمجھ کر اپنے گھروں سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ دنیا کی نعمتوں میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تمھاری دولت تمھاری ماں کی دعائیں ہیں، مگر وہ دعائیں بھی دنیا سے پیسہ مانگنے میں اکارت ہو جاتی ہیں۔

"میرے بدنصیب بچو! تمھارے لئے تمھاری ماں کی دعائیں بھی نہیں بچتیں۔ اُس کے پاس فقط ٹھنڈی آہیں اور گرم آنسو ہیں اور وہ بھی بے اثر"

یہی بھکارن کے بچوں کی دولت ہے۔

سدرشن (ترجمہ غلام رسول)

پروازِ تخیل

اللہ رے پروازِ تخئیل تماشائی
نظارۂ فطرت خود لینے لگا انگڑائی

اللہ رے شبِ وعدہ وہ آئے نہ نیند آئی
اب دیکھئے کٹتی ہے کیوں کر شبِ تنہائی

اِس حسن خرامی نے اک روح نئی بھر دی
جلووں کی کھلی آنکھیں مستانہ بہار آئی

انوارِ معانی کی پوچھو نہ لطافت کو
بیتاب ہے نظارہ بے خود ہے تماشائی

جذباتِ وفا شاید تکمیل کو آپہونچے
جب عشق تھا سودائی اب حسن ہے سودائی

دیکھو تو قمر اٹھو شاید کوئی آتا ہے
دنیائے تمنا میں پھر تازہ بہار آئی

جمیلہ خاتون قمر (کلکتہ)

ہمارا افلاس

ہماری موجودہ معاشرت کی ترقیاں اور فیشن پرستیاں زندگی کے ہر شعبہ میں گرانی اور افلاس کے اسباب پیدا کر رہی ہیں۔ ایک طرف مغرب کی اندھی تقلید اور طرزِ معاشرت ہماری زندگی کے معیار کو بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف ہماری مالی حالت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو مسلسل گرا رہی ہے اور ہماری زندگی میں نت نئی مشکلیں اور آفتیں پیدا کر رہی ہے۔

دورِ جدید کی دلفریب طرزِ زندگی میں ہم کچھ ایسے کھو گئے ہیں کہ اقسام کی بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کو بالکل جائز اور مباح سمجھنے لگے ہیں۔ اپنی فیشنیبل زندگی کی ضروریات کے لئے خواہ کسی ذریعے اور طریقے سے ہو ہم حصولِ زر میں پس و پیش نہیں کرتے۔ نیت بگاڑنے کچھ دیر نہیں لگتی۔ عزت و آبرو پر دھبہ لگ رہا ہے ــــ پرواہ نہیں! نیک نامی خاک میں مل رہی ہے ــــ مضائقہ نہیں!! برسوں کا خاندانی وقار بدنامی کے بھنور میں ڈگمگ ڈگمگ کر رہا ہے ــــ ٹس سے مس نہیں ہوتے!!! ظلم سے، جبر سے، دھوکے سے، فریب سے، جھوٹ سے، بے ایمانی سے، ضمیر فروشی سے، غرض کہ کسی طرح بھی ہو روپیہ ملے اور اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خواہشیں اور فیشنیبل زندگی کی ضرورتیں خاطر خواہ پوری ہوں۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہماری قوم میں صرف روپے کا ہی افلاس نہیں ہے، اپنی زندگی کی آئے دن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے سلسلہ میں ہر قسم کے افلاس سے ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے۔ نہ ہم میں خودداری رہی نہ عزتِ نفس، نہ شرافت رہی نہ دیانت داری، نہ اخلاق رہے نہ کردار، نہ ایمان رہا نہ ضمیر!!! عزت کا، شرافت کا، خودداری کا، دیانت داری کا، غرض کہ ہر قسم کا افلاس ہم پر مسلط ہے۔ ہر طرف سے ادبار و نکبت کی گھٹائیں ہم پر چھائی ہوئی ہیں مگر ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم کچھ ایسے سو رہے ہیں کہ

حشر تک جاگنا قسم ہے!

ہم اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں خواہ مخواہ گراں بنا رہے ہیں، لغویات کو ضروریاتِ زندگی میں داخل کر رہے ہیں، خرافات کو زندگی کا لازمہ سمجھ رہے ہیں اور اس طرح سادہ زندگی کی برکتوں اور مسرتوں سے خود کو محروم کرتے جا رہے ہیں۔ اپنی شخصیت کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر ظاہر کرنے کا خبط اور سودا کچھ ایسا ہمارے سر میں سما گیا ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنے آپ کو ہر طرح ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔

اپنی روز افزوں ضروریاتِ زندگی کی خاطر ہم اپنی آمدنی کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں اور جب ہم اپنے ضمیر اور ایمان کا خون کرنے کے بعد ناجائز آمدنی پیدا کر لیتے ہیں تو وقت پر ہماری ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں مگر حقیقی مسرت اور باطنی خوشی رفو چکر ہو جاتی ہے کیونکہ سچی خوشی جائز آمدنی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ناجائز آمدنی سے وقتیہ مسرت تو ہوتی ہے مگر اطمینانِ قلب ہرگز نصیب نہیں ہوتا، ہر وقت فکر دامنگیر رہتی ہے کہ معلوم نہیں کس دن بے ایمانیوں کا بھانڈا پھوٹ پڑے اور ذلت و خواری نصیب ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہم ہر وقت اور ہر جگہ حقیقی مسرت اور اطمینانِ قلب سے محروم رہتے ہیں۔ جب تک ہم اپنی معاشرت اور زندگی میں سادگی نہ پیدا کریں اور خرچ کو آمدنی کی مناسبت سے نہ گھٹا دیں۔ ہم میں ہر قسم کے افلاس کا اسی طرح دور دورہ رہے گا، دین و دنیا دونوں جگہ ہم ذلیل و خوار رہیں گے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!

جن اقوام کی تقلید میں ہم اپنے معیارِ زندگی کو بلند کر رہے ہیں ان کے نقطۂ خیال اور مقصد پر ہماری نظر پڑتی ہی نہیں، مغربی قومیں جس طرح اپنی ضرورتوں میں اضافہ کر رہی ہیں اور اپنی زندگی کے معیار کو اونچا کر رہی ہیں، اسی طرح ان میں کسبِ معاش کا خیال بھی ترقی کرتا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں وہ اپنی زندگی میں تنوع پیدا کرنے کے علاوہ اپنے بنی نوع کی امداد و اعانت کرنے کے قابل ہوتی جا رہی ہیں اور بتدریج اپنی قوم سے بے روزگاری کو نکال باہر کر رہی ہیں۔ اُن میں تجارت، زراعت، یا صنعت و حرفت کے کسی پیشہ کو اختیار کرنا قطعاً عار نہیں سمجھا جاتا اور ہم اس قسم کے کام یا پیشے اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں مگر اپنی گراں معاشرت اور تعیش پسند زندگی کی خاطر دوسروں کو دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا، ضمیر کا خون کرنا، خیانت کرنا، اور اقسام کے ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنا اور باوجود ان ساری بے ایمانیوں اور چالبازیوں کے ایک دن قرض خواہوں کی ڈگریوں میں اپنے آبا و اجداد کی جائدادیں نیلام چڑھوانا شانِ وضعداری خیال کرتے ہیں۔

جب تک ہم اپنے خرچ کو اپنی آمدنی کے اندر نہ رکھیں ہماری آمد و خرچ کا توازن کبھی قائم نہ رہے گا اور اس توازن کو جائز اور شریفانہ طریقے سے برقرار رکھنے کی ایک ہی تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے ضروری مداتِ خرچ کا تعین کریں اور اس امر کا لحاظ رکھیں کہ آمدنی کا کتنا فیصد کس مد پر صرف کیا جانا چاہئے اور کتنا غیر مرئی آنے والی ضرورتوں کے لئے مد محفوظ میں رہنا چاہیئے، اس طرح اگر ہم اپنا موازنہ بنالیں اور اپنی زندگی کے معیار کو اپنی آمدنی کے لحاظ سے گھٹادیں تو ہمارا افلاس بڑی حد تک دور ہو سکتا اور زندگی کی حقیقی مسرتیں ہمیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

مرزا سیف علی خاںؔ

پریم راگ

بتو! غیر کے تم اگر ہو تو کیا ہے
ہمارے بھی سر پر ہمارا خدا ہے

سما جاتی ہے حسن کی تجھ میں دنیا
ترا ظرف آئینہ کتنا بڑا ہے

شرارت سے ٹھکرا کے اے جانے والے
ترا نقشِ پا بھی عجب نقشِ پا ہے

بتو تم میں اور ہم میں ہے فرق اتنا
خدائی تمہاری ہمارا خدا ہے

بڑی چیز ہے میری تردامنی بھی
مری سمت اے شیخ کیا دیکھتا ہے

مرا حال سنتے ہی رو دیتے ہیں وہ
یہ قصہ ہی کچھ ایسا حسرت فزا ہے

بڑے کام کی چیز ہے دل ہمارا
حقیقت نما اک یہی آئینہ ہے

ترے صدقے اے اضطرابِ محبت
تڑپنے میں بھی کیا کہوں کیا مزا ہے

ہے نذرِ فنا آمد و شد نفس کی
جو آیا تھا کل آج وہ جا رہا ہے

تقی کس توقع پہ زندہ رہوں میں
جو دل کا ہے مالک وہ مجھ سے خفا ہے

تقی عابدی

رضیہ کے نام

پیاری بہن رضیہ سلام مسنون

اب کی دفعہ آپ نے تو خط لکھنے میں بڑی دیر لگائی۔ اگرچہ میں یہ سمجھی ہوئی تھی کہ امتحان کی تیاری نے آپ کو خط لکھنے سے باز رکھا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی بے لوث دوستی و سچی محبت نے مجھے ہمیشہ بے چین رکھا۔ آس پاس کے گھروں پر جب کبھی ڈاکیہ کی آواز سنائی دیتی تو میں غیر ارادی طور پر اپنی مصروفیت سے رُک کر اُس طرف متوجہ ہو جاتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ آج بہن رضیہ نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لیکن جب وہ چپ چاپ چلا جاتا تو مایوس ہو کر پھر اپنے کام کاج میں لگ جاتی۔ واقعی بہن آپ نے تو اب کی دفعہ خط کے لیے ہمیں بہت ستایا ہے اور دل چاہتا ہے کہ ہم بھی اس کا جواب دیر سے دے کر آپ کو خوب ستالیں۔ لیکن آپ نے اس خط میں مجھ سے ایک ضروری مشورہ طلب کیا ہے اس لئے میں اپنے اس ارادہ کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتی ہوں۔

بہن رضیہ۔ ۔ ۔ اس موجودہ تعلیم کے درجہ کو ختم کرنے کے بعد آئندہ کس قسم کی تعلیم حاصل کی جائے یہ ایک ایسا اہم سوال ہے جس کا جواب مجھ جیسی ہیچمیرز کی طاقت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ آپ اس خصوص میں اپنی دوسری بہنوں سے جو مجھ سے بدرجہا بہتر و برتر ہیں استمزاج فرماتیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہر کام میں مشورہ کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالٰے نے رسول مقبول صلعم کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے اگرچہ حضور صلعم سے بڑھ کر کوئی صاحب فہم و ذکا نہیں تھا لیکن پھر بھی مشورہ کا حکم ہے اور سرور کائنات ہر کام میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ فرماتے ہیں "مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَنْ مَشْوَرَةٍ" یعنی مشورہ کر لینے سے انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا چونکہ طلب علم ایک بڑا اور سخت کام ہے اس لئے اس میں مشاورت ضروری اور واجب ہے لیکن بہن ہمیشہ ایسے افراد سے مشورہ لو جو باخدا اور صاحبِ عقل ہیں۔ آپ نے مجھ سے اس قدر اہم سوال کرنے میں میری نسبت بہت زیادہ حسن ظن سے کام لیا ہے۔ میں آپ کی اس عزت افزائی کی بے حد مشکور ہوں۔ بہن جب تم نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے تو میں بھی اسے اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں کہ اپنی بساط کے موافق اس کے متعلق میرے خیالات کو آپ پر واضح کروں۔

بہن رضیہ موجودہ تعلیمی درجہ کو ختم کر لینے کے بعد یوں تو سب ہی پیشے اور فنون اچھے اور سیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً طب، معماری (انجینیری)، صناعی، برقی، وکالت، وغیرہ۔ لیکن ابھی یہ پیشے اور فنون اس ملک کی خواتین میں اس قدر عام نہیں ہوئے جس کو سیکھ کر ہماری صنف خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکے۔ البتہ ان سب میں مجھے ایک فن ایسا نظر آتا ہے جس کا سیکھنا بالخصوص ہماری صنف کے لئے لابدی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی وہ فن علم طب ہے کیونکہ یہ بھی مثل دیگر اسباب ضروریہ کے قیام صحت کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے دوا دارو کرنا ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صرف دو ہی علم سیکھنے کے قابل ہیں ایک علم فقہ مذہبی درستی اور وسعت معلومات کے لئے دوسرا علم طب صحت جسمانی اور دفع امراض کی غرض سے۔ ان کے علاوہ باقی کل علوم صرف رونق مجالس کے لئے ہیں نہ ان کا مذہب سے کوئی تعلق ہے اور نہ جسم سے۔

سب سے بڑی ضرورت اس علم کے حاصل کرنے کے لئے میں اس وجہ سے محسوس کر رہی ہوں کہ اس فن کے جاننے والی خواتین خصوصاً مسلم طبقہ میں بہت کم یا یوں کہو کہ بالکل نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ سب پر روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ ہماری بہنیں علاج معالجہ کے لئے سخت پریشان اور سرگرداں نظر آتی ہیں۔ کئی بہنیں تو اب تک خاطر خواہ علاج نہ ہونے کی وجہ سے موت کا شکار ہو چکی ہیں اور کئی بستر مرگ پر پڑی سسکیاں لے رہی ہیں۔ کوئی خاتون ان کے ساتھ سچی ہمدردی کرتی ہوئی دکھلائی نہیں دیتی۔ اکثر و بیشتر بہنیں اس فن کی قابل ماہرہ میسر نہ ہونے کے باعث اس قدر ہراساں و

پریشان ہیں کہ ان کی حالت کا یہاں ذکر کرنا خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرنا ہے۔ یوں تو اس ملک میں قابل ڈاکٹروں کی کمی نہیں لیکن یہ طبقہ بوجہ شرم و حیا جو اس کا خاص جوہر ہے اس طرف زیادہ رجوع ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ غرض اس فقدان کی وجہ سے ہماری بہنوں کو طبی مشورہ کے لیے جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ اب ہر بہن کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی امداد و اعانت کے لئے تیار ہو جائے۔ ان کی حالت اب اس قدر قابل رحم ہو گئی ہے کہ اگر اس وقت ان کی دستگیری نہ کی گئی تو یقین مانئے کہ اس طبقہ کو ایسا نقصان پہنچے گا کہ جس کی تلافی ناممکن ہو جائے گی! اس لئے میں اپنی ہر بہن کو جو مجھ سے اس بارے میں استفسار کرے گی۔ یہی رائے دوں گی کہ وہ فن طب سیکھے۔

اور بہن رضیہ آپ کے لئے بھی میری یہی رائے ہے کہ آپ بھی اس کے بعد فن طب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ تاکہ آپ کے اس فن سے ملک کی سیکڑوں بہنوں کو جنھیں فی الواقعی اس قسم کی اعانت کی ضرورت ہے فائدہ پہنچے گا۔ اپنی بہنوں کی خدمت بھی خدا کی خدمت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت کے صلہ میں متاع دنیا اور فلاح دین دونوں دولتوں سے مالا مال کر دے۔ بہن رضیہ آپ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں سوچو اور اپنے دل سے پوچھو کہ آخر وہ کیا کہتا ہے اور وہی کرو جس کے کرنے کے لئے وہ آمادہ ہے۔ ہم نے انہیں ارادوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھا ہے جس پر حضرت دل نے صاد کیا تھا۔

واسع النساء بیگم (زمانہ کالج ملم پلی)

من موہن

من موہن میں جیا لگا ہے

پھر برکھا کی راتیں آئیں
کالی کالی گھٹائیں چھائیں
کوئل نے پھر تانیں سنائیں
ساون ماس اب بیت چلا ہے

من موہن میں جیا لگا ہے

روٹھ گئے ہیں موسے ساجن
کس در جائے پریم بھکارن
سکھیاں جھولیں گائیں ساون
پی پی کا اک شور مچا ہے

من موہن میں جیا لگا ہے

برہا کی ماری میں دکھیاری
گن گن تارے رتیاں ساری
جیتی ہوں اک آس کی ماری
نینن مورے پیا بسا ہے

من موہن میں جیا لگا ہے

محمد اکرام الحق صدیقی عبرت

اردو

اعلیٰ، ارفع ہے شانِ اُردو
دلچسپ ہے داستانِ اردو

ساری دنیا میں جا کے دیکھو
ہر حصہ میں ہے مکانِ اردو

وہ کونسا باغ ہے جہاں میں
جس میں نہیں آشیانِ اردو

ہر ایک زباں کی نغمگی میں
کس طرح بھلا ہے خوانِ اردو

ہے مرکزِ مختصر نویسی
سمجھیں گے یہ نکتہ دانِ اردو

مِل سکتے ہیں ہر زباں کے الفاظ
جس میں ہندی ہی جانِ اردو

ہندی دیکھی ہے آج کل کی
ہم کو تو ہوا گمانِ اردو

عجمی عربی ملا کے دیکھی
باقی نہ رہی وہ شانِ اردو

کنڑی، تلگو میں چاہو دیکھو
مستعمل ہے زبانِ اردو

مسلم ہی کی ملکیت نہیں ہے
ہندو کی بھی ہے زبانِ اردو

برق و آفق و سرور و طالب
کہلاتے ہیں حامیانِ اردو

سرشار و نسیم و مہر و چکبست
یہ لوگ ہیں خازنانِ اردو

اغیار کو بھی وہ اپنا کر لے
یہ ایک ہے وصف شانِ اردو

عالمگیری ہے اس کی ایسی
ہر ایک ہے مدح خوانِ اردو

آپس کی خلش زبان پر کیوں
دیکھو نہ کرو زیانِ اردو

رہتی ہے بہار تا قیامت
ممکن نہیں، ہو خزانِ اردو

کیا خطرہ ہے جب شہہ دکن کے
ہے ہاتھوں میں عنانِ اردو

کیوں ہو نہ دکن میں اب ترقی
ہیں سیکڑوں قدردانِ اردو

اس کو حاصل ہوا ستقامت
کوشاں ہوں سخنورانِ اردو

ہر حصہ میں ہو رواج اس کا
کوشش کریں حامیانِ اردو

اللہ! وہ عروج حاصل
بن جائے اک آسمانِ اردو

ہے دل سے دعائے جذب تا حشر
دنیا میں رہے نشانِ اردو

راگھوندر راؤ جذب (عالم پوری)

تبصرے

کلامِ نسواں

مطبوعہ عہد آفرین برقی پریس حیدرآباد دکن کاغذ، طباعت اور کتابت بہتر قیمت (عہ)

ملنے کے پتے:۔ (۱) کمال احمد فاروقی بیت السلام سیف آباد (۲) مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) غلام دستگیر کتب فروش چارکمان (۴) سید عبدالقادر کتب فروش چار مینار حیدرآباد دکن۔

خواتین اردو کے کلام کا یہ ایک دلچسپ مجموعہ ہے جس کو محمد جمیل احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) نے نہایت ہی سلیقہ سے مرتب کر کے اپنی بہنوں کی خدمت میں بڑے احترام اور توقعات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں سو مختلف عنوانات ہیں جو (۱۲۲) صفحات پر مشتمل ہیں۔ ابتدا میں مرتب نے تمہید لکھی ہے جس میں اردو اور ہندوستان پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے۔ "یہ اپنی نوعیت کی پہلی علمی کوشش ہے اور اس میں اہم مسائل کے جمع کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے" زیادہ تر کلام "خواتین عثمانی" مرتبہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی "عصمت" اور "سہیلی" سے انتخاب کیا گیا ہے۔ کتاب تین ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں اس کلام کو پیش کیا گیا ہے جس میں قدرت کی نیرنگیوں اور انسانی جذبات کا عنصر مضمر ہے۔ اس باب میں (۲۳) نظمیں ہیں۔ سپاس نامہ اردو، صبح دم، چاند کا پیغام، سنسان بستی یقیناً دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں۔ دوسرے باب میں ان نظموں کو یکجا کیا گیا ہے جس میں سماج اور اس سے متعلق چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس باب میں (۴۴) نظمیں ہیں۔ رفتار زمانہ، پیغام عمل، بیٹی کی قربانی، نوائے سروش وہ نظمیں ہیں جو انسان کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے تازیانہ کا کام کرتی ہیں۔

بیٹی کی قربانی:۔

اے شادی کہوں تیرا تمن ہوں یا اپنی بربادی | کہ جس نے چھین لی مجھ سے مرے بچپن کی آزادی
کہ جھونکا بھاڑ میں محنت مگر وا اپنے ہاتھوں سے | خوشی کیا خاک ہو سوچو تم ہی ایسی برتو کہیں

وہ کہلاتا ہی بوڑھا جو ہوا چالیس سے اوپر | مرے دولہا ہیں خدا رکھے اب اڑتالیس سے اوپر
ہے ستر و برس میں بھی کئی ہفتے ابھی کم ہیں | مگر بیوی ہوں میں وہ میرے شوہر میرے ہمدم ہیں

صفیہ بیگم (ورنگل)

نوائے سروش:۔

تاروں کی سادگی تھی مجھے جنت نگاہ | دلکش صدائے نغمہ بھی فردوس گوش تھی
میں نے بھی یہ سنا کہ یہ آہستگی کوئی | کہتا ہے کچھ مجھی سے میں حیرت بدوش تھی
اس نے کہا کہ کچھ تجھے معلوم ہے حیا | لاتا ہے کیا پیام یہ مستقبل جدید
اب پھر وہی سکوت تھا ہر شے خموش تھی | آخر صدا یہ کس کی نصیحت بدوش تھی
تارے یہ کہہ رہے تھے کہ ہنس کے اے حیا | تو جانتی نہیں یہ نوائے سروش تھی

خورشید اقبال حیا

تیسرے باب میں (۴۷) نظمیں ہیں جن میں صوفیانہ خیالات مذہبی جذبات وغیرہ کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ در آقا، یوسف گم گشتہ، پریت کی ریت، اہل دل کے لئے دلنواز ضرور ہیں۔

یوسف گم گشتہ:۔

وہ یوسف گم گشتہ کس جائے نہاں ہوگا | کس پہلو میں پوشیدہ وہ راحت جاں ہوگا
میرا عربی آقا اللہ! کہاں ہوگا
میں آنکھوں کا فرش اس کے رستے میں بچھاؤں گی | میں اس میں سما کر پھر خود میں نہ سماؤں گی
میرا عربی آقا اللہ! کہاں ہوگا۔

جمال لیلیٰ مرحومہ اہلیہ حکیم الشعراء حضرت امجد

اگرچہ یہ مجموعہ قابل تحسین و ستائش ہے مگر ابھی اس میں بہت سی خامیاں ہیں جو بقول مرتب دوسرے اڈیشن میں دور ہو جائیں گی۔ مرتب نے اپنی تعلیمی مشغولیتوں کے باوجود ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا جو بہر صورت قابل مبارکباد ہے۔ امید کہ وہ دوسرا اڈیشن نہایت ہی توجہ اور وضاحت کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کر کے ادب اردو میں ایک نئی چیز کا اضافہ کریں گے۔ **شاہد**

اسلامی طب

(از ابن مظہر قاضی معین الدین رہبر فاروقی منشی فاضل) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ضخامت (۲۰۰) صفحے کتابت وطباعت اچھی، کاغذ معمولی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

اس کتاب میں ابن مظہر صاحب نے اسلامی طب کے متعلق بڑی تحقیق و تلاش کر معلومات فراہم کی ہیں اور بتلایا ہے کہ شاہانہ سرپرستیوں میں اس نے کس طرح

تحقیق کی منزلیں طے کیں۔ سب سے پہلے دیباچہ ہے جس میں مصنف نے تصنیف کے ساتھ ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ ان کو اس کتاب کی ترتیب میں کس قدر کاوش کرنی پڑی ہے۔ اس کے بعد مولانا حکیم مقصود علی خاں افسر الاطبا کی "تقریظ" روشنی میں ناظرین سے مصنف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ گو یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مستقل کتاب کی تعریف میں داخل نہیں ہوتی بلکہ اس کا خاکہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بیان ایک ایسے صاحب کا ہے جو اپنے آپ کو مصنف کا "رفیق طریق" بتاتے ہیں اور جن کو مصنف اپنا "خضر راہ" سمجھتے ہیں اس لئے ہم اس پر یقین کر کے مصنف کو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب کے بعض حصوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور اسلوب اور معلومات آفرینی سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ تمام کتاب دلچسپ ہوگی۔ لائق مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "ایسی ایسی نایاب کتابیں معرض بیان میں لائی گئی ہیں کہ سچے بہی خواہان فن اور کام کرنے والوں کے لئے فن کو عروج پر لانے میں ان کے نقش ہدایت بن سکیں گے اور وہ ان کو پڑھ کر انقلاب پیدا کر سکیں گے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ کم و بیش ایسی ساری کتابیں حیدرآباد ہی میں ہیں۔

ان نایاب کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے جن کا نچوڑ انھوں نے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہے اور غالباً لغزش قلم سے انھوں نے فہرست کی ابتدا میں لکھ دیا ہے یہ کتابیں ان کے موضوع کا نچوڑ ہیں۔ بہرحال اس فہرست سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد میں ہزاروں نایاب کتابیں، ہر فن پر موجود ہیں۔ صرف ڈھونڈنے اور اس سے استفادہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ محترمی ڈاکٹر زور نے نوجوانوں میں تحقیق و تجسس کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور ان کی تحریروں، تقریروں اور سب سے بڑھ کر ان کے پرخلوص عمل نے کامیابی کے ساتھ ہر ایک فرزند وطن پر یہ امر واضح کر دیا ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو روشنی میں لانا دراصل آئندہ نسلوں کی کامرانی کا ذریعہ ہے اور ماضی کو جب تک پیش نظر نہیں رکھا جائے گا مستقبل کبھی تابناک نہیں ہو سکتا۔ اسی کتاب میں غالباً ملک کی موجودہ علمی سرگرمیوں کو جلد بازی کی فضائے تالیف و تصانیف سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر ایک غلط تعبیر ہے جو ملک کے حالات کے صحیح مطالعہ کے بعد بے سروپا معلوم ہوتی ہے۔ "جامعہ عثمانیہ" کی بدولت اب ملک میں تصنیف و تالیف کا عام رجحان ہو گیا ہے اور ایسی کتابوں تک رسائی آسان ہو گئی ہے جو تصنیف و تالیف میں مدد دیتی ہیں۔ البتہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کی نہیں جو صرف ادعائے ہمہ دانی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں یا جمائیاں لیتے ہوئے کسی پر اعتراض کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بھی خدمت گزار اردو ہیں۔

خیر یہ باتیں تو برسبیل تذکرہ لکھ دی گئیں اور ان کا لکھنا اس لئے بے جا نہیں کہ اس قسم کی غلط فہمی کو اگر اہمیت دی جائے تو مصروف عمل نوجوانوں کی حوصلہ شکنی ممکن ہے۔ اسلامی طب اس قابل ہے کہ اس کو ہر مسلمان اور ہر طبیب مطالعہ کرے۔ توقع ہے کہ ابن مظہر صاحب آئندہ بھی صحیح رہنمائی میں تصنیف و تالیف سے ملک کی خدمت کریں گے۔ (م)

طب قدیم اور طب جدید از حکیم محمد اسماعیل قیمت (۱۲) انجمن طلبائے قدیم مدرسہ طبیہ یونانی سرکار عالی کی جانب سے بندگان عالی کے جشن سیمین کے موقع پر طب کے موضوع پر مقالہ نگاری کے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔

حکیم محمد اسماعیل صاحب نے یہ مقالہ اسی انعامی مقابلہ کے لئے لکھا ہے جس کو کتب خانہ سعیدیہ جام باغ کی جانب سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے متعلق نواب صدر یار جنگ بہادر نے لکھا ہے کہ

"مولوی اسماعیل صاحب نے طب کی تاریخ پر زیادہ توجہ مبذول کی ہے جو ایک حد تک زیر غور موضوع سے خارج ہے۔ انھوں نے نہ تو طب قدیم و طب جدید کی صورت حال کا تفصیل سے موازنہ کیا ہے اور نہ طب قدیم کی ترقی کی تدابیر پر لیسی تعمق کی نظر ڈالی ہے جیسی کہ تاریخی پہلو پر مبذول کی گئی ہے۔ اس کمی کے قطع نظر ان کا مضمون قابلیت سے تحریر کیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ

"میرا خیال ہے کہ مولوی حکیم محمد اسماعیل صاحب نے بڑی محنت اور سلیقہ سے مضمون مرتب کیا ہے انھوں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ بھی نہایت معقول ہیں اور غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔"

بعض دوسرے اصحاب نے بھی بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے ہمیں بڑی خوشی ہے کہ جامعہ کلیہ کے ایک فارغ التحصیل نے اس قدر معلومات آفریں کتاب لکھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طب قدیم مشرق کے مزاج کے کس قدر موافق ہے اور اس کے احیا میں کس قدر تحفظ صحت ممکن ہے۔ ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ (م)

مومن

مومن متوسطین شعرائے دہلی میں اچھی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ انھیں اردو کے ان اربعہ عناصر میں سے ایک ہونے کا شرف حاصل ہے، جن کے ہاتھوں اردو شاعری کی ازسرِنو تخلیق ہوئی اور جنھوں نے اسے ایک بار پھر اوجِ کمال کو پہنچایا۔

ذوقِ شاعری مومن نے خداداد پایا تھا جس کو فطری ذہانت اور جودتِ طبع نے اور چار چاند لگا دئیے تھے، ان کے کمالِ شاعری کی وجہ سے ان کے معاصرین ذوق و غالب وغیرہ ان کی عزت و قدر کرتے تھے، ان کے علاوہ شیفتہ جیسے نقادِ سخن جن کی نسبت غالب کا یہ خیال تھا کہ ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

اردو میں مومن ہی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے، اور یہ ان کی اعلیٰ قابلیت اور مسلم الثبوت استاد ہونے کا ایسا بین ثبوت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر جب قسمت ملیٹتی ہے تو کچھ پیش نہیں جاتی۔ مومن کے مرتے ہی لوگوں نے ان کے کلام سے کچھ ایسی بے توجہی برتی کہ ذوق و غالب کی طرح شہرت دینا تو رہا ایک طرف، اُلٹا اسے مبتذل اور بیہودہ کہہ کر ایسا نکما بنا ڈالا کہ آزاد تک جب "آبحیات" لکھنے بیٹھے تو انھیں صاف نظر انداز کر دیا، مگر شیفتہ زندہ تھے انھوں نے اس پر لے دے کی تو دوسری اشاعت میں آزاد نے اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کرتے ہوئے انہی کی زبانی مومن خاں کی کہانی لکھ دی۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے بھی الفاظ کے تغیر و تبدل سے مومن کے حالات کے ضمن میں بس اسی قدر لکھا جتنا کہ آزاد مرحوم "آبحیات" میں لکھ گئے تھے۔

اسی طرح زمانہ کی ناقدر شناسی نے ایک اہلِ کمال کے جوہرِ طبع کو خاطر خواہ طور پر کھلنے دینا تو کجا اپنی نافہمی سے اٹ ملیامیٹ کر دیا۔

مگر زمانے کی یہ ناقدری کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں اور نہ مومن ہی سے کچھ مخصوص ہے، بلکہ یہ تو معمولی ہتھکنڈے ہیں "چرخِ نیلی فام کے" اکثر اچھے شعرا پر یہی بیتی ہے۔ نظیر جسے آج اردو شاعری کا مصلحِ اعظم اور جدید رنگ کا اوّلیں علمبردار کہا جا رہا ہے، مدتوں اس کے کلام کو مبتذل، عامیانہ، ہزل اور فحش سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ ظفر کو جس کے صوفیانہ، سادہ اور دلنشیں اشعار اب اکثر اہلِ ذوق کے وردِ زباں رہتے ہیں۔ شاعر سمجھنے میں بھی ایک زمانے میں لوگوں کو کلام تھا۔ یہی نہیں اس کا سرمایۂ شاعری تک لاوارثی چیز جان کر استاد کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ غرض یہ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں، مگر ہر ایک بات کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ نظیر اور ظفر کے کلام سے جہاں تک ہمارا قیاس ہے لوگوں کی بے پروائی کی وجہ یہ تھی کہ نظیر کی سادہ اور فطری شاعری اس وقت کے مذاق کے مطابق نہ ہونے سے کسی کو نہ سہاتی تھی، اور ظفر غریب کی بادشاہت کی طرح لوگوں کو ہر ایک چیز عارضی اور نام کی نظر آتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ مومن کے کلام سے کیوں بے اعتنائی برتی گئی؟ تو اس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں:۔ ہمارے خیال میں بڑی وجہ یہ ہے کہ مومن صرف غزل گو تھے اور ان کا کلام عاشقانہ تھا۔ غدر تک تو خیر نہیں، مگر غدر کے بعد یہ رنگ بالکل ماند پڑ گیا، کیونکہ انقلابِ زمانہ اس کو سزاوار نہیں ہوا سلطنت کی تباہی نے

لوگوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ پرانے قدرداں اٹھ چکے تھے اور نئے حکمراں غزل گوئی تو کجا سرے سے یہاں کی زبان ہی نہ سمجھتے تھے اور جو کوئی ایک آدھ اردو سے واقف بھی تھا تو یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی کارآمد تصنیف ہاتھ لگے جس سے اس نئی زبان کے سمجھنے اور پڑھنے میں سہولت ہو۔ غرض لوگوں کی توجہ اس دور میں عام طور سے نظم سے زیادہ نثر' نیز قواعد و لغاتِ زبان کی ترتیب و تدوین کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ انگریزی کا چرچا بڑھتا جا رہا تھا اور چونکہ یہ نئی چیز تھی اس لئے باوجود شدید مخالفتوں کے نوجوان طبقہ میں اس کا ذوق عام ہو گیا تھا' غرض طبیعتوں کا رجحان اور مذاق ہی یکسر بدل گیا تھا۔ اگر ایک طرف انگریزی ادب کی دلچسپیاں دلوں کو موہے لیتی تھیں' تو دوسری طرف اردو شاعری بھی آزادؔ' حالیؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی توجہ سے نیا چولا بدل چکی تھی۔ غزل کا دائرہ محدود جان کر مسدس اور مثنوی کو فروغ دیا جا رہا تھا۔ تکلف اور تصنع کی جگہ سادگی اور واقعیت نے لے لی تھی۔ نیچرل مضامین کی قدر اور مانگ تھی' اور نظموں کا دور دورہ' تاریخی' خیالی' بیانیہ' اخلاقی' سیاسی' غرض ہر قسم کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں۔ دلوں پر نئی نئی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ "مسدسِ مدوجزرِ اسلام" نے مردہ رگوں میں نئے سرے سے خون اور اس میں ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا' ہر ایک کو اصلاح اور ترقی کی دھن تھی۔ اس صورتِ حال میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ پرانے دواوین کی ورق گردانی کرتا۔ غالب اول تو خود ہی اس دور کے ابتدائی زمانے میں موجود تھے' پھر ان کی دلنشیں خطوط نویسی اور سادہ نگاری کا شہرہ عام ہو چکا تھا۔ دیوان بھی باوجود مختصر ہونے کے تنوعِ مضامین کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا' اس پر حالیؔ جیسے مصلح کا استاد ہونا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔

ذوقؔ مرحوم کو آزادؔ کی "آبحیات" نے چار چاند لگا دیئے۔ اب رہ گئے مومنؔ خاں تو ان کے شاگردوں میں حالیؔ و آزادؔ جیسا کوئی شاگرد نہ تھا۔ لے دے کے ایک شیفتہ تھے' تو وہ بھی غدر کے بعد جلد ہی رخصت ہو گئے۔ بہرحال انھوں نے اتنا کیا کہ استاد کے منتشر کلام کو یکجا کر دیا (جو بعد میں دیوان کی صورت میں شایع ہوا) "گلشنِ بے خار" میں اپنے استاد کی یوں تعریف کی کہ حق ادا کر دیا لکھتے ہیں:۔

بزعم فقیر قوت شاعری ایشاں کم کسے بہ رسانت' در ہر جنس انچناں مکانتی و آنی دارد کہ ادیب منصف ہم میسر نیامد اگر حظے از فہم خداداد داری بیا و بہ دیوانش نظر کن و بہ تصدیق و تکذیب من زبانِ انصاف بکشا۔

آزادؔ کی آبحیات کے لئے ان کے حالاتِ زندگی لکھ کر بھیجے' مگر تو دان کی سوانح حیات سے متعلق' افسوس ہے انھوں نے کچھ نہیں لکھا' اگر یہ تھوڑے بہت کچھ بھی استاد کے حالات لکھ جاتے تو مومنؔ کے متعلق جو غلط فہمیاں اور افواہیں اب تک پھیلی ہوئی ہیں' ان کا ایک بڑی حد تک ازالہ ہو جاتا۔ غرض مومنؔ کے معاصرین اور ان کے شاگردوں کی چوک (بھول) نے ہمیں ان کے اصلی حال سے خبردار نہیں ہونے دیا' ممکن ہے ان لوگوں نے اس وجہ سے کچھ نہ لکھا ہو کہ مومنؔ اس زمانہ تک کوئی ایسے غیر معروف نہیں بنتے' ہزاروں ان کے دیکھنے اور جاننے والے زندہ' سلامت' موجود تھے۔ اسی لئے شاید ان کے حالات مرتب کرنے ضروری نہ معلوم ہوئے ہوں گے۔ مگر بعض لوگ اس خاموشی کی عجیب و غریب توجیہیں پیش کرتے ہیں' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مومنؔ کا چال چلن قابلِ اعتراض تھا' وہ حد سے زیادہ مغرور اور اکھل کھرے تھے' اور یہ کہ ان کی شاعری بھی بس یوں ہی ہے کیونکہ تمام کلام رطب و یابس سے پُر ہے وغیرہ۔

یہ بات کہ مومن کا چال چلن اچھا نہیں تھا' اس کے متعلق ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے کلام سے اس باب میں اگر مدد لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں رنگینی ضرور تھی' اور رند مشرب آدمی تھے' چنانچہ اکثر اشعار اور خاص طور پر مثنویاں اس کی شاہد ہیں۔ مگر یہ سب کچھ آپ بیتی ہے یا جگ بیتی اس کا حال خدا کو معلوم ہے۔ ان کے خاندان والوں سے استفسار کیا تو اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوا کہ خود بے حد خوبصورت' نفاست پسند اور نازک طبع تھے' گانے سے دلبستگی تھی اور حسن کے قدر داں تھے' لوگوں کو حاشیہ آرائی کے لئے اتنا ہی بہت کافی ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ ذاتیات سے تعلق رکھتا ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے ـــ اب رہی یہ بات کہ مومن مغرور اور اکھل کھرے تھے' اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اور معاصرین تو کجا سعدی جیسے مسلم الثبوت استاد کو ہیچ جانتے تھے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ مومن حد سے زیادہ خود دار تھے اور یہ چیز جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو میر صاحب کی طرح غرور اور بد دماغی کہلانے لگتی ہے۔ مومن کا بھی یہی حال تھا کہ حد سے زیادہ قانع اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے' ایسے مزاج کے آدمی سے یہ توقع رکھنی کہ وہ درباداری یا کسی امیر و رئیس کی خوشامد کر سکے بالکل فضول ہے' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مومن کی کلیات میں قصائد کا فقدان ہے' اور شاید مہاراجہ پٹیالہ کے سوا وہ بھی مجبوراً انھوں نے کسی رئیس کی مدح سرائی میں کچھ نہیں کہا۔ اپنی نسبت بیشک ان کے خیالات اعلیٰ تھے اور تعلّی کی لینا تو شاعروں کا پیدائشی حق ہے۔ میر صاحب کی تو خیر بات ہی الگ ہے مگر جب یقین تک یہ کہہ سکتے ہوں کہ ؎

یقیں تائید حق سے شعر کے میداں کا رستم
مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

تو کیا مومن ایسے گئے گذرے تھے کہ اتنا بھی نہ کہہ سکتے ؎

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

اکھل کھرے پن کا الزام بھی درست نہیں' ان کے دیکھنے والوں کی زبانی سنا ہے کہ دیوانخانہ میں ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا' شطرنج سے دلی مناسبت رکھتے تھے' علم نجوم کے ماہر تھے' اور شاعری کے دلدادہ۔ چنانچہ ہمیشہ دوست احباب شاگرد گھیرے رہتے تھے۔ کوئی نجوم کے احکام کی بابت پوچھتا' کوئی شطرنج کی چالوں کی' اور کوئی مشورۂ سخن کا منتظر رہتا۔ اور یہ اپنی فطری خوش خلقی سے سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے' ہاں یہ ضرور تھا کہ اپنے کو بہت لئے دئے رہتے تھے اور اپنے زمرۂ احباب و مخلصین کے علاوہ خواہ مخواہ ہر ایک سے ملتے نہیں پھرتے تھے۔

رہ گیا یہ اعتراض کہ کلام رطب و یابس سے بھرا ہوا ہے' تو اس کے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کلام کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے' ان کے اشعار کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آتا ہے' کیونکہ اکثر انھوں نے سادہ طریقہ کے بجائے اظہار خیال کے لئے پیچیدہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ علاوہ ازیں کلام میں فارسیت کا غلبہ زیادہ ہے' جس کی وجہ سے وہ سہل الفہم نہیں رہا' مگر اس کے باوجود سیکڑوں شعر ایسے بھی زبان قلم سے نکل گئے ہیں جو اردو شاعری میں تو کم از کم اپنا جواب نہیں رکھتے ـــ مختصر یہ کہ مومن صاحب طرز اور اپنے خاص رنگ کے استاد تھے اور ان کے کلام میں اعتراض کرنا سراسر ناانصافی و ہٹ دھرمی ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا' وہ ان اعتراضات کا جواب تھا جو خود مومن اور ان کے کلام پر عام طور سے کئے جاتے ہیں۔

اب ہم ان کے حالاتِ زندگی مختصر طور پر بیان کریںگے اور پھر بحیثیت ایک غزل گو شاعر کے اُنکے کمالِ شاعری پر خود ان کے کلام کی مدد سے روشنی ڈالیں گے۔

مومن کے اجداد کشمیری الاصل تھے، دادا دہلی میں آکر شاہی طبیب ہوگئے تھے، اور چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے، باپ بھی حکمت کرتے تھے۔ مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے جن سے ان کے والد کو والہانہ عقیدت تھی ان کا نام مومن خاں رکھا۔

مومن بچپن ہی سے نہایت ذہین اور طبّاع تھے، ابتدائی تعلیم ختم کر چکے تو باپ نے شاہ عبدالقادر صاحب کے سپرد کردیا تاکہ عربی سیکھیں، طبیعت بھی تیز چند ہی دن میں برق ہوگئے اور عربی و فارسی میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔ حافظہ کچھ ایسا غضب کا پایا تھا کہ جو بات سن لیتے پتھر کی لکیر ہوجاتی تھی، عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد باپ اور چچا سے طب پڑھی مگر جودتِ طبع نے اس پر قانع نہ رہنے دیا۔ طبیعت میں رنگینی تھی، شاعری کی طرف راغب ہوگئے۔ علمِ نجوم سے دلچسپی ہوئی تو اسے سیکھ کر ایسا ملکہ بہم پہنچایا کہ بڑے بڑے نجومی ان کے احکام سُن کر دنگ رہ جاتے تھے، شطرنج کا شوق ہوا تو ایسا ہوا کہ ماہر شاطر آآ کر ان سے چالیں پوچھتے تھے مگر کیا یہ اور کیا شاعری، تمام شوق محض دلبستگی کے تھے اور ان مشاغل کو انھوں نے کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

خوبصورت، زندہ دل اور خوش مذاق واقع ہوئے تھے، اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، خود اپنا کلام ہمیشہ ترنّم سے پڑھتے تھے، آواز میں درد اس بلا کا تھا کہ جو سنتا مدہوش ہوجاتا۔

دلّی سے انھیں دِلی محبت تھی، اگرچہ بغرض سیاحت وہ اکثر دوسرے شہروں میں جاتے رہتے تھے، مگر وطن کے باہر مستقل طور پر رہنا انھیں گوارا نہ تھا، چنانچہ کپور تھلہ کے راجہ نے جب بلایا تو ملازمت سے انکار کردیا۔

غالب کے انکار کرنے کے بعد فارسی پروفیسری بھی مومن خاں کو پیش کی گئی تھی مگر باہر جانے کی شرط ساتھ لگی ہوئی تھی، چنانچہ اسے بھی منظور نہیں کیا۔ حد درجہ قانع اور متوکل تھے، باپ دادا کی جاگیر اور پنشن سے جو کچھ ملتا تھا، اسی پر گزر اوقات تھی۔ تمام عمر ہنسی خوشی بسر کی اور باون برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کوٹھے پر سے گر پڑے تھے، نجوم کے ذریعہ حکم لگایا کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مرجاؤں گا، چنانچہ پانچویں مہینے انتقال ہوگیا۔ "دست و بازو بشکست" تاریخ ہے جو گرنے کے بعد خود ہی کہی تھی۔ تاریخ گوئی میں انھیں کمال حاصل تھا، نئے نئے طریقہ سے تاریخیں نکالتے تھے، اسکے علاوہ ان کے معمے اور پہیلیاں بھی مشہور ہیں۔ غرض بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے۔

تصانیف میں ایک دیوان یادگار باقی ہے جس میں مثنویاں بھی شامل ہیں۔ ان کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے مشہور رہے۔ اور ان کی شاعری کا دار و مدار خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی لکھا جاچکا ہے، شاعری ان کے لئے محض دلبستگی اور تفنن طبع کا ایک ذریعہ تھی، طبیعت موزوں، تخیل اعلیٰ اور ذہن رسا تھا، مگر شیفتہ کی طرح انھوں نے بھی اپنا ایک خاص معیار قائم کر رکھا تھا، جو کچھ کہتے اسی کے مطابق کہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے پورے کلام میں ایک قسم کی یکسانیت سی پائی جاتی ہے۔ کیا قصیدے، کیا غزلیں

اور کیا مثنویاں سب کا ایک حال ہے۔ یعنی نہ بہت ہی زیادہ اعلیٰ ہیں اور نہ بالکل مبتذل۔ ابتدائی کلام میں آزادہ روی نوجوانی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے کہیں کہیں لغزشیں ہو گئی ہیں اور عامیانہ پن جھلکتا ہے مگر اپنی علمی لیاقت سے انھوں نے اسے مبتذل نہیں ہونے دیا' اور آخر آخر میں تو کلام میں بہت ہی پختگی اور متانت آگئی ہے۔

مومن عاشقانہ رنگ کے استاد کامل اور بہترین جذبات نگار ہیں۔ آزاد ان کی غزلوں کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین اعلیٰ ہیں' جن میں استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی جان ڈال دی ہے' ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں' اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے' یہ اکثر اشعار میں ایک شئے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطیف معنی' بلکہ معانی پنہانی پیدا کر دیتے ہیں' اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیدہ فارسی کی' اور استعارے اضافتیں اردو میں استعمال کر کے کلام کو تمکین کرتے ہیں۔

مومن اور غالب کے کلام میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے بیدل کا مطالعہ کیا تھا' اسی لئے دونوں کے ہاں معنوی نزاکتیں بہت زیادہ ہیں' خصوصاً مومن تو اس بارے میں غالب پر بھی سبقت لے گئے ہیں' کیونکہ اظہار خیال کے لئے اکثر بجائے سادہ طریقہ کے پیچیدہ طریقہ اختیار کیا ہے' اس کے علاوہ بعض شعر ایسے ہیں جن کی ترکیب بالکل فارسی کی سی ہے' مگر انھوں نے کمال یہ کیا ہے کہ اضافتیں وغیرہ لگا کر کچھ اس طرح اپنایا ہے کہ ایک نئی چیز بن گئے ہیں۔ یہی نہیں' انھوں نے معمولی سے معمولی مضمون کو بھی اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے۔

علاوہ اس کے ان کے طرز ادا میں ایک خاص بات ہے جو غالب کو چھوڑ کر اوروں کے ہاں کم دیکھی جاتی ہے' وہ یہ کہ ان کے اشعار کو بادی النظر میں دیکھنے سے کچھ اور معنی سمجھ میں آتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو دوسرے بالکل نئے معنی پیدا ہوتے ہیں' اسی وجہ سے ان کے اشعار کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے' کیونکہ ہر دفعہ ایک نیا لطف آتا ہے۔

مومن کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں' جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے' کیونکہ اسی موقع پر معاملہ سامع پر چھوڑ دیا جاتا ہے' اگر اس کا ذہن رسا ہے تو وہ آسانی سے اس جزو کے معنی سمجھ لیتا ہے' ورنہ پھر جھٹ سے شعر پر پیچیدہ ہونے کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا لازمی ہے' اسی لئے ایک بلا سے اگر محفوظ ہوں تو ڈر رہتا ہے کہ دیکھئے دوسری کونسی بلا نازل ہوتی ہے۔ مگر یہ پورا جملہ کہ انسان کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضروری ہے' محذوف ہے' اور جب تک اس کا ذکر نہ کیا جائے شعر کے معنی پورے نہیں ہوتے' لیکن شاعر نے اس کا جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک امر بدیہی ہے لہذا اس کے جتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی مضمون کو ایک اور شعر میں دوسرے طریقہ سے بھی ادا کیا ہے :۔

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد
نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

غرض دیوان مومن میں بیشتر اشعار اسی انداز کے پائے جاتے ہیں۔ جن کا لکھنا باعث طوالت ہے، صرف دو شعر اور سن لیجیے ؎

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

درد بے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

مومن نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی تشبیہیں اور استعارے استعمال کر کے بعض جگہ بڑی جدت سے کام لیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے ؎

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

یا

چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

اور

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

غرض اسی طرح کی خوبصورت اور دلفریب تشبیہوں و استعاروں نے ان کے کلام کے حسن و خوبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ مومن کے کمالِ فن کا لب لباب ان کی غزل گوئی ہے، یوں دیکھا جائے تو اخلاق، تصوف، قناعت، توکل، بے ثباتی دنیا وغیرہ سے متعلق بھی اشعار کہے ہیں، مگر اصل چیز جس نے ان کے کلام کو چمکا دیا ہے وہ ان کا رنگ تغزل ہے۔ ان کی غزلیات میں ندرتِ خیال کے ساتھ لطافتِ زبان اور شستگی کلام عجب لطف دیتی ہے، ان میں ایجاز کے ساتھ سادگی، سلاست و روانی نازک خیالی اور جدتِ تخیل سب کچھ بدرجۂ احسن موجود ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہی ہیں وہ غضب کی ہیں مومن نے واردات و کیفیاتِ قلبی کی صحیح ترجمانی کی ہے، اور ان کے اشعار میں درد و اثر، سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ظرافت، شوخی اور بے ساختہ پن کچھ ایسا پایا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے باتیں کر رہے ہیں۔ عام طور سے ان کی غزلوں میں مقطع مطلع سے زیادہ زوردار ہوتا ہے، کیونکہ تخلص کو ہمیشہ کسی نہ کسی خاص خوبی اور نرالے طریقے سے کھپاتے ہیں، اکثر غزلیں پوری کی پوری مرصع کہی ہیں۔ نمونۃً بعض غزلوں میں سے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

۱
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

یہ پوری غزل مومن کی بہترین غزلوں میں سے شمار کی جاتی ہے ؎

۲
صبر کر صبر، ہو چکا جو کچھ — اے دلِ بیقرار ہونا تھا
کیوں شکایت گزار ہونا تھا — گو نہ تھی اے دل اسکے رنج کی تاب
رات دن بادہ و صنم مومن — کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

۳
دل قابلِ محبتِ جاناں نہیں رہا — وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا
یاروں کو فکرِ چارہ و درماں نہیں رہا — کیا اچھے ہو گئے کہ بھلوں سے برے ہوئے
بیکاری امیدسے فرصت ہے رات دن — وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا
بے سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا جی — اور اس خراب گھر میں کوئی ویراں نہیں رہا
مومن یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں مگر — دل میں تو کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

۴ کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا — نالہ پیہم سے یاں فرصت نہیں حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا
ہیں اسیر اس کے، جو ہے اپنا اسیر ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا — جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو بیوفا پھر حاصلِ بیداد کیا
تنگ ہو جنت ہی چلیے بے ہراس — لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا

۵ شعلہ ہائے تپِ دل آگ لگاتے کیوں ہو — گر ہو دل سوز مرے مجھ کو جلاتے کیوں ہو
جن سے منظور وفا ہے، ہو جفا بھی اُن پر — مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو
توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر — چارہ ساز و مری امید بندھاتے کیوں ہو

۶ ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے — نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے
تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں، شبِ ہجراں ہوں گے
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے
منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مومن کے دیوان میں دو سو سے بھی زیادہ غزلیں ہیں، ان میں سے محض چھ اور وہ بھی ناکمل انتخاب کرنا کسی طرح کافی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہم نے طوالت کے خیال سے صرف وہی غزلیں لکھی ہیں جو زبان زدِ خاص و عام ہونے کے علاوہ ان کی خصوصیاتِ شاعری کی پوری طرح حامل ہیں۔

اب ہم مومن کے چند ایسے اشعار پیش کریں گے، جن میں انھوں مختلف خیالات کو اپنے خاص پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا — جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

غالب نے اسی خیال کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کیا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دربدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

راضی برضا مولا رہنے کی تلقین کی ہے، یہ شعر خود ان کی اپنی زندگی کا آئینہ ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ قسمت پر شاکر رہے اور کبھی مال و دولت کی ہوس اور کسی کی خوشامد درآمد نہیں کی۔

اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل — گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا

تقدیر کا لکھا اَمِٹ ہے اور تدبیر سے تقدیر کسی طرح نہیں بدل سکتی۔

جنت کی ہوس واعظ بے جا ہے کہ عاشق ہوں — ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا

کہتے ہیں جنت کی ہوس آخر کس لئے کروں ۔ مانا کہ وہ سیر کے قابل جگہ ہے مگر یہاں اطمینانِ قلب و سکونِ خاطر کس کو ہے جو سیر کریں گے ۔

اور ایسا کوئی کیا بے سروساماں ہوگا — کہ مجھے زہر بھی دیجے گا تو احساں ہوگا

زندگیٔ ہجر بھی اک موت تھی — مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

یعنی عذابِ ہجر سے جو موت سے بدتر تھا نجات دلا دی ۔

جب جانتے تاثیر کہ دشمن بھی وہاں سے — اپنی طرح اے گردشِ ایام نکلتا

کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں — جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا

آنکھ بند ہونے سے مراد مرجانا ہے ظاہری آنکھیں بند ہونے سے دل کی آنکھیں کھل گئیں یعنی جسم کے مٹنے پر روح کو قرار آگیا اور معلوم ہوگیا کہ درحقیقت ہمیں ستانے والا "جی" ہی تھا نہ کہ "جان" ۔

اتنے ہیں یک نظر ہی میں اوضاع روزگار — دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا — بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

اچھی ہے وفا مجھ سے جلتے ہیں جلیں دشمن — تم آج ہوا سمجھو جو روز جزا ہوتا

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا — کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

غرض مومن کے کلام میں ایسے ہی بہتیرے سر تیز نشتر موجود ہیں ۔

ناصح اور واعظ سے یوں تو ہر ایک ہی شاعر کو کد رہتی ہے مگر مومن کی اور ناصح کی نوک جھوک غضب کی ہے معلوم ہوتا ہے اس مضمون سے کچھ انھیں خاص دلچسپی تھی کہ سینکڑوں جگہ باندھا ہے اور ہر جگہ نیا انداز ہے ۔ چونکہ ان اشعار سے مومن کی شوخی اور ظرافت کا رنگ معلوم ہوتا ہے لہذا کچھ آپ بھی سن لیجیے ؎

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

کیا پوچھتا ہے تلخیٔ الفت میں پند گو — ایسی تو لذتیں ہیں کہ تو جان کھا گیا

کیوں برا کہتے ہو بھلا ناصح — میں نے حضرت سے کیا برائی کی

میں تو دیوانہ تھا انکی عقل کو کیا ہوگیا — قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہوگیا

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

پوچھنا حال اس کا ہے منظور — میں نے ناصح کا مدعا جانا

اب ان کے کچھ مقطع بھی سن لیں ؎

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے — یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

در بتخانہ و عشق بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آ گئی اک بار کیا طبع مقدس میں

اے مومن آپ کب سے ہوے بندۂ بتاں
یارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

گر ترے کوچہ کو دی کعبہ سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمن اسلام ہم

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی
کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے ہو گئے تو

کیا حضرت مومن کہیں کعبہ کو سدھارے
سنسان ہے در کس لئے کیوں آج ہے دربند

یہ اشعار ان کے خاص رنگ کے حامل ہیں۔ شوخی طبع کے ساتھ ظرافت کی چاشنی پائی جاتی ہے نیز سادگی اور بے ساختہ پن اس غضب کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے باتیں کر رہے ہیں۔

مومن کا نمونۂ کلام آپ نے دیکھ لیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جس طرز (شاعری) کی بنا رکھی ہے وہ کس تغزل سے کس قدر ہم آہنگ ہے اور انھوں نے اپنی ذہانت و طباعی سے اس میں کس قدر جدت نزاکت اور لطافت پیدا کر دی ہے انکے رنگ کی پیروی انکے بعد انکے شاگردوں تسکین، نسیم اور تسلیم وغیرہ نے کی اور اسے اور بھی زیادہ چمکایا۔

موجودہ شاعروں میں حسرت موہانی مومن خاں کی طرز میں کہتے ہیں اور ایک ان پر کیا منحصر ہے اصغر، فانی، جگر اور اکثر دوسرے اچھے غزل گو شعرا کے کلام میں مومن کے رنگ کی جھلک صاف نمایاں نظر آتی ہے۔ مگر غالب کے مقابلے میں چونکہ بیچارے مومن کم مشہور ہیں۔ اس لئے موجودہ شعرا کے مداحین اپنے ممدوحین کے کلام کو مومن سے نسبت دینا کسر شان سمجھتے ہیں اور جسطرح بھی بنے کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ممدوح کا سلسلۂ کلام کھینچ تان کر غالب سے ملا دیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ غالب اردو کے مانے ہوے شاعر اور عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، مگر یہ انھیں معلوم نہیں کہ خود غالب مومن کے ایک شعر کے لئے اپنا پورا دیوان نذر دینے کو تیار تھے، اور خود ان دونوں کے کلام میں جتنی مماثلت ہے بہت کم معاصرین میں پائی جاتی ہے۔ لیکن مولانا عبدالحی نے بالکل سچ لکھا ہے کہ "افسوس ہے مومن کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کے کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا" ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کی تماشا گاہ ہے قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں۔ خصوصاً صنف غزل گوئی میں تو انھوں نے طرح طرح سے گلکاریاں اور غضب کی باریکیاں اور دلفریبیاں پیدا کی ہیں۔

بہرحال اردو شاعری جب تک قائم ہے مومن کا نام بھی زندہ رہیگا۔ کیونکہ انھوں نے اسے وسعت و ترقی دینے میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے اور زبان و ادب اردو کی نمایاں اور گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

تسنیم ربانی

اداریہ

آپ نے اقبال نمبر دیکھا ہوگا کیسے پسند آیا؟ اچھے مضمونوں پر انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ہم خود ان کو انتخاب کرنا نہیں چاہتے اس کام کے لئے ہم نے ایک مجلس بنائی ہے۔ اور وہ اچھی طرح جانچ کر اچھے مضمونوں کا انتخاب کرے گی۔ اور جب ہم کو اس مجلس سے اطلاع ملے گی ہم اعلان کردیں گے۔

اس نمبر میں ہم نے ہمیشہ کی طرح پہیلیاں اور لطیفے شائع کئے ہیں اور مئی کی پہیلیوں کے حل بھی چھاپے ہیں۔ آئندہ مہینے کے لئے آپ ایک مضمون لکھئے جس کا عنوان ہے "مدرسہ کا پہلا دن" اس مضمون میں آپ لکھئے کہ اس سال جس دن آپ کا مدرسہ کھلا، اس دن آپ نے کیا کیا؟ آپ میں سے اکثر بچے پڑھنے کے ساتھ کھیلتے بھی ہوں گے۔ ہم کو خیال رکھنا چاہئے تاکہ دماغ اچھی طرح کام کرسکے۔ صحت و بچے اپنی تصویریں بھیجیں۔ جو چھوٹی سائز پر ہوں۔ ہم نے "اقبال نمبر" میں لکھ دیا تھا کہ اس کا سرورق مسٹر خلیل نے بنایا ہے۔ وہ وقت پر نہ چھپ سکا۔ اس لئے مجبوری کی وجہ سے ہم نے دوسرا سرورق لگا دیا تھا اور وہ بھی پسند کیا گیا۔

پہیلیوں کے حل

مئی کے سب رس کی پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں:- الف (۱) قینچی، (۲) کاغذوں کی پن اور سوئی. ب. (۳) پھیرا نہ تھا، (۴) روئی ج (۵) جالا، (۶) کوڑا، د. (۷) چھتری، (۸) انگیٹھی۔

حسب ذیل سب رسی بھائیوں اور بہنوں نے روانہ کئے۔ معین الدین احمد انصاری (۸)، مس بی فخرالدین (۶) شوکت باسط علی خاں (۶) محمد عبدالقیوم مدرسہ عالیہ (۵) جلال صدیقی سٹی کالج (۴) سید لایق علی خاں سٹی کالج (۴)، حبیب شمس سٹی کالج (۲) سید واحد حسین سٹی کالج (۱)۔ مرزا منظر علی بیگ سٹی کالج (۱)

(جون کے سب رس کے "معمۂ اقبال" کے حل زیادہ تعداد میں نہیں وصول ہوئے اس لئے آئندہ ماہ میں درج کئے جائیں گے)

دوسری پہیلیاں

(آئندہ ان پہیلیوں کے حل روانہ کریں)

الف۔ ۱۔ چاندی کے قلعہ میں پارے کا چشمہ — پارے کے چشمے میں سونے کی کان
ایسے قلعہ میں نقب لگائے — بے کھٹکے انسان

۲. پیاری سہیلی کیا بتاؤں — میرا دکھڑا کس کو سناؤں
موا ساری دنیا کماتا — رتی برابر گھر میں نہ لاتا — (مس بی فخرالدین)

ب۔ ۱۔ ایک گلاس دو رنگ پانی — بوجھنے والا بڑا گیانی

۲۔ مارے وہ جی اٹھے — بن مارے مرجائے — (محمد غوث سٹی کالج)

ج۔ ۱۔ اتنی سی ہلدی گھر بھر میں مل دی — ۲۔ چھوٹا منہ بڑی بات — (محمود عبدالماجد پرمنی)

ایک گاؤں کا بازار

اکثر گاؤں میں یہ قاعدہ ہے کہ ہفتے میں ایک دفعہ بازار لگتا ہے جس میں اطراف کے گاؤں والے اپنی اپنی چیزیں بیچنے کے لئے لے آتے ہیں۔ اور ایک دن گاؤں میں رہ کر خرید و فروخت کر کے چلے جاتے ہیں۔

جاکورہ نظام ساگر کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں کے مسافر بنگلہ کے نزدیک ایک نہر ہے جو نظام ساگر کے تالاب سے لی گئی ہے۔ جاکورہ کا مسافر بنگلہ نہایت اچھے مقام پر واقع ہے۔ گرما کے تعطیلات میں ہم لوگ وہاں گئے۔ اتفاق سے دوسرا دن وہاں کے بازار کا دن تھا۔ رات کو اطراف کے گاؤں والے اپنا سامان لے کر آ گئے اور رات کو درختوں کے سایہ میں سوتے رہے۔ دوسرے دن نہر کے پاس ایک چہل پہل تھی صبح کا وقت تھا۔ ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے کئی دوکانیں لگ گئیں۔ اس شور و ہنگامہ میں چڑیوں کی چہچہاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب پرندوں کا یکساں اُڑنا نہایت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سورج نے افق مشرق سے کروٹ بدلی اور اس کی رنگین شعاعوں میں گاؤں کی پہاڑیاں چمکنے لگیں۔ نہر کا پانی سورج کی کرنوں میں خوب بہار دے رہا تھا اور نہر میں ایک دوسرا آسمان نظر آ رہا تھا۔ پاس ہی ایک مندر تھا چند عورتیں پیتل کے تھالوں میں پوجا کا سامان لئے ہوئے مندر کے اندر جا رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے جن سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ مندر سے بھجن گانے کی آواز آنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے یکایک رونے کا ایک شور بلند ہوا معلوم ہوا کہ رونے والے بنجارے تھے جو اتفاق سے اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل کر جدائی کی بھڑاس نکال رہے تھے کہیں پارچہ فروخت ہو رہا تھا۔ بندر والے اور سانپ والے کے اطراف لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اور نہر کے کنارے مچھلی والے بھی لوگوں کے حلقوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اکثر جگہ قیمتوں پر جھگڑا ہو رہا تھا گاہک ایک قیمت کہتے اور دوکاندار ایک۔ اسی مصروفیت میں سورج نصف النہار پر پہنچ گیا۔ لوگوں کی ٹولیاں ادھر اُدھر درختوں کے نیچے جم گئیں اور کھانے کا دور شروع ہوا اور آم کے چھلکوں کے ڈھیر لگ گئے۔ سہ پہر بھی گذر گئی اور شام اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ شام ہوتے ہی بہت سے لوگ واپس ہونے لگے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے میدان آم کے چھلکوں اور کوڑے کرکٹ سے بھر گیا۔ دوکاندار سامان اٹھانے میں مصروف تھے اور رات ہوتے ہوتے وہ لوگ اپنا سامان لے کر چلے گئے۔ بعض بنڈیوں میں دراز ہو گئے آفتاب بھی دنیا کی دلفریبیوں اور جانے والوں پر ایک نظر حسرت ڈال کر اُفق مغرب میں غائب ہو گیا اور اس کی جگہ چاند کی نرم و منور کرنوں نے لے لی۔ نہر کا پانی چاندنی کرنوں میں پارہ کی طرح مچل رہا تھا۔ مندر سے بھجن کی آواز خاموش فضا میں گونج رہی تھی۔

سلطانہ عارف الدین

لطیفہ

لڑکا (ریلوے گارڈ سے) بھائی نے مجھے مارا ہے۔

گارڈ۔ تو میں کیا کروں تم مجھے کیا کہتے ہو۔

لڑکا۔ بھائی نے میرا آدھا ٹکٹ لیا ہے اور میری عمر بارہ سال کی ہے۔ بھائی سے پورے پیسے وصول کرو۔

سید واحد حسین اختر

چڑیا کی کہانی

ایک بادشاہ تھا اس کے باغ میں ایک چڑیا نے گھونسلا رکھا اس میں چار بچے دیئے۔ ایک دن بادشاہ کا مالی باغ میں گیا اور اس نے چاہا کہ بیلے، چنبیلی، موتیا اور جوہی کی ڈالیاں جو بہت بڑھ گئی تھیں ان کو قلم کر دے۔ گلاب، چنبیلی، موتیا وغیرہ تو اس نے کاٹ دیئے لیکن جوہی اس نے جوہی کی ڈالی پر ہاتھ ڈالا اس میں سے آواز آنے لگی کہ

نہ توڑ بادشاہ کے مالی نہ توڑ، پھولوں کی ڈالی نہ توڑ، جوہی کی ڈالی نہ توڑ

مرے جان محمد گر پڑیں مرے خان محمد گر پڑیں

مری شمو بو گر پڑے مری قمرو بو گر پڑے

مالی یہ آواز سن کر ڈر گیا اور دوڑا دوڑا وزیر کے گھر گیا اور خبر دی کہ جوہی کے درخت سے یوں آواز آتی ہے۔ وزیر فوراً یہ سن کر باغ میں آیا اور چاہتا تھا کہ جوہی کی ڈالی توڑے مگر ڈالی سے پھر وہی آواز آئی کہ

نہ توڑو بادشاہ کے وزیر نہ توڑو

پھولوں کی ڈالی نہ توڑو جوہی کی ڈالی نہ توڑو

مرے جان محمد گر پڑیں مرے خان محمد گر پڑیں

مری شمو بو گر پڑے مری قمرو بو گر پڑے

وزیر نے جو آواز سنی تو بڑا پریشان ہوا۔ دکھائی تو کچھ نہ دیتا تھا لیکن آواز برابر چلی آتی تھی۔ حیران تھا کہ کیا کرے۔ آخر اس نے جا کر بادشاہ سے عرض کی کہ جوہی کی ڈالی سے یوں آواز آتی ہے۔ بادشاہ خود آئے اور انھوں نے بھی چاہا کہ ڈالی کو توڑیں۔ ڈالی پر ہاتھ لگتے ہی پھر وہی آواز بلند ہوئی کہ:۔

نہ توڑو بادشاہ سلامت نہ توڑو

جوہی کی ڈالی نہ توڑو پھولوں کی ڈالی نہ توڑو

مرے جان محمد گر پڑیں مرے خان محمد گر پڑیں

مری شمو بو گر پڑے مری قمرو بو گر پڑے

بادشاہ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا درخت بہت گھنا تھا۔ بادشاہ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی چڑیا کا گھونسلا ہے مالی کو حکم دیا کہ بہت احتیاط سے اس ٹہنی کو کاٹ لے۔ جب ٹہنی کاٹی گئی تو واقعی اس پر ایک چڑیا کا گھونسلا تھا اور اس میں چار ننھے ننھے بچے بھی تھے۔

بادشاہ نے فوراً ایک بڑا سونے چاندی کا پنجرا تیار کروایا اور اس میں گھونسلا معہ ٹہنی کے رکھوا دیا اور پنجرے کو اپنے کمرہ میں لٹکا دیا۔ لیکن جب کبھی اس کے نزدیک جاتا یا ہاتھ لگانا چاہتا تو اس میں سے یہی آواز آتی کہ

نہ توڑو بادشاہ سلامت نہ توڑو

جوہی کی ڈالی نہ توڑو پھولوں کی ڈالی نہ توڑو

مرے جان محمد گر پڑیں مرے خان محمد گر پڑیں

مری شمو بو گر پڑے مری قمرو بو گر پڑے

آخر کار چڑیا کی بک بک سے بادشاہ تنگ آ گیا اور اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا کیونکہ اب پر پھوٹ چکے تھے۔ چڑیا دروازہ کھلتے ہی خوشی خوشی اپنے بچوں کو لے کر پھر سے اڑ گئی اور جاتی ہوئی یوں کہتی گئی۔

توڑ لو بادشاہ سلامت توڑ لو

جوہی کی ڈالی توڑ لو پھولوں کی ڈالی توڑ لو

مرے جان محمد نہ گریں مرے خان محمد نہ گریں

مری شمو بو نہ گرے مری قمرو بو نہ گرے

اور پھر باغ میں جا کر اپنے بچوں کے ساتھ آرام و چین سے رہنے لگی۔

سکینہ بیگم رحمت اللہ

گلاب

گلاب تمام پھولوں کا سردار ہے۔ یہ پھول جتنا عام اور ہر دل عزیز ہے اتنا کوئی اور پھول نہیں، اس کی پیاری شکل، نرالا رنگ اور بھینی بھینی بو کو کون پسند نہیں کرتا؟

گلاب کا پودا یا تو کھڑا ہوتا ہے یا بیل کی طرح درختوں کے اوپر یا زمین پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی شاخوں پر کانٹے ہوتے ہیں۔ عام طور پر گلاب کے پودوں میں کئی تنے ہوتے ہیں۔ یہ تنے چوبی اور خاردار ہوتے ہیں۔ تنے کا رنگ نئے پودے میں سبز اور زیادہ پرانے میں سیاہی مائل ہوتا ہے جوں جوں پرانا ہوتا جاتا ہے چھال بھی سخت ہوتی جاتی ہے۔

ٹہنیوں میں پتیاں کسی میں پانچ اور کسی میں سات ہوتی ہیں پتیوں کے جوڑے ہوتے ہیں ایک پتی ٹہنی کے اس طرف ہوتی ہے تو دوسری اس طرف آخر میں ٹہنی کے سرے پر ایک ہی پتی ہوتی ہے۔ پتیوں کا رنگ گہرا سبز ہوتا ہے، کنارے دندانہ دار کٹے ہوئے۔

گلاب کے پھول کے رنگ مختلف ہیں: سرخ، سفید، گلابی اور زرد زیادہ عام ہیں۔ گلاب کے پھول میں بہت سی پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ پھول دوہرا کہلاتا ہے۔ گلاب کے پھول کے بیچ میں ایک گچھا سا ہوتا ہے جس میں بیج ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے روئیں دار ریشے سے گھرے رہتے ہیں۔

گلاب کی کلیوں پر سبز رنگ کی پتیوں کا ایک غلاف چڑھا رہتا ہے یہ پھول کے نازک حصے کی حفاظت کرتا ہے۔ جب پھول کھل جاتا ہے تو چھوٹی چھوٹی رنگین پتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی پنکھڑیاں کہلاتی ہیں، پنکھڑیاں چکنی اور خوشبودار ہوتی ہیں۔

گلاب کے پھول زیب و زینت کا کام دیتے ہیں۔ باغوں میں، گھروں میں، ملاقات کے کمروں، کیاریوں اور گملوں میں لگاتے ہیں۔ پھول توڑ کر ہار اور گجرے تیار کرتے ہیں۔ پھولوں سے عطر اور عرق کشید کرتے ہیں۔ عرق بڑی مفید چیز ہے، جلسوں اور محفلوں میں لوگوں پر چھڑکتے ہیں۔ آنکھیں اگر دکھنے لگیں تو دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پنکھڑیوں سے گلقند بھی تیار کیا جاتا ہے جو دوا کا کام دیتا ہے۔

گلاب کی کاشت قلموں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ قلمیں فروری کے مہینے میں لگائی جاتی ہیں۔ قلموں کے سرے پر گوبر لگا دیا جاتا ہے تاکہ گرمی سے سوکھ نہ جائیں۔ قلمیں سیدھی نہ لگائیں بلکہ ترچھی ہونی چاہئیں۔ پانی صبح شام دیا جائے، دھوپ کے وقت نہیں۔

ابوالمحاسن متین حیدرآبادی

دکھ اور سکھ

میرا خیال ہے کہ دکھ ایک عارضی اور فانی چیز ہے، سکھ اصلی حقیقی اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے جو لوگ زندگی کو دکھ کی زنجیر سمجھتے ہیں اور اس سے نجات پانے کے لئے خودکشی کر لیتے ہیں میرے خیال میں ان کا دماغ درست نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کا دوسرا نام ہے مسرت۔ اور تکلیفیں مثل پھول کے آس پاس کے قدرتی کانٹے ہیں اور پھول کانٹوں میں محفوظ رہ کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قدسیہ ظہیرالدین احمد (محبوبیہ گرلز اسکول)

شیخ چلی

شیخ چلی کے پانچ دوست تھے۔ شیخ چلی نے اپنے بیٹے کو ایک بکرا دلایا۔ پانچوں دوستوں نے یہ سوچا کہ کسی طرح اس بچے کا بکرا کھا جانا چاہیئے۔ ایک روز انھوں نے بچے سے بکرا چھین لیا۔ بچے نے سارا واقعہ شیخ چلی سے بیان کر دیا۔ شیخ چلی کو غصہ آیا اور اس نے دوستوں سے بدلہ لینے کے لئے دو بندریاں رکھے تھے۔ اپنی بیوی سے کہا کہ آج دوستوں کی دعوت ہے۔ اس لئے تم بریانی، قورمہ، میٹھا، تیار کرو اس کے بعد شیخ چلی ایک بندر کو کاندھے پر بٹھا کر لے چلا جب دوست بازار میں ملے تو شیخ چلی نے ان کے سامنے بندر کو زمین پر چھوڑ کر کہا کہ گھر جا کر بیوی سے کہہ کہ آج میرے پانچوں دوستوں کی دعوت ہے۔ اس لئے بریانی، قورمہ، میٹھا، تیار کرے۔ اس کے بعد شیخ چلی نے بندر کو لات مار کر کہا کہ گھر جا۔ بندر سامنے سے بھاگ گیا لیکن وہ گھر نہ گیا بلکہ جنگل میں بھاگ گیا جب پانچوں دوست گھر آئے تو مکان میں ویسے ہی بندر کو دیکھا۔ اور دعوت کا سامان بھی بالکل وہی دیکھا جو شیخ چلی نے کہا تھا بندر کے اس کام کو دیکھ کر دوستوں نے اس کو خریدنا چاہا۔ شیخ چلی نے بندر کی قیمت دو ہزار بتائی۔ دوستوں نے دو ہزار روپے دے کر بندر کو خریدا۔ ایک روز ان ہی دوستوں نے بازار میں شیخ چلی سے ملاقات کرتے وقت اپنے بندر سے کہا کہ گھر جا کر کہنا کہ آج شیخ چلی کی دعوت ہے جلد کھانا تیار کرو۔

اس کے بعد جب شیخ چلی دوستوں کے ساتھ گھر گیا تو وہاں نہ بندر تھا نہ کھانا۔ بندر جنگل میں بھاگ گیا تھا۔ شیخ چلی کے دوستوں کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ شیخ چلی نے ایک بکرے کے بجائے دو ہزار روپیے وصول کئے۔

وحید الدین طالب علم (جماعت چہارم)

ریل گاڑی

ترے وجود نے عالم کو ایک کر ڈالا
دکن کو شرق کو پچھم کو ایک کر ڈالا

نہ ڈر ہے مینہہ کا ہم کو نہ دھوپ کا کھٹکا
نہ اس کا خوف کہ حایل ہے راہ میں دریا

اندھیری رات ہو طوفاں ہو یا کہ آندھی ہو
رواں دواں ہے وہ سردی ہو یا کہ گرمی ہو

مزے سے کھاؤ، پیو، بیٹھو، سوؤ یا لیٹو!
سفر میں ملتا ہے آرام گھر کا سا ہم کو

تو ہی نے ہم کو سکھایا کہ آ گئے جاؤ تم!!
جہاں کا تارا بنو اور جگمگاؤ تم!

کروگے محنت و کوشش تو پاؤگے آرام
عمل ہے تلخ مگر اس کا میٹھا ہے انجام

ہے سچ تو یہ کہ بڑا کام کر دیا تو نے
ہر اک کو وقت کا پابند کر دیا تو نے

نہ تھی نگاہوں میں کچھ اپنی وقعت و عزت
بڑھائی تو نے زمانے میں وقت کی قیمت

اگر ہو عاقل و دانا تو قدر اس کی کرو
نہ اپنے وقت کو بیکار ضایع ہونے دو

مسیح الدین خاں اقبال متین بشیر آباد

تربیت تعلیم سے زیادہ ضروری ہے

ہر بچے کے لئے ماں کی گود پہلا مدرسہ ہے اگر ابتدا ہی میں بچہ اچھا سبق سیکھے تو وہ اپنے سن شعور کو پہونچ کر لائق بنے گا. اگر خدانخواستہ کوئی بچہ ابتدا سے ہی نافرمان اور بے ادب نکلا تو صرف تعلیم سے اس کی اصلاح کا امکان نہیں ہے اس لئے ہر بچے کی ماں کا فرض ہوگیا کہ اول سے ہی اچھی باتوں کی جانب مائل کرے۔

بعض مائیں بچوں کی عدم تربیت کا الزام اپنے پر نہیں لیتیں اور کہتی ہیں کہ وہ تو (یعنی باپ) کبھی خفا ہوتے نہیں جو صحیح نہیں ہے اس لئے کہ بچوں کو پانچ یا چھ سال کی عمر تک خفا ہونا یا ڈرانا نہیں چاہیے ڈرانے کے باعث ان کے دماغی نشو ونما میں فرق آتا ہے جس سے تعلیم پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے بچے کی ذمہ داری ماں اور باپ دونوں پر مساوی ہے۔

آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے کہ تعلیم یافتہ ماں باپ بچوں کی تعلیم بچپن سے ہی آغاز کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلد وہ قابل بنیں مگر تربیت کے جانب توجہ نہیں کرتے جس کی وجہ خامی رہ جاتی ہے ہر بچے کے لئے تربیت اولاً ضروری ہے اس کے بعد بچے کو قابل بنا سکتی ہے اس نقطۂ نظر سے میرا خیال ہے کہ " تربیت تعلیم سے زیادہ ضروری ہے "

بعض بچوں کی طبیعت میں شرافت کا مادہ رہتا ہے کہ ماں کا لاڈ پیار ان کے حق میں بربادی کا باعث ہوتا ہے اس لئے ماں کو چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد سے مناسب محبت کرے اسی نظریہ کے تحت پرانے بڈھیوں کا قول ہے کہ " کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر " یہ کہاوت لفظ بلفظ صحیح ہے زمانہ سلف کے ماں باپ اسی اصول کے پابند تھے جب ہی تو تربیت و تعلیم ان کے بچوں کی ایسی رہی کہ آج بھی ہم کو ماننا پڑتا ہے آج کل تربیت کے معاملہ میں خاص توجہ و سختی برتنے کی ضرورت ہے۔

میری رائے میں بچوں کی تربیت کی ذمہ داری ماں پر اور تعلیم کی ذمہ داری باپ پر عاید ہونی چاہیے تنہا ماں کو یا باپ کو ذمہ دار قرار دینا مناسب نہیں ہے ماں کا یہ کہنا کہ میں اکیلی عورت کیا کر سکتی ہوں قابل تسلیم نہیں ہے البتہ فرمانبردار اولاد بنانا ماں کا فریضہ ہے اس لئے کہ اس کے بمقابلہ باپ کے ہر بچہ اپنی ماں کا اثر فطرتاً زیادہ قبول کرتا ہے. بچہ شعور کو پہونچنے کے بعد باپ کا اثر بچہ پر قائم ہونے سے تعلیم اچھی ہو سکتی ہے. مگر مڈل کامیاب ہونے تک تعلیم کا شوق دلانا استاد کا کام اور نگرانی کرنا باپ کا فرض ہے تعلیم سے زیادہ تربیت کو ضروری قرار دینا چاہیئے. تاکہ بچوں کا مستقبل بعد ختم تعلیم بہتر و شاندار بن سکے۔

بیگم حسن الدین محمد (ہنگولی)

کولمبس اور نئی دنیا

(یہ مضمون لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے براڈکاسٹ کیا گیا تھا)

عزیز بھائیو وہ ملک جس کو آپ امریکہ کہتے ہیں نئی دنیا کے نام سے بھی مشہور ہے اسی نام سے ہم کو پتہ ملتا ہے کہ وہ چار پانچ سو سال کے لوگوں کو یقینی ایک نئی دنیا معلوم ہوتی تھی. انگریز کہتے ہیں کہ براعظم یورپ قدیم دنیا میں شامل ہے تاکہ مشرقی اور مغربی ہمسفریں میں فرق معلوم کریں. اب آپ اس مشہور آدمی کے واقعات پڑھیں گے جس نے سب سے پہلے امریکہ کو تلاش کیا. اس زمانہ کے لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ دنیا ایک گیند کے مانند ہے کیونکہ اس وقت تک کسی شخص نے بھی دنیا کے اطراف سفر نہیں کیا تھا. اور اس زمانہ میں کوئی بڑا جہاز نہ تھا جو بہت بڑا دریائی سفر کر سکے. ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے اس زمانہ میں بہت سی کتابیں چھاپی گئیں. اور لوگ دنیا کے متعلق خیالات کو بدلنے لگے. اور بہت سے دریائی سفر پوری دنیا کی تلاش کے واسطے کئے گئے مگر ان سے زیادہ مشہور سفر امریکہ کا تھا. کولمبس شہر اٹلی کے ایک بندرگاہ میں جس کا نام جنیوا ہے پیدا ہوا اس کا باپ کوئی مالدار آدمی نہ تھا تاہم ہم اس نے

اپنے بیٹے کولمبس کو اچھی تعلیم دلوائی تھی کیونکہ کولمبس اور اس کے ماں باپ ہمیشہ دریا کے کنارے رہا کرتے تھے کولمبس بچپن میں جنیوا میں جہازوں کی آمد و رفت دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ کولمبس کو دریا سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ اس نے سولہ سال کی عمر میں دریائی سفر کرنا شروع کر دیا۔ اس کا سب سے پہلا سفر یہ تھا کہ دور دراز کے شمالی سرد مقامات تک گیا یہاں تک کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ سرد مقام پر گیا . . . . اور وہاں سے افریقہ کے گرم ملکوں سے ہوتا ہوا اپنے ملک جنیوا کو پہنچا۔ وہ قریب قریب ۲۵ سال سے زیادہ دریا پر تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اسی اثنا میں نئی دنیا کو پانے کا خیال کیا ہوگا۔ وہ دنیا کے نقشوں پر اچھی طرح حاوی ہو گیا تھا۔ وہ شروع ہی سے ملاحوں کے قصوں کو بہت دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اس نے دل میں یہ یقین کر لیا تھا کہ یورپ سے بہت دور مغرب کی جانب ایک دنیا ہے اور وہ امید رکھتا تھا کہ خود ہی پہلا شخص ہوگا جو اس نئی دنیا کو پائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں ایک بڑا دریائی سفر کرنا بہت ہی مشکل امر تھا کولمبس کو نئی دنیا کی تلاش کے لئے جہازوں اور روپیہ کی ضرورت تھی اس لئے اس نے اس زمانہ کے بادشاہوں سے اپیل کی کہ وہ اس کے اس کار عظیم میں مدد دیں۔ مگر کولمبس کو وہاں کے بجائے ملک اسپین کے بادشاہ سے امداد مل چکی تھی۔ اسپین سے رخصت ہوا۔ تو اس وقت ان تینوں جہازوں میں ایک سو بیس آدمی تھے۔ کولمبس مغربی جانب روانہ ہوا اور تقریباً اس کو دو ماہ تک کوئی زمین نظر نہ آئی۔ کولمبس اور اس کے ساتھیوں کا بحر اٹلانٹک عبور کرنا تھا! اس کے ساتھی زمین سے اتنی دور جانے کے بعد بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ کولمبس کے چند ساتھیوں نے ٹھان لی تھی کہ کولمبس کو دریا میں پھینک دیں اور خود اسپین کو واپس چلے جائیں مگر کولمبس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور وہ کئی طریقوں سے اپنے مشکلات پر غالب رہا اس نے اپنے ساتھیوں سے التجا کی کہ وہ چند روز اور صبر کریں کیونکہ اس کو یقین تھا کہ زمین قریب میں ملے گی۔

ایک روز صبح سویرے اکتوبر سنہ ۱۴۹۲ء میں زمین نظر آئی۔ اس وقت کولمبس اور اس کے ساتھیوں کی خوشی قابل بیان نہیں ہے جہازوں سے کشتیاں اتاری گئیں۔ اور لوگ اس میں بیٹھ کر کنارے کی طرف روانہ ہوئے۔ اس نئی دنیا میں جس شخص نے پہلے قدم رکھا وہ کولمبس ہی تھا۔ وہ مقام جس پر کولمبس نے پہلے قدم رکھا وہ ایک جزیرہ تھا۔ اور جس کو آج کل "امریکہ" کہتے ہیں۔ کولمبس نے اس کو اسپین کی ریاست میں شامل کر لیا۔ اور اسپین جانے کے لئے بہت جلد تیار ہوا تاکہ اسپین کے بادشاہ اور ملک کو اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائیں۔ وہ اپنے ساتھ ملک کے باشندے درخت جانور اور بہت سا سونا اور قیمتی جواہر لے گیا۔ جب کولمبس اسپین پہنچا تو اس کا نہایت پرجوش طریقہ سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور وہ بہت ہی بہادر مانا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کولمبس امریکہ کو دوبارہ روانہ ہوا۔

محمود علی متعلم (حیدرآباد دکن)

میرے ننھے تارے

ارے ننھے تارے مرے پاس آجا
تو اپنی چمک آکے مجھ کو دکھا جا

ادھر آ تجھے ہاتھ میں لے کے دیکھوں
یہ کیا بات ہے جو چمکتا ہے تو یوں

تو ننھا سا جگنو ہے اللہ میاں کا
تجھے اوڑھنی میں میں رکھوں اِدھر آ

زمین پر رہوں میں اور تم آسماں پر
بتاؤ تو پھر میں تمھیں پاؤں کیونکر

چلا آ چلا آ مرے پیارے تارے
چراغوں سے اچھے کھلونے سے پیارے

(ماخوذ از بنات دہلی)

مرسلہ جہاں بانو بیگم

سب رس جولائی ۱۹۳۸ء

اگر میں لکھپتی ہوتا

اگر میں لکھپتی ہوتا تو سب سے پہلے ملک کی مایۂ ناز یونیورسٹی جامعۂ عثمانیہ میں شریک ہو کر زیور علم سے مزین ہوتا۔ معاشیات خالص میرے مضامین ہوتے۔ معاشی اصول و ضوابط پر عبور حاصل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھتا تو بجائے طوق غلامی گلے میں ڈالنے کے خدمت ملک و قوم کو اپنا فرض اولین سمجھتا۔ ملک کی معاشی پستی کا بنظر غائر مطالعہ کرتا۔ چند زرعی مدارس قائم کرتا جس میں صحیح اصول زراعت بتلائے جاتے۔ ابتدائی تعلیم کا خیال رکھتا جس کی ملک کو سخت ضرورت ہے۔ اس طرح نونہالان وطن آوارگی سے باز رہتے۔ چند صنعت و حرفت کے ادارے بھی قائم کرتا۔ اور اس میں اُن نوجوانوں اور ہوشمند بچوں کی کھپت ہوتی جو آج کل باوجود تندرست و توانا ہونے کے دربدر بھیک مانگ رہے ہیں۔ ملک میں شکرسازی کا ایک کارخانہ اور اس سے متصل اور موزوں زمین پر نیشکر کی کاشت کا خاطر خواہ انتظام کرتا جس سے حصول شکر میں آسانی ہوتی۔ ایک مستقل کارخانہ دیاسلائی و صابن سازی کا بھی قائم کرتا۔ اس میں کافی مزدور کام کرتے اور اُن سب کی احتیاجات پوری ہو جاتیں۔ ایسے کارخانوں کی ملک میں شدید ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ترک مسکرات کی تائید میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا۔ جو ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کا سدباب کرنے سے مجھے اچھے سے اچھا کاریگر ارزاں اُجرت پر دستیاب ہوتا۔ اپنا زیادہ وقت قوم کی خدمت کے لئے وقف کرسکتا۔

چند انجمنیں قائم کرتا جن میں اصلاح عقائد کا کام ہوتا۔ اس طرح آئندہ نسلوں میں تفریق و فرقہ بندی جیسی بُری باتوں کا سدباب ہو جاتا۔

تقسیم دولت اور بہترین تنظیم سے خاطر خواہ نظام پیدا کرنے کے بعد ایک دفعہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا اور مشہور تاریخی مقامات کے سفر سے لطف اندوز ہوتا۔ اس طرح میں اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کر کے ملک و قوم میں اپنی یاد چھوڑ جاتا۔

حسین شریف (دوم مسلم ہائی کلاس)

رات کی تاریکی

میں ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ایک تالاب نظر آیا۔ میں نے ساتھیوں سے نہانے کی اجازت لی اور تالاب کی طرف چل پڑا۔ پہلے غوطے میں مجھے کچھ معلوم نہ ہوا دوسرے غوطے میں میں نے محسوس کیا کہ تالاب کا پانی شہد کی طرح مجھ سے لپٹ گیا ہے میں نے سمجھا کہ یہ تالاب جادو کا بنا ہوا ہے۔ ڈر کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ میں گرتے پڑتے باہر آیا اور جسم کو کپڑوں سے صاف کیا۔ اور ایک درخت کے نیچے سو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام چیونٹیاں اور کوڑے میرے جسم سے لپٹ گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کس طرح اپنے کو ان سے آزاد کروں۔ مگر میری یہ تمام تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں میں نے اپنی آزادی کے لئے دعا کی۔ اور اس کے بعد ہی دیکھا کہ تمام آسمان کالے بادلوں سے گھر گیا ہے۔ بجلی چمکنے لگی بادل گرجنے لگے۔ اور بارش شروع ہو گئی اور میں اکیلا اس لق و دق جنگل میں بے کس و بے بس تھا۔ بارش نے میرے جسم کو بالکل صاف کر دیا تھا۔ اور کپڑے بھیگ گئے تھے سوکھے کپڑوں کے لئے میں نے قافلے کی تلاش کی۔ مگر قافلہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ مجھے بھیگے کپڑوں سے سردی لگ رہی تھی۔ اور اسی دھن میں تھا کہ کسی طیارے کی آواز آئی۔ میں نے اپنی جیب سے سرخ دستی نکال کر ہوا میں لہرانا شروع کی۔ تاکہ طیارچی مجھ کو مصیبت زدہ سمجھ کر اپنے ساتھ طیارہ میں بٹھا لے

میری یہ تدبیر کارگر ہوئی اور طیارہ زمین کی طرف اترنے لگا۔ آخر سلامتی کے ساتھ زمین پر پہنچ گیا طیارچی نے مجھے اپنے طیارہ میں جگہ دی۔

طیارہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا ہم بادلوں سے کھیل رہے تھے کہ برف باری شروع ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد طیارہ دھڑام سے زمین پر گر گیا اس کی آواز سے آنکھ کھل گئی اور میں خود کو بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ کچھ فاصلہ پر ایک جھلملاتا چراغ رات کی گہری تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

محمد فیروزالدین صدیقی (دہم ب)

کھیل کی ضرورت

کھیل کی ہر انسان کو ضرورت ہے۔ کھیل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی جیسے آنکھ مچولی ٹینس وغیرہ۔ دوسرا دماغی جیسے شطرنج، BRIDGE، وغیرہ۔ ہمارے جسم کو ورزش کی بہت ضرورت ہے۔ کھیلنے سے ورزش ہوتی ہے۔ شطرنج کھیلنے سے ہمارے دماغ میں سوچنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ کھیل سے بدن میں چستی پیدا ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں طبیعت بشاش رہتی ہے۔ دماغ آرام پاتا ہے اس لئے کہ وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا اور کھیلنے سے اس کو آرام پہنچتا ہے۔ اور ذہن چالاک ہوتا ہے۔ کھیل سے کھانا بھی ہضم ہوتا ہے۔ کھیل بچوں کے لئے بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس زمانے میں ان کی ہڈیاں نرم رہتی ہیں۔ کھیلنے سے یہ اور مضبوط ہوتی ہیں۔ کھیلنے سے انسان کی عمر بھی بڑھتی ہے۔ بیماری بہت کم آتی ہے۔ اس لئے کھیل ہر شخص کے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی کھیلے نہیں تو وہ بہت جلد بیمار ہو جاتا ہے اور اس کی عمر گھٹ جاتی ہے۔

زہرہ ہاشم علی

مکہ مسجد

مکہ مسجد حیدرآباد میں سب سے بڑی مسجد ہے یہ چارمینار کے جنوب میں واقع ہے۔ جمعہ کے روز یہاں ہزارہا آدمی نماز پڑھتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہر رات کو ہزارہا آدمی تراویح پڑھتے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں ہوئی۔ یہ قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ بڑا نیک اور پارسا تھا۔ اس مسجد کا پایہ رکھنے کے وقت اس نے حاضرین سے کہا کہ جس شخص کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی ہو وہ اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھے۔ بڑے بڑے مذہبی لوگ وہاں حاضر تھے۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جس کی ایک نہ ایک نماز قضا نہ ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے خود کہا کہ بارہ سال کی عمر سے اب تک ایک نماز یہاں تک کہ تہجد کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی پھر بڑھ کر خود ہی نے سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۰۲۴ھ میں یہ مسجد بننا شروع ہوئی۔ یہ میر فیض اللہ بیگ داروغہ اور رنگیا چودھری کی نگرانی میں بنی۔ رنگیا چودھری کا خطاب ہنرمند خاں تھا۔ دو ہزار معمار دو ہزار سنگ تراش اور چار ہزار مزدور بنانے کے لئے مقرر کئے گئے۔ جس قدر اس کی تعمیر میں پتھر لگا ہے اس کا بہت بڑا حصہ لگن پہاڑ سے لایا گیا جو حیدرآباد کے جنوب تقریباً ۹ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مسجد کے بلند ستون ایک ڈال پتھر کے تراشیدہ ہیں۔ یہ مسجد جب تیار ہوئی تو سلطان محمد قطب شاہ نے اس مسجد کا نام "بیت العتیق" رکھا۔ مورخوں نے کہا ہے کہ کئی سو مزدوروں نے متواتر پانچ سال کام کرنے کے بعد ان کو کان سے نکالا تھا اور معدن سے مسجد تک ایک ہزار چار سو بیل کھینچ کر لائے تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ اور سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے اس کی درستی کی طرف توجہ کی اور اس پر آٹھ لاکھ روپیہ خرچ کئے۔

جب شہنشاہ اورنگ زیب نے قطب شاہی سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس نے مسجد کے اندر کی عمارت پر باریک چونا کرایا اور اس کے علاوہ نماز کے اوقات معلوم ہونے کے لئے سنگ موسیٰ کی ایک دھوپ گھڑی صحن میں بنوائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے اس مسجد کا نام "بیت العتیق" کے بجائے "مکہ مسجد" رکھا۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام ابوالحسن تاناشاہ کا رکھا ہوا ہے۔ لیکن آج کل اس مسجد کو مکہ مسجد کہتے ہیں۔

ایس۔ پی۔ راج
(متعلم)

نکتہ چینی

سب رس جولائی ۱۹۴۵ء

بعض طبیعتوں کا قاعدہ ہے کہ ان سے کسی امر کے متعلق رائے پوچھی جائے نہ پوچھی جائے لیکن وہ اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے نکتہ چینی سے باز نہیں آتے یہ لوگ ایسے بدبیں اور بدطینت ہوتے ہیں کہ محض اس خواہش کے لئے کہ دنیا انھیں معتبر اور واقف کار کہے وہ ایک بھلی چیز میں بھی نقص نکال دیتے ہیں اور سو سو طرح اس کی برائیاں ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کرتے ہیں۔ کسی کے متعلق ان کی ذاتی رائے دریافت کریں یا نہ کریں۔ لیکن وہ اس کا نام آتے ہی صدہا اعتراضات کی بوچھار شروع کر دیتے۔ اس ہرزہ سرائی اور بدطینتی کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ زمانہ ان سے نفرت کرتا ہے اور ہمیشہ ان سے الگ تھلگ رہنے کی ممکنہ کوشش کرتا ہے۔ مہذب اور سنجیدہ لوگ انھیں کبھی اپنی مجلس میں شریک کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ یہ دنیا پر روشن ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی نہایت ہی ذلت اور نامقبولیت کی حالت میں بسر ہوتی ہے اور یہ جہاں کہیں جاتے ہیں تو لوگ ہرگز ان کے اٹھنے بیٹھنے کے روادار نہیں ہوتے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کور باطن ہم پر بھی نہ کبھی کوئی ناشائستہ حملہ کر ہی دے گا۔ فی الحقیقت نکتہ چینی اخلاق کا بالکل خاتمہ ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ازراہ ورید کے لئے بھی نکتہ چینی کے عادی نہ بنیں۔ بالفرض ہم سے اگر کسی ایسے مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جائے جس کے متعلق ہم اپنا اچھا خیال ظاہر نہ کر سکتے ہوں تو احسن یہ ہے کہ خاموشی اختیار کر لیں اور اگر اصرار سے جواب طلب کیا جائے تو نہایت سنجیدگی اور نیک نیتی کے ساتھ مناسب الفاظ میں جو مخاطب کی ناگواری کا باعث نہ ہوں اپنا خیال ظاہر کر دیں۔

دختر سلطان محمود
(محبوبیہ گرلز اسکول)

سادگی

کیا کہوں تم سے کہ کیا ہے سادگی — رہبرِ راہِ خدا ہے سادگی
ہے تکلف اور ریا کا دخل کیا — دینِ حق کا اقتضا ہے سادگی
ہر طرف ہے حسنِ فطرت کا نمود — ہر طرف جلوہ نما ہے سادگی
سادگی سے حسن ہر اک شئے میں ہے — زینتِ ارض و سما ہے سادگی
بے تکلف مورد کبر و ریا — منزلِ صدق و صفا ہے سادگی
بانوا کے حق میں ہے حسنِ عمل — بے نوا کا آسرا ہے سادگی
تم قناعت جس کو کہتے ہو سنو — نام اس کا دوسرا ہے سادگی
الغرض شاہد ہے ساری کائنات — حسن ہے۔ حق کی عطا ہے سادگی
مختصر تعریف۔ ماجد سے سنی — ہو گیا معلوم کیا ہے سادگی

از محمود عبدالماجد ماجد
(متعلم)

خواجہ محمود گاواں

خواجہ گاواں کا اصل نام خواجہ عماد الدین تھا۔ صوبہ گیلان کے قریہ قاواں میں ۸۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ انقلابِ زمانہ کی وجہ ترک وطن کر کے تاجر کی حیثیت سے ملک ملک کی سیر کرنے لگا۔ ہمیشہ علماء کی صحبت میں رہا کرتا اور خود بھی ایک اچھا عالم تھا۔

۴۳ برس کی عمر میں تجارت اور علم کی تحقیقات کرتے کرتے ہندوستان آیا اور سیدھا دکن کا رخ کر کے محمد آباد (بیدر) میں ایک بزرگ شاہ محب اللہ کرمانی سے ملا۔ اس وقت دکن میں سلطان علاء الدین بہمنی ثانی کا دَور دورہ تھا۔ اس زمانہ میں خواجہ محمود گاواں کو ایک معمولی سی جگہ مل گئی جب سلطان علاء الدین بہمنی ثانی کا انتقال ہوا تھا تو محمد شاہ ثانی کا دَور دورہ شروع ہوا تو خواجہ محمود گاواں اپنی وفاداری اور لیاقت کی وجہ سے سلطنت بہمنی کا وزیر مقرر ہوا اور شاہی فرمان کے ذریعہ مخدوم جہانیاں اور امیر الامراء خواجہ جہان خطاب ملا۔ غرض ملک کی ہمدردی اور وفاداری کی وجہ سے یہ خطابات حاصل ہوئے تھے۔ محمود گاواں جس کے رکاب میں وزیر سلطنت کی حیثیت سے جلو میں ہزار سوار رہتے تھے جب اپنے مکان جاتا تو وہ سب لباس اتار کر اپنے معمولی سے کپڑے پہن کر زندگی گزار دیتا تھا۔ خواجہ محمود گاواں نے تمام عمر تنخواہ سے زیادہ ایک حبہ نہ لیا لیکن اپنے شریف پیشہ تجارت کو ترک نہیں کیا بلکہ جو کچھ بھی تجارت سے آمدنی ہوتی خزانہ میں درویشوں کے نام الگ جمع رہتی تھی۔ اور اپنے ضروری خرچ کے بعد جو کچھ بھی بچ رہتا یتیموں، مسکینوں اور غریبوں میں تقسیم کرتا۔ مطبخ شاہی میں عمدہ عمدہ کھانے پکتے تھے مگر وہ ان کو چکھتا بھی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا کھانا اور وہ بھی مٹی کے برتن میں کھاتا۔ ایسا جلیل القدر وزیر کبھی پلنگ پر نہیں سویا بلکہ بوریے پر سویا کرتا اور ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ شب کو اپنا بھیس بدل کر اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر تمام شہر کی گشت لگاتا تھا۔ مسکینوں اور معذوروں کو دے کر یہ کہتا کہ یہ بادشاہ کا عطیہ ہے تم لوگ ان کو ہمیشہ سلامتی کی دعا دیتے رہو۔ خواجہ محمود گاواں نے محمد آباد (بیدر) میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ ۱۴۷۲ء میں تعمیر کروایا۔ یہ عمارت نہایت مستحکم اور رفیع الشان ہے اور ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مدرسہ کے سامنے دو بہت ہی بلند مینار ہیں جن میں سے ایک ابھی تک موجود ہے جو تقریباً سو فٹ بلند ہے اور اس پر کلام اللہ کی آیتیں نہایت خوش رنگ اور عمدہ خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ طلبہ کے رہنے کے لئے کشادہ حجرے بنے ہوئے تھے جو طالب علم مدرسے میں رہتے تھے ان کو کھانا اور کپڑا مفت ملتا تھا اور اپنے وسیع معلومات سے طلبہ کو مستفید کرتا اور درس بھی دیا کرتا تھا۔

خواجہ جہاں کی شہادت کا حال بڑا درد انگیز اور عبرت خیز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی موت زندگی سے زیادہ شاندار تھی۔ امراء خواجہ جہان سے بہت حسد کرتے تھے اور بادشاہ کی چاہت سے ان کو بہت رشک ہوتا تھا اور وہ انہیں ایک آنکھ بھی نہ بھاتا تھا۔ دشمنوں نے سازش کی اور محمود گاواں کے غلام کو روپے کی لالچ دے کر شراب سے مست کر کے جعلی باغی نامہ پر مہر کروا لی۔ اور محمد شاہ ثانی کے ملاحظہ میں پیش کر دیا۔ بادشاہ کو خیال بھی نہ گزرا کہ یہ سازش کس کی ہے۔ بادشاہ کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور فوراً خواجہ جہان کو طلب کر کے وہ خط دکھایا۔ خواجہ جہاں نے دیکھ کر کہا کہ یہ مجھ پر تہمت باندھی گئی ہے مہر تو بیشک میری ہے لیکن خط میرا نہیں اور اپنی بے گناہی کی قسم کھائی مگر بادشاہ کے دل پر اثر نہ ہوا اور اپنے غلام جوہر کو خواجہ جہاں کے قتل کا حکم دیا۔ خواجہ جہاں نے سلطان سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تو اپنی عمر ختم کر لی ہے اگر آج قتل نہ ہوا تو کل اپنی موت سے مر جاؤں گا۔ مگر میرا قتل ملک کی خرابی اور حضور کی بدنامی کا موجب ہوگا۔ محمد شاہ بہمنی نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا اور سیدھا محل میں چلا گیا۔ خواجہ جہان نے قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھی اور کلمہ پڑھنے کے بعد غلام نے محمود گاواں کا کام تمام کر ڈالا۔ خواجہ جہاں اپنے ملک کا جان نثار بن کر زندہ رہا۔ جونہی اس کی آنکھیں بند ہوئیں ملک کے ہر گوشے سے بغاوتیں شروع ہو گئیں بعد چند ہی دنوں میں ڈیڑھ سو برس کی زبردست حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔

محمد رحمت اللہ خاں متعلم سٹی کالج (نہم)

پچی کا ڈر

ہوا غضب زور سے چل رہی تھی بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے بجلی کبھی کبھی اپنی چمک سے آنکھیں خیرہ کر رہی تھی چھوٹی سی لڑکی ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی اُس کی بہن شوخی سے کہہ رہی تھی چلو چلو منی باغ چلیں اور بہت سے پھول توڑ لائیں آج رشید بھائی جب گھر آئیں تو پھول خوب برسائیں آہا کتنا اچھا دن ہے کیوں تم بہت سُست ہو کیا بات ہے امی نے تم کو آج سوئیٹ اور چاکلیٹ نہیں دیئے یا تمھارے کھلونے رشید بھائی نے توڑ دیئے کیا بات ہے۔ کہو منی۔ منی نے کہا نہیں آپا میں تو "میگل راجہ" سے ڈر رہی ہوں کہ آگر کہیں مجھے اور آپ کو پکڑ نہ لیجائیں۔ انا میری کہتی تھی کہ میگل راجہ ڈراتے ہیں، چمکاتے ہیں پھر چھوٹی لڑکیوں کو کپڑ لیے جاتے ہیں۔ آپا جب سے میگل راجہ ڈرائے چمکائے جاتے ہیں اب آئیں گے اور ہم کو پکڑ لیجائیں گے صفیہ نے کہا نہیں میری منی "میگل راجہ" تو بہت اچھے ہیں ان کے آنے سے کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے اگر "میگل راجہ" آئیں تو تم کو بتاؤں گی۔ کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں کی باتیں رشید چپکا کھڑا سن رہا تھا تھوڑا پانی سوئیٹ اور چاکلیٹ لے کر چھت پر گیا بوندیں برسانے لگا بوند کے ساتھ ایک ایک سوئیٹ اور چاکلیٹ برسا رہا تھا منی نے کہا آپا آپا میگل راجہ سوئیٹ بھی برسا رہے ہیں صفیہ کو حیرت تھی کہ پانی کے ساتھ سوئیٹ چاکلیٹ کیسے برس رہے ہیں۔ صفیہ نے کہا منی آؤ چھت پر جاکر "میگل راجہ" کو پکڑ لیں گے۔ جب ہمارے یہاں میگل راجہ آجائیں گے تو روز بہت سارے سوئیٹ ہم کو ملیں گے۔ دونوں یہ باتیں کرکے بہت خوشی خوشی سے چھت پر بھاگے رشید دروازے کے بازو چھپ گیا دونوں لڑکیاں داخل ہوتے ہی زور کی آواز دی منی تو ڈری ہوئی تھی ایک دم سے چیخ کے ساتھ گر گئی۔ صفیہ نے سنبھالا اور کہا منی "میگل راجہ" کو اب تو خوب سزا دیں گے۔ منی اٹھی دونوں لڑکیوں نے رشید کو پکڑ لیا اور خوب ہنسنے لگے اتنے میں ان کے امی اور ابا آگئے دیکھا فرش پانی سے تر ہے لڑکیاں اوپر ہنس رہی ہیں دونوں جلد اوپر گئے جاتے ہیں صفیہ اور منی نے کہا "میگل راجہ" کو ہم نے گرفتار کر لیا۔ آپ سزا دیجئے رشید نے سارا قصہ سنایا اور کہا امی جان انا کو منع فرما دیجئے کہ منی کو نہ ڈرائیں منی نے کہا رشید بھائی "میگل راجہ" سے اب نہیں ڈرتی وہ تو سوئیٹ دیتے ہیں۔

معصومہ میر رضا علی (محبوبیہ گرل اسکول)

محنت کا پھل

۱۔ غازی مصطفیٰ کمال اتاترک:۔ ایک غریب زمیندار کا لڑکا جو ترقی کرتے ہوئے آج ترکوں کے سفید و سیاہ کا مالک بنا بیٹھا ہے۔

۲۔ رضا شاہ پہلوی:۔
ایک معمولی سپاہی جس نے ترقی کرتے کرتے ایران کی شہنشاہی حاصل کی۔

۳۔ مسولینی:۔
ایک غریب خاندان کا آزاد لڑکا جو اٹلی کا مطلق العنان آمر ہے۔

۴۔ ہٹلر:۔
ایک مفلس خاندان کا آوارہ گرد لڑکا جو آج جرمنی کا آمر ہے۔

۵۔ حسن گانگو بہمنی:۔
ایک غریب کسان تھا جس نے ایمان داری اور محنت کی وجہ سے ترقی کرتے ہوئے دکن کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالیں

محمد محی الدین جنیدی (متعلم فنیہ کا بیگلہ)

کھیل

کھیلنا بچوں کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے بہت شوق سے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح وہ کھیل میں ان قوتوں کی پرورش کرتے ہیں جو آگے چل کر ان کی عملی زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے پھیپھڑے، دل، اعصاب اور ہاضمہ کھیل ہی کے ذریعہ قوی اور ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات اور سکنات کھیل ہی میں پختہ ہوتے ہیں۔ کھیل ہی سے اپنے ماحول کو صحیح طور پر سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور بیماریوں سے مدافعت کی قوت بھی کھیل ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ غرض کھیل ہی کے ذریعہ بچے تندرستی، طاقت اور تحمل کی صفات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن کھیل کے اثرات صرف جسمانی ترقی ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ کھیلوں سے اخلاقی اور دماغی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ کھیل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے بچوں کے طبعی رجحانات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ چونکہ کھیل ہی کے ذریعہ بچوں کی مختلف قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اس لئے قدیم زمانہ سے تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔

افلاطون کا قول ہے "تعلیم کی ابتدا بچوں کے کھیلوں کی صحیح رہنمائی سے ہونی چاہیئے"۔ اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود اکثر والدین اپنے بچوں کو قبل از وقت کھیلوں سے چھڑا کر مدرسوں میں نصابی تعلیم کے حاصل کرنے میں منہمک کر دیتے ہیں گویا وہ اس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں کہ بچوں کی آئندہ زندگی کے لئے بعض تعلیم کافی نہیں۔ کھیل میں بچے اپنی آپ تربیت کرتے ہیں۔ کھیل کے جسمانی اور دماغی پہلوؤں سے قطع نظر اس کے سماجی اور اخلاقی پہلو بھی ہیں جن کو ایک عرصہ دراز تک نظر انداز کیا گیا۔ بالخصوص اس کے سماجی پہلو کو آج تک وہ اہمیت نہیں دی گئی جتنی دینی چاہیئے تھی جب ڈیوک آف ولنگٹن سے پوچھا گیا اور اس نے واٹرلو کی جنگ میں کس طرح فتح حاصل کی تو اس نے جواب دیا کہ وہ جنگ سالہا سال قبل ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں فتح کی گئی تھی۔ اس کے باوجود ہم یہ امر فراموش کر دیتے ہیں کہ کھیل کے میدانوں پر ہی لڑکے قائد بننا یا دوسروں کی رہنمائی میں ملنا سیکھتے ہیں یہیں وہ مخالف قوتوں کے خلاف جد و جہد کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کھیل کے میدانی تجربات ہی سے بچے یا تو جھگڑالو اور ظالم ہو جاتے ہیں یا بزدل۔ لیکن منظم اور نگرانی شدہ کھیلوں میں یہ نقائص پیدا نہیں ہونے پاتے۔ انہی کے ذریعہ بچے دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ مل جل کر رہنا سیکھتے ہیں اور اپنے کام کو امداد باہمی کے اصول پر انجام دیتے ہیں۔ خود اعتمادی، اطاعت گزاری، فرض شناسی اور احساس تنظیم جیسی بیش بہا صفات کھیل کے میدان ہی پر استوار ہوتی ہیں۔ کھیلوں کے قواعد کی پابندی سے ان میں باضابطگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔

منظم کھیل بچوں میں جمہوری خیالات و رجحانات بھی پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ بچے اپنا کپتان خود منتخب کرتے ہیں اور پھر اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ مدرسہ کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان کے حق میں درس گاہ کی حیثیت ایک "شہنشاہیت" کی سی ہے جہاں استاد یا مدرس کے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ مدرسہ میں ان پر جو پابندیاں لگادی جاتی ہیں وہ دوسروں کی وجہ سے ہوتے ہیں اور ان کی پابندی پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے کھیل کے میدان میں وہ ان اصولوں کی پابندی کرتے ہیں جو خود انھوں نے اپنے لئے بنائے ہیں اس طرح بچے میدان میں حکومت کے قوانین کی تعظیم اور ان کی پابندی کرنے کا سبق حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کھیل انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کا سبق دیتے ہیں۔ ٹیم کی کامیابی کو کسی ایک کھلاڑی کی شاندار کامیابی یا کارنامہ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بچوں کو اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی اغراض کا قربان کرنا پڑتا ہے۔ جماعت کی کامیابی کو وہ اپنی فتح اور اس کی شکست کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اس طرح بچوں میں اپنی جماعت کے لئے جذبہ وفاداری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ احساس ان کے کردار کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ ذاتی مفاد کی قربانی اور اجتماعی مفاد کے حاصل کرنے کی

متفقہ اور ان تھک کوشش کرنا ایک ایسا جذبہ ہے جس کے حامل کسی ملک کے بہترین اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں۔ وہ شخص جو صرف اپنی ذات اور اپنے مفاد کا خیال رکھے اچھا شہری نہیں بن سکتا۔ برخلاف اس کے وہ شخص جو اپنے کو ایک بڑے جسم کا ایک عضو سمجھ کر اس کی بھلائی کی خاطر کوشش کرے ایک کامیاب شہری ہو سکتا ہے۔ اسی سے قومیت کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ کسی جماعت کی کامیابی کے لئے جذبۂ محبت سے زیادہ جذبۂ وفاداری کو اہمیت حاصل ہے۔ بچوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو ایسے کھیلوں کی ترغیب دی جائے جن کے کھیلنے میں مختلف جماعتیں یا گروہ درکار ہوں کیونکہ اس جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ان میں کا ہر فرد اس کی کامیابی کے لیے متعدد کوششیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن کا اظہار عملاً دوسرے کھیلوں میں ممکن نہیں۔ عملی زندگی میں انسان کو جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جلد کسی نتیجہ پر پہونچ کر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ یہ سبق بھی کھیلوں میں بہت اچھی طرح حاصل کیا جاتا ہے کیونکہ وہی کھیل دلچسپ اور کامیاب ہوتا ہے جب کہ اس کے کھلاڑیوں میں موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے اور اس پر فوراً عمل پیرا ہونے کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہو۔ فرض کیجیے کہ فٹ بال کے ایک کھلاڑی کو تین چار مخالف کھلاڑیوں نے گھیر لیا ہے۔ ایسے موقعہ پر وہ مجبور ہے کہ فوراً کوئی ترکیب ذہن میں سوچے کہ خود کو بھی نجات ملے اور گیند مخالف کھلاڑیوں میں جانے نہ پائے۔ وہ بغیر بدحواس ہوئے فوراً گیند کو ایک قریبی ساتھی کے پاس اچھال دیتا ہے۔ اس کی یہ کامیابی اس کے فکر اور عمل کے باہمی اور فوری مطابقت میں مضمر ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ کھیل کے مقابلوں میں ایسے نازک مواقع روزانہ پیش آتے ہیں اور اچھے کھلاڑی ان سے کبھی نہیں گھبراتے بلکہ مستقل مزاجی اور دلجمعی کے ساتھ خطرات پر غالب آتے ہیں۔ کیا یہ چیز عملی زندگی میں ضروری نہیں؟ کتابیں جن میں عملی پہلو سے زیادہ نظری پہلو کو اہمیت دی جاتی ہے یہ سبق دینے سے قاصر ہیں۔ کھیل میں بچے رنگ، نسل، مذہب اور امارت وغربت کے امتیازات کو بڑی حد تک فراموش کر دیتے ہیں اور اس طرح رواداری کی عادت پڑتی ہے جس کی ہندوستان جیسے ملک میں سخت ضرورت ہے۔ یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لڑنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اس فطری جذبہ کو کھیل کے مقابلوں کی صورت میں ظاہر نہ ہونے دیا جائے تو وہ ملک میں باہمی فتنہ و فساد، جنگ و جدال، کشت و خون، مذہبی اور فرقہ واری کشمکشوں کی صورت میں نمودار ہو کر تباہی لاتا ہے۔ اسی لئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں "اسپورٹس" کا رواج جتنا زیادہ ہوتا جائے گا اتنا ہی آپس کی جنگ جوئی اور اختلافات کم ہوتے جائیں گے۔ اسی قسم کے کھیلوں میں بچے کی تربیت ہوتی ہے کہ وہ کھیل میں دھوکہ اور فریب سے کام نہ لے۔ اپنی ٹیم کی کامیابی کے لئے غیر موافق حالات کا مردانہ وار مقابلہ شروع سے آخر تک کرے اور اگر کامیابی نہ ہو تو اپنی شکست کو خندہ پیشانی سے قبول کرے اور مخالف جماعت کو کسی قسم کا ضرر پہونچانے کی کوشش نہ کرے بلکہ حکم کے فیصلے کو اول و آخر جانے۔ مخالف ٹیم کا خیر مقدم کرے اور اس کی مہمان نوازی و دلجوئی کو اپنا فرض سمجھے۔ انہی خوبیوں کی بنا پر کھیلوں کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ میں ہر سال بڑے بڑے بین الاقوامی مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور ان میں مرد اور عورتیں یکساں طور پر حصہ لیتے ہیں اور اس طرح بین الاقوامی رشتے استوار ہوتے ہیں۔ (ماخوذ)

سید محمد یعقوب

کام کی باتیں

(۱) بہترین ناصح دل ہے۔ بہترین استاد زمانہ ہے۔ بہترین کتاب دنیا ہے۔ بہترین دوست خدا ہے۔ (تالمود)

(۲) بدبختی کے زمانے میں بھی ناامید نہ ہو کیونکہ سیاہ بادلوں سے شفاف پانی برستا ہے۔ (نظامی)

(۳) تندی ایک مخلص دوست کو بھی چھڑا دیتی ہے اور مہربانی جانی دشمن کو بھی جوڑ دیتی ہے۔ (عمر خیام)

سیدہ عظیم النساء بیگم

چڑیا کی کہانی

ایک ننھی منی چڑیا
ایک تھا اس کا ننھا بچہ
ماں نے اس کو اڑنا سکھایا
چگنے کا بھی ڈھنگ بتایا
آگیا اس کو کچھ اڑنا
پھرنے لگا وہ اِس جا اُس جا
اڑتے اڑتے باغ میں آیا
باغ ہمارے منو میاں کا
منو میاں نے دیکھا اس کو
اور پکڑنا چاہا اس کو
منو میاں جب دوڑے پکڑنے
پھر سے لگا وہ فوراً اڑنے
ننھا پرندہ آگے آگے
منو میاں تھے پیچھے پیچھے
اڑکر ماں کے پاس وہ پہنچا
خوف سے اس کا سانس تھا پھولا
ماں نے گلے سے اس کو لگایا
لے کے بلائیں پیار سے پوچھا
کیوں مرے ننھے بتا یہ کیا ہے
کس کا تجھ کو خوف ہوا ہے
کیوں ہے ترا یہ حال پریشاں
کیوں تو ہوا جاتا ہے ہراساں
جب یہ کسی کا اس کو رہا ڈر
کہنے لگا وہ ماں سے رو کر
اوہ امری پیاری اچھی اماں
پیچھے پڑا ہے طفلِ انساں
چاہتا ہے وہ مجھ کو پکڑنا
فولادی پنجے میں جکڑنا
واقعہ صرف اتنا ہی ہوا تھا
چین سے میں گھر میں بیٹھا تھا
بیٹھے بیٹھے جی میں آئی
سیر کروں اس وقت چمن کی
اڑتے ہوئے اک باغ میں پہنچا
تتلی سی اک شاخ پہ بیٹھا
دم بھی ابھی لینے نہ پایا
آیا اودھر انسان کا بچہ
دیکھ کے مجھ کو بدلے تیور
اور پکڑنے جھپٹا مجھ پر
پتھر اس نے مجھ پر پھینکے
اُف وہ پتھر اللہ بچائے
پھر سے وہاں سے اڑ کر نکلا
سیدھا رستہ لیا میں گھر کا
اڑتے اڑتے اب گھر پہنچا
ٹل گئی آفت شکر خدا کا
ماں نے سنا جب قصہ سارا
منو میاں پر غصہ آیا
غصہ میں اپنے گھر سے نکلی
منو میاں کے باغ کی رہ لی
پوچھا جا کر منو میاں سے
"دشمنی کیا ہے بچے سے میرے
ننھے کو میرے مارنے دوڑیں
اس پہ بڑے سے پتھر پھینکیں
آئیے اپنے گھر تو چلئے
کہتی ہوں میں اب امی سے"
ماں کا اپنی نام سنا جب
منو میاں نے ڈر کے کہا تب
"نا، مری پیاری اچھی چڑیا
امی سے یہ بات نہ کہنا
وہ سن لینگی تو ماریں گی
کھال ادھیڑ کر رکھ ہی دیں گی
پیار پرندوں سے کرتی ہیں
چھیڑیں تو غصہ ہوتی ہیں
آج میں تو توبہ کرتا ہوں
اور تم سے وعدہ کرتا ہوں
چڑیوں کو چھیڑا نہ کروں گا
باغ میں آئیں نام نہ لوں گا
مجھ سے اگر ایسا ممکن ہو
دانہ پانی دوں گا ان کو"

سن کے یہ چڑیا اڑ گئی پھر سے
منو میاں کو چھوڑ اکیلے

سید موسیٰ کلیم ید اللہی
(متعلم)



مئی
سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

۹	نظمیں
۶	غزلیں
۷	افسانے اور قصے
۲	ڈرامے
۷	عام دلچسپی کے مضمون
۷	علمی اور تاریخی مضمون

سب رس

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیرِ ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

بہ اہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہوکر دفتر ادارۂ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو — مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیاتِ حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وصولی بذریعہ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپئے	دو روپئے آٹھ آنے۔	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر۔	چار روپئے آٹھ آنے	تین روپئے	سات آنے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپئے	۳۰ روپئے	۱۵ روپئے	۶ روپئے
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

جلد (۱) شمارہ (۵) | سب رس | مئی سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

اِداریہ

ہم ان تمام معاصرین کے شکرگزار ہیں جنھوں نے سب رس کے بعض مضامین کو اپنے صفحات پر جگہ دی اور اس طرح اپنے ناظرین کو بھی ان سے استفادہ کا موقع دیا۔ لیکن ہمیں ان معاصرین سے شکایت ہے جنھوں نے "سب رس" کے مضامین نقل تو کئے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ یہ طریقہ اصولِ صحافت کے بالکل منافی ہے اور اس سے ان پر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

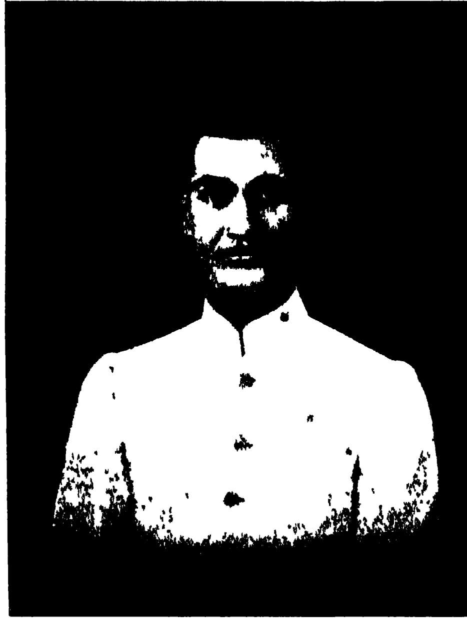
ہمارے ایک لاہوری معاصر نے "سب رس" کے پہلے شمارہ سے "علامہ اقبال" کی تصویر کا عکس لے کر شایع کیا ہے۔ اور یہ نہیں لکھا کہ یہ "سب رس" سے لیا گیا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اقبال کی وہ تصویر جو سردار امراؤ سنگھ شیرگل مجیٹھیا نے اتاری تھی اور خود انھوں نے ڈاکٹر زور کو پیرس میں دی تھی اور جس کو ہم نے ڈاکٹر زور سے حاصل کر کے شایع کیا تھا، ہمارے معاصر کو کہاں سے مل گئی!

ہمارے بعض مضمون نگار ایسے مضامین بھیج دیتے ہیں جو پہلے شایع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ "امتحان" کے بارے میں ہمارے پاس کئی شکایتیں وصول ہوئی ہیں۔ ہم اپنے قلمی معاونین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسے ہی مضامین عنایت کریں گے جو غیر مطبوعہ ہوں تاکہ ہم "ادارتی ذمہ داری" کی پوری پابندی کر سکیں۔ خاص کر دوسری زبانوں کے مضامین کا ترجمہ کرتے وقت اطمینان کر لینا چاہیئے کہ پہلے کسی اور نے ان کا ترجمہ شایع تو نہیں کیا۔

"عثمانیین" کی علمی فتوحات روز بہ روز ترقی پذیر ہیں۔ مرزا سرفراز علی صاحب بی، اے (عثمانیہ) نے ٹرنیٹی کالج لندن میں تقریری انعام حاصل کیا۔ میر عباس علی خان صاحب بی، اے (عثمانیہ) نے الہ آباد کے کئی تقریری انعامی مقابلوں میں امتیازی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ مسرت خیز خبر یہ ہے کہ "ڈاکٹر رضی الدین نے گزشتہ چھ سال کی بہترین سائنسی تحقیق" کے سلسلہ میں ہندوستان کے عظیم الشان ادارۂ سائنس سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کے اس قدیم قابلِ احترام طبقہ کے چشم و چراغ ہیں جس کے افراد دکن میں علم و فضل اور قضاءت و خطابت و افتا کی خدمات صدیوں سے انجام دیتے آئے ہیں۔ اسی طبقہ سے قدیم اولیا و علمائے کرام کے علاوہ مولانا شاہ رفیع الدین قندھاری، مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ، نواب معزز یار الدولہ اور نواب فیروز یار جنگ جیسے بزرگ افراد پیدا ہوئے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ان قدیم خاندانوں میں پھر سے صاحبانِ علم و فضل و کمال پیدا ہو رہے ہیں۔ جو یقین ہے کہ اپنے اسلاف کی طرح ملک کی بیش بہا خدمتیں انجام دیں گے۔

"مجلۂ عثمانیہ" ایک معیاری رسالہ ہے لیکن ہر سال مدیروں کی تبدیلی کے ساتھ اس کا معیار اور پالیسی بھی بدل جاتی ہے چنانچہ "مجلۂ عثمانیہ" کا تازہ ترین شمارہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے افسوسناک بھی ہے اور تعجب خیز بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئے مدیر صاحب نے جامعۂ عثمانیہ کی قابلِ احترام روایات کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ "سب رس" کے متعلق جن زہریلے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کی ہمیں مطلق پرواہ نہیں۔ لیکن افسوس صرف اس امر کا ہے کہ انھوں نے "جامعۂ عثمانیہ" کے علمی وقار کو گرانے کی ایک شرمناک کوشش کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شمارہ "یونس سلیم صاحب" کے نام سے کسی ایسے شخص نے مرتب کیا ہے جس کے دل میں جامعۂ عثمانیہ کا کوئی درد نہیں ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے اور یونس سلیم صاحب ہی نے اس کو مرتب کرنے کی زحمت گوارا کی ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ مادرِ جامعہ سے یونس صاحب جیسے طیلسانی بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی



جامعہ عثمانیہ کے مشہور رصہوت اور پروفیسر
حدکی خدمت میں ہندوستان کی سائنس اکیڈیمی
نے گزشتہ چھ سال کی تحقیقات کے سلسلہ میں
طلائی تمغہ پیش کیا ہے

غزل

نہ پابندی سلیقے کی نہ آزادی قرینے کی
ضرورت کچھ نہیں معلوم ہوتی اپنے جینے کی

میں اپنے دل کا مختار اور مالک ہوں مگر پھر بھی
سمجھتا ہوں کہ ان کے ہاتھ ہے ہر اک بدی نیکی

یہی آنکھیں، یہی دل ہو تو پھر اللہ مالک ہے
نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

محبت اور پھر معلوم ہو جائے قیامت ہے
ترے سینے میں کس نے ڈال دی ہے مہر سینے کی

جسے خالق نے دی ہے آنکھ بزمِ دہر کو دیکھے
یہاں کی رتی رتی ہے سلیقے کی قرینے کی

جہاں دو دل کے بیٹھے عاشق و معشوق کہلائے
انگوٹھی میں بٹھا کر دیکھ لو جوڑی نگینے کی

ہوا ہوں جب سے مفلس اپنے آنسو پی کے رہتا ہوں
کروں کیا اے صفیؔ عادت بری ہوتی ہے پینے کی

صفیؔ (اورنگ آبادی)

غزل

جس کی نگہ بلند ہے جس کی نظر بلند
وہ میں ہوں تیرے دیکھنے والوں میں سر بلند

ڈوبے کہیں تو کشتیٔ دل بحرِ عشق میں
موجِ سرشک اور ہوائے چشمِ تر بلند

کس طرح مجھ غریب کی بر آئے آرزو
دستِ سوال پست، مقامِ اثر بلند

نسبت نہیں ترے قدِ موزوں سے سرو کو
کیا فائدہ؟ جو ہو شجرِ بے ثمر بلند

ہو لاکھ سدِ راہ نشیب و فرازِ دہر
رکھے مدام اپنا ارادہ بشر بلند

نقشِ قدم پہ اس کے ہے میری جبیں کا نقش
سجدوں نے کر دیا شرفِ رہ گزر بلند

فرقت کی رات نوحۂ عشرت میں کٹ گئی
آوازۂ نشاط رہا تا سحر بلند

کب تک رہے گا سینۂ سوزاں میں سرنگوں؟
کب تک نہ ہوگا شعلۂ داغِ جگر بلند؟

واں امتحانِ ناز یہاں نازِ امتحاں
رتبہ میں طور سے ہے ترا سنگِ در بلند

رکھتا نہیں ہے گریۂ آتش عناں عزیزؔ
ایک ایک اس کی بوند ہے مثلِ شرر بلند

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

ہنسی اور ظرافت

ہنسی ایک متعدی کیفیت ہے۔ جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھے اُن میں سے کسی ظریف نے کوئی قصہ چھیڑا اور اس کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ اب اس متاثرہ حلقہ میں جس نے قدم رکھا وہ اس کیفیت میں گرفتار رہا۔ جس طرح چوہوں سے پلیگ، مچھروں سے ملیریا اور مکھیوں سے ہیضہ کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ اُسی طرح سے خوش طبعی اور ظرافت کے جراثیم کانوں کی راہ سے مختلف غدودوں کو گدگداتے ہوئے خاص خاص رگ پٹھوں کو چھیڑتے ہوئے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں۔ حملہ کی ابتدا، دماغ سے ہو کر اس کا اثر ہونٹوں، آنکھوں اور رخساروں پر پھیل جاتا ہے۔ مگر اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ انسان بیتاب ہو جاتا ہے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں بتیسی باہر نمودار ہو جاتی ہے منہ پھٹا رہ جاتا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا کر ایسی ایسی بے سُری آوازیں نکالنا شروع کر دیتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ان بے سُری آوازوں کو اصطلاح میں قہقہا کہتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہنسنے اور رونے کا سنگم ہے اس لئے قہقہے کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رگ پٹھے کھنچ جاتے ہیں سانس پھول جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ کہنا چاہیئے کہ ہنسنے اور رونے میں صرف ایک قہقہے کا فاصلہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا   کسی نے قہقہا اے بے خبر مارا تو کیا مارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظرافت کیا بلا ہے اور ہنسی کس چڑیا کا نام ہے۔ اپنی مارواڑی بھاشا میں تو بس ظرافت اسی کو کہتے ہیں کہ جس سے ہنسی آجائے اور ہنسی اس کیفیت کا نام ہے جو ظرافت کے اثر سے پیدا ہو۔

اس مختصر سی تعریف کو سن کر بعض خوش طبع ناک بھوں چڑھائیں گے اور بعض ترش رو اصحاب کھل کھلا کر ہنس پڑیں گے مگر کوئی ہنسے یا روئے واقعہ یہ ہے کہ ہنسی کوئی ایسی چیز نہیں، جس پر عمل جراحی کر کے بتا دیا جائے اور تیز نشتر کی نوک سے ذہنی کیفیت کو چیر پھاڑ کر ان تاروں کو باہر نکال کر دکھا دیا جائے جن کے چھیڑنے سے چہرے پر تبسم کی برق کوند جاتی ہے یا قہقہے کے بادل گرجنے لگتے ہیں۔ تاہم یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ذرا کسی بچے کے تلوے کو انگلی سے ٹھوکے دیکھیئے تو اول تو وہ مسکرائے گا پھر کھل کھلا کر ہنس پڑے گا۔ یا کسی بڑے شخص کی بغل اور گردن کے غدودوں کو اچھی طرح سے گدگدا دیجئے اور پھر تماشا دیکھئے کہ وہ کس کس نمونے کے قہقہے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر میں جس ہنسی کا ذکر کر رہا ہوں اس میں گدگدانے کی مطلق ضرورت نہیں بلکہ موٹی سے موٹی کھال والا شخص جس کے ہنسی کے غدود بالکل بے حس ہوں وہ بھی ایک مرتبہ کھل کھلا کر ہنس دیتا ہے۔

اب رہی خوش طبعی یا ظرافت تو جس طرح شاعری اور مصوری کی صحیح اور مکمل تعریف کرنا ایک مشکل امر ہے۔ اُسی طرح ان کے حدود قائم کرنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ اور چونکہ ظرافت میں خوش طبعی، خوش مذاقی، تمسخر، ہنسی دلگی، حاضر جوابی، مضحکہ، مزاح، لطیفہ گوئی، پھبتی، پھکڑ، نوک جھوک، فقرہ بازی اور تمام پُر مذاق چیزیں شریک ہیں۔ اس لئے ان کی ایک مکمل اور جامع تعریف کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں ہر ایک علم و فن کے ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر ظرافت یا خوش طبعی کی تعلیم دینے کا

کوئی ادارہ نہیں ہے جن کی طبیعتوں کو ناچ گانے سے لگاؤ ہے۔ وہ ناچ گانے کی تعلیم گاہوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جن کو آرٹ سے دلچسپی ہے وہ آرٹ اسکول میں داخل ہو جاتے ہیں مگر جن اصحاب کی طبیعتیں ظرافت کی طرف مائل ہیں وہ بیچارے اودھر اودھر ٹامک ٹوئے ہی مارتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی ظرافت کا ادارہ ہوتا تو پھر آپ دیکھتے کہ ایک مشتعل سے مشتعل طبیعت کا لڑکا بھی دو دو بجے رات تک پُر مذاق لطیفے رٹتا ہوا دکھائی دیتا اور ہر رونی صورت بچے کے ماں باپ یہی خواہش کرتے کہ ان کا بچہ ظرافت کے مڈل اسکول تک ضرور پہنچ جائے۔

ظرافت کی تعلیم دینے سے میرا یہ مقصد نہیں کہ زبردستی ہر ایک کا مذاق اڑایا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شئے کو ظریفانہ رنگ میں دیکھ سکے اور اس کے ہر پہلو کو ایک دلچسپ اور لطیف انداز میں ظاہر کر سکے۔ جس میں دانائی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ بشاشت اور خوش دلی کے اجزا بھی موجود ہوں۔ جن کی بدولت ایک ظریف مداری کی طرح جھولی میں گدھے کے کان ڈال کر خرگوش نکالتا ہے اور دھتورے کے بیج بو کر زعفران کے پودے اگاتا رہتا ہے۔

اس تماشے میں سب سے اول حاضر جوابی، ذکاوت اور تخیل کی زبردست اداکاری ہے۔ اور اس کے بعد صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہوتا ہے چنانچہ اس میں چند بے سروپا اور غیر مربوط خیالات کو اس طرح مخلوط کر دیا جاتا ہے کہ اس میں تعجب اور تحیر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور سامعین کے سامنے ایک نظر فریب جلوہ، دلوں میں فرحت اور روح میں ایک مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں نے تعجب اور تحیر کا لفظ اسی لئے استعمال کیا کہ جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں استعجاب اور تحیر کی کیفیت پیدا نہ کی جائے، کسی طرح مسرت اور خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ظرافت کے متعلق ارسطو کا خیال ہے کہ جس قدر تناقص اور متضاد کیفیتیں پیدا کی جائیں اتنا ہی ظرافت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

مثلاً کوئی صاحب بڑے مقطع چقطع، موٹے تازے، بھاری بھرکم توند لئے نہایت پر تکلف کپڑے پہنے آہستہ آہستہ اور نہایت متانت سے چلے جا رہے ہوں۔ یکایک ان کا پاؤں پھسلے اور وہ قلابازی کھا کر دھم سے نیچے آ رہیں . . . کیچڑ میں ان کے تمام کپڑے لت پت ہو جائیں۔ ٹوپی ایک طرف جا پڑے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں توند مشکیزے کی طرح الگ ہلتی ہوئی نظر آئے۔ اٹھنے کی کوشش کریں۔ پھر پھسلیں اور اڑدھم کر کے نیچے آ رہیں۔ اپنے گرد تماشائیوں کا ہجوم اور ہنستے ہوئے مجمع کو دیکھ کر غصہ سے ہونٹ چبانے شروع کر دیں اور سر بازار گالیوں کی بوچھار باندھ دیں تو ان کی ہیبت کذائی پر خواہ مخواہ لوگوں کو ہنسی آ جائے گی۔

پر تکلف کپڑوں کا کیچڑ میں لت پت ہونا قدم پھونک پھونک کے دھرنے کے باوجود ٹانگ پھسل کر گرنا۔ باوجود متانت کے سر بازار گالیاں دینا۔ یہ سب متضاد کیفیتیں ہیں اب ان میں جس قدر تناقص اور بے ربطی بڑھتی جائے گی اسی قدر استعجاب بڑھے گا اور لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ اسی طرح اگر کوئی پہلوان سر بازار دھپے کھائے یا کوئی شریف صورت گدھے کی طرح رینگے۔ بندر کی طرح منہ بنائے یا لنگور کی طرح اچکنے لگے۔ یا کوئی شخص ہنستے ہنستے رو دے یا روتے روتے ہنس پڑے یا جسے ہم عالم خیال کر رہے ہوں وہ مہمل بے تکی اور گدھے پن کی باتیں کرنے لگے یہ سب صورتیں اپنی اصلی صورتوں سے متضاد ہیں اور یہی وہ کیفیتیں ہیں جن سے تعجب کی تحریک ہوتی ہے جو ہنسی کا مادہ تولید ہے۔ ڈاکٹر الیگزنڈر کہتا ہے کہ ظرافت انسان کی وہ معصوم مسرت ہے جو دوسروں کو مضرت یا تکلیف پہنچانے سے حاصل ہوتی ہے۔

قدیم زمانے میں ظلم و تعدی اور بے رحمی کے اجزا مسرت حاصل کرنے کے لئے جزو اعظم خیال کئے گئے تھے اس زمانہ میں اگر ہم کسی شخص کو ڈوبتا ہوا دیکھیں تو ایک روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اگلے زمانے میں رومن کسی کو مرتا ہوا یا ڈوبتا ہوا دیکھتے تھے تو انھیں بے حد

خوشی ہوتی تھی اور سرکس میں گاڑیاں دوڑاتے وقت اگر کسی کی گاڑی ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی یا مقابلے کے وقت جنگلی درندے کسی آدمی کی تکا بوٹی کرتے تو یہ جانکاہ منظر دیکھ کر یار لوگ پھولوں نہیں سماتے تھے۔ اب بھی لندن میں کتوں کے ذریعے لومڑی کا شکار اور اسپین میں جنگلی سانڈوں کے مقابلے ایک پُر لطف اور روحانی مسرت کا سماں پیش کرتے رہتے ہیں بعض رقیق القلب ا۔ بزدل اصحاب کو اس نظارے سے روحانی تکلیف پہنچتی ہے گر اسپین کے چھوٹے سے چھوٹے بچے کے سامنے ذرا سانڈوں کے مقابلے کا نام آیا اور اس کی کانوں تک باچھیں چرگئیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس قسم کی جنگ سے ہم تو ہم خود سانڈ کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے چنانچہ آئے دن اسپین کے رہنے والوں کو اللہ میاں سے یہی لڑائی رہتی ہے کہ تو نے ہمیں سینگ کیوں نہیں دیئے۔ ہم بھی اس کھلے میدان میں سانڈوں کی طرح دو دو ٹکریں لڑ کر مسرت ابدی حاصل کرتے۔

ہندوستان میں بھی اس وحشیانہ مسرت کا ایک دَور گزر چکا ہے۔ جو شیروں کے مقابلے، ہاتھیوں کی لڑائی اور مینڈھوں کی ٹکروں سے گزرتا ہوا اب صرف مرغ بازی اور بٹیر بازی پر آٹکا ہے۔

مولانا عبد الحلیم شرر نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد اسپینی جنگجو اور ہندوستانی صلح پسند اصحاب کے جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اتفاقاً ایک مرغ باز کا مرغ ہار گیا۔ وہ دل شکستہ ہو کر عراق چلے گئے۔ اور نجف اشرف میں مہینوں معروف عبادت رہے۔ شب و روز دعا کرتے تھے کہ خداوندا ائمہ معصومین کا صدقہ مجھے ایسا مرغ دلوا دے جو لڑائی میں کسی سے نہ ہارے۔ ایک رات خواب میں بشارت ہوی کہ "جنگل میں جاؤ" آنکھ کھولتے ہی انھوں نے بیابان کا رستہ لیا۔ یک بیک ایک ڈھوکہ سے "ککڑوں کوں" کی آواز آئی۔ یہ ایک مرغی بھی ساتھ لے گئے تھے آواز سن کر انھوں نے فوراً مرغی چھوڑ دی۔ وہ مرغ اسے دیکھ کر فوراً باہر نکل آیا اور ان صاحب نے اسے پکڑ لیا۔ اُس کی نسل پھر ایسی ہوئی کہ انھیں پھر کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑا"۔

مگر آج کل قانون "انسداد بے رحمی بر جانوران" نے کم سے کم ہندوستان میں تو اس جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ لیکن اسپین میں اب بھی وہی چہل پہل ہے۔ وہی سانڈوں کے زور اور وہی مقابلوں کے زور ہیں۔ اب رہے وہ مشترک اجزا جو کلام میں ظرافت کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں اور اصول، جو اصلی واقعات میں تناقص اور متضاد کیفیتوں کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ اُن میں بعض تو ایسے ہیں جو ہندوستان میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں کم۔ مگر بعض مشترک ہیں جو ہر ملک میں ظرافت پیدا کرنے کے ذریعے بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تجنیس، ایہام، پھکّت، پھبتی، تشبیہ و تضاد کو تقریباً ہر قوم نے اپنا آلۂ ظرافت بنا رکھا ہے۔ اس پر بھی بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ ہر زبان، ہر ملک اور ہر قوم کا مذاق ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہے۔

اس وقت ریڈیو، ٹیلیفون، سینما، اور اسی قسم کی دوسری ایجادوں نے ایک قوم کو دوسری قوم سے اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے روشناس کرا دیا۔ خیالات اور رفتار و گفتار میں ایک کو دوسرے کا ہم خیال اور ہم زبان بنا دیا۔ مگر ظرافت کی زبان پر سوائے اہل زبان کے دوسری زبان والا قابو نہیں پا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے علوم و فنون کا ترجمہ اسی خوبی، اسی سلاست اور اسی روانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اُس کی اصل عبارت میں موجود ہے (باقی)

مرزا عصمت اللہ بیگ

دورِ حاضر کے خطرات اور ان سے بچنے کی تدابیر

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں انسان سب سے زیادہ ذی اقتدار اور با اثر ہے۔ یہ امتیاز قدرت نے اس کو اُس کے اعلیٰ دماغی ارتقا کے توسط سے عطا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نہ صرف تمام حیوانات و نباتات پر بالآخر غالب آچکا ہے بلکہ نظامِ عالم کی بڑی بڑی قوتوں کا بھی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ تاریخ کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ انسان کو اس بلند مرتبہ پر پہنچنے کے لئے ہزارہا سال کی جدوجہد اور غور و فکر لاحق ہوئی۔ حیاتیات کے متعلم نظریۂ ارتقا کے موجب جملہ جاندار اشیاء کو ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ناموافق حالات کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے ترقی کی راہ میں گام زن مان کر انسان کو اس سے ایک درجہ کمتر مخلوق سے بتدریج انسان میں تبدیل ہونے کے لیے کئی لاکھ سال کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اگر اُس حالت سے آغاز کیا جائے جب کہ زمین آفتاب کے بطن سے آتشی جنم لے کر فضا میں رونما ہوئی تو اس پر انسان کو جو زمین ہی کا ایک جزو ہے موجودہ شکل و صورت سے آراستہ ہونے کے لئے دو ہزار ملین سال سے کم مدت نہیں گزری۔

کائنات کے محققین کی ان رایوں کو قلمبند کر کے ہم یہ بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک شخص جب اپنا خاندانی شجرہ تیار کرتا ہے تو اُس بڑی مشکل تک جس کو وہ اپنا جدِ اعلیٰ تصور کرتا ہے سلسلہ ملانے کے لئے اُس کو کس قدر محنت اٹھانی پڑتی ہے اور اپنے پیشروؤں سے منسوب کتنی قوی اور ضعیف روایتوں کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔ اس لئے انسانی ارتقاء کا مسئلہ اگر مشکل نہ ہوگا تو کیا ہوگا، اور متشکی مزاج اور شیدائیانِ فن کی دانست میں "ضعیف" عقیدے کے لوگ اگر اس مسئلہ کی تفصیلات کو شبہ کی نظر سے دیکھیں تو انھیں برا نہ ماننا چاہئیے۔ بہر حال کسی کو اعتراض نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ انسان جب سے ایک علٰحدہ جنس کی حیثیت سے زمین پر مسلط ہوا تو اس وقت سے اب تک ہزار ہا سال کی مسلسل دماغی و جسمانی کوششوں کے بعد اس کو عامۂ مخلوقات پر فوقیت نصیب ہوئی اُس کی اس عالم گیر فتح و نصرت کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی منظم زندگی ہے جس میں مذہب کو اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔

مذہب انسان کو نہ صرف اس کی چند سالہ زندگی کا زمانہ امن و آسائش کے ساتھ بسر کرنے کے طریقے سکھاتا ہے بلکہ مرنے کے بعد کی لامتناہی مدت کو اس کی روح کے لئے پُر لطف و پُر سکون بنانے کی غرض سے اس کی اور اس کے نوع کی آئندہ نسلوں کے حفظ و امان کا سامان بھی مہیا کراتا ہے۔ ہر دور میں چند ایسے انسان بھی پیدا ہوتے ہیں جنھوں نے علم حاضر پر عبور حاصل کر کے (بلکہ اکثر محض اپنے خیالی تصور میں اس علم پر حاوی ہو کر) انانیت کی بدمستی میں الاہیت کو ایک مفروضہ خیال کیا ہے یا فطرت کو الاہیت کی جگہ ساری کائنات کا حاکم قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے مذاہب کے ان تمام اصول کا جو عمل صالح اور امن عالم کے لئے اساسی سمجھے گئے ہیں نہ صرف احترام کیا ہے بلکہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ اُن اصولوں کی متابعت میں صرف کیا ہے۔

نپولین بوناپارٹ کی لاپلاس سے پہلی ملاقات ۱۷۸۵ء میں ہوئی جب کہ وہ فرانس کے فوجی مدرسے کے ۱۶ سال والے نوخیز طالبِ علم کی حیثیت سے لاپلاس کے سامنے امتحان کی غرض سے حاضر ہوا۔ نپولین جب ترقی کرتا ہوا فرانس کا مطلق العنان

حاکم بن بیٹھا تو پیرانے تعلقات کی بنا پر لاپلاس کو کئی اعزاز عطا کئے اور بالآخر ایک وزارت سے بھی سرفراز کیا۔ لاپلاس جیسے ریاضی کے شیدائی کو علمی تحقیقات سے کون سا مشغلہ روک سکتا تھا۔ اس نے بالآخر اپنی شہرۂ آفاق کتاب فلکی میکانیات کو شائع کرکے نپولین کے مطالعے کے لئے پیش کیا۔ نپولین نے اس گراں بہا تحفہ کی تمہید پڑھی اور شاید اس کے چند ابتدائی اوراق بھی اُلٹے، لیکن اس میں کہیں اللہ تعالیٰ کی تعریف یا اس کی قدرت کا اعتراف نہ پایا، اس لئے یہہ خیال کرکے کہ اپنی خوش اعتقادی اور حمایت مذہب کا اچھا اعلان ہوگا لاپلاس سے شکایت کی کہ نظام عالم کی ایسی جامع اور ایسے بڑے فاضل کی لکھی ہوی کتاب میں کہیں بھی کائنات کے خالق کا ذکر نہ ہونا قابل افسوس ہے، لاپلاس نے جواب دیا " صاحب مجھے اپنے مضمون کی تیاری میں اِس مفروضہ کی کہیں ضرورت نہیں پیش آئی "۔

نپولین نے جب اس گستاخانہ جواب کا ذکر لاپلاس کے ہم پلّہ اور ہم عصر ریاضی کے ماہر لاگرانج سے کیا تو اس نے کہا " ممکن ہے کہ یہہ ایک مفروضہ ہی ہو۔ لیکن نہایت ہی پُر لطف اور شاندار مفروضہ ہے، اس سے بے شمار امور کی توجیہہ ہو جاتی ہے " ان دونوں شہرۂ آفاق محققین کے سوانح عمری کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے عمل صالح سے کبھی گریز نہیں کیا اور جس مقدس اعتقاد کو مفروضہ تصور کیا آخر دم تک دنیائی کاروبار میں اس کی متابعت کی۔ یہہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاپلاس کو نظام شمسی کی اپنی جس تحقیق پر ناز تھا اور لاگرانج نے اپنی جس تصنیف کے متعلق فخریہ بیان کیا تھا کہ اس کے اندر ایک بھی ہندسی شکل نہیں ہے سارا موضوع تفرقی مساواتوں ہی کے ذریعے ادا ہوا ہے، اُن میں زمانۂ حال کی تنقید نے متعدد اسقام نکالے جس سے ظاہر ہے کہ کائنات سے متعلق انسان کی بڑی سے بڑی تحقیقات تکمیل کی محتاج ہے اور علم میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے اسی قدر مزید اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

دور حاضرہ کے بعض نوجوان خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں چند ایک دہریت زدہ مصنفین کے خام خیالات یا ناقص روایات کو بغیر سوچے سمجھے اپنے لئے چراغ ہدایت فرض کرکے مذہب کے اصول اور اس کے عملی قواعد وضوابط کو غیر ضروری بلکہ مانع راہ ترقی سمجھتے ہیں۔ ان کی دانست میں مذہب ایک ڈھکوسلا ہے اور خدا کا تصور آزاد خیالی کے حق میں زمانۂ جاہلیت کا جاری کردہ ظلم وستم ہے ان لوگوں کو زمانہ کے تغیر وتبدل سے جب حکومت ملتی ہے تو وہ جزا وسزا کے قیود سے اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر غیر ذمہ دارانہ اور لاأبالی زندگی بسر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسانیت کا خون ہونے لگتا ہے اور آدمی دیدہ نہیں دانستہ بہیمیت کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔
انفرادی آزادی کا بڑے سے بڑا حامی بھی کبھی منظم زندگی کے قواعد وضوابط کو جبر وتعدی کا مرادف نہیں تصور کر سکتا۔ زندگی تو بڑی چیز ہے کوئی کھیل بھی قواعد وضوابط سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اکثر کھیلوں جیسے کرکٹ فٹ بال وغیرہ کے قواعد وضوابط کو اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محض خود اختیاری ہیں، لیکن اُن میں لغویت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ سالہا سال کے رواج نے ان کے گرد روایات کا ایک ہالا تیار کر رکھا ہے جو ان کے روز افزوں احترام کا باعث ثابت ہوا ہے۔ مذہب کا صحیح مفہوم نہ جان کر اگر انسان یہہ سمجھنے لگیں کہ مذہب ضعیف الاعتقاد ذہنیتوں کو ایک ثبوت طلب ہستی کا بے جا خوف دلاتا ہے یا

محتاج وسائل آئین کے قیود میں صحیح و تندرست اجسام کو جکڑ کر خیالی گناہ کی حقیقی لذتوں سے محروم رکھتا ہے، اور اس دھوکے میں پڑ کر مطلق العنان زندگی بسر کرنا چاہیں تو تھوڑی سی مدت میں وہ نہ صرف زمرۂ انسانی سے خارج ہو جائیں گے بلکہ ہمیشہ کے لئے روئے زمین سے انسان کی نسل ہی مٹ جائے گی۔

ارضیات کے متعلم جانتے ہیں کہ طبقات الارض کے اندر آغازِ عالم حیات سے لے کر اب تک کے حیوانات و نباتات کی نعشوں کے ساتھ اُن کی تاریخ بھی دفن ہے۔ سالہا سال کی محنت و مطالعہ کے بعد پتہ چلا ہے کہ کس دور میں کن نباتات کو فروغ تھا اور کون حیوانات روئے زمین پر مسلط تھے۔ ان کی شکل و شباہت کیا تھی جسمانی و دماغی کیفیت کیسی تھی۔ چٹانوں کے ایک طبقہ سے نکل کر عین اس کے بالائی طبقہ پر پہنچتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ بعض حیوانات کے رکاز یک لخت غائب ہو گئے گویا اُن کی نسل ہی دنیا سے اٹھ گئی اور دوسری نوع یا جنس کے جانداروں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اس واقعہ کی اہل الرائے اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ بعض موسمی تغیرات کے اچانک حملے نے براہ راست یا متعدی بیماریوں کے توسط سے ان بدنصیب حیوانات کے بیشتر حصہ کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ان میں سے صرف وہی بچ سکے جو خاص ارتقائی ذرائع سے ان مشکلات کا مقابلہ کر سکے اور اس طرح اپنے آپ کو جدید حالات کے موزوں بنا کر بتدریج بدلے ہوئے جسم میں رونما ہوئے، جُوراسی یا کھریالی عہد کے بعض قدیم دیو ہیکل ہوام کی نسبت تصور کیا جاتا ہے کہ خود ان میں سے بعضوں نے ناخن و دنداں کی صلابت اور طبیعت کی خباثت میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کے باقی ماندہ صلح پسند بنی عم اُن کے شکار بن کر تمام کے تمام دنیا سے ناپید ہو گئے۔

دورِ حاضر کا مغربی طفل مکتب بھی بلا مبالغہ ان امور سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن سیاسی دنیا پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ جو قومیں اپنے آپ کو سب سے زیادہ تہذیب یافتہ سمجھتی ہیں سائنس جیسے متبرک اور غدار رساں علم کی مدد سے آئے دن نئے نئے اور زبردست سے زبردست آلات کشت و خون ایجاد کر کے اپنے ہی جیسے لیکن کمترمایہ انسانوں کو اجتماعی حیثیت سے قتل کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس درندہ خصالی کی اصل وجہہ خدا فراموشی ہے، جب خدا کو بھول گئے تو نہ اپنا مذہب قابل عمل رہا اور نہ دوسروں کی جانیں قابل لحاظ رہیں۔ پھر عہد و پیمان کا کون احترام کرے، عدل و انصاف کی کیوں تکلیف گوارا کی جائے۔ رحم و کرم کے لئے تو ایسی دنیا میں جگہ ہی کہاں نکل سکتی۔ اعلیٰ تہذیب زبردست بہیمیت کا مرادف بن جاتی ہے۔ ایسی قومیں جب تک دولت و ثروت کے نشہ میں سرشار رہتی ہیں اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ وحشیانہ طرزِ عمل تہذیب کا قاتل ہے تو ان کے سرگروہ فرماتے ہیں "ہم کو اپنے جذبات فطری کے خلاف عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ عالم حیات میں بھی تو یہی دیکھنے میں آتا ہے، بڑی قوت چھوٹی قوت پر غالب آتی ہے۔ انسان کی طبیعت بھی ایسی ہی متضاد و مخالف قوتوں کا مجموعہ ہے۔ نیکی بدی دراصل کوئی جداگانہ خواص نہیں ہیں صرف اضافی حیثیت رکھتی ہیں، جو چیز مفید ہے اچھی ہے جو غیر مفید ہے بُری ہے اور واضح ہے کہ حالات کے لحاظ سے وہی چیز کبھی مفید ہے اور کبھی غیر مفید" ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ استدلال کسی طرح شیطان کے اُس استدلال سے کم نہیں جب کہ وہ بموجب ایک مشہور انگریزی ضرب المثل کے برے کام کی رغبت دلانے کے لئے صحائف آسمانی کے حوالے پیش کرتا ہے۔

یہی قومیں جب کمزور ہوجاتی ہیں اور اُن کی مطلق العنانی دوسری قوموں میں منتقل ہو جاتی ہیں تب کہیں اُن کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اضطراب کے ساتھ انسانی مساوات اور صلح و امن کی خوبیوں کا وظیفہ پڑھنے لگتی ہیں۔

دنیا سے جب اس طرح عدل و انصاف اٹھتا جاتا ہے اور خود غرضی کسی قاعدہ قانون، عہد و پیمان کو شمار ہی میں نہیں لاتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوگا کہ انسان جانور سے بھی بدتر ہو جائے گا اور قتل و خون و غارت گری بالآخر اگر نسل انسانی کو میٹ نہ دے گی تو کم از کم تہذیب دنیا سے اٹھ جائے گی اور آدمی دس لاکھ برس پہلے کے وحشی درندہ میں تبدیل ہوجائے گا مذہب کے مخالفوں کے پاس مذہب کے خلاف سب سے بڑا یہہ اعتراض ہے کہ دنیا میں مذہب کے نام سے جتنی مہلک لڑائیاں ہوی ہیں اتنی کسی اور غرض سے نہیں ہوئیں، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر مذہبی لڑائیاں صرف برائے نام مذہبی تھیں، لڑنے والوں کے اغراض اور نصب العین عموماً بالکل دوسرے تھے مثلاً ذاتی یا خاندانی عروج، حکومت کی طمع یا جوشِ انتقام وغیرہ، اگر بالفرض یہہ مان بھی لیا جائے کہ جملہ نام نہاد مذہبی لڑائیاں فی الحقیقت مذہب ہی کی خاطر ہوئیں تو دنیا کی تاریخ باآواز بلند نالاں ہے کہ ان مذہبی لڑائیوں سے کئی ہزار مرتبہ زیادہ کثیر التعداد اور قبیح الاثر حصول ملک و دولت اور تخت و تاج کی لڑائیاں ہیں، اگر اس کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنے انسان ان کے شکار ہوے ہیں اتنے نہ وبائی امراض میں مرے ہیں نہ حوادث سماوی جیسے قحط سال طوفان طغیانی زلزلہ وغیرہ سے، وحشی سے وحشی درندوں نے بھی باہمی جنگ و جدل میں اپنی جنس کے اتنے جاندار قتل نہیں کئے جتنے کہ بنی آدم نے قتل کئے، اور یہہ قتل و خون قاتلوں نے اپنی ضروریات زندگی کے لئے مجبور ہوکر نہیں کئے بلکہ اکثر صورتوں میں محض اپنی شان و شوکت آرام و آسائش کی خاطر حرص و طمع کے زیر اثر کئے، خدا کو مانتے ہوے یا کسی عالم گیر ماورائی زبردست قوت سے ڈرتے ہوے انسان سے جب اس کی جنس کے ساتھ ایسی وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوی ہیں تو اس شیطانی دور کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب کہ دنیا سے خوف خدا اٹھ جائے گا اور کروڑوں کی تعداد میں مہلک سے مہلک آلات حرب و ذرائع کشت و خون لے کر اقوام عالم قاعدہ قانون، عدل و انصاف غرض انسانیت کے تمام خواص کو ترک کر دے کر کامل بہیمیت کے ساتھ ایک دوسرے کو مسخر کرنے کی دُھن میں مصروف ہو جائیں گی !

آنے والی دنیا کی یہہ ہیبت ناک تصویر مدبران عالم کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہے مغربی ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں (مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلز وغیرہ) نے اس مضمون کی کئی کتابیں لکھی ہیں اور سینما کے فلم تیار کئے ہیں، لیکن ان کوششوں سے صرف عوام الناس کی تفریح اور مصنفین وغیرہ کے مالی مفاد کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہوا، سچی بات یہہ ہے کہ انسان بالطبع کاہل اور قدامت پسند واقع ہوا ہے، جب تک اُس کو ناقابل برداشت تکلیف نہ ہو وہ پرانے راستوں سے ہٹ کر نئے راستے پر چلنا نہیں چاہتا۔ اکثر لوگ کسب معیشت کے دھندوں میں لگے رہتے ہیں، جو خوش نصیب فرحت اور مرفہ الحالی کی گودوں میں پرورش پاتے ہیں انھیں آئے دن اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ اپنی دولت سے کیا نئے مزے حاصل کریں اور بے کاری کا وقت کیسے کٹے۔ جو اِن کے بین بین واقع ہیں وہ دنیا کی رفتار کو دیکھ کر سمجھتے تو ہیں کہ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن پست ہمتی یا قسمت پرستی کی وجہ سے یہہ کہکر کہ دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہو یا "چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، مغربی ممالک میں جہاں دو ایک صدی سے ہر چیز بڑے پیمانے پر صورت پذیر ہو رہی ہے اور اس کے اثرات بہت جلد محسوس ہونے ہیں، چند سال سے یہہ رائے قائم ہوتی آرہی ہے کہ دنیا کی حکومت کی مشینوں پر جس طبقے نے آغاز تاریخ سے قبضہ کر رکھا ہے اس کی تربیت ناقص ہے، حکومت کی چوٹی پر عموماً وہی لوگ پہنچتے ہیں جو بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں، حصول دولت کے ذرائع کی نسبت بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں، اچھے مقرر ہیں حکمت عملی خوب جانتے ہیں، عوام الناس کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہیں، دنیا کی تاریخ کا زیادہ تر وہ جزو پڑھے ہوتے ہیں جو خودغرض مدبروں اور مطلق العنان سپہ سالاروں کی داستانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ حالانکہ بدیہی بات ہے کہ اپنے ابناء جنس کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والوں کے لئے فراست و تدبر سے بڑھکر ایمانداری، نیک نیتی اور ایثار نفس کی ضرورت ہے۔

یہہ خوبیاں بھی تربیت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے برٹش ایسوسیئشن فار ایڈ وانسمنٹ آف سائنس کے سال گزشتہ کے اجلاس میں شعبہ تعلیم کے خطبۂ صدارت کے ساتھ دور حاضرہ کے متعلمین کی تعلیم و تربیت کے نقائص دور کرنے کی ایک اسکیم پیش کی ہے جس کو ہر شخص بآسانی حاصل کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ اس میں نبی نوع انسان کی تاریخ کو حیاتیات کی ایک شاخ تسلیم کر کے روئے زمین کی اقوام میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، یہہ تجویز بڑی محنت اور وسیع مطالعہ کے بعد پیش کی گئی ہے حقیقت میں عملی جامہ پہنانے کے قابل ہے، راقم الحروف کی رائے میں تمام عملی برائیوں کی جڑ خواہ وہ ایک آدمی کے لائحہ عمل سے متعلق ہوں یا قوم کے، عدم احساس تناسب ہے کسی چیز کی حقیقی اہمیت سمجھنے میں اگر طبیعت کا جمود رکاوٹیں پیدا کرتا ہے تو غیر ضروری ذاتی دلچسپی بھی اکثر اوقات شدید موانعات کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی وجہہ سے انسان غیر جانبداری اور توازن رائے کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے، مثلاً ہر مذہب میں ذوی القربیٰ اور دوست احباب کی اعانت پر اصرار کیا جاتا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ مستحقین کے حقوق تلف کر کے قوم اور ملک کا روپیہ اور اہم خدمات قرابت داروں اور دوستوں پر لٹا دئے جائیں، ایسے دوسرے بے شمار عمل ہیں جن کا خودغرضانہ دلچسپی کی وجہہ سے حد سے متجاوز ہو جانا ملک و قوم کے لئے باعث مضرت ہے۔ ان غلطیوں سے بچنے کے لئے ہر چیز کو اس کے صحیح منظر میں دیکھنے کی کوشش کی جانی چاہئے تاکہ حتی الامکان اس کی حقیقی اہمیت کا لحاظ ہو سکے دنیا کے مدبروں اور ذمہ دار حکام کے لئے اس سے بہتر مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

دور حاضر کی جدتوں میں ایک بڑی با اثر جدت یورپ کے بعض بڑے ملکوں میں ڈکٹیٹروں کا تقرر ہے۔ صدیوں قبل روما کی جمہوری حکومت نے بعض نازک موقعوں پر اس خدمت کو عارضی طور پر بارہا قائم کیا ہے مگر جوں ہی بلا ملک سے ٹل گئی یہہ عہدہ بھی برخاست کر دیا گیا۔ دور حاضرہ میں ایسا نہیں ہو رہا ہے، سالہا سال سے ڈکٹیٹر چلے آرہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ضرورت کے وقت حکومت کے تمام اختیارات ایک ایماندار اور قابل اعتماد ہستی کے سپرد کرنے میں بڑا ہی فائدہ ہوتا ہے، ہر ایک کام فی الفور انجام پاتا ہے، مختلف مدبروں کے اختلاف رائے سے جن رکاوٹوں کا اندیشہ ہے وہ ڈکٹیٹرشپ کے عہد میں پیدا ہی نہیں ہوسکتیں، جب تک کوئی ان غیر معمولی خوبیوں سے آراستہ اور ملک کا سچا فدائی نہ مل جائے اس عہدۂ جلیلہ کے قیام سے بجائے فائدے کے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے، ڈکٹیٹرشپ اگر کسی ملک کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے تو دوسرے کے لئے باعث تباہی نہ ہونی چاہئے۔ اگر کسی ملک میں یہہ عہدہ اس نیت سے تراشا جاتا ہے کہ عامۂ خلائق کی پرامن زندگی میں رخنہ ڈالا جائے تو اس سے بدتر کوئی عمل نہیں ہو سکتا بعض حضرات کو فکر رہتی ہے کہ اگر ہر شخص اچھے ہی کام کرے گا تو دنیا سے برائی بالکل اٹھ جائے گی تو پھر نیکی کو کیا قدر و منزلت حاصل ہوگی؟ تندرستی کی اسی وقت قدر ہوتی ہے جب کہ کبھی مرض کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی ہو۔ ان مہمل خیالات کے دور کرنے کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ انسان دنیا میں اچھے کام کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، بالفرض برائی دنیا سے اٹھ بھی جائے تو اچھے کام کرنے کا ہر وقت موقع باقی رہتا ہے، تندرستی کا لطف اٹھانے کے لئے بیماری کی چاشنی ضروری نہیں، تندرستی کے ساتھ اس کے مستحسن مشاغل میں جب آدمی مصروف ہو جاتا ہے تو یہہ مشاغل

اس کی مسرت کا باعث ہوتے ہیں ورنہ بے کاری بہت جلد اس کی تندرستی کو برباد کردے گی۔

ایک دوسری غلط رائے سائنس اور اس کی ایجادات سے متعلق ہے، دوران جنگ میں بمب کے گولوں اور زہریلی گیسوں وغیرہ کے استعمال سے بے گناہ شہریوں، بیکس عورتوں اور بچوں کی جو شرمناک خوں ریزیاں سنی جاتی ہیں ان کی ذمہ داری سائنس اور ماہران سائنس کے سر تھوپنا قرین انصاف نہیں سائنس نے بیہ اشیا، کلیات فطرت کی تلاش اور ماہیت مادہ کی تحقیق میں دریافت کئے، ان سے ہر اچھے اور برے کام لئے جا سکتے ہیں، بعض ممالک کے سررشتہ جات جنگ کے چند سنگدل اشخاص نے ان سے خلق کشی کا کام لیا تو اس کی ذمہ داری ان سنگدلوں پر ہے نہ کہ سائنس یا اس کے شیدائیوں پر۔ اگر مہذب دول اپنے علم و دولت کے سرمایوں کو بجائے ایک دوسرے کے کشت و خون پر صرف کرنے کے بنی نوع انسان کی فطرتاً مخالف قوتوں جیسے امراض متعدی یا حوادث سماوی مثلاً قحط، طغیانی، زلزلہ وغیرہ کے مسلسل مقابلے کے لئے محفوظ کردیں تو حکومتوں کے جملہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور بنی نوع انسان حقیقت میں خدا کی بہترین مخلوق ثابت ہو سکیں گے روحانیات اور راز ہستی کے افشا، کی کوشش اور قوائے حیات پر اقتدار حاصل کرنے کے مساعی انسان ہی کے بس کے کام ہیں، ان کے لئے بڑی فرصت، کثیر سرمایہ اور وسیع اشتراک عمل کی ضرورت ہے، مہذب دنیا کے باشندے اگر چاہیں تو اپنی وحشت پرستی کو چھوڑ کر جلد سے جلد ان انسانی مشاغل کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ ہر فرد بشر کو ان اصول پر کاربند ہونے کی ہدایت دے تاکہ انسان کی نسل بہ حیثیت انسان کے برقرار رہے۔

محمد عبدالرحمٰن خاں

اے آر سی اس - بی اس سی (لندن)

چل دیے

ہونٹوں پہ ایک برق سی لہرا کے چل دیے
کچھ اور سوز عشق کو بھڑکا کے چل دیے

پیمانۂ چشم مست کا چھلکا کے چل دیے
مست شراب حسن کو بہکا کے چل دیے

موج صبا سی پھولوں میں اب تک بسی ہوئی
آغوش انتظار میں وہ آ کے چل دیے

دنیا مری نگاہ میں تاریک ہو گئی!
گیسو وہ اپنے دوش پہ پھیلا کے چل دیے

حیران کر گئے مجھے حیران کر گئے!
آئینۂ جمال وہ دکھلا کے چل دیے

اک تفرقۂ تصور مبہم میں ڈال کر!!
شیرازۂ خیال کو بکھرا کے چل دیے

کچھ اور اضافہ کر کے مرے اضطراب میں
تعلیم صبر و ضبط کی فرما کے چل دیے

آنکھوں کو دے کے دعوت نظارۂ جمال
اللہ کس ادا سے وہ شرما کے چل دیے

بگڑے ہوئے کھنچے ہوئے روٹھے ہوئے تقی
تعمیر حسن و عشق کو وہ ڈھا کے چل دیے

تقی عابدی

طیارچی

(ایک ہیبت ناک افسانہ)

اکبر صدیقی اُن نوجوانوں میں سے ہیں جنھوں نے علم وادب کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا ہے، ان کی کتاب "مشاہیر قندھار" ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اب انھوں نے کام کرنے کی ایک نئی راہ نکالی ہے مشہور مغربی افسانوں کو اُردو جامہ پہنانے میں خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے "سب رس" فبروری میں ان کا ایک ترجمہ سحر زدہ شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا اور مشیر دکن نے بھی شکریہ کے ساتھ اس کو "سب رس" سے نقل کیا۔ صاحب موصوف نے سب رس کو ہر مہینہ ایک ترجمہ شدہ افسانہ دینے کا وعدہ کیا ہے "سب رس"

۱۹۳۶ء کی خزاں میں امریکہ کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی میں باوجود ہنرمند ہونے کے اپنی غربت کا احساس کررہا تھا یہ احساس مجھ پر آہستہ آہستہ طاری ہوتا گیا۔

پیر کی صبح تھی میں میز سے لگا ہوا اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں کررہا تھا اور حسب معمول ناکامی ہورہی تھی، میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا "بیگم! اب ہمارے پاس صرف اسّی ڈالر بنک میں باقی رہ گئے ہیں اور آیندہ مہینے تک اتنی رقم میں گھر چلنا چاہئے اس کے بعد وہ رقم آجائے گی جو مسٹر شارٹ نے دینے کا وعدہ کیا ہے"

ہم دونوں مہینہ کا میزانیہ بنانے میں مصروف تھے اور آخر اس نتیجے پر پہنچے، کہ مجھے غیر معمولی محنت کرنی پڑے گی، ورنہ ہم ایک مہینے تک تنگی ترشی کے باوجود بھی گذران نہ کرسکیں گے، تلاش معیشت کا سوال میرے لئے ناقابل حل بنتا گیا۔

میری بیوی نے کہا میں نے کل کے "ٹائمز" سے ایک اعلان کاٹ لیا ہے کسی کمپنی کو ایک طیارچی کی ضرورت ہے طیارہ یہاں سے ہیامنڈاسپورٹ (نیویارک) تک پرواز کرے گا اچھا! ٹھہرئیے میں ابھی ڈھونڈ لاتی ہوں"

وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئی، اشتہار کی تحریر یہ تھی " ضرورت ہے!!

مستعد طیارچی کی، ایک ایسے غیر اجازت یافتہ طیارہ کے لئے جو لاس انجلس سے ہیامنڈاسپورٹ (نیویارک) تک پرواز کرے گا تنخواہ اور سفر خرچ معقول۔"

میں نے بیوی سے کہا مجھے ایسی ملازمت کی ضرورت نہیں، مالک نہایت ایماندار آدمی ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ طیارہ غیر اجازت یافتہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہ آثار قدیمہ کی یادگار ہے یا طویل پرواز کے ناقابل۔ میں خواہ کتنا ہی تجربہ کار طیارچی سہی، لیکن ابھی مرنے کے لئے تیار نہیں۔"

"کیا ایک غیر اجازت یافتہ طیارہ اڑ ہی نہیں سکتا، اور اگر ایسے طیارہ پر ملازم رکھا جائے تو کیا ہوائی قوانین عدالت ہمارے لئے کھلے نہیں ہیں؟ ہم نالش نہیں کرسکتے؟" میری بیوی نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو سمجھایا کہ عدالتی دروازے ہر طرح کھلے ہیں۔ لیکن ایک طیارچی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہوائی چھتری ہو اور دنیا کے جغرافیہ پر عبور تامہ رکھتا ہو۔ لیکن اس کمپنی میں ملازم ہونے کے یہ معنے ہیں کہ مجھے یہاں سے نیویارک جانے کے لئے برفانی پہاڑوں اور ریگستانوں سے گذرنا پڑے گا سیکڑوں بڑے اور چھوٹے مقامات خوفناک جنگل اور جھاڑیاں طے کرنی پڑیں گیں۔ مجھے یہ سفر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن مفلسی سب کچھ کراتی ہے، اس لئے میں نے امیدواری کے لئے درخواست دینا مناسب سمجھا، اس لئے ٹیلیفون کا دصولہ اٹھایا اور کمپنی کے دفتر سے ملا لیا، میرا مخاطب مشہور فلم کمپنی کا مالک ٹرن بل تھا، مالک کمپنی نے طیارہ کی ساخت کے متعلق چند باتیں بتائیں جو میری دلچسپی کا باعث ہوئیں میں اسی جگہ اپنے تقرر کا خواہاں ہوگیا

دوسرے دن کمپنی کے دفتر پہنچا ٹرن بل سے ملاقات کی بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اس جگہ کے اور بھی امیدوار تھے طیارہ ہر امیدوار کو بتلایا جارہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی طیارہ دیکھا اور کوئی نقص نہ پایا، ایک ہفتے بعد میرے تقرر کا اعلان ہوگیا اس اثناء میں میں نے راستے کے جغرافیائی حالات کا گہرا مطالعہ کیا تاکہ میرا سفر کامیاب ہے میں اس نئے تقرر پر خوش تھا اور راضی تھا ملازمت پر

مسرت کے ساتھ دستخط کر دئے۔

طیارہ ایک سال سے زیر استعمال تھا یہ عصر جدید کا طیارہ تھا مشین اچھی حالت میں تھی لیکن ایک گمان ضرور تھا کہ زیادہ بوجھ لادنے زیادہ تیز رفتار لے جانے اور مکدر فضا میں اطمینانی پرواز کرنے سے قاصر رہے گا۔ یہ ایک مشرقی صنعت تھی ایک سال پہلے ٹرن بل نے اس کو کیلیفورنیا میں خریدا تھا، سو گھنٹے پرواز کر چکا تھا، اسی کے ساتھ کے اور چار طیارے تھے جو زیادہ سامان لادے جانے اور زیادہ تیز رفتار لے جانے کی وجہ سے خراب ہو چکے تھے۔ مہلک حادثات نے ان کی شکلیں مسخ کر دی تھیں لیکن وہ طیارہ جو اب میرے قبضے میں تھا ہر قسم کے عیب سے پاک تھا اور اس کا دستہ عربی گھوڑے کی لگام معلوم ہو رہا تھا کہ میں جو بھی اشارہ کروں اس کو نہایت وفاداری کے ساتھ انجام دے گا اس کے ساتھی طیارے زیادہ وزن لے جانے اور غیر معمولی رفتار میں پرواز کرنے کے بعد حادثات کا شکار ہو چکے تھے اس لئے ناظر ہوائی نے اس خیال سے کہ یہ بھی پانچواں سوار نہ بن جائے اس کا اجازت نامہ چھین لیا تھا ٹرن بل اس فکر میں تھا کہ اس نقصان کی تلافی کے لئے جو محض بدنامی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے عدالت سے چارہ جوئی کرے، لیکن عدالت جانے سے پہلے اس شرط پر سمجھوتہ ہو گیا کہ اگر طیارہ کسی فلم کے سلسلہ میں ہیامنڈ اسپورٹ تک پرواز کرے تو ٹرن بل ہزاروں ڈالر کے مالک بن جائیں گے۔

اسی سلسلے میں مجھے ملازم رکھا گیا اور اتنی اجرت دی گئی تھی جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے فکر معاش سے بے نیاز بنا دیا، دس ہزار ڈالر میں میری زندگی کا بیمہ کرایا گیا۔

میں طیارہ کو آزمانے کے لئے مسلسل چھ گھنٹے تک پرواز کرتا رہا اس اثناء میں متعدد بار زمین پر آیا اور پھر فضا میں اڑ گیا، آڑے ٹیڑھے، الٹے سیدھے اور ترچھے ہو کر ہر طرح میں نے طیارہ کو آزما لیا اور جب اس میں کوئی نقص نظر نہ آیا تو پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کر گیا، اس بلندی پر بھی اس کی رفتار میں کسی قسم کا فرق نہ ہوا تو میں یک لخت نیچے اترا اور پھر اسی سرعت کے ساتھ فضا میں بلند ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہو گیا کہ ناظر ہوائی نے بلا وجہ اجازت نامے سے محروم کر دیا ہے

اس آزمائش سے یقین ہو گیا کہ میرا سفر کامیاب رہے گا میں نے اپنے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں، مجھے سنسان جنگل، ریگ زار، ویران آبادیاں، برفانی پہاڑ، کہر آلود فضا، جنوبی کیلیفورنیا کی بلند ڈھلوان چٹانیں اور ایسی سیکڑوں وحشتوں کا سامنا کرنا تھا!!

۱۳ اکتوبر روانگی کی تاریخ تھی اور ۱۴ اکتوبر میری سالگرہ کا دن، لاس اینجلس سے ۱۳ کی صبح نکل کر شام کے وقت کان کاس میں جہاں یہ تقریب منانی تھی اس کا انتظام اگلے پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا، ۱۳ کی صبح ہم طیران گاہ جا رہے تھے، مجھے ہر چیز سے مستعدی اور استقلال نظر آ رہا تھا لیکن جب آسمان کی طرف نظر اٹھی فضا نہایت مغموم نظر آنے لگی، کئی دن سے مطلع صاف تھا اسی لئے آج کا یہ ناگوار خاطر تھا، اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ شام تک میں کان کاس جا پہنچوں گا۔

طیارہ فضا میں دس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ ایک منٹ میں چار میل طے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی میں سان جبرئیل کی وادی میں تھا دور، بہت دور لاس اینجلس کے بلند مینار نظر آ رہے تھے، لامحدود فضا میں ان گنت آبادیاں دکھائی دے رہی تھیں، دریاؤں کا پیچ و خم، درختوں کے جھنڈ، سڑکیں، ریلیں، باغوں کی روشیں غرض فضا میں ہو کر دور بہت نیچے کے مناظر دیکھنا جام جم کے مشاہدہ سے کم نہیں علم جغرافیہ کی اہمیت کا اندازہ یہیں پہنچ کر کیا جا سکتا ہے۔

سیرا میڈری اور سان انٹونیو کی برفانی چوٹیاں بھی نظر سے اوجھل ہو گئیں مشرقی افق پر سان برناڈینو، سان گرگا نیا اور سان جیکنٹو کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں کچھ لمحے گذرنے کے بعد میں نے انھیں بھی عبور کر لیا، اب ہر طرف ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے کہیں نخلستان اور دو چار خیمے اور پانی کے چشمے بھی نظر آ جاتے۔ کیلیفورنیا تک پہنچنے میں مجھے صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اس لئے میں جنوبی نیوادا کی طرف نکل گیا اور ایری زونا کا چکر لگاتا ہوا بولڈر کا بند دیکھنے کے لئے زمین سے صرف دو ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا، بولڈر کا بند انسانی صنعت کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو دریائے کلوریڈو کے پانی کو روک کر بنایا گیا ہے، اس سے کروڑوں ایکڑ زمین

سیراب ہوتی ہے اور یہہ آبشار بنیا گرا سے تین گنی برقی قوت بہم پہنچاتا ہے۔

یہہ دیکھنے کے بعد آٹھ ہزار فٹ بلند ہوگیا، طیارہ میڈلیک کی طرف ارِ یزونا کے جنوبی حصے میں پرواز کر رہا تھا میں اس کی ارضی ماہیت دیکھ رہا تھا زمین سرخی مائل بھوری تھی قدیم لاووں کے آثار نظر آرہے تھے، پہاڑوں کی بلند چوٹیاں، گہری گھاٹیاں اور وادیاں غرض ہر چیز عظمت و جبروت کی حامل تھی میں تین سو میل تک ہی مناظر دیکھتا گیا، وحشت، یاس اور تنہائی میرے تخیل سے کوسوں دور تھے طیارہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور میری نظریں دریائے کولوریڈو پر تھیں جو نہایت شان سے ایک بڑے اژدہا کی طرح چکر کاٹتا ہوا اسیڈ لیک کی طرف بہہ رہا تھا۔

مطلع ابر آلود ہونے لگا اور وحشت و تنہائی بھی محسوس ہونے لگی، طیارہ کبھی پانچ سو فٹ بلند ہو جاتا اور کبھی اتنی تیزی سے اترتا جیسے پتھر گر رہا ہے۔

میں اس کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوشش صرف کر رہا تھا، یہہ ناخوش گواری میرے طیارہ کے غیر اجازت یافتہ ہونے کو بار بار یاد دلا رہی تھی جو اس امر کے لئے کافی تھی کہ طیارہ کی مشنری میں کوئی کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔

ان جھکولوں کے صدمے سے اگر طیارہ کا کوئی بازو بیکار ہو جاتا تو میرا کیا حشر ہوتا! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں طیارہ سے چھتری میں منتقل ہو جاتا لیکن میری منزل کہاں ہوتی؟ گرانڈ کیان یان کے گہرے غاروں میں، پانی سے چالیس میل اور غذا سے سو میل دور اور انسانی آبادی سے نہ معلوم کتنے فاصلے پر، اگر اس حالت میں میں گر جاؤں تو جس بے بسی کی موت مروں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے گرانڈ کیان یان میں طیارہ کو اتارنا اس کے پرخچے اڑا دینے کے مرادف ہے اور چھتری کے ذریعے اترنا جلتے توے سے آگ میں کودنے سے کم نہیں۔

میں نے اب انجن کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، مشین برابر کام کرتا رہا، طیارہ گرانڈ کیان یان سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا، ارِ یزونا کا ریگستان اور جنگل دو سو تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے میرے نیچے بھاگ رہے تھے، مطلع کا وہی عالم تھا لیکن مشین برابر وفاداری کے ساتھ کام کر رہی تھی، بادل گرج رہے تھے، میں مشرق کی طرف ہوا کے سمندر میں بہا چلا جا رہا تھا سفید بادلوں کی وجہ سے مطلع کی وحشت دور ہونے لگی، میں نے گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑے اور روٹی وغیرہ کھائی، گرم گرم کافی پی اور پھر اپنے مستقبل کے لئے تیار ہوگیا، طیارہ سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر بادلوں سے کھیل رہا تھا کبھی ان سے اوپر جاتا اور کبھی نیچے۔ بارش ہو رہی تھی، بجلیاں چمک رہی تھیں اور گرج کی آوازیں کان پھاڑے دے رہی تھیں، میں ایک ہزار فٹ اور بلند ہوگیا، دنیا میری نظروں سے اوجھل تھی نیچے ہر طرف طوفان ہی طوفان نظر آتا تھا، ایک گھنٹہ گذر گیا۔ رفعت سوئی بیس ہزار فٹ بتلا رہی تھی اور میں کچھ سردی اور آکسیجن کی کمی محسوس کرنے لگا، موخر الذکر نے مجھے زیادہ ہراساں کر دیا اس لئے اترنے لگا لیکن بادلوں کے طوفان بے تمیزی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا جدھر نظر اٹھتی بادل نظر آتے مجھے سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ انتہائی رفتار کے ساتھ انتہائی قابل برداشت بلندی پر پرواز کروں لیکن مصیبت تنہا نہیں آتی، برف سے طیارے کے دونوں بازو وزنی ہو رہے تھے اور میں باوجود کوشش کے زمین کا چپہ بھی نہ دیکھ سکا حالانکہ ریگستان کے بعد ابھی تک میں نے دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا، اب جنوبی ہوا کا ایک تھپیڑا مجھے شمال مغربی میکسیکو جدید میں اور شمالی ہوا کا تھپیڑا جنوب مغربی کولوریڈو پر یا جنوب مشرقی یوٹا پر گرا دیتا، مقابل کی رو شمال مشرقی ارِ یزونا میں بہالے جاتی، یہہ کل رقبہ انگلستان کے خطے کے مساوی ہے جو ارِ یزونا سے میکسیکو جدید اور یوٹا تک پھیلا ہوا ہے۔

اس طرح پرواز کرتے رہنا بھی خودکشی سے کم نہ تھا اس لئے میں نے اتر کر بارش ہی میں برف جھاڑ دینے کا خیال کیا تیرہ ہزار فٹ سے اوپر بارش بہت کم تھی لیکن نیچے پہاڑوں پر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی جس نے میری پرواز کو سفر بے منزل بنا دیا تھا اب صرف ایک آخری صورت باقی رہ گئی تھی کہ میں چھ ہزار فٹ نیچے اتروں اور بارش ہی سے برف دھل جانے کی دعا کروں، اور ہوا کے ایسے تھپیڑے کے لئے ملتجی ہوں جو مجھے فلاگ اسٹاف یا ہال بروک ارِ یزونا کے کسی طیران گاہ پر پہنچا دے، ابھی میرے پاس اتنا پٹرول تھا کہ میں دو گھنٹے مسلسل پرواز کر سکتا تھا لیکن اس کو استعمال کرنے کی قابلیت مجھ میں باقی نہ تھی کیونکہ آئندہ سفر میں اور دو تین سو پونڈ برف بازوں پر جم جاتی۔

میں نے طیارہ کو ایک زوردار جھکولا دے کر ایک دائرہ پر گھمایا تاکہ برف گرا کر بار ہلکا کر سکوں، جھکولے کے ساتھ ہی دھڑام کی ایک آواز ہوی اور طیارہ ایک ہزار فٹ نیچے آرہا، دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا گویا طیارہ زمین پر گر گیا ہے، اس کے بعد بندوق پھٹنے کی آواز ہوئی اور دونوں بازو طیارہ کی نشست پر آکر جم گئے جیسے کوئی پرند پر جوڑے اتر رہا ہے، میں نے پٹرول رساں نالی کاٹ دی اور انجن بند ہوتے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ طیارہ سر کے بل انتہائی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جا رہا ہے، رفتار تماتین سو میل پر تھا، چند لمحے میرے لئے گھنٹوں سے زیادہ تھے، طیارہ کے بازو ہوا کے زور سے اڑ کر بار بار میرے سر پر پڑ رہے تھے، لیکن میری ٹوپی نے میرا سر بچا دیا، اور اب میں اپنی نشست سے ہٹ کر چھتری تک پہنچنے کی فکر میں تھا، اگر چھتری پیچھے لٹکتی ہوی نہ ہوتی تو چھتری کو سہارنے والے تاروں میں ٹکڑے ہو گیا ہوتا لیکن اس کے باوجود بھی میں زخمی ہوا مجھ پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری ہوی، دھواں دھار بارش کی سنسناتی ہوئی آوازیں بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک میری اس غفلت کو دور کرنے کے لئے کافی تھے، میں نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اس زنجیر کو کھینچنے کی کوشش کی جس سے چھتری ملحق تھی نتیجہ یہہ ہوا کہ اس کے ساتھ کی متعلقہ اشیا نکل آئیں اور فضا میں گم ہوگئیں ان تمام آوازوں کو دباتے ہوئے چھتری کھلنے کی آواز سنائی دی، میں نے دیکھا چھتری طیارہ سے چھوٹ کر لٹک رہی ہے میں نے طیارہ کو خدا حافظ کہا اور زنجیر ہاتھ میں لئے ہوے نیچے اتر گیا، اس منتقلی میں میرے ایک دو زخم آئے اور بے ہوش ہو گیا، ہوش جب آیا تو ایک زور کی آواز سنائی دی، میں سمجھ گیا کہ ٹرن بل کا طیارہ بھی میرا ہمسفر ہے۔ میں نیچے گھورتا رہا کہ زمین دیکھ سکوں لیکن بارش کی کثرت سے کچھ سجھائی نہ دیا، کچھ دیر بعد مٹی کی بو آنے لگی ساکن پانی اور سڑے گلے پودوں کی بدبو محسوس ہو رہی تھی، مویشیوں کی بھی آوازیں آئیں، دوسرے لمحے میں میرا ایک پیر کیچڑ میں لت پت ہو گیا اور ساتھ ہی پورا جسم اور پھر کچھ فاصلے پر چھتری بھی اتر آئی، میں نے خود کو چھتری کی قید سے آزاد کیا اس کے بعد ایک دھماکے کی آواز آئی، میں سمجھ گیا کہ طیارہ بھی زمین پر پہنچ چکا ہے چھتری بند کی اور پھر اپنی منزل سوچتا رہا، دفعتاً خوفناک آوازیں آنی شروع ہوئیں جن سے معلوم ہوا کہ میں ایک ریگستان کو طے کر کے دلدل میں آپھنسا ہوں، آوازیں ثوری مینڈکوں کی تھیں میں دیوانہ وار ہنستے ہوئے آپ سے آپ سوال کرنے لگا کہ آیا میں اری زونا کے جنگلوں میں ہوں، میکسیکو جدید، یوطہ، یا کلوریڈو کی وادیوں میں؟ میری منزل خدا ہی جانے، میرے آئندہ احباب کا علم بھی اسی کو ہے، میرے اطمینان قلب کے لئے یہی کافی تھا کہ میں زندہ زمیں پر آگیا ہوں اگرچہ دلدل میں ہوں لیکن یہہ جنت سے کم نہیں۔

بارش تھم گئی تھی، سورج نکل آیا تھا، تھوڑی دور سبز گھاس لہرا رہی تھی، پرندوں کے چہچہوں سے دلدل معمور تھی، جب اپنے مستقبل پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ قدرت مجھے زندہ رکھنے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ اگر خدا کو میری موت منظور ہوتی تو میں اسی وقت مر چکا ہوتا جب کہ طیارہ کے بازو سر پر پڑ رہے تھے یا چھتری کسی ایسے مقام پر اترتی کہ میں کسی چٹان سے ٹکرا کر دم توڑ دیتا یا سمندر میں ڈوب جاتا، لیکن اب صورت ہی اور تھی میں ایسی جگہ تھا جہاں پانی اور غذا میسر ہونے کا امکان تھا۔

مغربی سمت میں نصف میل کے فاصلہ پر مجھے ایک چٹان نظر آئی وہاں پہنچ کر اطراف میں نظر دوڑائی، ہر طرف دلدل ہی دلدل تھی، کوئی تین سو ایکڑ کا رقبہ ہوگا، انسان کا کہیں پتہ نہ تھا وادی ڈاش کلش (اری زونا) میں یہی مناظر میرے پیش نظر تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ میکسیکو جدید، کولوریڈو اور یوطہ انھیں دلدلوں سے بھرے پڑے ہیں میں اپنی جغرافیائی معلومات کی بنا پر سمجھتا تھا کہ یہ وہ مقام تھا جس کو یہاں کے باشندے "فور کارنرس" کہتے ہیں اور جہاں اری زونا، میکسیکو جدید، یوطہ اور کولوریڈو کے حدود آملتے ہیں۔

میں چٹان سے اترا اور اب انسانی آثار کی کھوج میں لگ گیا، زمین غور سے دیکھی تو معلوم ہوا کہ بکریوں کے گلے یہاں کی گھاس چر گئے ہیں، ان کے پیر کے نشانات بھی نظر آئے یہہ میری معلومات میں اضافہ کرنے والی چیزیں تھیں

میں آگے بڑھا اور دو تین آثار میرے مستقبل کو درخشاں بنانے والے نظر آئے اس کے بعد میرا بد قسمت شکستہ طیارہ چھ فٹ زمین میں دھنسا ہوا دکھائی دیا تھوڑی کوشش کے بعد میں نے اپنا لوہے کا صندوق اس میں سے کھینچ لیا جس میں دو دو بین ڈوری، گلاس، ادویہ، ابتدائی جراحی کا سامان تھرماس شکاری چاقو، دیا سلائی کی ڈبیاں، جیبی قطب نما، ایک بندوق اور بلانکٹ تھی میں ان سب کو لے کر چھتری لینے کے لئے چلا گیا، راستہ میں خرگوش کا شکار کیا، چھتری لی اور ایک مقام پر پہنچ کر چھوٹا سا خیمہ کھڑا کیا، گوشت بھوننے کے لئے مجھے کچھ نہ ملا تو طیارہ کے بازو کا تھوڑا سا حصہ توڑ کر برتن کی شکل بنالی، ناشتہ کیا، شام ہوگئی ستاروں سے آسمان جگمگا گیا، میں نے مختلف ستارے پہچان لئے، طائری ملبوس اتار کر پائجامہ پہنا اور بلانکٹ اوڑھ کر سوگیا، سو کر اٹھا یوں تو دن چڑھ آیا تھا زخموں سے چور ہونے کی وجہ سے طبیعت مضمحل تھی، لیکن اٹھ کر زخم دھوئے آئیوڈین پھیری اور کس کر باندھ دیا، اس حرارت سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، خدا جانے میں کب تک بے ہوش رہا لیکن کتوں اور انسانوں کی آوازیں مجھے ہوش میں لائیں، آنکھیں کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک نوجوان جو ہندی کے زانو پر سر رکھا ہوں، اور اس کے قریب ہی دو تین ادھیڑ عمر کے آدمی اپنی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے میں قطعاً ناواقف تھا ان کے قریب ہی چار خوبصورت گھوڑے کھڑے ہنہنا رہے تھے مجھ میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی ان لوگوں نے بدقت تمام مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور گھر کی راہ لی ہم راستہ طے کر رہے تھے میرا مربی مجھ پر سوالات کی بوچھار کر رہا تھا لیکن افسوس کہ میں ایک کا بھی جواب نہ دے سکا میں نے اس کے استفہامی لہجہ کو دیکھ کر انگریزی زبان میں ایک جملہ کہا لیکن وہ نہ سمجھ سکا میں نے ہسپانوی زبان میں اس سے گفتگو کی اس کا جواب ملا کہ اس کی ایک بہن "ای ٹے ڈی کل شی" آل جے ٹو میں رہتی ہے جو ہسپانوی زبان سے خوب واقف ہے لیکن خود اس کی زبان اتنی شکستہ تھی کہ میں اس کو بہ مشکل سمجھ سکا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی زبان میں اشاروں کے ساتھ گفتگو کرتا گیا، اس کی طویل گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان نو مر جو ہندیوں نے میرے طیارہ کے گرنے کی آواز سنی اور اس کی تلاش میں پڑ گئے پہلے دن ناکام رہے اور دوسرے دن انھوں نے مجھے پالیا دلدل سے تین میل پر بیس پچیس جھونپڑیوں کی ایک آبادی تھی، مجھے ایک جھونپڑی میں لٹایا گیا ایک ہندی نے گھاس کا ایک گٹھا لایا اور اس کو بستر کی شکل میں پھیلا دیا سمہ گیر اور بلانکٹ سے اس کو آراستہ کیا گیا اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کی ممکنہ کوشش کی گئی، کچھ دیر بعد ایک شخص ہاتھ میں دیگچی لئے ہوئے آیا اور جوشاندہ پلا دوسرے آدمی نے تھوڑی دیر بعد گرم گرم تھپر لا کے مجھے اوڑھنیاں اوڑھا دیں گنہ میں پسینہ میں تر بتر ہوگیا اور خود کو گرم حمام میں محسوس کرنے لگا۔

سرِ مغرب ایک عورت میری کٹیا میں آئی اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی شاید یہ سمجھ کر کہ میں ان کے علاج سے رو بصحت ہوں میں نے اس کو اشارہ سے کہا کہ میں بھوکا ہوں، تب اس نے ایک کٹورا لایا جس میں گوشت کے بھونے ہوئے ٹکڑے اور جو کے ابلے ہوئے دانے تھے میں نے یہ غذا بڑی خوشی سے کھائی، وہ لوگ روزانہ میرے لئے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں لاتے اور دل دہی سے میرا علاج کرتے اس اثنا میں میں نے ریڈ انڈین زبان کے چند الفاظ بھی معلوم کر لئے اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا کام نکالنے کے قابل ہوگیا۔

ایک دن میں بستر پر پڑا ہوا تھا کہ کٹیا کا دروازہ کھلا اور سولہ سالہ خوش رو ہنس مکھ لڑکی داخل ہوئی وہ میرے قریب آئی میں اس کے خیر مقدم کے لئے اٹھا اس نے نہایت سلیس اور صاف ہسپانوی زبان میں کہا "میں اے ٹی ڈی کل شی ہوں، میرے بھائی انکلازی نے مجھے آپ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے طلب کیا ہے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ بیمار ہیں اور آسمان سے گر گئے تھے اور پھر یہاں لائے گئے" یہ الفاظ میرے لئے زندگی بخش ثابت ہوئے اور میں اپنے آپ کو ایک تندرست نوجوان محسوس کرنے لگا۔

---

۲۴ اکتوبر کی صبح کو لاس اینجلس سے چلا تھا اس دن سے ابھی تک مجھے شیو (shave) کرنے کا موقع نہ ملا اب جو آئینہ میں اپنی تصویر دیکھی تو بعض رخساروں پر اور داڑھی سینے پر لہرا رہی تھی میں اپنی شکل سے ڈر گیا میں نے پہلی دفعہ خود کو اس حال میں دیکھا، لاس اینجلس سے چلنے کے بعد اب تک کے واقعات کا اعادہ کیا اور جب اے ٹی ڈی کل شی کا خیال آیا تو فوراً ایک ندامت محسوس ہوئی اب مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا ایسے

قدرتی مناظر سے گھری ہوئی کٹیا میں اس کا وجود جنت میں حور سے کم نہ تھا میرے دل میں سیکڑوں سوالات تھے جو اس سے کرنے تھے، ہم تین گھنٹے لگاتار باتیں کرتے رہے، اس کے بعد نے ورے جو ہندی آگئے اور ہماری گفتگو میں مخل ہونے لگے اس سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ میں جنوب مشرقی یوطہ کے علاقہ میں انگو سے (۱۶۰) برفانی میل کے فاصلے پر تھا جہاں نئی تہذیب کے لوگ بستے ہیں اور تار اور ٹیلیفون کے ذرائع مراسلت مہیا ہوسکتے ہیں۔

سرما کا موسم شروع ہوچکا تھا اور میری سالگرہ اور کرسمس کے ایام وہیں گذر چکے تھے جنوری کا مہینہ تھا طیارہ ناقابل استعمال تھا اور صحت بھی سفر کی مانع تھی فروری کی ایک صبح انکلازی کٹیا میں آیا "میں آل جے ٹو جارہا ہوں جہاں میرے ایک بھائی کے ہاں پیغام بر کبوتر ہیں جو تم سن لی (اری زونا) جاتے ہیں اگر آپ چاہیں تو کوئی خط دیجئے جو کسی فرانسسکو کے اگزمن تک پہنچا دیا جائے گا۔ میں خوشی سے اچھل گیا اور کاغذ پنسل لے کر اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کی

"مدیران جرائد لاس اینجلس

طیارے کے پرخچے اڑ گئے، میں چھتری کے ذریعے زمین پر آگیا، اب برف سے گھرا ہوا آل جے ٹو (یوطہ) سے ۴۶ میل دور "شن شین بے ٹو" میں ہوں، جوزف ٹرن بل تک اطلاع دے دو کہ ایک آبی طیارہ روانہ کردیں۔"

اگر یہ اطلاع شن لی میں کسی پادری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی اطلاع ان کے ہاتھوں میری بیوی کو ہوجائے گی اور وہ میری خیریت سن کر مطمئن ہوگی، میں نے دعائیں دیتے ہوئے کاغذ کا پرزہ انکلازی کے حوالے کیا اور وہ برفانی جنگل میں نظر سے غائب ہوگیا، وہ نویں دن واپس آیا اور اطلاع دی کہ میری چٹھی کبوتر کے ذریعہ روانہ کردی گئی ہے، اس کے دوسرے دن مجھے ایک طیارہ کی آواز سنائی دی میں کٹیا سے باہر ہوا تو ایک روپہلی آبی طیارہ برفانی زمین پر اترنے کے تمام ساماں سے آراستہ ہماری جھونپڑیوں پر منڈلاتا نظر آیا اور دوسرے لمحہ میں وہ میری کٹیا سے سو گز کے فاصلے پر آکر رک گیا۔ طیارے سے چھ آدمی اترے اور باہر نکل گئے، ٹرن بل خود پیش پیش تھے، اور ان کے بعد دو طیارچی اور دو اخباری نمائندے اور چھٹا جیرلڈ ٹامسن شنڈلاس اینجلس کے اخبار کا ایڈیٹر تھا

ہم سب صحیح سلامت لاس اینجلس واپس آگئے، ایک دن ٹرن بل کے دفتر میں میری طلبی ہوئی، اس نے مجھ سے کہا "۱۳ر اکتوبر سے اب تک میں انگلیوں پر دن گنتا رہا، تمہاری گم شدگی کے بعد مختلف مقامات پر تار دئے گئے اور لاحاصل تلاش کی گئی تمہارے لئے الاسکا کو بھی تار دیا گیا۔ آخر جب میری تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو یہ سمجھا کہ تم آب و دانہ اور بے گور و کفن موت کی آغوش میں سوچکے ہیں، تمہارا قاتل خود کو قرار دے لیا، لیکن تمہاری بیوی بیہ سے اس خیال کی تردید کرتی رہی ہیں تمہیں دواخانہ بھیج کر طبی معائنہ کرواتا ہوں کیونکہ میں تمہاری موجودہ صحت کا حال معلوم کرنے کا متمنی ہوں"۔ میں نے مالک کے حکم کی تعمیل کی اور دواخانہ آیا ڈاکٹر نے لاشعاع کے ذریعے مجھے ناخن سے تالو تک دیکھ لیا اور کوئی نقص نہ پایا ٹرن بل خوش ہوگیا اور میز کے خانے سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ یہ ایک چک تھا جو مجھے میری کامیاب پرواز یعنی نیویارک تک پہنچ جانے کے بعد دیا جانے والا تھا، میں نے چک دیکھا اور اس سے متعجب ہوکر سوال کیا جناب کیا یہ آپ کی غلطی نہیں؟

"میں نے اپنی تمام عمر میں صرف ایک غلطی یہ کی کہ تمہیں ایک غیر اجازت یافتہ طیارہ دے کر برفانی راستوں پر اڑایا اور اسی غلطی کا جرمانہ بخوشی ادا کر رہا ہوں" ٹرن بل نے کہا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر آیا۔

میں اپنا قصہ ختم کرنے سے پہلے ان نے ورے جو ہندیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے حیات نو بخشی آئندہ سال پھر "شن شین بے ٹو" جاوں گا لیکن غیر اجازت یافتہ طیارہ میں نہیں، میں نے ایسے طیاروں میں پرواز کرنے اور اچانک زمین پر اترنے کا خیال ذہن میں لانے کی قسم کھالی ہے

ترجمہ اکبر صدیقی

طرزِ یگانہ

جنھیں ذوقِ حضوری خواب و بیداری میں حاصل تھا
خداوندا وہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا؟

خدا یاد آگیا واللہ وہ جلوہ بھی دیکھا ہے!
خدا جانے وہی حق تھا کہ حق کا عکسِ باطل تھا

تماشا گاہِ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں!
بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا

اندھیری کوٹھری میں آئینہ دیکھا تو کیا دیکھا؟
یہی دیکھا کہ میں خود دیدۂ بینا میں باطل تھا

زہے حسنِ گنہ گاری زہے فیضِ پشیمانی!!
جسے ٹھنڈا پسینا آگیا جنت میں داخل تھا

نگاہِ شوق کی دنیا خدا جانے کہاں تک ہے
جہاں دیکھا وہی حسنِ یگانہ شمعِ محفل تھا!

میرزا یگانہ چنگیزی

میرے لئے

برہمی ہوتی ہے اس کی بے سبب میرے لئے
سجدہ ور بھی ہوا ترکِ ادب میرے لئے!

ہے تگ و دو اس جہاں میں انبساطِ زندگی
پائے بندئ قفس ہے کیا غضب میرے لئے

حال نہ پوچھ اس کلبۂ احزاں کی کیفیت نہ پوچھ
ہو گئے ہیں ایک ہی سے روز و شب میرے لئے

کیا ہوا امید وفا اس چرخِ کج رفتار سے
ایک بھی گردش کرے ظالم نہ جب میرے لئے

ہے امیدوں سے زیادہ ناامیدی کا ہجوم
کیا رہا ہے زندگی کا لطف اب میرے لئے

مے سے توبہ کر تو لوں، لیکن یہ دیکھوں کس طرح
تڑپے یوں ہر جام میں بنت العنب میرے لئے

کچھ نہ کچھ اس میں بھی چشمِ فتنہ زا کا زور ہے
یوں سکونِ دل ہوا تھا پہلے کب میرے لئے

غیر تو دشمن ہی تھے اپنے بھی اب دشمن ہوئے
ہو گئی دنیا ہی فرحت، کچھ عجب میرے لئے

مرزا فرحت اللہ بیگ (بی، اے)

بیوہ

موت پر کس کا زور چل سکتا ہے، بنواری لال تھوڑی سی علالت کے بعد تیس سال کی عمر ہی میں مر گیا..... ایک بیوی کو دنیا سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے لئے زندہ چھوڑتے ہوئے..... ایک نوجوان بیوی کو جس کی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ اپنی پوری روشنی سے اس کے دل کو منور کر رہے تھے..... شیلا اب بیوہ تھی... عورت ہونے کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا... وہ اپنے خاوند کی قاتلہ سمجھی جانے لگی... ڈائن سمجھی جانے لگی......

ایک بیوہ سب کچھ سمجھی جاتی ہے..... سولہ سترہ سال کی لڑکی ہر دم خیالی دنیا بسانے والی نادان لڑکی کو اک دم سے یہ باور کرایا جائے کہ "تو بیوہ ہے" کس قدر ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والا ہوتا ہے، مرنے والے سے زیادہ اس کا غم شیلا کے لئے سوہان روح تھا، وہ چاہتی کوئی اسے تسلی دے اس کی اشک شوئی کرے، اور اسے طعن و تشنیع کرنے والی زبان چبھتی ہوئی قہر آلود نظریں... چاروں طرف سے گھیرے رہیں۔

سسرال میں اب اس کا کوئی گزارا نہ تھا خاوند کو کھا جانے والی کا کہاں گزارا ہو سکتا ہے؟ زندگی تک اس کے چرنوں میں اور مرنے کے بعد.....
وہ جہاں ہو وہیں..... دنیا میں؟ کس کے ساتھ؟ کیوں؟ شیلا روتی تھی..... اپنے سر کے بال نوچ ڈالے تھے کھانا چھوڑ دیا تھا، پھر بھی یہ سب ڈھونگ تماشے سمجھے گئے کہا گیا کہ "بڑی مکار ہے، منحوس ہے"..... وہ اور بھی زیادہ رونے لگی...

سسرال سے نکال دی گئی، شیلا سسرال سے نکال دی گئی... ایک منحوس ہمیشہ نڈھال رہنے والی لڑکی کو کون اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے جب کہ اس گھر میں شادی، پوجا، سالگرہ ہوتی ہوں، چھوٹے چھوٹے بچے ہوں..... ساس نے صاف کہہ دیا "جاؤ اپنی ماں کے پاس میرے گھر میں تو اب رہنے کی ضرورت نہیں..... میرے بیٹے کو کھا گئی... اب اور کسے کھائے گی" بیچاری کی آواز بھر آ گئی..... سننے والوں کو بھی ترس آ گیا..... شیلا کے سر پر سبھوں نے اس کے پاپ کی گٹھڑی کی طرح میلے کچیلے کپڑے باندھ دیے..... دروازے بند ہوتے گئے.....

شیلا کی ماں بہت دن ہوئے مر چکی تھی..... اس کے باپ نے دوسری شادی کی اور اس شادی کے کچھ دن بعد ہی دنیا سے منہ موڑ لیا..... اپنی پہلی بیوی کے پاس چلا گیا، شیلا کی سوتیلی ماں ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتی اور اسے شیلا یا شیلا کے معاملات سے بہت کم تعلق ہوتا۔

وہ مکان جس میں شیلا اب جا رہی تھی، اس کے باپ کی وصیت سے ان دونوں ماں بیٹیوں کا تھا اور وہ کسی غیر کے گھر نہیں جا رہی تھی، شیلا کی ماں طبیعت کی کچھ بری نہ تھی... لیکن..... ایک بیوہ لڑکی کے لئے ماں کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے اور وہ بھی سوتیلی ماں کا، ابتدائی دو چار دن کے علاوہ باقی کے دن شیلا کے لئے کچھ زیادہ امید افزا نہ تھے۔ سسرال سے زیادہ یہاں اسے تکلیف ہوتی تھی..... جو بات غیروں کی زبان سے سنی جائے وہی اگر آپ نے بھی دہرائی تو سننے والے کا دل چھد کے رہ جاتا ہے مگر ان تمام طعن و تشنیع اور بدسلوکی کا اثر کچھ دنوں کے لئے شیلا کے دل پر بہت گہرا داغ بٹھاتا رہا لیکن اب..... اسے ان باتوں کو سنتے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے..... ان باتوں نے اس کے کان پکا دیے تھے..... وہ سب کچھ سنتی... سمجھتی کہ وہ اسی کی مستحق ہے اور زندگی کے دن بغیر روئے دھوئے گزار رہی تھی..... اس کی ماں نے ایک دن کہا کہ وہ اپنے کھانے پینے کا علیحدہ انتظام کر لے۔ وہ کہتی "ایک بیوہ تیرا بار اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی..." پھر بھی مکان میں شیلا کا حصہ تھا۔ وہ مصلحتاً خاموش ہو جاتی..... بچا ہوا دینے اور کھانے میں دونوں کو بہت دن تک کوئی اعتراض نہ ہوا.....

شیلا کی ماں کے ہاں ایک لڑکا کھانا کھایا کرتا اور ماہوار چار پانچ روپے جو کچھ بھی ہو سکتا دے دیتا..... وہ روزانہ دو وقت شیلا کے گھر آتا، اور اب تین چار وقت آنے لگا تھا، راجہ شنکر مدرسہ میں میٹرک کی تعلیم پاتا تھا، بڑا ہی منچلا، طبیعت میں شوخی اور شرارت، گانے بجانے کا شوقین، غرض کہ

موجودہ زمانے کا نوجوان تھا... شیلا سے اس نے کبھی کھل کر بات نہیں کی لیکن نظروں میں... شیلا کے لئے اُن کے راز کی گہرائی تک پہونچنا مشکل نہ تھا شیلا کی ماں نے ایک دن راجہ شنکر سے کہا "تھوڑی دیر اگر شیلا کو بھی پڑھا دو تو وہ کہیں دس بیس کی نوکری کرے گی" شیلا نے بھی اس کو غنیمت جانا اور دوسرے دن سے تعلیم شروع ہوگئی..... راجہ شنکر کو اب پڑھنے کی فرصت نہ تھی، وقت بے وقت جب دیکھو وہ شیلا کو پڑھاتا رہتا... شیلا ذہین تھی اس کی تمام توجہ تعلیم کی طرف ہوگئی، اس نے بہت جلد سیکھ لیا لکھنا، پڑھنا.... اور ساتھ ہی پڑھانا بھی، راجہ شنکر اس کے کہنے پر اپنی کتاب کے دلچسپ حصے اسے سناتا، کبھی کسی بات پر اڑ جاتی یا سننے کے لئے تیار نہ ہوتی .. "ایک عورت نے مرد کے لئے جان دے دی" وہ تعجب سے پوچھا کرتی، راجہ شنکر کچھ نہ کہتا....

شیلا کی ماں چند دنوں تک تو بڑی سختی سے دونوں کی نگرانی کرتی رہی لیکن بعد میں وہ لاپرواہ ہوگئی..... دونوں کو پڑھنے پڑھانے کی کامل آزادی حاصل تھی.... محلہ والوں نے ناک بھوں چڑھائی .... مگر پرواہ کرنے والا کون تھا..... کسی تہوار کے موقع پر ایک ناٹک کھیلا جانے والا تھا، راجہ شنکر نے شیلا کی مدد سے اپنا پورا پارٹ یاد کر لیا تھا، اور اسی کا کام سب سے زیادہ اچھا رہا.... دوسرے دن شیلا نے ہیروین کا پارٹ خود یاد کر لیا اور کل کے کام کو دوبارہ دہرایا گیا..... راجہ شنکر ہیرو، شیلا ہیروین..... شیلا نے اپنا پارٹ ختم کیا..... اس کی ہمت بڑھ گئی تھی اس نے سوچتے ہوئے کہا "اگر ہم ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لئے رہیں تو" "کھیل سکتے ہیں اگر..." "میں چاہوں تو نا" شیلا نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں" راجہ شنکر کی زبان سے نکلا... اس نے زمین پر اپنی انگلی سے کریدتے ہوئے کہا میں تم کو چاہتا ہوں شیلا" شیلا خاموش ہوگئی.... اور چلی گئی.... راجہ شنکر بھی کچھ تذبذب کچھ امید کی حالت میں گھر چلا آیا......

شیلا اب بننے سنورنے لگی.... اس کے شباب کے دریا میں پھر کسی کا چہرہ عکس افگن تھا، کوئی دیکھنے والا ہو تو آرائش کیوں نہ کی جائے شیلا اور راجہ شنکر کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بندھ گیا..... محبت کے خطوط کا، شیلا کی ماں نے ان کی اس چوری کو پکڑ لیا وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شیلا پر جھپٹی، شیلا کو ہر بُرے لفظ سے یاد کیا اور آخر میں گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی، شیلا کے لئے راجہ شنکر کے ساتھ بھاگ جانے کا خیال فضول تھا اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا "ہمارا اس طرح بھاگ جانا..... ہم دونوں کے لئے بہت خطرناک ہوگا" وہ اتنے بڑے مرحلے میں اپنی عزت اور آبرو کی بازی لگانا نہیں چاہتا تھا۔ شیلا نے منہ پھوڑ کر اپنی نسوانی حیا اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر کہا "چلو بھاگ چلیں" مگر راجہ شنکر کا جواب مایوس کن تھا اُسے اب ناامیدی ہوگئی، راجہ شنکر آیا، شیلا اُسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتے ہوئے سارے واقعات بیان کر دئے۔ راجہ شنکر نے بہت دم دلاسا دیا" اس کو کوئی حق نہیں..... گھر تمہارا بھی ہے اور اس کا بھی.... اب کی دفعہ جو کچھ کہے تو تم اپنا حصہ مانگو...." راجہ شنکر کی بتائی ہوئی ترکیب کارگر تو ہوئی لیکن سختی بڑھ گئی دونوں میں ایک دیوار حائل کر دی گئی.... نہ یہ اس سے ملے اور نہ وہ اس سے .... پھر بھی جس کو ملنے کی دھن سمائی ہو وہ کب کسی رکاوٹ کو خاطر میں لاتا ہے۔ وہ بچے جو شیلا کے پاس پڑھنے آتے تھے، راجہ شنکر نے ان میں سے ایک کو ہموار کر لیا اور اس طرح خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا... بعض اوقات وہ مل بھی لیا کرتے..... دونوں بہت بری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے. . انجام دل خوش کن نہیں ہو سکتا تھا، راجہ شنکر نے امتحان دینے کے بعد اپنے گھر کی راہ لی..... اور وہاں اس کی شادی ہوگئی .... شیلا نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ "تم شادی کر لو" مگر جس وقت یہ خبر شیلا کے کانوں میں پہنچی، وہ سنبھل نہ سکی، آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا، یہ دوسری بیوی تھی راجہ شنکر کو اس کے سامنے آتے ہوئے جھجک ہوتی تھی..... مگر اس نے اپنی بیوی کو اس کے مدرسہ میں داخل کیا.... سرسوتی شیلا سے زیادہ حسین نہ تھی.... مگر وہ بیوہ نہ تھی..... وہ گھنٹوں اس کی صورت دیکھتی اور آہیں کھینچا کرتی..... سرسوتی نے راجہ شنکر سے پوچھا "استادنی ماں غمگین کیوں رہتی ہیں" "میں کیا جانوں" راجہ نے اس انداز میں کہا کہ سرسوتی سمجھ گئی "یہ سب تو جانتے ہیں" سرسوتی کھنچی کھنچی رہنے لگی

راجہ شنکر نے سمجھا کہ شیلا ہی نے کچھ کہا ہوگا وہ ایک دن اُس کے پاس گیا، وہ اپنے بال سکھا رہی تھی..... وہ مسکرائی لیکن طنز اس کے لبوں پر کھیل رہا تھا..... "شیلا یہ تم نے کیا کیا" "میں نے کیا کیا راجہ" "کچھ بھی نہیں؟" "کچھ بھی نہیں" اس نے نہایت ہی سنجیدہ لہجہ میں کہا اور اٹھ کر جانے لگی، راجہ نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا..... "سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو....." شیلا چونکی اس کے کانوں میں "سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو" گونج رہا تھا۔ "میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا" اپنے اضطراری حالت میں جواب دیا لیکن وہ سوچتی رہی "میں کون ہوں..... ایک بیوہ.....اور سرسوتی سہاگن اس کے خاوند کو کیوں چھین لوں..مگر... راجہ نے مجھ سے محبت ہی کیوں کی، میں بدلہ لوں گی... ضرور لوں گی" وہ مکتب پر گر پڑی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیہ میں جذب ہو رہے تھے

دوسرے دن سرسوتی آئی..... باتوں ہی باتوں میں راجہ شنکر کا ذکر آیا "وہ کس قدر آزاد ہوگیا ہے..... راتوں کو سوتا ہی نہیں..... ہمیشہ کچھ سوچا کرتا ہے" شبہہ کے لئے یہ جاننا مشکل نہ تھا..... وہ اکیلے خیال میں گم رہتا ہے..... "سرسوتی" اس نے اس کی طرف مترحم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ایک بات کہوں برا تو نہ مانوگی" "نہیں شیلا نہیں ایسا خیال نہ کرنا میں تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں.... شیلا کو سرسوتی بہن سمجھتی ہے... راجہ راتوں کو سویا نہیں کرتا، سوچا کرتا ہے..... اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا، شیلا نے کچھ بھی نہ کہا... دو بڑے بڑے آنسو لڑھک کر اس کے رخسار پر بہنے لگے..... سرسوتی گھبرا گئی اس نے اس کے آنسو صاف کئے شیلا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "کچھ سن سرسوتی کچھ سن... تم اپنی ہستی کو سنبھال کر رکھو... میں نے اپنی ہستی کو کھو کر خود کو کھو دیا ہے ..." اپنے آپ کو سرسوتی کی گود میں ڈال دیا۔

چند دنوں کے بعد شیلا.. یکایک غائب ہوگئی..... سرسوتی نے اپنی خادمہ کی طرف دیکھا اس خبر کو سن کر اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئی تھیں، اسی رات کو نواری لال کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ نواری لال دولھا بنا بیٹھا ہے۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔

رشید قریشی (عثمانیہ)

کسان

برہنہ جسم، پسینے میں غرق، ننگے پاؤں
گیہوں کے کھیت سے کٹیا میں اپنی آیا ہے
ہے اک پھٹی ہوی کمبل غریب کاندھوں پر
پڑا ہے کھیت کا سامان ایک کونے میں!
نفس ہے پھولی ہوی جیسے پھونک بھتے کی
لہو کی لہر سی ہے موج زن پسینے میں!

مگر سکون ہے یوں دل میں جیسے ٹھنڈی چھاؤں
تصورات کی دنیا بھی ساتھ لایا ہے!
سیاہ ابر پہ رہ رہ کے اٹھ رہی ہے نظر
ہیں اس کی زیست کے اسرار، پا کے کھونے میں
رکھی ہے کان پہ بیڑی بنا کے پتے کی
بقائے دہر کا ہے راز اُس کے جینے میں

ہر ایک سانس ہے اُس کا بہار آزادی
کہ اس غلام کا دل ہے دیار آزادی

میکش

جنگ

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ — باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی — پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی !
عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس — کیوں رک رہی ہے سینے میں تہذیبِ نو کی سانس
امن و اماں کی نبض چھٹی جا رہی ہے کیوں — بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں
اب دُلہنوں سے چھین لیا جائے گا سُہاگ — اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ
بربطِ نوازِ بزمِ الُوہی اِدھر تو آ !! — دعوت دہِ پیامِ "عبودی" اِدھر تو آ
انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ — اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ
معصومۂ حیات کی بے چادری تو دیکھ — دستِ ہوس سے حسن کی غارت گری تو دیکھ
خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی — قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی
انساں رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے؟ — اِس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے ؟
او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو ! — او انجمِ حمیّتِ یزداں طلوع ہو !!

مخدوم محی الدین (ام، اے)

دیوتا

تم جھوٹ کہتے ہو!

مقدس دیوتا کی نورانی آنکھوں سے غصہ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں، چہرہ دہکتے اور گرم آفتاب کی مانند آگ کے شعلے برسا رہا ہے۔

دیوتا نے اپنے ایک پجاری کو دنیا کی سیر کرنے کی اجازت دی تھی اور کہا تھا کہ تم وہاں اپنے قول و فعل سے میری نمائندگی کرو گے تم کو وہاں فرشتوں سے زیادہ نازک بدن اور حسین ہستیاں دکھائی دیں گی، ان کے دل لبھانے والے ناز و انداز اور گداز جسموں میں گناہ کے سیلاب بہا کرتے ہیں، ان کاغذی پھولوں کو تم اپنی راحت کا ذریعہ نہ بنانا، اور وہاں اس کا بھی خیال رہے کہ اسی مقام کے ایک پُرسکون جنگل کو چند لڑکوں نے حصول علم کے لئے بسایا ہے، ان تمام نونہالوں سے ہنس بول کر ملنا، میری دعا اور محبت کا گلدستہ وہاں کے اس "رشکِ گلستاں" کو دے دینا جس کی میٹھی میٹھی باتیں اور رس بھری ادائیں فرشتوں کو بھی آمادۂ پرستش کرتی ہیں، وہ مجسم تقدس ہے اور اس کے تقدس میں ایک احساسِ درد، وہ اپنے ساتھیوں کے درد سے تڑپ اٹھتا ہے اپنی ہمدردی سے ان کو خوش کرتا ہے اور اس طرح خود خوش ہوتا ہے، اس کے معصوم دل کو دکھ پہنچاؤ گے تو میرا غضب تم پر نازل ہوگا

دیوتا نے پجاری سے یہ بھی کہا تھا کہ تم جس وقت میرا درشن کرتے ہو تو میری مدہوش کن نگاہ کا اثر تم میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، یہ کیفیت تم کو ہر سم کی فکروں سے آزاد کر دیتی ہے لیکن دنیا والوں کے پیمانے شراب سے چھلکتے ہیں، وہ آگ کو پانی کرکے پی جاتے ہیں، پھر اس کے بعد ان میں وہ تقدس باقی نہیں رہتا جو انسانیت کا آئینہ دار ہو، تم نے اس خانہ خراب کو منہ لگایا تو دیکھنا اچھا نہ ہوگا

پجاری دنیا کی سیر کرتا ہوا انجام کار اس فردوسی بستی میں داخل ہوا، جس کی جانب دیوتا نے اشارہ کیا تھا، یہاں لہلہاتا ہوا سبزہ زار تھا، بلند اور سفید عمارتیں تھیں معصوم لڑکے آبی رنگ کا لباس پہنے نغمہ سرائی کر رہے تھے ان کے نقروی تبسم اور رنگین قہقہوں سے ماحول درخشاں تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنت نگاہ اور فردوس گوش کے باعث یہ مقام الوہیت نواز دیوتا کا تفرج گاہ ہے۔

یہاں اس نے ایک لڑکے کے شیریں نغمے سنے، جس کے سوز و گداز نے اس کو تھوڑی دیر تک اپنے آپ سے بے خبر کر دیا، وہ گا رہا تھا۔

بستی بستا کھیل نہیں   بستے بستے بستی ہے

اس معصوم ہستی کے اندر پجاری کو اپنے دیوتا کی جھلک نظر آئی، اس نے نیاز مندانہ نگاہ سے اس معصومیت نواز لڑکے کی پرستش کی اور اس کے مضطرب دل نے دم بھر کے لئے ایک سکون حاصل کیا۔

پجاری کی ایک ایسے لڑکے سے بھی ملاقات ہوئی جو بہت اچھا شاعر تھا اس کا تخلص اتنا مغالطہ انگیز تھا کہ پجاری کو اپنے دیوتا کی نصیحت یاد آگئی پجاری کو وہ مجسم شراب معلوم ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں میں شراب کا نشہ تھا، اس کے رخساروں پر شراب جیسا رنگ کھیل رہا تھا، اس کے ہونٹوں میں شراب کی لذت تھی، لیکن وہ مادی شراب سے بالکل ناآشنا تھا، پجاری یہاں بغیر پیئے مدہوش ہوگیا، دنیا میں اس نے کئی لطیف چیزیں دیکھیں مگر کبھی اس کو اتنا لطف نہ آیا اس پر ایک سرور اور نشہ کی کیفیت طاری تھی۔

پجاری نے آخر دیوتا کے منظورِ نظر رشکِ گلستاں کو پالیا، حسنِ فطرت کا ذوق رکھنے والے اس جنگل کو رشکِ ارم اور اس لڑکے کو شہزادہ کہتے تھے، اس کے آس پاس دوسرے کئی لڑکے مصروفِ گلگشت تھے، ایک ہی پودے کے خوش نما پھولوں کی طرح ان میں یکسانیت نظر آتی تھی، پجاری نے لڑکے کے قدم چومے اور لڑکے نے پجاری کی عزت کی، کیونکہ وہ دیوتا کا خاص نمائندہ تھا اس نے گلدستہ کا پلکوں سے بوسہ لیا، اس کی آنکھوں میں

خوشی کے آنسو رقصاں تھے، لبوں پر پھولوں کو شرمانے والی مسکراہٹ تھی، مخمور اداؤں سے خرمنِ دل پر بجلیاں گر رہی تھیں، وہ دیوتا کے احسان سے پھولوں نہیں سما رہا تھا، اظہارِ تشکر کے لئے وہ بے چین تھا، اُس نے پجاری سے کہا " دیوتا یہاں نہیں آسکتے؟ وہ نہیں آسکتے تو مجھے اپنے پاس بلالیں میں اُن کو میٹھے راگ سناؤں گا، میرے اچھے دیوتا کیسے نیک ہیں، وہ مجھے کتنا عزیز رکھتے ہیں، جب یہاں کے برے لوگ مجھے ستاتے ہیں، تو دیوتا اُن سے روٹھ جاتے ہیں، میرے ستانے والوں کو دیوتا کی ناراضگی کا خیال سہما دیتا ہے، وہ مجھ سے طالبِ عفو ہوتے ہیں، میں بھی ان کو معاف کر دیتا ہوں، کہیں دیوتا کا غضب ان پر نازل نہ ہو جائے، میں کسی کو مبتلائے مصیبت نہیں دیکھ سکتا۔"

یہاں چند دن قیام کر کے پجاری دیوتا کے پاس واپس جا رہا تھا، وہ بہت تھکا ہوا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، بادل کا رنگ تو بہ شکن تھا، پجاری نے دیکھا، شرابِ ارغوانی نے دنیا والوں میں ایک لطف انگیز بات پیدا کر دی ہے، سفید گلاس میں آتشیں پانی ——— اس کے خیالات متزلزل تھے، اس نے دیوتا کے حکم کی نافرمانی کی، رکتے رکتے پیمانہ منہ سے لگا ہی لیا، اس کے بعد اس پر ایک کیف چھا گیا اسی کیف میں وہ دیوتا کی طرف لوٹا دیوتا نے اسے آتا دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ پجاری نے اس کے حکم کی نافرمانی کی ہے، تو اس کی ساری مسرت غصہ سے بدل گئی، اب پجاری کا ماتھا ٹھنکا وہ بہت پشیمان تھا کہ کیوں اس نے ایسی حرکت کی جس نے اس کے مقدس دیوتا کو ناراض کر دیا، دوسرے دن پجاری نے دیوتا کو اس لڑکے کا پیغام سنایا اور اس کا واسطہ دے کر معافی چاہی، دیوتا نے کہا " اچھا خوش ہو جا میں تجھے معاف کرتا ہوں"———

پجاری نے اس کے بعد مقدس دیوتا کو کبھی ناراض نہ کیا۔

پجاری (عثمانیہ)

مغنیہ سے

نغمۂ دل نواز بن پردۂ ساز میں بھی آ
جلوۂ حسن دلبری رنگ مجاز میں بھی آ
بزمِ سرود و عشق کو کب سے ہے تیرا انتظار
خلوتِ راز سے گزر محفلِ ناز میں بھی آ

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

میری متاعِ عشرت و صبر و سکوں لٹائے جا
شوخ نظر کا واسطہ برق نظر گرائے جا
دردِ جگر کا ساز ہو رہنِ تبسم جمال
زخمِ جگر کو خندۂ ناز سے تو ہنسائے جا

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

میری نگاہ کو بھی دے دعوتِ جلوۂ تمام
پردۂ بے خودی میں لے شرم و حیا سے انتقام
پھر مجھے شوق سے سنا، پریم کی دھن میں کوئی گیت
پھر مرے قلب و روح کو دے کوئی سرمدی پیام

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

سجدۂ عشق کے لئے سجدہ گرِ نیاز بن
آنکھ کا میری نور بن، دل کا مرے گداز بن
دیکھ حدیثِ دردِ دل، منظرِ عام پر نہ آئے
عالمِ حسن و عشق میں، جوشِ جنوں کا راز بن

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

النسب کلیانوی

نیک نام خاں

اگرچہ گولکنڈہ کی صرف دو سو سال کی تاریخ ہے لیکن یہہ عجیب بات ہے کہ اس میں بہت سے مشاہیر ملتے ہیں جن کی زندگی میں تاریخ کی بہت سی حقیقتیں پوشیدہ ہیں، یہہ سچ ہے کہ اس سلطنت کو ایسے بیوفاؤں سے بھی سابقہ پڑا جنھوں نے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور بالآخر اس کا خاتمہ کردیا، لیکن ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کی غیر متزلزل وفاداری اس سلطنت کی ہمیشہ دستگیری کرتی رہی اور اس سلطنت کو مقدور بھر زندہ رکھا، اگرچہ بیوفاؤں کی بیدردی کی وجہہ سے بالآخر گولکنڈہ کی سلطنت ختم ہوگئی لیکن اس کے وفاداروں کے سبق آموز کارنامے اب تک زندہ ہیں۔ اس سلطنت کے وفادار ارباب سیاست کی ایک بڑی فہرست ہے۔ اس میں جہاں مصطفےٰ خاں اردستانی حضرت میر مومن استر آبادی حضرت حسین شاہ ولیؒ اور عبدالرزاق لاری پائے جاتے ہیں وہاں نیک نام خاں کا نام نیک بھی ہے جو گولکنڈہ کے مشاہیر میں سے تھا یہہ بھی ایک بڑی شخصیت تھی جس کی وفاداری اور حمیت اب بھی بہت سوں کو یاد ہے۔

نیک نام خاں سے متعلق اب تک بہت کم معلومات تھے، دنیائے تاریخ اس کو صرف ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتی تھی، یہہ مختصر معلومات بھی کچھ مغل تاریخوں سے اور کچھ انگریزی وثائق سے حاصل ہوتے تھے، کوئی مقامی تاریخ ایسی نہیں ہے جو نیک نام خاں کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈالتی مغل مورخوں کو اس سے کوئی خاص واسطہ نہ تھا مغل مورخ اس سے کچھ اس طرح واقف ہوے تھے کہ یہہ بیجاپور کی تائید میں جے سنگھ کے مقابلہ کے لئے گیا تھا، ان کو تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہ تھی نہ ان کے ہاں کوئی مواد تھا۔ انگریز کمپنی کے عہدہ داروں نے اس وجہہ سے اس کا ذکر کیا ہے کہ اس نے کئی سال کرناٹک کی سپہ سالاری اور گورنری کی تھی، اسی کے طفیل میں انگریزوں کو مدراس ملا، لیکن یہہ سب تحریریں اس قدر پراگندہ اور مختصر ہیں کہ ان سے نیک نام خاں کے حالات پر کافی روشنی نہیں پڑتی اور بعض مرتبہ تو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، بعض جگہ اس کو ابوالحسن قطب شاہ کا سپہ سالار بنایا گیا ہے حالانکہ یہہ عبداللہ قطب شاہ کا سپہ سالار و وزیر تھا اور ابوالحسن کی تخت نشینی سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا تھا، لیکن ایک مقامی تاریخ سے جس کا نام حدائق السلاطین ہے اور جس سے اب تک استفادہ نہیں کیا گیا نیک نام خاں کے بہت سے حالات معلوم ہوتے ہیں، اس تاریخ کا مولف علی طیفور بسطامی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہہ مولف کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا اور گیا اور چونکہ یہہ فاضل آدمی تھا اس لئے ابوالحسن قطب شاہ کے علم نوازدربار نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی اور دربار کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا کر اس نے گولکنڈہ میں اپنی تاریخ لکھی تھی جو ۱۰۹۲ھ میں گولکنڈہ کی فتح سے چھ سال پہلے ختم ہوی ہے، اور اتفاق یہہ ہے کہ علی بن طیفور اور اس کا بھائی ابراہیم جو خادم تخلص کرتا تھا نیک نام سے براہ راست وابستہ تھے، ابراہیم تو نیک نام خاں کا ملازم تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی قربت کی وجہہ سے یہ نیک نام خاں سے اچھی طرح واقف تھے۔

تمام تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں کا اصل نام رضا قلی تھا، علی بن طیفور کے علاوہ جس کی تاریخ اس حقیقت کی صحیح رہنمائی کرتی ہے مغل مورخوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، محمد کاظم جو عالم گیرنامہ کا مولف ہے نیز خافی خاں[1] اس کو رضا قلی لکھتے ہیں[۱]، ایک مثنوی سے جو

---

[۱] عالم گیرنامہ محمد کاظم ۱۰۰۶



گولکنڈہ کا غدار وزیر میر جملہ



گولکنڈہ کا وفادار وزیر نیک نام خاں

اس کی تعریف میں لکھی گئی تھی اس کا نام رضا خاں ظاہر ہوتا ہے ؎ رضا خاں جم قدر خورشید رائے　　زسرتا بہ پا محض لطف خدائے

لیکن قیاس یہہ ہے کہ یہہ اس کا نام نہیں بلکہ خطاب تھا جو گولکنڈہ آنے کے بعد دربار قطب شاہی سے عطا ہوا تھا اس کے ابتدائی حالات صرف اس قدر معلوم ہوتے ہیں کہ یہہ ایرانی تھا اور صفوی دربار کا ملازم تھا، خافی خاں تو اس کو ایرانی امیر لکھتا ہے کہ "در اصل از امرائے ایران بودہ"[1] اور ولیم اروِن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہہ نہیں ہے لیکن یہہ صحیح ہے کہ یہہ شاہ ایران شاہ عباس ثانی صفوی کا ملازم خاص تھا چونکہ یہہ خواجہ سرا تھا اس لئے شاہی محل کا خاص انتظام اس کے سپرد تھا، خافی خاں نے اس کے متعلق ایک عجیب و غریب روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی خواجہ سرا نہیں تھا بلکہ خود ساختہ تھا[2] لیکن جو تصویریں اس کی دستیاب ہوتی ہیں ان سے غالباً اس روایت کی توثیق نہیں ہوسکتی۔ سب مورخ اس کو نیک نام خاں خواجہ سرا اور رضا قلی خواجہ سرا لکھتے ہیں۔ خافی خاں کی اسی روایت سے نیک نام خاں کے ترک وطن کی توجیہہ بھی کی جاتی ہے کہ وہ شاہ ایران کی خفگی کی وجہہ سے گولکنڈہ بھاگ آیا تھا، چنانچہ خافی خاں کے الفاظ یہہ ہیں " از غضب شاہ ایران . . . . . . آخر کار رو بہ دکن آورد"[3] ممکن ہے کہ اس روایت کا یہ حصہ صحیح ہو۔ لیکن حقیقت یہہ معلوم ہوتی ہے کہ نیک نام خاں سلطنت گولکنڈہ کی عظمت سے متاثر ہوکر آیا تھا، یہہ سب جانتے ہیں کہ قطب شاہی دربار کی مہمان نوازی لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی تھی، نیز ایران اور گولکنڈہ کے پرانے تعلقات بھی جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں زیادہ گہرے ہوگئے تھے یہہ بات کچھ خلاف قیاس بھی نہ تھی اہل ایران گولکنڈہ کی قدر شناسی سے ناواقف نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی کشش کچھ یہاں بھی کام کر رہی تھی، سچ پوچھو تو گولکنڈہ کی سلطنت نیک نام خاں کے حقیقی خدمات کی صحیح ترجمان ہوسکتی تھی، یہی میدان تھا جہاں وہ اپنی وفادارانہ فوجی و سیاسی قابلیت ظاہر کرسکتا تھا، یہاں اس کو نہ صرف اپنی صحیح خدمات ظاہر کرنے کا موقع ملا جس کی وجہہ سے اس کو شہرت دوام ملی بلکہ خود سلطنت گولکنڈہ کو بھی اس سے سیاسی اور فوجی فائدے پہنچے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

نیک نام خاں کرناٹک میں

یہہ بتانا مشکل ہے کہ نیک نام خاں ایران سے گولکنڈہ کب آیا تھا اور پھر یہہ سوال بھی حل طلب رہ جاتا ہے کہ وہ کرناٹک میں کب متعین کیا گیا تھا، حدائق السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ کرناٹک میں میر جملہ کے ساتھ بلکہ اس کے ماتحت مامور ہوا تھا[4] قرائن یہہ ہیں کہ وہ غالباً میر جملہ کے ساتھ گولکنڈہ آیا اور ایک ہی زمانے میں کرناٹک میں متعین کیا گیا تھا اور غالباً ان دونوں میں دیرینہ روابط تھے، اگر یہہ صحیح نہیں ہے تو اس قدر قطعی ہے کہ وہ کرناٹک میں میر جملہ کے ماتحت تھا اور اسی ماتحتی میں فوجوں کی رہنمائی کرتا تھا[5] ممکن ہے کہ کرناٹک کی عظیم الشان فتوحات جن میں سدھوٹ اور گنڈی کوٹ شامل ہیں اور جو میر جملہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں نیک نام خاں کی کوششوں کا پھل ہو لیکن ۱۰۶۵ھ میں میر جملہ کی غداری سے نہ صرف کرناٹک بلکہ خود سلطنت گولکنڈہ کی سیاسی فضا بدل گئی جس کا سلطنت کو کوئی اندازہ نہ تھا، بات یہہ تھی کہ میر جملہ نے کرناٹک میں وسیع فتوحات حاصل کرلی تھیں اور اس سے مغرور ہوکر وہ ایک خود مختار راج دھانی کی فکر کر رہا تھا اور جب گولکنڈہ نے مزاحمت کی تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے مغل سلطنت سے مل گیا اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ مغل سلطنت سے ایک لڑائی ٹھن گئی اور گولکنڈہ کو دب کر صلح کرنی پڑی، یہہ ایسا افسوسناک واقعہ تھا کہ اس سے سلطنت کی تمام بساط الٹ گئی اور اس قدر نقصان پہنچا کہ اس کی پھر تلافی نہ ہوسکی۔ فرانسیسی سیاح برنیر کہتا ہے کہ اس سے سلطنت کا تمام وقار غائب ہوگیا تھا اور یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے کہ اس کا نفسیاتی اثر دوسرے امراء و عمائد سلطنت کے جذبۂ وفاداری کو

---

[1] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۴ [2] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۵ [3] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۵ [4] حدائق السلاطین

متزلزل کرنے لگا کہا جاتا ہے کہ خود عبداللہ قطب شاہ نے شرم کے مارے شہر حیدرآباد چھوڑ کر گولکنڈہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اگر برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو عبداللہ قطب شاہ نے دربار کی نشست بھی چھوڑ دی تھی[1]

نیک نام خاں کی وفاداری

اس تاریک فضا میں نیک نام خاں کی ہستی ایک بڑی نظر افروز حقیقت تھی، علی بن طیفور کہتا ہے کہ میر جملہ نے جاتے ہوئے نیک نام خاں کو بھی دعوت بغاوت دی اور ساتھ چلنے کے لئے کہا لیکن اس نے نہ صرف اس قبیح حرکت سے صاف انکار کر دیا بلکہ دل خراش واقعہ سے اس کے جذبۂ وفاداری پر ایسی ضرب لگی کہ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی[2] جو اس کی وفاداری کا سچا ثبوت تھا۔ اس ہمت شکن ماحول میں نیک نام خاں کی غیر متزلزل وفاداری ایک بڑی سبق آموز حقیقت تھی۔ جہاں مغل سلطنت کی سحر انگیزیاں میر جملہ کو جادۂ وفاداری سے منحرف کر سکتی تھیں نیک نام خاں کو بھی متاثر کر سکتی تھیں لیکن اس نے اپنی وفا شعاری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اگرچہ نیک نام خاں برسوں سے کرناٹک میں کام کر رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی حکومت اس کی شخصیت اور اس کے بلند کردار سے بہت دنوں تک واقف نہیں ہوی، اس کی غالباً ایک وجہ یہہ تھی کہ میر جملہ کے ہوتے ہوے اس کو ترقی کے مواقع نہیں تھے، میر جملہ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اس گھٹا ٹوپ میں نیک نام کے اوصاف ظاہر نہیں ہو سکتے تھے حکومت اس کے صحیح اوصاف سے اس وقت واقف ہوی جب کہ میر جملہ کی بے وفائی کا غلغلہ بلند ہوا اور نیک نام خاں نے میر جملہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ عجب نہیں کہ سلطنت اس ہمت شکن ماحول میں اس کو ایک قابل قدر شخصیت سمجھنے لگی کیونکہ اس میں ایسے جوہر تھے جو سلطنت کی اندرونی اور بیرونی گتھیاں سلجھانے میں مدد دے سکتے تھے تو مفتوحہ کرناٹک کی سربراہی ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا تھا، یہہ ابھی ابھی فتح ہوا تھا اور اس لئے اس نئے ملک کو قابو میں رکھنا آسان کام نہ تھا اس کے علاوہ فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری تھا، اگرچہ کرناٹک کی تسخیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جب کہ جنگ تالی کوٹ ہوی تھی، جاری تھی عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اکثر فتوحات ہو چکی تھیں کیونکہ بیجاپور کی طرف سے اندولہ خاں اور شاہ جی یہہ کام کر رہے تھے تو گولکنڈہ کی طرف سے میر جملہ اور نیک نام خاں یہہ کام انجام دیتے رہے اور مشرقی کرناٹک کا ایک بڑا حصہ جس کو حیدرآبادی کرناٹک کہنے لگے تھے حاصل کر لیا۔ لیکن یہہ کام ابھی باقی تھا، خاندان وجیا نگر کے پرانے اجزا رائل، نائک اور ودیار کی شکل میں موجود تھے اور موقع دیکھتے تھے اور جب موقع ملتا گولکنڈے کے دشمنوں سے کام لیتے تھے، چنانچہ تنجور کے راجہ سری رنگ رائل نے گولکنڈہ کے خلاف شاہ جہاں سے امداد کی درخواست کی تھی اس کے علاوہ گولکنڈہ کو انگریزوں اور ولندیزیوں سے علحدہ مقابلہ کرنا تھا کیونکہ یہہ فرنگی تاجر ۱۶۰۰ء سے ساحل کارومنڈل پر قدم جما رہے تھے۔ اور مدراس کے انگریزی وثائق سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جملہ کے انحراف کی وجہہ سے جب کہ وہ کرناٹک چھوڑ کر مغلوں کے پاس چلا گیا قدیم راجہ وجیا نگر نے کرناٹک پر حملے شروع کر دئے تھے۔ چنانچہ گرین ہل جو انگریز کمپنی کا صدر تھا کہتا ہے کہ میر جملہ کے جانے کے بعد راجہ وجیا نگر کی فوجیں پلی کٹ اور پونا ملی پر آگئیں[3] ممکن ہے کہ اس میں خود میر جملہ کا ہاتھ ہو کیونکہ وہ یہاں اپنی ایک خود مختار راج دھانی بنانا چاہتا تھا، جب اس کو ناکامی ہوی تو یہاں سے جاتے ہوے کرناٹک کی رعایا میں گولکنڈہ کی کی طرف سے زہر پھیلا دیا۔ ان فوجوں کی فوری مزاحمت بھی ضروری تھی، ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان کام کی سربراہی کے لئے ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو نہ صرف کرناٹک سے واقف ہو اور یہاں کی ہند و طاقت سے آشنا ہو نیز فرنگی اقوام کا پورا جواب دے سکے ایسے موقع کے لئے نیک نام خاں سے بہتر آدمی نہیں ہو سکتا تھا، اس نے یہاں برسوں کام کیا تھا یہاں کے جغرافیہ اور سیاسی طاقتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

---

[1] سفرنامہ برنیر ۱۹۵ [2] حدایق السلاطین ورق ۲۰۲ [3] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ جلد اول ۱۶۶

اس بات کی وضاحت مشکل ہے کہ نیک نام خاں کو کرناٹک کا کب گورنر بنایا گیا' مدراس کے قدیم وثایق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہوا تھا' لیکن یہہ بیان بحث طلب معلوم ہوتا ہے کیونکہ میر جملہ نے ۱۶۵۶ء سے کچھ پہلے گولکنڈہ سے انحراف کیا اور کرناٹک چھوڑا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے جاتے ہی حیدرآبادی کرناٹک کی سرلشکری اور گورنری کا مسئلہ درپیش تھا اور یہہ مسئلہ اس وجہہ سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا کہ کرناٹک کی پرانی ہندو طاقتیں سر اٹھانے لگیں اور مغلوں سے مدد مانگنے لگی تھیں اور اس کا باعث خود میر جملہ معلوم ہوتا ہے نیز سدہوٹ اور گنڈی کوٹ کو میر جملہ اپنی جاگیر سمجھتا تھا حالانکہ یہہ حکومت گولکنڈہ کی طرف سے فتح ہوی تھی اور جب تک حکومت ان مفتوحہ علاقوں کو عطا نہیں کرتی یہہ جاگیر نہیں ہوسکتی تھی لیکن میر جملہ کے اس جھوٹے دعوے کی وجہہ سے مغل حکومت ان علاقوں پر اپنی نظر رکھتی تھی تاکہ گولکنڈہ کا اقتدار زیادہ پھیلنے نہ پائے' ان حالات کے مدنظر عبداللہ قطب شاہ کو ان علاقوں پر فوری قبضہ کرنا چاہئے تھا' چنانچہ حدائق السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ نے میر جملہ کے جاتے ہی حیدرآبادی کرناٹک کو اپنے قبضہ میں لے لیا گو بعض روایات سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سال کے بعد یہہ قبضہ اس وقت ہوا تھا جب کہ اورنگ زیب جنگ برادرانہ میں مصروف ہوگیا۔ قرائن یہ ہیں کہ ۱۶۵۶ء ہی میں نیک نام خاں کو یہاں کا گورنر بنایا گیا ہوگا تاکہ ان علاقوں کی فوری ضبط و تنظیم ہوسکے اور یہہ کام صرف نیک نام خاں ہی کرسکتا تھا کیونکہ یہہ نہ صرف ان علاقوں سے واقف تھا بلکہ اپنے خلوص و وفاداری کا سچا ثبوت دے چکا تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر جملہ کے جاتے ہی عبداللہ قطب شاہ نے اس کو فوراً کرناٹک سے گولکنڈہ طلب کیا تھا اور حدائق السلاطین کے الفاظ نقل کئے جائیں ''تو بہ نوازشات شاہانہ و عنایات بادشاہانہ مفتخر و مستظہر گردانید' پایۂ قدر و منزلت او را بدرجۂ اعلا و ذروہ اعتلا بر افراشتہ واز سائر وزرائے عظام اختیار تمام بخشید'' اسی موقع پر اس کو رضا خاں کا خطاب دیا گیا' نیز پورے اعتماد کے ساتھ کرناٹک کی سرلشکری اور گورنری اس کے سپرد کردی یعنے حدائق السلاطین کے الفاظ ہیں ''سپہ سالاری کل آں مملکت[1] مفوض داشتند''۔ لیکن اس کے ساتھ یہہ بات غور طلب ہے کہ ان علاقوں میں نیک نام خاں کو مطلق اختیار دیے گئے جو کسی سپہ سالار یا صوبہ دار کو نہیں دئے جاتے ''زمام اختیار مہمات عزل و نصب ارباب مناصب و کفالت بہ کف اقتدار او گذاشتہ و بہ خطاب خاں مقرر ساختہ بہ احترام و اکرام خزانہ و سپاہ و احتشام روانہ آں صوب ساختند''۔

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نیک نام خاں پر پورا اعتماد رکھتی تھی اور واقعات بتاتے ہیں کہ اس نے پوری وفاداری کے ساتھ یہہ اعتماد پورا بھی کیا حکومت کے علاوہ عام لوگ بھی نیک نام خاں کی ترقی کو مسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے' ابراہیم نے جو خادم تخلص کرتا تھا اس مسرت خیز واقعہ کی تاریخ ذیل کے مصرع سے نکالی تھی[2]:—

ہمہ جا فتح میسر بادا

کرناٹک میں مامور ہونے کے بعد نیک نام خاں کو بہت کام کرنا تھا ایک طرف ہندو طاقتوں کا مقابلہ کرنا تھا جو میر جملہ کی بغاوت کی وجہہ سے سر اٹھا رہی تھیں دوسری طرف فرنگی قوموں کی چوکھاروں مثلاً قابض ہوگئی تھیں گتھیاں سلجھانا تھا جس زمانے سے یہہ کرناٹک پر مامور ہوا ہے ہندو طاقتوں کا مقابلہ شروع کردیا۔ ٹری ویلور کو جو مدراس کے جنوب میں واقع ہے اپنا مستقر بنالیا تھا اور وہاں سے ان مقامات پر حملے شروع کردئے جہاں کرناٹک کے پچھلے راجگان اپنی فوجوں کی نقل و حرکت کر رہے تھے' چنانچہ مدراس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۵۹ء میں قطب شاہی فوجیں مدراس کے قریب پہنچ گئیں دوسری مشکل یہہ تھی کہ اس زمانے میں ولندیزی پرتگالیوں کے پرانے مقبوضات پر حملہ آور ہو رہے تھے' چنانچہ سنٹ طامس پر جو مدراس سے

---

[1] حدائق السلاطین ورق ۲۰۲ [2] حدائق السلاطین ورق ۲۰۳ [3] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ ۱۹۷ - ۱۹۹

ے میل کے فاصلے پر واقع ہے ولندیزی پیش قدمی کر رہے تھے، جو سلطنت گولکنڈہ کے مفاد کے منافی تھا اور سلطنت یہاں اپنا قبضہ کرنا چاہتی تھی اس لئے ۱۶۶۲ء میں نیک نام خاں نے سنٹ طامس کا محاصرہ کر لیا تاکہ یہ جگہ کسی اور قوم کے ہاتھ میں نہ جائے، چند ہی روز میں اس پر قبضہ ہو گیا[1] اور یہاں کی آبادی سب مدراس میں منتقل ہو گئی، اس وار سے غالباً یہ فائدہ ہوا کہ ولندیزی آگے نہیں بڑھ سکے اور پرتگالیوں کے پرانے مقبوضات پر گولکنڈہ کا قبضہ ہو گیا نیز ہند و طاقتوں کی سرکوبی ہو گئی، اس طریقہ سے میر جملہ کی غداری کی وجہہ سے جو سیاسی تلاطم برپا ہو گیا تھا اس کا سد باب ہو گیا، کیونکہ نیک نام نے کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تھی، ایڈورڈ ونٹر جو اس زمانے میں انگریز کمپنی کا صدر تھا وہ ایک خط مورخہ ۱۰ ار دسمبر ۱۶۶۳ء میں کہتا ہے کہ نیک نام خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مدراس کے قریب پڑا ہوا ہے، لیکن ان ضروری چیزوں کے ساتھ اس نے مزید فتوحات بھی حاصل کر لیں یعنے اگر حدائق السلاطین کے الفاظ پر اعتماد کیا جائے تو "تمام آں مملکت تسخیر نمودہ" یعنے کرناٹک کے زرخیز اقطاع جو ابھی فتح نہیں ہوے تھے مسخر کئے گئے، غالباً گوٹی گرم کنڈہ اور کڑپہ اس نے فتح کئے تھے اور یہہ سدھوٹ اور گنڈی کوٹ کے ساتھ شامل ہو کر جو میر جملہ کے زمانے میں فتح ہوئے تھے ایک مستقل سلطنت ہو گئی تھی اس کو نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئیے۔ اس نے نہ صرف اپنی فوج کشیوں سے کرناٹک کے تلاطم فرو کیے بلکہ بڑی فتوحات حاصل کر لیں

نیک نام خاں کی اس پیش قدمی سے انگریز کمپنی بھی متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک تو اس وجہہ سے کہ یہہ چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ سنٹ طامس پر قابض ہو گیا تھا جو مدراس کے قلعہ سنٹ جارج سے بہت قریب تھا اور دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں انگریز کمپنی کا موافق نہیں تھا۔ یہہ ۱۶۴۲ء کے سمجھوتہ کا جس کو قول کہتے ہیں اور جو میر جملہ نے انگریز کمپنی عطا کیا تھا مخالف تھا، یہہ چاہتا تھا کہ اس قول کو منسوخ کر کے جدید قول کی تکمیل کرے اور انگریزوں سے زیادہ رقم وصول کرے، کیونکہ ۱۶۴۷ء کے قول کے مطابق یہہ طے ہوا تھا کہ انگریز کمپنی کروڑ گری کی آدھی رقم حکومت گولکنڈہ کو دیا کرے، اگر قول کے مطابق اس کی پابجائی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن گرین ہل نے ۱۶۵۸ء میں یہہ شکل اختیار کی تھی کہ بجائے آدھی کروڑ گری ادا کرنے کے صرف ۳۸۰ ہون سالانہ ادا کرتا تھا اور اس کو "شہر کا کرایہ" کہا جاتا تھا یعنے مدراس کی سکونت کے معاوضے میں کمپنی کی طرف سے یہہ رقم ادا کی جاتی تھی۔ لیکن انگریز کمپنی کے بیان کے مطابق جب نیک نام خاں ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے یہہ رقم لینے سے انکار کر دیا، اس نے نہ صرف کروڑ گری کی تمام رقم طلب کی بلکہ یہہ کہا کہ میں مدراس میں ایک حوالدار رکھونگا جو سختی کے ساتھ تمام رسائد کی تقسیم کیا کرے گا انگریز کمپنی اس سے بہت خائف ہو گئی کیونکہ خود ایڈورڈ ونٹر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ سنٹ طامس پر قابض تھا ونٹر نے گفت و شنید کی لیکن نیک نام خاں نے اس کو نہیں مانا، ممکن تھا کہ لڑائی کی صورت پیدا ہوتی لیکن بدقسمتی سے کرناٹک کے نائکوں نے پھر شورش کر دی اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ سنٹ طامس کی تمام فوجیں اس شورش کے سد باب کے لئے متوجہ ہوئیں اور کمپنی کو چند روز کے لئے دم لینے کا موقع مل گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۷۰ء تک نیک نام خاں کو پھر اس طرف توجہہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۶۷۰ء میں ونیٹر کی جگہ فاکس کرافٹ کمپنی کا صدر ہوا تھا، نیک نام خاں نے اس شخص سے اپنے مطالبات مانگے، جب مطالبات پورے نہیں ہوئے تو نیک نام خاں نے جارحانہ کاروائی اختیار کی مدراس کے راستے بند کر دئے اور ٹریلی کین پر قبضہ کر لیا، اس سے اہل مدراس اور کمپنی کو بہت تکلیف ہوی اس سے مجبور ہو کر کمپنی نے ۱۶۷۲ء میں نیک نام خاں کے مطالبات منظور کر لئے تھے کمپنی اس بات کے لئے تیار ہو گئی کہ سالانہ ایک ہزار دو سو ہون کرایہ ادا کرے گی اور پچھلے بقایا میں گیارہ ہزار ہون ادا کئے، نیک نام خاں کا دیا ہوا یہہ قول انگریز کمپنی کے اسناد میں موجود ہے۔

(باقی آئندہ)

عبد المجید صدیقی

---

[1] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ ۱۹۷۔ ۱۹۹

عید تو یہ ہے

قاسم جب گھر پہنچا تو بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مگر ہلکی ہلکی ہوا رجب بھی پڑ رہی تھی۔ اس نے سیڑھیوں پر اپنے جوتوں کی مٹی جھاڑی اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ اپنی پرانی سیکل کو بھی اپنے ساتھ کھینچا۔ "بہت پرانی ہو گئی ہے ایک نئی خریدوں گا" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے اپنے ڈاک کے تھیلے میں جھانک کر دیکھا ایک بھی خط باقی نہ تھا۔ آج کا دن اچھا گزر گیا " اس نے برساتی جھاڑتے ہوئے سوچا۔ دالان میں علی بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی فکروں میں ایسا غرق تھا کہ اسے اپنے باپ کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ قاسم کو علی کی صورت دیکھتے ہی خیال آیا کہ "سردی تو شروع ہو گئی ہے مگر بے چارے کے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔ اور باورچی خانے کی چھت بھی ٹپکتی ہے۔ اسی کی مرمت کروانی ہے۔"

"آج کتنی سردی ہے۔ بارش تو آج سارے دن ہوتی رہی مگر شکر ہے کہ میں نے سارے خط بانٹ دئے" قاسم نے ہنس کر کہا۔ مگر علی نے کچھ جواب نہ دیا۔ قاسم نے کپڑے بدلنے شروع کئے۔ اپنی وردی اتار کر کھونٹی سے لگائی۔ اور ایک پرانا کوٹ جو کہ ایک بیگم صاحبہ نے اسے دیا تھا پہن کر باورچی خانے فارغ کیا۔

علی کی خاموشی اس کو بری لگ رہی تھی۔ وہ سارے دن کے حالات کسی کو سنانا چاہتا تھا۔ اور یہاں سوائے علی کے اور کوئی نہ تھا

"حامد کی بیوی بہت بیمار ہے۔" اس نے ہمت کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ " اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا برا حال ہے۔ بچاروں کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس بیماری میں وہ بہت کمزور ہو گئی ہے لیکن اس کی بیماری کا میں نے تم کو تھوڑا سا حال تو رات کو بھی سنایا تھا۔"

علی نے انگڑائی لے کر اپنے باپ کی طرف غور سے دیکھا۔

"آج صبح جب میں اس کو ڈاک دینے گیا۔ . . . ."

"صبح" علی نے آہستہ سے کہا۔

"صبح" قاسم نے تیوری پر بل ڈال کر اپنی غلطی کو ٹھیک کیا۔ "تو حامد نے کہا وہ تو اچھی ہیں مگر بچوں کو دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے پوچھا کہ میں بھی کچھ مدد کر سکتا ہوں تو کہنے لگا۔ کہیں سے ایک کمبل مل جائے تو بہتر ہے سردی سے تو بچ جائیں گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ کوٹھی والی بیگم صاحبہ جنھوں نے مجھ کو کوٹ دیا تھا ان سے کمبل ہی مانگ لاؤں گا۔"

قاسم نے چولہا سلگایا۔ علی تو پڑھا لکھا عقلمند آدمی تھا۔ وہ اس قسم کے ذلیل کام کیسے کر سکتا تھا۔ " شاما کی چھوٹی بچی شنا تا بہت اچھی ہے وہ روز میرا انتظار کرتی رہتی ہے۔ آج شاما نے اس کو نئی گڑیا لا کر دی تھی۔ اس نے مجھے بھی بتائی۔ بہت خوش تھی میں نے بھی تعریف کر دی۔ بڑی اچھی۔ . . . ."

"یا اللہ" کہہ کر علی نے اپنی کتاب فرش پر پھینکی۔

"آج تم بہت گھبرائے ہوئے ہو!" قاسم حیرت سے اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں" علی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "اصل یہ ہے کہ حامد کی بیمار بیوی۔ شاما کی خوبصورت بچی، راستے کی خرابی اور بارش کی زیادتی کی

کھیلتے ہوئے کہا ۔ معلوم نہیں میں نے کیا کیا کہہ ڈالا ۔ لیکن میں بھول گیا کہ آپ کو مجھے پڑھانے میں کتنا روپیہ صرف کرنا پڑا ہوگا ۔ اور کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہوں گی مگر میں سوچتا ہوں کہ جب بی۔ اے پاس کرلیا ہے تو کوئی اچھا کام کیوں نہ ڈھونڈوں ۔"

قاسم سوچنے لگا کہ یہ لڑکا بھی کیسی باتیں کرتا ہے ۔ اسے علی کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی اس کو تعلیم دلانا بھی وہ اپنی زندگی کا ایک فرض سمجھتا تھا ۔ اس کو خیال تک نہ آتا تھا کہ علی پر بیکار روپیہ صرف ہورہا ہے آج قاسم بہت غمگین تھا اس کو علی کی باتیں کچھ پسند نہ آئیں ۔ وہ چپ چاپ جاکر بستر پر لیٹ گیا ۔

صبح جب وہ اٹھا تو اسے ذرا تکان محسوس ہوئی ۔ رات کو وہ اچھی طرح نہ سوسکا ۔ ساری رات الٹے سیدھے خیالات اس کو ستاتے رہے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا چھ بج چکے تھے ۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا ۔ اور نو بجے تک کھانا پکا کر سائیکل پر باندھ کر ڈاک خانے کی طرف چل کھڑا ہوا جب وہ وہاں پہنچا تو بہت کم لوگ آئے ہوئے تھے ۔ مگر وہ ہمیشہ وقت پر کام کرنے کا عادی تھا ۔

اس کے دوست ہاشم نے کہا کہ اسے دو مہینے کے بعد پنشن ہوجانے والی ہے ۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اپنی سائیکل بیچ دے ۔ "چھ مہینے ہوئے کہ میں نے خریدی تھی ۔ ابھی تو بالکل نئی ہے ۔" ہاشم نے کہا "لیکن میرا کوئی دوست خریدے گا تو آدھی قیمت پر بیچ دوں گا ۔"

"اچھا تو میں لے لوں گا ۔" قاسم نے ہاشم سے کہا ۔

پھر سب لوگ دن بھر گشت کے لئے اپنے تھیلے خطوں اور رسالوں سے بھرنے لگے عید میں صرف ایک دن باقی تھا ۔ عید کارڈوں کی بھرمار تھی ۔

"آج تو خوب لمبا چکر ہے" اس نے ہاشم سے اپنا تھیلا بھرتے ہوئے کہا ۔ اس کے بعد سارے ڈاک خانے میں خاموشی چھاگئی ۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہوگئے ۔ "آدھی قیمت پر سائیکل مل جائے گی کتنی اچھی بات ہے ۔" قاسم سوچنے لگا ۔ پہلے حامد کے گھر آیا ۔ قاسم نے خیریت پوچھی ۔

"آج" ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے ۔ اگر ..... اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا ڈاکٹر کو بلا لائیے ۔"

ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کم از کم دو میل کا سفر کرنا پڑتا تھا ۔ مگر اس نے اپنے دوست کی خاطر یہ سفر خوشی سے اختیار کرلیا ۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے کہہ دیا ۔ "کوئی فکر کی بات نہیں ۔ کل سے آج حالت اچھی ہے ۔ تھوڑے دنوں میں اچھی ہوجائیں گی ۔"

"خدا کا شکر ہے کہ ان کے اچھے ہونے کی امید تو ہوئی" حامد نے ڈاکٹر کے جانے کے بعد کہا ۔

"ہاں بھائی مجھے تو بہت فکر ہوگئی تھی ۔" قاسم نے اپنی برساتی پہنتے ہوئے کہا ۔

"قاسم بھائی اب کے ہماری عید بھی عجیب موقعے پر آئی ۔" حامد نے اپنی چھوٹی لڑکی خالدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

"اس کی ضد ہے کہ عید میں نئے کپڑے لوں گی ۔ ان کی بیماری میں اتنا خرچ ہوگیا ہے کہ اس چھوٹی سی بچی کے لئے کپڑے بھی نہیں بنا سکتا ۔"

"ہاں بھائی بیماری بہت بری بلا ہے" قاسم نے سرد آہ بھر کر کہا ۔

"بعض لوگوں پر بھی کس طرح مصیبت آتی ہے ۔ بچارا حامد اپنی بیوی کی بیماری میں بالکل مفلس ہوگیا ۔ خالدہ کے لئے کپڑے بھی نہیں بنا سکتا" قاسم سوچنے لگا ۔ اس نے چند خط مختلف گھروں پر دئے ۔ "بچاری خالدہ" وہ سوچنے لگا "اس کی عید کتنی سونی رہے گی ۔"

اس نے اپنی سائیکل ایک سڑک کی طرف پھیری ۔ اس سڑک پر دوسری سڑکوں سے زیادہ کیچڑ تھا ۔ وہ ایک گھر کے دروازے پر ٹھیرا ۔ "خط لے جاؤ" کا نعرہ لگایا ۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے گرد آکر جمع ہوگئے ۔ "مجھے دو مجھے دو" سب چیخ رہے تھے ۔ قاسم سب سے بڑے کو خط دے کر مسکراتا ہوا آگے چل کھڑا ہوا ۔

اس وقت بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر رات کی بارش کا کیچڑ اب تک سڑکوں پر باقی تھا ۔ سمنٹ کی سڑک پر سے گزر کر شاما کے گھر کی

بھی سڑک پر اس نے اپنی سائیکل پھیری۔ یا اللہ رحم کیجیو! یہ سڑکیں تو میری بوڑھی سائیکل کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گی۔ قاسم نے آہستہ سے کہا۔ دور سے شاما کا گھر نظر آنے لگا۔ کھڑکی میں شاما بیٹھی ایک کتاب میں تصویریں دیکھ رہی تھی۔ "دیکھو شاما میں تمہارے لئے ایک اور کتاب لایا ہوں" قاسم نے دور سے ایک تصویروں کی فہرست اسے دکھائی۔ وہ دوڑی ہوئی دروازے پر آئی "لائیے جلدی سے دیجئے" قاسم سے وہ تصویروں کی فہرست چھین کر وہ اندر بھاگ گئی۔ اور مختلف اخباروں میں سے کٹی ہوئی بہت سی تصویریں اس کو لاکر دکھائیں۔ ماں سب کو دیکھنے کے بعد وہ پھر اپنے کام پر چل کھڑا ہوا۔ آگے بڑھا تو دیکھا بڑھیا ماما زینت بی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ قاسم کو دیکھ کر وہ آگے بڑھی "بیٹا میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔ یہ پانچ روپے میری بیٹی کو بھیج دئے میں نے بڑی مشکل سے اس کے لئے جمع کئے ہیں۔ آج ہی بھیج دے۔" "اچھا اماں" قاسم نے کہا۔ اور روپے جیب میں رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "اس بچاری کو یہ بھی معلوم نہیں کہ روپے بھیجنے میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ خیر ایک غریب کا بھلا ہوگا۔"

آخر ہوتے ہوتے وہ بیگم صاحبہ کے بنگلے پر پہنچا۔ اتفاق سے وہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ ایسے موقعے پر وہ ضرور قاسم کی خیریت پوچھ لیتی تھیں۔ آج انھوں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ علی کو نوکری ملی یا نہیں؟ قاسم نے غمگین صورت بنا کر کہا "ابھی نہیں ملی۔ وہ میری طرح جاہل نہیں ہے، بیگم صاحب۔ بی۔ اے پاس کر چکا ہے۔ کوئی بڑا کام چاہتا ہے۔"

"شاید دفتر کا کام چاہتا ہے؟"

"جی ہاں" قاسم نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا میں صاحب سے ذکر کروں گی۔ شاید کوئی جگہ خالی ہو صرف تمہاری خاطر میں ضرور کوشش کروں گی۔"

قاسم نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ اس کو کس طرح علی کے کپڑوں اور دوسری ضرورتوں پر روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے گھر کے خرچ بھی پورے نہیں ہوتے۔

عید کے دن شام کو جب وہ گھر پہنچا تو علی دالان میں بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ بہت خوش معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ قاسم بھی آکر اس کے پاس بیٹھا۔ علی نے کہا "بیگم صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ صاحب سے مجھے ملایا۔ انھوں نے آپ کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ ایسے نیک باپ کا بیٹا بھی نیک ہونا چاہیے۔ صاحب نے کہا کہ بس یہ سفارش کافی ہے کل سے دفتر میں آکر کام کرو۔ انھوں نے مجھے نوکری دلا دی۔۔۔ اس لئے کہ وہ آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

قاسم خوشی سے پاگل ہو گیا۔ "دیکھا ہماری بیگم صاحب کو اللہ انھیں خوش رکھے اگر وہ یہاں سے چلی جائیں تو بہت سے غریب بھوکے مر جائیں۔ دیکھو آخر انھوں نے ہی تمہارا بھی خیال رکھا۔" قاسم نے آدھی قیمت پر ہاشم سے نئی سائیکل خریدنے کی خوشخبری علی کو سنائی۔ "اب تم نوکر ہو گئے ہو تو ہم اس مہینے باورچی خانے کی چھت کی مرمت بھی کرالیں گے۔" قاسم نے کھانا پکانے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد قاسم نے شروانی پہنی اور وہ کوٹھری میں سے سائیکل نکالی۔ "اب کدھر چلے ابا" علی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"علی تم کو یہ تو معلوم ہی ہے میں بڈھا دیہاتی آدمی ہوں۔ تمہاری طرح عقلمند پڑھا لکھا تو ہوں نہیں کام بھی ذلیل لوگوں کے سے کرتا ہوں" قاسم نے اپنے ڈاک کے تھیلوں میں سے چار پانچ ڈبے نکال کر علی کو دکھائے۔ "خالدہ کے لئے کچھ کپڑے اور حامد کے دوسرے بچوں کے لئے کھلونے اور مٹھائی لے جا رہا ہوں۔ عید کے دن بچوں والے گھر میں خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

قبل اس کے کہ علی کچھ کہے۔ قاسم جا چکا تھا۔ جب قاسم حامد کے پاس پہنچا تو سب بچے کھیل رہے تھے اس کو دیکھتے ہی وہ اس کے گرد آکر جمع ہو گئے۔ قاسم نے ان سب کو چیزیں بانٹ دیں۔ خالدہ کپڑوں کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اپنی ماں کو دکھانے کے لئے اندر بھاگ گئی بچوں کے شور وغل میں آٹھ بج گئے۔ خالدہ اپنی ماں سے ضد کر رہی تھی کہ جلدی سے اس کو کپڑے سلا کر یہ سی دے۔ اس کے چلانے کی آواز باہر صاف آ رہی تھی ——— گھر واپس آتے ہوئے قاسم سوچنے لگا "عید تو یہ ہے"

مصنفہ بنت جمیل الرحمٰن

اندھیری رات

اندھیرا چھا گیا تھا خاک کی رنگیں فضاؤں پر — نقاب شب پڑی تھی دہر کی شیریں اداؤں پر
گل و غنچہ، بیابان و چمن، کہسار اور وادی — حریم ناز، گورستان، ویرانہ اور آبادی
شب تاریک کی آغوش میں بے ہوش ہوتے تھے — ترانے زندگی کے ہر طرف خاموش ہوتے تھے
سیاہی کے بلند ایوان میں سنسان خاموشی — اندھیرے کے کھلے میدان میں انجان خاموشی
سیاہی کی چمک بالیں پہ شمع نور کے بدلے — ہوائے وادیٔ ایمن، چراغ طور کے بدلے
کھلی جب آنکھ، دیکھا اک اندھیرا بزم ہستی پر — امنڈ آئی تھی اک کالی گھٹا آنکھوں کی بستی پر
نظر تو آشنا تھی، اٹھ چلی افلاک کی جانب — ستاروں کی طرف، ایوان آتشناک کی جانب
نظر کے ساتھ میری روح بھی پرواز میں آئی — چلی اڑتی ہوئی، انجم کی بزم ناز میں آئی
جہاں آنکھوں کے آگے برق پارے جھلملاتے تھے — جہاں اک رفعت عالی میں تارے جھلملاتے تھے
شبستانِ فلک میں نور کے لاکھوں جہاں پیدا — چمکتی بجلیوں میں سرخ اور نیلے مکاں پیدا
سہانی چاندنی، زریں وادی، نور کے دریا — بہے جاتے تھے گویا سامنے کافور کے دریا
اندھیری رات میں میری نگہ نے یہ سماں دیکھا — سیاہی زمیں پر جلوہ زار آسماں دیکھا
کہا بیتاب ہو کر میری روح جاودانی سے — کہ حاصل روشنی کر اس فضائے آسمانی سے

شعاع چرخ رنگیں سے بڑھا تابندگی اپنی
جہاں کے نور و ظلمت میں نہ الجھا زندگی اپنی

محمد عبدالقیوم خان باقی ایم اے (ریسرچ اسکالر)

انتقام

چوتھا منظر

علیہ اپنے کمرہ میں ایک میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے اور اپنا سر ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے۔ کبھی باتیں کرتے کرتے میز کے پاس سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی پھر کسی کونے میں کرسی پر جا بیٹھتی ہے۔

"یہ تو معلوم تھا" مگر میری محبت نے زندگی کے ٹھوس حقایق سے انکار کیا۔ شاید محبت ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔ میں تو جانتی تھی کہ ناصر کی طلب محض خواہش ہے۔ وہ میری محبت کا جواب نہیں ہے۔ پھر کیوں میں نے اس سے اقرار الفت کر لیا۔ کیوں میں نے اپنے دل کی کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دی! کیا میں جانتی نہ تھی کہ اس کی جنس فریبی ہے دغا باز ہے! یہ بھی نہ جانا میں نے تو کیا جانا! ہرن کو خدا نے مضبوط اور تیز رفتار ٹانگیں اسی لئے تو دی ہیں کہ وہ شیر سے اپنی جان بچا سکے، پھر وہ ہرن کم بخت اگر خود ہی اپنی ٹانگ توڑ کر شیر کے ساتھ بیٹھ جائے تو قصور کس کا! تین مہینے تک۔ تین مہینے تک اس بہانہ باز نے زندگی کی کس قدر دلفریب تصویریں میرے سامنے رکھیں، مگر وہ نقش کچے تھے اور وہ رنگ اڑنے لگا۔ میں بیوقوفوں کے باغ عدن میں بے خبر پڑی رہی۔ میری بازی ہو گئی! اب وہ مجھے سمجھا رہا ہے کہ اماں اور چچا کے حکم سے سرتابی کر کے وہ مجھے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا، اور کہتا ہے کہ میرے ساتھ نکل چل گویا عزت میرے لئے نہیں ہے۔ عیش مجھے دینا چاہتا ہے! بغیر آبرو کے عیش! مرد کا بہیمانہ تصور! وہ بیچارا اپنی اماں سے ڈرتا ہے چچا جان سے ڈرتا ہے۔ وہ ابھی ننھا بچہ ہے! لیکن مجھے اپنے آغوش میں لینے کے لئے پورا مرد ہے! میری آبرو کو اپنے خاندان کی اشتہاری عزت کے مقابلے میں تولتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ اپنی خاندانی عزت کے پلہ میں مکر و فریب کا وزن رکھ کر اس کو میرے پلہ سے بھاری بنا دے گا۔

بے ایمان! بے ایمان!

غصہ کی حالت میں اپنے ہاتھوں کے دونوں مٹھیاں باندھ لیتی ہے!

مجھے لکھتا ہے: "میں مجبور ہوں۔ چچا صاحب زہر کھا لینے کی دھمکی دے رہے ہیں! ۶۵ برس اس دنیا میں دنیا کی تمام گندگیوں کے ساتھ زندگی گذار لینے کے بعد ہی چچا صاحب کی موت کا امکان اس قدر ہولناک ہے! مگر ۲۰ برس کی ناکردہ گناہ لڑکی کا حشر کچھ بھی ہو مگر اس عالی خاندان مرد کے ضمیر میں ایک چٹکی نہیں لے سکتا! پھر کہتا ہے مجھے معاف کرو میرے قصور سے درگذرو! فریبی کہیں کا!

تیز تیز ٹہلنے لگتی ہے، پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے، پھر دفعتاً اپنی ساڑی کے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ساڑی کے پلو کو غور سے دیکھتی ہے:

آنسو! ایک کوے کے لئے جو صبح میرے گھر کی دیوار پر فائیں فائیں کر رہا تھا! اور اب کسی گھوڑے پر بیٹھا غلاظت کھا رہا ہوگا! - آنسو! ایک کتے کے لئے جو شام میرے سامنے دم ہلا رہا تھا اور اب کسی کوچہ میں پڑا ہوا مکھیاں مار رہا ہوگا! آنسو! معصوم کے آنسو! موتیوں سے گراں تر۔ ایسے کے لئے جو اُن کی قیمت نہ جانتا ہو! سوروں کے سامنے میرے موتی ہرگز نہ بکھیرے جائیں گے!!

تن کر سیدھی ہو جاتی ہے، ساڑی کو سنبھال لیتی ہے، اور بہت تمکنت کے ساتھ میز کے سامنے جا بیٹھتی ہے:

"جس کا کیسہ زر خالص سے پُر ہو وہ کھوٹے پیسے کے ضایع ہونے کا غم کیوں کرے: میں عورت ہوں اور عورت کا سرمایہ میری گرہ میں ہے! ایسے کتنے ہی کھوٹے سکے میرے سامنے خاک پر گریں گے اور میں ان کو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گی! محبت میں نے کی اور محبت ایک ہی دفعہ کی جا سکتی ہے! دھوکہ میں نے کھایا اور دھوکہ ایک ہی دفعہ کھایا جا سکتا ہے۔ وہ منزل طے ہو گئی۔ وہ دروازہ بند ہو گیا! زخم اگر مندمل نہ بھی ہو تو بلا سے، رستا رہے! مگر میرے

غرور نفس کی بھاری چادر اس کو ڈھانکے رہے گی ۔ وہ کھل نہیں سکتا! غیروں
کی نظر کے سامنے عریاں نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ عورت کا وقار ہے!!
——یہی لکھدوں اس کو ؟ یا کچھ نہ لکھوں! ——
سوچتی ہے اور پھر کھڑی ہوجاتی ہے ۔
"میر صاحب اماں سے ڈاکٹر رضا کا ذکر کر رہے تھے، شاید پیام ہی آئے
تھے، ——کیوں نہ میں اس کو قبول کرلوں ۔ گویا میرے کان میں کوئی کہہ رہا ہے
——عطیہ! تیرے لئے محبت کے دروازے بند ہوگئے، مگر زندگی کے باقی
سب دروازے کھلے ہوئے ہیں! ——اور انتقام کا دروازہ بھی! ——
دوشیزگی کی پابندیوں سے آزاد ہوجا، اور پھر جب تک تیرا حسن اور اس کی
کشش باقی ہے اپنا انتقام لے! جلا جلا کر اور رلا رلا کر ان موذیوں کو!
یکایک لطیفہ آواز دیتی ہے اور عطیہ چونک پڑتی ہے ۔
لطیفہ: عطیہ کیا کر رہی ہو تنہا، میر صاحب جو تشریف لائے ہیں ۔
عطیہ ۔ تشریف لائیے اماں! تشریف لائیے دادا ۔
لطیفہ اور میر صاحب داخل ہوتے ہیں ۔
میر صاحب: میں دیکھتا ہوں عطیہ! کہ آج کل تم اکثر اپنے کمرے میں
بند رہتی ہو اور ٹینس و شطرنج بھی کئی دن سے بند ہے ۔
عطیہ: جی ہاں دادا! میں آج کل شطرنج کی چالوں پر عالمانہ غور و فکر
کر رہی ہوں کچھ نئی چالیں، کچھ نئے نقشے ڈھونڈھ رہی ہوں!
میر صاحب: اللہ رے ذوق! آج کل کی لڑکیاں بھی ایک طرفہ معمہ
ہیں! شطرنج بھی عالمانہ غور و فکر کی زد میں آگئی! جس شخص نے محض تفریح کے لئے
یہ کھیل ایجاد کیا ہوگا اسے کیا خبر ہوگی کہ کسی زمانہ میں اس کھیل پر بھی متمدن دنیا
کی کھوپڑیاں غور و فکر کے حملے کیا کریں گی ۔ شطرنج نہ ہوئی علم الافلاک ہوگیا!!
——خیر بیٹھو ہم بھی آج کل کسی فکر میں مبتلا ہیں ۔ تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں
(لطیفہ کی طرف دیکھ کر) بات یہ ہے کہ —— یعنی بات یہ ہے کہ —— کہ دراصل
معاملہ یہ ہے کہ —— تمہاری شادی کا سوال درپیش ہے ۔ عطیہ! ڈاکٹر رضا
کو تو تم جانتی ہو! یہ بھی جانتی ہو کہ وہ ہمارے شہر کے ایک نیک نام اور کامیاب
ڈاکٹر ہیں، وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کو (لطیفہ کی طرف دیکھ کر)
تردد یہ ہے کہ ان کی عمر ذرا زیادہ ہے، پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا ہے اور ایک
نوجوان لڑکی بھی موجود ہے (ذرا رک کر) اب تمہاری والدہ تو کہتی ہیں کہ عمر کا
تفاوت قابل اعتراض ہے اور میں —— میں کہتا ہوں کہ اول تو تفاوت
ایسا کیا زیادہ ہے —— ڈاکٹر صاحب کی عمر ۳۹ سال ہے —— دوسرے
تمہارے لئے اس قدر خوشحال اور نیک سیرت شوہر ہر طرح مناسب ہے ۔
پھر بڑی بات یہ کہ ہم لوگوں کی طرح وہ بھی نہایت آزاد خیال ہیں ۔ اب
بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے ۔
عطیہ: دادا! میں نے آپ کو ہمیشہ باپ کی برابر سمجھا ۔ اب جو آپ کی رائے ہو
میر صاحب: مگر تمہارے دل کا رجحان!
عطیہ: دل کے رجحان کا کیا ذکر، وہ تو نہ ادھر ہے نہ ادھر——
لطیفہ: مگر بیٹی! بغیر طبیعت کے رجحان کے ازدواجی زندگی ایک ساز ہوگا
بغیر نغمہ کے، ——ایک تار ہوگا ٹوٹا ہوا! تمہارے والد مرحوم سے میری شادی
صرف ذاتی رجحانات کا نتیجہ تھی، ان کو بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں، آج تک
ہم اس رشتہ کے نتائج کو بھگت رہے ہیں ۔ خاندان نے اور سماج نے تمہارے
والد کو اور مجھے اس طرح ستایا جس طرح فرعون اپنے غلاموں کی ننگی پیٹھ پر چابک
لگواتا تھا! مگر باوجود اس ابتلا کے ہم اور وہ دنیا سے بے تعلق رہ کر بھی اپنی
محبت کے دامن میں آسودہ رہے! ——
عطیہ: جی ہاں! میں بھی! جب مجھے اس رشتہ میں کوئی عذر نہیں تو زیادہ
تردد کیوں! اب خدا کا نام لیکر پیام منظور کیجئے ۔
میر صاحب: مبارک، مبارک! خدا راست لائے! عطیہ بیٹی! تیرا فیصلہ
دانشمندانہ ہے ۔ اپنے حال کو تو ہی بہتر سمجھ سکتی ہے ۔ جھوٹے اور کاذب ہیں
وہ مرد جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ عورت کی بھلائی کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں ——
جھوٹے ہیں وہ سب ——
عطیہ: وہ جو چاہیں سمجھیں، اور جس طرح چاہیں اپنے کو آسمان پر بٹھائیں مگر
جب تک اس جنس میں آپ جیسے لوگ موجود ہیں، دادا، دنیا تباہ نہ ہوگی!
میر صاحب: اچھا تو میں جاتا ہوں اور تاریخ مقرر کرنے کے لئے کہتا ہوں!

لطیفہ: آداب! دادا۔

(ایک سال کے بعد علیہ کی شادی ڈاکٹر رضا سے ہو چکی ہے نئی زندگی میں علیہ خوش ہے، ڈاکٹر رضا کی لڑکی ریحانہ بہت ہی نیک اور سعادتمند لڑکی ہے، علیہ سے اس کے تعلقات بے تکلف بہنوں کے سے ہیں، ناصر بھی اکثر شام کو یہاں آکر ٹینس کھیلا کرتا، ڈاکٹر رضا علیہ اور نجمہ بیٹھے ہوئے چاء پی رہے ہیں، نازو علیہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہے)

ریحانہ: تو باوا جان کسی دن پھر پردہ کے مسئلہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھائیے، آخر مولویوں کے بیان کی حقیقت کیا ہے۔

(کسی شخص کے آنے کی آہٹ ہوتی، نازو دوڑ کر گئی اور واپس آئی)

نازو: ناصر میاں آئے ہیں سرکار!

ڈاکٹر: بلائیے ان کو، یہیں بلائیے۔

(ناصر آتا ہے، ادب سے سلام کرتا ہے)

ڈاکٹر: آؤ بھئی ناصر! اب تم لوگوں کے ٹینس کھیلنے کا وقت ہو گیا، ایک پیالی چاء پی لو تو جاؤ۔ میں اپنے مریضوں کو دیکھوں۔

(ڈاکٹر باہر جاتے ہیں)

علیہ: تم چلو، میں آتی ہوں، ذرا باورچی خانہ میں جھانکتی آؤں۔

(علیہ جاتی ہے، ناصر اور ریحانہ کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر دیکھتے ہیں)

ناصر: یہ لو یہ تو بارش شروع ہو گئی، گیا ہمارا ٹینس، لاحول ولا...

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

ناصر: آپ کچھ خاموش سی ہیں۔

ریحانہ: جی نہیں ناصر بھائی، آج کالج میں ذرا کام زیادہ تھا، تھک گئی ہوں۔

ناصر: یہ آپ مجھے ناصر بھائی کیوں کہتی ہیں، میرا آپ کا کوئی رشتہ تو ہے نہیں۔

ریحانہ: دلہن آپا آپ کو بھائی کہتی ہیں، میں نے بھی کہنا شروع کر دیا۔

ناصر: نہ کہا کیجئے۔

ریحانہ: کیوں؟

ناصر: نہ کہا کیجئے۔

ریحانہ: آخر کیوں؟

ناصر: بس نہ کہا کیجئے۔ اس لفظ میں اور اس کے مفہوم میں وہ ترنم نہیں جس کو میری روح ڈھونڈتی ہے!

ریحانہ: جس لفظ میں ترنم ہو وہی بتا دیجئے۔

ناصر: وہ لفظ! — کیا آپ کو ایسا کوئی لفظ معلوم نہیں۔

ریحانہ (کچھ شرما کر خاموش رہ جاتی ہے)

ناصر: خاموش کیوں ہو گئیں آپ۔

ریحانہ: یہ سوچ رہی تھی کہ ترنم لفظوں میں کہاں ہوتا ہے، الفاظ کے اندر تو ترنم نہیں ہوتا، البتہ ترنم کے اندر سے الفاظ ضرور پیدا ہو کرتے ہیں! جب روح کے اندر ترنم ہوتا ہے تو زبان بہ سکے ڈھالتی ہے!

ناصر: کیا خوب کہا آپ نے! میری زبان اگر کوئی ایسا سکہ ڈھالے تو آپ کو ناگوار تو نہ ہوگا!

ریحانہ: ناگوار کیوں ہوتا، ترنم آپ کا، سکہ آپ کا، میں کون کہ مجھے ناگوار ہو!

ناصر: آپ کون! ترنم تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

ریحانہ: (چونک کر) میرا پیدا کیا ہوا۔ میرا ——

ناصر: جی ہاں! آپ کا۔

ریحانہ: کیوں کر؟

ناصر: اس طرح جس طرح ہوا صنوبر کے پتوں میں ترنم پیدا کرتی، اس طرح جس طرح آبشار سے بجلی پیدا ہوتی ہے، اس طرح ——

ریحانہ: آپ کچھ شاعر بھی ہیں ناصر بھا.... ناصر صاحب!

ناصر: شعر میں لکھتا نہیں، مگر شعریت حاصل کرتا ہوں —— ایسی رنگین تیتریوں سے جیسی کہ اس وقت میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہے!

ریحانہ: (بہت سنجیدہ صورت بنا کر) نہیں ناصر صاحب! میں آپ کے ان اشاروں کی حریف نہیں ہو سکتی!

ناصر: محبت کے اشارے کیا ایسے مشکل ہیں یا اس قدر نامرغوب؟

ریحانہ: مشکل بھی اور نامرغوب بھی! کچھ اور باتیں کیجئے! ریحانہ

ناصر: اوہ وہ دو حرف جو میں کہنا چاہتا ہوں کتنی دفعہ ہی کہنا چاہا اور کہہ

(ڈاکٹر رضا اور عطیہ داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر رضا: آج تو بھئی بارش نے ٹینس کھیلنے کی بالکل ہی ممانعت کر دی، کیا مصیبت ہے اگر دن بھر مطلب کی محنت کے بعد شام کو کھلی ہوا میں بھی نہ ٹہل سکیں۔

(ناصر کچھ حرکت کرتا ہے، گویا جانے کا ارادہ ہے)

عطیہ: بیٹھو ناصر! اب کھانا کھا کر جائیو۔ کہو اب تمہارے امتحان کا نتیجہ کب آئے گا؟

ناصر: ابھی تو دو مہینے انتظار کرنا ہوگا، ہماری یونیورسٹی کے نتیجے بہت دیر سے نکلتے ہیں۔

عطیہ: دیر آید درست آید۔ جو نتیجہ قطعی و مختتم ہوتا ہے وہ ہمیشہ دیر ہی میں نکلا کرتا ہے۔ نتیجہ تو وہی فیصلہ کن ہوتا ہے جو انتظار کرائے۔ چکی جس قدر آہستہ چلتی ہے اسی قدر زیادہ باریک پیستی ہے!

ناصر: بہن عطیہ کے فلسفیانہ اشارے بھی بہت پرلطف ہوتے ہیں۔

عطیہ: پرلطف! — ایک حد تک! اس حد کے بعد میرا فلسفہ خوفناک طریقہ پر سنجیدہ ہو جاتا ہے!

ڈاکٹر رضا: اچھا تو اب چھوڑیئے اس فلسفہ کو! ورنہ میں بھی اپنے مریضوں کا حال سنانے لگوں گا!

(ریحانہ اٹھ کر چلی جاتی ہے اور عطیہ بھی اٹھتی ہے)

عطیہ: جانے دیجئے! میری تو یہ ہے! کہیں اس دل لگی میں زندگی کا اصلی فلسفہ نہ بھول جاؤں! ذرا جا کر باورچی خانہ کی تو خبر لوں! (مسکرا کر) شدید ترین اور سنجیدہ ترین فلسفہ اگر ہے تو وہ باورچی خانہ کا فلسفہ ہے!!

(عطیہ جاتی ہے)

ڈاکٹر: کہو بیٹے ناصر! آج کل تمہارے کالج کی انجمن محافظ حقوق نسواں کا کیا حال ہے؟

ناصر: جی اب تو امتحان کے بعد یونیورسٹی کے سب ہی شعبے بند ہو گئے!

ڈاکٹر: ارے میاں! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس انجمن بازی اور انجمن سازی کا نتیجہ کیا ہے! ہم لوگوں نے اپنی زندگی کو نقالی اور تصنعات سے اس قدر بھر لیا ہے کہ ہمارا تصور چند مصطلحات کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ انجمن محافظ حقوق! سبحان اللہ! گویا حقوق کی حفاظت بھی کسی سرحد کا معاملہ ہے! کہ جب تک ایک دستہ فوج کا یا ایک توپ خانہ سرحد پر مقرر نہ کر دو دشمن کے حملہ کی کوئی روک ہی نہیں! اور عورتوں کے حقوق کے ایسے ہی محافظ ہو تو پہلے اپنے گھر میں کچھ کر کے دکھاؤ۔ اس سے کیا فائدہ کہ انجمن کے ہر ممبر کا گھر تو بدستور عورتوں کے لئے جیل خانہ بنا رہے اور گھر کے باہر ممبر صاحب حقوق نسواں کے نقارے بجاتے پھریں۔

ناصر: تو جناب بغیر اجتماعی کوششوں کے اصلاح ——

ڈاکٹر: اجتماعی کوششیں اور اصلاح! انفرادی کوششوں کا پتہ نہیں اور اجتماعی کوششوں کا ارادہ ہے! ارے میاں! تم تعلیم یافتہ ہو، نوجوان ہو، ولایت جا کر اور زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جاؤ گے۔ یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں، اپنے رشتہ داروں میں بھی اصلاح کی کوئی صورت نکالی؟

تو دروں در چہ کردی کہ بروں خانہ آئی؟

ناصر: مگر ہمارے خاندان کے لوگ تو اس قدر قدامت پسند ——

ڈاکٹر: اجی وہ کتنے ہی قدامت پسند ہوں، مگر یہ تو بتائیے کہ آپ نے ان کی قدامت پرستی کے خلاف کیا جہاد فرمایا؟ — سوائے انجمن محافظ حقوق نسواں کے جلسوں میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے اور تالیاں بجا کر رزولیوشن پاس کر دینے کے!

ناصر: جی یہ تو بجا ہے، مگر ——

ڈاکٹر: جب یہ بجا ہے تو پھر آپ کے نقارہ میں سوائے آواز کے رہا کیا؟ اگر مگر کیسی؟

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

عطیہ: کوئی بڑے زور کی بحث ہو رہی ہے یہاں؟

ڈاکٹر: بحث وحث کچھ بھی نہیں، ذرا میاں ناصر کی مزاج پرسی کر رہا ہوں! یہ بڑے محافظ حقوق نسواں بنے پھرتے ہیں! کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں تو قدامت پرستوں کی وجہ سے کچھ نہ کر سکا مگر باہر تمام جہان کی عورتوں کو آزاد کرا دینے کا ارادہ ہے!

عطیہ: شیر نے بکری سے کہا تھا آ! میں تجھے غرانا سکھا دوں! بکری نے کہا بخشئے چچا! مجھے ممیانا ہی زیادہ پسند ہے! ذرا دور ہی رہیئے!!

ڈاکٹر: اجی ہاں! یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ سب دھوکہ بازی ہے!

عطیہ: اور میں کہتی ہوں پہلے تو یہ حضرت اپنا حال درست کریں، اپنے دامن کے دھبے دھوئیں! اس کے بعد ہم غریبوں پر کرم فرمانے کا ارادہ کریں! اگر یہی سب ہمارے حقوق کے محافظ ہیں تو ہم باز آئے ایسے حقوق سے! بخشو بی بلی! چوہا لنڈورا ہی جیئے گا!

ناصر: تو اب تو آپ دونوں مل کر میرا خاتمہ ہی کر دیں گے!

ڈاکٹر: بھاگ نکلیے! بھاگ نکلیے میاں ناصر! انجمن محافظ حقوق نسواں زندہ باد!!

(نازو داخل ہوتی ہے)

نازو: سرکار! خاصہ حاضر ہے اور ریحانہ بی فرماتی ہیں کہ ان کے سر میں درد ہے اس وقت خاصہ تناول نہ فرمائیں گی۔

عطیہ: سر میں درد ہے! ذرا میں اس کو دیکھ تو لوں۔

(عطیہ جاتی ہے، ڈاکٹر اور ناصر اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ گویا عطیہ کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں)

ناصر: مجھے ایک ضروری بات ..... بلکہ بہت اہم بات — یعنی اپنی زندگی کے متعلق ایک امر — میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت — میرا مطلب یہ ہے کہ —

ڈاکٹر: میاں ناصر، عطیہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں بوکھلا دیا!

ناصر: جی نہیں! مگر — لیکن — یعنی وہ ایک اور بات کہنی ہے!

ڈاکٹر: تو کہو نا! بات کیا ہے آخر! تم تو اگر اور لیکن اور یعنی میں پھنس کر رہ گئے

ناصر: جی، مجھے یہ عرض کرنا ہے — یعنی یہ کہ — کیا یہ ممکن ہے کہ ریحانہ۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟

ڈاکٹر: ہاں! ہاں! بھائی کہو نا، ضرور کہو، کہو بھی کہیں! کیا تم ریحانہ کے متعلق مجھے اپنے جذبات سے مطلع کر رہے ہو!

ناصر: (جلدی سے گھبرا کر) جی ہاں! جی ہاں! یہی تو عرض کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر: تو میاں ناصر سنو! فیصلہ قطعاً ریحانہ کے ہاتھ میں ہے یہ معاملہ اس کا ہے وہی جانے! ہم تو اس کو اپنے تجربہ اور عقل کے مطابق مشورہ دے سکتے ہیں۔ بس! باقی وہ بالکل مختار ہے۔ البتہ تم پہلے اس کی ماں سے دو باتیں کر لو! — اور بیٹا مجھے تو —

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

عطیہ: ریحانہ کا مزاج کچھ سست ہے۔ میں نے اس کے لئے قہوہ بھجوا دیا ہے آئیے خاصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے!

(سب جاتے ہیں)

(عطیہ ایک آراستہ کمرہ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے، ناصر سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے)

عطیہ: مجھ سے کیا کہتے ہو؟ اگر یہ خیال ہے تو خدا مبارک کرے! اتنا تو میں کہتی ہوں کہ جس نوجوان کو ریحانہ جیسی بیوی نصیب ہوگی اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے — مگر اپنا معاملہ تم خود ہی اس کے سامنے پیش کرو، میں بھی کسی موقعہ سے دو حرف کہہ دوں گی۔ تم ٹھہرے انجمن محافظ نسواں کے ممبر تم ہی ریحانہ کے حقوق کی عزت کر سکتے ہو، یہ حق اسی کا ہے کہ وہ ہاں کہے یا نہیں! رہے ہم، ماں باپ تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہے کہ ہم مناسب مشورہ دیں!

ناصر: مگر آپ کی سفارش!

عطیہ: سفارش! عقل گئی ہے تمھاری! یہ معاملات سفارشوں سے طے ہوا کرتے ہیں، یا طے ہونے چاہئیں! اظہار مدعا سے تمھاری زبان قاصر تو نہیں! مگر میں تو جانتی ہوں بہت میٹھی اور دلکش ہے، اپنے وکیل خود بنو! گھبراتے کیوں ہو! زبان طرار! دماغ ہوشیار، انداز دلپسند، سب کچھ خدا نے تم کو دیا ہے!

ناصر: میں نے تو ذکر چھیڑا تھا۔

عطیہ: پھر کیا کہا اس نے؟ — لو وہ تو خود ہی آ رہی ہے — میں تمھارے لئے میدان خالی کرتی ہوں۔

(عطیہ مسکراتی ہوئی جاتی ہے — ریحانہ داخل ہوتی ہے)

ریحانہ: اوہو ناصر صاحب، سنتی ہوں کہ کل تو آپ سے اور بابا جان سے بڑی مزیدار بحث ہوئی۔

ناصر: جی ہاں، بحث وحث کیا، ڈاکٹر صاحب نے میری تھوڑی سی گوشمالی فرمائی۔

ریحانہ: کان تو کچھ آپ کے سرخ معلوم نہیں ہوتے!

ناصر: (ہنس کر) دولہن آپا کا انداز گفتگو کچھ آپ بھی اختیار کرتی جاتی ہیں!

ریحانہ: جیسی ماں ویسی بیٹی — ہونا بھی یہی چاہیے — اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں سنجیدہ بن جاؤں تو لیجئے میں نہایت سنجیدہ بن گئی اب فرمائیے!

(مذاقاً منہ بنا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ریحانہ: لیجئے، اب ذرا دیکھئے میری سنجیدگی — دہکتے انگارے کی طرح باوقار اور برف کی طرح ٹھنڈی! اب آپ کیا حقوق نسواں کے

مسئلہ پر کچھ فرمائیں گے ؟

ناصر: (دفعتاً اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ریحانہ! خدا کے لئے! مرتے ہوئے کو طنز اور استہزا سے نہ مارو! میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے آیا ہوں! بتا دو کیا فیصلہ ہے؟!

ریحانہ: (دوسری طرف نظر پھیر کر) ناصر صاحب! اگر راستہ ناہموار ہو تو گھوڑے کو دوڑائیے نہیں! کہیں ٹھوکر نہ کھائے!

ناصر: تو کیا راستہ ناہموار ہے!

ریحانہ: بہت! آپ کے خیال و گمان سے بھی زیادہ!

ناصر: (گھٹنوں کے بل کرسی کے پاس بیٹھ جاتا ہے) میں مر جاؤں گا ریحانہ! میں فنا ہو جاؤں گا!

ریحانہ: یہ آپ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض حال کرنے کا خاص فرنگی طریقہ کیوں اختیار فرمایا ــــ وہ بھی میرے ساتھ، کہ میں ایک کالی عورت ہوں! غلام قوم کی عورت! نامہذب عورت! ــــ اس ذکر کو فی الحال ملتوی کیجئے۔ مجھے چند روز سوچنے دیجئے!

ناصر: مگر ــــ امید کی کوئی جھلک میرے لئے؟

ریحانہ: ابھی نہیں!

ناصر: عنایت کا کوئی لفظ میرے لئے؟

ریحانہ: ابھی نہیں!

ناصر: کرم کی ایک نظر میرے لئے!

ریحانہ: ابھی نہیں!

(عطیہ داخل ہوتی ہے، دروازہ ہی سے آواز دیتی ہے)

ریحانہ: ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں (ناصر کو دیکھ کر) اوہو، میاں ناصر بھی موجود ہیں۔ (ریحانہ "بہت خوب" کہتی ہوئی جاتی ہے)

ناصر: (عطیہ سے مخاطب ہو کر) جی ہاں، میں موجود ہوں۔ کس مشکل میں پھنس گیا ہوں!

عطیہ: سبحان اللہ! گویا آپ ننھے بچے ہیں کہ میں نے آپ کو اٹھا کر کانٹوں بھری جھاڑی میں پھینک دیا!

ناصر: تو پھر میرا حشر کیا ہوتا ہے؟ ریحانہ نے تو اپنا جواب ملتوی رکھا ہے

عطیہ: التوا کی گود میں امیدیں پلتی ہیں۔

ناصر: مگر ــــ

عطیہ: مگر وگر کچھ نہیں، اگر وہ کہتی ہے کہ انتظار کرو تو کرو انتظار!

ناصر: مگر انتظار میرے لئے روح فرسا ہے!

عطیہ: (مسکرا کر) روح کو تحلیل ہونے دو، جس قدر تحلیل ہوگی اسی قدر کثافت سے پاک ہوگی!

ناصر: یہ مذاق ہے یا طنز؟

عطیہ: نہ مذاق ہے اور نہ طنز، صرف مشورہ ہے، دوستانہ اور عزیزانہ!

ناصر: آپ اگر مشیر اور ناصح ہیں تو کچھ معین اور دستگیر بھی بنیے!

عطیہ: سنو میاں ناصر! مرد اپنی محبت کی کاغذی کشتیاں بہتے پانی پر ڈالتا ہے، بہت سی بہہ جاتی ہیں ــــ بہی چلی جاتی ہیں، اور کتنی ہی بہتے بہتے غایب ہو جاتی ہیں، ایک دو کنارے کی گھانس اور کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتی ہیں، کوئی ایسی بھی ہوتی ہے جو کنارے سے دو ہاتھ آگے ڈوب کر رہ جاتی ہے ــــ جو کشتی چار دن بھی نہ تیر سکے اس کا کیا اعتبار!

ناصر: (مسکرا کر) آپ کے معمے اور بھی جان کا عذاب ہیں!

عطیہ: میرے معموں کی پل صراط سے گذرے بغیر اپنے تصور کی جنت میں کیوں کر داخل ہو سکو گے! ــــ خیر اب تم گھر جاؤ، میں دو ایک دن میں خود ریحانہ کا منشا معلوم کر کے تم کو اطلاع دوں گی۔ بادلوں کی طرح بھاگتے پھرنے سے کوئی نتیجہ نہیں!

(ناصر "خدا حافظ" کہہ کر جاتا ہے، عطیہ کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے)

"میرے انتقام کی منزل قریب آ رہی ہے ــــ ہر چیز سے زیادہ پرکیف۔ انتقام! ــــ چراغ اپنا ہی خون پیتا ہے اور تاریکی کو کھا جاتا ہے، مگر پھر کاجل بن کر وہ خون اور ظلمت اس کے حلق سے نکلتی ہے!! ــــ عمل کے بطن میں اس کے نتائج زندہ رہتے ہیں!!

(ریحانہ اور ناصر کی شادی قرار پا گئی، نکاح بہت سادگی کے ساتھ ہونے والا ہے، دولہا اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آگیا ہے یہ اشخاص وہی ہیں جو پہلے منظر ــــ میں دیکھے گئے تھے۔ دولہا والوں کی طرف سے

نکاح کے جلد پڑھائے جانے کا تقاضہ ہو رہا ہے، دولھا مسند پر سہرا باندھے بیٹھا ہے، اس کمرے کے ایک پہلو میں پردے پڑے ہوئے ہیں، یہ زنانہ حصہ ہے ڈاکٹر ناصر داخل ہوتے ہیں ۔)

ایک بڑے میاں: کیوں جناب ڈاکٹر صاحب! کیا دیر ہے اب؟

ڈاکٹر: جی کچھ دیر نہیں، لڑکی کی منشا معلوم کی جا رہی ہے!

بڑے میاں: اب اس کی بھلا کیا ضرورت ہے! منشا تو بہرحال پہلے ہی معلوم تھی، اور مسلمان لڑکی کی منشا ہی کیا!

ڈاکٹر: جی بجا ہے میر صاحب! اس کی کیا منشا! منشا تو صرف میری اور آپ کی ہونی چاہیے!

بڑے میاں: جی ہاں! شرفا کا تو یہی دستور ہے!

ڈاکٹر: اور در اصل جناب میر صاحب! شرفا کے لئے تو خود نکاح بھی ایک دستور اور رواج ہی تو ہے! اس کی بھی چنداں حاجت تھوڑا ہی تھی!

دوسرے بڑے میاں: کیا فرمایا آپ نے ڈاکٹر صاحب؟ توبہ! کچھ مذاق کر رہے ہیں!

ڈاکٹر: (ہنس کر) جی ہاں، آج تو دن ہی مذاق کا ہے — ہم سب مذاق ہی کے لئے تو جمع ہوئے ہیں!!

بڑے میاں: بجا بجا ہے، اچھا تو اب کیا دیر ہے نکاح میں؟

ڈاکٹر: جی، وہ دیکھئے دولھا کی والدہ تشریف لا رہی ہیں، معاف کیجیے وہ بے پردہ آ رہی ہیں، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ پردہ کے پابند نہیں ہیں۔

بڑے میاں: (گھبرا کر) کیا فرمایا آپ نے؟ دولھا کی وا — دولھن کی وا — یہ تو جناب مناسب نہیں شریعت کے بالکل خلاف، واللہ! (جوش میں آ کر) بالکل خلاف! نامحرم کے سامنے کوئی شریف عورت آئے! نہیں صاحب، نہیں، منع کیجیے اُن کو منع کیجیے!

(عطیہ نہایت سادہ لباس میں ایک چادر لپیٹے ہوئے مگر منہ اور ہاتھ کھولے ہوئے داخل ہوتی ہے)

عطیہ: ضرورت نہیں کہ آپ حضرات کو — جو آج ہی ہمارے خاندان میں شریک ہو جانے والے تھے — میں نے عرض کیا ہو جانے والے تھے۔ ("تھے" پر زور دے کر)

(سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ ناصر اپنا سہرا ہٹا دیتا ہے)

بڑے میاں: یہ آپ کیا فرما......

عطیہ: ٹھہریے، ٹھہریے! بڑے میاں! ذرا میری بات سنیے! میں دولھن کا ایک پیام لائی ہوں!

(سب ایک دوسرے کی طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتے ہیں)

ایک بڑے میاں: کیا معنی اس کے یعنی ہماری توہین —

عطیہ: جی نہیں! توہین کا کوئی موقعہ نہیں! توہین صرف معززین کی ہوا کرتی ہے! جس کی گرہ میں کچھ نہ ہو اس سے کوئی کیا چھینے! گفتگو صرف ایک ذرا سے معاملہ کی ہے —

بڑے میاں: اب کیسی گفتگو! — یعنی

عطیہ: یعنی وانی رہنے دیجئے! ایک عورت کو اپنی مقدس اور محترم ذات شریف سے دو باتیں کر لینے دیجیے آپ اگر اسی طرح میری بات کاٹتے رہیں گے تو میں صبح تک بھی دولھن کا پیام نہ پہنچا سکوں گی!

بڑے میاں: مگر ہم —

عطیہ: غصہ کی حالت میں محفل پر اپنے منہ کا تھوک نہ اڑائیے!

بڑے میاں: مگر ہم —

عطیہ: "ہم" ایک بے معنی لفظ ہے — ایک دھول سے بھری ہوئی گٹھڑی ہے! — یہ "ہم"! — اس دھول کو اڑا دینے والی ہوا چلنے والی ہے — میں اب سب کے لئے دولھن کا یہ پیام لائی ہوں کہ اس کو دولھا اور دولھن والوں کے نسب پر بہت شبہ ہے!

بڑے میاں: یعنی، یہ کیا گفتگو ہے آپ کی! — ہم —

عطیہ: پھر وہی ہم! — کہہ تو دیا کہ دولھن مجہول النسب دولھا سے نکاح کرنا نہیں چاہتی۔

بڑے میاں: یعنی!

عطیہ: یعنی یہ کہ دولھن کو معلوم ہو چکا ہے کہ ناصر میاں کی تیسری پشت میں — یعنی دولھا میاں کے نانا کے دادا نومسلم تھے، اس لئے —

بڑے میاں: (بگڑ کر، بآواز بلند) ہم نہیں سن سکتے یہ توہین آمیز اشارات! حسب ونسب کے متعلق! اسلام نے حکم دیا ہے کہ نسب اسی کا اچھا جس کے اعمال اچھے ہوں!

عطیہ: اعمال! ذرا وہ بھی سن لیجئے! آپ میں سے ایک صاحب تو وہ ہیں — حضرت مولانا — جنھوں نے بلا وجہ دو بیویوں کو طلاق دی، ایک صاحب وہ ہیں — جناب پیر صاحب قبلہ — جن کی بیوی کے مہر اور نان نفقہ کا مقدمہ چل رہا ہے — اور وہ جو خواجہ خضر اس طرف بیٹھے ہیں (اشارہ کرکے) وہ اس مقدمہ میں حلف دروغی کرکے آئے ہیں!! اور وہ دولہا کے چچا صاحب — (چاروں طرف دیکھتی ہے) کہاں ہیں وہ جنھوں نے عمر بھر ایک بازاری عورت کو بلا نکاح اپنے گھر میں رکھا — ایک صاحب نے اپنی لڑکی کو محروم الارث قرار دیا! ایک صاحب نے — وہ جو ادھر بیٹھے ہیں! — اپنی ۱۴ سال کی لڑکی کو زبردستی اور صرف دولت کی خاطر ۶۰ سال کے ایک بوڑھے بوالہوس کے حوالہ کیا — اور سنیئے گا اپنے اعمال حسنہ! — یہ نسب آپ کا اور یہ اعمال آپ کے!!

(سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا عصا سنبھال لیتا ہے، کوئی عمامہ درست کرتا ہے، کوئی قبا کے دامن جھاڑتا ہے — ناصر ابھی تک بیٹھا ہوا ہے)

عطیہ: ٹھہریئے! میں کہتی ہوں کہ آپ جا نہیں سکتے! میری لڑکی نے جس کو آپ بیاہنے آئے تھے یہ کہا ہے کہ آپ سب بازاری لفنگے ہیں جو بے گناہ عورتوں کی زندگی سے کھیلا کرتے ہیں — جانور ہیں —

(سب بوڑھے بڑبڑا رہے ہیں!)

ایک بڑے میاں: لاحول ولا قوۃ —

عطیہ: خاموش! تم سب نے عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنا لیا ہے، اور جیسے اس کے بزرگ ویسا ہی ناصر بھی ہے! —

بڑے میاں: (بگڑ کر) بس معاف کیجئے، ہم سننا نہیں چاہتے!

عطیہ: سننا چاہو یا نہ چاہو، سننا تو پڑے گا! شرافت اور نسب کے دعویدارو! میں نے اور میرے شوہر نے تم سب کو صرف اسی لئے آج یہاں آنے کی ترغیب دی تھی کہ تم کو ذلیل کرکے اسی ذلیل عورت کے دروازے سے ٹھوکریں مار کر اٹھایا جائے جس کو تم نے سالہا سال اس کے جائز حقوق سے محروم رکھا جس کی زندگی کو تم نے تلخ کر دیا — اب اسی تلخی کا ایک گھونٹ تم بھی پیتے جاؤ!

ایک بڑے میاں: استغفراللہ!

دوسرے: لاحول ولا —

تیسرے: انا اللہ —

عطیہ: استغفراللہ، دل سے کہو، شاید خدا تمھارے گناہ معاف کر دے! لاحول تم اپنے اعمال سیاہ پر پڑھو، اپنے بھائی شیطان کے نام پر! اور انا اللہ اپنی مردہ روحوں کے لئے کہو، جو خدا کرے جلد دنیا کی آلودگیوں کو سمیٹ کر وہاں جائیں جہاں ان سے حساب مانگا جاتا ہے!!

بڑے میاں: ہم اب نہیں ٹھہر سکتے یہ تمام بیہودہ باتیں سننے کے لئے۔

عطیہ: (مسکرا کر) غلہ جب پھٹکا جاتا ہے تو خالی اور خراب دانوں کو ہوا اڑا کر لے جاتی ہے — جائیے، تشریف لے جائیے — حسب و نسب کی جھنڈیاں ہلانے والے!! موذی — مکار!!

(ناصر کی طرف اشارہ کرکے)

اٹھو دولہا میاں! گھر کو سدھارو، ممکن تھا کہ یہی جواب تم کو پہلے دیدیا جاتا مگر ہم ان بڑے صاحبوں کی ذلت اور رسوائی کی لذت سے محروم رہ جاتے! — جاؤ اپنے مکر و فریب کی پونجی کسی اور بازار میں لے جاؤ! — ہمارے گھر اس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے!

سب بوڑھے براتی: (ناصر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے)

ایک: اچھا دیکھا جائے گا!

دوسرا: اچھا دیکھا جائے گا!

تیسرا: دیکھا جائے گا!

(پردہ گرتا ہے)

قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام

مشرقی اور مغربی شاعری کا فرق

شاعری خدا کی دین ہے۔ ہر وہ شخص جسے بات کرنی آتی ہو شاعری نہیں کرسکتا۔ وہی شاعر بن سکتا ہے جس میں شاعری کا مادہ فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہو۔ اگرچہ شعر سے محظوظ ہونے کی صلاحیت ہر فرزندِ آدم میں موجود ہے اور ہر بچہ کم و بیش ذوقِ شعر قدرت سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری قوموں کی مادری زبان کہلاتی ہے۔ ہم نے اکثر خورد سال بچوں کو جن کے ابتدائی بول بھی درست نہیں ہوتے تُک سے تُک ملاتے اور بے معنی الفاظ کو وزن میں ڈھالتے سنا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عالم اور فاضل اصحاب شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے لیکن ان کا مذاقِ شعر نہایت پاکیزہ ہوتا ہے۔

غرض جس طرح یہ بات مسلم ہے کہ شاعری اکتسابی یا درسی علم نہیں بلکہ ذوقی اور وہبی مادہ ہے۔ اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر یا کلامِ موزوں ہر ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شعر میں ایک ایسا عالمگیر اثر ہے جو جاہل، عالم، بڑے اور چھوٹے سب کے دلوں کو لبھاتا ہے۔ اعشیٰ، ابوالحسن، رودکی، لارڈ بائرن اور سولن وغیرہ کی اعجاز نما شاعری کی بڑی مثالوں کو چھوڑ کر بھی دیکھا جائے تو جو کیف اور اثر قلبِ انسانی میں ایک شعر پیدا کرتا ہے وہ نثر کے ایک صفحہ سے ممکن نہیں۔ شاعری انسانی روح کی غذا ہے۔ جس طرح اچھی غذا کے بغیر جسمِ انسانی جیسا کہ چاہیے بالیدہ نہیں ہوتا اسی طرح فنونِ لطیفہ سے بے نیاز رہ کر روحِ انسانی کی لطافتیں خوابیدہ رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے نثر سے پہلے نظم کہنی سیکھی یا فطرت نے سب سے پہلے کلامِ موزوں کہلوایا ہو کیونکہ اس کے بغیر اس عالمِ کون و فساد کی ہنگامہ آرائی بھی بے کیف نظر آتی۔

جس طرح شعر کی اثر آفرینی اور شاعری کا ذوقی ہونا دو مسلمہ نظریے ہیں۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک خطۂ ملک کے شعری محرکات و تاثراتِ شاعری دوسرے خطۂ زمین سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ سر والٹر اسکاٹ نے درحقیقت بہت ہی سچ کہا ہے کہ دنیا کی دو چیزیں بھی یکساں نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ایسا ضرور ہے جس سے وہ ایک نہیں کہی جا سکتیں۔ ظاہر ہے کہ جب عالم کی دو چیزوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی تو دو مختلف خطۂ زمین کی شاعری جو دنیا کے دو مختلف سمتوں میں واقع ہیں کیونکر یکساں ہو سکتی ہے چنانچہ مشرقی اور مغربی شاعری میں جو بعد المشرقین نظر آتا ہے اس کا سبب بھی یہی محرکات و تاثرات کا افتراق ہے۔

ایشیائی شاعری اور خصوصاً اردو شاعری برسوں سے مطعون ہے۔ چنانچہ مولانا حالی نے بھی اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں اس پر بہت کچھ لے دے کی ہے اور وہ اس کو اس سے بھی بہت زیادہ قابلِ ملامت سمجھتے ہیں چنانچہ آپ نے آخر میں فرمایا ہے۔

"اگرچہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحتہً نکتہ چینی کی جائے۔ کیونکہ عمارت کا بودا پن جیسا بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک

ہو سکتا ہے اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے۔"

مولانا حالی کی عظیم المرتبت شخصیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ یہ دنیائے ادب اردو کا وہ پیشوا ہے جس نے اردو شاعری کی کایا پلٹ دی۔ اور وہ ہادی عیسیٰ دم ہے جس کی قلم نے اسلام کے مردہ قالب میں تازہ روح پھونکی۔ سچی بات یہ ہے کہ جو خدمت اسلام کی حالی کے "مدوجزر اسلام" نے کی دوسرے مسلمان شعرا کے پورے پورے ضخیم دیوان بھی نہ کر سکے چنانچہ سرسید نے فرمایا تھا کہ جب مجھ سے بارگاہ خداوندی میں پوچھا ہوگی کہ کیا لے آیا ہے تو جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔ لیکن ان تمام احسانات اور خوبیوں کے اقرار کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے مقدمۂ شعر و شاعری میں جو اعتراضات اردو شاعری اور خصوصاً اردو تغزل پر کئے ہیں وہ سب کے سب قابل قبول نہیں ہیں۔ مولانا حالی نے اس میں اکثر انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے جو ورڈسورتھ نے (WORDSWORTH) لرکل بیالڈز (LERICAL BALLADS) کے مقدمے میں پیش کئے ہیں چاہے مقدمۂ شعر و شاعری لرکل بیالڈز کے مقدمے کو دیکھ کر یا اس کر لکھا گیا ہو یا نہیں لیکن شاعری کے جس معیار کی اس میں سفارش کی گئی ہے وہ یقیناً کم و بیش وہی ہے جو مغربی شاعری کا ہوتا ہے۔ اور وہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر مشرقی شاعر کا پاؤں قدم قدم پر لڑکھڑاتا ہے۔ غرض اردو شاعری پر اور خصوصاً تغزل پر مغربی ادب پرستوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس کی شاعرانہ رنگینیاں مصنوعی ہوتی ہیں اور اس کی سحر کاریاں جھوٹی اس کو حقیقت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ واقعہ نگاری سے کوئی سروکار۔ چنانچہ ان کی کوشش اور تمنا ہے کہ مشرقی شاعری کا معیار گھٹ کر یا بڑھ کر بن کر یا بگڑ کر جس طرح بنے مغربی معیار شاعری سے بھڑ جائے تو وہ گنگا نہائیں کیونکہ ان کے خیال میں یہی معراج شاعری ہے اس لئے آج کل عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ مقالہ نگار یا مضمون نگار نے جہاں شاعری کے کسی پہلو پر قلم اٹھایا مغربی شعرا کے دو چار مقولے موٹے موٹے الفاظ میں نقل کر دیئے جیسے "ملٹن کا خیال ہے کہ "اچھا شعر وہی ہے جس میں زور، سادگی اور اصلیت ہو۔" یا گولڈاسمتھ کہتا ہے کہ "میری مبنی بر اصلیت نظمیں ہی میرے لئے باعث فخر و ناز ہیں" چنانچہ وہ اپنی نظم سے یوں مخاطب ہوتا ہے "اے میری پیاری نظم کو محفل میں لوگ تجھ پر لے دے کرتے ہیں لیکن جب میرے پاس کوئی نہیں ہوتا تو تجھ پر گھمنڈ کرتا ہوں" وغیرہ وغیرہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اقصائے عالم کے مفکرین و مدبرین کے اقوال نقل کرنے سے ضرور قارئین و ناظرین کو استفادہ پہونچتا ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے معمولی دماغ غیر معمولی دماغوں کے نتائج فکر سے روشناس ہوتے ہیں لیکن مشرق میں رہ کر مغرب کی گانا یا زمین کے سنگے آسمان میں چلانا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

مغربی شعرا کے خیالات مغرب ہی کے لئے موزوں ہیں جہاں زیادہ تر مادہ، اصلیت، اور عمل سے بحث رہتی ہے۔ ان کے نتائج افکار ان ذہنیتوں پر کس طرح منطبق ہو سکتے ہیں جنھوں نے روحانی فضا میں نشو و نما پائی ہو تخیل کے پروں پر اڑتے ہوں اور باطنی عالم میں کھوئے ہوئے ہوں۔ چنانچہ ان دونوں سرزمینوں کا فرق یورپ کا ایک عالم نفسیات ولیم ڈاوڈ اپنی کتاب "اپنے نفس کی شناخت" (KNOW YOUR OWN MIND) میں (جس کا ترجمہ مولوی علی اکبر صاحب

نائب ناظم تعلیمات نے کیا ہے ، اس طرح بیان کرتا ہے :-

"سیاحوں کا بیان ہے کہ برما کے جوگی دھوپ میں آسن جما کر مذہبی رموز کا مراقبہ کیا کرتے ہیں اور دنیا کی ان کو مطلق پروا نہیں ہوتی لیکن مغربی ممالک میں بلحاظ آب وہوا یہ دشوار ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں اس سرزمین پر خدا کی مار ہے۔ علاوہ ازیں کسب معاش میں یہاں بہت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سفید اقوام عملی پہلو پر زیادہ زور دیتی ہیں اور عملی دنیا سے الگ ہو کر اعلیٰ ذاتی صفات کے حاصل کرنے اور گہرے غور وفکر کی زندگی بسر کرنے کا رواج ہمارے ہاں سے اٹھ گیا ہے بلکہ اس کو ہم کم وبیش حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔"

ولیم گلاور مغرب کے سطحی پن اور عملی ذہنیت کی وجہ کسب معاش کی دشواریوں کو قرار دیتے ہیں آہ انھیں کیا خبر کہ غریب مشرقی کس طرح مر مر کر جیتے ہیں۔ بہر حال چاہے یہ خدا کی مار ہو یا خدا کا فضل مغرب اور مشرق کی ذہنیتوں میں بہت بڑا فرق ہے اور اس افتراق کا ذمہ دار ارث اور ماحول ہے نہ اقتصادی پستی۔ اور ایک وسیع النظر نقادِ سخن کو ان ہی اختلافات کی روشنی میں ان کے کمال کو جانچنا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی نظم کی وہ صنف جس کو لرک (LERIC) کہتے ہیں اپنے اندر ایسے گوناگوں تنوعات رکھتی ہے جو اردو تغزل میں موجود نہیں مشرقی اور مغربی شاعری کے رجحانات ان کے افکار وتخیل کی خصوصیات اور ان کے ارتقا کے اسباب پر غور کرنے کے بعد اس اعتراض کی اہمیت جو مغربی ادب پرستوں کو مشرقی شاعری پر ہے بہت کچھ گھٹ جاتی ہے۔

مشرقی شاعری کی خصوصیت موضوعی (SUBJECTIVE) اور باطنی کیفیات پر مبنی ہے۔ اس کی دنیا زیادہ تر موضوعی ہوتی ہے۔ وہ اپنے باطن کے عالم رنگ وبو کی رنگینیوں میں کچھ ایسا غرق ہوتا ہے کہ دنیائے واقعیت (REALISM) سے دور رہ جاتا ہے اور حقیقت میں اس کے خیال کی پرواز اور اس کی موضوعیت (SUBJECTIVITY) کی نزاکت ہی اس کا کمالِ شاعری ہے۔ مشرقی شاعر فطرتاً تصوریت پسند (IDEALIST) ہوتا ہے۔ اس لئے عام طور پر مشرقی شاعری میں موضوعیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔

برخلاف اس کے مغربی فن کاری کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر ایک معروضی (OBJECTIVE) عالم میں رہتا ہے۔ اس کو خارجی عالم سے ایک خاص ربط رہتا ہے وہ مشرقی شاعر کی طرح اپنے باطنی عالم سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کو بیرونی دنیا سے گہری دلچسپی رہتی ہے جو مغربی اہل فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ مغربی شاعر واقعیت پسند (REALIST) ہوتا ہے وہ خارجی عالم سے راست اثرات قبول کرتا ہے اور ان بیرونی تاثرات ہی کو خوبی سے ظاہر کرنا مغربی شاعری کا کمال ہے اور یہی وجہ ہے کہ مغربی شاعری میں معروضیت (OBJECTIVITY) کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔

اپنے اس خیال کی تائید میں اگر مشرقی اور مغربی مصوری کی مثال لی جائے اور ان کا تقابل کر کے دکھلایا جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔ مغربی مصوری کے دو بڑے اصناف منظر نگاری (LANDSCAPE -) اور تصویر کشی

(PORTRAIT DRAWING) ہیں۔ ان ہر دو اصناف میں ایک مغربی مصور جس بات کا خاص التزام رکھتا ہے وہ واقعہ نگاری یا واقعیت (REALISM -) ہے منظر نگاری میں خطوط اور رنگوں کے توازن کے ساتھ سب سے بڑا التزام اس بات کا رکھا جاتا ہے کہ واقعیت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس ضمن میں جو چیز نمایاں ہوتی ہے وہ پیش کردہ منظر کے نظری (PERSPECTIVE) کی صحت ہے۔ اور یہی چیز واقعیت کی جان ہے اسی طرح تصویر کشی میں بھی مغربی مصور کے پیش نظر انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت کی صحیح صحیح ترجمانی ہوتی ہے برخلاف اس کے مشرقی مصور منظری زاویوں کے قید و بند سے آزاد نظر آتا ہے۔ بظاہر اس کی مصوری اس قدر ناقص نظر آتی ہے کہ وہ مناظر کو صحیح زاویوں میں بھی نہیں بتا سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مناظر و سراپا کے معمولی قواعد سے بھی ناآشنا ہے۔ اسی طرح مشرقی تصویر کشی (PORTRAIT) میں بھی انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت نگاری مفقود نظر آتی ہے۔

پس ظاہر بین نظریں کہہ سکتی ہیں کہ مشرقی مصوری ناقص ہے اگرچہ حقیقت شناس جانتا ہے کہ ایک مشرقی فن کار کے لئے پابندئی رسم و آئین ایسی ہی ضروری ہے جیسے مذہبی رسوم کی۔ کوئی ماہر فن فن کار کے اپنے معیار سے جانچے تو ان بے رنگ تصویروں میں اک عالم رنگ و بو نظر آئے گا اور معلوم ہوگا کہ اس کے نزاکت خیال، معنی آفرینی اور موضوعی کیفیات میں کتنی گہرائیاں ہیں اور اس باکمال مصور نے خارجی دنیا سے الگ رہ کر حسن اور معنی کے کیسے کیسے دریا بہائے ہیں۔ یہی ظاہر بینی ہے کہ اجنٹہ کی مصوری، ایلورہ اور پالم پیٹھ وغیرہ کی نازک اور حسین بت تراشی کے معنوی پہلو اور خیال آفرینی کو ایک عامیانہ نظر سے جانچنے والا محسوس اور معلوم نہیں کر سکتا۔

پس جب ہر دو صاحبان فن کے موضوع ہی الگ ہیں۔ رجحانات اور محرکات ہی الگ ہیں یہاں تک کہ دونوں کا مطمح نظر بھی جدا جدا ہے تو چاہیے کہ دونوں کے کمال کو پرکھنے کی کسوٹیاں بھی جدا جدا ہوں ورنہ اگر ایک فن کاری کی کسوٹی پر دوسرے فن کو جانچا جائے تو ہر صاحب شعور سمجھ سکتا ہے کہ اس کے حسن و قبح کا کس قدر اندازہ لگ سکے گا اور اگر تھوڑا بہت بھی جانے تو وہ کس حد تک درست ہوگا۔

اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ مغربی اور مشرقی شاعری کو ان کے اپنے معیار پر جانچا جائے ورنہ ایک کے معیار پر دوسرے کو جانچ کر اس کے حسن و کمال کو پامال کرتے ہوئے اور اس کی خصوصیات اور نزاکتوں کو نظر انداز کر کے اس کے حسن و قبح کا غلط اندازہ لگانا کسی صاحب فہم کے پاس قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

لطیف النساء بیگم (بی اے)

جواب الجواب

شعر۔ کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

اعتراض۔ من بیقرار کا ترجمہ میں بیقرار صحیح نہیں اس لئے کہ فارسی ترکیب میں لفظ من مضاف واقع ہوا ہے۔

جواب۔ من بیقرار میں من مضاف نہیں ہے موصوف ہے ترکیب اضافی نہیں توصیفی ہے ؎

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

جواب الجواب۔ مجیب نے یہ بیان نہیں کیا "میں بیقرار رویا" میں لفظ "بیقرار" کو اس کے ماسبق اور مابعد سے کیا تعلق ہے؟ "میں" اس جملہ میں مبتدا ہے اور "رویا" اس کی خبر؟ لفظ "بیقرار" معلق رہ جاتا ہے۔

"من بیقرار" میں اضافت توصیفی سہی؟ لیکن اردو میں صفت مقدم ہوتی ہے اور موصوف موخر؟ مصرع یوں ہوتا:۔

کچھ اس طرح تڑپ کر بیقرار زار رویا

تو ترکیب درست اور مصرع بامحاورہ ہو جاتا۔

شعر۔ آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

اعتراض۔ دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے۔ ردیف رویا کی بجائے روتا ہے چاہیے۔

جواب۔ ماضی مطلق بھی حال کے معنی دیتی ہے مثلاً ناسخ فرماتے ہیں ؎

خانۂ عاشق میں جو درم بھرتے ہیں عقل سے مجھ کو نظر آئے وہ انساں خالی

یعنی ایسے لوگ مجھ کو عقل سے خالی نظر آتے ہیں۔

جواب الجواب۔ مجیب نے جس قاعدہ کا ذکر کیا ہے اور مصباح القواعد سے ناسخ کا جو شعر نقل کیا ہے اس میں "بھرتے ہیں" (حال مطلق) کے مقابلہ میں "آئے" (ماضی مطلق) حال کے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن فانی کے شعر میں "آیا ہے ملے ہیں" (ماضی قریب) کے مقابلہ میں "رویا" (ماضی مطلق) حال کے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ناسخ کا شعر نہ مفید ادعا رہے نہ محل استشہاد؟؟

شعر۔ کیا اس کو بےقراری یاد آگئی ہماری مل مل کے بجلیوں سے ابر بہار رویا

اعتراض۔ دونوں مصرعوں میں ربط نہیں پرنکہ پہلے مصرع میں کیا حرف استفہام ہے اس لئے دوسرے مصرع میں مل مل کی جگہ کیوں مل چاہیے۔

جواب۔ کیا یہ قاعدہ ہے کہ جب پہلے مصرع میں استفہام ہو تو دوسرے مصرع میں کیوں ہونا ضروری ہے تاکہ ربط ہو جائے دیکھیے غالب کا شعر ہے ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مطلب سنئے تو ربط بھی معلوم ہو جائے گا شاعر اپنے نزاکت تخیل کی بنا پر بجلی کے کوندنے اور موسم بہار میں پانی برسنے پر حسن تعلیل صرف کر کے کہتا ہے کہ یہ موسم بہار کا بادل جو بجلیوں سے گویا مل مل کر زار زار رو رہا ہے تو کیا اسے ہماری بے قراری یاد آگئی جو اس کی یہ حالت ہے۔

جواب الجواب۔ غالب کے شعر میں حرف "کیا" بتعلق مصرع ثانی استعجابیہ ہے فانی کے شعر میں "کیا" بتعلق مصرع ثانی استفہامیہ ہے اس لئے غالب کے شعر سے استدلال غلط ہے۔

شعر۔ آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں یہ جانتا ہوں دل ادھر آیا ادھر گیا

اعتراض۔ اس شعر میں دل آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے (مثال چھوڑ کر) یعنی ادھر آیا ادھر گیا اگر دل کا آنا مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی ادھر آیا ادھر گیا سے کیا مراد ہے۔

جواب۔ شعر کی توضیح ملاحظہ فرمائیے پھر آنا جانا معلوم ہو جائے گا۔ دل آیا۔ کسی کی محبت ہوئی کسی پر طبیعت آئی۔ دل گیا۔ دل پہلو سے چلا گیا یعنی ادھر کسی پر طبیعت آئی ادھر دل پہلو سے نکل کر پرایا ہو گیا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بتاؤ دل آیا یا گیا تو میں اس کا کیا جواب دوں میں جانتا ہوں یہی کہہ دوں گا کہ ادھر کسی پر میری طبیعت آئی ادھر میرے پہلو سے میرا دل چلا۔

جواب الجواب۔ "ادھر آیا ادھر گیا" یہ اردو کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں

"جانے میں کچھ دیر نہیں لگتی" جیسے:۔

واغ:۔ "تھی یہ خبر ہم کو اب کے بہار — ادہر آئے گی اور اُدہر جائے گی"

اور مطلق "ادہر" کے معنی اِس طرف' اور "اُدہر" کے معنی اُس طرف ہیں۔
اب (مثال مندرجۂ اعتراض کے ساتھ) شعر زیر بحث کے معنی اور مجیب کی تاویلات قابلِ غور ہیں۔

شعر۔ شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے — صبح بہارِ حشر کا چہرا اتر گیا!

اعتراض۔ "جی اٹھے" یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ شام ہجر کے مارے "کشتگان شام ہجر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں۔ "وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے مصیبت کا مارا جو مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے کشتۂ مصیبت کا نہیں۔

جواب۔ مارا کے معنی فرہنگ آصفیہ میں ہیں مقتول، قتل شدہ، کشتہ، جان دادہ۔ مذبوح، ذبح شدہ۔ پھر ہجر کے مارے کا ترجمہ ہجر کا ستایا ہوا۔ آپ مصیبت کے مارے پر قیاس کرتے ہیں اور اس سے مصیبت زدہ معنی لیتے ہیں اور کشتۂ مصیبت نہیں کہتے صحیح ہے مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے مارا کے معنی کشتہ اور مقتول کے بھی لغت میں ہیں تو پھر ہجر کے مارے کا ترجمہ کشتۂ ہجر کہنے میں کیا قباحت ہے۔ مارا کے معنی ڈسا ہوا۔ گزیدہ اور کشتہ کے ہو سکتے ہیں جیسے سالک کا شعر ہے ؎

وہ سرد مہر ہاں تری نظروں میں ہے مگر — پانی بھی مانگتا نہیں مارا نگاہ کا

اب نگاہ کے مارا کا ترجمہ کشتۂ نگاہ صحیح ہے یا ستایا ہوا نگاہ کا درست ہے میرے خیال میں جو نگاہ کا مارا پانی تک نہ مانگے اس کے کشتہ اور مقتول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ایسے ہی ہجر کا مارا یعنی کشتۂ ہجر مراد لیں تو کیوں غلط؟ سمجھ میں نہیں آتا!

جواب الجواب۔ حیرت ہے کہ مجیب نے بحوالہ فرہنگ آصفیہ "مارا" کی سند تو پیش کی لیکن "مارے" کا لفظ جو معرضِ بحث میں ہے اس کے متعلق کیوں سکوت اختیار کیا؟ "مارے" کے متعلق اسی فرہنگ میں یہ عبارت مرقوم ہے:۔
"شامت کے مارے نے یہ قصور کیا یعنی شامت زدہ نے" لہذا سالک کے

شعر سے اعتراض رفع نہیں ہو سکتا۔

شعر۔ فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود — شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

اعتراض۔ پہلے مصرع میں غم ہستی کا ذکر ہے دوسرے میں غم کی تکرار ہے اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ دفتر غم آیا ہستی کا ہے یا عشق و ہوس کا۔

جواب۔ شعر کا مطلب لکھنے سے واضح ہو جائے گا کہ کونسا غم ہے کہتے ہیں فانی کی زندگی تک دنیا کا غم بھی نمایاں رہا آج دیکھو اس کے بعد دفترِ غم کا شیرازہ بکھرا ہوا نظر آ رہا ہے یعنی غم عالم اس کے ساتھ ساتھ تھا اور وہ غم کا ساتھی اب نہ وہ موجود ہے نہ غم کا پتہ۔

جواب الجواب۔ مجیب کی ترجمانی اور شاعر کے پیرایۂ بیاں میں کوئی معنوی ربط نہیں ہے، ابہ البحث شعر کے مصرع اولیٰ سے ثابت ہے کہ "غم ہستی" ذات فانی سے وابستہ ہے' اور مصرع ثانی میں مطلق "دفترِ غم" کا بکھر جانا بیان کیا گیا ہے۔ لہذا "غم ہستی" کو "دفترِ غم" سے کیا تعلق؟ باوجود اس سرگرم ترجمانی کے واضح نہیں ہوتا۔

شعر۔ ہزار ڈھونڈیے اس کا نشاں نہیں ملتا — جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

اعتراض۔ "جبیں ملے تو ملے" اس سے کیا مراد ہے۔ جبیں تو آستاں کے ہر تلاشی کے ساتھ ہے۔

جواب۔ جبیں ملے تو ملے یعنی پیشانی تو موجود ہے جیسے کہتے ہیں، خدا ملے تو ملے مگر روزگار نہیں ملتا یعنی خدا تو موجود ہے اس کا ملنا آسان ہے مگر ملازمت غیر موجود اور اس کا ملنا عنقا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر تلاش کرو خدائے بے نشان کا پتہ ملتا ہی نہیں پیشانی تو مشتاق سجدہ ہے مگر اس کے آستانے کو لاکھ لاکھ ڈھونڈو کہیں پتہ نہیں۔ شعر صاف ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اعتراض سے کیا مقصود ہے اور یہ تلاشی آپ نے کہاں سے تراشا محققین کی رائے ہے کہ تلاشی بمعنی تلاش کرنے والا محض غلط ہے کیونکہ عربی قاعدہ یہاں جاری نہیں ہو سکتا۔

جواب الجواب۔ مجیب کی خود ساختہ توجیہات سے قطع نظر "جبیں" کے متعلق جو میسر ہے "ملے تو ملے" کہنا قطعاً بے معنی اور مہمل ہے۔ مصرع ثانی اس طرح درست ہو سکتا ہے:۔ "جبیں ملی ہے مگر آستاں نہیں ملتا"

اس اصلاح سے اعتراض کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ مجیب کا اعتراض لفظ "ستلاشی" پر بھی ہے؛ واضح رہے کہ بعض فارسی الاصل الفاظ کو عربی قاعدہ کے تحت اساتذہ نے استعمال کیا ہے جیسے "مششدر"

ظہیر فاریابی:- بر بساط امراو ز نقش ششدر یافتن۔

"ستلاشی" زندہ - متلاشی ترے، افلاک کے سب تارے ہیں۔

شعر ۸ - چشم ساقی اثر مے سے نہیں ہیں گلرنگ　　دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

اعتراض ۸ - پیمانے کو دل کا مضاف الیہ قرار دینے کے بجائے اگر یوں کہا جاتا کہ پیمانہ میرے دل کے خون سے لبریز ہے تو شعر بامعنی اور تشبیہ کامل ہوتی۔

جواب۔ شعر بامعنی ہے اور تشبیہ اب بھی کامل ہے۔ دل کا پیمانہ اضافت مجازی ہے چشم ساقی کو پیمانے سے تشبیہ دی ہے اور مے کو خون سے گلرنگ۔ وجہ شبہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ساقی کی آنکھیں شراب پینے سے گلرنگ (لال) ہوگئی ہیں بلکہ یہ پیمانے ہیں جو میرے خون سے چھلک رہے ہیں۔

جواب الجواب۔ شاعر تو کہتا ہے "پیمانے کا دل" اور مجیب کہتا ہے۔ "دل کا پیمانہ" یہ عجیب اخلاص مندانہ تعبیر ہے!

شعر ۹ - لوح دل کو غم الفت کو قلم کہتے ہیں　　کن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

اعتراض ۹ - غم کو قلم سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہے، اور "کو" کی تکرار بھی مخل فصاحت ہے! کن ایک کلمہ لفظی ہے اسی لحاظ سے انداز رقم کی جگہ انداز بیان زیادہ موزوں تھا۔

جواب۔ غم کو قلم سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ قلم کی روسیاہی مشہور ہے اور وہ اسود الصحائف (جس کے نامہ اعمال زیادہ سیاہ ہوں) دو "کو" ایک مصرع میں آگئے تو آپ مخل فصاحت خیال کرتے ہیں حالانکہ ایک شاعر نے پانچ "کو" ایک مصرع میں جمع کر دیے ہیں۔

ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں!　　الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

اور "رقم" انداز بیان سے اس لئے بہتر ہے کہ وہ لوح، قلم کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ افصح اور فصیح سے بحث نہیں مطلب یہ ہے کہ کلام غلطی سے پاک ہے۔

جواب الجواب۔ بقول مجیب "قلم" تو روسیاہ ٹھیرا اگر "غم" بھی روسیاہ اور ہم رنگ عصار موسیٰ ہوتا تو تشبیہ تمام ہوجاتی۔ "کو" کی تکرار کا تعلق ذوق سلیم سے ہے، شمار سے نہیں۔

شعر ۱۰ - زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے!　　ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

اعتراض ۱۰ - پہلے مصرع میں "بھی" کے بعد تو کا لفظ زائد اور مخل فصاحت ہے۔ "بھی تو" کے بجائے لفظ "آپ" چاہئے۔ علاوہ بریں مصرع ثانی کی ترکیب بھی مہمل ہے کیونکہ کسی کے مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا البتہ مار ڈالنے کے لئے حیلہ درکار ہے۔

جواب۔ پہلے مصرع میں "بھی" کے بعد "تو" زائد و بیکار نہیں ہے حسن کلام اور تاکید کے لئے "تو" آتا ہے مثلاً داغ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

معجزہ حضرت عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں　　مردہ اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجھ کو

دوسرے اعتراض کا جواب کہ مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا جب کوئی مار ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا تو چاہتا ہے کہ کسی طرح خود ہی مر جائے اور مار ڈالنے کا حیلہ اس وقت درکار ہوگا جب خود میں مار ڈالنے کی طاقت ہو۔ آپ کی اصلاح سے دو "آپ" ایک جگہ جمع ہوکر کانوں پر گرانی پیدا کرتے ہیں۔

جواب الجواب۔ داغ کے شعر میں حرف "تو" تاکید کے معنی پر استعمال ہوا ہے یعنی عیسیٰ کا معجزہ ہرگز ہرگز غلط نہیں، مجھ کو جب وہ قم کہتے ہیں تو در مردہ اٹھتا ہے۔ فانی کے شعر میں "تو" بیکار ہے اور "بھی" کا لفظ مخل معنی! اسی سے یہ مفہوم ہوتا کہ "زندگی" کے علاوہ کوئی اور بھی "پشیمان" ہے۔ یہ اصلاح پر اعتراض صحیح نہیں، بقول مجیب مومن کی وہ غزل جس کا یہ مطلع ہے:-

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں
کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

قافیہ اور ردیف میں دو "نون" ایک جگہ جمع ہوجانے کی وجہ سے مہمل ہوجائے گی؟

نیز "حیلہ ڈھونڈنا" کے متعلق جو عجیب و غریب تاویلات کی گئی ہیں وہ لاجواب ہیں۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر

تنقید باقیات فانی کا جواب (بسلسلہ گذشتہ)

۱۱
اب اسے دار پہ لیجا کے سلادے ساقی — یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

۱۱ اعتراض۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دار پر سلانے کی زحمت ساقی کو کیوں دی جا رہی ہے اور دار پر سلانا کس معنی میں استعمال ہوا اگر سولی دینا کے معنی میں استعمال ہوا تو یہ غلط ہے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں دار پر چڑھانا مستعمل ہے۔

جواب۔ ساقی کو دار پر سلانے کی زحمت اس واسطے دی جا رہی ہے کہ اس کا شراب پلایا ہوا مستانا ہے۔ ساقی کو آپ کلال سمجھے ہوئے ہیں۔ شعر کی مٹی پلید کر دی۔ شاعر تو مشہور مثل کی بنا پر کہتا ہے کہ سولی پر بھی نیند آتی ہے ذوق کا شعر ہے ؎

یادِ مژگاں میں مری آنکھ لگی جاتی ہے — لوگ سچ کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی نیند آتی ہے

مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ مشہور ہے کہ سولی پر نیند آتی ہے اس لئے شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی (معشوق) تیرا شراب پلایا ہوا مستانا (عاشق) نہ جانے کہاں بہکتا پھر رہا ہے۔ یہ اچھا نہیں۔ سولی پر لے جا کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا دے وہاں اس کو نیند آ جائے گی۔

۱۲
دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں — سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

۱۲ اعتراض۔ بہتر تو یہ تھا کہ پیمانے کی مناسبت سے صرف آنکھ کا ذکر ہوتا یا آنکھوں کی مناسبت سے پیمانے کی جمع لائی جاتی؟

جواب۔ یہاں دل سے شیشہ کو تشبیہ دی ہے اور آنکھوں سے پیمانہ کو۔ اور تشبیہ میں نقص نہیں ہے۔

مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ آنسو، خون کا قطرہ، اور لہو کا جوہر اور دل خون کا مخزن ہے شاعر کہتا ہے کہ دل سے خون کی بوندیں اس طرح امنڈ کر آنکھوں تک پہنچی ہیں جیسے شراب شیشے سے پیمانہ تک پے در پے پہنچتی ہی رہے۔

۱۳
ٹڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں — لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

۱۳ اعتراض۔ یہ شعر جو کہ یہ منظر پیش کر رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

جواب۔ یہ شعر العشق نار یحرق ماسوی اللہ کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

۱۴
کہتے ہیں کیا ہی مزہ کا ہے فسانہ فانی — آپ کی جان سے دور آپکے مرجانے کا

۱۴ اعتراض۔ مرجانا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو مرجانے کے بعد یعنی فوت ہوجانے کے بعد آپ کی جان سے دور کہنا لغو بات ہے یہ تو اس وقت کہتے ہیں جب کوئی حادثہ وغیرہ ابھی وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ مرجانا اگر عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی آپ کی جان سے دور کہنا بیجا ہے۔ اگرچہ مطلق مرجانا عاشق ہونا کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

جواب۔ مرجانا اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی فوت ہوجانے کے معنی میں اور پھر آپ کی جان سے دور کہنا لغویات نہیں شعر کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

شاعر کہتا ہے کہ وہ محبوب یہ کہتا ہے کہ اے فانی تمہاری جان سے دور تمہارے مرجانے کا کیا پر لطف قصہ ہے۔

جان سے دور محاورہ ہے مخلص دوست کہا کرتے ہیں جو مرجانے کا نام زبان پر لانا برا سمجھتے ہیں۔ جان سے دور اور مرجانے میں لطف آنا۔ یہ دونوں متضاد باتیں لا کر محبوب کے طعن اور کچھ اپنے سے محبت ثابت کرنا مقصود ہے۔ اس لئے یہ محاورہ برمحل اور نہایت لطف ریز ہو گیا۔ مطلق مرجانا عاشق ہونے کے معنی میں آتا ہے دیکھئے فرہنگ آصفیہ۔ اگر اس شعر میں مرجانے سے عاشق ہونے کے معنی مراد لیں تب بھی معنی میں کوئی خرابی نہیں آتی۔

۱۵
یاس ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا — اس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

۱۵ اعتراض۔ بیزار ہونا یعنی ناراض ہونا۔ ملول ہونا۔ ناخوش ہونا۔ یہاں کیا معنی مراد ہیں اور اس کو ہوش سے کیا تعلق ہے قطع نظر اس کے جب مصرع اولیٰ میں ہوش سے بیزار ہونے کی نفی کر دی گئی ہے تو شاعر ہشیار برقرار رہا ہے ایسی صورت میں مصرع ثانی میں یہ کہنا کہ ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا بے معنی ہے۔

جواب۔ یاس اور اس کا مشار الیہ معشوق ہے شاعر اپنی کشمکش کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ یارو عشق میں ہوش سے بیزار ہو کر نبھتی ہے اور نہ بزم معشوق میں ہشیار رہ کر کام چلتا ہے یعنی یہی نہیں کہ غفلت و بے پروائی سے کوئی کام نکلے اور نہ عقل و ہوش سے کام لینے سے کوئی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ عجیب کشمکش ہے مطلب عرض کرنے کے بعد شاید شعر بامعنی ہو گیا ہے۔

۱۶
کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے — یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

۱۶ اعتراض (حصۂ ظرافت کو چھوڑ کر) قطع نظر اس کے قافیہ میں نقطہ بیمار نہیں ہوا جاتا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو یہ درست نہیں اس لئے کہ بیمار ہونا انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔ اور اگر لفظ بیمار سے مجازاً عاشق ہونا مراد ہے تو مصرع ثانی کے یہ معنی ہیں کہ ہم سے عاشق ہوا بھی نہیں جاتا۔

جواب۔ اپنی طرف سے الفاظ کے معنی میں گنجایش پیدا کر کے اعتراض کا موقع نکالنا اور خود اعتراض کرنا اور خوش ہو جانا انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ یعلوم ہوا کہ آپ شعر کا مطلب نہیں سمجھے۔ سنئے۔ وعدۂ پرسش۔ عاشق کی بیمار پرسی کا اقرار کرنا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوست! تم یہ کہتے ہو کہ ہم یہ اقرار نہیں کرتے کہ تمہاری بیمار پرسی کو آئیں گے۔ اچھا نہ کرو ہم سے بھی بیمار نہیں ہوا جاتا۔ (ہم تو قصداً بیمار بن رہے تھے کہ تم ہماری عیادت کو آ گے) یعنی ہم تو تمہارے آنے کے اقرار پر بیمار ہوتے تم اقرار نہیں کرتے ہم بیمار نہیں بنتے تم آنے سے چھوٹے ہم بیمار بننے سے بچے۔

شعر
نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے ۔ ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بیہوش تھا

اعتراض۔ مصرع ثانی میں سوزِ غم کو شعلہ اور پھر شعلہ کو بیہوش کہنا۔
چیل بسولا لے گئی کیسے ہکنگوں راب کے مصداق ہے۔

جواب۔ ایک بہترین اوصاف شعر کا مضحکہ اڑانا انصاف سے بعید ہے۔ شعلۂ بیہوش۔ بے حس شعلہ خاموش شعلہ۔ مطلب یہ ہے کہ بھائیو! میرے خبردار دل نے مجھے معرفتِ الٰہی کی بجلی سے پرنور کر دیا۔ نہیں تو اس سے پہلے میرے غمِ دل کی سوزش بجھی ہوئی آگ کے مثل تھی یعنی میرا دل اول بے نور تھا۔ ایک تھا اب معرفت کی بدولت چمک اٹھا۔

شعر
سرگذشت عمر کہئے اس کو یا رودادِ عشق ۔ دل کے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا

اعتراض۔ سراپا گوش کی جگہ ہمہ تن گوش ہوتا تو بہتر تھا۔ دل کے لب جنبش میں تھے کہنے سے حقیقی معنی میں لبوں کی حرکت ثابت ہوتی ہے مجازی معنی لینے کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے (مثال چھوڑ کر) اگر بات کرنے کو لب تکلم کی جنبش سے تعبیر کیا جاتا تو شعر بامعنی ہوتا۔

جواب۔ سراپا گوش ہمہ تن گوش کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ قول فیصل میں صہبائی سراپا کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

مخفی نماند کہ لفظ سراپا افادہ معنی استیعاب می کند اے از سر تا پا چوں سرا سر لبالب کہ بمعنی ازیں سر تا آں سر۔ ازیں لب تا آں لب گلہ ہے بمعنی ہمہ تن می آید صفحہ ۲۴ مطبوعہ نولکشور۔ دل کے لب۔ دل کو ایک شخص قرار دیا اور لب اس کے لئے لازم تھے۔ اس کا ذکر کیا۔ اس مصرع میں استعارہ بالکنایہ اور استعارہ تخییلیہ ہے علمائے فن بلاغت نے اس کی یہ تعریف لکھی ہے کہ کسی ایک شئے کو کسی شئے کے ساتھ خیال میں تشبیہ دیں اور مشبہ بہ کا ذکر نہ کریں بلکہ صرف مشبہ بہ سے خصوصیت رکھنے والی چیزوں کو مشبہ کے لئے ثابت کریں مثلاً ذوق کا مصرع "قفس میں کیوں کہ نہ پھڑکے دل آشیاں کے لئے" اس میں ظاہر ہے کہ پھڑکنا طائر کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن شاعر نے دل کو اپنے خیال میں طائر سے تشبیہ دی ہے اور ظاہر میں طائرِ دل یا مرغِ دل نہیں کہا بلکہ صرف پھڑکنا ایک ایسا لفظ کہہ دیا جس سے شاعر کا مقصود حاصل ہو گیا بس اس قاعدہ کے مطابق دل کو شخص سے خیال میں تشبیہ دے کر مشبہ بہ کی خصوصیت یعنی لب کہہ دیا جیسا کہ غالب کہتے ہیں۔ ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے ۔ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

ظاہر ہے کہ جس طرح دل لب نہیں رکھتا غالب کے شعر میں خامہ دانت اور ناطقہ سر و گریباں نہیں رکھتا بس معلوم ہوا کہ خامہ اور ناطقہ کو انسان متردد سے تشبیہ دی ہے اور اس کی خصوصیت یعنی انگشت بدنداں اور سر بہ گریباں ہونے کا ذکر کر دیا ہے مطلب شعر جناب فانی یہ ہے کہ یارو! ایک وقت تھا کہ میرے دل کے لب میری عمر کی سرگذشت یا عشق کی داستان کہوں بیان کرتے تھے اور میں مارے شوق کے ہمہ تن گوش بنا ہوا سنتا ہوتا تھا ناظرین انصاف فرمائیں کہ اس حالت میں جناب فانی کا شعر بامعنی ہے یا بے معنی۔

شعر
پی اور وہ پی ازل میں کہ اتری نہ حشر تک ۔ یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا

اعتراض۔ "یادش بخیر" دعا کے طور پر غائب کے حق میں بولا جاتا ہے متوفی کے لئے نہیں چونکہ مصرع ثانی میں "بادہ نوش تھا" کہنے سے بادہ نوش کا متوفی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

جواب۔ معترض صاحب اپنی طرف سے اپنے حسب منشا تشریح کر لیتے ہیں اور اعتراض چسپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یادش بخیر دعا ہی کے طور پر دل کے لئے شاعر نے استعمال کیا ہے اور با موقع استعمال کیا ہے شاعر کب کہتا ہے کہ دل مر گیا ہے وہ تو دل کی حالت بیان کرتا ہے اور دعا دیتا ہے کہ یارو! خدا زندہ رکھے کبھی ہمارا دل بھی عجب شراب کا رسیا تھا اس نے روزِ ازل میں پی اور اتنی پی کہ حشر تک بھی اس کا نشہ نہ اترے یعنی بڑا شرابی تھا۔ اب کہیے

یا دشنِ تخیر با موقع استعمال ہوا ہے یا بے موقع۔

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش ہے

اعتراض۔ بنی کی مناسبت سے مٹی چاہیے۔ مٹ گئی کہنا صحیح نہیں۔ مصرع ثانی میں دو اسم عدد ہے معدود یعنی بوندوں سے بہت دور جا پڑا ہے جس سے خون کا تعدد لازم آتا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ دو خون کی بوندوں کے عوض خون کی دو بوندوں میں کہتا۔

جواب۔ ہستی خود بن گئی کے معنی میں ہے تو مٹی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے دوسرا اعتراض الٹا سمجھا ہے۔ ایسا قاعدہ ہے کہ عدد اور معدود میں واصلہ نہیں ہوتا۔ نظم میں صرف فاصلہ ہی نہیں بلکہ تقدیم تاخیر بھی ہوجاتی ہے دیکھیے شوق

کہیے یہ جب سن لے انساں تو دو کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

یہاں بھی انسان دو میں انسان کا تعدد لازم آتا ہے۔ جس طرح دو خون کا تعدد لازم آتا تھا نظم میں اس طرح ہوا ہی کرتا ہے۔

کیا یہ فانی کر رہا تھا عالم ہستی کی سیر آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

اعتراض۔ بے خودی سے بے خود موہانی، ہوش سے ہوش (غالباً بلگرامی) مراد لیے جائیں تو شعر با معنی اور پر لطف ہوسکتا ہے ورنہ مہمل۔

جواب۔ ایسے اچھے شعر کو مہمل ہی نہیں بلکہ بے خود موہانی اور مخدومی جناب ہوش بلگرامی کے اسما کے ساتھ متصل کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسان دنیا کی کیا سیر اور تماشا کر سکتا ہے کہ بے خودی جس کو سامنے کھینچ رہی ہے کہ ادھر چلا آ۔ اور ہوش پیچھے پڑ کے روکتا تھا کہ ادھر نہ جا۔

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی چاک دامن بھی باندازہ داماں نکلا

اعتراض۔ مصرع اول میں لفظ بھی زاید ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جنون کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی اس کو آزادی کی توقع تھی۔

جواب۔ نہیں! کسی اور چیز سے آزادی کی توقع نہیں تھی بلکہ جنون ہی سے تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ جنون سے توقع آزادی کی تھی اب اس سے بھی نہیں۔ بھی یہاں کلمہ تاکید ہے۔ شمول کے لئے نہیں ہے۔

بجلیاں شاخ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اعتراض۔ شاعر نے دوسرے مصرع کو پہلے کی کیوں علت قرار دی ہے۔ واضح نہیں قطع نظر اس کے بجلیوں کے ساتھ بچھنے کا لفظ استعمال کرنا مضحکہ خیز ہے۔

جواب۔ فرہنگ آصفیہ میں ہے۔ بچھا جانا۔ عجز و انکسار کے مارے زمین میں جھکا جانا اس لیے بجلیاں بچھے جانا بجلیوں کا زمین سے لگ جانا چھوجانا مراد ہے۔ دوسرے مصرع کو اس لئے علت قرار دیا ہے کہ سوختہ ساماں جس کا سب کچھ تباہ ہوچکا ہو اور صرف ایک نشیمن رہ گیا ہو تو بجلیاں اس کے جلا دینے کے واسطے بھی گھونسلا کی شاخ پر ٹوٹی پڑتی ہیں اب علت واضح ہوگئی ہوگی۔

چارہ گر ناصح مشفق دل بے صبر و قرار جو آشنا عشق میں غم خوار وہ نادان نکلا

اعتراض۔ لفظ قرار پر بھی باے قافیہ لانے کی ضرورت ہے دل بے صبر و قرار کہنے سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ قرار دل بے صبر سے جدا ہے۔

جواب۔ لفظ قرار دل بے صبر سے کس طرح جدا ہو سکتا ہے اور نہ احتمال نکل سکتا کہ قرار دل بے صبر سے علیحدہ اس لئے کہ واؤ عاطفہ موجود ہے وہ اس کو کہاں علیحدہ ہونے دے گا حالی کا شعر ہے ملاحظہ فرمائیے۔

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

آپ کے قاعدہ کے رو سے تو یہاں بھی بے بال و بے پر چاہیے حالانکہ نہیں ہے۔

تمام قوت غم صرف دل ہوئی ورنہ زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا

اعتراض۔ موجودہ صورت میں پہلا مصرع دوسرے مصرع کی علت قرار نہیں پا سکتا اگر غم کی جگہ پر دل کا لفظ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ دل غم کی وجہ سے ناتواں ہوگیا ہے ورنہ نالہ و فغاں سے نہ زمین ہوتی نہ آسمان ہوتا۔

جواب۔ اتنی کوشش کے بعد سطحی مطلب اور بالکل پامال مضمون پیدا کیا گیا بغیر اصلاح کے شعر اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ کہتے ہیں یہ وا بڑی خیر گزری میرے غم کی پوری قوت میرے ہی دل پر صرف ہوگئی اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین مانو۔ میرے کثرتِ غم کے بار سے ادھر تو زمین دھنس جاتی اور ادھر آسمان میری آہ کے غم سے یوں تھم نہ سکتا پارہ پارہ ہوکر نہ جانے کہاں نہ جاتا کیونکہ یہ وہی غم ہے جس کے متعلق بلبل شیراز نے کہا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

محمد عبد اللطیف (لکچرار ورنگل کالج)

اورنگ آباد (دکن)

تری ہر صبح پیغامِ حیاتِ تازہ لاتی ہے ۔۔۔ تری ویرانیوں میں زندگانی مسکراتی ہے

نسیمِ جاں فزا چلتی ہے تیرے سبزہ زاروں میں ۔۔۔ شرابِ حسن بل کھاتی ہے تیرے آبشاروں میں

دلوں کو مست کرتی ہیں تری بدمست برساتیں ۔۔۔ فضاؤں میں لٹاتی ہیں جوانی چاندنی راتیں

دکن کی سرزمیں پر موج زن ہے جوئے خوں تیری ۔۔۔ اگلتی ہے ہزاروں لعل خاکِ تیرہ گوں تیری

ترے جگنو گرا دیتے ہیں قیمت ماہ تابوں کی ! ۔۔۔ تری مٹی کے ذروں میں چمک ہے آفتابوں کی

تری پابندگی یوں ہنس رہی ہے انقلابوں پر ۔۔۔ سمندر جیسے ہنستا ہے حقارت سے حبابوں پر

زمانے میں ترے آثار کی توقیر ہوتی ہے ۔۔۔ تری گودی میں اہلِ ہند کی تہذیب سوتی ہے

رہی چشمِ مذاہب تیرے در پہ خوں چکاں برسوں ۔۔۔ رہیں[1] گے دامنِ کہسار پر جن کے نشاں برسوں

ہے تیری وادیوں میں عزمِ خلجی بے قرار اب تک ۔۔۔ فضا میں ہمتِ تغلق کا اڑتا ہے غبار اب تک

زمانہ جانتا ہے، کوہساروں میں ترے اکثر ۔۔۔ ہوا ہے امتحانِ تیزیِ تیغِ ملکِ عنبر

ترے دامن میں عالمگیر میٹھی نیند سوتا ہے ۔۔۔ جلالِ قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے

حصاروں میں تری نکلا نتیجہ سعیِ پیہم کا ۔۔۔ ترے مشرق سے پہلا[2] آفتابِ آصفی چمکا

ترے ہی سازِ پر میں نے سنے نغمے جوانی کے ۔۔۔ ترے ماحول میں سیکھے ہیں گر جادو بیانی کے

تخیل پر مرے منقوش ہے تیری بہار اب تک ۔۔۔ مرے آنسو تری الفت کے ہیں آئینہ دار اب تک

ہواؤں سے پرانی داستانِ راز سنتا ہوں ۔۔۔ میں تنہائی میں تیری رس بھری آواز سنتا ہوں

ترے در پر متاعِ زندگانی چھوڑ آیا ہوں ۔۔۔ وفورِ شوق کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں

سکندر علی وجد
بی اے، ایچ سی ایس

[1] ایلورہ و اجنتا کے غار
[2] آصف جاہ اول نے اورنگ آباد ہی میں خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔

بچوں سے

اس دفعہ ہمارے عنوان پر زیادہ مضمون وصول نہیں ہوئے۔ دیکھیں آئندہ مہینے تم میں سے کتنے بچے اور بچیاں مضمون بھیجتی ہیں۔ مضمون چھوٹا اور اچھا ہو۔

عنوان حیدرآباد کی کوئی تاریخی عمارت

پہیلیوں کے حل کرنے میں یوں تو بہت سے بچوں اور بچیوں نے دلچسپی لی لیکن ہم صرف ان کے نام لکھ رہے ہیں جن کے پانچ سے زیادہ حل صحیح ہیں جن کے نام خط کشیدہ ہیں ان کا لفظوں کا زینہ بھی صحیح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب ننھے بھائیوں اور بہنوں میں غور کرنے کا شوق پیدا ہو چلا ہے۔ اس نمبر میں بھی ہم نے کئی پہیلیاں چھاپی ہیں امید ہے کہ ان کو بھی شوق کے ساتھ حل کیا جائے گا۔

اپریل کی پہیلیوں کے صحیح حل: ا۔ ۱۔ فارس ۲۔ جاپان ۳۔ ترکی ۴۔ روس ۵۔ چین ۶۔ جرمنی ۷۔ فرانس ب ۱۔ جامن ۲۔ چھینکا ۳۔ سوئی تاگا ج ۱۔ پنسل یا قلم ۲۔ مخلوق یا آدمی ۳۔ فکر ۴۔ دھواں ۵۔ انڈا ۶۔ کیچوا د۔ پہلے بکری کو لے جائے گا پھر کتے کو لے جا کر بکری کو واپس لائے گا بکری کو وہاں چھوڑ کر پان کا گٹھا لے جائے گا پھر واپس آکر بکری کو لے جائے گا۔ لفظوں کے زینہ کا حل کئی طرح سے حل کیا گیا ہے۔ بعض بچوں نے بے معنے لفظ بھی لکھے ہیں جس کی وجہ سے ان کا زینہ غلط قرار پایا۔

معین الدین احمد انصاری ۱۶، بشیر محمد عبدالرحمٰن خان ۱۶، زہرہ ہاشم علی ۱۵، سید عالم علی نور تمہ فاہم عالیہ ۱۴، سید عبد الکریم خادم ۱۴۔ محمد عبد الباسط پنجم سٹی کالج ۱۴، سید واحد حسین پنجم سٹی کالج ۱۳، عبدالحکیم متعلم کمر مٹیہ ۱۳، صالحہ سید علی جعفری محبوبیہ ۱۳، تقی حسین خان سید ہفتم سٹی کالج ۱۳، صدیقہ سید یاور حسین ۱۳، محمد احمد اللہ خان محمود ہفتم دارالعلوم ۱۳، حبیب شمس پنجم سٹی کالج ۱۳، ودرراج چہارم سٹی کالج ۱۲، سیدہ خلیل الدین ۱۲، محمود عبدالماجد پربھنی ۱۲، کنیز فاطمہ ذکیہ سلطانہ بشیرآبادی ۱۲، فیروز صدیقی ۱۱، محمد ممتاز الدین خان پنجم سٹی کالج ۱۱، طیبہ محمد علی فاضل ۱۱، رام چندر ریڈی ششم سداسیو پیٹھ ۱۱، رشید احمد علی خان ۱۰، محمد عمر علی شیبانی ششم شاہ گنج ۹، حبیبہ حبیب الرحمٰن ۹، میر بیدار علی، شبلی کرمانی ششم شاہ گنج ۶، مسیح الدین خان اقبال بشیرآباد ۶، خواجہ معین الدین فاروقی سٹی کالج ۶، رقیہ سید مظفر حسین ۱۴، جلال صدیقی ۱۳۔

اب ان پہیلیوں کے حل بھیجیں۔ ا (۱) ادھر چلمن ادھر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے۔ ہاتھ خاں یوں کہیں دو دو انگل سرکے۔
(۲) ایک ہی صورت ایک ہی ذات۔ دونوں کے پاؤں منہ نہ ہات + ایک کا سر ہے آنکھ نہیں۔ ایک کی آنکھ ہے سر نہیں۔ (حبیبہ حبیب الرحمٰن)
ب (۱) گھوڑا اَڑا کیوں۔ پان سڑے کیوں روٹی جلے کیوں (۲) ایک بھائی چڑھتا ایک بھائی اترتا (خواجہ معین الدین فاروقی جماعت پنجم سٹی کالج)
ج (۱) جالا تھا سو جل گیا جلو نہ اس کے تاگو۔ گھر سے لوگ باہر آئے تو کھڑکی سے بھاگو (۲) کالا ہے پر کوا نہیں۔ کمر پتلی ہے پر چیتا نہیں۔ جبڑا لمبا ہے مگر شیر نہیں۔ (افسر بیگم صدیقی متعلم پہلی کمان ہائی اسکول)
د (۱) آگر ہمارے ہاتھ میں ایسی جلی رہی۔ کئی بار وہ گھٹی پا گلی کی گلی رہی
(۲) ظاہر میں ہے سفید تو باطن میں ہے کالی۔ لذت میں گر عجب ہے تو خوشبو میں نرالی (محمد عبدالرزاق طالب علم جماعت ششم الف مدرسہ فوقانیہ نظام آباد)

شعبدے

باکمال تاگا۔ تھوڑے تاگے کو نمک کے پانی میں بھگو کر سکھا لیجئے۔ بعد ازاں اس میں ایک چھلا ڈال کر دوہرا کر لیجئے پھر کسی چیز سے باندھ کر دیاسلائی کو روشن کر کے تاگے کو جلا دیجئے۔ تاگا جل جائے گا مگر چھلا نہیں گرے گا۔

پیاسا گلاس۔ ایک مٹی کی نئی ہنک لے کر اس میں پانی ڈال دیجئے۔ ایک گلاس میں تھوڑا کاغذ روشن کر کے اس ہنک پر الٹ دیجئے۔ پانی گلاس کھینچ لے گا اس طرح پانی ہنک سے غائب ہو جائے گا۔

میر بیدار علی

مجھے سب سے زیادہ کب ہنسی آئی؟

سب ہی بھائی اور بہنوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے یہ سوال دیکھ کر ہی زیادہ ہنسی آئی۔ وجہ یہ ہے کہ جن باتوں پر ہنسی ہوں وہ سب کی سب یکے بعد دیگرے یاد کر کے ہنس رہی ہیں مثلاً کھیلتے ہوئے کسی کے پیر کا پھسل جانا اور دھڑام سے گر پڑنا یا بارش میں کسی کا باہر سے بھیگتے ہوئے گھر آنا اور قمیص نکال کر ہاتھوں میں لئے سکھانے کے لئے ناچتے ہوئے پھرنا الٹے کپڑے پہنے ہوئے دولہا بھائی یا بھائی جان سے مٹھائی طلب کرنا غرض ایسے بیسیوں واقعات ہیں جن پر ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہوتا ہے لیکن ایک وقت لوٹ لوٹ کر ہنسنا پڑا تھا۔ آپ بھی انہیں مگر صرف مسکرا کر خاموش ہو جائیے آپ ہنسنے لگیں تو آپ کے پیٹ میں درد ہوگا میں اس کی ذمہ دار نہیں۔

آپا جان کی شادی میں جو تھی کی تیاری تھی رسم دراصل ہم ہی کو انجام دینی تھی ہم سب بہنیں مختلف ترکیبیں کر رہی تھیں کہ کسی صورت دولہا بھائی کا مذاق اُڑایا جائے ہماری ترکیب کا قصہ یہ تھا کہ ایک پلنگ تاگے سے بُنا جائے اور اس پہ ایک سرخ رنگ کی سوزنی بچھادی جائے چنانچہ اس پر عمل کیا گیا سیتاپھل کا زمانہ تھا جانوں نے سیتاپھل کھا کر اور کچھ ضائع کر کے صحن میں ڈھیر لگا دیئے تھے کمرے کی بڑی دری پہ ایک طرف اپنا بنا ہوا پلنگ بچھا دیا اور پلنگ کے اوپر ایک چاندنی کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ڈوری سے باندھ کر ڈوری اس طرح پلنگ کے نیچے لائی گئی کہ اگر پلنگ پر کچھ وزن ڈالا جائے تو ڈوری کے دبنے سے چاندنی کے ٹکڑے علٰحدہ ہو جائیں اس انتظام کے بعد ہم نے سیتاپھل اور ان چھلکوں وغیرہ کو چاندنی پر نہایت سلیقہ سے جما دیا اور پلنگ پر سوزنی بچھا دی۔

دولہا بھائی آئے اور ان کا پلنگ پر بیٹھنا ہی تھا کہ پلنگ کا آسمان پھٹ گیا اور سیتاپھل کے چھلکوں کی بارش ہوگئی ادھر بارش ہوئی اور بڑی مشکلوں سے پلنگ کی چوریاری سے دولہا میاں نکلے شیروانی اور سیتاپھل کے چھلکوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ہم فرش پہ لوٹتے ہوئے آنسوؤں کو پل دے رہے تھے۔

سعیدہ خلیل الدین

اقوالِ زرّین

(۱) سب سے بڑا بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ .... (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

(۲) جو شخص مجھے میرے عیب بتاتا ہے وہ میرا عزیز ہے۔ .... (حضرت عمر رضی اللہ عنہ)

(۳) تصرف سے علم بڑھتا اور مال گھٹتا ہے۔ .... (حضرت علی کرم اللہ وجہٗ)

(۴) اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عقلمندی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ .... (نپولین اعظم)

(۵) دوسروں کو خوش رکھ کر جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوشی نہیں .... (ملٹن)

(۶) ہر شخص سے محبت کرو مگر ہر ایک پر اعتبار نہ کرو اور کسی کے ساتھ برائی نہ کرو۔ .... (شکسپیر)

مرسلہ معین الدین احمد انصاری

بدگمان بیگم

منظور ——— رحم دل شوہر — ننھا ——— بیگم کا شیر خوار لڑکا
بیگم ——— منظور کی بدگمان بیوی — فہمیدہ ——— بیگم کی ملازمہ

منظور ۔ مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا ہے بیگم بڑے غصہ کی حالت میں داخل ہوتی ہے۔

بیگم نگوڑی کو جا کر دو تین گھنٹے ہو گئے مگر اب تک آنے کا نام نہیں لیتی خدا معلوم کم بخت کے سانپ سونگھ گیا' زمین نگل گئی یا آسمان نے غرق کر گیا کہ اب تک نہیں لوٹی۔

منظور آخر تم نے اسے کہاں بھیجا ہے جو اتنی بک بک لگا رکھی ہے۔

بیگم میں نے اسے بازار بھیجا تھا تاکہ صابون لے آئے اور میں منّے کو حمام کرا سکوں۔

منظور ذرا صبر و تحمل سے کام لو وہ کچھ بھاگی تو نہیں جاتی جو تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔

بیگم بس خاموش رہو جب دیکھو... ایک ادنیٰ ملازمہ کی پشتیبانی کرتے رہتے ہو؟

منظور لو تم تو خفا ہو گئیں' میں نے ذرا سی بات کہی کہ آپ کے غصہ کا پارہ حد سے بڑھ گیا۔

بیگم خیر جانے بھی دو میں ہی قصور وار ہوں' فہمیدہ بالکل بے قصور ہے نا۔

منظور نہیں نہیں قصور اس کا بھی ہے مگر بھئی آدمی بشر ہے' انسان سے تو غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آ جانے پر جو جی چاہے سو کہہ لینا۔

بیگم میں کیوں برا بھلا کہتی' میں اس گھر کی کون ہوں؟ تم نے تو میرا رتبہ نوکروں سے بھی گھٹا دیا۔

منظور آخر تمہیں ہوا کیا ہے جو مجھ سے ہر بات پر الجھا کرتی ہو جب وہ آئے تو اسے خوب گالیاں کہہ سنانا میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہو۔!!!

بیگم میں کون ہوں تمہارے پیچھے پڑنے والی' اور اگر پیچھے پڑوں بھی تو تمہارے آگے بھلا میری کیا دال گل سکتی ہے۔

منظور جو بھی بہتان لگاتی ہو لگا لو مگر میں تو بالکل بے قصور ہوں۔

بیگم ہر ایک الزام تم مجھ ہی پر دھرتے ہو میں نے پہلے سیکڑوں دفعہ کہہ دیا کہ نوکروں کے معاملات میں دخل نہ دو' مگر تم نے میری ایک نہ چلنے دی

منظور اچھی بات ہے اب کی مرتبہ نوکر اپنی مرضی سے رکھنا' اب تو خوش ہو نا

بیگم مگر جب تک فہمیدہ کا نگوڑا منہ کالا نہ ہوگا مجھ پر اس گھر کا کھانا حرام ہے

منظور مگر کسی کو ذرا سی بات پر نوکری سے علٰحدہ کر دینا کہاں کا انصاف ہے

بیگم انصاف ہو یا نا انصافی مگر میں تو اپنی بات سے نہ ٹلوں گی۔ ایک دفعہ خاموش دو دفعہ خاموش ہو گئی تو اس نے نوکری کو ایک مذاق سمجھ رکھا ہے ہمارے پاس اس کی گذر ہو رہی ہے اگر دوسری جگہ ہو تو ایک دن بھی کوئی گھڑی بھر کے لئے پانی بھی نہ پینے دے۔

منظور خیر اب کی بار اسے معاف کر دو پھر کبھی قصور کرے گی تو اسے نکال دیں گے

بیگم نہیں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا تمہیں نے تو نوکروں کو اپنے سر پر چڑھا لیا ہے۔ ورنہ ایک دو ٹکوں کی ملازمہ کی مجال اتنی ہو سکتی ہے۔؟

منظور آ جانے پر اسے نوکری سے علٰحدہ کئے دیتا ہوں۔

بیگم یاد رکھو اسے تنخواہ کا بقایا نہ دینا ورنہ میں اسے کھرا کھرا جواب سناتی ہوں

منظور اتنا بھی غضب نہ کرو۔ ایک تو یہ کہ اس کو تھوڑے سے قصور پر برطرف کر رہی ہو دوسرے یہ کہ بغیر تنخواہ کے۔

بیگم یہ سزائیں بھی اس کے لئے کم ہیں۔

منظور تو کیا اس نے اتنے دن محنت نہیں کی جو تم اسے تنخواہ بھی نہیں دینا چاہتیں

سب رس
اگر انیلہ ہے تو میں اپنے پاس سے دے کر اندر آنے سے پہلے ہی جواب دے دیتا ہوں۔

بیگم اچھا تو لاؤ تنخواہ مجھے ہمارے دو میں ہی دوں گی۔

منظور (روپیئے دیتے ہوئے) لو اس کی باقی تنخواہ اور مہربانی فرما کر اسے غریب کو سخت سست مت کہو۔

(فہمیدہ حیران و پریشان گھر میں داخل ہوتی ہے)

بیگم اری او کمبخت اتنی دیر کہاں مر گئی تھی۔؟

فہمیدہ بیوی کیا بیان کروں، کچھ کہا نہیں جاتا۔ جب میں بازار جا رہی تھی تو ایک گاڑی بان موا اپنی گاڑی دوڑاتا ہوا مجھ پر لایا۔ پریشانی میں میاں تو کے پیسے کہیں گم گئے، اور میری جان مشکل بچی۔

بیگم پھر اتنی دیر کہاں غائب رہی؟

فہمیدہ پیسے ڈھونڈ رہی تھی، آخر کار کہیں نہ ملے تو ڈرتی ڈرتی آئی ہوں۔

بیگم خدا حافظ اب تم نوکری سے برطرف کی جاتی ہو۔

فہمیدہ میرا قصور معاف کیجئے۔

بیگم نہیں نہیں تیرا قصور قابل معافی نہیں۔

فہمیدہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔

بیگم میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ تم نوکری سے برطرف کی جاتی ہو بس؟

فہمیدہ اب کے اگر میں ایسا کروں تو آپ کی جوتی اور میرا سر۔

بیگم (فہمیدہ کو روپئے دیتے ہوئے) چلی جاؤ یہاں سے مجھے سست کاہل اور مکار ملازمہ نہیں چاہیئے۔

فہمیدہ (روتے ہوئے) اب میں کہاں جاؤں گی، مجھے کون نوکر رکھے گا، مجھے کون پہچانتا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔

بیگم میں نے تجھ سے ایک چھوڑ دو دفعہ کہہ دیا کہ تو نوکری سے برطرف کی جاتی تو پھر بھی میرا دماغ چاٹ جاتی ہے۔ چلی جا یہاں سے ورنہ گردن میں ہاتھ دے کر بڑی بےعزتی کے ساتھ نکلواتی ہوں۔

(فہمیدہ کا روتے ہوئے اپنا سامان لے کر چلا جانا)

منظور۔ شاید اب تمھیں خوشی ہوئی ہوگی اور اب کھانا کھاؤ گی ——!!!

بیگم ہاں میں آج بہت خوش ہوں اور آج ضرورت سے زیادہ کھانا کھاؤں گی

پردہ گرتا ہے

محمد کمال خاں متعلم جماعت ہشتم مدرسہ عالیہ

چھٹی کا دن

یاں چھٹی کے دن کھیلتے ہیں ہم پیپل کے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے
جب آ جاتے ہیں بھائی ذکی اور ہمسائے کے بچے بھی
بس مچ جاتی ہے اودھم سی ہاں پیپل کے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے
ہم کودتے ہیں اور بھاگتے ہیں ننھی کے پینجن باجتے ہیں
جب اس کو لے کر ناچتے ہیں ہم پیپل کے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے اس پیڑ تلے

لطیف النساء بیگم (بی۔اے)

جادو کا محل

بہت زمانے کا ذکر ہے کہ کسی شہر کے بادشاہ کو سیر وسیاحت کا بہت شوق تھا۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دور دور تک سفر کرتا .... ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بہت دور کے سفر پر گیا۔ راستے میں ایک بڑا گھنا جنگل نظر آیا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اس جنگل میں شکار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگ راضی ہو گئے۔ یہ جنگل بہت گھنا اور خوفناک تھا۔ سارا دن چلنے پر بھی ختم نہ ہوا جب سورج غروب ہو رہا تھا تو انھیں اس جنگل میں ایک عالی شان محل نظر آیا جسے دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے کہ ایسے ویران جنگل میں اتنا عالی شان محل کس کا ہوگا۔ اس میں کوئی آدمی نہ تھا۔ محل کے دروازہ نہ تھا بلکہ محل کی دیوار توڑ کر اندر جانے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ بادشاہ اور اس کے ساتھی اندر گھس گئے۔ محل سجا سجایا اور ہر طرح کے سامان سے آراستہ تھا۔ کھانے پینے کی سب چیزیں موجود تھیں۔ مگر کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ بادشاہ اور اس کے ساتھی بہت تھکے ہوئے تھے سب کھانے کے گرد بیٹھ گئے اور چاہتے تھے کہ کھانا شروع کریں۔ اتنے میں کسی ساتھی کی نظر راستے پر پڑی وہ چیخ اٹھا کہ دوڑو دیواریں آپس میں مل رہی ہیں۔ سب ساتھیوں کی نظریں اس طرف اٹھیں تو دیکھا کہ جس راستے سے وہ آئے تھے وہ آہستہ آہستہ بند ہوا جا رہا ہے۔ سب دوڑنے لگے مگر باہر نکلنے سے پہلے راستہ بند ہو چکا تھا دونوں دیواریں آپس میں مل گئی تھیں ان کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ دیواریں چن دی گئی ہیں اب وہ سب گھبرا گئے اور راستہ تلاش کرنے لگے۔ راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ ایک شخص نمودار ہوا جو لباس سے غلام معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی ۔ اور سب نے مل کر اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور اس ویرانے میں یہ کس کا محل ہے۔ یہ راستہ کیونکر بند ہو گیا مگر اس شخص نے کسی سے کچھ نہ کہا اور پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے آگے جانے لگا اب سب کے سب اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ انھیں لئے ہوئے اندھیرے تہ خانہ میں اترا اور اسی اندھیرے میں بہت دور چلنے کے بعد ایک جگہ روشنی نظر آئی یہ سب لوگ اسی طرف چل پڑے۔ یہاں پر دروازہ کھلا سامنے ایک نہایت سرسبز وشاداب باغ دکھائی دیا جس میں ہر طرف نہریں جاری تھیں اور حوض میں قسم قسم کی مچھلیاں اور فوارے تھے۔ بیچ میں ایک خوشنما تخت سونے اور جواہرات سے سجا ہوا تھا اس پر ایک خوبصورت ملکہ بیٹھی ہوئی تھی وہ شخص جو بادشاہ کو مع ساتھیوں کے گرفتار کر کے لایا تھا ملکہ کے سامنے جھک کر آداب بجالایا اور کہا حضور قیدی حاضر ہیں۔ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ملکہ نے مسکرایا بادشاہ کو قیدی کا لفظ سن کر بڑا غصہ آیا۔ اس نے کڑک کر غلام سے کہا اے شخص منہ سنبھال کر بات کر کس جرم میں ہم کو قیدی بتلاتا ہے۔ ملکہ نے بات کاٹ کر کہا اے بادشاہ جب تم میرے محل میں گرفتار ہو کر آئے ہو تو قیدی نہیں تو پھر کیا ہو۔ بادشاہ نے کہا اے مغرور ملکہ تو نے ہمیں بلا وجہ کس لئے گرفتار کیا۔ ملکہ نے جواب دیا تمھیں قتل کرنے کے لئے۔ بادشاہ نے کہا او بے رحم ملکہ آخر کس جرم میں تو ہمیں قتل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ میرے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے اور تیری رعیت سے لینے کی خاطر۔ یہ دشمنی میرے اور تیرے باپ میں چلی آتی ہے میرے باپ کی سلطنت میں تیرے باپ نے بغاوت کرائی اور تمام رعیت تیرے باپ کی طرف ہو گئی آخر کار میرے باپ کو شکست ہوئی۔ اور وہ تیرے باپ کے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے قتل ہوا میری ماں اس صدمہ کی تاب نہ لا کر چھ ماہ بعد مر گئی۔ اور مجھے وصیت کر گئی کہ اگر میں زندہ ہوں تو باپ کے خون کا بدلہ تیرے باپ اور اس کی رعیت سے لوں۔ ایک سال کے اندر ہی اندر تیرا باپ بھی مر گیا اور مجھے اس سے بدلہ لینے کا موقع نہ ملا۔ اس کی جگہ تو بادشاہ بنا تو میں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے اور تیری رعایا سے لوں گی بہت مدت سے تیرا انتظار تھا مگر تو نہ آیا۔ اب تو میرے پنجہ میں گرفتار ہو گیا ہے میری ماں کی وصیت کے مطابق تو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ میرا باپ تیرے باپ کے ہاتھ سے

قتل ہوا۔ بادشاہ نے کہا یہ تو کہو کہ ہمارے داخل ہوتے ہی محل کی دیواریں لگ گئیں اس میں کیا راز تھا۔ ملکہ نے ہنس کر کہا۔ جب میرا باپ قتل ہوگیا اور رعیت باغی ہوگئی تو میرے پاس نہ فوج تھی نہ طاقت کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے لے سکوں۔ اس لئے میں نے اپنی ماں کے بوڑھے استاد سے جو جادو کا عمل جانتا ہے مدد مانگی اور خواہش ظاہر کی کہ جادو کے زور سے کوئی ایسا جال پھیلایا جائے جس سے دشمن میرے قبضہ میں آسکے اور میں اس سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے سکوں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر میں لڑنے آتی تو تیری فوج مجھے مار ڈالتی یا زندہ گرفتار کرلیتی اب تو میرے قبضہ میں ہے اور قتل کیا جائے گا یہ سن کر بادشاہ کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ہمت کرکے کہا دھوکہ دے کر قتل کرنا بزدلی ہے۔ اگر ہمت ہے تو مقابلہ کر۔ ملکہ نے کہا دھوکے ہی سے سہی مگر مجھے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اب بادشاہ منت وسماجت کرنے لگا۔ کہ ملکہ رحم کر کسی کی جان لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ میرا خون بہانے سے تیرا باپ زندہ تو نہیں ہوسکتا۔ میں اس کے معاوضہ میں تجھ کو اس ملک کی ملکہ بنادوں گا۔ میری رعایا تیری رعایا ہوگی۔ ملکہ نے کہا مجھے تخت وتاج کی خواہش نہیں اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے یہ سچ ہے کہ تیری جان لینے سے میرا باپ زندہ تو نہ ہوگا مگر اس سے میرے انتقام کی آگ تو بجھے گی اور میں اپنی ماں کی وصیت پوری کرسکوں گی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ یہ ضدی عورت کسی طرح ماننے والی نہیں اور جان لے کر ٹلے گی تو اس نے کہا اچھا اگر ایسا ہی ہے تو کیا میرے قتل ہونے کے بعد یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ملکہ نے کہا نہیں بلکہ یہ اپنے بنانے والے کے قتل ہونے پر ٹوٹ جائے گا۔ بادشاہ چونکا اور کہا وہ شخص کون ہے اور کہاں ہے ملکہ اس سوال سے چونک گئی اور کہا کہ اس کا بنانے والا میری ماں کا بوڑھا استاد ہے جس کا پتہ تمھیں نہیں بتلایا جائے گا بادشاہ نے کہا خیر یہ تو بتاؤ کہ یہاں سے نکل جانے کا کوئی راستہ اور بھی ہے یا نہیں۔ ملکہ نے جواب دیا بھاگ کر نکلنے کی کوشش نہ کر یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ خیر جب تو میری جان ہی لینے پر تلی ہوئی ہے تو اتنا تو بتا کہ کیا میرے قتل کردینے کے بعد یہ طلسم توڑ دیا جائے گا ملکہ نے کہا نہیں جب تک تیری رعیت کا ایک شخص بھی زندہ رہے گا اس وقت تک طلسم نہ توڑا جائے گا اور ہر شخص کو اس طلسم میں موت کے گھاٹ اتارا جائے گا بادشاہ نے دل میں کہا۔ اُف ایک انسان کی جان کے بدلے لاکھوں بندگان خدا کا خون کیا جائے گا۔ یہ سوچ کر گہری فکر میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا اے ملکہ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے چند دن کی مہلت دی جائے تاکہ عاقبت کا کچھ توشہ ساتھ لے لوں ملکہ نے کہا ناممکن آج کی مہلت غنیمت سمجھ کل صبح تو قتل کردیا جائے گا۔ اب بادشاہ بالکل مایوس ہوگیا اور وہیں باغ میں ایک درخت کے نیچے گہری سوچ میں بیٹھ گیا۔ اسی حالت میں رات ہوگئی۔ ملکہ محل میں چلی گئی۔ مگر بادشاہ وہاں سے ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ملکہ نے کھانا بھجوایا اس نے کھانے سے انکار کردیا۔ اس کے ساتھی چونکہ بہت تھکے ماندے اور بھوکے تھے اس لئے انھوں نے کھانا کھایا۔ اور مزے سے سو گئے۔ مگر بادشاہ کو نیند نہ آئی وہ بے قرار ہوکر ٹہلنے لگا۔ بہت رات گئے تک وہ یوں ہی ٹہلتا رہا۔ قریب آدھی رات کے چاند کی ہلکی روشنی میں ایک سایہ اس کی طرف آتا دکھائی دیا تو بادشاہ ایک پاس کے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سایہ اس کی طرف سے ہوکر نکل گیا وہ ایک عورت کا سایہ تھا اس نے سوچا اس آدھی رات میں یہ کون عورت یہاں چلی آئی ہوگی چل کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ کون ہے اور کہاں جاتی ہے یہ سوچ کر تلوار کمر سے کھولی اور اس کے پیچھے پیچھے تھوڑے فاصلے سے ساتھ ہولیا۔ یہ سایہ بہت دور کا چکر کاٹ کر ایک گھاٹی پہ پہونچا اور وہاں سے نیچے اتر کر ایک پہاڑی کے نیچے داخل ہوگیا۔ بادشاہ بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہوا اور چٹانوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ یہ ملکہ تھی اس کو دیکھ کر ایک بوڑھا شخص عصا ہاتھ میں لئے سامنے آیا اور کہا۔ ملکہ اتنی رات گئے تم نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں اٹھائی۔ ملکہ نے جواب دیا۔ قابل احترام بزرگ جس شخص کا مجھے انتظار تھا وہ گرفتار ہوگیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کل قتل کردیا جائے۔ میں نے اتنی رات گئے آنے کی اس لئے تکلیف اٹھائی کہ وہ شخص طلسم توڑنے کی کوشش میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کا پتہ لگالے اور نصیب دشمناں کچھ نقصان

نہ پہنچا دے۔ جادوگر نے کہا۔ تو کیا اس کو طلسم توڑنے کا ذریعہ معلوم ہو گیا ملکہ نے کہا ہاں اس نے کچھ اس طرح سے پوچھا کہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ جادوگر نے کہا کہ یہ تم نے برا کیا خیر اس کو میری قیام گاہ کا بھی پتہ معلوم ہو گیا۔ ملکہ نے کہا یہ میں نے نہیں بتلایا۔ جادوگر نے کہا کہ یہ تم نے اچھا کیا کہ پتہ نہیں بتلایا اگر وہ میرا پتہ لگا بھی لے اور مجھے قتل بھی کر دے تو اس طلسم کو نہیں توڑ سکتا جب تک وہ طلسمی انگشتری حاصل نہ کر لے وہ میرے قتل کے بعد دوسرے طلسم میں جائے گا اور جلد موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ ملکہ نے کہا طلسمی انگشتری کیسی ہے اور کہاں ہے۔ وہ کس طرح دستیاب ہو سکتی ہے یہ راز تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا جادوگر نے ہنس کر کہا کہ میں تمہیں بتانا ضروری نہ سمجھا میرے قتل پر یہ پہاڑ اور گھاٹیاں سب غائب ہو جائیں گی۔ اور میرا خون بہنے سے یہاں ایک وسیع سمندر لہریں مارنے لگے گا۔ اور میرا قاتل اس میں غوطے کھانے لگے گا اس سمندر میں بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ ہوں گی اگر وہ باہمت شخص ہو گا تو ان سب کا مقابلہ کرتا ہوا اس کے کنارے پہنچ جائے گا ورنہ لقمۂ اجل ہو جائے گا جب وہ سب آفات سے بچ کر سمندر پار کرے گا تو اس کو ایک بہت بڑی چٹان ملے گی وہ اس کا جگر کاٹ کر اس کے اوپر پہنچ جائے تو اس کے ڈھلوان میں گھاٹی نظر آئے گی اس گھاٹی میں ایک ہموار جگہ ایک گنبد ہو گا۔ اس گنبد کے کلس پر ایک چڑیا ہو گی جس کے سینے میں وہ جادو کی انگوٹھی محفوظ ہے۔ جب وہ گنبد میں داخل ہو گا تو اس کو وہاں تین تیر اور ایک کمان ملیں گی۔ اگر وہ ان کو لے کر اس چڑیا کو مار دے گا اور اس کا سینہ چاک کر کے انگشتری حاصل کر لے گا تو طلسم اس کے ہاتھ میں آجائے گا تم اطمینان رکھو اگر وہ میرا پتہ لگا کر مجھے قتل بھی کر دے تو وہ سمندر کی مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اگر اس سے بھی بچ کر سمندر کے کنارے پہنچ گیا تو بھی ناواقفیت کی وجہ سے وہ چٹانوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا بھوکا پیاسا مر جائے گا۔ مگر طلسم نہ توڑ سکے گا۔ یہ باتیں کر کے ملکہ گھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ جادوگر اس کو چھوڑنے پہاڑ کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ بادشاہ نے یہ تمام قصہ سن لیا۔ اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آج ضرور اس جادوگر کو قتل کر کے جادو کی انگوٹھی حاصل کر لوں گا۔ اور ہزاروں بندگان خدا کی جانیں بچاؤں گا۔ یہ سوچ کر تلوار سنبھالے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں جادوگر واپس آیا۔ اور اپنے مقام پر سو گیا جب اس کے خراٹوں کی آواز آئی تو بادشاہ تلوار لے کر آگے بڑھا اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے قتل کے ساتھ ہی زمین لرزنے لگی اور پہاڑ وغیرہ سب غائب ہو گئے اور اس جگہ ایک وسیع سمندر لہریں مارنے لگا جادوگر کی لاش اس میں بہ گئی اور بادشاہ اس میں غوطے کھانے لگا۔ مگر ہمت کر کے آگے بڑھا بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ منہ کھولے اس کو نگلنے آگے بڑھیں مگر وہ تلوار سے ان کا خاتمہ کر دیا مردانہ وار آگے بڑھتا گیا اور آخر کار سمندر پار کر لیا اور جیسا کہ جادوگر نے کہا تھا اسی طرح چٹان کاٹ کر اس پر پہنچ گیا اور گھاٹی میں اترتے ہی گنبد نظر آیا جس کے کلس پر چڑیا بیٹھی تھی۔ وہ گنبد کے اندر گھسا وہاں اس کو تین تیر اور ایک کمان ملی۔ ان کو لے کر باہر نکلا اور تیر کمان میں لے کر نشانہ تاک کر مارا پہلا وار خالی گیا اسی طرح دوسرا وار بھی خالی گیا تیسرا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور چڑیا پھڑک کر زمین پر آ گری چڑیا کے گرتے ہی گنبد وغیرہ سب غائب ہو گئے سارا طلسم ہلنے لگا اور غضب کا اندھیرا سارے طلسم پر چھا گیا۔ ملکہ کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ نے چڑیا کا سینہ چاک کر کے انگوٹھی نکال لی۔ اس سمندر کا چلو بھر پانی لے کر اس میں انگوٹھی ڈبو کر وہ پانی سمندر پر چھڑکا سمندر غائب ہو کر راستہ صاف ہو گیا۔ ملکہ شیرنی کی طرح گرجتی ہوئی آئی اور بادشاہ پر حملہ کیا۔ بادشاہ نے ملکہ کو قتل کر دیا چونکہ راستہ طلسم کی وجہ سے بہت دور ہو گیا تھا اس لیے سیدھا جلد قدم بڑھاتا ہوا محل کو آیا اور انگوٹھی پانی میں گھول کر محل کی دیواروں پر چھڑکنے لگا جس سے جادو کا محل غائب ہو گیا اور راستہ بالکل صاف ہو گیا بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے ملک کو واپس آ گیا۔

اشرف ہادی علی (محبوبیہ گرلز اسکول)

بچپن کی ایک خطرناک تفریح

انسانی زندگی میں بعض ایسے لمحے گزرتے ہیں جن کی یاد کبھی دل سے بھلائی نہیں جا سکتی ایسا ہی ایک لمحہ وہ تھا جب میں اپنے دو بھائیوں اور ایک بہن کے ساتھ ایک ایسے ٹرالی کے ڈبہ میں سوار تھی جو اپنی پوری تیزی کے ساتھ ہمارے قابو اور اختیار سے باہر ان ڈھلوان پٹڑیوں پر گذر رہا تھا جو ایک پہاڑ سے اس کے دامن کی نشیبی سطح تک تعمیر کا سامان لانے لے جانے کے لئے بنائی گئی تھیں ہم نے اس سفر کو اپنے طفلانہ زعم میں تفریح کے تصور میں اختیار کیا تھا لیکن اس کے اندر جو خطرات پوشیدہ تھے اس کا احساس اُس وقت ہوا جب ان ٹرالی کے ڈبوں نے اپنی تیز رفتاری اور ہماری بے اختیاری ہم پر ظاہر کر دی۔

واقعہ یہ ہے کہ نظام ساگر کی تعمیر جب قریب الختم تھی ہم ایک ایسے سفال پوش مکان میں رہتے تھے جو بزمانہ تعمیر عہدہ داران مال کی سکونت گاہ ہونے کی یادگار ہیں اب مسافر بنگلہ گولکنڈہ کے نام سے مشہور ہے ساگر منظر کی پہاڑی اور کٹے کے دامن میں یہ مکان ہماری تفریح کے لئے وسیع میدان رکھتا تھا اُس وقت ہمارا کام پڑھنا لکھنا اور صبح شام نظام ساگر کی تفریح کرنا تھا نہ گوشے پردہ کی بندشیں تھیں اور نہ سواری کی محتاجی جو کوئی نظام ساگر دیکھنے آتا چاہے مرد ہو یا عورت اُس کے ساتھ نظام ساگر دیکھتے صبح شام ہر مہمان کے ہمراہ دور دور تک جا کر دیکھتے مگر کبھی جی بھرتا تھا اور نہ کبھی اکتاتے ہماری یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ روزانہ شام ساگر منظر جاتے جو زیر تعمیر تھا اور ہمارے مکان سے بہت قریب۔ اس وقت سامانِ تعمیر فراہم کرنے کے لئے ٹرالی ہی چلا کرتی تھی جو ہمارے مکان اور ساگر منظر کے درمیان سے گزرتی تھی شام میں جب کام بند ہو جاتا تمام ڈبے مکان کے پیچھے ہی ٹھیرا کرتے۔ ان ڈبوں کو دیکھ کر ہر وقت میرے بھائی رشید اصرار کرتے کہ تھوڑی دور ان میں بیٹھ کر پٹڑیوں پر پھسلیں چونکہ ہماری تفریح ہمارے ایک بزرگ استاد کے ساتھ ہوتی اس لئے ان کی موجودگی میں ایسی جرأت کا اظہار کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے سوچا کہ استاد صاحب کی رکاوٹ کو دور کرنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ واپسی میں ذرا تیز چل کر اُن سے علحدہ ہو جائیں یہ چال کامیاب بھی ہو گئی مغرب کا وقت تھا ہم ساگر منظر سے اتر کر استاد صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے چونکہ ہمیں سیدھے راستے سے جانے کی عادت نہ تھی پتھروں اور جھاڑیوں میں سے چلنے میں زیادہ لطف آتا تھا اس لئے ہمیں جھاڑیوں میں چھپ کر استاد صاحب کو دھوکا دینے کا بہت ہی اچھا موقعہ ہاتھ آیا تھوڑی دیر کے بعد ہم کمین گاہ سے نکل کر اُن بار برداری کے ڈبوں کے پاس پہنچے۔ ایک ڈبہ میں عالیہ کو سوار کر کے میں نے ڈھکیلنا شروع کیا دوسرے ڈبہ میں رشید نے قیوم کو بٹھلایا اور اس کو حرکت دینے لگے تھوڑی دیر ڈھکیلنے کے بعد ہم نے ایسا محسوس کیا کہ ڈبے ہماری مدد کے بغیر چل رہے ہیں اب ہم اپنے اپنے ڈبوں میں چڑھ گئے جوں ہی ہم نے ڈبوں میں قدم رکھا اُن کی رفتار تیز ہونے لگی ڈبے زور سے چلنے لگے ہم ان کے کنارے پکڑے ہوئے تھے پٹڑیاں کچھ ایسی بے تکی تھیں کہ خدا کی پناہ دونوں جانب بڑے بڑے غار اتار اور اتار پر موڑ دونوں غاروں کے بیچ سے گزر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پل صراط پر سے جا رہے ہیں خوف کے مارے منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی اور رات کی تاریکی میں دم بدم اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا کہ اندیشہ بات اور

استادصاحب کی آوازوں سے دل ہلے جاتے تھے افسوس تو یہ تھا کہ جواب بھی نہ دے سکتے اور اُن پر ظاہر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہیں بدحواس بے دست و پا ڈبوں پر کھڑے چلے جارہے تھے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی گو استادصاحب کی آواز سے کانپ رہے تھے مگر جواب نہیں دے سکتے تھے یہ خوف الگ دامنگیر تھا کہ اب اُن کے سامنے کیسے جائیں اور کیونکر منہ دکھلائیں۔

استادصاحب قبلہ گھبرائے ہوئے مکان تشریف لے گئے۔ چپراسیوں کو قندیلوں کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ ہم کو ڈھونڈھ نکالیں وہ لوگ ساگر منظر کی طرف چلے گئے اس وقت اندھیرا کافی ہوچکا تھا جب ہماری ڈھونڈھ شروع ہوئی ہم ٹرالی میں ایسے سہمے ہوئے چلے جارہے تھے گویا سانپ چھو گیا ہے ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت نہ تھی کوئی دو تین فرلانگ جانے کے بعد پٹڑیوں اور سڑک میں کراس تھا اس کی وجہ سے پٹڑیاں کچھ سڑک میں دبی ہوئی تھیں وہاں آکر ہمارا ڈبہ کچھ آہستہ ہوا ساتھ ہی میں کود گئی اور ڈبے کو تھام لیا اور عالیہ کو نیچے لے لیا۔ سڑک کے بازو چھوٹے چھوٹے پتھر چوتروں کی شکل میں جمے ہوئے تھے اس پر کودنے سے تھوڑی ہی چوٹ بھی آئی مگر یہاں احساس کس کو تھا۔ رشید کا ڈبہ ذرا پیچھے تھا انھوں نے آواز دی کہ پٹڑیوں پر پتھر رکھ دوں کہ رکاوٹ ہوجائے گر میں یہ تمیز نہ کرسکی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں گو آواز آرہی تھی۔ تاہم جب وہ ڈبہ قریب آگیا تو میں نے اور عالیہ نے پوری طاقت سے پکڑکر اسے روک لیا۔ وہ دونوں بھی اتر گئے اور ان ڈبوں کو چھوڑدیا وہ پھر حرکت کرنے لگے نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

ہم نے سیدھا گھر کا رُخ کیا دل میں ایک گھبراہٹ تھی کہ نہ جانے کس کس کے عتاب کا سامنا ہو۔ ابا کے خوف سے دم نکلا جاتا تھا اور استادصاحب قبلہ کا غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ الگ آنکھوں میں پھر رہا تھا راستہ میں بہت سے گڑھوں کانٹوں اور حصار کے تاروں کا سامنا کرنا پڑا بالاخر باورچی خانہ کے دروازے سے مکان میں داخل ہوئے غصہ سے بچنے کی ترکیب یہ سوجھی کہ کتابیں لے کر سبق یاد کرنے لگے سبق یاد کرکے کچھ کھالیا۔ کھانا کس سے جاتا تھا مگر مصلحت وقت یہی تھی کہ ہو سکے تو سوئیں کیونکہ جانتے تھے کہ دوسری صورت میں ابا کھانے کے لئے اٹھوائیں گے اور اس وقت استادصاحب قبلہ اور ابا کا سامنا کرنا ہوگا اور اس خیال سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔

ہمارے استادصاحب کا یہ اصول تھا کہ شاگرد کا کیسا ہی قصور ہو مگر سبق اچھا یاد ہو تو وہ برداشت کرلیتے اور اگر سبق میں ذراسی غلطی بھی ہو تو پھر بہت خفا ہوتے ہم نے صبح چھ بجے ناشتہ سے قبل ہی جاکر سبق سنا دیا مگر رشید کو شاید دہشت اور پریشانی سے بخار آگیا تھا استادصاحب قبلہ نے صرف اس قدر فرمایا کہ "آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا یہ پہلی غلطی ہے اگر سبق میں ذرا بھی غلطی ہوتی اور رشید کو بخار نہ آتا تو تم لوگوں کی خیر نہ تھی"

اس کے بعد ہم کو کبھی ان ڈبوں میں بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی اور اب جب کبھی اُن پٹڑیوں کا پل صراط یاد آتا ہے تو وہی منظر آنکھوں میں پھرجاتا ہے وہی خوف دل پر طاری ہوجاتا ہے۔

رضیہ زین العابدین

مفید باتیں

انسان کو مصیبت میں صبر کرنا چاہیئے نہ کہ غم صبر سے قدرتی مسرت اور غم سے دلی تکلیف حاصل ہوتی ہے

دنیا میں انسان کو اپنا اعتبار نہ کھونا چاہیئے اگر کھو دے تو ماں باپ کے کھونے کے برابر ہے۔

محمد عبدالحکیم قریشی متعلم (مدرسہ)

زمین کی شکل

زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور جو ہم کو چپٹی نظر آتی ہے اصل میں نارنگی کے مانند گول ہے یہ سُن کر شاید تم کو تعجب ہوگا کہ زمین جس پر عالی شان عمارتیں بنی ہوئی ہیں جس پر امیروں کے بڑے بڑے محل اور حویلیاں اور غریبوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات اور جھونپڑیاں کھڑی ہیں اور جس پر اونچے اونچے پہاڑ گہرے سمندر اور بڑی بڑی ندیاں ہیں کیونکر گول ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ تمھیں یہ خیال پیدا ہو کہ ایسی زمین جس پر بڑے بڑے شہر ہیں جن میں کھیل کے بڑے بڑے میدان ہیں جہاں سیکڑوں بچے روزانہ کرکٹ فٹ بال کھیلتے ہیں جس کی سڑکوں پر ہزاروں قسم کی سواریاں چلتی ہیں اور شہروں کے ایک کونے سے دوسرے کونے کو پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی زمین ہرگز گول نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی خیال پرانے زمانے میں لوگوں کا تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اس چپٹی زمین کا کہیں نہ کہیں سرا ضرور ہونا چاہیئے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اس فکر میں چند بہادر ملاح اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھ کر اس کے سرے کی تلاش میں ایک ہی رُخ پر ناک کی سیدھ سے روانہ ہوئے۔ تم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی کشتیاں آج کل کے جہازوں کے مانند آگ اور پانی کے ذریعے نہیں چلتی تھیں وہ کشتیاں بہت چھوٹی تھیں جو بادبان یعنی پردوں کے ذریعے ہوا کے زور پر چلتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ بہت آہستہ آہستہ چلتیں اور جو فاصلہ کہ آج کل کے جہاز پندرہ دن میں طے کرتے ہیں وہ کشتیاں چھ مہینے میں بھی نہیں طے کر سکتی تھیں۔ ایسی ہی کشتیوں میں بیٹھ کر وہ ملاح اپنی کشتیوں کا رُخ ایک ہی سمت میں رکھ کر زمین کے سرے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اُن کی جانیں کس قدر خطرے میں تھیں؟ بہر حال وہ روانہ ہوئے۔ ایک مہینہ گذرا دو مہینے گذر گئے لیکن زمین کے سرے کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ وہ اور آگے بڑھے چھ مہینے گذر گئے سال بھر ہو گیا پر ان کو زمین کا سرا نظر نہیں آیا۔ ایک طرف طوفان کا یہ زور کہ سمندر کی موجیں ایک ایک میل اوپر اٹھتی اور بیٹھتی تھیں ان کے ساتھ ان کشتیوں کا بھی یہی حال ہوتا تھا اور دوسری طرف ہوا کہتی تھی کہ میں ہوں۔ ان ملاحوں کو ہر منٹ یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں ان کی کشتیاں اُلٹ نہ جائیں لیکن ان دھن کے پکے ملاحوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور اسی خیال میں کہ زمین کا سرا اب بہت نزدیک ہے آگے بڑھتے گئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سفر میں اُن کی کشتیوں کا رُخ ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہا۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ جہاں سے چلے تھے آخر میں پھر وہیں پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر زمین چپٹی ہے تو کہیں نہ کہیں اس کا سرا ملنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے ایک ہی سمت میں سفر کرنے پر بھی وہ اسی مقام پر پہنچے جہاں سے کہ روانہ ہوئے تھے پس یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ زمین گول ہو۔

ایک اور مثال سے بھی زمین کا گول ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تم روزانہ دیکھتے ہو کہ سورج صبح میں نکلتا ہے اور دن بھر سفر کرنے کے بعد شام کو غروب ہو جاتا ہے جس وقت سورج نکلتا ہے اس کی روشنی پہلے بنگلوں اور مکانوں کے بلند حصوں پر پڑتی ہے اور جوں جوں سورج بلند ہوتا ہے اس کی روشنی نچلے حصے میں پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو سورج کی روشنی ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ مکانات کے نیچے اور اوپر تمام حصوں میں پھیل جاتی لیکن تم کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کونسی چیز ہے جو سورج کی روشنی کو ایک ہی وقت میں زمین کے تمام حصوں پر پھیلنے سے روکتی ہے؟ وہ زمین کی گولائی ہے۔ ان مثالوں کے ذریعے تمھیں معلوم

ہو چکا ہے کہ زمین اصل میں گول ہے۔

اب تم یہ سوال کر سکتے ہو کہ جب زمین گول ہے تو پھر چپٹی کیوں نظر آتی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ تمھاری نظر اپنے مقام سے صرف تھوڑے فاصلے تک جا سکتی ہے۔ جس کے آگے تم کو ہر چیز مدھم نظر آتی ہے۔ اس سے اور آگے تم کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح چیونٹی کی نظر بھی، جو تم سے بہت چھوٹی ہے صرف تھوڑے فاصلے تک جا سکتی ہے۔ ایسی چیونٹی کو جو کسی گیند پر رینگ رہی ہو اس گیند کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آئے گا جو اس کو چپٹا معلوم ہوگا۔ جو حال گیند پر چیونٹی کا ہے وہی حال ہمارا زمین پر ہے۔ زمین بہت بڑی ہے ہماری نظر اس چیونٹی کے مانند صرف تھوڑی دور تک جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم کو ایک ہی وقت میں زمین کا صرف تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا ہے جو لازمی طور پر چپٹا معلوم ہوتا ہے۔

جی سورج بھان

الحمرا

جنوبی ہسپانیہ کے مشہور شہر غرناطہ کے پاس ایک اونچی پہاڑی ہے جس پر الحمرا کی پرانی عمارت کھڑی ہے آس پاس بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ جن پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے پاس ہی ایک بہت بڑا جنگل ہے جس میں زیتون کے درخت پھیلے ہوئے ہیں۔ الحمرا میں بہت سے چھوٹے چھوٹے محل ہیں جن کو مراکش کے عربوں نے بنایا تھا۔ دیواروں پر جابجا خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوے ہیں۔ اُن میں طرح طرح کی عبارتیں کھدی ہیں۔ ایک بڑا محل ہے جس کے اندر دو بڑے بڑے مکانات ہیں ان میں مسلمان بادشاہوں کے دربار لگتے تھے ایک تو وہ ہال ہے جہاں دوسرے ملکوں کے ایلچی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کورٹ آف لائنز یعنی شیروں کے دربار کے نام سے مشہور ہے اس دربار میں عرب کاریگروں نے سنگ مرمر سے تراش کر ایسے خوبصورت شیر بنائے ہیں جنھیں دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ کہیں ہم شیروں کی کچھار میں تو نہیں آگئے۔ اس دربار کے اطراف عالی شان ایوان اور محرابیں پھیلی ہوئی ہیں صحن میں حوض ہے جس میں فواروں کی جگہ سنگ مرمر کے شیر کھڑے ہیں ان شیروں کے منہ سے پانی نکلتا ہے دربار میں سنگ مرمر کی ۱۲۴ محرابیں اور کئی بڑے بڑے کمرے ہیں۔ الحمرا کی خوبصورتی کا چرچا ساری دنیا میں ہے ملکوں ملکوں کے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ الحمرا کو دیکھ کر اگلے زمانے کے لوگوں کی کاریگری اور ہنرمندی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے (ماخوذ)

محمود علی متعلم

ایک سمجھ دار لڑکا

نذیر کی عمر بمشکل سے گیارہ سال کی ہوگی اس کے باپ کے اولاد بہت زیادہ تھی لیکن آج سے گیارہ سال پہلے اس کی جو آمدنی تھی اس میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا تھا گھر کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا جس سے وہ بہت پریشان تھا

عید کے دن نذیر کا باپ اس کو ساتھ لئے ہوے اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے گیا ــــ دوست: "آج تم نے نماز کہاں پڑھی؟"

نذیر کا باپ ــ "محلہ ہی کی مسجد میں پڑھی" پھر نذیر کے باپ نے بیٹے سے کہا کہ چچا کو سلام کرو۔ نذیر سلام کرکے چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ باپ نے اپنے دوست سے کچھ باتیں کرنے کے بعد بچے سے کہا "تم اپنی چچی سے عید مل آؤ"

نذیر: "بہت اچھا" نذیر نے اندر جاکر چچی کو سلام کیا اور دالان میں ایک جگہ پر اب سے بیٹھ گیا۔ چچی بہت محبت والی تھیں کمسن بچوں سے محبت سے پیش آتی تھیں پہلے نذیر کا مزاج پوچھا پھر اس کو عیدی کے طور پر ایک اٹھنی دینی چاہی۔

نذیر "مجھے اٹھنی نہیں چاہیئے" چچی (اصرار سے) "لو بیٹا میوہ مٹھائی خرید کر کھالو"

نذیر: "چچی میں نہیں لیتا ابا کو معلوم ہوگا تو وہ بہت خفا ہوں گے" یہ کہہ نذیر باہر چلا آیا اور اپنے باپ کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ میں اس نے باپ سے کہا کہ ابا! چچی مجھے اٹھنی دینا چاہتی تھیں میں نے نہیں لی۔

باپ: "تم نے اٹھنی کیوں نہیں لی؟"

نذیر: "آج کل آپ روپیہ نہ ہونے سے بہت پریشان ہیں اگر میں ان سے عیدی لیتا تو آپ کو بھی ان کے بچوں کو عیدی دینی پڑتی"۔

نذیر کے باپ نے جب یہ بات سنی تو خوش ہو کر اس کو پیار کیا اور اس کی عقل اور سمجھ کی بہت تعریف کی۔

ابو المحاسن متین

ریل کا موجد

یہ مضمون انگریزی اور اردو کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

عزیز بچو! تم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ دنیا میں آج کل وہ کام ہو رہے ہیں جو پہلے زمانے میں سنے جاتے تھے۔ پہلے زمانے میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جانا ہوتا تو چھکڑوں یا سواری کے جانوروں کے ذریعے سے جاتے تھے۔ اس طرح کئی مہینوں کا سفر ہوتا تھا لیکن جب سے ریل بنی مہینوں کا سفر دنوں میں اور دنوں کا گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ کسی زمانے میں ہوا میں اڑنا ایک ناممکن بات سمجھی جاتی تھی لیکن آج کل ہم ہوائی جہاز میں پرندوں کی طرح ہوا میں قلابازیاں لگاتے دیکھتے ہیں اسی طرح سیکڑوں چیزیں عالم وجود میں آئیں۔ ان تمام چیزوں کی ایجاد کا گھر "سائنس" ہے۔

لیکن یہ سمجھنا کہ صرف سائنس پڑھنے سے یہ کام آسان ہو جاتا ہے نہیں۔ اس کے لئے عمل ہمت اور عالی دماغی کی ضرورت ہے یوں تو ہم ہندوستانی بھی سائنس کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسی ڈگریوں سے کیا فائدہ جس سے کسی قسم کا استفادہ نہ کیا جا سکے۔ ان تمام چیزوں کی ایجاد کرنے والے مغربی ممالک کے رہنے والے تم ہی جیسے انسان مگر اولوالعزم اور سچا ارادہ رکھنے والے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ وہ تم جیسے غریب نہیں۔ وہ تم سے بھی غریب تھے۔ باوجود غربت کے اپنے آپ کو ہر کام کا اہل سمجھتے ہیں۔ آج ہم تم کو اُن ہی میں سے ایک شخص کا حال سناتے ہیں جس نے سب سے پہلی مرتبہ ریل کا انجن تیار کیا۔ اس عالی ہمت شخص کا نام جارج اسٹیفنسن تھا۔

جارج ملک انگلستان کے کسی قریہ میں ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوا اس کے والد کا نام رابرٹ اسٹیفنسن تھا۔ یہ کوئلے کی کان میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوئلے کی کان میں کام کرنے والے کی کیا آمدنی ہوگی اور وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کس طرح انتظام کرتا ہوگا جارج اور لڑکوں کی طرح بارہ سال کی عمر تک آوارہ رہا اور اپنا سارا وقت کھیل کود میں گنوایا اس کے باپ نے اپنی آمدنی میں اضافے کے خیال سے اپنے لڑکے کو بھی کان میں ملازم رکھا دیا۔

ان دنوں کوئلے کی کانوں میں بھاپ سے چلنے والا انجن استعمال کیا جاتا تھا بھلا ایسا لڑکا جو علم سے بالکل بے بہرہ ہو کس طرح اس انجن سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا لیکن اس کو روز بروز انجن سے دلچسپی ہوتی گئی۔ بڑی کوشش کے بعد انجن سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ اسی زمانے میں ٹریوتھک نامی ایک شخص نے اپنے ایک دوست کی مدد سے ایسا انجن ایجاد کیا تھا جو بغیر کسی جانور کی مدد کے سڑکوں پر دوڑتا تھا جارج کو بھی ایسے انجن تیار کرنے کی فکر ہوئی لیکن اس کو اپنی مشکلات کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور یہ خوب جان گیا تھا کہ جب تک تعلیم نہ پائی جائے کامیابی قطعی ناممکن ہے۔ چنانچہ اب جارج راتوں کو مدرسے میں پڑھتا تھا۔ دیکھو ترقی کرنے والے سپوت ایسے ہوتے ہیں۔

جارج کی شادی بھی ہو گئی جس کے سبب اس کے اخراجات بڑھ گئے لیکن جارج ایک ہوشیار آدمی تھا۔ دوسری مزدوری کے ذریعے سے اس کی تلافی کرتا تھا اس کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا لیکن اس کے بعد ہی بیوی شوہر کو جدائی کا داغ دے گئی بیوی کے مرنے کا اس کو اتنا صدمہ ہوا کہ انگلستان کو خیرباد کہہ کر اسکاٹ لینڈ کا راستہ لیا اسکاٹ لینڈ میں کچھ دنوں تک رہ کر ایک معقول رقم کے ساتھ انگلستان واپس آیا۔ اب اس کو اپنے ماں باپ کی بھی کفالت کرنی پڑی چونکہ اس کا باپ اندھا ہو گیا تھا۔ جارج ایک کان میں ملازم ہو گیا اس کان میں ایک انجن تھا جو پانی خارج کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن یہ انجن خراب ہونے کی وجہ سے برابر کام نہیں کرتا تھا مالک نے اس کی درستی کے لئے ہر ایک ماہر سے رائے لی لیکن کچھ نہ ہوا جب جارج نے اس کی مرمت کی اجازت چاہی تو پہلے اس کا مذاق اڑایا لیکن چند روز یہ سمجھ کر کہ چلو اس کو بھی موقع دو، اجازت دے دی۔ اس نے انجن کو ذرا سی تبدیلی کے بعد اس قابل بنا دیا کہ وہ تھوڑی دیر میں پانی خارج کرنے لگا۔ مالک یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور

اس کو انجن کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔

جارج نے ایک ایسے انجن تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا جس کی مدد سے کوئلہ اٹھایا جا سکے۔ آخرکار اس نے ایک دن ایسا انجن تیار ہی کرلیا جو بھاپ کے بل بوتے پر کوئلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتا تھا اور یہ پٹڑیوں پر چلتا تھا۔

ایک اور شخص نے جس کا نام ایڈرڈ تھا یہ ارادہ کیا کہ ایک ریل ایسی تیار کی جائے جو گھوڑوں کی مدد سے پٹڑیوں پر چلے۔ جارج یہ سن کر خود اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ تم بغیر گھوڑوں کے بھی اس کام کو بہت آسانی سے انجام دے سکتے ہو۔ چنانچہ اس نے ایک انجن تیار کرنے کا وعدہ کیا۔

جارج نے ایک چھوٹا سا انجن تیار کیا اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں لگا دیں۔ اور خود چلانا شروع کیا۔ مظاہرے کے دن بہت لوگ جمع ہوگئے پہلے انجن بہت ہی آہستہ رفتار سے چلتا رہا اور پھر اس نے اس کی رفتار ایک دم تیز کر دی لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور واہ! واہ! کے نعرے بلند ہوئے

جارج اپنے لڑکے کے ساتھ انجنوں کی تیاری میں مصروف رہتا اور ایک دوسرے سے اچھا تیار کیا کرتا جو سب سے اچھا انجن تیار کرے اس کو پانچ سو پونڈ کا انعام دیا جانا مقرر ہوا۔ اس انعام کا جارج ہی مستحق قرار پایا۔ اور اس کے لڑکے نے انجنوں میں اور بہت سی اصلاحیں کیں۔ آخر میں پارلیمنٹ سے اس کو انگلستان میں پٹڑیاں بچھانے کی اجازت مل گئی اور تھوڑے دنوں ہی میں ملک انگلستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پٹڑیوں کا جال بچھ گیا۔

تم نے دیکھا نہ ایک معمولی انسان جس کے ہاں نہ کھانے کو برابر غذا تھی اور نہ رہنے کو گھر تھا کتنا بڑا آدمی بن گیا۔ اس کا ارادہ پکا اور مضبوط تھا۔ تم بھی اپنے ارادوں میں مستقل ہو جاؤ۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی حاصل ہوگی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ دوسری قوموں کو یہ ثابت کر دکھاؤ کہ ہمارے دماغوں میں بھی ہر کام کے انجام دینے کی صلاحیت موجود ہے۔

شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)

بچوں کی مٹھائی

نا میاں نا نہیں دیتے ہیں کسی کو گالی
ہاں بری بات برے ہوتے ہیں بچے ایسے

اچھے بچے نہیں کرتے ہیں۔ ہاں اپنی خراب
یہ گنواروں میں ہوا کرتے ہیں ایسے تیسے

ایسے بچوں کو کوئی پیار نہیں کرتا ہے
نہ کوئی دیتا ہے پاس اپنے بلا کے پیسے

دیکھو نبن کو وہ کس طرح سے چپ رہتا ہے
تم بھی ایسے ہی رہو رہتا ہے نبن جیسے

کل سے اسکول کو جایا کرو پڑھنے کے لئے
واں سے پھر آکے سبق ہم کو سناؤ لے سے

جس طرح بھائی پڑھا کرتا ہے ویسے ہی پڑھو
کوٹ پتلون بنا دیں گے تمھیں بھی ویسے

سائکل چھوٹی سی اسکول کے جانے کے لئے
کل منگا دیں گے مگر بیٹھو گے اس پر کیسے

اچھے بچے جو ہیں سنتے ہیں بڑوں کا کہنا
جو برے ہیں وہ نہیں سنتے بڑوں کی شہ سے

سید ابوالقاسم سرور

سینما

سینما کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ تصاویر علٰحدہ علٰحدہ لی جاتی تھیں اور روشنی کی مدد سے انھیں پردے پر دکھلایا جاتا تھا اور شاید اس وقت کسی کو بولتے فلم کا خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن جس طرح ہر چیز ترقی کی طرف مائل ہوتی ہے اسی طرح سے سینما بھی ترقی کی طرف مائل تھا سینما کی ترقی میں عقلمند مصوروں ڈرامہ نویسوں اور اداکاروں نے حصہ لیا اور ان الگ الگ تصویروں کو فلم کی صورت میں لایا گیا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مسلسل تصاویر کو فلم کہنے لگے اسی طرح اس کی ترقی کا دروازہ کھلا اور اب تک بہت کچھ ترقی کرچکا ہے سینما کے لئے بڑے بڑے مصنفین نے اچھے اچھے ڈرامے لکھے فلموں کے ساتھ ریکارڈ بھی دیئے جانے لگے اور تصاویر کے ساتھ ریکارڈ بھی لگائے گئے جب یہ لوگ ہونٹ ہلاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ آدمیوں کی طرح باتیں کررہے ہیں سینما جیسی اچھی چیز ہے بشرطیکہ اس سے فوائد حاصل کئے جائیں مثلاً اگر کسی کو یہ سمجھایا جائے کہ ہوائی جہاز اس طرح سے پرواز کرتا ہے تو وہ نہ اس کو اچھی طرح سے سمجھے گا اور نہ اس کی تشفی ہوگی اور اگر اس کے بجائے ہم اس کو کسی فلم کے ذریعے سے بتلائیں کہ ہوائی جہاز اس طرح سے پرواز کرتا ہے تو وہ فلم دیکھنے کے بعد اچھی طرح سمجھ جائے گا اس کے سوائے بھی ہزارہا مثالیں ہیں جن کے باعث سینما سائنس دانوں کا شاندار کارنامہ کہلاتا ہے مثلاً اگر ہم کسی کو کہہ دیں کہ ہر قوم کی ترقی کا دارومدار اُن کے ہوشیار قومی لیڈروں پر ہے تو بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ کیا کہیں غریب قومی لیڈر بھی کسی قوم کو ترقی دے سکتے ہیں اور یہ خیال کریں گے کہ کیا بیچارے لیڈروں پر ہی قومی ترقی کا دارومدار ہے لیکن اس کے بجائے اگر ہم انھیں فلم دکھلادیں کہ لیڈروں نے کتنے مجمع کے سامنے تقریریں کیں اور مجمع کو اپنا بنالیا۔ تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ چند ہوشیار لیڈر مل کر کسی قوم کو کیسے ترقی دے سکتے ہیں اگر ہم کسی کو یہ سمجھائیں کہ ترکی کچھ دنوں پہلے بہت مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن اس کو چند فدایان ملک نے اس پستی سے نکالا تو اتنا کہنے اور سمجھانے سے لوگوں کو تشفی نہیں ہوگی لیکن ان تمام واقعات کو فلم کے ذریعہ سے بتلادیں تو لوگ اچھی طرح سے سمجھ جائیں گے کہ ان جاں نثاران قوم نے ترکی کو کس طرح پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیا۔ اس لئے سینما کی سی سہولتیں کسی اور چیز میں نہیں آسکتیں کیونکہ مشاہدہ ہی سے معمولی عقل والا انسان ہر چیز کو سمجھ سکتا ہے سینما ہمیں نصیحت آموز سبق سکھلاتا ہے اور مناظر قدرت سے ہم کو بہرہ اندوز کرتا ہے سینما ہی تعلیمی تفریح کا بہترین ذریعہ ہے تاج محل جو دنیا کے (۷) خوبصورت عجائبات میں سے ہے اور جس کو اکثر دل نے ابھی تک دیکھا نہیں اگر اس عمارت کو یہاں دیکھنا چاہیں تو صرف فوٹو کے ذریعہ سے دیکھ سکتے ہیں لیکن فوٹو میں ہمیں اس کی خوبیاں اچھی طرح سے ظاہر نہ ہوں گی۔ اس کے بجائے اگر تاج محل فلم میں بتلایا جائے تو ہم اپنے وطن میں بیٹھے کر اس عمارت کا حسن مرمری دیکھ سکتے ہیں اور اپنے دل کو خوش کرسکتے ہیں کیونکہ یہ ہماری گزشتہ زمانے کی بہت بڑی تاریخی یادگار اور اسلامی تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہے جو لوگ تمام دن کام کرنے کے بعد تھک جاتے ہیں انھیں تفریح کے لئے سینما سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی کیونکہ سینما میں ہر وہ چیز رہتی ہے جو تفریح اور دل کی شگفتگی کے لئے موزوں ہو مثلاً سینما میں وہ بہترین مناظر اور تاریخی ڈرامے بتلائے جاتے ہیں جن سے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ تفریح کی حد تک سہی لیکن سینما کا اصلی مقصد تعلیم دینا ہے سینما صرف تعلیم اور ریاست کی حد تک ہی مفید نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ضروری ہے سینما ہمیں اچھی تعلیم دیتا اور ہماری ہمت بڑھاتا ہے مثلاً ہم میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اپنی بود و باش کے نقائص اور ترقی یافتہ ممالک کی خوبیاں دیکھیں لیکن اس کا مشاہدہ ہمیں سینما ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے سررشتہ تعلیمات حکومت سرکار عالی بھی سینما کے ذریعہ تعلیم پھیلانے کی تجاویز پر غور کررہا ہے بہرکیف سینما ہر طرح سے مفید ثابت ہوسکتا ہے

ا خ

محمد شفیع الدین صدیقی (طالب علم مدرسہ سلطانیہ ثانوی)

احسان فراموشی

(ایک سبق آموز قصہ)

کہتے ہیں کہ کسی ملک میں بادشاہ بیمار ہوگیا۔ وہاں کے حکما نے بہت علاج کیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بادشاہ ناامید ہوچکا تھا کہ وہاں ایک حکیم آیا۔ یہ فن طب میں ماہر تھا۔ اور بہت سی زبانیں بھی جانتا تھا۔ جب اس نے سنا کہ بادشاہ کو کوئی اچھا نہ کر سکا تو اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اور حکم پا کر حضوری میں داخل ہوا اور درخواست کی کہ اگر ارشاد ہو تو بغیر کسی داخلی علاج کے حضور کو اچھا کر دونگا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر تم مجھے اس طرح تندرست کرو گے تو میں تمھیں خوش کر دونگا۔ دوسرے دن حکیم ایک گیندا اور ایک بلّا لے کر حاضر ہوا۔ دونوں اندر سے کھوکھلے تھے۔ ان میں دوائیں بھری ہوئی تھیں۔ اور کہا کہ حضور اس سے خوب کھیلیں۔ جب بدن سے پسینہ ٹپکنے لگے تو اس وقت آپ فوراً حمام کریں اور خوب سوئیں۔ کل آپ بالکل تندرست ہوجائیں گے۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور جب جاگا تو بالکل تندرست تھا۔ بادشاہ حیران رہ گیا پھر اس نے دربار کیا ارکانِ دولت حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب بھی موجود تھے۔ بادشاہ ان کی بڑی تعریف کی اور انعام واکرام دیا۔ وزیر اعظم کو حکیم کی عزت افزائی ناگوار گذری۔ اس نے ارادہ کیا کہ حکیم کو بادشاہ کی نظروں سے گرا دے۔ بادشاہ کچھ کم عقل بھی تھا۔ وہ وزیر کے بہکانے میں آگیا۔ وزیر نے بادشاہ کو کہا کہ یہ حکیم جاسوس ہے۔ اور آپ کے کسی دشمن نے اسے بھیجا ہے اگرچہ اس نے آپ کو اچھا کر دیا ہے مگر آخر کار دواؤں کی تاثیر رنگ لائے گی۔ اور آپ کی جان پر بن آئے گی۔ بہتر ہے کہ آپ اسے بلا کر فوراً قتل کا حکم دے دیں بادشاہ نے کہا۔ بہتر میں اپنی جان بچانے کے لئے ابھی اس کے قتل کا فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ پھر بادشاہ نے حکیم کو بلا بھیجا۔ اور جب وہ خوش خوش آیا تو بادشاہ نے پوچھا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس لئے بلایا ہے۔ حکیم نے جواب دیا۔ نہیں۔ حسب ارشاد میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں حکیم سخت حیران ہوا۔ اور کہا کہ خداوند میرے قتل کی وجہ تو آپ بتا دیجئے بادشاہ نے کہا کہ تو جاسوس ہے اور میرے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حکیم سمجھ گیا کہ حاسدوں کا داؤ چل گیا ہے۔ وہ دیر تک اپنی بے قصوری کا اظہار کرتا رہا۔ اور جب دیکھا کہ نجات مشکل ہے تو بادشاہ سے درخواست کی کہ تھوڑی دیر کے لئے اجازت ملے کہ میں اپنے مکان جا کر اپنا سامان عزیزوں میں تقسیم کر دوں۔ اس سامان میں ایک کتاب بھی ہے جو کتب خانہ شاہی کے قابل ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کیسی کتاب ہے؟ حکیم نے کہا کہ اس میں بہت سی راز کی باتیں ہیں۔ از آں جملہ ایک یہ ہے کہ جب میرا سر کاٹا جائے۔ آپ اس کتاب کو کھول کر چھٹے ورق کے بائیں صفحہ کی تیسری سطر پڑھ کر جو سوال کریں میرا سر فوراً جواب دے گا۔ بادشاہ خوش ہوا۔ اور بولا کہ یہ تماشا دیکھنے کے قابل ہے اور اس نے قتل کا حکم دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔ حکیم اپنے گھر جا کر ایک ہی دن میں سب کاموں سے فراغت حاصل کر لی۔ اور ایک بڑی کتاب لے کر حاضر ہوا۔ اور جزدان سمیت اُسے بادشاہ کی خدمت میں داخل کر کے کہا کہ جب میرا سر کاٹا جائے تو اسے ایک طشت میں جزدان پر رکھ دیجئے فوراً خون بند ہوجائے گا۔ پھر کتاب پڑھ کر سوال کیجئے۔ میرا سر جواب دے گا۔ حکیم نے پھر التجا کی کہ جہاں پناہ! میں بے گناہ ہوں میرے قتل سے درگذر کیجئے۔ مگر بادشاہ نے ایک نہ سنی اور کہا کہ تیرے مارے جانے کے بعد تیرے سر سے گفتگو سنوں گا۔ یہ کہ کر بادشاہ نے کتاب اٹھالی اور جلاد نے حکیم کا کام تمام کر دیا۔ جب حکیم کا سر جزدان پر رکھ کر طشت میں رکھا گیا تو خون فوراً بند ہوگیا۔ بادشاہ نے کتاب کھول کر چاہا کہ ورق الٹے۔ مگر وہ آپس میں ایسے چپاں تھے کہ انگلی میں لعابِ دہن لگائے بغیر اسے الٹا نہ سکا۔ جب نوبت چھٹے ورق پر پہنچی۔ بادشاہ نے ہر چند چاہا کہ ورق الٹے۔ اور انگلی کو لعاب لگا کر ورق الٹاتا تھا۔ یہاں تک زہرِ ہلاہل نے جو کتاب کے اوراق میں لگا ہوا تھا جسم میں سرایت کی۔ اور بادشاہ کا حال لحظہ بہ لحظہ متغیر ہونے لگا۔ اس کی بصارت جاتی رہی آخر بے قرار ہو کر تخت کے نیچے جا پڑا۔ اسی وقت سر نے پکارا۔ ”اے ظالم! دیکھ بے گناہوں کا خون ضائع نہیں جاتا۔“ اس کلام کو سنتے ہی بادشاہ چل بسا اور اپنی سزا کو پہنچا

کیقباد سہراب جی (فرسٹ فارم مدرسہ عالیہ)

دیکھنے والے

سمجھ لے دیکھ کر خود نبضِ بسمل دیکھنے والے
دکھائیں کیا تجھے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

مری گردن میں ہاتھ اپنے حمائل دیکھنے والے
یہی ہے جذبۂ دل جذبۂ دل دیکھنے والے

ہوا ہے خاک اگر بن جا غبارِ پردۂ لیلیٰ
بگولے کی طرح اٹھ اٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے تھے قلبِ مضطرب پر ہاتھ کا رکھنا
تڑپ کر رو دیئے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

کمانِ غمزہ میں تیرِ نگہ زہ کر چکا کوئی
نوید اے جنبشِ مژگانِ قاتل دیکھنے والے

نہ چھٹ جائے کہیں رنگِ حنا دستِ حنائی سے
کفِ افسوس مل کر خوں بھرا دل دیکھنے والے

سوالِ وصل کا بس بس جواب اتنا ہی کافی ہے
ادا سے مسکرا دے روئے سائل دیکھنے والے

خدا شاہد یہ تیری بیکسی ہے قابلِ عبرت
فلک کو یاس سے منزل بمنزل دیکھنے والے

بُتانِ شوخ کو دل دیکھنے کا صدق دعویٰ ہے
مرے اشعار تو دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

صدق جائسی

دیکھ لینے دے

کل آنا آج جانا یہ تماشا دیکھ لینے دے
ٹھہر عمرِ رواں وو دن کی دنیا دیکھ لینے دے

ہنسیں رو رو پہ اور روئیں ہنسی پر دیکھنے والے
جو دنیا رو کے ہنسنا ہنس کے رونا دیکھ لینے دے

قیامت ہے یہ کہنا منھ چھپا کر جانیوالے سے
ٹھہر جا دیکھ لینے دے ٹھہر جا دیکھ لینے دے

دکھا دے یوں جھلک دل جل اٹھے بیہوش ہو جاؤں
مجھے موسیٰ صفت ہی اپنا جلوہ دیکھ لینے دے

جنوں وحشی کو لیجا بعد تو زنداں سے محشر میں
اسے پہلے ذرا ہر پھر کے صحرا دیکھ لینے دے

نہ کر محدود بُت خانے میں مسجد میں کلیسا میں
ترا ہر جائی جلوہ مجھ کو ہر جا دیکھ لینے دے

خدایا پہلے حسرت تھی مگر اب عبرت آئے گی
انھیں آنکھوں سے دنیا کا تماشا دیکھ لینے دے

میر آفتاب علی خاں مہر

عیدِ میلادالنبیؐ

فرشتے سرگ شاتوکوں ستارےیاں سوں سنوارے ہیں
شہؐ دنیا و دیں کے تئیں عرش کرسی سنگارے ہیں

مگر مولود ہے شہ کا عرش اوپر طبل کاجے
مراداں پاونے سارے جگت ہاتاں پسارے ہیں

خوشیاں تھے جگ سماتے نیں سو اپنے پیرہن میانے
نیرہ جگ آپناتن من شہنشہؐ پر نثارے ہیں

محمد قطب شہ غازی کرے مولود بہو خیند سوں
تو اُس کی عمرو دولت تئیں دعا صف صف ہو ٹھارے ہیں

ملک ہور جن سب کرتے دعا شہ کا صدق سیتے
دنیا ہور دین میں ایسا سو شہ نیں کر پکارے ہیں

صدق ... کاری آپ اُجاپا نانو دوؐ جگ میں
طبق نوراں کے لے حوراں سو شہ پر تھے نثارے ہیں

نبیؐ صدقے گنایا ہے ترکماں آج میزوانی
علیؐ صدقے سے دوؐ جگ میں بلند اُس کے ستارے ہیں

سلطان محمد قلی قطب شاہ

علامہ اقبال مرحوم

سب رس کا یہ شمارہ تیار ہو چکا تھا کہ ہمیں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے بے وقت انتقال کی افسوس ناک خبر ملی ان کی رحلت سے دنیا کا ایک بڑا شاعر اٹھ گیا مرحوم کے دل و دماغ میں اسلامی عظمت کی وہ صحیح روح کارفرما تھی جس کو بدقسمتی سے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے مرتے وقت بھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ "اسی اسلامی عظمت" کے ترجمان ہیں۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا، مسلمان ہوں مسکراتے ہوئے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"

تین سال ہوئے جب علامہ مرحوم نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ "میں علیل ہوں اس لئے شعر و شاعری کے مشاغل ترک کر دئے ہیں" اس کے ایک سال بعد میں نے ان سے لاہور میں ملاقات کی اس وقت بھی وہ بیمار تھے۔ بڑے اخلاق سے ملے، ایک تخت پر لیٹے ہوئے تھے، جسم پر تہمد اور نیم آستین تھا سامنے حقہ دھرا تھا اور اطراف کتابیں رکھی ہوئی تھیں جامعۂ عثمانیہ اور حیدرآباد سے بڑی دلچسپی کا اظہار فرمایا میں چاہتا تھا کہ مشرق کے شاعرِ اعظم سے گھنٹوں گفتگو کی جائے لیکن ان کی بیماری کا خیال کر کے بادلِ ناخواستہ ہم نے ان کو خدا حافظ کہا اِس وقت جب میں ان کی رحلت کے متعلق لکھ رہا ہوں ان کی صورت میری نگاہوں کے سامنے ہے ان کے چہرے پر حقیقی عظمت کے آثار تھے اور بیماری کے باوجود اپنے وجود میں ایک "زندگی" رکھتے تھے اور اب جب کہ وہ دنیا کی مادی نگاہوں سے دور ہو گئے ہیں ان کی روحانی بقا اور جاودانی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

حال ہی میں سارے ہندوستان نے ان کی بلند پایہ خدمات کا خراجِ تحسین عطا کیا اور حیدرآباد میں بھی ڈاکٹر سید عبداللطیف سابق پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کی کوشش سے شاندار پیمانے پر یوم اقبال منایا گیا جس کے پہلے اجلاس کی صدارت ہز ہائنس پرنس آف برار نے کی تھی اور دوسرے اجلاس کی ہز اکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنت نے ان اجلاسوں میں مرحوم کی شخصیت اور ان کے پیام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سال جامعۂ عثمانیہ نے اپنے جلسۂ تقسیم اسناد میں اقبال کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ آج سے تقریباً تین ہفتے پہلے میرے ایک دوست نے ان سے ملاقات کی مرحوم نے فرمایا کہ "میں اب بہت کم دن زندہ رہوں گا حیدرآباد نے جس طرح میری خدمتوں کو سراہا ہے میں اس کا بہت ممنون ہوں افسوس کہ میں اپنی ڈگری حاصل کرنے کے لئے علالت کی وجہ سے حیدرآباد نہ آسکا"

مرحوم ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد آئے تھے، اور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ نے انھیں باریاب کیا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے ان کے اعزاز میں مشاعرہ بھی کیا۔ قطب شاہی مقبروں پر ان کی نظم نے ماضی کی عظمتوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کی شان میں بھی ایک نظم لکھی تھی۔ اور ایک نظم کے ذریعے مہاراجہ بہادر کے اخلاق کی تعریف فرمائی تھی۔

دعا ہے کہ غلامستانِ ہند کے اس حریت پسند مسلمان اور مشرقِ جدید کے سب سے بڑے شاعر کو خدائے تعالیٰ اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے رنج و ملال کے اس ہجوم میں جو ان کے انتقال سے ہمارے دل پر چھایا ہوا ہے ہم کس منہ سے ان کے پس ماندگاں کو صبر کی تلقین کریں۔

علامہ اقبال کے مختصر حالات

۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹر اور گورنمنٹ کالج سے بی، اے اور ایم، اے کی ڈگریوں کے ساتھ پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی میں اقبال نے علمی ذوق اور فلسفۂ زندگی حاصل کیا جس کی پختگی نے بالآخر انھیں شاعرِ حیات بنا دیا۔ اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ کے لکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کی تعلیم دینے لگے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال یورپ گئے اور وہاں تین سال قیام کیا، کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری لے کر جرمنی چلے گئے جہاں میونک یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی "فلسفۂ ایران" ان کے مقالہ کا موضوع تھا۔ ڈاکٹری کی ڈگری لینے کے بعد لندن یونیورسٹی میں داخل ہو کر بیرسٹری کا امتحان کامیاب کیا۔ اسی زمانے میں اقبال نے انگلستان میں "اسلام" پر چھ معلومات آفریں تقریریں کیں۔ چھ ماہ تک لندن میں عربی کے استاد رہے جولائی ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔

علامہ اقبال بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے لیکن ان کی شاعری کا حقیقی معنوں میں آغاز ۱۸۹۹ء میں ہوا جب انجمنِ حمایت الاسلام کے جلسہ میں انھوں نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک درد آگیں نظم پڑھی۔ اس کے بعد اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں وہ ہر سال نئی اور اچھی نظمیں سنانے لگے سر شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن میں بھی ان کی نظمیں چھپنے لگیں۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں انھیں مدراس مدعو کیا گیا تھا' وہاں تقاریر کرنے کے بعد وہ حیدرآباد میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے آئے ۱۹۳۲ء میں نادر شاہ فرمانروائے افغانستان نے انھیں مدعو کیا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڈھ یونیورسٹی نے اور ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹری کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

اقبال نے سب سے پہلے اردو زبان میں ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی۔ پھر "فلسفۂ ایران" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ۱۹۰۵ء میں اپنی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" شائع کیا۔ انگلستان سے واپس آکر "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کے نام سے فارسی زبان میں دو مثنویاں چھاپیں۔ اس کے بعد "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم" فارسی کلام کے دو مجموعے شائع کئے۔ ۱۹۲۹ء میں فلسفۂ اسلام کے متعلق وہ تقریریں جو انگلستان میں کی گئی تھیں' کتابی صورت میں شائع ہوئیں ۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" اپنے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ شائع کیا اور تھوڑے دن بعد "ضربِ کلیم" کے عنوان سے تیسرا مجموعہ چھاپا۔ اسی زمانے میں فارسی میں ایک مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" شائع ہوئی۔

ہندوستان نے' مشرق نے' مسلمانوں نے' اردو نے' فارسی نے ایک ایسا شاعر کھو دیا جو ان سب کے لئے باعثِ فخر و ناز تھا۔ اب قوم کا فرض یہ ہے کہ اس کے کلام سے ہمیشہ روحانی استفادہ حاصل کرتی رہے تاکہ اس کا پیامِ قیامت تک "حرکت و حیات" کا باعث بنا رہے ملک میں جا بجا یادگاریں قائم کی جائیں اس کے متعلق لٹریچر چھاپیں' اس کے مشن کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کی زوال یافتہ قوم اپنے اقبال کے لئے کیا کرتی ہے؟ جب تک اپنے بزرگوں کی عظمت و احترام کا جذبہ ہم میں پیدا نہ ہوگا ہم اپنے آپ میں کوئی قوت محسوس نہ کر سکیں گے۔

شاعرِ مشرق

آسمانوں سے گزر جاتی تھی جس کی جستجو
بندگی میں جس نے کی تھی اپنے رب سے گفتگو

عرشیوں کا دل ہلا دیتا تھا جس کا اضطراب
ذاتِ باری نے دیا تھا جس کے "شکوہ" کا جواب

جس کی آہوں کے شرارے دل کو گرماتے رہے
جس کے آنسو کوثر و تسنیم چھلکاتے رہے

جس کی الجھن تھی مسلماں کے لئے وجہِ سکوں
تھا خرد آموزِ مشرق جس کا اندازِ جنوں!

"بیخودی" میں جس کی احساسِ خودی کا راز تھا
سوز کے پردے میں جس کا ہر نفس اک ساز تھا

کس لئے روتا ہے؟ اس کی موت پر اے کم نظر!
موت اک موہوم پردہ ہے ثباتِ زیست پر

مردِ مومن مسکراتا ہے اجل کو دیکھ کر!
قید و بندِ زندگی کے ماحصل کو دیکھ کر

ڈھونڈتا ہے بحر میں ساحل سفینے کے لئے
زندۂ جاوید مرتا بھی ہے جینے کے لئے

تن ہوا ٹھنڈا تو کیا؟ ہے روح گرمائی ہوئی
موت کے پردے میں بھی ہے زندگی آئی ہوئی

چیر کر سینے کو داغِ دل دکھانے کے لئے
عرش پر روٹھے ہوئے رب کو منانے کے لئے

خلد کو اپنے ترانوں سے سجانے کے لئے
اڑ گئی بلبل قفس سے آشیانے کے لئے

محرمِ منزل تھا، رستے میں ٹھہر سکتا نہیں
کہہ رہی ہے زندگی اقبال مر سکتا نہیں

میکش

تبصرے

دی حیدرآباد ڈومینینس مولفہ جی یس بھان صاحب مددگار سٹی کالج ، ملنے کا پتہ اور قیمت باوجود تحقیق کے مل نہ سکے ۔

پہلی ہی نظر میں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب طالب علمانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عوام کے افادہ اور خصوصاً دیگر ممالک کے سیاحوں اور معلومات فراہم کرنیوالوں کے لئے لکھی گئی ہے ۔ فہرست مضامین، تقسیم ابواب، خاص ترتیب غرض کوئی ایسی سہولت اس میں نہیں جس سے مطالعہ کرنیوالا بغیر کافی تحقیق و تجسس کے جس چیز کا خواہشمند ہے معلوم کرسکے تاہم شگفتہ انداز بیان، سلیس پیرایہ اور خصوصاً افسانوی تسلسل جس سے یہ کتاب مملو ہے وہی اس قابل ہے کہ پڑھنے والے کو اس کے ختم کرنے تک روک سکے ۔ عوام کے افادہ کی خاطر لکھی ہوئی اس کتاب میں حیدرآباد کی جدید ہمہ جہتی ترقیات کے تفصیلی بیانات سے خاص طور پر پرہیز کیا گیا ہے ۔ کتاب کے آخر آخر میں صوبوں اور اضلاع کے متعلق مجمل معلومات درج کئے گئے ہیں ۔ بہرحال چہتر صفحات کی یہ مختصر کتاب معلومات آفریں کہی جاسکتی ہے اور جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اس کو بڑی حد تک پورا کرسکتی ہے ۔

آصفی کہانیاں مولفہ محمد عبدالسلام صاحب ذکی بی، اے ۔ عثمانیہ، ناشر سید عبدالقادر اینڈ سنس قیمت سرکار سے مہ عوام سے ۸ر

ذکی صاحب ملک کے بچوں کی ترقی و اصلاح میں اس قدر زیادہ حصہ لینے لگے کہ بالآخر خود ایک "بچہ" بنکر رہ گئے ۔ بچوں کی ذہنیت، ان کی دماغی حالت اور اُن کے شوق و دلچسپی کو ایک "بچہ" سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیش نظر کتاب ذکی صاحب کے مطمع نظر کی پوری آئینہ دار ہے اس میں کل کہانیاں یا کہانی نما تاریخی حالات ہیں جو سلطنت آصفیہ کے چھ سلاطین اور پانچ اسی خاندان کے پیشروؤں اور دیگر متعلقین کے ہیں ۔ انداز بیان سادہ اور سلیس ہے ۔ آج کل اُردو ادب میں افسانہ کی جو قدر ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے، آصفی سلاطین کے صدہا تاریخی واقعات ایسے ہیں جنھیں بالکل کہانی کے پیرایہ میں ادا کیا جاسکتا ہے ۔ زیر نظر کتاب میں کہانی کم اور تاریخ زیادہ ہے ۔ اگر ذکی صاحب سلاطین آصفی کے ان بیشمار واقعات میں سے جو زبان زد خاص و عام ہیں چند دلچسپ، نتیجہ خیز اور اثر آگیں واقعات لے کر بچوں کی دلچسپی کے لئے انہیں کی زبان میں کہانیوں کی شکل میں یا ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تو انھیں بلاشک اپنے مقصد میں اس سے کہیں زیادہ کامیابی ہوتی مگر بقول عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ کہ جنھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے، "...... ابتدا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے اس قدر اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس میدان میں ذکی صاحب نے پہلا قدم رکھا ہے "۔ ابتدا میں عبدالمجید صاحب صدیقی کا پیش لفظ اور سروری صاحب کا مقدمہ ہے اس کتاب کو شہزادۂ مکرم جاہ کے نام نامی سے معنون کیا گیا ہے ۔ مجموعی طور پر ذکی صاحب کی یہ پہلی کوشش ناقابل تحسین نہیں کہی جاسکتی اور قوی توقع ہے کہ ان کا "دوسرا نقش" اس سے بہرصورت بڑھ چڑھ کر ہوگا ۔

المنظور کربلا نمبر بدایون سے نکلنے والا ماہوار رسالہ ہے، دنیائے اسلام کی اس عظیم ترین قربانی کی دردناک و خون چکاں یاد کو تازہ کرنے کے لئے جس طرح اور رسائل نے اپنے اپنے خاص نمبرات پیش کئے ہیں اسی طرح المنظور کے ایڈیٹر جناب جناب محمد عبدالواحد عثمانی صاحب نے بھی اس کا کربلا نمبر پیش کیا ہے ۔ اس مختصر سے پرچہ میں باب التفسیر کے علاوہ سارے مضامین داستان کربلا ہی سے متعلق ہیں جس کے لئے یہ نمبر پیش کیا گیا ہے "داستان عشق" اور "شہید مظلوم" اچھے مضامین میں شمار کئے جاسکتے ہیں ۔ شذرات میں اپنے متعلق "خود ستائی نہیں حقیقت ہے" کہہ کر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ موجودہ پرچہ کی کسی "خوبی" پر منطبق نہیں کی جاسکتی حالانکہ یہ خاص نمبر ہے ۔

سالانہ چندہ ۔ روپیہ منیجر المنظور بدایون سے مل سکتا ہے ۔ ۲

مرقعِ اصلاحِ حال مصنف منصور حیدرآبادی ۔ یوم ترک مسکرات کے سلسلہ میں لکھی ہوئی تین نظموں کو یکجا جمع کر کے شایع کیا گیا ہے ۔ پہلی نظم ہے نالۂ منصور یعنی ترک مسکرات " دوسری "مثنوی ترک جوا " اور تیسری "اتحاد ہندو مسلم " تینوں میں کوئی خاص بات نہیں متعدد اشعار وزن وتقطیع کے قیود سے بے نیاز ہیں معلوم نہ ہوسکا کہ آخری نظم لکھنے کا کیا محل تھا ۔ یہاں نفاق کب ہوگیا تھا جس کو دور کرنے کی دعوت دونوں مذاہب کے لوگوں کو دی جارہی ہے ۔ اس قسم کی نظموں سے اکثر لوگ خصوصاً بیرون ریاست کے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتے ہیں ۔ احتراز ضروری ہے ۔ ملنے کا پتہ غائب ۔ ۲

پہلا شراب کار مترجمہ محمد یونس سلیم صاحب بی ۔ اے ۔ ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور قیمت درج نہیں ۔ ٹالسٹائے کے اس مختصر سے ڈرامے کے متعدد تراجم اردو اور ہندی میں ہوچکے ہیں ۔ ترجمہ در ترجمہ ہونے کی وجہ سے زبان کی کوئی لطافت اور خوبی باقی نہیں رہی اور نہ اصولاً رہ سکتی ہے جہاں تک میرا خیال ہے اس ڈرامہ کے تمام تراجم میں مجنوں گورکھپوری نے سب سے اچھا ترجمہ کیا ہے جسے آج دس گیارہ سال پہلے شاید ڈسمبر ۱۹۲۶ء کے نگار میں انہوں نے "ابوالخمر" کے نام سے شایع کیا تھا ۔ اس چھوٹے سے ڈرامہ کو (پانچ ایکٹ میں منقسم کیا گیا ہے) جناب راجہ حسن اختر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے نام سے معنون کیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ دیہات سدھار کی تحریک کے لئے ایسی اشاعتیں مفید ہیں لیکن بار بار ایک ہی راگ الاپو تو سننے والے کو اس سے نفرت ہوجاتی ہے ۔ ان فرسودہ تخیلات کے بھونڈے تراجم پر آج کل جو محنت صرف کی جارہی ہے اگر وہی محنت اپنے ملک ، اپنی زبان اپنی تہذیب ومعاشرت اور غریب طبقہ کی ردی حالت کی اصلاح وترقی کے لئے اپنے ہی ذاتی واپجی خیالات پیش کئے جائیں تو ہمارا ماحول بہت کچھ بدل سکتا ہے ۔ سوائے سرورق کے موجودہ حالت میں اس ترجمہ میں کوئی بات قابل لحاظ نہیں ۔ ۲

خیابانِ نسواں نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد کے ان انشا پردازوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو زبان کے تاریخی و تحقیقی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ان کی بعض کتابوں نے اردو دانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے ۔ ہاشمی صاحب نے مستقل تصنیفات کے علاوہ کئی دلچسپ مضامین لکھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوکر زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ماہ نامہ "عصمت" کے بکڈپو کی جانب سے ان کے ان مضامین کا دوسرا مجموعہ مرتب کر کے چھاپا گیا ہے جو ہندوستان کی نسوانی زندگی سے متعلق ہیں ۔ بعض مضامین بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ان کو ضرور پڑھا جائے ۔

یہ کتاب (۱۲) میں عصمت بک ڈپو سے مل سکتی ہے ۔

انتظام کتب خانہ نوشتہ شیخ محبوب صاحب قریشی ، ناشر محبوبیہ کارخانہ جلدسازی نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن قیمت ۴ ر

شیخ محبوب صاحب قریشی ایک باہمت اور پرجوش حیدرآبادی ہیں ۔ ان کے دل میں علمی خدمت کا ایک قابل قدر جذبہ ہے اسی جذبہ کے تحت انھوں نے فن صحافی کو ماہرانہ طور پر حاصل کر کے جدید ترین وسائل کے ذریعہ "محبوبیہ کارخانہ جلدسازی" قائم کیا ۔ جس کے کام کی نفاست اور پائیداری اور نرخوں کی واجبیت تمام ہندوستان میں مشہور ہے اس کارخانہ کے قیام کے علاوہ انھوں نے تحفظ کتب کے لئے بعض قابل قدر ایجادیں کیں ۔ جلد کو پانی اور کیڑوں کے اثر سے بچانے کے لئے "محبوبیہ پالش" اور اوراق کی حفاظت کے لئے ایک کاغذ

تیار کیا۔ یہ ایجاد بیس عرصہ سو سال کی کاوش اور تجربات کا نتیجہ ہیں۔ آج کل وہ کتابوں کو دیمک سے بچانے کے لئے تجربے کر رہے ہیں۔ اگر یہ تجربے کامیاب ہو گئے تو ملک کی ناقابل فراموش خدمت ہوگی۔ حیرت ہے کہ ان علمی کاموں کے باوجود شیخ محبوب صاحب قریشی نے تحریری کام کے لئے بھی وقت نکالا۔ ان کی پیش نظر کتاب "انتظام کتب خانہ" ہے اگرچہ مدارس کے کتاب خانوں کے انتظام اور اُن کی ضرورتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے مفید ہوگا جو اپنی کتابوں کو کم سے کم خرچ سے سنوارنا اور ان کو ہر وقت پاکیزہ صورت اور نئی حالت میں رکھنا چاہتے ہوں۔ شیخ محبوب صاحب نے "سب رس" کے لئے ایک خاص "فائیل کور" بھی تیار کیا ہے جس میں "سب رس" کے بارہ شمارے حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں اور آسانی سے نکالے اور لگائے جا سکتے ہیں۔ اس پر سنہرے حروف میں "سب رس" بھی لکھا ہے۔
م

مسلمان اور تجارت

از ابوالمکارم محمد مشائخ صاحب عارف چیتاپوری۔ قیمت ۲ ر

ابوالمکارم عارف چیتاپوری نے "مسلمان اور تجارت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ زبان عام فہم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون عوام کے لئے لکھا گیا ہے اس زمانہ میں جب کہ تمام تر رجحانات سرکاری ملازمت کی جانب مرکوز ہیں، اس قسم کے رسالے بہت کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں عارف صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ ماضی پر ایک نگاہ بازگشت ڈالی ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی کے لئے "تجارت" کا پیشہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ جن مسلمانوں کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے وہ اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔ مصنف کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ م

انکشاف

از صاحبزادی قطب النساء بیگم صاحبہ۔ صاحبزادی قطب النساء بیگم صاحبہ خاندان شاہی کی ایک روشن خیال خاتون ہیں انھوں نے اپنے خاندانی حالات کو "انکشاف" کے نام سے ایک کتابی صورت میں ترتیب دیا ہے، اگرچہ یہ کتاب، ایک خاص خاندان سے متعلق ہے لیکن اس کی افادیت سے اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعے خانوادۂ آصفیہ کی ایک قابل احترام شاخ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عظیم المرتبت خانوادہ کی ایک لائق خاتون کی علمی خدمت کے لحاظ سے بھی وہ قابل مطالعہ ہے۔ ہم صاحبزادی صاحبہ کو ان کے علمی مشاغل پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے خانوادہ کی خواتین میں علم کا سچا شوق پیدا کر سکیں گی۔ م

روزنامہ مشیر ہند بمبئی

ابو سعید خان صاحب رفاعی جو حیدرآباد کے ایک معزز جاگیردار ہیں بمبئی سے روزنامہ "مشیر ہند" نکال رہے ہیں۔ اس روزنامہ کا مقصد حیدرآباد کے طبقہ جاگیرداران اور طبقہ صاحبزادگان کی صحیح نمائندگی اور مسلمانوں کی قومی خدمت کرنا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی خبریں، مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ زبان کا بعض وقت لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے اکثر غلطیاں نظر آتی ہیں۔ کتابت و طباعت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ رفاعی صاحب ان امور پر قابو پالیں گے۔ اس طرح ان کا یہ ایثار اہل ملک کو زیادہ استفادہ کا موقع دے گا۔ م

اردو ہفتہ وار بمبئی

خوشی کی بات ہے کہ اہل حیدرآباد میں صحافتی خدمت کا شوق روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے، طوفان اور مشیر ہند کے علاوہ ہفتہ وار "اردو" بھی ایک حیدرآبادی اہل ذوق جناب غالب صاحب حیدرآبادی کی ادارت میں نکلنے لگا ہے۔ اس کے تمام شمارے سلیقہ سے مرتب کئے گئے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ بہت جلد ترقی کے منازل طے کرے گا۔ اس کے شماروں پر ایک عمومی نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ "اردو" اہل حیدرآباد کی خدمت کے لئے جاری کیا گیا۔ اس میں ان ناجائز پروپگنڈوں کا جواب دیا گیا ہے جو بیرون ملک حیدرآباد کے خلاف کئے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے اس معاصر کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ م

تاریخ عدالت آصفی مصنفہ میر باسط علی خاں صاحب ام۔ اے (کنٹب) بار ایٹ لا قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

دولت آصفیہ کے قیام سے اب تک معدلت گستری و انصاف رسانی کے لئے متعدد عدالتوں اداروں اور محکموں کا قیام اور ان کی تدریجی ترقی کے متعلق آج تک کسی نے ایسی مسلسل مربوط اور جامع تصنیف ملک کے سامنے پیش نہیں کی جیسی کہ مولوی باسط علی خاں صاحب نے پیش کی ہے۔ دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا کہ بانیٔ سلطنت آصفیہ اور ان کے بیدار مغز و عادل جانشینوں نے ملکی ضروریات کے تحت وقتاً فوقتاً اپنی رعایا کی سہولتوں اور اس کے اطمینان کی خاطر ہر مذہب اور ہر فرقہ کے عقائد و معاشرتی اصول کا پورا پورا لحاظ کرکے اپنی قائم کردہ متعدد عدالتوں کے ذریعہ عدل گستری اور حق پسندی کا پورا حق ادا کر دیا۔

پیش نظر تاریخ عدالت آصفی تین سو چودہ (۳۱۴) صفحات پر مشتمل ہے جس کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ریاست حیدرآباد اور خاندان آصفی کی اجمالی تاریخ ہے، دوسرے باب میں ریاست حیدرآباد میں اسلامی قوانین کا تذکرہ ہے۔ تیسرا باب عہد آصفی میں عدالتوں کے قیام اور ان کے ارتقاء پر مشتمل ہے۔ اس باب کے مختلف حصے ہیں جن میں متعدد قدیم دفاتر عدالت ہائے فوجداری، دیوانی، اسمات ضلع و تعلقات مشترک عدالتیں اسپشل محکمہ جات، مجالس مرافعہ صدر وغیرہ کی تفصیل ہے غرض نہایت تفصیل اور قابل مصنف نے سلاطین آصفیہ کے طریقۂ عدل پر روشنی ڈالی ہے۔

چوتھا باب دور عثمانی میں عدالتوں کا نظم و نسق اور ان کی اصلاح و ترقی کے مفصل بیانات سے مملو ہے۔ پانچویں باب میں بلندی معیار وکالت و امتحانات عدالتی و انجمن وکلا، عدالت عالیہ کا حال درج ہے۔

چھٹا باب ان شہزادگان والا تبار، مشاہیر سلطنت، صدر اعظمان، مدار المہامان، معین المہامان، صدر المہامان، معتمدین عدالت، میر مجلسان و اراکین عدالت العالیہ وغیرہ کے دلچسپ اجمالی حالات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے اصلاحات و انتظام عدالت میں اپنی دلچسپی سے عملی حصہ لیا ہے۔

باب ہفتم میں صرف خاص مبارک اور علاقۂ غیر خالصہ یعنی پائیگاہوں، سمستانوں اور جاگیرات وغیرہ کی عدالتوں کے بیانات ہیں۔ اس گرانقدر کتاب کو اعلیٰ حضرت بندگان عالی، شہزادگان و شہزادیان والا تبار کے علاوہ قدیم مشاہیر حیدرآباد، اراکین کونسل قدیم و جدید مختلف عہدہ داران عدالت اور عمارات عدالت العالیہ و عدالت ہائے اضلاع کی دلکش تصاویر سے مزین کیا گیا ہے جو تعداد میں پچاسی (۸۵) ہیں۔ شروع میں رفتار عدالت کا نہایت عمدہ نقشہ دیا گیا ہے۔

کتاب "عادل حقیقی" کی بارگاہ میں نذر کی گئی ہے۔ ابتدا میں نواب سر امین جنگ بہادر کا قابل قدر پیش لفظ ہے۔ طباعت عمدہ اور کاغذ بھی اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ٹائٹل پیج ملک کے مایۂ ناز مصور قیوم کا تیار کردہ ہے۔ میر باسط علی خاں صاحب کی یہ کوشش لائق صد تحسین ہے کہ عہد آصفی کے اس روشن ترین پہلو کو اس قدر دل نشین اور عمدہ پیرایے میں ملک کے آگے پیش کیا۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہر آدمی بے اختیار مصنف کے ساتھ اس شعر کے دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ؎

ہر چند عدل جنس گراں بود در جہاں ارزاں بعہد رسید بہ بازار آصفی

ا۔ ح

مقالہ از مولوی عبد اللطیف صاحب منشی فاضل مولوی عالم لکچرار اخلاقیات ورنگل کالج۔ یہ چھوٹی سی کتاب ورنگل کالج کے صدر مولوی حفیظ اللہ صاحب بی۔ اے کی علمی اور ادبی دلچسپی کی وجہ سے شائع کی گئی ہے مضمون نویسی کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار باب ہیں (۱) مضمون نویسی کے مبادیات (۲) مضمون نگاری کی ہیئت (۳) مبادیات مضمون نویسی (۴) عناصر (۳) تعلیم مضمون نویسی ان میں مفید اور دلچسپ ہدایتیں درج کی گئی ہیں شروع میں ان بیس کتابوں کے نام بھی دئیے گئے ہیں جن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا گیا ہے ان میں ایک ڈاکٹر زور کی کتاب اسالیب بیان ہے لیکن تعجب ہے کہ اس موضوع کے متعلق اُن کی کتاب فن انشا پردازی کا مطالعہ نہیں کیا گیا حالانکہ یہ اس موضوع پر اسالیب بیان سے زیادہ اہم اور مفید ہے بہر حال مولوی عبد اللطیف صاحب نے وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ کے لئے یہ چھوٹا سا رسالہ مرتب کرکے کمی کو پورا کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ طلبہ کی سہولت کے لئے ایسی ہی کتابیں لکھی جائیں۔ ش

ادارہ متعدد خصوصی انعامات

کے ساتھ ... انعامات ... مکمل صحیح حل

... گا

معمہ زمرد اسپیشل ۲۲

۲۵۰۰ روپیہ انعام

انعام اول ۰۰۰ ... صحیح حل پر	تین انعام صحن کا پیسہ ترتیب اس کے مطابق	(۱) ۰۰ روپیہ کی ہیرا اسٹیرن واچ (کتاب چھاپ)
انعام دوم ۳۰۰ روپیہ ایک غلطی والوں میں		گراموفون والی قبر کے امیشوں ایک بیج ٹوٹن کارڈ
انعام سوم ۲۰۰ روپیہ دو غلطی والوں میں		(سب سے زیادہ تعداد حل پر)
انعام چہارم ۵۳۰ روپیہ کی زمرد اسٹکی تین غلطی والوں میں کسی ایک		(۲) ۱ سے سل قیمتی ... اس کے بعد کی تعداد پر۔
		(۳) اٹرمن فونٹن پن قیمتی ... اس کے بعد کی تعداد پر

اسپیشل انعام۔ ... ایک سو روپیہ ... مساوی تقسیم کر دئیے جائیں گے۔

صحیح حل ... قیمتی ... سے زائد

ہر ایک غلطی کے حل پر ایک فونٹن پن قیمتی ... سے زائد

اسپیشل ... [illegible]

... معمہ ... ایک ہی نام سے

معمہ زمرد اسپیشل نمبر (۲۲)

۴	۳ د	■	ل	ش	ی	پ	س	۱ ا
ا		۵ ع	■	■	ت	ب	ر	۲
	■	ا	■	۷		۸ غ	■	■
ڑ		۹	■		■	ش	ی	
ش	■		■	ی		ڑ	۱۰ غ	■
■	۱۳	ت	۱۲ ن	■	■	■		۱۱ ش
ے	ی	■	ا	■	ی	۱۵	ی	۱۴ د
و	ن	■		■		و		۱۶ ا
	ت	۱۹	■	ت	ف	ل	۱۸	■

اشارے آڑے

سب اعلان معمہ زمرد ــــ نمبر اسپیشل ہے۔

رباعی۔

زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
اور وقت مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے
یوں پیاس میں لاکر کوئی پانی نہ پلائے
اور بعد فنا فاتحہ ــــ پہ دلائے

(۱) غریبوں اور بے کسوں پر ظلم و ستم کرنیوالوں کو
ا کے ــــ سے ڈرنا چاہیئے۔
(۱) کسی کا ظرف دیکھنا ہو تو یہ دیکھیئے کہ وہ اپنے
ماتحت پر دوسروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے
(۱) فوق بے ترتیب۔
(۱) جب کوئی کام اپنی ــــ سے کیا جائے اور انجام ٹھیک ہو تو انسان نادم ہونیکے بجائے عموماً تاویلات پیش کرنے لگتا ہے
(۱) جنکی طبیعت میں ــــ ہو وہ اپنے اور دوسروں کے لئے باعث زحمت بن جاتا ہے۔
(۱) ملک کی معاشی ترقی کے لئے ــــ صنعتوں کی حوصلہ افزائی ہر اس شخص پر فرض ہے جو اپنے وطن کی ترقی کا
دلدادہ ہو۔
(۱) دیانت داری اور ساکھ کے لئے جو ــــ ضروری ہیں اُن سب کی معمہ زمرد کے کاروبار میں کامل پابندی کیجاتی ہے
(۱) انسان جب سکتہ کا شکار ہو جاتا ہے تو بعض اوقات احساس کا اسکے دماغی توازن کو الٹ دیتا ہے۔
(۱) بمعنی ظلم۔

اشارے کھڑے

حرف واؤ کی شناخت کے لئے (۱، ۵، ۱) احتیاطاً
علامت ہے اس کے علاوہ زیر زبر پیش وغیرہ
وغیرہ لکھے جائیں یا نہیں کوئی غلطی متصور نہ ہوگی
(۳) اگر یہ زرگ نرک کر چلنے لگے تو سمجھئے کہ غلطی ہوگئی
(۴) ایسے انسان کی طبیعت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل
ہوتا ہے جو اکثر و بیشتر ــــ رہے۔
(۵) وہ بھی کوئی انسان ہے جو اپنی ــــ
حکم کا خیال نہ رکھے۔
(۷) ایسے لوگ جن کی طبیعت ہی ــــ ہو
عموماً ہر دلعزیزی حاصل نہیں کر سکتے۔
(۱۲) مست شباب حسین عورت کا ــــ اپنے اندر
ایک ایسی دلکشی رکھتا ہے جس کے بیان کرنے کیلئے
شاعرانہ دماغ چاہیئے۔
(۱۳) نئے پرانے سبھی اس شخص کی عزت کرتے
ہیں جس کی ــــ اچھی ہو۔
(۱۵) جب مرض کا حملہ ہوتا ہے تو اس کا مریض بے چین ہو جاتا ہے
(۱۶) دارالخلافہ انگلی۔

تاریخ اشاعت صحیح ست۔ انعام یافتگان معمہ زمرد نمبر ۲۵ ۹ تیر ۱۳۴۲ف م ۱۴ مئی
معمہ نمبر ۲۳ ۱۶ تیر ۱۳۴۲ف م ۲۱ مئی ۱۹۳۳ء
تاریخ تقسیم انعامات — انعامات کی تقسیم چار بجے شام سے عمل میں آئیگی۔

بلدہ و اضلاع سے ہمارے دفتر پر وصولی حل کی آخری تاریخ ۶ تیر ۱۳۴۲ف م ۱۱ مئی ۱۹۳۳ء
اشاعت صحیح حل دفتر پر ۸ تیر ۱۳۴۲ف شام کے ۵ بجے اخبار رہبر دکن میں ۹ تیر
م ۱۴ مئی ۱۹۳۳ء

براہ کرم حل کے ساتھ اپنا پتہ واضح تحریر فرمائیے

مختصر شرائط و ضابطہ (۱) فیس شرکت فی حل ۴ ہر اور (۵) میں ۱۲ (۵) میں ۲۰ حل ایک ہی نام سے۔
(۲) اضلاع کے اصحاب کے لئے حل کے ساتھ رسید منی آرڈر منسلک کرنا لازمی ہے۔
(۳) علاقہ انگریزی کے اصحاب فیس ذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کراس کرکے روانہ کر سکتے ہیں۔
(۴) وصول شدہ رقم اور حل کسی صورت میں واپس نہ ہونگے مشتبہ حرف ایک غلطی متصور ہوگی۔ حل اگر نہ پہونچے تو کمپنی ذمہ دار نہ ہوگی۔ کسی کو ایک سے زیادہ انعام نہیں دیا جائے گا۔ مالک کمپنی کا فیصلہ ہر معاملہ میں قطعی اور قطعاً ناقابل تسلیم ہوگا۔ معمہ کے سلسلہ میں بالمشافہ گفتگو یا خط و کتابت کی اجازت نہیں۔ حل سادہ کاغذ پر یا مطبوعہ داخلہ فارم پر داخل ہو سکتے ہیں۔ جو دفتر سے بحساب فی پیسہ (۳) یا ایک آنہ میں اٹھارہ حل سکتیں۔ فیس میں ٹکٹ پیسہ قبول نہ ہوں گے

(منیجر شعبہ معمہ) **حیدرآباد ٹریڈنگ کمپنی**

نزد مرکز بہبودی اطفال
حویلی قدیم۔ حیدرآباد دکن

سب رس کے قلمی معاونین اور خریدار اصحاب سے

۱ ۔ بلدہ کے بعض خریدار اصحاب کے پتے غلط معلوم ہوتے ہیں یا واضح نہیں ہیں جس کی وجہ سے تسلیم کنندوں کو دقت ہو رہی ہے ۔ اور پرچے بعض پرچے نہیں پہنچ رہے ہیں یا دیر میں پہنچ رہے ہیں جن اصحاب کو ایک ہفتہ کے اندر پرچہ نہ مل رہے ہوں وہ اپنے ٹھیک پتے اور نمبر مکان وغیرہ سے مطلع فرمائیں ۔

۲ ۔ بعض اصحاب نے دفاتر یا مدارس کے پتے دئے ہیں ۔ اگر کسی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں چھٹیاں ہوں تو سب رس ان کو وقت پر نہیں پہنچ سکتا ایسے اصحاب اگر مکان کے پتے روانہ کر سکیں تو دفتر کو سہولت ہوگی ۔

۳ ۔ بلدہ کے بعض اصحاب بار بار پتہ تبدیل کرنے کی اطلاع دیتے ہیں یا اضلاع کے اصحاب عارضی طور پر بلدہ آکر اپنے پرچے طلب کرتے ہیں ایسی صورتوں میں اکثر پرچے وقت پر نہیں پہنچ سکتے ۔ اگر دو مہینے سے زیادہ قیام کرنا ہو تو قدیم پتہ [illegible] تبدیلی سے مطلع کر دیں تو رسالہ وقت پر مل جائے گا

۴ ۔ خریدار اور مضمون نگار اصحاب کے اتنے مختلف ری خطوط آتے ہیں کہ ادارہ ان کا [illegible] بعض [illegible] جواب کے لئے اسٹامپس روانہ نہیں کئے جاتے ان کا جواب کی توقع نہ رکھنی چاہئیے ۔ [illegible]

۵ ۔ بعض اصحاب اپنے مضمون یا نظمیں روانہ کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں رکھتے ۔ ہر مضمون یا نظم [illegible] کیوں کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ صرف خط کے نیچے دستخط کر دئے جاتے ہیں جو بعض اوقات [illegible] نظمیں ہوتی ہیں ان کے ختم پر نام لکھنا بھول جاتے ہیں ۔ جس سے بعض مضامین اور نظمیں [illegible]

سب رس کی جلد

سب رس کے سال بھر کے بارہ پرچوں [illegible] ایک [illegible] منقش ہے ۔ اور جس میں نہایت سہولت کے ساتھ ہر ماہ پرچہ [illegible] رکھنے سے پرچے خراب نہیں ہوتے اور نہ سب رس کے رنگین سرورقوں کو نقصان پہنچتا ہے [illegible] سال بھر کے سب رس کا مجموعہ [illegible] جلد بنوانا چاہتے ہوں وہ ابھی سے یہ فائیل کو خرید لیں تو ان کے رسالے محفوظ رہیں گے اور [illegible] ان کی میزوں و الماریوں کی آرائش و زیبائش میں بھی اضافہ ہوگا ۔ اس کی قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے [illegible] دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔

[illegible]

(۱)

نذرِ ولی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا نیا کارنامہ

ادارۂ ادبیاتِ اُردو اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتہ نوجوانوں کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے لئے قائم کیا گیا تھا اور خدا کے فضل سے اس اثنا میں اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کے اغراض و مقاصد میں توسیع عمل میں آئی۔ اور وہ اب حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی ادارہ بن گیا ہے جو اپنے مطبوعات کے ذریعہ سے اُردو زبان اور ادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں اُردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کرنا اور اہلِ ملک کو اُردو ادب کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں اس نے غیر معمولی کام کیا ہے۔ اس وقت تک ادارہ نے جامعہ عثمانیہ کے پچاسوں طلبہ کے مضامین کے مجموعے اور دیگر کتب شائع کی ہیں۔ اب اس نے اسی جامعہ کی ام۔ اے۔ کی طالبات کے مضامین کا یہ نفیس مجموعہ پیش کیا ہے جو اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔

اس میں دکن کی مایہ ناز خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔اے۔ محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی۔اے۔ محترمہ نعیم النسا بیگم صاحبہ بی۔اے۔ اور محترمہ نجم النسا بیگم صاحبہ بی۔اے کے دلچسپ مضامین شامل ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے سالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ مجموعہ کے متعلق ڈاکٹر زور کی یہ رائے ہے کہ

> ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدمِ اُردو تھے۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، اُن کے تخیل ان کے فنِ شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ اُن کے اسلوبِ زبان، اور انتخابِ الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اُردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب ان کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت اور جلد بندی ایسی ہی نفیس ہے جیسی کہ صنفِ نازک کی ایک نفیس ترین کتاب کے لئے ہونی چاہیے۔ نذرِ ولی، اقبال اور جوش کے کلام کے مجموعوں کی سائز پر نہایت دیدہ زیب جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس پر دو جگہ خوبصورت خطِ کوفی میں نام کے سنہری ٹھپے ہیں۔ تعداد صفحات ۲۵۰۔ قیمت مجلد عالہ ۸/

خواجہ حمید الدین مہتمم ادارہ

دفتر سب رس یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

محض خریداران سب رس کے لئے

صرف تین ماہ تک — اُردو کی مشہور و معروف کتابیں رعایتی قیمتوں پر

صرف سب رس کے خریداروں کو حسب ذیل بیش مشہور و معروف اردو کتابیں ۳۰ جون ۱۹۳۸ء تک ادارہ کی طرف سے رعایتی قیمت سے پیش کی جائیں گی۔

قیمتوں میں قابل لحاظ تخفیف کرانے کا واحد مقصد یہی ہے کہ ادارۂ سب رس چاہتا ہے کہ

(۱) سب رس پڑھنے والوں کے لئے وسعت مطالعہ کا زرین موقع حاصل ہو۔

(۲) بہترین اُردو کتابوں تک شائقین کی سہولت سے رسائی ہو سکے۔

(۳) کم صرفہ سے وہ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا دلچسپ کتب خانہ جمع کر سکیں۔

رعایتی قیمتوں اور بازار کی رائج قیمتوں کا مقابلہ کرلینے سے سب رس کی اس مفید تجویز اور ایثار کی اہمیت واضح ہو جائے گی

ہر فرمائش کے ساتھ سب رس کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

اگر دس روپیہ سے زیادہ کی کتابیں منگوائی جائیں تو محصول ڈاک دفتر سب رس ہی ادا کرے گا

نوٹ۔ اگر اس رعایت سے فائدہ اٹھایا گیا تو ادارہ کوشش کرے گا کہ اُردو کی دیگر مفید اور اہم کتابیں بھی اسی طرح رعایتی قیمتوں پر اپنے خریداروں کے لئے فراہم کر سکے۔

کتاب	مصنف	کیفیت	بازار کی قیمت	رعایتی قیمت
۱ اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	وہ معرکۃ الآرا کتاب جو یورپ میں دو سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی۔ سب رس کی اُن کے چار سو صفحات بارہ تصاویر مجلد	لے ۴ر	للعہ ۴ر
۲۔ اردو ادب بیسویں صدی میں	مولوی علی حسنین صاحب زیبا ام اے ریسرچ اسکالر	عہد حاضر کے اردو ادب کا پر لطف تبصرہ جس پر مصنف کو ام اے کی ڈگری حاصل ہوئی	۱۲ر	۸ر
۳۔ جدید اُردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	حالی سے لیکر موجودہ عہد تک اردو شاعری کے مختلف دبستانوں کی مستند اور مقبول باتصویر تاریخ	عار ۸ر	عار
۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات	مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل	یورپ کے کتب خانوں کی دکنی قلمی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ۔ سات سو سے زیادہ صفحات	للعہ	ے
۵۔ اُردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	اردو نثر نگاری کی تاریخ انشا پردازوں کی نثر کے اسلوب و خصوصیات پر تبصرہ جدید نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے	عہ ۲ر	۱۲ر
۶۔ یادگار ولی	مولوی سید محمد صاحب ام اے	اردو شاعری کے ابو الآبا حضرت ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار کا باتصویر دلچسپ مرقع	عار	عہ ۸ر
۷۔ ارمغان عزیزیہ	نواب عزیز یار جنگ بہادر	حیدرآباد دکن کے مشہور استاد اور باکمال شاعر کے بلند پایہ کلام کا مجلد باتصویر اور دیدہ زیب مجموعہ	عار	عہ ۸ر
۸۔ مرقع سخن جلد دوم	مرتبہ ڈاکٹر زورؔ	حیدرآباد کے پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو صفحات اور پچاس تصاویر مجلد	صمہ	للعہ
۹۔ سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت مستند انتخاب جس کے ساتھ حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی ہے	۱۲ر	۸ر
۱۰۔ خواتین عہد عثمانی	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	خواتین دکن کی پچیس سالہ ترقی کا مرقع۔ بقول مدیر معارف اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان کی منفرد کتاب	عمعہ	صمعہ
۱۱۔ مشاہیر قندہار دکن	محمد اکبر الدین صاحب صدیقی	دکن کے مشہور مردم خیز خطہ قندہار شریف کے اولیا علما و مشایخین اور شعرا و مصنفین کا باتصویر تذکرہ	عمعہ	۸ر

نمبر	نام کتاب	مصنف	کیفیت	بازار کی قیمت	رعایتی قیمت
۱۲	عہد ابراہیم عادل شاہ کے ادبیات و سیاست	مولوی علی محسن صاحب ایم اے	بیجاپور کی تاریخ کے ایک اہم دور کے متعلق نہایت دلچسپ اور مفید تحقیقی مقالہ جس پر مصنف نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی	عیر	عہ
۱۳	فن انشاپردازی	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	مضمون نگاری و انشاپردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے اور ترقی کے وسائل	عہر	۱۲/
۱۴	بادۂ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	دکن کے مشہور شاعر ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۱۵	مثنویات میر	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اردو شاعروں کے سرتاج میر تقی میر کی مثنویاں جو کئی قلمی نسخوں کے مقابلہ کے بعد حاشیہ و مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئیں	عا/	عیر
۱۶	تنقیدی مقالات	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	اردو و فارسی کے بہترین مصنفوں اور شاعروں کے کارناموں پر اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں صفحات ۲۹۶ مجلد	عہر	عا/
۱۷	کیفِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	مشہور شاعر سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۱۸	حضرت امجد کی شاعری	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	عہد حاضر کے سب سے بڑے اہل دل شاعر حضرت امجد کے کلام پر تبصرہ اور نمونہ	۱۲/	۸/
۱۹	متاعِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے جلد دیوانوں کا دلچسپ انتخاب مع حالات و تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۲۰	فیضِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	استاد الاساتذہ حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے حالات زندگی اور نمونہ کلام مع تصویر	۱۲/	۸/

جملہ ۱۲ ۱۱/ ۳۸ — ۴/ ۲۷

نوٹ بازار کی قیمتوں اور سب رس کی رعایتی قیمتوں کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ سب رس کے خریداروں کے لئے کتنی زیادہ سہولت بہم پہنچائی جارہی ہے یعنے بیس کتابوں کی خریدی پر سب رس کے خریدار کا بیک وقت گیارہ روپے آٹھ آنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ اہل ذوق اصحاب اس زرین موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے کیونکہ دفتر سب رس نے محض علم و ادب کی خدمت کی خاطر ان کتابوں کے مصنفین و مولفین سے قیمت کی یہ رعایت صرف تین ماہ کے لئے حاصل کی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

گولکنڈہ کے افسانے

دکن کی عظیم الشان قطب شاہی سلطنت کی شہرہ آفاق ثروت، تہذیب، معاشرت، اور اصلی زندگی معلوم کرنا ہو تو ڈاکٹر زور کے یہ عجیب و غریب افسانے ضرور پڑھئے۔ ان میں بقول مولانا عبدالحق بی اے معتمد انجمن سکریٹری اردو "تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

تاریخی معلومات کے علاوہ جو اصحاب جدید اردو نثر اور افسانوں کے پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے بھی **"سیر گولکنڈہ"** اور **"گولکنڈے کے ہیرے"** ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا، اور جنہوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

دونوں کتابیں با تصویر ہیں۔ سیر گولکنڈہ صفحات ۱۶۰ تصاویر ۱۲ اور قیمت صرف ۱۵/
گولکنڈے کے ہیرے مجلد ″ ۱۳۶ ″ ۸ ″ ″ ۱۲/

ہر کتب فروش اور علمی کرو دفتر **سب رس** یا **مکتبہ ابراہیمیہ** سے طلب کیجئے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

۱۔ **مرقع سخن** (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات، پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (صمہ) اس بیش قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ **مرقع سخن** (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (صمہ) اس جلد میں آں سلاطین و خانوادۂ آصفی و امرا کبار کے تذکرے بھی ہیں جن کی شاعری یا علم دوستی قابل ذکر ہے۔

۳۔ **سراج سخن** حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ام اے، ال ال بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲ر) مع تصویر خط سراج

۴۔ **ایمان سخن** استاد الشعرا شیر محمد خان ایمان حیدرآبادی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد صاحب لکچرار اردو صفحے (۱۲۰) قیمت (۱۲ر) ایمان عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ **فیض سخن** استاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۴۴) قیمت (۱۲ر) مع تصویر درگاہ فیض

۶۔ **بادۂ سخن** ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب۔ از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی۔ صفحے (۱۲۸) قیمت (۱۲ر) مع تصویر شاعر۔

۷۔ **کیف سخن** سید رضی الدین حسن کیفی کے حالات زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی۔ صفحے ۱۲۲ قیمت (۱۲ر)

۸۔ **متاع سخن** نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۲۵) قیمت (۱۲ر) مع تصویر شاعر۔

۹۔ **ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری** انگلستان کے مشہور شاعر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام جس نے اردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔ از مولوی میر حسن صاحب ام اے۔ صفحے (۱۴۴) قیمت (عہر) مع تصویر شاعر۔

۱۰۔ **ٹیگور اور اس کی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر اعظم کے حالات زندگی و تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے صفحات (۱۲۸) قیمت (۱۲ر)

۱۱۔ **ہوش کے ناخن** حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ام اے۔ صفحات (۹۲) قیمت (۱۲ر)

۱۲۔ **یوسف ہندی قید فرنگ میں** مرزا غالب مرحوم کے واقعہ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی صفحات ۸۰ قیمت (۸ر)

۱۳۔ **نذر ولی** بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طالبات جامعہ عثمانیہ کی نذر عقیدت صفحات (۵۰) قیمت مجلد (عار ۸ر)

المشتہر خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات اردو کی زیر طبع کتابیں

۱ ۔ گنج سخن ۔ انتخاب کلام حضرت میر احمد علی صفر مرحوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی سید محمد صاحب ام، اے ۔

۲ ۔ انتخاب کلام حکیم مظفر الدین صاحب فراج مرحوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

۳ ۔ گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش کی نظموں کا مجموعہ

۴ ۔ اردو مرثیہ نگاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے ۔

۵ ۔ شمس الامراء کی اردو خدمات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از نواب محمد ظہیر الدین خان صاحب بی، اے ۔

۶ ۔ تاریخ ادبیات انگریزی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی میر حسن صاحب ام، اے ۔

۷ ۔ تاریخ ادبیات عربی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی سید ابوالفیض صاحب ام، اے ۔

۸ ۔ تاریخ ادبیات اردو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام، اے، پی ایچ ڈی

۹ ۔ تاریخ ادبیات ہندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام اے ۔ ال ال بی

۱۰ ۔ تاریخ گولکنڈہ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام، اے ۔ ال ال بی ۔

۱۱ ۔ نقد سخن ۔ کلام فانی کی سخنورانہ تنقید ۔ از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ۔

۱۲ ۔ بہمنی تمدن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ۔ ال ال بی

ضمیمہ

ایک دلچسپ ڈرامہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی طالب علم کے واردات سفر یورپ نہایت دلچسپ اور اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب اے، آر، سی، اس، بی، اس، سی، سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ ہیں جنہوں نے طالب علم اور استاد دونوں حیثیتوں سے یورپ میں قیام کیا، مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور مغرب کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ایشیا اور یورپ کے طالب علموں کے حالات محاسن و نقائص اور ضروریات و رجحانات پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ اس کتاب کی دلچسپی اور مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف مصنف کا نام کافی ہے۔

ڈیمی تقطیع ۶،۷ صفحات۔ طباعت کتابت پاکیزہ قیمت صرف ۱۲ر دفتر سب رس یا مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد اضلاع، اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاصکر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوتی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعرا کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعرا سید احمد حسین امجد

رباعیات امجد حصہ اول	عہ
رباعیات امجد حصہ دوم	مہر
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجد سی پیوند	مہ
نذر امجد	۶ر
حج امجد	عاں
میاں بیوی کی کہانی	۴ر
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	سے
گلستان امجد	سے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

ارباب نثر اردو	عاں
گلشن گفتار	۱۲ر
مثنویات میر	عاں
ابتدائی فارسی	۱۲ر
یادگار ولی	عاں

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ارمغان عزیز	عاں
متاع سخن	۱۲

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

اردو کے اسالیب بیان	عہر
اردو شہ پارے	لے
روح تنقید	۱۲
تنقیدی مقالات	ہے
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عہر
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عاں
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	لے
فن انشاپردازی	عہر
طلسم تقدیر	۸ر
سیر گولکنڈہ	۱۵ر
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲ر

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

دنیائے افسانہ	عہر
کردار اور افسانہ	عہر
جدید اردو شاعری	عاں
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶ر
انگریزی افسانے	عہر

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

خیالات آزاد جلد اول	
خیالات آزاد جلد دوم	

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	۸ر
خواتین عہد عثمانی	۸ر
حضرت امجد کی شاعری	۱۲ر
مکتوبات امجد	۱۲ر
رہبر سفر یورپ	۱۲ر
ذکر نبی	۱۲ر

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

مہتمم

ماہنامہ



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن



زمرد اشو ـ زمرد لبنان

حیدرآباد دکن



دوسرا شمارہ

۱۴ نظمیں

۵ غزلیں

۶ افسانے

۷ عام دلچسپی کے مضمون

۵ علمی اور تاریخی مضمون

"ادارہ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

بہ اہتمام خواجہ حمید الدین

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب ازبس، لے لو — مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس، لے لو

سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ سلسلۂ ادبیاتِ اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہو گی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ و مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے ارباب تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ دو چیز یا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپے	دو روپے آٹھ آنہ	چھ آنہ
حیدرآباد سے باہر	چار روپے آٹھ آنہ	دو روپے بارہ آنے	سات آنہ

نرخنامہ اجرتِ اشتہارات

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۱۵ روپیہ	۶ روپیہ
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

سب رس

جلد ۱ شمارہ ۲

سنہ ۱۹۳۸ء

فروری

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

اداریہ

سب رس کا دوسرا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں بھی ہم نے مضامین کے تنوع اور معیار کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ سب رس کا پہلا شمارہ توقع سے زیادہ پسند کیا گیا۔ جس کے ثبوت میں ہندوستان کے کئی اہل رائے اصحاب کے خطوط ہمیں وصول ہوئے ہیں جن کو آئندہ کسی موقعہ سے شائع کیا جائے گا۔

سب رس کے آئندہ شمارہ میں کئی علمی و ادبی مضامین اور بلند پایہ نظمیں شائع ہو رہی ہیں۔ جن میں قاضی عبدالغفار صاحب کا ایک دلچسپ ڈرامہ اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کا مزاحیہ مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس شمارہ کا سرورق ملک کے نوجوان حسن کار مسٹر خلیل نے تیار کیا ہے۔ صاحب موصوف کو سرورق تیار کرنے کا خاص سلیقہ ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ "سب رس" کا سرورق ہر ماہ بدلتا رہے۔ انھوں نے بچوں کے سب رس (ما بت ماہ جنوری) کے لئے جو ٹائٹل بنایا تھا وہ بھی بہت پسند کیا گیا۔

گذشتہ سال ارباب کلیۂ بلدہ نے "یوم ولی" مناکر ایک قدیم اردو شاعر کی یاد تازہ کردی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولی اور دوسرے قدیم شعرائے اردو کے متعلق تحقیق کا ایک شوق پیدا ہو گیا۔ المؤسی نے ایک خاص نمبر اسی سلسلے میں شائع کیا اور ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اُن دلچسپ مضامین کا ایک دیدہ زیب مجموعہ "نذر ولی" کے نام سے عنقریب شائع ہو رہا ہے جن کو جامعہ عثمانیہ کی طالبات نے لکھا ہے۔ اس سال "اسلامک کلچر سوسائٹی" نے "یوم اقبال" مناکر موجودہ زمانے کے ایک پیام بر اور مستقبلی شاعر کا خراج تحسین ادا کیا۔ یوم اقبال کے سلسلے میں جو اثر آفریں علمی اجتماعات ہوئے اُن کی یاد عرصہ تک تازہ رہے گی۔ اس یوم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہز ہائنس شہزادۂ برار نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ملک نے اپنے ہر دلعزیز ولی عہد سلطنت کو ایک علمی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا۔ توقع ہے کہ اپنی آبائی علم پروری کے باعث ہز ہائنس اسی طرح علمی مظاہروں کی حوصلہ افزائی فرماتے رہیں گے۔

گزشتہ نمبر میں اقبال کی تصویر شائع کرکے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اقبال سے متعلق ایک مضمون شائع کریں گے۔ "یوم اقبال" کے سلسلے میں "اسلامک کلچر سوسائٹی" کی جانب سے اقبال سے متعلق مضامین اور نظموں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا گیا کہ ہمیں اقبال پر جو مضامین وصول ہوئے تھے ان کو بھی اس مجموعہ میں شریک کرنے کے لئے بھیج دیا جائے تاکہ شاعر کی خدمت میں ملک کی جانب سے یہ تحفہ بہتر سے بہتر پیرائے میں پیش کیا جاسکے۔

مشاہداتِ امجد

اس چمن میں سدا بہار نہیں
رنگِ دنیا کا اعتبار نہیں

بلبلے کو سکون ہو کیوں کر
خود سمندر کو جب قرار نہیں

دل میں ہر دم کشمکش ہو کیوں کر
کون سا گل ہے جس میں خار نہیں

"ہاں کبھی کا بھی ایک وقت آئے گا
کب تک آخر یہ بار بار نہیں"

میرے شکووں پہ ہنس کے کہتے ہیں
عاشقوں کا تو یہ شعار نہیں

ہائے وہ وعدہ کر کے فرمانا
کیا مرا تم کو اعتبار نہیں

کس قدر صاف دل رہا امجدؔ
اس کی مٹی میں بھی غبار نہیں

سید احمد حسین امجدؔ

پڑا رہنے دے

اپنے در پر مجھے اے حور پڑا رہنے دے
اپنے دل سے ہوں میں مجبور پڑا رہنے دے

نہ جلا کوند کے اے برقِ تجلی نہ جلا!
مجھ کو بے ہوش سرِ طور پڑا رہنے دے

جام پر جام پلا دیر نہ کر اے ساقی!
صدقے میخانے کے مخمور پڑا رہنے دے

نہ لگا ٹھوکریں ظالم نہ لگا رستے میں
گر پڑا ہے دلِ رنجور پڑا رہنے دے

نہ سہی سر ترے زانوں پہ مری جاں نہ سہی!
اپنے قدموں سے ذرا دور پڑا رہنے دے

میں کہوں ہاتھ یہ گردن میں پڑا رہنے دو!
آپ فرمائیے منظور پڑا رہنے دے

چارہ گر دیکھنا ہے ان کو اسی روزن سے
دلِ مجروح میں ناسور پڑا رہنے دے

میں گدائے درِ میخانہ ہوں ساقی مجھ کو!
کسی کونے میں یہیں دور پڑا رہنے دے

میرے دم سے ہے مزا جور و جفا کا قاتل
مجھ کو زخموں میں یونہیں چور پڑا رہنے دے

ہم سمجھ لیں گے یہی ہے ترے کشتہ کا کفن!
پرتوِ عارضِ پُرنور پڑا رہنے دے

ساقیا تیرے کرم سے نہ ہو محروم عزیزؔ
التجا ہے یہی مخمور پڑا رہنے دے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

مولوی عبدالحق بی ۔ اے



عہد حاضر کے اردو زبان کے سب سے بڑے محسن ، جن کی خدمات
کے اعتراف میں گذشتہ ماہ جامعۂ الہ آباد نے (ڈی لٹ) کی اعزازی ڈگری
پیش کی ہے ۔

علامہ راشد الخیری کی یاد

آج ہندوستان پورے دو سال سے اس مہتم بالشان ہستی کا ماتم کر رہا ہے جس کی پُر زور زبان و قلم نے طبقۂ نسواں کے اندر جدید خیالات کا بیج بویا اور جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ہندوستانی خواتین کے صنفی اور علمی مفاد کی حمایت اور خدمت میں گذارا۔ افسوس کہ ایسی عظیم المرتبت ہستی ہم سے ایسے وقت جدا ہوئی جب کہ ہماری صنفِ لطیف کی عام علمی سطح بام عروج پر گامزن ہو کر اوہام و خرافات سے بچ رہی تھی، اور یہ مظلوم طبقہ اپنی ترقی کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو چارہ ہے۔ ع

بجز تسلیم کے چارہ ہی کیا ہے حکم یزداں میں

مولانا کے خاندانی حالات حضرت خواجہ حسن نظامی ۷ر فروری ۱۹۳۶ء کے منادی میں لکھتے ہیں کہ "جد اعلیٰ مولانا ابوالخیر خیر اللہ صاحب شاہ جہاں کے زمانے میں عرب سے دہلی آئے تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ "خیری" کا لفظ لکھا کرتے تھے اور ان کا سارا خاندان بھی خیری لکھتا ہے۔ ان کے پردادا مولوی عبد الخالق صاحب تھے جن کا ذکر سرسید احمد خاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" میں لکھا ہے۔ میری اور مرحوم کی چالیس سال سے دوستی تھی جو آج موت نے ختم کر دی مگر یاد میری زندگی تک زندہ رہے گی۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب دہلی کے شہرۂ آفاق مصنف سے ان کی قریبی قرابت تھی۔"

ایسے زبردست مصنف کے انتقال پُر ملال سے نہ صرف طبقۂ نسواں کو بلکہ اُردو ادب کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ آج دنیائے ادب میں مرحوم کی دلآویز انشا پردازی اور بہترین افسانہ نگاری کا ڈنکا بج چکا ہے۔ نثر نگاری میں اُن کی فصاحت و بلاغت کی گل کاریاں چمنستان ادب کے لئے سدا بہار بنی ہوئی ہیں۔ ان کے ناولوں کے علاوہ رسالہ "بنات" "عصمت" اور "جوہر نسواں" کے مطالعہ سے علامہ کی غیر معمولی قوت نثر نگاری کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے جو بیش قیمت کتابیں، بے شمار مضامین، انہوں نے مظلوم و بے کس عورتوں کی اصلاح و ترقی کے لئے لکھے ہیں وہ ہر طرح قابل احترام اور لائق ستائش ہیں یہ حقیقت ہے کہ یہ امتیاز اور اعزاز علامہ مرحوم ہی کو حاصل ہے کہ جہالت اور غیر ضروری آداب زندگی میں جکڑی ہوئی افسردہ عورتوں کے لئے ہنسانے اور خوش کرنے والا ذخیرہ کافی مقدار میں بہم پہونچایا۔ مولانا کی آخری تصنیف "چہار عالم" ہے اور اُن کی جملہ کتابوں کی تعداد (۱۰۴) ہے اُن پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے تاہم "طوفان اشک" "جوہر عصمت" "سیلاب اشک" وغیرہ ایسی کتابیں ہیں، جن کا ایک ایک لفظ درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ سنگدل سے سنگدل پڑھے اور متاثر نہ ہو۔ مولانا کا سحر طراز قلم ایک طرف عورت کے ایثار، جفاکشی اور شجاعت و وفاداری اور جان نثاری کا دلچسپ منظر کھینچتا ہے تو دوسری طرف دولت اور رواج کی چوکھٹ پر مظلوم عورتوں کی قربانیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

مولانا انشا پرداز اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے۔ اُن کی شاعری بجا طور پر کشتیٔ نسواں کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُن کے کلام میں ایک عجیب یکسانیت ہے اور شروع سے آخر تک درد میں ڈوبے ہوئے بے لوث اور سچے واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

افسوس کہ طبقۂ نسواں کا یہ مخصوص شاعر مسلم الثبوت انشا پرداز اور زبانِ اُردو کا محسن ۳ر فروری ۱۹۳۶ء کی صبح کو داغ مفارقت دے گیا۔

ابوالمکارم محمد مشائخ عارف (چنیا پوری)

۷

نازونیاز

مجھے بھی عشق میں پامالِ ناز رہنے دے
نیاز مند کو صرفِ نیاز رہنے دے

کہا یہ کس نے کہ مل ہم سے اور عدو سے نہ مل
مگر کوئی سببِ امتیاز رہنے دے

سنے وہ یا نہ سنے اختیار ہے اُس کو
تو اپنے دستِ دعا کو دراز رہنے دے

کسی کا نقشِ قدم سجدہ گاہ ہے میری
نہ چھیڑ شیخ تری جانماز رہنے دے

مریضِ ہجر کے آثارِ زندگی معلوم
تسلیاں تری اے چارہ ساز رہنے دے

ہمارے داغِ جگر سے تجھے ہے کیا نسبت
چراغِ بزم یہ سوز و گداز رہنے دے

نہ جانے یہ دلِ پُر درد کیا ستم ڈھائے
ذرا جبینِ وہ مستِ ناز رہنے دے

ہیں خطِ شوق کے دو لفظ پُر اثر کافی
معینؔ عبارتِ جدت طراز رہنے دے

نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر معینؔ

شاعروں کا تخیل

ادب یا لٹریچر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاعری دوسرے سائنس۔ شاعری میں تخیل کی حکومت ہے اور دنیائے سائنس میں دلیل کا سکہ چلتا ہے۔ ناول اور ناٹک شاعری کی قلمرو میں پھلتے پھولتے ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمر سائنس کے ذیل میں شامل ہیں۔ شاعری کا میدان اندرونی خیالات ہیں۔ سائنس کی بنیاد بیرونی صداقتوں پر رکھی جاتی ہے۔ درخت سے پھل ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ سائنس داں اسے صاف طور پر دیکھتا ہے اور نتیجہ کتاب میں نوٹ کرتا ہے۔ مگر انسان کیسے عروج حاصل کرتا ہے اور کن غلطیوں کے باعث اس کا عروج تنزل میں بدل جاتا ہے، اسے دیکھنا سمجھنا اور پھر دوسروں پر واضح کرنا تخیل کا کام ہے۔ سائنس داں کا نظریہ دنیا فوراً تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن جب کوئی باکمال شاعر جذبات اندرونی کا کوئی راز حاصل کر لیتا ہے اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو لوگ اس کی صداقت میں شبہ کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ تخیل کا سنگِ بنیاد صداقت ہوتا ہے۔ جذبات کی سرکشی عقل کے قانون کو تسلیم نہیں کرتی۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ عقل کا فتویٰ کچھ ہے اور جذبات کا تقاضا کچھ اور۔ بالعموم اِس پُرلطف جنگ میں میدان اکثر جذبات ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔ بڑے سے بڑے خشک مزاج، اور نفس کش فلسفی واضحات سے وہ اثر لیتے ہیں جو ان کے فلسفیانہ خیالوں کے بالکل مخالف ہوتا ہے۔ شاعرانہ جذبات اُردو شاعری کی جان ہیں۔ اور شاعر ان کیفیات پر دل کھول کر بحث کرتا ہے ایک فاضل انگریز کا قول ہے .... "The human mind is essentially illogical"

"انسانی دماغ اصلاً غیر منطقی ہے"۔ ہر شخص کا تجربہ اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔ ایک ہی چیز کبھی ہم کو پسند ہوتی ہے اور کبھی ناپسند ایک ہی بات سے ہم خوش ہوتے ہیں۔ اور کبھی ناخوش۔ کبھی ابدی زندگی کی آرزو ہوتی ہے، کبھی فوری موت کی تمنا۔ کبھی ہماری طبیعت بلندی کی طرف مائل ہوتی ہے کبھی پستی کی طرف جھکتی ہے۔ کبھی سر میں غرور سماتا ہے، کبھی طبیعت میں انکسار آجاتا ہے کبھی اپنے علم پر ناز ہوتا ہے۔ کبھی اپنے جہل پر شرم آتی ہے، کبھی اپنی طبیعت پر اکڑتے ہیں۔ کبھی اپنی کمزوری سے دبتے ہیں کبھی اپنے اختیارات کے زعم میں اینڈتے ہیں۔ کبھی اپنی مجبوریوں کا احساس افسردہ و مضمحل کر دیتا ہے، کبھی ہر چیز پر پیار آتا ہے کبھی اپنی ہستی سے بھی دل بیزار ہو جاتا ہے، کبھی دل کی ترنگ کا یہ رنگ ہے کہ ایک ہجوم خلائق ہو اور ہم ہوں۔ کبھی طبع میں یہ موج سمائی ہے کہ ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اکثر و بیشتر اس طرح کی متضاد کیفیتیں ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہیں مگر اوروں کے یہاں یہ دل ہی دل میں رہ جاتی ہیں اور دنیا کو ان کی خبر نہیں ہوتی۔ شاعر کا کلام اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے، جہاں یہ سب تاثرات نظر آتے ہیں اُس موقع پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "شاعر کو جو بات کہنا ہے اور جو واقعہ بیان کرنا ہے اس کو وہ صاف صاف لفظوں میں کیوں نہیں ادا کر دیتا

یہ گل و بلبل کو بیچ میں کیوں ڈالتا ہے؟" سوال دلچسپ ہے ——— شائد میرا جواب بھی کچھ اس سے زیادہ ہی دلچسپ ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات رعنائی تخیل کے لئے اس کو اتنے پاؤں پھیلانے پڑتے ہیں کہ جذبات کی چادر کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں۔

شاعری پیغمبری کا ایک جزو مانی جاتی ہے۔ شاعری بیشتر موسیقی ہے۔ شاعری کی زبان کا پیدا کرنا ایک زبردست قوت ہے۔ یہ قلم کی وہ سہگیں طاقت ہے جس سے تلواریں پناہ مانگتی ہیں۔ دنیا ——— شاعر کی نگاہ میں ایک دلکش خواب ہے۔ اس کا سینہ گداز عشق سے معمور ہے۔ وہ الفاظ کا ایک کامیاب مصور ہے اور جمالیاتی تصورات کا نقاش ———!

انگلستان کے مشہور ادیب گولڈ اسمتھ کا مقولہ ہے:- "شاعری دراصل وہ ہے جس کہ اطمینانِ قلب کو ایک زبردست بھونچال (جو انسان کی پرسکون زندگی کے ساکت سے ساکت سمندر میں قیامت کا طوفان متلاطم کر دے) متزلزل نہ کر سکے۔ اور ایک نازک سے نازک شیشے ایک چھوٹے سے چھوٹے چینی کے برتن کی صدائے شکست اس کے آبگینۂ دل کو چکنا چور کر دے!"

عرب میں جب کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارک باد کی سفارتیں آتی تھیں۔ خوشی کے جلسے کئے جاتے تھے۔ قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر فخر یہ گیت گاتی تھیں۔ قبیلہ کی عزت و شان دفعتاً بلند ہو جاتی تھی۔ ایک ایک شعر قبیلوں اور قبیلے کے افراد کے ناموں کو قیامت تک کے لئے زندہ کر دیتا تھا۔

شاعر کے پاکیزہ تخیلات بڑے بڑے زاہدوں کے "صحوبات لاطائل" سے کتنے اچھے رہے!!

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں شعر خیالی باتیں ہیں کہ جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات، یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ مولانا آزاد آب حیات میں کہتے ہیں۔" شاعر صبح کا نور و ظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اڑاتا آتا ہے۔ صبح تبا شیر بکھیرتی آتی ہے۔ یا مثلاً سورج نکلا۔ اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئی۔ وہ کہتا ہے سنہری گنبد ہوا میں اچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی خرمن سحر کا غل۔ اور عالم نور کا جلوہ۔ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے بادشاہ مشرق سیر خنگ فلک سوار، تاج مرصع سر پر رکھے، کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی ہے۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے۔ اور روپہلی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنائع الہٰی سے ہے۔" شعر وہ وصف خاص ہے جس کو سب موزونیت کہتے ہیں۔ کلام میں نور زیادہ ہو جاتا ہے۔ مضمون میں ایک ایسا جادو بھر جاتا ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے۔

نثر ——— اپنی شائستگی اور تکلف کے بوجھ سے گراں بار تھی۔ نظم نے اس کی زندگی میں قدم رکھ کر اس میں ایک پرکیف رنگین ہلچل ڈال دی

اس کو شگفتہ اور ہر دلعزیز بنا دیا۔ ڈاکٹر تاثیر نے، شاعرِ ایران (خیام) کی ایک رباعی کا اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ صبح کی آمد شاعرانہ ہنگاموں سے کیسی پُر کیف ہے:۔

اب جاگ کہ شب کے شاغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے ... جو مئے تھی وہ سب بہہ نکلی ہے جو جام تھا پارا پارا ہے
مشرق کا شکاری اٹھا ہے کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں! ... اک پیچ میں قصرِ اسکندر اک پیچ میں قصرِ دارا ہے

شاعرِ عرب کا تخیل:۔ "صبح ہوتی جاتی ہے۔ اور فجر کی آنکھوں سے سیاہی کا سرمہ بہتا جاتا ہے"۔ مچھلی سمندر میں خاموش ہے۔ درندے صحرا کی غار دار خشکی پر شور مچا رہے ہیں۔ پرندے ہوا میں نغمہ ریز ہیں۔ لیکن شاعر کے دل میں سمندر کی خاموشی زمین کا شور اور ہوا کا نغمہ ــــ یہ تینوں کیفیات بیک وقت موجود ہیں ــــ شاعر روحانی قوتوں کا مصور ہے۔ اس کی روح میں آٹھوں پہر ہلچل رہتی ہے۔

اس کے تخیل کی دنیا ہی انوکھی ہے۔ کہیں اس کی مرضی یہ ہے کہ چاندنی رات ہو۔ ایک چھوٹے سے بجرے میں پھول ہی پھول لدے ہوں۔ ان پھولوں میں بیٹھا نہایت لطافت و نزاکت سے وہ بربط بجا رہا ہو۔ بجرا پانی کی پُرسکون سطح پر لہریں لیتا چلا جا رہا ہو۔ یکایک دریائے زندگی کا کنارہ آجائے اور وہ خوش خوش پار اتر جائے۔

کبھی اس کی کوئی شام کسی ندی کے کنارے گذرتی ہے۔ وہ بیٹھا ہوا ہے مبہوت، ساکت۔ اس کی نگاہوں میں ندی کا کنارہ ایک رنگین تصویر معلوم ہوتا ہے۔ فضائے بسیط کی خاموشی کسی کی یاد کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ دریا رنگین ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے دور آسمان سے جا ملا ہے۔ آفتاب کی رنگین نڈھال کرنیں اودی اودی مغربی گھاٹیوں میں منہ چھپا رہی ہیں ــــ رفتہ رفتہ آسمان کا نیل ڈھلنے لگا ــــ تاروں کا عکس سطحِ آب پر رقصاں ہو گیا ــــ!

لیکن اس کے نزدیک زندگی میں صرف پھول ہی پھول نہیں ہیں۔ اس کے ارد گرد کانٹے بھی ہیں۔ زندگی محض ہنسنے اور گانے سے وابستہ نہیں ہے۔ اس میں رونے پیٹنے کا بھی عنصر موجود ہے۔ زندگی صرف محبت کرنا اور کامیاب مرجانا ہی نہیں ہے۔ اس میں جدوجہد کے بعد بھی ناکامیاں بھری ہیں۔ اس کی کشتیٔ حیات جب تک موجوں کے تھپیڑوں سے نہ کھیلے ساحل سے لطف اندوز نہیں ہوتی۔ اس کے بعض نغمے ایسے بھی ہیں جن کے لئے نغمے کہلانا ذلت ہے جب تک وہ فضائے ہستی میں نہ گونجیں، کائنات سے نہ ٹکرائیں آسمان و زمین ایک نہ کردیں ــــ!

اگر زندگی میں صرف خوشیوں کے سیلاب آئے ہوئے ہوں، کامیابی کی فراوانیاں ہوں، مگر جب تک زندگی کی لہروں پر شاعری کے قوسِ قزح کا عکس منعکس نہ ہو زندگی ایک تردد ہے بے پایاں، ایک ملال ہے عمیق!!

کوئل کی آواز، جو اس غریب کا تنہا ذریعہ مسرت و شادمانی ہے پپیہے کی آہ، شاعر کا نالہ، اور گل کی واماندگی، یہ سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ سب پریشانیٔ خاطر اور مجبوریٔ محبت کی نشانیاں ہیں ــــ اگر آج شاعری نہ ہوتی تو یہ راز سربستہ ہی رہ جاتا کہ کائنات کا مفہوم کیا ہے ــــ

شعر، الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔ شعر کی لطافت، زبان کی درستی، محاورہ کا صحیح استعمال، رمز و کنایہ قصص و تلمیح، صنائع کا ایک دفتر بے پایاں، تشبیہات کا ایک جوئے رواں ——— حسن کا ذکر ہو تو یوسف موجود ہوں ——— عمر کا بیان ہو تو حضرت نوح سامنے ہوں ——— یہ شاعری کی ہلچل ہے۔

شاعری بہ اعتبارِ جذبات، ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہیں۔ جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں، نفیس اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں ——— شاعر کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے، جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں ——— شاعر کی ایک آہ جو دل سے نکلی ہو، ایسی ہزار صوفیانہ ریاضتوں اور اعمال پر بھاری ہے، جن میں شائبۂ خلوص نہ ہو ———

شاعری ——— تو فسانۂ زندگی ہے!!

شاعر کی آنکھ سے نکلا ہوا ایک آنسو، جس نے شعر کی شکل اختیار کر لی ہے!

ایک پرکیف اور وجد آفریں نغمہ، جو شاعر کے سینہ کو چیر کر پھوٹ نکلا ہے۔ ایک دلاویز خواب جو شعر کی شکل میں جلوہ آرا ہے۔ شاعر کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ایک شفاف چشمہ جس کی روانی نے سنگین خس و خاشاک کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔ الفاظ کی ایک مرصع تصویر جس نے دیکھنے اور سننے والے کو مبہوت کر دیا۔ الفاظ سے تراشا ہوا ایک بہترین شاہکار جس کے ہر پہلو سے شعریت برس رہی ہے۔

کیفیاتِ قلب اور جذباتِ دل کو شاعر جس والہانہ انداز سے پیش کرتا ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔

جہاں بانو بیگم (بی اے)

وہ جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے ہیجان میں فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے، وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے اور جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے۔ میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا ہوں اور اسی کے گیت گاتا ہوں۔

نذرالاسلام

مقبرۂ رابعہ دورانی

مقبرہ حسین کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیا حسن اور غم میں کوئی ربط باہمی ہے؟

"مقبرۂ رابعہ دورانی" کہنے کو "تاج محل" کی نقل ہے لیکن بجائے خود حسن کارانہ تعمیر کا ایک حسین نمونہ ہے۔ اس کے پُرسکون ماحول میں شاعر کی زندگی کا ہر لمحہ جذبات و احساسات کی ایک دنیا لئے ہوئے آتا ہے اور شباب و شعر کا ایک نغمہ چھوڑتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ باقی صاحب کی یہ نظم اس بہشت مختصر کی مکمل تصویر ہے۔

"سب رس"

کس درد سے چھڑنے لگا پھر سازِ محبت
کس سمت سے آنے لگی آوازِ محبت؟

ماتم کدۂ حسن کی اس نوحہ گری میں
حسرت کدۂ عشق کی خونیں جگری میں

ہے درد کی دنیاؤں کا اک آئینہ خانہ
کس شان سے ہے جلوہ نما غم کا فسانہ

دروازے پہ جو حوض ہے، سرشارِ الم ہے
دنیائے محبت کا چھلکتا ہوا غم ہے

یہ جوئے رواں اشکِ رواں کی ہی نشانی
ماں کے لئے خونبار ہے بیٹے کی جوانی

ہیں سرو کی مانند نکلتی ہوئی آہیں
جو ڈھونڈتی ہیں عرصۂ افلاک کی راہیں

مینار نہیں، دستِ دعا فاتحہ خواں ہیں
دریوزہ گرِ رحمتِ خلاقِ جہاں ہیں

گنبد میں سدا گونجتا ہے نالہ و فریاد
بے ساختہ کرتا ہے کوئی نام خدا یاد

بے رحم ہے اور خانہ برانداز زمانہ
دنیا سے مٹا دیتا ہے دنیا کا فسانہ

آنکھوں میں جفاکار کے جچتا نہیں کوئی
اس دشمنِ بیدرد سے بچتا نہیں کوئی

برباد نہ کر دے کہیں، اس جنتِ غم کو
بے نور نہ کر دے کہیں، اس دل کے حرم کو

اس واسطے معمار نے اس خلد بریں میں
اک ماں کے دھڑکتے ہوئے سینے کی زمیں میں

صورت گریٔ درد، اس انداز سے کی ہے
گویا غمِ جاں، مطلعِ حسنِ ازلی ہے!

تابندگی و رفعتِ ارمان سے دیکھو
اس غم کے فسانے کو اسی شان سے دیکھو

عبدالقیوم خاں باقی (ام ۔ ۴)

فطرت

دنیا بھر کی عورتوں نے مل کر ایک مجلس قائم کی۔
فرعون کے محلات میں یہ مبارک رسم ادا کی گئی تھی۔
اِن سب نے مل کر ایک عورت کا انتخاب کیا۔
وہ پُر شکوہ۔ باوِقار۔ خوبصورت ہمہ صفت موصوف۔
یقیناً ایک غیر معمولی عورت تھی۔
جس کو مجلس کی طرف سے ملکہ کا خطاب دیا گیا تھا۔
سال گزر گیا پھر مجلس کا دن آیا۔
فرعون کے محل اور اس کے ایوانوں کو عروسِ نو بنا دیا گیا
جس طرف دیکھو جاہ و جلال اور دلکشی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔
مصر میں یہ ایک ایسا تہوار منایا جانے والا تھا۔
جس کی مثال پہلے کہیں ملتی نہ تھی۔
مجلس نے ملکہ کی شان اور رتبہ کے مطابق اس کے خیر مقدم کی تیاریاں کی تھیں
ہر دل عقیدت سے لبریز اور نگاہیں احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔
ایک لونڈی برہنہ اندر داخل ہوئی۔
اس نے لکنت لیتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔
ملکہ نہ آئے گی کیونکہ اس نے ایک مرد کی اطاعت قبول کر لی ہے۔

(خان بہادر) عبدالرحمٰن چغتائی

زندگی کے مظاہر

مسٹر مہندر راج سکسینہ کا یہ مضمون دراصل "زندگی کیا ہے؟" کا اختتامی حصہ ہے، علمی مباحث کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ فنی ہونے کے باوجود عام فہم بھی ہوں، سکسینہ صاحب کی جولانیٔ قلم کا بہترین ثبوت ہے۔ یقین ہے کہ "زندگی کیا ہے؟" کی طرح "زندگی کے مظاہر" کا مطالعہ بھی دلچسپی سے کیا جائے گا۔

"سب رس"

مظاہر زندگی کو اختصاراً تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ حرکت ۲۔ تغذیہ ۳۔ تولید و نمو

حرکت ۔ خوردبینی امتحان سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدائی عضویوں یا کسی جاندار کے خلیہ کی زندگی کا پہلا ثبوت اس کی آزاد حرکت ہے جس کو عموماً ارادی حرکت کہا جاتا ہے اور شاید اسی ارادی حرکت کی بنیاد سے "اندرونی عزیزی قوت" کی موجودگی کا تصور قائم کیا گیا ہے لیکن حقیقت پوچھئے تو زندگی کے دیگر مخصوص کئے ہوئے حواس کی طرح حرکت بھی دراصل تخم مایہ کے طبعی و کیمیائی تعاملات کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کسی غیبی قوت کو مطلق دخل نہیں۔

جس واسطے میں ابتدائی عضویے پائے جاتے ہیں وہ پانی ہے۔ اور پانی میں آکسیجن کی کم و بیش مقدار حل شدہ ہوتی ہے۔ یہی گیس ہے جو تخم مایہ کے مختلف اجزاء کے ساتھ ہمیشہ متعامل رہتی اور انہیں اکساتی ہے۔ "وَرورن" نے ثابت کیا ہے کہ اگر واسطے میں سے آکسیجن کو بے دخل کر دیا جائے تو امیبا یا ایسے ہی ادنٰے جانوروں کی تخم مائی حرکت مطلقاً بند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا "ڈانٹک" کے قول کے مطابق "زیادہ تر حرکت کی وجہ تخم مایے کے اجزاء کے ساتھ آکسیجن کا متواتر تعامل اور غیر متوازن کیمیائی کیفیتوں کی پیدائش ہے"

ٹھیک یہی کیفیت روشنی کی ہے۔ حیاتیات کے معملوں میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ زندہ عضویوں سے بھرے ہوئے مرتبان کے اس رخ پر جو دریچہ کے قریب ہوتا ہے عضویے کھنچ آتے ہیں۔ مثلاً یہ کیفیت بعض جراثیم۔ آلجی کے جواں بذروں۔ ڈیاٹمس اور ڈسمڈس اور ایوگلینا وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس مظہر کو بھی خوش اعتقادی کے تحت مختلف باتوں پر محمول کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ نور کے رخ جانداروں کی کشش بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ روشنی مبدء زندگی ہے اور ہر شئے اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ادب میں شمع و پروانہ کے سوز و تپش اور راز و نیاز کے ہزاروں افسانے بن گئے۔ ورنہ بات اصل میں کچھ اور ہی ہے۔

عموماً مختلف کیمیائی تعاملات میں روشنی کو بڑا دخل ہے۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن اور کلورین کو لیجئے۔ ان دونوں گیسوں کے آمیزہ کو اندھیرے میں رکھا جائے تو ان میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ لیکن جوں ہی اسے آپ کسی تیز روشنی کی زد میں لے آتے ہیں یہ گیسیں تیزی سے تعامل کرنے لگتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تخم مایے کے نامعلوم کیمیائی تعاملات کے وقوع کے لئے روشنی اس طرح کا عمل کرتی ہو

اور یہ عمل عضویے کی زندگی پر فائدہ بخش اثر رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں عضویہ کا میکانی طور پر نور کی جانب رجوع کرنا قابل تعجب بات نہ ہوگی۔ اسی طرح ۱۸۸۴ء میں اپنی تحقیقات کے ذریعہ Stahl اور Pfeiffer نے یہ ثابت کیا کہ جاندار عضویوں پر غذائی مادوں کا مختلف اثر ہوتا ہے۔ کسی کاشت میں جس سے مصنوعی طور پر غذائی مادوں کو کم کردیا گیا ہو ایک قطرہ ماء اللحم ڈال دیجئے پھر دیکھئے کہ اس قطرے کے اطراف ہزاروں کی تعداد میں عضویے جمع ہوگئے ہیں۔ معلوم کیا گیا ہے کہ اس کیفیت کا اظہار بھی ان کیمیائی تعاملات کا نتیجہ ہے جو تخمِ مایہ اور غذائی مادوں کے درمیاں بہ سرعت واقع ہوتا ہے۔

تغذیہ عمل تغذیہ تخم مایہ کا ایک واضح فعل ہے۔ جاندار چیزوں کی یہ خصوصیت بتلائی جاتی ہے کہ وہ بے جان مادوں کو استحالے کے بعد اپنے جیسی شئے میں تبدیل کرسکتی ہیں اور یہ کہ اس قسم کی تبدیلی کی محرک اصل "غریزی قوت" ہے۔ جس کی مدد کے بغیر سادہ غیر نامیاتی مرکبات جاندار رطوبتوں میں تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔

لیکن بہ نظر غائر دیکھئے تو یہ دعویٰ بھی اگلوں کی طرح محض قیاسات کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ تغذیہ کا عمل بھی ایک پیچیدہ کیمیائی عمل ہے جس میں استحالہ اور انجذاب کے افعال نمایاں ہوتے ہیں۔

حال حال تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ استحالہ کاربن اور غیر نامیاتی عناصر کے نامیاتی مرکبات میں ترکیب کر سبز پودوں ہی تک محدود ہے اور یہ کہ جانور اپنی نامیاتی غذاؤں کے لئے پودوں کے رہین منت ہیں۔ پودے کے ان حصوں میں جو روشنی کے قریب ہوتے ہیں ایک سبز مادہ ہوتا ہے جسے سبزی (Chlorophyll) کہتے ہیں۔ سبزی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ روشنی اور ایک خاص تپش کی موجودگی میں ہوا کے CO_2 کاربن ڈائی اکسائیڈ کو جذب کرتی ہے۔ جس سے خلیہ کے اندر کاربوہائیڈریٹیں یعنی نشاستہ کے قسم کے مرکبات تیار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ زمین سے بھی اپنی جڑوں کے ذریعہ مختلف غیر نامیاتی نمک کے محلول، نائٹریٹ سلفیٹ وغیرہ جذب کرلیتے ہیں۔ اور یہ Protein کی تیاری میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو تخم مایہ کا جزو اعظم ہے۔

بادی النظر میں یہ امر حیرت انگیز ہے کہ کس طرح خلیہ سادہ غیر نامیاتی اشیاء کو جاندار مائع میں تبدیل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس عقدہ سے ابتدائی صدی کے سائنس داں متاثر ہوگئے اور چونکہ وہ اس عجیب مظہر کی کوئی خاطر خواہ توجیہہ کیمیائی یا طبعی اصولوں کے تحت نہ کرسکتے تھے اس لئے انھوں نے یہ فرض کرلیا کہ بے جان غذائی مادوں کو تخم مایہ میں تبدیل کرنے کے لئے ایک غیبی قوت کی نگرانی کی ضرورت ہے اور مبہم قوت کو قوت غریزی کہا گیا۔

جراثیم اور بعض Torulae پر تجربوں کے دوران میں معلوم کیا گیا کہ اگر ان عضویوں کو آب کشیدہ۔ ٹارٹرک اسڈ اور امونیا کے محلول میں رکھا جائے تو وہ نہایت سرعت کے ساتھ نمو پاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ یہ اشیاء جن کے اجزائے ترکیبی کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور آکسیجن ہیں ان کی تخم مائی بناوٹ کے لئے کافی ہیں۔ اس صورت میں یہ سوال یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے زیر اثر ایسے سادہ غیر نامیاتی مرکبات کو پیچیدہ جاندار تخم مایہ میں تبدیل کیا جاتا ہے؟

موجودہ علم کیمیا میں بعض ایسی اشیاء کی دریافت پر بہت اہمیت دی جاتی ہے جنھیں تماسی عامل کہا جاتا ہے۔

یہ ایسے مادے ہیں جو کسی کیمیائی عمل میں سرعت و تیزی پیدا کر دیتے ہیں بلکہ بعض تعاملات تو سادہ حالات میں بغیر ان کی موجودگی کے ہو نہیں سکتے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ خود آخر تعامل میں غیر متاثر رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پلاٹینم کے مہین ذروں کو لیجئے جب ان پر سے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا آمیزہ ایک خاص تپش پر گزارا جاتا ہے تو دونوں گیس سرعت سے ملاپ کرتی اور پانی بناتی ہیں۔ یہی حال بعض ایسے نامیاتی مرکبات کا ہے جنھیں (Enzyme) خامرے کہا جاتا ہے۔

(Enzyme) پیچیدہ نامیاتی مرکبات ہیں جو کم و بیش ہر جاندار عضویے میں پائے جاتے ہیں اور نہایت قوی تماسی عاملی خصوصیات رکھتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں انھیں علٰحدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بعض کیمیائی تعامل ان کی موجودگی میں نہایت آسانی سے ہوتے ہیں مثلاً خمیر کے خلیوں سے ایک خامرہ حاصل کیا گیا جسے (Zymase) کہتے ہیں اور جب معمولی انگوری شکر کے محلول میں اسے داخل کیا گیا تو وہی کیفیت پیدا ہونے لگی جو عمل تخمیر کے دوران میں نظر آتی ہے۔ یعنی شکر کی کچھ مقدار الکوحل اور کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بسرعت تبدیل ہونے لگی۔ نیز توانائی کی ایک خاص مقدار بھی آزاد ہوئی۔

Ost wald - Hoff meister - Ver worm اور دیگر سائنس دانوں نے یہ بتلایا کہ خلیوں کی زندگی میں خامروں کو بہت دخل ہے۔ اور یہ کہ زندگی کے مختلف افعال جن میں تغذیے کو نمایاں جگہ حاصل ہے ان کی موجودگی میں سرانجام پاتے ہیں Ost wald نے ایک تقریر کے دوران میں جو ۱۹۰۱ء میں بمقام ہامبرگ کی گئی تھی کہا تھا کہ "ہم Enzymes کو تماسی عامل تصور کرسکتے ہیں جو عضویے کی زندگی کے دوران میں اس کے خلیوں میں پیدا ہوتے اور اس کے "افعال غریزی" کی بابجائی میں مدد کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف شروع سے آخر تک استحالہ و انجذاب پر مکمل قابو رکھتے ہیں بلکہ ان کی موجودگی سے تکسیدی عمل کے دوران میں وہ توانائی آزاد ہوتی ہے جس کو "غریزی قوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں" اس طرح Ost wald صاف و صریح الفاظ میں عمل تغذیہ کو محض ایک کیمیائی عمل تسلیم کرتا ہے۔

تولید و نمو تقریباً نصف صدی قبل بھی عمل تولید کے لئے کسی نامعلوم توانائی کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی تھی چنانچہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں جو "غریزی قوت" پر یقین رکھتے تھے یہ مظہر بھی ایک زبردست دلیل تھا اور اس کا ایقان تھا کہ عمل تولید پر صرف جاندار شے قادر ہوسکتی ہے۔ اور اسے کسی کیمیائی یا طبعی اصول کے ذریعہ کبھی سمجھایا نہیں جاسکتا۔

سچ پوچھئے تو خلیہ کی سادہ تقسیم (Fission) کی کیفیت جو پیچیدہ تولید کا پیش خیمہ ہے۔ جانداروں کے علاوہ بعض غیر جانداروں میں بھی دیکھی گئی ہے Monte gomey کی تحقیقات اس ضمن میں نہایت دلچسپ ہیں۔ اس محقق نے دیکھا کہ Myeline جو ایک پیچیدہ شحمی مرکب ہے اور بیضے کی زردی یا اعصاب سے حاصل کیا جاتا ہے جب پانی میں ڈالا جاتا ہے تو اس سے نہ صرف خلیہ کے مشابہ اشکال پیدا ہوتی ہیں بلکہ مہین و نازک نلی نما ساختیں بھی جو ہر سمت ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس طرح ایک عرصہ قبل Robin نے بتلایا کہ بعض بے جان شحمی مادے جو جانوروں کے جسم سے حاصل کئے جاتے ہیں اور خصوصیت سے وہ جنھیں خون سے تیار کیا جاتا ہے۔ جب پانی اور البومنی سیال سے تماس میں آتے ہیں تو ان سے جاندار نخزایے کی سی کیفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے

Robinson کے الفاظ میں " ان مرکبات سے مختلف الاشکال نسیجیاتی ساختیں نلی نما، کعبی، پیچدار، غصنی وغیرہ پیدا ہوتی ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب باتیں یہ ہیں کہ یہ شکلیں جاندار عضویوں کی طرح تقسیم اور مسلسل پھیلاؤ، تناؤ سے تیز حرکت کرتی ہیں چنانچہ خوردبین میں کھوکھلے اجسام اسی طرح تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں گویا کوئی جاندار اجاتی تولید کر رہا ہے "۔

یہ شحمی مادے نخزمایے کی طرح پیچیدہ سالماتی ساخت کے ہیں اس لئے ان میں یہ تبدیلیاں غالباً سالمات کے اندرونی ردوبدل کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ہوبہو نخزمایے کی ان مخصوص خصوصیتوں سے مشابہ ہیں جن کے مجموعہ کا نام " زندگی " دے دیا گیا ہے۔

تولید کی ابتداء شاید اس طرح ہوئی کہ خلیہ کے نمو کے دوران میں اگر اسے کافی غذا اور موافق حالات میسر آئیں تو اس کے نخزمائی مافیہ میں بسرعت زیادتی ہوتی ہے۔ نیز چونکہ خلوی دیوار نہایت لچکدار ہونے ہوتے بھی ایک خاص حد سے زیادہ پھیل نہیں سکتی اس لئے اس پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس صورت میں مرکزہ جو خلیہ کی منتشر قوتوں کا مرکز ہے پھولے ہوئے خلیہ کے بڑھتے ہوئے دائرہ عمل پر اپنا قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ایک دوسرا مرکزہ پیدا ہو جاتا ہے جو امّ المرکزہ کی تقسیم سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزہ کی تقسیم کے دوران میں آپ خلیہ سے قبل ام المرکزہ کی تنصیف دیکھتے ہیں۔

ماہرین کیمیا و حیاتیات کا یہ یقین ہے کہ جاندار نخزمایے کی سالماتی ساخت نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ اور یہ کہ وہ مسلسل تغیر و تبدل کی حالت میں ہوتے ہیں جس کے نتائج کے طور پر آپ ان تمام مظاہر زندگی کو رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جنھیں اس سے قبل بیان کیا گیا ہے۔ مہاتما بدھ نے تقریباً ڈھائی ہزار سال پیشتر زندگی کو شعلہ سے مشابہت دی تھی۔ اور یہ آج بھی صحیح ہے۔ یقیناً وہ شعلہ کی طرح ایک لامتناہی تغیر کی حالت میں ہے جس کے سالمات مسلسل تکسید و تحویل میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا تغیر لامختتم زندگی کی اساس ہے۔ اور زندگی نام ہے مخصوص مادے کے سالمات کی ہر لحظہ تبدیل پذیر حالت کا۔

ان حالات کے پیش نظر اگر آپ یہ کہہ دیں کہ جاندار اور بے جان مادوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہ ہوا تو یہ غلط نہیں ہے اس لئے کہ جاندار اور بے جان دو نہایت ہی غیر قیام پذیر حالتیں ہیں جو ذرا سے تغیر سے ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اور موت ان دونوں مروری حالتوں کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔ جہاں حیات اور عدم حیات کی حدیں ملتی ہیں۔ لہٰذا اس وقفے (موت) کو حرکت (زندگی) سے اسی قدر لگاؤ ہے جتنا جمود (عدم حیات) سے۔

ان دو مروری حالتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح الکوحل سے حرارت کے زیر اثر ہم جاندار اشیاء کو بے جان مادوں میں تبدیل کر سکتے ہیں اسی طرح بے جان مادوں کو بھی مصنوعی طریقوں کے استعمال سے جاندار نخزمایے میں بدل دینا ممکن ہوگا۔ انصاف کیجئے کہ ان دلائل کی موجودگی میں اگر موجودہ سائنسدانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ زندگی کو از سر نو Denovo پیدا کیا جا سکتا ہے تو آپ ان پر طعن تشنیع کی بوچھار کیوں کر دیں؟ ان کا مضحکہ کیوں اڑائیں؟ اسی طرح ان سادہ قابل فہم طبعی و کیمیائی توجیہوں کو رکھتے ہوئے اگر کسی غیبی قوت عزیزی —— Divine vital force سے انکار کیا گیا ہو تو آپ اس پر اظہار برہمی کیوں کریں؟

ثابت ہوا کہ مختلف طبعی و کیمیائی تبدیلیاں مخصوص مادوں کے سالمات میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس اہتزاز و ردوبدل میں جو توانائی پیدا ہوتی ہے وہی ہے جسے صحیح معنوں میں عزیزی قوت (Vital force) کہا جانا چاہئے۔ نیز یہ کہ اس میں توانائی کو مصنوعی طور پر اسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے جیسے ہم معمل میں برق و حرارت کو پیدا کر لیتے ہیں۔

یہی بین سالماتی تغیر سے حاصل شدہ توانائی ہے جو محرک حیات ہے۔ اس لئے کسی عضویے کی زندگی میں جب تک وہ مسلسل پیدا ہوتی رہے اور جب تک نخزمایہ کے سالمات اس توانائی کے زیر اثر غیر متناہی حالت تبدیلی میں رہیں عضویہ زندہ ہے۔ اور جب یہ تبدیلیاں بند ہو جائیں مردہ و بے جان۔

جس نل کے ذریعے عثمان ساگر سے ہمارے گھروں میں پانی آتا ہے اگر اسے کسی میکانیتی طریقہ سے ہم دوبارہ وہیں پہونچا سکیں اور اس کام میں جو توانائی صرف ہوتی ہے وہ اس پانی کے بین سالماتی تبدیلی سے حاصل کی جائے تو آپ صحیح معنوں میں اس قوت محرک کا تصور پیش کر سکتے ہیں جس کو (Vital force) عزیزی توانائی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیدرآباد کا یہ منبع آب بلدہ سے کئی فیٹ بلندی پر ہے۔ اس لئے پانی کا بہاؤ ہمارے نشیبی سمت میں اس غیر متوازن حالت کی وجہ سے ہے جو سیال کی بلند و پست سطحوں کے فرق سے رونما ہوتی ہے۔ اگر ایسی ہی غیر متوازن حالت پروٹین شحمیات و نیز دیگر مخصوص مادوں میں مصنوعی طور پر پیدا کی جا سکے تو پھر زندگی کے از سر نو پیدا کرنے میں کون امر مانع ہے؟

اس میں شک نہیں کہ کائنات میں زندگی کی ابتداء کے متعلق اختلاف خیال ہے۔ لیکن اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ شاید کچھ ایسے ہی حالات ابتدائے زندگی کا موجب ہوئے ہوں۔

ان ناقابل تصور تبدیلیوں اور مہیب طوفانوں کے بعد جو قشر ارض کی بیرونی سطح کے ٹھنڈا ہونے کے بعد رونما ہوئے اور جب سطح زمین کی تپش زندگی کے لئے موافق حال ہوئی تو غالباً سب سے پہلے خط استوا کے اتھل نیم گرم سمندروں میں زندگی کی ابتدا ہوئی۔

اس وقفہ کا حال جسے ادنئے Paleozoic دور کہا جاتا ہے نہایت دلچسپ ہے۔ ان مقامات سے کرۂ ارض میں زندگی کے ابتدائی شائبے نمودار ہوئے۔ فضاء نہایت ہی مکدر اور تاریک تھی۔ دور تند و تاریک ابروں میں قرص آفتاب کسی مدھم زرد کرہ کی طرح چمکتا تھا۔ فضا مختلف عناصر کی گیسی حالتوں سے سیر شدہ تھی۔ جس میں کاربن ڈائی اکسائیڈ کا تناسب زیادہ تھا۔ خوفناک آندھیاں نیم گرم سمندروں میں تموج پیدا کرتی تھیں۔ سیاہ بادل زمین کی طرف جھکے آتے تھے۔ بجلیاں مہیب آواز کے ساتھ کوندتی تھیں اور طوفانی بارش گویا خشکی کی جلد چھیلے ڈالتی تھی۔

رفتہ رفتہ جب یہ محشری طوفان ختم ہوئے تو عناصر نے موجودہ صورت اختیار کی فضا کچھ روشن اور صاف ہوئی۔ آفتاب کی شعاعیں نیم گرم سمندروں پر پڑنے لگیں اور وہ موافق حالات بہم ہوئے جو تخلیق حیات کے لئے ضروری ہیں۔ تو ترکیب حیات شاید اس طرح ہوئی کہ آفتاب کی تیز روشنی اور ایک خاص تپش پر فضا کی کاربن ڈائی اکسائڈ پانی میں حل ہوئی پھر اس توانائی کے زیر اثر

اس آمیزہ میں سالماتی تبدیلیوں کی وجہ Formal dehyde پیدا ہوا۔ کیمیا کا مبتدی جانتا ہے کہ گو فارمل ڈیہائنڈ ایک زہر قاتل ہے لیکن اس کے چند سالمے جب مل جائیں تو نشاستہ پیدا ہوتا ہے جو تمام جانداروں کے خلوی مافیہ کا جزو اعظم ہے۔ چنانچہ اس طرح ان مخصوص حالات میں توانائی کی ایک کثیر مقدار زندگی میں داخل کی گئی جس کی ارتقائی صورت موجودہ انسان کی شکل میں بحر و بر پر حاوی ہے۔ اور جو آج خود اپنی تخلیق کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔

آج بھی سبزی کے ذریعہ سے آفتاب کی یہی توانائی پودوں میں منقید ہوتی ہے اور یہی توانائی سبزی خور اور گوشت خور جانوروں کی مبدء حیات ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ بعض وقت بے بنیاد قیاسات حقیقت ثابت ہوتے گئے ہیں۔ صدیوں مشتر بوڑھی دادیوں نے اپنے شریر پوتوں کو مصروف خیال رکھنے کے لئے اُڑن کھٹولہ کی دلچسپ کہانیاں اور اڑنے والے گھوڑوں کے محیر العقل افسانے تراش لیے تھے۔ اور آج طیاروں۔ زیپلینوں کی صورت میں وہ دنیا کے آگے موجود ہیں۔ اسی طرح کسی جدت پسند شاعر نے داد شاعری کے لیے چند الفاظ موزوں کر لئے تھے اور اب سائنس کی حقیقت شناس نظروں میں وہ لفظاً بہ لفظ صحیح ہیں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

مہندر راج سکسینہ
(ام ، اس سی)

جو آدمی سونے روپے سے لدا ہو، میں ہرگز باور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی حیثیت سے بڑا ہو سکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں، غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو۔ بہت ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہے بینک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شائد میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین سی ہے۔

پریم چند

مادرِ گیتی

اے مادرِ گیتی ترے دامانِ کرم میں
کیا بیش بہا گوہر و یاقوت بھرے ہیں
تو مظہرِ جبروت جلالِ ازلی ہے
کہسار و سمندر ترے قدموں پہ پڑے ہیں
اشجار جو پھیلے ہوئے ہیں حدِ نظر تک
ہے فیض یہ تیرا ہی کہ اس طرح کھڑے ہیں
یہ سارے زمانے کے نوا سنج پرندے
تیرے ہی اشارے سے ہواؤں میں اڑے ہیں

تو خالقِ اشکال ہے تو نورِ ازل ہے
ہر شئے سے نمودار ترا ذوقِ عمل ہے

انساں کے لئے مادرِ گیتی ترا آغوش
گہوارہ مسرت کا ہے خوشیوں کی فضا ہے
گو تاک میں رہتی ہے اجل اس کے ہمیشہ
پر ہاتھ میں تھامے ہوئے تو آبِ بقا ہے
تو پالتی ہے اس کو بہاروں کی ہوا میں
پہناتی اسے شوق سے پھولوں کی قبا ہے
یہ فیض ہے تیرا ہی کہ انسان کے گھر آج
دولت سے تری روکشِ فردوس بنا ہے

سرشار فضاؤں میں تری جلوہ گری ہے
تو قوتِ تخلیق کی جادو نظری ہے

ہیں کھیل رہے وسعتِ صحرا میں ہزاروں
انسانوں کے بچے کہ جو ہیں حسن کے تارے
دوشیزہ حسینوں کے بھی ہیں غول یہاں پہ
پانی کے لئے آئے ہیں ندی کے کنارے
کھیتوں میں کوئی بانسری بیٹھا ہی بجاتے
کیا دلکش و رنگیں ہیں یہ جنگل کے نظارے
ہے حسن بھی اور عشق بھی معصوم فضا میں
ہیں چاروں طرف اڑتے محبت کے شرارے

اے مادرِ گیتی یہ ترا فیض اثر ہے !
یاں خار بھی گلزار کا منظورِ نظر ہے !

محمد جلال الدین اشک
(بی، اے- ال ال، بی)

(ماخوذ از شیلی)

"میں اور وہ"

دن گذرتے جا رہے تھے لیکن وہ برابر اپنی روش پر قائم تھی۔ ایک نا سمجھ بیوی جسے خاوند کے دل سے کھیلنا آتا ہو کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اف! میں چاہتا وہ مجھے جھنجھوڑے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" رونے لگے میرے سینے کو اپنے قیمتی آنسوؤں سے تر کر دے افسوس اس نے مجھے سمجھا ہی نہیں میں کیا چاہتا تھا اور مجھے کیا مل رہا تھا ایک ہمیشہ خاموش رہنے والی عورت ہمیشہ کچھ سوچتی رہنے والی میں کیسے یقین کروں کہ وہ میرے متعلق ہی سوچ رہی ہے۔ ممکن ہے اس کا خیال اس کے گھر کے اطراف چکر لگا رہا ہو میری کسی بات پر بھی نہ ہنسنے والی بیوی مجھے صرف خاوند سمجھنے والی بیوی کاش اسے معلوم ہو جاتا کہ میں اس کا عاشق ہوں۔ محبت بھرے خطوط چاہتا ہوں دل لگی چاہتا ہوں۔ شوخی چاہتا ہوں محبت چاہتا ہوں میں اسے چاہتا ہوں۔ مگر وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح غیر متزلزل رہی۔ موجوں نے اس کو اپنے ساتھ بہالے جانے کے لئے لاکھ سر پٹکا۔

کیا وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے؟ میں کانپ اٹھا۔ تو پھر میں اس سے کیوں محبت کرتا ہوں؟ دوسرے ہی کو محبت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس نے پھر مجھ سے شادی ہی کیوں کی؟ پہلی ہی ملاقات میں کہہ دیا ہوتا یا لکھ دیا ہوتا کہ "یوں ہے" اور میری زندگی نہ تلخ ہوتی مگر وہ مجھ سے مانوس کیوں نہیں ہوتی؟ میں سوچتا رہا غیر شعوری طور پر میرے قدم آئینہ کی طرف اٹھنے لگے۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہیبتناک سایہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے میں نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے رضائی اوڑھ لی اور کپکپاتا ہوا سونے کی کوشش کرنے لگا سو گیا۔

صبح کو مجھ سے پوچھتی ہیں "کل رات والے سینما نے تو آپ کے دماغ پر بہت اثر کیا" "ہاں! ایک قابل رشک بیوی اور خاوند کی زندگی میرے دل پر بہت اثر کرتی ہیں" وہ خاموش ہو گئیں۔ وہ ہمیشہ ہی سے خاموش رہتی ہیں ایسے جملے کہتے کہتے میں تھک چکا تھا۔ ساری کہانیاں میں نے سنادی تھیں۔ مثلاً "ایک شخص تھا اور وہ بیوی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ بے حد۔ اور عورت بھی بہت چاہتی تھی مگر دل ہی دل میں۔ دونوں نے ایک مالی کو مالن سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ لیا اور دونوں کی زندگی نئے سرے سے شروع ہوئی اصلی زندگی شروع ہوئی گویا ..." وہ خاموش سنتیں خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل جاتی اور بس میں سمجھتا کہ یہ ایک قہقہہ مارتی ہوئی اٹھیں گی اور مجھے "آؤ ہم بھی ایسی ہی زندگی گزاریں" کہتی ہوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ کی سیر کو کھینچ لے جائیں گی اور وہاں تو صرف "آپ نے کھانا کھایا" "آپ نے امی کے خط کا جواب دیا" "آپ سو جائیے میں ذرا نماز پڑھ لوں" مجھے یہ کس جرم کی سزا مل رہی تھی۔ میرے منصوبے خاک میں مل چکے تھے میرے حسب منشا جو کوئی بیوی مل جاتی تو ہماری زندگی سے بہتر ایک ڈرامہ نویس کو کوئی بہتر پلاٹ نہ مل سکتا۔ محبت اور

دو محبت بھرے دلوں کی دنیا اپنے اندر دلچسپیوں اور رنگینیوں کو رکھتی ہے وہ دنیا والوں کے سامنے بالکل انوکھے رنگ میں آجاتیں۔ مگر
ایک دن وہ اپنے کپڑے درست کرنے میں مصروف تھیں۔ میں نے نظر سے زیادہ دل کا حال بیان کرنا فضول سمجھا ... ...
فضول اس لئے کہ جب کبھی حسرت ویاس سے دیکھتا وہ کہتی "آپ کو کچھ تکلیف ہے" میں بیشک اپنی تکلیف ظاہر کرنا چاہتا لیکن
ان کی تکلیف دیکھنے کے لئے ... ان کو بھی بے چین کرنے کے لئے اور وہ ہمیشہ غیر متاثر اور ساتھ ہی ہمیشہ متاثر کن بھی۔
صندوق کو بند کرنے کے بعد وہ ایک ساڑی لیے ہوئے پلٹیں مجھے دیکھتے ہی جھجکیں ... بھاگ جانا چاہتی ہیں "نہیں اب
صبر نہیں ہو سکتا" میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا کہنا
چاہتی تھیں "یہ انداز گفتگو کیا ہے" میں نے کہا "تم کو مجھ سے بولنا ہی پڑے گا کہ تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو" "کوئی پکڑنے
کے لئے آئے اور نہ بھاگا جائے" اس نے پہلی دفعہ اپنے جملہ کو ہنستے ہوئے ادا کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھ سے تم ایسی باتیں
کیا کرو مجھ سے تم" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اس نے سر کو اس طرح جھکا لیا جیسے کچھ سونچ رہی ہے۔ سر کو ایک جنبش
کے ساتھ ہوئے اس نے کہا "اچھی بات ہے آپ اور کیا چاہتے ہیں" "مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں ذرا شوخ وطرار بس بس"
میں نے مطمئن لہجہ میں کہا۔ "تو پھر آئیے آپ سے کچھ شوخی کریں" اس نے ساڑی کو میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے واقعی ذرا شوخی ہی سے کہا
اس طرح کہ دل خوش ہو گیا۔ "اسے پہن لیجئے اور پھر" میں کیا سن رہا تھا ساڑی میں پہن لوں میں "چلئے جلدی کیجئے
شوخی کا وقت جا رہا ہے" "اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "مطلب کچھ بھی نہیں بس یہی کہ تھوڑی دیر دل لگی رہے
میں بھی لطف اٹھاؤں اور آپ کو بھی مزہ آئے۔" اس نے ایک خاص انداز میں کہا جسے سن کر ساڑی تو کیا کچھ اور بھی کہہ دیتی تو
بلا عذر۔ میں نے اس کی مدد سے پہن تو لیا۔ مگر یہ کہ پانی پانی ہوا جا رہا تھا آئینے میں دیکھتا ہوں تو اپنی حالت پر بجائے ہنسی کے
غصہ آنے لگا ایک تیس سالہ جوان بیڈول جسم اور بھدی ناک والا ساڑی میں خوفناک مکروہ مضحکہ خیز۔ وہ
ہنس رہی تھیں اس طرح چیخ چیخ کر کہ اشک کی خاموشی کی کسر نکال رہی تھیں بعد میں "وہ کیا سونچ رہی ہوگی؟" پر بہت دیر تک
غور کرتا رہا اندر جاتے ہوئے بھی شرم آرہی تھی۔ مگر میں نے ارادہ کر لیا کہ بدلہ ضرور لوں گا میں نے زبردستی اسے اپنا لباس
پہنا دیا۔ بہت دیر تک تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم اگر مرد بن جاؤ تو بھی نہ چھوڑ دوں" "آپ جیسی عورت کے ساتھ میرا نباہ
مشکل سے ہوگا" اس نے بھویں سکڑتے ہوئے جواب دیا۔ میرے دل پر گولیوں کی باڑ چل رہی تھی منہ میں دھواں سا بھر گیا میں نے
اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "تم مجھ پر بڑا احسان کر رہی ہو ..." میں نے رکتے رکتے کہا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی ایک
سہیلی آئی تھیں۔ میں دیوان خانے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کے قہقہوں کی آواز کانوں میں آئی۔ ان کی سہیلی نے کہا
"تو اب یہ ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ یوں بیچارے کو گھیر رہی ہیں آپ" میں دروازے کو کان لگائے سن رہا تھا۔ بہت ہی آہستہ لہجہ میں
کہنے لگیں "اس بھونڈی صورت پر یہ چاؤ ہیں ان کے" "اری آہستہ" انھوں نے اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا "مگر تو نے کبھی میری
آنکھوں سے بھی دیکھا ہے" میں نے صوفہ پر اپنے آپ کو ڈال دیا دماغ میں چکر سا محسوس ہو رہا تھا چیخنا چاہتا تھا، رونا چاہتا تھا

دوڑ کر انھیں سینے سے لگالینا چاہتا تھا..... وہ کتنی نیک اور محبت کرنے والی بیوی ہے" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سونچنا شروع کیا..... اندر داخل ہوا ایک سرور سا مجھ پر طاری تھا۔ ہر چیز رنگین نظر آرہی تھی اور وہ تو ملاحت کا چراغ معلوم ہو رہی تھیں...... روشنی کی طرح ملاحت کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھوں کی مسکراہٹ..... وہ اٹھیں..... میں نے کہا "ایک نئی بات کہنی ہے تم سے" "جی بس بہت سن چکی۔ اب "کوئی پرانی بات ہی سنائیے" ان کا مطلب شاید یہ تھا کہ ہم جو روزانہ انھیں اپنے عشق اور ان کے حسن کے متعلق نئی نئی باتیں کرتے ہیں وہ نہ کریں بلکہ کوئی پرانی بغیر حسن و عشق والی۔ اور ہم اس دنیا میں پہونچ گئے جہاں عمر بھر رہنے کی ہر شخص کے دل میں خواہش ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے کی ملاقاتیں، شادی کی تیاریاں۔ شادی..... جوانی اور شادی.....

"میں ابھی سونچ ہی رہا تھا کہ وہ کھانا لے آئی..... بال درست کر لئے گئے تھے۔ غازہ رخساروں پر چمک رہا تھا... خوشبو میں بسی ہوئی تھیں..... گویا آج "ہم میں کچھ بھی نہ چھوڑنے" کا ارادہ کر کے آئی تھیں۔ میں کھا رہا تھا... سونچ رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان کا آراستہ کمرہ نظروں میں پھرنے لگا..... کتنا ڈرتے ڈرتے..... میں نے اندر قدم رکھا تھا۔ میں نے سر تھامے ہوئے کہا "یاد ہے وہ رات والی ملاقات" وہ شرما گئیں۔ واقعہ در اصل یوں تھا کہ میں نے شادی سے پہلے ان سے ملاقات کی تھی...... اور ایک رات کو جب وہ اپنی ماں کے پاس سے لوٹ رہی تھیں..... میں نے راستے ہی میں روک لیا۔ وہ چونکی..... گھبرا گئی..... میں مایوس ہو گیا۔ ایک عاشق و معشوق تو ایسے زرین موقعوں کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں اور یہ..... گھبرا رہی ہے..... "نہیں آج تمھیں نہیں جانے دوں گا" میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ اس نے جھینپتے ہوئے کہا کہ "میں چیختی ہوں..... اماں کو بلاتی ہوں" میں گھبرا گیا..... نرم ہو گیا... "اچھا کم از کم میری ایک دو باتوں کا جواب ہی تو دے دو" "کیا جی" اس نے تیزی سے کہا۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے" "ہاں" "تم کس کی ہو" "تمھاری" "ہم کس کے ہیں" "ہمارے" گفتگو اس قدر جذباتی اور تیزی سے ہو رہی تھی کہ مجھے خود خیال نہ رہا کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور کیا جواب مل رہا ہے ..ایک گستاخی..... اور جانے کی اجازت دے دی گئی..... اب جو غور کرتا ہوں تو اُن کی ساری چالاکی کا راز کھل جاتا ہے۔ کس طرح انھوں نے صرف مجھے ٹالنے کی خاطر سب کچھ کہا..... سب کا اثبات میں جواب دیا۔ میں نے چہرہ پر درشتی پیدا کر لی "تو تم نے مجھے دھوکا دیا" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا "جی ہاں" مگر آپ نے بھی تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی..... اگر آپ کی ہماری شادی نہ ہوئی تو۔ جانتی ہوں کہ نسبت ہو چکی تھی مگر کیا نسبت نہیں ٹوٹ سکتی.. آپ..." "اچھا تو بہت دور کی لی تم نے" میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تو کسی قسم کا خوف نہیں" "نہیں..... ماحول نہایت رنگین تھا۔ کمرہ کی سبز روشنی رومان آفریں تھی۔ وہ پان لے آئیں... میں نے کہا "وہی شرارت کی ہے" وہ مسکرا دیں..... زردہ سے مجھے بڑی نفرت ہے اور یہ قصداً ایک آدھ چٹکی زردہ پان میں ڈال دیا کرتی ہیں۔

"آج بہت جلد نیند آرہی ہے آپ کو" "ہاں" میں نے روشنی گل کرتے ہوئے جواب دیا۔

رشید قریشی

"نامۂ شوق"

پوچھے جو وہ نامہرباں زندہ ہے صدقِ ناتواں
جس دم چلا ہوں میں ادھر وہ زخمیٔ تیرِ نظر
دھنستا تھا مثلِ شمعِ سر کہتا تھا ہر ہر سانس پر
بیمار و محرومِ دوا ناشاد و مشتاقِ قضا!
صرف ایک تیری جستجو حسرت نہ کوئی آرزو
کھینچے تو کام آہیں نہ دیں بے بس ہیں ہم نالے کہیں
چھیڑا اسی سے جو ملا رودادِ غم کا سلسلہ
خوش گو بہت دیکھے مگر دیکھا نہیں ایسا اثر
گو نالۂ مستانہ تھا حالِ دلِ دیوانہ تھا!
حسرت بھری تقریر تھی الفاظ میں تاثیر تھی
اے فتنۂ ایام سُن اے دلبرِ گلفام سن
اے شمعِ بزمِ دلبری اے رشکِ ماہ و مشتری
محبوبِ مغرور و حسیں ناز آفرین و نازنین
جب سے پھری تیری نظر رو رو کے ہوتی ہے بسر
کر دے پھر اے رنگیں ادا روشن ہمارا غمکدا
تجھ سے چمن دنیا رہے تو اے چمن آرا ہے

اے نامہ بر کہنا کہ ہاں کل تک تو آنکھوں میں تھی جاں
ہاتھوں سے تھامے تھا جگر روتا تھا لے کر ہچکیاں
اے سوزِ فرقت الحذر اے ضبطِ الفت الاماں
ہمدم نہ کوئی ہمنوا محرم نہ کوئی رازداں
ہو جب خود اپنا دل عدو کیسے رفیق و مہرباں
بے سود دن کی کوششیں راتوں کی محنت رائیگاں
گہہ تیری فرقت کا گلا گہہ شکوۂ دردِ نہاں
بانی ہو پتھر کا جگر اللہ رے حسنِ بیاں
لیکن عجب افسانہ تھا رو رو دیا میں خستہ جاں
ہر بات اس کی تیر تھی ہر فقرہ اس کا تھا سناں
اس شخص کا پیغام سُن جس پر کبھی تھا مہرباں
اے غیرتِ حور و پری سرتاجِ خوبانِ جہاں
ناکام آنکھوں کے مکیں نادار دل کے میہماں
گنتا ہوں تارے رات بھر تکتا ہے تو اس کا آسماں
تجھ پر نظر ڈالیں سدا حسرت سے خوبانِ زماں
آگے ترے پھیکا رہے رنگ بہارِ بوستاں

صدقِ جائسی

عربی ادب
خلفائے راشدین کے عہد میں

ظہورِ اسلام سے قبل کے زمانہ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جہالت اور بربریت کے شدید ترین مظاہروں کا زمانہ تھا انسانیت، اخلاق، راستی اور راست بازی، ہمدردی اور خدا ترسی سے بنی نوع انسان کو ابھی آگاہی بھی نہ ہوئی تھی۔ تمام دنیا نکبت اور افلاس کے پست ترین درجہ پر پہونچ چکی تھی۔ خصوصاً انسانوں کے خون سے کھیلنا معمولی بات تھی۔ عرب دنیا کی اور اقوام سے گمراہی اور ضلالت میں بہت آگے تھے۔ تمدن اور تہذیب سے بیگانگی کے اس وحشت افضا ماحول میں خدائے عزوجل نے بنی نوع انسان کی رفعت، ترقی اور بھلائی کے لئے اپنے الوہی پیغام کے ساتھ ایک برگزیدہ نبی کو بھیجا جن کی تعلیمات سے نہ صرف عرب بلکہ سارا عالم نیکی، تقدس، عفت اور توحید کے نور سے جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

خدا کے اس سب سے بڑے اور آخری پیغمبر محمدؐ کی زندگی اور ان کے حالات کی یہاں تفصیل پیش کرنا ہمارا مقصد نہیں البتہ عرب جیسے ملک میں ان کی بعثت سے جو سیاسی انقلاب، ذہنی انقلاب، علمی و ادبی بیداری اور معاشرت و ماحول میں جو روح پیدا ہوگئی اس کا اجمالی تذکرہ ضروری ہوگا۔ ان تبدیلیوں کا ذکر یہاں اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی ملک یا قوم میں کوئی زبردست انقلاب آیا خواہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو اس کا لازمی اثر وہاں کے ادب پر پڑا اور اس نئے ماحول کے اثرات کو ہم بخوبی اس جدید ادب سے معلوم کر سکتے ہیں کیونکہ ادب ہی قومی زندگی کا آئینہ ہے۔

جاہلیت کے زمانہ میں عرب اپنی عصبیت پروری اور نسبی فضیلت پر فخر کیا کرتے تھے اور حتی الامکان اپنے خصائص کو زندہ رکھنے کی کوشش میں ہی مصروف رہتے۔ برخلاف اس کے اسلام نے ان کی اس بیگانگی کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد کا پہلا سبق پڑھایا اور انہیں بتلا دیا کہ "ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے" باوجود ان کے مواطن اور انساب کے اختلاف کے وہ بھائی بھائی ہوگئے اور اسلام کی بنیاد اسی اخوت اور برادری کی سنگین بنیادوں پر رکھی گئی۔

اسلام کی اس اخوت نوازی سے زبان اور لغت کے اختلافات بھی یک لخت ختم ہوگئے۔ عرب کی اس لسانی وحدت میں بڑا حصہ قرآن اور حدیثوں کا بھی شامل ہے۔

اسلام کی آمد کے بعد عرب پہلی مرتبہ اپنے گھر سے باہر نکلے۔ اب تک وہ صرف اپنے جزیرہ نما ہی میں مقید تھے۔ نہ انھیں باہر کے حالات کا علم تھا اور نہ کسی بیرونی ملک سے ان کے روابط تھے۔ قیصر و کسریٰ کے نام یا ایرانی و رومی سلطنتوں کا تذکرہ وہاں افسانوں کی شکل میں پہونچتا۔

عربوں نے پے در پے ممالک فتح کرنے شروع کئے۔ اجنبی ممالک کی دولت اور غنیمتوں نے اہل عرب کی حالت ہی بدل دی۔ ایک بھوکے پیاسے گم کردہ راہ مسافر کو اگر کہیں پھولوں اور پھلوں سے لدا پھندا ایک باغ مل جائے جس کی نگہداشت کے لئے کوئی نہ ہو

تو جو حالت اس گلستاں کو پاکر اس درماندہ کی ہوگی وہی کیفیت عربوں کی اس وسیع و عریض عالم کی فتوحات سے ہوگئی۔

ان فتوحات کے علاوہ علم و ادب میں اثرانداز ہونے والا ایک اور سبب تھا وہ عربوں کی ہجرت اور عجمیوں سے اختلاط ہو۔ عربوں نے اسلامی فتوحات کے ابتدائی عہد میں اپنے قحط زدہ اور بے برگ و گیاہ صحرا کو خیرباد کہہ کر زرخیز اور آباد ممالک میں رہنا بسنا شروع کیا اس کا لازمی اثر ان کی زبان اور ان کے ادب پر ہوا۔ یہ اثر عہد راشدین میں اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ عہد اموی میں ہے اسی لئے ہم ان کا تفصیلی حال آگے بیان کریں گے۔

اسلام اور قرآن کا اثر ادب پر۔

یوں بھی ظہور اسلام سے عربوں کی ذہنی بیداری اور تخیل میں زبردست انقلاب آچکا تھا لیکن جو اثر براہ راست قرآن شریف سے عربی علوم و فنون اور عربوں کے آداب پر پڑا وہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ جاہلیت میں جہاں بات بات پر اشعار کی روایت کی جاتی اور اس میدان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دئے جاتے وہاں اب زندگی کے ہر ہر قدم پر قرآن سے استمداد کیا جانے لگا۔

معانی، بیان، بدیع کے نقطۂ نظر سے ہو یا فصاحت و بلاغت کے پہلو سے کاروباری اور معاشی حیثیت سے ہو یا علمی و ادبی نقطۂ نظر سے غرض حیات کے ہر پہلو اور زندگی کے ہر رخ میں قرآن ہی پیش کیا جاتا۔

اسلام نے جو تبدیلیاں ان کے آداب و علوم میں پیدا کیں ان کی تفصیل ہم یوں پیش کرسکتے ہیں:۔

(۱) جاہلیت کے بعض آداب کا بطلان مثلاً کہانت، زجر وغیرہ۔

(۲) غیر ممالک سے بعض نئے علوم و فنون کی درآمد مثلاً فلسفہ، طب اور دوسرے علوم۔

(۳) بعض نئے علوم کی ابتدا مثلاً شرعی و دینی علوم جیسے حدیث، تفسیر، فقہ، قضاۃ وغیرہ۔

جاہلیت کے جن علوم اور آداب میں اسلام نے ترقی اور وسعت پیدا کی ان میں شعر اور خطابت بہت اہم ہیں لیکن حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو عصر راشدین میں شعر کی جانب زیادہ توجہ نہ برتی گئی البتہ خطابت نے اس عہد میں غیر معمولی ترقی کی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو مذہبی معاملات اور سیاسی امور میں بہترین مقررین ہی کی ضرورت پڑتی تھی۔ غزوات اور دیگر مواقع پر عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لئے عمدہ خطیب ہی درکار تھا۔ اس نقطۂ نظر سے بھی اس زمانہ میں شاعر پر مقرر ہی بازی لے گیا۔ جو خوبیاں اور محاسن اب تک شاعری میں پائے جاتے تھے ان سب کا لحاظ اب خطابت میں کیا جانے لگا۔

خطابت

خطابت نے جب کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے اسلام کی آمد کے بعد غیر معمولی ترقی کی خصوصاً ابتدائے اسلام میں مقررین ہی ہر معاملہ میں خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی جنگی ہو یا مبارزتی پیش پیش رہا کرتے۔ عہد جاہلیت کی خطابت اور اس دور کی خطابت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں قرآن شریف کی سورتیں، حدیثیں اور خلفاء وغیرہ کے اقوال سب ہی تقریروں میں شامل کئے جاتے جن سے ان کی حالت ہی بدل جاتی۔

اسلامی تعلیمات، نیکی اور زہد کے خیالات، روحانی رفعت اور علو خیالی کا اثر اس عہد کی خطابت میں بہت نمایاں ہے۔ راشدین کے عہد میں چاروں خلفاء اور خصوصاً حضرت علیؑ خطابت کے امام مانے جاتے ہیں حضرت علیؑ کے خطبات کو یک جا جمع کیا گیا ہے جس کا نام "نہج البلاغۃ" ہے۔ اس دور کے بہت سے مشہور خطیب عہد اموی تک ہے۔ ان مشاہیر میں مصعب بن زبیر قطری بن الفجاءۃ، زیاد بن ابیہ اور سحبان وائل کے نام بہت ممتاز ہیں۔

عصر راشدین میں نثر کی حالت

عربی ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ نثر کی اہمیت بمقابلہ نظم کے کچھ زیادہ ہی ہوگئی۔ ان انقلابات اور تبدیلیوں کا اثر جن کا ذکر آچکا ہے اس عہد کی نثر اور انشاء پر بہت گہرا پڑا۔ اسلوب تحریر میں زمین اور آسمان کا فرق ہوگیا کیونکہ اسلامی حیات اور قرآن و حدیث کی روح ہر علم و فن میں جاری و ساری ہوگئی۔

جاہلیت میں نثر کی چند ہی قسمیں تھیں مثلاً زیادہ سے زیادہ کاہنوں کی مسجع عبارتیں، ضرب الامثال یا اور حکیمانہ خیالات اور پند و موعظت سے بھری ہوئی چند تقریریں ملیں گی بس یہی نثر کی کل کائنات تھی جو جہالت کی پیداوار کہلائی جا سکتی ہے لیکن اسلام کی آمد اور راشدین کے عہد میں فتوحات کی کثرت اور وسعت مملکت نے چونکہ نثر کی ضرورت کو شدید تر بنا دیا تھا اس لئے عربی نثر کی حقیقی بناء اسی سے پڑی۔

متذکرہ بالا وجوہات کی بناء پر لغت میں جو تغیرات ہوئے وہ بھی اہم ہیں مثلاً یہیں سے کتابت اور خطابت میں تفریق شروع ہوئی تحریرات عام بول چال سے قدرے مختلف ہوئیں اور اس اختلاف کا آغاز یہیں سے ہوا۔

اس زمانہ کی نثر میں زیادہ تر خطبات، قوانین و احکام، پند و نصائح اور خلفاء اور والیوں کی خط و کتابت کے نمونے ہی ہیں اسلوب میں سادگی بے حد نمایاں ہے خصوصاً حکومت و سیاست کے سلسلہ میں خلفاء اور والیوں کی جو مراسلت ہوئی تھی وہ بالکل سہل ممتنع ہوتی۔ نہایت گہرے مطالب اور مشکل مسائل کے حل چند معمولی الفاظ میں تحریر کر دئیے جاتے چھوٹے چھوٹے جملے مستعمل ہوتے۔ بیانات کی تقویت کے لئے قرآن کی آیتیں چھوٹی چھوٹی سورتیں اور حدیثیں بھی استعمال کی جاتیں۔ اسلام کی وجہ سے لغت میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ بھی ہوا یا پرانے الفاظ ہی خاص معانی میں استعمال ہونے لگے مثلاً اسلام کے فرائض، عبادات اور عقائد وغیرہ سے متعلق الفاظ۔

اس زمانہ کی فتوحات اور مبارزتی کارناموں کی تفصیلات ہمیں ان کتب سے ملتی ہیں جنھیں بعض مولفین اور مورخین نے اسی زمانہ سے لکھنا شروع کر دیا تھا مثلاً "واقدی کی تصنیف" "فتوح الشام" اور بلاذری کی "فتوح البلدان" اس عہد کے امتیازی کارنامے ہیں۔ ہر مقام اور ہر ملک کی جو اس وقت فتح ہوا پوری تفصیلات نہایت دلچسپ تاریخی انداز سے لکھی گئی ہیں یہ بھی اس عہد کی نثر کے جواہر پاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

عصر راشدین میں نظم کی حالت

قرآن کے نزول کے ساتھ ہی اہل عرب کی شعری قوتیں گویا سلب ہوگئیں جہالت کا فخر و غرور اور عصبیت پروری چونکہ عقاید اسلام کے منافی تھے اسی لئے ان کی وہ خصوصیات بھی زائل ہوگئیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شاعری عرب سے بجائے بالکلیہ ختم ہوجانے کے کچھ عرصہ تک دبی رہی۔

نبوت کے زمانہ میں کفار اور مشرکین کے خلاف مسلمانوں کو تحریض دلانے اور کفار کی ہمتیں پست کرنے کے لئے خود آنحضرت نے شاعروں سے مدد لی جس کی بہترین مثالیں ہمیں حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحنہ اور کعب بن زبیر کے کارناموں سے مل سکتی ہیں۔ آنحضرت صلعم کے بعد خلفاء نے شاعری کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ دی اس میں شک نہیں کہ انھیں شاعری سے دلچسپی ضرور تھی بلکہ بعض راویوں نے چاروں خلفاء کے اشعار کی روایت کی ہے ان کے متعلق خیال ہے کہ وہ انھیں کے کہے ہوئے ہیں ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن شاعری سے دلچسپی کے باوجود انھوں نے عملاً شاعروں کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کی اور اسلامی قوانین کی پابجائی اور قرآن شریف کی اہمیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر جمانے کی فکر ہی میں رہے۔

جاہلیت کے زمانہ کے سارے خیالات چونکہ اس عہد میں فنا ہو چکے تھے اس لئے شاعری بھی جو کچھ تھی عفت، پاکیزگی نصائح اور مذاہبات سے مملو ہوتی۔ اس وقت جاہلیت کے شعرا اور شاعری کی اہمیت صرف اتنی باقی تھی کہ کلام الٰہی میں جو الفاظ اور محاورات مباحث اور پیچیدگیوں کے حامل ہوتے ان کا استناد ان سے کیا جاتا۔ اس عہد کے بعض شاعر خالص جاہلیت کی پیداوار تھے جن کا بیان پچھلے باب میں آچکا ہے اور بعض جو اس عہد کے تھے یا آئندہ مشہور ہوئے ان کا ذکر آگے آئے گا۔

قرآن شریف کی تدوین

عصر راشدین کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن شریف کی تدوین اور حدیثوں کے جمع کرنے کا ہے علوم شرعیہ کی حقیقی بنیاد ان کی ترتیب کے بعد ہی پڑی۔ قرآن شریف ایک ہی مقام پر یا ایک ہی وقت میں نازل نہیں ہوا بلکہ کلام الٰہی کا نزول ابتدائے وحی سے لے کر آنحضرت صلعم کے وصال تک یعنی بیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوا جن میں بعض سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور بعض مدینہ میں۔ قرآن شریف کے تکمیل پانے کے باوجود نہ اس کی کوئی خاص ترتیب باقی تھی اور نہ اس کے سارے حصے ہی ایک جگہ پر موجود تھے۔

فن تحریر چونکہ ابھی اپنی طفولیت کی منزلوں سے گزر رہا تھا اسی لئے اس کی نقلیں بھی کی گئی تھیں تو عجیب و غریب اشیاء پر مثلاً کہیں کسی نے اس کی سورتوں کو کسی جانور کے چمڑے پر لکھا تھا تو کسی نے اس کی نقل پسلی کی ہڈیوں اور بازوؤں کی ہڈیوں پر کی تھی۔ کہیں اس کی عبارت کھجور کے پتوں اور دوسرے اسی قسم کے چوڑے پتوں پر لکھی گئی تھیں تو کہیں اس کے پارے پتھر کی صاف تختیوں پر تحریر کئے گئے تھے اس کے بعض حصے لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھے۔

قرآن شریف کے اس طرح حفظ کرنے والوں کو اس زمانہ میں "القراء" کہا جاتا تھا۔ آنحضرت صلعم کے وصال تک یعنی ۱۱ھ تک یہی عالم رہا اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جزیرہ نمائے عرب میں لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت مرتد ہوگئی جس کے لئے انھوں نے ایک فوج ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کی۔

ان لڑائیوں میں بہت سے صحابۂ کرام شہید ہوئے جن میں اکثر قرا تھے خصوصاً جنگ یمامۃ میں بارہ سو مسلمان شہید ہوئے جن میں سات سو قرا شامل تھے۔

جب یہ خبر مدینہ پہونچی تو مسلمانوں کو اس بات کا بڑا خوف لگ گیا کہیں قرآن شریف کے وہ حصے تلف نہ ہوجائیں جو اس وقت تک ان ہی قرا کے سینوں میں محفوظ تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب اس بات کا ذکر حضرت ابوبکرؓ سے کیا اور ضمناً اس کا بھی تذکرہ کیا کہ قرآن شریف کی تدوین ہوجانی مناسب ہے تو اس پر حضرت ابوبکرؓ نے خیال ظاہر کیا کہ جس کام کو آنحضرت صلعم نے نہیں کیا اس کو وہ کس طرح کرسکتے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جمع کرنے میں حضرت زید بن ثابت انصاری سے مدد لی کیونکہ وہ کاتب وحی تھے۔ صحابہ اور دیگر لوگوں کے پاس جس قدر سورتیں مل سکتی تھیں انھیں جمع کرلیا گیا۔ بعض اوقات کوئی سورت دو تین جگہ مل جاتی تھی لیکن بعض سورتیں صرف کسی ایک کے پاس محفوظ رہ گئی تھیں جیسے سورت "توبة" صرف ابوخزیمۃ انصاری کے پاس محفوظ تھی۔ غرض قرا وغیرہ سے مدد لے کر اسے ایک جگہ جمع کرلیا گیا۔ یہ قرآن شریف پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا ان کی شہادت کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں یہ حضرت حفصۃ کے پاس چلا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں چونکہ اسلامی ممالک کا دائرہ بہت وسیع ہوچکا تھا اور فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اسی لئے مسلمان بھی ہر طرف پھیل گئے تھے جہاں جہاں مسلمان پہونچے تھے ان میں قرا کی ایک بڑی تعداد شامل تھی جن میں ہر ایک نے قرآن شریف کی ترتیب اپنے حسب مرضی کی تھی اسی لئے ہر ایک کے پاس اس کی خاص ترتیب اور قرأت کا ایک خاص انداز تھا یہاں تک کہ سورتوں کی قرأت میں اختلاف پیدا ہوچکا تھا۔

جنگ ارمینیہ میں اسی قرأت کے متعلق مختلف مباحث کو سن کر حذیفۃ بن الیمان نے حضرت عثمانؓ کو قرآن کے بارے میں ان اختلافات قرأت سے پیدا ہونے والے شبہات سے آگاہ کیا اور انھیں خوف دلایا کہ کہیں اس کی حالت بھی انجیل اور توراۃ کی سی نہ ہوجائے۔ حضرت عثمانؓ نے ان حالات کو سن کر اس کی خاص ترتیب اور قرأت کی یکسانیت کے لئے حضرت حفصۃ کے پاس سے حضرت عمرؓ کے جمع کردہ قرآن شریف کو منگوایا اور اس کام کی صحت اور بہتری کے لئے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام کو جمع کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اس قرآن اور قرا سے مدد لے کر کلام الٰہی کا ایک صحیح ترین نسخہ تیار کریں اور انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ جب ان میں کسی آیت کے متعلق اختلاف پیدا ہوجائے تو قریش کی لغت کا خیال رکھیں کیونکہ قرآن شریف قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا تھا۔

۳۰ھ میں اس طرح قرآن شریف کی چار نقلیں کی گئیں جنھیں چار مقامات یعنی مکہ، بصرہ، کوفہ اور شام کو بھجوا دیا گیا۔ اس کے دو اور نسخے انھوں نے تیار کرائے جن میں ایک اپنے لوگوں کے لئے اور ایک خود اپنے لئے رکھا اس سے پہلے کے تمام نسخوں اور ان تمام اشیاء کو جن پر اس کی سورتیں لکھی ہوئی تھیں انھوں نے جلانے کا حکم دیا۔

مسلمانوں نے اس صحیح نسخے سے چند ہی دنوں میں سیکڑوں قرآن نقل کر ڈالے چنانچہ جنگ صفین میں جو اس واقعہ کے صرف سات سال بعد ہوئی حضرت معاویہ کی فوج نے تقریباً پانچ سو قرآن شریف بلند کئے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نقل کس سرعت سے عمل میں آئی۔ چند ہی دنوں میں قرآن شریف کے ہزارہا نسخے مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گئے یہی وجہ تھی کہ قرآن و حدیث مسلمانوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن کر ان کے ہر خیال اور ان کے ہر قول میں پرتو فگن ہونے لگے جس کا لازمی نتیجہ ان کے ادب کا متاثر ہونا تھا۔

ابوالفضل العباس
(ام، اے)

بیوی کی یاد میں

رفیق زندگی تجھ کو کہاں ڈھونڈوں کہاں پاؤں
نہ مردے کچھ بتا سکتے نہ قبریں بول سکتی ہیں
یہاں کی بیکسی بیچارگی عبرت دلاتی ہے
تڑپ کر بجلیاں دکھلاتی ہیں اپنی ہراسانی
شکستہ دل میں جو ٹوٹی ہوئی پتھر کی کڑیاں ہیں
وہ سناٹا ہے جس کو دیکھ کر حیراں ہو ویرانی
یہیں بسنا تھا گر تم کو پتہ اپنا دیا ہوتا
میں سمجھا تھا کہ میرے آخری دم تک نبھاؤ گی
بھلا دی تم نے وہ برسوں کی صحبت وہ یک جائی
تمھیں نفرت سہی مجھ سے مگر بچے تو پیارے تھے
وہاں تم کو غم دنیا سے فرصت ہے فراغت ہے
وہاں آرام سے تم سو رہی ہو اپنی تربت میں
وہاں کیا ہے کہ تم سے نازنیں جاں دے کے بستے ہیں
نہیں تمکیں کو اب آرام و راحت غم کا مارا ہے

پتہ کس سے چلے شہر خموشاں میں جو چلاؤں
یہ وہ پُر ہول ویرانہ جہاں روحیں بھٹکتی ہیں
ہوا بھی سائیں سائیں کی صدا سے دل ہلاتی ہے
یہاں برسات کا پتہ بھی ہو جاتا ہے خود پانی
زمیں بھی خاک اڑاتی ہے یہاں ذرے بھی لرزاں ہیں
وہ تاریکی ہے ڈر جاتے ہیں خود غول بیابانی!
مجھے اے بے مروت ساتھ اپنے لے لیا ہوتا
خبر کیا تھی کہ یوں تم ساتھ چھوڑو گی، دغا دو گی
مگر میرے لئے اب موت سے بدتر ہے تنہائی
مجھے چھوڑا تو چھوڑا غیر تھا یہ تو تمھارے تھے
یہاں راحت نہ ہونے سے مرا جینا مصیبت ہے
یہاں کٹتی ہیں راتیں کروٹیں بدلتے ہی فرقت میں
یہاں صورت تمھاری دیکھنے کو ہم ترستے ہیں
بہر صورت تمھارا ہے تمھارا ہے تمھارا ہے!

میر باسط علی خاں تمکین

چمنِ روزگار

ساری بہار اُسی سے ہی فصلِ بہار میں
دل اور جان، دونوں بھی ہیں کس شمار میں

کیوں ناامید آپ کا امیدوار ہو
یا موت آئے گی مجھے، یا نیند آئے گی

اے دردِ عشق! بات تو جب ہی کہ میرے دوا! سنت
اس سے زیادہ لطف کا طالب نہیں ہوں میں

نالہ خلافِ وعدہ کیا ہائے کیا کیا
کیا ہوں شریکِ بزم کہ مجھ بدنصیب کو

میں نے بھی توبہ توڑ دی اپنی تو کیا ہوا
میرا وقار آپ کا آرام بھی گیا!

اک تازہ واردات ہے ہر ایک دم کے ساتھ
صیاد نے اشارہ کیا میں سمجھ گیا!

مجنوں اگر نہیں نہ سہی، کوہ کن تو بن
سو مہربانیوں کے عوض مسکرا دیا

عشق اور آپ؟ واہ صفی! واہ واہ! واہ!

بس ایک پھول ہے چمنِ روزگار میں
آپ اختیار میں ہیں تو سب اختیار میں

سب کچھ ہی، کیا نہیں نگہ شرمسار میں
اور ایک شب گزار تو دو دل انتظار میں

مرنے کے بعد چین نہ پاؤں مزار میں
امید بن کے رہ، دلِ امیدوار میں

وہ سُن چکے تو فرق پڑا اعتبار میں
گھل مل کے بیٹھنا نہیں آتا ہی چار میں

دنیا کے لوگ کیا نہیں کرتے بہار میں
آخر یہ کیا بلا ہے دلِ بے قرار میں

میرے ارادے آ نہیں سکتے شمار میں
باتیں پکار کر نہیں کرتے شکار میں

اتنا تو ہو کہ موت رہے اختیار میں
سرکار نے کمال کیا اختصار میں

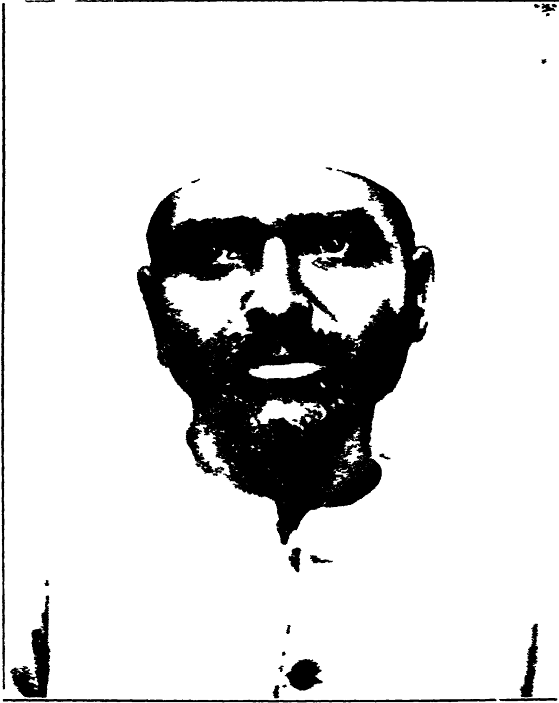
غم؟ اور ہائے زندگی مستعار میں

صفی (اورنگ آبادی)



مشہور ہوں بادہ خوار کہنے دو انہیں
مستوں میں ہوں ہوشیار کہنے دو انہیں
باطن سے تو پاک و صاف بھلے ہی ہوں
ظاہر میں خراب و خوار کہنے دو انہیں

گورسرن بلی آزاد



ہم سے تو اس کے واسطے بھی بد دعا نہ ہو
دشمن برا سہی مگر اس کا برا نہ ہو
دل خانۂ خدا ہے تو پھر اس میں اے صفی
حسرت نہ ہو، امید نہ ہو مدعا نہ ہو

محمد بہبود علی "صفی"، اورنگ آبادی

مانٹسکیو کے سیاسی نظریات[1]

حیدرآباد کے نوجوان انشا پردازوں میں شہاب الدین صاحب ام، اے سابق مدیر مجلۂ عثمانیہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے تاریخی اور سیاسی مضامین نہایت ٹھوس اور معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ صاحب موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ "سب رس" کے لئے آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ "سب رس"

"ہمیں مانٹسکیو کے ... نظریہ "تفریق اختیارات" سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ مدت دراز سے ہندوستانی برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ عمال حکومت کو اس وقت جو عادلانہ اختیارات حاصل ہیں ان کی تفریق کی جائے ... لیکن اس وقت تک برطانوی ہندی حکومت اس اصلاح پر رضامند نہیں ہوئی درآں حالیکہ قلمرو اعلیٰحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ اور بعض دوسری ریاستوں میں مدت سے اس اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ آج کل ہندوستانی سیاسی بے چینی کے زمانے میں مانٹسکیو کا یہ خیال بالکل صادق معلوم ہوتا ہے۔"

(پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ مبادی سیاسیات جلد دوم صفحہ ۹)

اٹھارویں صدی کی تحریکات اور اپنے زمانے کے مزاج سے متاثر ہو کر جس سیاسی مفکر نے باقاعدہ طور پر اپنے خیالات پیش کئے وہ مانٹسکیو ہے اس نے ادب اور تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے زمانے کی ذہنی رفتار سے ہمدردی رکھتا تھا۔ ۱۷۲۱ء میں اس نے اپنے "ایرانی خطوط" (Persian Letters) شائع کیے جس میں فرانس کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی ادارت کا بڑا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی اس نے مختلف ممالک کا سفر کرنے اور وہاں کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ براعظم کے تمام مشہور ممالک کی سیر کرنے کے بعد وہ انگلستان گیا اور وہاں دو سال تک مقیم رہا۔ اس دوران میں اس کو انگلستان کے تمام سربرآوردہ سیاستوں سے ملنے کا موقعہ ملا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت اور اس کی آزادی کے تخیل سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ انگلستان کے ادارات کے علاوہ اس کو روما کی تاریخ اور سیاسیات سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ اُس نے ایک مقالہ بھی شائع کیا تھا جس میں نہایت باقاعدہ طور پر اس نے روما کے عروج و زوال کا فلسفیانہ تجزیہ کیا ہے۔ غرض روما کی تاریخ اور انگریزی ادارات ہی تھے جن پر اُس نے زیادہ تر اپنے سیاسی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ ان تمام تجربات اور مطالعہ سے اس نے

---

[1] یہ مضمون گیٹل کی کتاب (History of Political Thought) سے ماخوذ ہے۔

جو سیاسی نتائج اخذ کئے وہ "روح قوانین" (Spirit of The laws) کی شکل میں نمودار ہوئے۔ یہہ مشہور اور قابل قدر کتاب ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی۔

مانٹسکیو کا طریقہ تحقیق حکیمانہ یا تصوری نہیں ہے۔ وہ سیاسی مسائل کو محض مجرد سیاسی تخیلات کے تحت نہیں بلکہ حالات و واقعات کی روشنی میں جانچتا تھا۔ اپنے زمانے کے تمام مفکرین کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ انصاف اور قانون کے بنیادی اصول فطرت ہی میں موجود ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہہ بھی سمجھتا تھا کہ فطرت کی اِن تعلیمات کو' ان اصول و کلیات میں نہیں تلاش کرنا چاہیے جن کی بنیاد تعلیمات ہے اور جس کا طریقہ استقرائی طریقہ ہو۔ اس کے برخلاف اس کا خیال تھا کہ وہ حقیقی سیاسی زندگی، واقعات و حالات' اور تاریخ و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ وہ مجرد انصاف کے احوال کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ مکمل قوانین کے نظام کو مانتا تھا وہ فطری قوانین کے علم برداروں میں سے نہیں بلکہ تاریخی مسلک کے پیشروؤں میں سے تھا۔ اس کا طرز استدلال افلاطون اور لاک کی نسبت' ارسطو اور بودین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

مانٹسکیو کے خیالات و تصانیف پر اس زمانے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اس وقت فطری قوانین اور فطری حقوق کے نظریات حاوی تھے۔ بلکہ یہی فرانس کے حالات اس وقت اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مانٹسکیو کے نظریات کا مقصد کسی چیز کا دعویٰ کرنے یا رائج الوقت نظام پر حملہ کرنے سے زیادہ اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اس نے شہریوں کے حقوق یا بادشاہ کے اختیارات سے زیادہ حکومت اور انصاف کے عملی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے خیالات میں ایسی چیزیں بہت کم ہیں جن کا تعلق اقتدار اعلیٰ کی نوعیت، حقوق انسانی یا فطری مساوات سے ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ فرانس کی اسپرٹ کو قائم رکھا جائے اور ملوکیت کی حفاظت کی جائے۔ اس کا ایک اہم مقصد یہہ بھی تھا کہ حکومت کے عاملانہ اور قانون سازانہ حقوق کو علحدہ کر دیا جائے کیونکہ اس کے نزدیک آزادی کی حفاظت کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اس کی تصانیف سے نہ صرف فرانس بلکہ عام سیاسی ادارات کی نوعیت اور اُن کے عملی پہلوؤں پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن انقلاب فرانس پر اس کے خیالات نے اپنے بہت کم نقوش چھوڑے ہیں۔
مملکت کے سلسلہ میں اس نے تمام معاشری ادارات پر روشنی ڈالی اور ایک دوسرے کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے ایک طرف تو طبعی حالات، نسلی خصوصیات، مذہبی روایات، معاشری اثرات، معاشی قوانین اور حکومتی ادارات کو اور دوسری طرف سیاسی اور ملکی آزادی کو جانچنے کی کوشش کی۔ اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ قوانین و سیاسیات کا ایک ایسا تقابلی نظریہ قائم کیا جائے جس کی بنیاد مختلف ملکوں اور زمانوں کے واقعتی نظام پر ہے۔ اسی طرح اس نے مختلف ملکوں اور حکومتوں کی ضروریات کے مطابق اور ان کی روشنی میں قانون سازی کے تقابلی مطالعہ پر بھی زور دیا۔ لیکن اس کی تصانیف کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں آزادی اور آزادی کی حفاظت میں تفریق اختیارات کی قدر و اہمیت پر بحث کی گئی ہے

اس اصول سے ہٹ کر کہ قانون فطرت ہی میں مضمر ہے۔ اور دلائل و عقلیت سے اس کے احوال معین کئے جا سکتے ہیں یا یہہ کہ قانون مقتدر اعلیٰ کا قطعی حکم ہے اور اس کو کوئی شے متاثر نہیں کر سکتی' مانٹسکیو نے قانون کے تخیل کو وسیع کر کے

اس میں اسباب و علل اور اثرات و نتائج کو بھی شامل کر دیا۔ چنانچہ ان ہی اصول کے پیش نظر وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مملکتوں کے تعلقات کی وجہ سے قانون اقوام وجود میں آیا۔ اور کسی ملک کے حاکم و محکوم کے آپس کے تعلقات نے سیاسی قانون کی بنیاد ڈالی اسی طرح شہریوں کے تعلقات سے قانون دیوانی کے اصول مدون ہوے۔ قانون اقوام تو ہر مملکت کے لئے مشترک ہوتا ہے لیکن سیاسی اور دیوانی قوانین ہر مملکت میں مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان کا انحصار ہر ملک کے واقعات و حالات پر ہوتا ہے۔ فطری طرز حکومت اور فطری نظام قانون وہی ہے جو مختلف اثرات کی مطابقت کے لحاظ سے ہو۔ کیونکہ یہی اثرات ہوتے ہیں جو افراد کی زندگیوں کو حالات کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔ اور ان ہی پیچیدہ اور گوناگوں اثرات سے "قوانین کی روح" پیدا ہوتی ہے۔ اس "روح" کا پتہ لگانے کے لئے مانٹسکیو کو جغرافیہ، عمرانیات، معاشیات، اصول قانون اور سیاسیات کے میدانوں میں داخل ہونا پڑا تھا۔

مانٹسکیو نے ان اصولوں کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی جو ہر طرز حکومت کی تعمیر میں کارفرما ہوتے ہیں۔ حکومتوں کی اس نے جو تقسیم کی ہے اس کے مطابق مطلق العنانیت وہ طرز حکومت ہے جس میں ایک فرد بغیر قانون کے حکومت کرتا ہے۔ ملوکیت بھی شخصی حکومت کا نام ہے لیکن اس میں ایک فرد قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ عمومیت وہ طرز حکومت ہے جس میں عوام کو سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے عمومیت بھی دو طرح کی ہو سکتی ہے، ایک اعیانی دوسری جمہوری ہر طرز حکومت کا قیام مخصوص اثرات اور احوال کے تحت عمل میں آتا ہے۔ چنانچہ مطلق العنانی کی بنیاد قوت پر ہے۔ ملوکیت کی بنیاد عزت پر، اعیانیت کی بنیاد متوسط الخیالی پر اور جمہوریت کی بنیاد حب الوطنی یا سیاسی خوبیوں پر ہے۔ مانٹسکیو ہر طرز حکومت کے نقائص کا بھی اظہار کرتا ہے اور حالات و ادارات کی موزونیت کے لحاظ سے وہ ہر طرز حکومت کے قوانین کی بھی تقسیم کرتا ہے۔

اس کے نزدیک کسی طرز حکومت کا بجائے خود اچھا ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ اس کی قدر کو ایک اضافی چیز سمجھتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق جب اس روح میں تبدیلی ہو جاتی ہے جو ہر طرز حکومت کی تشکیل کا باعث ہوتی ہے تو حکومت میں قدرتی طور پر انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت اس وقت ناممکن ہو جاتی ہے جب کہ سیاسی حس اور احساس مساوات مفقود ہو جائے اعیانیت قائم نہیں رہ سکتی اگر حکمران طبقہ میں میانہ روی اور اعتدال پسندی باقی نہ رہے۔ ملوکیت اس وقت خطرہ میں پڑ جاتی ہے جب بادشاہوں کا وقار گھٹ جاتا ہے اور مطلق العنانی کو کسی صورت میں بھی استحکام اور استقامت حاصل نہیں کر سکتی۔ انقلاب بھی کوئی باقاعدہ اور صریحی نتائج کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا کیونکہ نئی طرز حکومت کا بھی دارومدار تمام تر حالات ہی پر ہوتا ہے۔

ایک اور چیز جس پر مانٹسکیو نے زور دیا، حدود مملکت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مطلق العنانی بڑے اور وسیع ملکوں ہی میں پیدا ہوتی اور ان ہی میں پنپتی ہے۔ لیکن اوسط رقبہ رکھنے والے ممالک میں ملوکیت کے ارتقا کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اسی طرح جمہوری مملکتوں کے لئے چھوٹے علاقے زیادہ مفید ہوتے ہیں وہ مملکت فرانس کو جمہوری حکومت کے لئے بہت بڑا رقبہ تصور کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مملکت کے حدود و رقبے کے تغیر کے ساتھ ساتھ طرز حکومت میں بھی تبدیلی ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ مملکت کے حدود میں اضافہ اور وسعت ناپسندیدہ طرز حکومت کا پیش خیمہ ہوتا ہے اس لئے وہ

ایک لحاظ سے مکیاولی کے نظریہ توسیع مملکت کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن ایک مختصر اور چھوٹی جمہوریہ کو اپنی محافظت کے لئے جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے متاثر ہو کر مانٹسکیو نے وفاقیت کے اصول کی تائید وحمایت کی۔ رقبۂ مملکت اور اس کی طرز حکومت کے تعلق اور اصول وفاق کی اہمیت کے متعلق اس نے جو نظریات پیش کئے تھے ان کا کافی اثر امریکہ پر پڑا۔ چنانچہ جب ممالک متحدہ امریکہ کا وفاقی دستور مرتب کیا جا رہا تھا تو مانٹسکیو کے کئی ایک اصول اختیار کر لئے گئے۔

مانٹسکیو نے آزادی کی نوعیت پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس خصوص میں اس نے اپنے خیالات زیادہ تر لاک سے حاصل کئے۔ لیکن انھیں بالکل نئے لباس میں پیش کیا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف فطری حقوق اور انفرادیت پر بہت کم زور دیا۔ بلکہ سیاسی اور شخصی آزادی کے امتیاز و فرق کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں سیاسی آزادی فرد اور مملکت کے تعلقات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ اور جب مملکت ایسے فرد کی محافظت کا ذمہ لے جو قانون کے دائرہ میں رہ کر قانون ہی کے مطابق اپنی خواہشات کو پورا کرے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس فرد کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی ایک فرد کے دوسرے افراد مملکت سے تعلقات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ مانٹسکیو کا یہ اصول نہ صرف مطلق العنانی کے خلاف ہے بلکہ وہ غلامی کو بھی جائز نہیں سمجھتا اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو شخصی آزادی کا یہ نظریۂ فطری قانون سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مانٹسکیو نے غلامی کے نظریات کی مخالفت کرتے ہوئے ایک ایسے بین الاقوامی میثاق کی بھی تجویز پیش کی تھی (گو کسی قدر طنزیہ پیرایہ ہی میں سہی) جس کی رو سے غلامی کی تجارت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

لیکن مانٹسکیو کے جس نظریہ کو موجودہ دور میں بھی کافی اہمیت حاصل ہے، وہ ادارات حکومت کی تقسیم و تفریق سے متعلق ہے ادارات حکومت کی تفریق سے اس کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ سیاسی آزادی کی محافظت کی جائے۔ وہ اس کو ہر فرد کے انفرادی اور غیر ذمہ دارانہ عمل کے خلاف اور انسانی ارادے بجائے قانون کی اطاعت کے لئے ایک مفید حربہ تصور کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ آزادی وہیں ممکن ہے جہاں حکومت کے اختیارات میں توازن کے ساتھ ساتھ ان پر تحدید عائد کر دی جائے۔ اس کے نزدیک مطلق العنانیت کو دور کرنے اور آزادی کا پورا یقین حاصل کرنے کے لئے عاملہ مقننہ اور عدلیہ کا ایک دوسرے سے علحدہ ہونا ضروری ہے اس کی تائید میں وہ انگلستان کی مثال پیش کرتا ہے، جہاں اس کے خیال میں اس اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شعبۂ حکومت کو اسی اصول "تحدید و توازن" پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اور خصوصیت کے ساتھ، قانون سازی اور عاملانہ اختیارات کے ایک دوسرے سے علحدہ ہونے کو وہ بہت ضروری سمجھتا تھا۔ اسی طرح فوجداری قوانین اور طریقہ کارروائی سے بھی اس نے ان نقائص کو دور کرنے پر زور دیا جن کی وجہ سے ناانصافی کو روکا نہیں جا سکتا۔ مانٹسکیو کے تفریق اختیارات کے نظریہ نے ــــ جو اگرچہ کہ انگلستان کے دستور کی غلط تفہیم پر قائم کیا گیا تھا کیونکہ وہاں کابینی طرز حکومت کے ارتقا کی وجہ سے عاملانہ اور قانون سازانہ اختیارات ایک ہی جگہ جمع ہو رہے تھے ــــ امریکہ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہاں اس اصول کو مرکز اور ریاستوں، دونوں کے دساتیر میں ایک بہت ہی مفید اصول کی حیثیت سے اختیار کر لیا گیا۔ خود فرانس میں جب انقلابی اسمبلی نے اعلان حقوق الناس تیار کیا تھا تو

اس اصول کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا تھا۔

بودین کی پیروی کرتے ہوئے مانٹسکیو نے یہ بتلایا کہ سیاسی اور معاشرتی ادارات اپنے ماحول اور ملک کے طبعی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور خصوصیت کے ساتھ آب و ہوا اور ملک کی زرخیزی کو اس نے ادارات سیاسی کی ترتیب و تشکیل میں بڑے اہم اجزا ظاہر کئے تھے۔ اسی سلسلہ میں اس نے یہ بھی واضح کیا کہ سرد ممالک میں سیاسی آزادی ایک فطری چیز ہوتی ہے اور اسی طرح گرم ممالک میں آزادی کا فقدان اور غلامی کا رواج غیر فطری نہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ پہاڑی علاقے آزادی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور وسیع میدان مطلق العنانیت کی ترویج میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ایشیا کے وسیع میدانوں میں مطلق العنان اور شخصی طرز حکومت کو جو فروغ حاصل ہوا اور یورپ کے چھوٹے چھوٹے جغرافی اکائیوں میں آزادی کی جو جدوجہد شروع ہوئی اور اس کو حاصل کرنے اور بحال رکھنے کی کوشش کی گئی وہ بہت بڑی حد تک جغرافی اثرات کا نتیجہ تھیں۔ وہ بالآخر اس نتیجہ پر بھی پہنچتا ہے کہ جزیروں کے رہنے والوں کے لئے براعظموں کے باشندوں سے زیادہ عمومی ادارات حکومت کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

مانٹسکیو نے اس پر بھی بہت زور دیا کہ معاشی و معاشرتی اور مذہبی اثرات قانون کی تدوین و تشکیل میں بہت بڑا حصہ لیتے ہیں شاید وہ اسی لئے اس کو ضروری سمجھتا تھا کہ قانون کو رائج الوقت رسوم و رواج کے معیار کے مطابق ہونا چاہیے۔ مسئلہ آبادی غریبوں کی امداد اور تجارت و زر کے مسائل پر اس نے اپنے ملک اور اپنے دور کی مثالیں پیش کرتے ہوئے نہایت حکیمانہ طور پر روشنی ڈالی ہے۔ ہرنگٹن کی طرح مانٹسکیو کا بھی یہی خیال تھا کہ سیاسی اختیارات کی تفریق اور تقسیم کا مسئلہ دراصل ملکیت کی تقسیم اور توازن کی طرف ہی رہنمائی کرتا ہے۔ کسی ملک کی تجارت کی ترقی کو وہ ملوکیت کے لئے خطرناک تصور کرتا تھا اسی طرح عمومی حکومتوں کے لئے تجارتی اجارہ داری کو بھی ناموزوں سمجھتا تھا۔ انفرادی جدوجہد اور مسابقت کے مسائل میں وہ طبعیین کا موافق تھا۔

مانٹسکیو اگرچہ عیسائیت کا پیرو تھا۔ لیکن اس نے سیاست اور مذہب کے تعلق کو بالکل "مکیاولیانہ" اسپرٹ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک اسلام کے مطلق العنان حکومتوں میں اور عیسائیت کے محدود حکومتوں میں ترویج پانے کے یہی اسباب تھے۔ وہ کیتھولک مذہب کے لئے ملوکیت کو اور پروٹسٹنٹ مذہب کے لئے جمہوریت کو بہت موزوں تصور کرتا تھا۔ اس نے مذہبی رواداری کی بھی حمایت کی ہے اور اس پر بھی زور دیا ہے کہ مملکتی اقتدار کے دائرہ سے اخلاقی اور مذہبی امور خارج ہیں۔

مانٹسکیو نے ارسطو، بودین اور مکیاولی کے استخراجی اور تاریخی طریقہ کو اختیار کیا اور ان ہی کی طرح مبداء مملکت اور ہئیت مملکت کی نسبت عملی سیاسیات سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنے دائرہ تحقیقات میں اس نے غیر متمدن اقوام اور گمنام علاقوں کو بھی شامل کر کے تاریخ اور مشاہدات کے میدان کو بہت وسیع کر دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اس نے جاپانیوں، چینوں اور اہل افریقیہ کے ادارات کے متعلق جو معلومات حاصل کیے اور ان سے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ صحیح نہیں ہیں۔ عام علوم عمرانی کے ساتھ سیاسیات کو شامل کرنے کی کوشش اور سیاسی نظریات کو استخراجی کلیات پر قائم کرنے کا اس کا خیال، درحقیقت سیاسی فلسفہ کے اہم

رجحانات کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اواخر اٹھارویں صدی کی سیاسی تحریکات کی بنیاد لاک کے فطری حقوق، معاہدہ معاشرہ اور نظریات انقلاب پر رکھی گئی جن کی سب سے زیادہ وضاحت روسو کی تحریرات سے ہوتی ہے۔

محمد شہاب الدین
(ایم اے)

شاعر کی تمنا

اک کیف کا عالم ہو اک وجد کی دنیا ہو — خود بادہ و خود مستی خود ساغر و مینا ہو
اس درد بھرے دل کو دکھ دینے سے کیا حاصل — لذت کشِ وعدہ ہو، منت کشِ ایفا ہو
امید شکن ہو کر امید دلاتے ہو — خود قلزمِ ہستی ہو خود ساحلِ دریا ہو
معصوم تبسم ہو پر کیف تکلم ہو ! — اک نغمۂ دلکش ہو اک حسن کی دنیا ہو
دنیائے تجلی نے پائی ہے ضیا تم سے — اے جلوہ دہِ ہستی! ـــ کیا محو تماشا ہو؟
رنگین تخیل ہو پر کیف تصور ہو — تم شعرِ مجسم ہو "شاعر کی تمنا" ہو
کچھ ہو کہ "جیسے ہونا" کچھ زیب نہیں دیتا — جب تھے تو خدا جانے ـــ اب ہو تو کہو کیا ہو

عباس علی خاں
(بی اے)

از الہ آباد

نیا پل اور شام

حیدرآباد کا نیا پل ایک مرکزی مقام ہے جس کو بلدہ اور بیرون بلدہ کا نقطۂ اتصال کہا جا سکتا ہے۔ اکبر صاحب نے اس پل کی ایک شام کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ حقیقت اور مبالغہ کا شاعرانہ امتزاج ہے ــ اور شاعری کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کو حسن کاری کی جان سمجھنا چاہیے "سب رس"

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خواب دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرت انساں کی سرگرمی میں گم شور طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پُر بہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دار الشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دارالکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفا قانی
(بی۔اے۔ ال ال بی)

---

[1] عدالت العالیہ [2] عثمانیہ دواخانہ [3] کلیۂ بلدہ [4] کتب خانہ آصفیہ

قطب شاہی عہد میں تلنگی ادب کی سرپرستی

مسٹر سباراؤ تلنگی کے مشہور شاعر اور جامعۂ عثمانیہ میں تلنگی کے پروفیسر ہیں۔ ذیل کا مضمون ان کی ایک توسیعی تقریر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جس کو دکن کی تاریخ اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے خاص شوق سے پڑھیں گے۔ (سب رس)

یامنی چرتیر تلنگی زبان کی ایک مشہور اور قابل وقعت نظم ہے۔ اس کے مصنف پونگنٹی تلیگنّا نے سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال کئے بغیر تین ہزار مصرعوں کی ایک طویل نظم لکھ کر تلنگی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس نے اس کارنامے کو امین خاں کے نام سے منسوب کیا ہے جو گولکنڈے کے تیسرے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰-۱۵۸۵) کے دربار کا بلند پایہ عہدہ دار تھا۔ پانچ سو مصرعوں میں امین خاں کا سلسلۂ نسب اور اس کی اُس قسم کی دلچسپیوں کو تفصیل سے واضح کیا گیا ہے جو ادب، مذہب اور سیاست کے میدان میں امرا و شاہانِ گولکنڈہ ظاہر کیا کرتے تھے ایسی اہم معلومات اب تک ایک مقامی زبان میں مقفل تھیں اس لئے میں نے اس مضمون کے ذریعے سے ان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے

امین خاں کا سلسلۂ نسب

ستیا چنتامنی پولاچیرو جس کو عہد حاضر میں پٹن چیرو کہتے ہیں، کا حکمراں ہما میاں (ہمایوں میاں؟) تھا جو طاقتور بہادر اور شگفتہ مزاج بھی تھا۔ اس کی بیوی کا نام جدی بی؟ تھا۔ ان کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام بڑے میاں (بدیع میاں ؟) تھا جس کی شادی سلربی بی (سالار بی بی) سے ہوئی امین خاں ان ہی کا لڑکا تھا جس نے تلنگی ادب کی سرپرستی کی ہے۔ امین خاں کے حالات زندگی اس کے حسن کارانہ ذوق اور ذاتی خصائل کا صاف طور پر نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے علاوہ اس کی بیویوں اور لڑکوں نے گولکنڈے کی زندگی میں سماجی یگانگت اور عام رواداری کی تکمیل میں جو حصہ لیا ہے اس کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے میں نے اس مضمون میں مبالغہ آرائی اور فصاحت و بلاغت کے لوازمات سے قطع نظر کر کے اس نظم سے صرف واقعات پیش کیے ہیں۔ امین خاں کے خیالات اعتقاد کے بارے میں عجیب تھے اس نظم کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے خانگی ملازمین اور خدمت گار صرف وہی تھے جو یا تو لڑائی میں گرفتار ہو کر آئے تھے یا خود کو امین خاں کے سپرد کر دیا تھا روزمرہ استعمال کی اشیا سنہری برتن وغیرہ بالکلیہ ان ہی خدمت گاروں کے ہاتھوں میں رہتے تھے۔ بھٹاراجولو یا بھاٹ وہ لوگ ہوتے تھے جو شاہی دربار سے متعلق رہتے اور موقعوں پر بادشاہوں کے خطابات و کارناموں کو بیان کیا کرتے تھے امین خاں کے ہاں بھی یہ لوگ ایک کافی تعداد میں تھے اور وہ ان کو اشرفیاں اور چھتریاں انعام میں دیا کرتا تھا۔ ایک شہر امین پور بسایا تھا جہاں ایک بڑا تالاب بھی بنایا گیا تھا۔ ستیا چنتامنی (پٹن چیرو) میں اُس نے ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کی تھی جس کی عالیشان سفید عمارت کی شاعر نے بڑی تعریف کی ہے۔ بارھویں اور سترھویں صدی میں ویراشیوم کا اثر تلنگانہ پر چھا گیا تھا اور سنیاسی بننے کا شوق اور نفس کشی کا خیال ملک میں عام ہونے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں سنیاسیوں اور مجرد رہنے والوں کی کثرت ہوگئی امین خاں کو اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ افراد اور نوجوانوں کی آوارہ گردی کا احساس ہوا جو نہ صرف معاشرت کے لئے ایک عذاب ہوتے بلکہ

ان کی زندگی بیکار ضائع جاتی ۔ وہ جانتا تھا کہ سنیاسیوں کی مخالفت اور روک ٹوک خواہ قانون کے ذریعے ہو یا کسی اور اصلاح سے اس کے خلاف ایک شورش اور مخالفت پیدا ہو جائے گی ۔ آج بھی دنیا میں مذہبی رسوم کی وجہ سے شدید تنازعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں ہندوؤں کے نزدیک خیرات کا بہترین طریقہ کسی کی شادی کروا دینا ہے ۔ امین خاں نے اسی اصول کے تحت بغیر کسی نمائش یا اظہار کے غیر شادی شدہ نوجوان کو مالی امداد دے کر شادی کی طرف راغب کیا ۔ لوگ اس ترغیب سے مدد حاصل کرنے کی طرف اس قدر تیزی سے رجوع ہوئے کہ ایک قلیل مدت میں شاذ ہی کوئی ایسا خاندان ہوگا جس میں مجرد نوجوان باقی رہے ہوں اس طریقے سے امین خاں نے جوان نسل کو خرابی سے بچا لیا اس کو باغبانی کا بڑا شوق تھا اس نے ایک باغیچہ میں پودوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا اس کا باغ اور یہ چھوٹا سا باغیچہ مختلف قسم کے میوے کے درختوں اور قسم قسم کے پھولوں کی کیاریوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا شاعر نے اپنے شاعرانہ انداز میں اس کی یوں تعریف کی ہے کہ "امین خاں کے باغ میں داخل ہونے کے بعد بوڑھوں میں بھی جوانی کے آثار نمایاں ہو جاتے اور شیر خوار بچے بھی جوان ہو جاتے ہیں" ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ امین خاں کے باغ میں متعدد کھجور کے درخت لگائے گئے تھے اور یہ پہلا ہی موقع ہے کہ تلنگی ادب میں دکن کے باغوں میں کھجور کے درختوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اُس نے کنویں کھدوائے اور دھوپوں میں ہر سڑک پر آبدار خانے کا انتظام کیا ۔

امین خاں کا خاندان

امین خاں کی تین بیویاں تھیں ۱ ۔ بڑی بی بی ۲ ۔ شکور بی بی اور ۳ ۔ سیمی بی بی لیکن ان تینوں میں سے صرف بڑی بی بی اپنے شوہر کے ساتھ تعمیری کاموں میں اشتراک کرتی تھیں شاعر نے اس کے اخلاق اور نیکیوں کی بے حد مدح سرائی کی ہے ہم بعض وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری معاشرت میں ایک دوسرے کی شرکت خواہ وہ افراد کی جانب سے ہو یا حکومتوں کی دور حاضرہ ہی کی برکات ہیں اور اس کے برعکس ازمنہ وسطیٰ کا معاشرہ ذات پات کے قیود میں جکڑا ہوا اور معاشرت کے باہمی خدمات سے قطعاً نا آشنا دکھایا جاتا ہے مگر ہم چار سو سال پہلے کے دکن پر نظر ڈالتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں ؟ مسلمان دکن میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے جنگ میں دونوں جانب والوں کا نقصان ہوا مگر جب یہاں بس گئے تو ایسے بن گئے کہ فاتح اور مفتوح میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہا چنانچہ اس دور کے ایک شاعر نے اپنی نہ فنا ہونے والی زبان میں کہا ہے "کہ صوبہ دار وقت کی بیوی شہر کی گلیوں میں غریب بچوں کو دودھ اور اسی قسم کی دیگر اشیا تقسیم کرتی ہوئی پھرتی ہے" کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ نہ تو مفتوحین نے ان ہاتھوں کو جابر سمجھا اور نہ فاتح نے اپنی فاتحانہ شان کے منافی خیال کیا اور نہ مذہب و ملت کے اختلاف نے مسلمانوں کو دکن میں اتفاق و یکجہتی کا منبع بننے سے باز رکھا اس طرح وہ اخلاص اور یگانگت کی روح جو مسلمان بادشاہانِ دکن نے نہایت ہوشیاری اور بیدار مغزی کے ساتھ پھونکی تھی ہمیں آج تک اور اب بھی نظر آتی ہے ۔

فرزندانِ امین خاں

امین خاں کو بڑی بی بی کے بطن سے دو لڑکے تھے غطاطاں خاں ؟ اور فضل اللہ خاں ۔ شاعر نے آخر میں غطاطا خاں کی زندگی اور کارناموں کا ذکر کیا ہے جس سے ہم کو اس زمانے کے تاریخی واقعات کا علم ہوتا ہے شاعر غطاطا خاں کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس کو اس کی خوش کلامی کی وجہ سے شہنشاہ اکبر سے قرب حاصل ہو گیا تھا اس نے وسوا مادھ دیو کے ہاں جا کر سیکڑوں فیل کوہ پیکر لائے تھے وہ کئی مرتبہ عاد اللہ خاں (یا ید اللہ خاں) کے پاس وصول خراج کی غرض سے بھیجا گیا تھا

اس نے نہایت دانشمندی سے برید شاہ کو اپنے آقا قطب شاہ سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنے کی طرف راغب کیا تھا اسی طرح اس نے جالیان کرناٹک کو دربار گولکنڈہ میں تحفہ روانہ کرنے پر مجبور کیا اور اپنے آقا ابراہیم الملک قطب شاہ سے دیانت داری کر کے اس کی نظروں میں اپنی وقعت قائم کی وہ والی مینکا مقرب خاص تھا اس کو عربی، فارسی، گجراتی اڑیہ اور فصیح تلنگی اور دیگر قنوجی زبانوں پر کافی عبور حاصل تھا نظم کے اس حصہ سے کئی دلچسپ تاریخی واقعات کا علم ہوتا ہے۔

شہنشاہ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۶۰۵ء تک حکومت کی۔ ابراہیم الملک قطب شاہ نے ۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء گولکنڈہ پر حکومت کی اور یہ دونوں ہمعصر گزرے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ غطاطا خاں نے دلّی جاکر شہنشاہ اکبر سے تحسین حاصل کیا لیکن ہم اس وقت یہ نہیں کہہ سکتا کہ گولکنڈے کے بادشاہ نے کب اور کس غرض سے غطاطا خاں کو دلّی روانہ کیا تھا اور اس میں کیا سیاسی راز مضمر تھا گوبیل لکھتا ہے کہ ۱۵۶۵ء میں وجیانگر کی سلطنت کے زوال کے بعد جنوبی ہند کے مسلمان بادشاہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے لگے تو سلطنت دہلی سے مدد کے طالب ہوئے اگرچہ اکبر نے سلطنت احمد نگر اور برار کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی مگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کردیا شاید اسی سلسلے میں غطاطا خاں کو ایسے اہم سیاسی معاملے میں سفیر بنا کر دہلی روانہ کیا گیا۔ وسیوا ناد ھ دیو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے علاقہ اڑیسہ کا بادشاہ تھا ابراہیم الملک نے جنگ تالی کوٹ کے بعد رفعت خاں کی سرکردگی میں ایک مہم شمالی جانب روانہ کی جس میں اس کو کامیابی بھی ہوئی اور راجمندری سے لے کر قاسم کوٹہ تک کا علاقہ ہاتھ آیا لیکن اس سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اڑیسہ کی مہم بھی اسی وقت جاری رہی ہو اس لئے کہ گولکنڈہ اور وسیوا ناد ھ دیو کے درمیان ۱۵۶۹ء میں صلح نامہ ہوتا ہے۔ دو سلاطین ایسے بیان کئے گئے کہ جن سے غطاطا خاں نے خراج وصول کیا ہے ایک تو عادالله خاں اور دوسرے برید شاہ، ہم یہ تو جانتے ہیں کہ شاہان بیدر کا لقب برید شاہ تھا مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ عادالله خاں کون تھا ۱۵۵۰ء اور ۱۵۸۰ء کے دوران میں بیجاپور پر علی عادل شاہ حکمران تھا ممکن ہے کہ عادالله خاں سے وہی مراد ہو۔

دوسرا لڑکا۔ فضل الله خاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سیر الگا را جا کر گولکنڈہ اور وجیانگر میں اتحاد کرا دینے میں کامیاب رہا یہ سیر الگا رائے کون تھا؟ ہم جانتے ہیں کہ رام راج کو جنگ تالی کوٹ میں شکست ہوئی اور اس کے بھائی ترل دیو رائے نے پائے تخت کو وجیانگر سے پینو کنڈہ میں منتقل کر دیا سری رنگ رائے ترل رائے کا بیٹا تھا جو ۱۵۷۲ء میں تخت نشین ہوا سیر الگا رائے کوئی جدا نام نہیں بلکہ وہ سری رنگ رائے کی ایک مستعمل اور بدلی ہوئی شکل ہے یہ ابراہیم قطب شاہ کا ہمعصر گزرا ہے گو اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سری رنگ رائے کس توقع پر گولکنڈہ آیا تھا۔ کیا اس نے فضل الله خاں کے ایما سے ایسا کیا ہو لیکن اس واقعہ سے کہ ابراہیم الملک نے نہایت دوربینی اور مدبرانہ طریقہ پر ایک طرف تو دہلی سے دوسری طرف وجیانگر سے گفت و شنید جاری رکھی تھی ہم بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کی یہ کوشش دکن میں امن کے قیام اور تہذیب و تمدن کے ایک نئے باب کے اضافے کا پیش خیمہ تھی بعض حصوں میں ان تفصیلات کا ذکر ہے جو گولکنڈے کی تجارت سے متعلق ہیں۔ فضل الله خاں کو پیگو کے گھوڑے تحفتہً ملے تھے اس زمانے میں پرتگالی پیگو سے گھوڑے لاتے اور گولکنڈے میں فروخت کرتے ان کی یہ تجارت خوب ترقی پر تھی۔

امین خاں کو شکور بی بی کے بطن سے بھی دو لڑکے تھے ایک عبدالعلی اور دوسرا شیخ ابراہیم۔ شاعر عبدالعلی کی زبان دانی اور علم و فضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "عبدالعلی ایک اعلیٰ پائے کا خطاط ہے جو سلطان گولکنڈہ کے دربار میں شاہی خوش نویس کے عہدہ پر فایز ہے وہ عربی، فارسی، کنڑی، قنوجی اور تلنگی زبانوں پر خوب حاوی ہے۔" شیخ ابراہیم کا ذکر جس کا فوجی ملازمت میں ہونا سمجھا جاتا ہے بعض ہی جگہ آیا ہے۔ امین خاں کا ایک اور فرزند عبدالکریم بھی تھا جو اس کی تیسری بیوی کے بطن سے تھا۔ شاعر نے عبدالکریم کے متعلق بعض نہایت دلچسپ باتیں بتلائی ہیں۔ "عبدالکریم ایک نہایت ہی خوش طبع اور ظریف شخص تھا بعض اوقات وہ تمام اہل دربار کو ہنسا ہنسا کر لٹا دیتا تھا اس کی فیاضی اور دریا دلی مشہور تھی کوئی شخص کبھی اس کے گھر سے خالی نہ جاتا۔ اس کو ہمیشہ دربار سے انعام و اکرام اور تحائف میں زرین پگڑیاں جواہر دار کلاہیں اور گھوڑے پالکیاں ملا کرتی تھیں۔" میرے خیال میں اب مجھے وہ دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہئے جس کو شاعر نے امین خاں کی تمہید میں نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ "امین خاں نے ایک دربار منعقد کیا جس میں اس کے غلام اس کے اعزا سفراء خطاب یافتہ امراء مقربانِ خاص جاگیردار اور فوجی عہدہ دار جمع تھے وہ ایک نظم جو نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھی جا رہی تھی سن کر محظوظ ہو رہا تھا مجھے بھی مدعو ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مجسم اخلاق امین خاں نے مجھے اپنے قریب بٹھلا کر اعزاز بخشا میں ابھی اپنی جگہ پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ درباری ملازمین نے خوشبویات میرے جسم پر لگائیں ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی لعل تھے مجھے دیا گیا۔ امین خاں نے ایک خاص انداز سے مسکراتے ہوئے مارا لنگا نتی آپاناما کی طرف دیکھا جو ذات کا برہمن تھا اور ایک اعلیٰ عہدے پر فایز تھا آپانا اس اشارے کا مطلب سمجھ کر مجھ سے یوں مخاطب ہوا کہ "جس طرح کوئل کے لئے آم کی پیٹر ہوتی ہے اسی طرح علم دوست کے لئے ایک نظم یعنی اے تلیگنا کیا تم اپنی نظم اپنے مہذب اور شائستہ حاکم امین خاں کو سنا کر خراج تحسین وصول کرنے کی عزت حاصل کرنا نہیں چاہتے" یہ تھی ایک مثال اس سرپرستی اور قدردانی کی جو تلنگی ادب کو مسلمان سلاطین و امرائے گولکنڈہ سے نصیب ہوئی۔

مترجمہ سراج الدین احمد

زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں انہیں خوشی ہوتی ہے۔ کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے اُن کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے

عبدالحق

چار مینار سے استفسار

"چار مینار" کے نام ہی میں حیدر آباد کا تصور پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ حیدر آباد کی یہ قدیم تاریخی عمارت، اس کے جبوری دور کے تمدن کی ایک ایسی نشانی ہے جو آج تک اپنی اسی عظمت و شان کے ساتھ موجود ہے۔ حیدر آباد کی دنیا نے کئی کروٹیں بدلیں لیکن اس کی مستحکم بنیادیں متزلزل نہ ہو سکیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ ہر زمانے کا ساتھ دیتا رہا۔ وجد صاحب نے ایک لطیف انداز میں اس سے استفسار کیا ہے۔

"سب رس"

فلک کے جور سے تو آج اک مظلوم ہستی ہے — مگر تجھ سے ابھی شانِ قطب شاہی برستی ہے
دلوں کو موہ لیتے ہیں ترے نقش و نگار اب تک — خزاں پر خندہ زن ہے رات دن تیری بہار اب تک
سنبھل کر تجھ کو دیکھیں تو رسینا دیکھنے والے — تماشا خود نہ بن جائیں تماشا دیکھنے والے
ترے دم سے ابھی زخمِ دلِ احباب تازہ ہے — تو اپنے بانیوں کی شان و شوکت کا جنازہ ہے
تری عظمت ہمیں دیتی ہے پیغام خود آگاہی — ترے جلوے سے پہروں خیرہ تھی چشم شہنشاہی
بہت سے زخم کھائے ہیں ترے قلب شکیبا نے — ہزاروں رنگ دیکھے ہیں تری چشم تماشا نے
بتا کس خاک کے تودے سے کوہِ نور نکلا تھا — کہاں ہر جوہری کا ہاتھ مثلِ دستِ بیضا تھا
بتا کس کر و فر کے تھے سلاطینِ قطب شاہی — کہاں صبح و مسا بجتا تھا ناقوسِ ہوا خواہی
بتا کیا تھے مشاغل ان کے وہ کس طرح رہتے تھے — ہیں جن کے مقبرے ایسے تو ان کے محل کیسے تھے
بتا کس دن، کہاں، دربارِ عالیشان ہوتا تھا — جہاں بلدے کا ہر چھوٹا بڑا مہمان ہوتا تھا
بتا کس شان کے تھے حکمت عظمت کے کاشانے — کہاں تھے معدنِ علم و ہنر شاہی کتب خانے
بتا کیا حسن رکھتا تھا محمد شاہ کا ہمدم — بتا کس طرح جاگی قسمتِ رقاصۂ جہلم
بتا کس جا ہوا کرتے تھے جلسے باکمالوں کے (محمد قلی قطب شاہ) — کہاں تھے جمگھٹے موسیٰ ندی پر مہ جمالوں کے (بھاگ متی)
بتا کیونکر تمدن زا ہوا ہر وقت چلتی تھی — بتا تہذیب کب اک مستقل سانچے میں ڈھلتی تھی

بتا رخصت پہ کس کی چرخ نیلی فام روتا تھا
بتا دربار سے کس طرح تاناشاہ نکلا تھا !
بتا کب گم ہوا یہ شاہزادہ راج دھانی میں
بتا کس دن محل کے حوض میں لاشے ہی لاشے تھے
بتا کیوں نقشِ حیرت تھا جہاں آباد کا والی
بتا دلی کو پہنچے کس طرح در، بابِ عالی کے
بتا کس مقبرے پر شاعرِ اقبال رویا تھا !
بتا اِن آفتوں کا تیرے دل پر کچھ اثر بھی ہے ؟
اماں دشمن کو دی صد حیف! یہ کیا کر دیا تو نے
مجھے تو خون رلواتی ہے پہروں بے حسی تیری
سرِ فاتح پہ گر جاتا تو تیرا نام ہو جاتا !

گلی کوچوں میں سارے شہر کے کہرام ہوتا تھا
خدا بندہ کو لے کر کیا بے پرواہ نکلا تھا !
اجل کی گود میں کیوں سو گیا اٹھتی جوانی میں
فتح کے بعد کتنی دھوم تھی کیسے تماشے تھے
کیا فاتح نے کیونکر اعترافِ ہمت عالی !
ہیں تاریخوں میں قصے درج جن کی بے مثالی کے
بتا بیخود کہاں یہ عظمتِ ماضی کا جویا تھا !
تری تاریکیوں میں پرتوِ نورِ سحر بھی ہے ؟
ہمیشہ کے لئے اپنے کو رسوا کر لیا تو نے !
تری نادانیوں کا پھل ہے غافل بیکسی تیری
شہیدِ ملک و آزادِ غمِ ایام ہو جاتا !

سکندر علی وجد
بی، اے، ایچ، سی ایس

بانئ چارمینار کی ایک غزل

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ! — پیا باج یک تل جیا جائے نا
(کے بغیر — نہ) (کے بغیر — لمحہ — نہ)
میں کیسے پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے اتا کیا جائے نا
(کے بغیر صبر) (کہا — لیکن — نہ)
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے — کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
(جس کو — جاہل) (کبھی — بیٹھا)
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا (سلطان محمد قلی قطب شاہ)
(مجھ — دیوانے) (دیوانے — کچھ)

حسن و دل

(مشہور قطب شاہی افسانہ سب رس کا خلاصہ)

قدیم قطب شاہی شاعر اور ادیب وجہی نے حسن و دل کا دلچسپ افسانہ اپنی مشہور کتاب سب رس میں
نہایت دلآویز پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ چونکہ زبان قدیم ہے اس لئے مولوی عبدالحق صاحب نے
اس قصہ کو اپنی زبان میں اختصار کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ (سب رس)

عقل مغرب کا بادشاہ اور عشق مشرق کا۔ عقل کا ملک سیستان تھا۔ حسن عشق کی بیٹی ہے اور دل عقل کا فرزند ہے۔ بیٹا جب سیانا ہوا تو باپ (عقل) اسے شہر تن (بدن) کا والی بنا دیتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دل کا ایک مصاحب آب حیات کا قصہ پڑھ کر سناتا ہے دل کو آب حیات کا ذکر سن کر اس کے حاصل کرنے کی دھن لگتی ہے اور اس کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوتا ہے کہ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے آخر اس کا جاسوس نظر اس کی تلاش میں نکلتا ہے اور رستے میں اسے ایک خوش منظر اور خوش حال شہر ملتا ہے جس کا نام عافیت اور اس کے بادشاہ کا نام ناموس ہے۔ وہ ناموس سے ملاقات کرتا ہے اور اپنے سفر کا مقصد بیان کر کے رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ ناموس کہتا ہے کہ آب حیات کی کوئی حقیقت نہیں یہ فسانہ ہے اصل آب حیات انسان کی آبرو ہے۔ نظر مایوس ہو کر آگے بڑھتا ہے چلتے چلتے ایک عظیم الشان پہاڑ کے قریب پہنچتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام زہد ہے اور ایک بڈھے زرق نامی کا آشیانہ ہے۔ اس کی خدمت میں حاضر ہوا آب حیات کا نشان پوچھا۔ اس نے کہا کہ آب حیات دنیا میں کہاں وہ تو بہشت میں ہے۔ ہاں اگر اس کی تلاش ہے تو عاشقوں کے آنسوؤں میں ڈھونڈ۔ یہ بات اس کے دل کو نہ لگی اور وہاں سے مایوس ہو کر آگے چلا تو ہدایت نام ایک سر بفلک کوٹ دیکھا جس کا بادشاہ ہمت تھا اس نے البتہ کچھ ہمت بندھائی اور آب حیات کا پتہ بتایا اور کہا کہ کوہ قاف کے اس طرف ایک شہر ہے جس کا نام دیدار ہے اس میں ایک باغ ہے جس کا نام رخسار ہے اور اس باغ میں ایک چشمہ دہن ہے اور اسی چشمے میں آب حیات ہے جس کی تجھے تلاش ہے۔ اور ایک سفارشی خط اپنے بھائی قامت کے نام دیا۔ اور یہ بھی کہا وہاں پہنچنا بہت دشوار ہو۔ شہر دیدار کا نگہبان ایک دیو رقیب نامی ہے وہ کسی غیر آدمی کو وہاں گھسنے نہیں دیتا۔ غرض بہزار دقت جب کہ وہ رقیب کے شہر سنگسار میں پہنچا تو نگہبانوں نے اسے قید کر لیا اور رقیب کے پاس لے گئے۔ رقیب بہت بگڑا اور کہا تو یہاں کیسے آیا۔ نظر نے جب دیکھا کہ جان کا خطرہ ہے تو کہا میں بڑا حکیم اور کیمیا گر ہوں۔ رقیب کو لالچ نے گھیرا اور سونے کی طمع میں اسے بڑی خاطر سے اپنے پاس رکھا جب سونا بنانے کی فرمائش کی تو نظر نے کہا بعض دوائیں صرف شہر دیدار میں ملتی ہیں وہاں لے چلو تو سونا بنا دوں گا۔ وہاں گیا تو قامت سے ملاقات ہوئی ہمت کا خط دیا اور اس کی مدد سے چھپ کر رقیب کے پنجے سے رہائی پائی اور شہر دیدار کا قصد کیا۔ رخسار کے گلزار میں پہنچا تو دل باغ باغ ہو گیا قضا کار حسن کی ایک سہیلی لٹ (زلف)

وہاں سیر کرنے آئی تھی اس کی آنکھ جو نظر پر پڑی تو برہم ہو کر بولی کہ تو کون ہے اور یہاں کیسے آیا ہے؟ یہ بہت گھبرایا اور بہت منت و عاجزی کی اور کہا میں مصیبت زدہ ہوں، یہاں تک آ گیا ہوں، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ اسے ترس آیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ رخصت کرتے وقت اپنے کچھ بال دئیے اور کہا جب تجھ پر کوئی مصیبت آئے تو یہ بال آگ پر رکھ دینا میں فوراً تیری مدد کو آجاؤں گی۔ زلف سے وداع ہو کر پھر شہر دیدار کی طرف چلا اور تھوڑی دیر میں رخسار کے گلزار میں پہنچ گیا۔ وہاں کا نگہبان غمزہ تھا، غمزہ نظر کا بھائی تھا لیکن بچپن میں جدا ہو گئے تھے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔ غمزے نے جو غیر شخص کو گلزار میں دیکھا تو فوراً جھپٹ کر اسے گرفتار کر لیا اور قتل ہی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر بازوبند پر پڑی۔ ان کی ماں نے بچپنے میں نشانی کے لئے دونوں کے بازوؤں پر ایک ایک لعل باندھ دیا تھا، دیکھتے ہی وہ نظر سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ دونوں بھائی ملے نظر نے اپنا سب احوال سنایا۔ غمزہ حسن کا مصاحب تھا وہ اسے حسن کے پاس لے گیا۔ حسن کے پاس ایک نہایت خوش رنگ بیش بہا لعل تھا جس پر ایک خوبصورت منی سی مورت بنی ہوئی تھی اس نے پرکھنے کے لئے نظر کو دکھایا وہ دیکھ کر حیران ہو گیا اور کہا کہ یہ صورت تو دل کی ہے۔ یہ سنتے ہی حسن دل پر عاشق ہو جاتی ہے۔ نظر نے کہا کہ دل کو آب حیات کی بڑی جستجو ہے اور اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے یہ مل جائے تو میں دل کو تیرے پاس لے آتا ہوں۔ حسن نے اپنے غلام خیال کو نظر کے ساتھ کیا اور ایک یاقوت کی انگوٹھی ان کو دی جس سے آب حیات کے چشمے پر مہر کی جاتی تھی۔ خیال اور نظر شہر بدن میں پہنچ کر دل سے ملتے ہیں دل کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے اور خیال حسن کی تصویر کھینچ کر دل کو دکھاتا ہے تو دل ہزار جان سے حسن پر عاشق ہو جاتا ہے، کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے آخر نظر کے مشورے سے شہر دیدار کے سفر کا قصد کرتا ہے۔ دل کے باپ بادشاہ عقل کا وزیر وہم نامی اپنے آقا کا بڑا خیر خواہ تھا اسے جب یہ خبر ہوئی تو اس نے فوراً بادشاہ سے ساری باتیں جا لگائیں اور کہا کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ہے اور دونوں شہزادۂ دل کو شہر دیدار کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کریں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے ابھی بادشاہ عشق سے صلح ہوئی ہے باہم قول و قرار ہوئے ہیں اگر لڑائی ہوئی تو بہت برا ہو گا۔ عشق بہت قوی ہے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ عقل اس خبر کے سننے سے سخت پریشان ہوا اور وہم کے مشورے کے موافق دل اور نظر کو قید کر دیا اور پہرے بٹھا دئے۔

یاقوت کی وہ انگوٹھی جو حسن نے دل کو اپنے عشق کی نشانی بھیجی تھی کسی مصلحت سے دل نے نظر کو دے دی تھی اس کی ایک خاصیت یہ تھی جو کوئی اسے منہ میں رکھ لے تو سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے وہ سب کو دیکھے اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ عقل بادشاہ کے بند سے باہر نکل آیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا اور جلد جا پہنچا۔ سیر کرتے کرتے رخسار کے گلزار میں گزر ہوا، وہاں ایک چشمہ جسے آب حیات کہتے ہیں پایا، لالچ میں آ کر چاہتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے کہ انگوٹھی منہ میں سے نکل چشمے میں جا پڑی اور آب حیات کا چشمہ نظر سے غائب ہو گیا۔ اتنے میں رقیب کی نظر اس پر پڑی وہ تاک میں تھا ہی فوراً جکڑ کر باندھ لیا اور گھر لے جا کر قید کر لیا یہ ان کے کرتوت کا نتیجہ تھا، سخت پریشان حال اور بے قرار تھا کہ ایک دن لٹ کے بالوں کا خیال آیا، ایک دو بال لے کر آگ پر رکھے، بالوں کا آگ پر رکھنا تھا کہ فوراً لٹ آ پہنچی۔ حال پوچھا اور کسی حکمت سے قید سے چھڑایا اور شہر دیدار اور رخسار کے گلزار کے رستے پر ڈال دیا

نظر وہاں پہنچ کر حسن سے ملا۔ وہ فراق کی ماری تو انتظار ہی میں بیٹھی تھی، جب نظر کی زبانی سب حال معلوم ہوا تو بہت مایوس ہوئی اور غمزہ کو بلا کر کہا کہ تم اور نظر دونوں جاؤ اور جس طرح بن پڑے، تدبیر سے، حکمت سے، جادو سے ٹونے سے دل کو یہاں لے کر آؤ۔

اب نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو ساتھ لے کر شہر بدن کی طرف سدھارے۔ کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند سے نکل بھاگا تو عقل کو اسی وقت کھٹکا ہوا تھا کہ یہ جا کر کچھ نہ کچھ فساد برپا کرے گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دئے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے اُسے ملک سے باہر نہ جانے دیں اور جہاں ملے قید کریں۔ زرق کا بیٹا توبہ جو اپنے کوہستان زہد میں رہتا تھا اُسے بھی عقل نے تاکیدی احکام بھیجے تھے۔ جب نظر اور غمزہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو قلعہ کے دیدبان نے اطلاع دی کہ نظر لشکر لئے پہاڑی کے نیچے پڑا ہے۔ توبہ غصہ میں بھرا ہوا فوراً لشکر لے کر چڑھ آیا۔ یہ دونوں بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا۔ یہاں سے چل کر وہ قلندروں کے بھیس میں شہر عافیت کی طرف چلے اور وہاں کے بادشاہ ناموس سے ملے۔ اس پر کچھ ایسا جادو چلے کہ تخت و تاج چھوڑ کر وہ بھی فقیر ہو گیا۔

ادھر توبہ شکست کھا کر با حال خستہ و تباہ بادشاہ عقل کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس پر گزری تھی کہہ سنائی۔ بادشاہ نے غمزہ کی یہ سفاکی دیکھی تو دل کو طلب کیا، قید سے رہا کیا اور غمزہ کی بیدادی کا قصہ سنایا اور نہایت دلسوزی سے موقع کی اونچ نیچ کو سمجھایا اور کہا کہ حسن کا لشکر بہت سفاک ہے اس میں وفا نہیں۔ تم اگر ان دغا بازوں کی باتوں پر جاؤ گے تو اپنا ملک کھو بیٹھو گے ہماری بات سنو، ہمارا جرار لشکر حاضر ہے اسے لے کر شہر دیدار کے ادھر چلے جاؤ، اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں، عورت کی ذات بہت مکار ہوتی ہے نہ معلوم اس عشق کے پردے میں کیا گل کھلائے۔ دل کو بھی یہ بات پسند آئی اور سمجھا کہ اگر غالب آیا تو حسن اپنی ہے اور جو مغلوب ہوا تو معذوری ہے عقل کی باتوں سے عشق کا ولولہ دھیما پڑ گیا۔

غرض شاہ عقل کے سپہ سالار صبر کو ساتھ لیا اور لاؤ لشکر لے کر شہر دیدار کا رخ کیا۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ ساتھ والے خبر لائے کہ اس جنگل میں جگہ جگہ ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں گویا ہوا سے باتیں کرتے ہیں۔ دل یہ سن کر بے تاب ہو گیا، شکار کا شوق سر پر سوار ہوا تیر کمان لے ہرنوں پر گھوڑا ڈالا۔ وہ اصل میں ہرن نہ تھے وہی غمزے کا لشکر تھا، انھیں کون پکڑ سکتا تھا، دور نکل جاتے تو ٹھیر جاتے اور جو دل قریب آتا قلانچیں بھر کر آگے نکل جاتے۔ عقل کو خبر ہوئی تو محبت نے جوش مارا اور وہ بھی اسی طرف راہی ہوا۔ دونوں ہرنوں کے پیچھے سرگرداں چلے اور نظر اور غمزہ انھیں جُل دے کر شہر دیدار کے پاس لے آئے۔ حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کارگذاری سنائی وہ سن کر باغ باغ ہو گئی۔

اب سوچ یہ پڑی، کہ عقل بادشاہ جو لشکر لئے چلا آ رہا ہے اس کی کیا تدبیر کی جائے اور اس آفت کو کیونکر ٹالا جائے۔ رائے یہ قرار پائی کہ حسن اپنے باپ کو اطلاع دے کہ وہ کسی جتن سے اس بلا کو ٹالے۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میرا ایک وفادار غلام خیال نامی مدت سے غائب تھا اب معلوم ہوا عقل بادشاہ نے گرفتار کر لیا ہے۔ ہم نے طلب کیا تو بہت برہم ہوا اور اب لشکر لئے چڑھا آ رہا ہے۔ عشق نے جب یہ مکتوب پڑھا تو مارے طیش کے چہرہ لال ہو گیا اور کہنے لگا کہ عقل کی یہ مجال کہ وہ اس سرزمین پر قدم رکھے، عقل دیوانہ ہے کہ جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے۔

غرض عشق نے اپنے بہادر سپہ سالار ہجر کو مقابلے کے لئے بھیجا عقل یہ فوج دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ فرزند کی نالایقی اور اپنے فعل پر بہت پچھتایا۔ اب لڑائی شروع ہوگئی۔ غمزہ نے عقل پر حملہ کیا، خوب دو دو ہاتھ ہوئے، عقل کو سنبھلنا مشکل ہوگیا۔ دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر پر قیامت برپا کردی۔ تیسرے دن رات کو زلف نے شبخوں مارا، سوتے ہوؤں کو پچھاڑا۔ اتنے میں باس (نسیم) پہنچی، اس نے دل کو بہت کچھ ڈھارس دی اور پے در پے حملوں سے غنیم کے لشکر میں کھلبلی مچادی، زلف کو بھگادیا اور عشق کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔

حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرائی، اپنے خال سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کوہ قاف میں تیری ایک ہمزاد ہے بڑی چتر اور دلبر ہے حسن و جمال میں بھی لاجواب ہے وہ آگئی تو بیڑا پار ہے۔ حسن نے کہا وہ کوہ قاف میں، میں یہاں اس کے آتے آتے تو کام تمام ہوجائے گا۔ خال نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں، میرے پاس عنبر کا دانہ ہے، ابھی آگ پر رکھتا ہوں، چٹکی بجانے میں تیرے پاس آجائے گی۔ خال نے ایسا ہی کیا اور حسن کی ہمزاد فوراً آپہنچی۔ حسن اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی، گلے ملی اور اپنی ساری بپتا کہہ سنائی۔ ہمزاد نے کچھ سوچ بچار کے بعد کہا ڈرو مت، عقل کیا چیز ہے، وہ ہمارے حملے کی کیا تاب لاسکتا ہے۔ حسن کی ہمزاد نے اپنا ناز، غمزہ، شیوہ، نخرہ سپہ سالار ہجر کی مدد کو بھیجا۔ حسن کے پاس ایک باکمال تیر انداز بھی تھا، جس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا، اس کا نام ہلال تھا، اُسے بھی حسن نے سپہ سالار کی کمک پر بھیجا۔

جب یہ پہنچے تو سپہ سالار کا پلہ بہت بھاری ہوگیا۔ ہلال عقل کے لشکر پر جا پڑا، صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا اندر گھستا ہوا چلا گیا اور یک بارگی دل کے پاس جا پہنچا اور انجان بنے سے ایسا تیر جوڑ کر مارا کہ دل گھوڑے پر سے زمین پر آگرا۔ مارنا کسے چاہتا تھا اور لگ گیا کسے، قضا پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ عقل نے جو یہ دیکھا تو حواس جاتے رہے سارا لشکر تو کہیں، میں کہیں، فرار ہوگیا۔ عقل بیچارہ مارا مارا پھرا کہیں ٹھکانا نہ ملا۔

ادھر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ حسن ہزار ہزار شکر بجالائی عقل کو پاس نہ دیکھ کر حسن کے خدمت گاروں نے دل کو گرفتار کرلیا اور حسن کے پاس لے آئے۔ حسن کی نظر جو اس پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور دل سے آہ نکلی، بے تاب ہوگئی۔ مارنے والے کو کوسنے دینے لگی اور خدمت گاروں پر آفت برپا کردی۔ اب کیا ہوسکتا تھا، خاموش ہورہی مگر دل کو لگی ہوئی تھی، اپنی دائی ناز کو بلایا اپنی بے قراری اور بپتا کا حال سنایا۔ دائی نے کہا جلدی اچھی نہیں مصلحت سے کام لینا چاہئے ورنہ اس میں بڑی بدنامی ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے جسے چاہ ذقن کہتے ہیں، کچھ سونے کا بنا ہوا ہے اور اس کا سواد بھی اچھا ہے فی الحال دل کو وہاں بند رکھا جائے۔ دل بیچارہ یہاں گرفتار، ادھر حسن بے قرار۔

آخر حسن سے نہ رہا گیا اس نے اپنی سہیلی وفا کو جو سپہ سالار ہجر کی بیٹی تھی، بلاکر اپنے درد دکھ کی داستان بیان کی اور کہا کہ دل سے ملنے کی کوئی تدبیر کرو۔ وفا نے کہا میرے خیال میں ایک بات آتی ہے کہ شہر میں ایک باغ ہے (جس کا نام باغ آشنائی ہے) اس میں ایک چشمہ ہے جیسا چشمۂ آب حیات۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک چھجا ہے جس پر غمزے کے بادل چھائے رہتے ہیں اور ناز کے موتی برستے ہیں۔ اس چھجے میں دو کالی کالی کھڑکیاں ہیں جو ان کھڑکیوں کو کھول کے داخل ہو تو وصال کی لذت پائے۔ حسن نے منت سے کہا کہ اگر تو یہ کرسکتی ہے تو للہ جلدی کر اور ساتھ ہی زلف کو حکم دیا کہ دل کے پیچ سب کھول دے اور چاہ ذقن سے باہر نکال لا۔ زلف ناز و ادا سے اکڑتی لچکتی گئی اور دل کو چاہ ذقن سے باہر نکال لائی۔ اتنے میں وفا بھی آپہنچی دل سے گھل مل کے باتیں کرنے لگی۔ بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا حسن نے جو

تجھے بند کر رکھا تھا اس میں مجبوری تھی، باپ کا ڈر اور لحاظ تھا اگر ایسا نہ کرتی تو تیری جان کے لالے پڑ جاتے۔ حسن نے تیرے ساتھ بڑی بڑی مروت اور عنایت کی ہے تجھے اس کی قدر کرنی چاہئیے۔ غرض اس طرح کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے دل کو بہلایا اور محبت کی گرمائی سے گرمایا۔ کنوئیں سے نکل کر باغ میں جو آیا تو بہت خوش ہوا بہت دنوں کا تھکا ماندہ تھا وہیں پھولوں کی کیاری پر پڑ کے سو رہا۔ حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، ہوا کی طرح اڑ کے آئی۔ دیکھا کہ دل کا قرار جی کا آرام دل پڑا سو رہا ہے اور سارا باغ اس کے حسن کی جوت سے جگمگ کر رہا ہے۔ دل کی صورت دیکھ حسن کا دل ہاتھ سے جاتا رہا اس کے پاؤں پر آنکھیں ملیں، بلائیں لینے لگی اور اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی، مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ چند قطرے دل کے رخسار پر جو گرے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ باغ میں دفعتاً یہ نئی بہار کہاں سے آ گئی کہ سارا چمن نور کا عالم۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو دوسرا ہی عالم نظر آیا۔ دل سے آہ نکلی، بے قرار ہو گیا اور محبت کے جوش میں دوڑ کر قدموں پر گر پڑا۔ اب گلے شکوے راز کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد حسن نے کہا کہ تیرے عشق نے بیتاب کر دیا اور یہاں کھینچ لایا اب اجازت دئیے جاتی ہوں اور وصال کی تدبیر کرتی ہوں برا نہ مان اور میری مصلحت کو پہچان۔

سرِ شام وفا اور ناز نے چھپے پر مجلس عشق آراستہ کی، نظر اور خیال اور تبسم چشمے پر صحبت رکھتے تھے۔ حسن نے وفا کو بلا کر کہا کہ خیال، نظر اور تبسم سے کہو کہ دل کو دارو ئے بے ہوشی پلائیں اور زلف سے کہو کہ دل کو اس چھپے پر اس طرح لے کر آئے کہ کسی اور کو تو کیا اسے بھی خبر نہ ہو۔ خیال، نظر اور تبسم نے حکم کی تعمیل کی اور زلف اسے چھپے پر اس طرح اٹھا لائی کہ دل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ غرض اسی طرح روز حسن، دل کو بالاخانے پر لاتی، مزے اڑاتی اور دل کے ارمان نکالتی۔

آخر یہ چوری کب تک چھپتی۔ رقیب کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ حسن کے پاس رہتی تھی۔ ظاہر میں دوست پر دل میں کھوٹ تھا۔ اسے اس کا جلاپا تھا کہ حسن اکیلے اکیلے کہیں جاتی ہے اور مجھ سے چھپاتی ہے اس کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ ایک روز چپکے سے حسن کے پیچھے ہو لی اور بالاخانے پر ایک کونے میں چھپ کے بیٹھ رہی اور سارے راز سے واقف ہو گئی۔

ایک شب ایسا ہوا کہ حسن شہر گئی تو کسی وجہ سے اس کا آنا نہ ہوا غیر موقع پاکر وصال کے بالاخانے پر چڑھ گئی۔ جادو ٹونے میں کمال رکھتی تھی، حسن کا بھیس بدل کر بیٹھ گئی۔ جس طرح حسن حکم دیتی تھی اسی طرح اس نے بھی حکم دیا۔ دارو ئے بے ہوشی پلا زلف اسے جوں توں بالاخانے پر لائی۔ اتنے میں خیال جو سو رہا تھا جاگا، دل کو دیکھا تو کہیں نہ پایا۔ بہت پریشان ہوا ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وصال کے بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا کہ غیر دل کی گود میں مست پڑی ہے اور دل بے خبری کے عالم میں ہے۔ فوراً شہر دیدار کو دوڑا گیا اور جو کچھ دیکھا تھا حسن سے من وعن بیان کیا۔ یہ سن کر حسن کے ہوش جاتے رہے تن بدن میں آگ لگ گئی، جیسے بیٹھی تھی اٹھ کھڑی ہوئی اور حسد کی آگ میں جلتی بلتی وصال کے بالاخانے پر آئی۔ غیر اور دل کو ایک جگہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ کوسنے اور گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا اور ایک قیامت برپا کر دی۔ غیر ہکا بکا رہ گئی اور چھپ کر دوسرے رستے سے نکل بھاگی۔

حسن دل پر بھی سخت برافروختہ ہوئی اور اس کی بے وفائی اور بے پروائی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور طیش میں آکر خیال،

نفرا اور تبسم کو حکم دیا کہ اس نالایق بے وفا مورکھ کو باغ سے باہر نکال دو۔

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یہ فریب کیا، اُدھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی اور حسن اور دل کے کرتوتوں کی ساری کیفیت سنائی وہ سن کر بہت برا فروختہ ہوا شہر دیدار میں آیا اور دل کو بندی خانے سے نکال شہر سنگسار میں لے گیا۔ وہاں ہجر نام کا ایک کوٹ تھا، اسی میں قید کر دیا۔ دل بیچارہ سخت پریشان اور جینے سے بیزار تھا۔ تمام حالات سے بے خبر جی ہی جی میں یہ کہتا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی کہ حسن نے یہ ستم مجھ پر ڈھایا ہے۔

نہ معلوم غیر کے دل میں کیا آئی شاید دل کے حال پر ترس آیا کہ اس نے حسن کو ایک خط لکھا اور اصل واقعہ کہہ سنایا کہ دل غریب بے گناہ ہے اصل قصور میرا ہے، میں تیری صورت بنا کر اس سے ملی، اسے کیا خبر تھی کہ یہ دغا بازی ہے۔ بے خبر مست پر باداش لازم نہیں، وہ عاشق صادق ہے اس پر غصہ درست نہیں۔ اس رقعہ کا مضمون پڑھ کر حسن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ہوش و حواس جاتے رہے، بال نوچنے لگی، سینہ کوٹنے لگی اور اپنے کئے پر بہت نادم ہوئی۔ اسی وقت دل کو اشتیاق بھرا خط لکھا جس میں اپنے فراق اور غیر کی شکایت لکھی اور ہزاروں قسمیں دے کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دلایا۔ خیال کے ہاتھ یہ رقعہ دل کو بھیجا۔ جب یہ نامۂ شوق دل کو پہنچا تو وہ بھی بے تاب ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے جواب میں لکھا کہ تیرا اس میں کوئی قصور نہیں یہ سارا فساد غیر کا ہے۔ میرا دل تجھ سے صاف ہے، وہی محبت وہی چاہ ہے، تو اگر مجھے داروئے بے ہوشی نہ پلایا کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا خیر جو ہوا سو ہوا۔

اب دوسری طرف کا حال سنئے، عقل بادشاہ شکست کھا کر شہر بدن میں آیا اور مارے شرم کے کہیں چھپ رہا۔ اور صبر جو عقل کا سرلشکر تھا وہ بھاگ کر شہر ہدایت میں آیا اور ہمت کو اپنی بدبختی اور مصیبت کی ساری داستان سنائی۔ ہمت نے بہت رنج و افسوس کیا اور کہا کہ عقل کا مجھ پر بہت حق ہے، شرط دوستداری یہ ہے کہ اب عقل اور دل کی خبر لوں، نہ معلوم ان بدنصیبوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ کہہ کر تلوار ہاتھ میں لی اور اپنا لشکر ساتھ لے کر شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا۔ رستے میں جہاں جہاں پہنچا عقل اور دل کا حال پوچھتا جاتا۔ چلتے چلتے قامت کے بوستان میں آیا۔ قامت نے کہا اے ہمت تو نے خوب کیا، تجھ پر ہزار رحمت۔ سچے اور وفادار آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب اس نے بیان کیا کہ دل ایک سال ہوتا ہے ہجراں کے کوٹ میں بند ہے عقل شہر بدن میں پڑا ہے۔ عشق سے جیتنا مشکل ہے اس سے مل کے رہنے ہی میں مصلحت ہے اب صرف ایک تدبیر ہے کہ عشق کو سمجھا بجھا کر کسی طرح منا دیا جائے۔ عشق بہت بڑا بادشاہ ہے اگر اس سے التجا کی گئی تو ضرور مان جائے گا اس سے صلح کئے بغیر گزیر نہیں۔ ہمت کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اور اسی وقت اپنا لاؤ لشکر چھوڑ عشق کی خدمت میں پہنچا۔ اس کی بہت مدح و ستائش کی۔ عشق نے بھی اس کا احترام کیا اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ ہمت نے پھر موقع دیکھ کر عقل اور دل کا ذکر چھیڑا اور اُن کی طرف سے ایسی وکالت کی کہ عشق راضی ہو گیا اور یہ قرار پایا کہ دل عشق بادشاہ کی وزارت قبول کرے، عشق کے بعد سب سے بڑا رتبہ اسی کا ہوگا۔ عشق بادشاہ اور دل وزیر ہوا تو کام خاطر خواہ چلے گا۔

اس کے بعد عشق نے اپنے سرلشکر مہر کو حکم دیا کہ شہر بدن جا کر عقل کو تسلی اور دلاسا دے اور عزت و حرمت کے ساتھ یہاں لائے

مہر جس قدر جلد ہو سکا شہر بدن پہنچا اور عقل سے ملاقات کی۔ عشق نے جو کہا تھا حرف بحرف بیان کیا اور سب اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ کسی طرح کی فکر نہ کر تیرے اقبال نے زور کیا ہے وہاں جانے کے بعد سب خرخشے دور ہو جائیں گے اور تو امن و آسائش اور بلند اقبالی کے ساتھ رہے گا۔ عقل نے یہ سمجھ کر کہ اب حکومت و دولت جا چکی ہے، یار، دوست، مشیر اور مصاحب سب نے منہ موڑ لیا ہے، مصلحت یہی ہے کہ عشق کی بات مان لی جائے۔ غرض اس نے عشق کا فرمانا قبول کیا اور مہر کے ساتھ عشق کے حضور پہنچا۔ عشق بھی اس سے بڑے احترام اور عزت کے ساتھ پیش آیا گلے سے لگایا اور ہر طرح خاطر جمع کی اور کہا کہ میں بادشاہ تو وزیر، ملک اور حکومت تیرے سپرد ہے مجھے ملک داری سے کیا واسطہ، جو تو مناسب سمجھے، کر۔

غرض جب عقل عشق بادشاہ کا وزیر ہو گیا تو عشق نے ہمت سے کہا کہ دل کو ہجراں کے کوٹ سے چھڑا کر میرے سامنے حاضر کر اور اس کے پاؤں کی بیڑیاں نکال کر رقیب کے پاؤں میں ڈال اور غیر کو جو اس کی بیٹی ہے ایسی جگہ قید کر کہ وہاں سے نکل نہ سکے۔ ہمت سلام کر کے روانہ ہوا اور دل کو ہجراں کے کوٹ سے لڑ جھگڑ کر باہر لایا اس کی بیڑیاں رقیب کے پاؤں میں ڈالیں اور غیر کو بھی ایک مکان میں بند کر دیا۔ اگرچہ اس پر اس کا دل دکھا لیکن حکم کی تعمیل واجب تھی۔ غیر نے جیسا کیا تھا ویسا پایا۔ اس کے بعد ہمت دل کو عشق کے پاس لایا اور عشق کو دل سے ملایا۔ سب ایک دوسرے کے گلے ملے۔ آخر عقل اور عشق نے باہم مشورہ کر کے یہ ٹھیرایا کہ حسن کا عشق سے عقد کر دیا جائے۔ القصہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دونوں کی مراد بر آئی۔ گھر گھر عیش و عشرت کا سماں تھا اور خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔

ایک روز دل اور ہمت اور نظر تینوں شراب پینے رخسار کے گلزار میں پہنچے۔ وہاں آب حیات کا چشمہ دہن دیکھا۔ وہاں ایک پیر سبز پوش یعنے خضر آئے۔ ہمت نے دل سے کہا کہ اس پیر روشن ضمیر کی قدم بوسی کر اور اس بزرگ کی دعا لے۔ دل دوڑ کر قدم بوس ہوا ادب سے نزدیک بیٹھا خضر نے آنکھوں آنکھوں کے اشاروں میں سب راز کھول دیا اور دل خضر کے فیض سے اپنے دل کی مراد کو پہنچا۔ حسن اور دل رہے سہے، پھولے پھلے، بال بچوں والے ہوئے۔ ان کا سب سے بڑا فرزند یہ کتاب ہے جو اپنے وقت کا افلاطون و لقمان ہے، روشن ضمیر، صاحب تدبیر ہے۔ جو کوئی صاحب نظر ہو گا اسے یہ سخن بھائے گا اور قدر کرے گا۔

عبدالحق

اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ہے۔
جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے۔
اے ماں، اس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے۔
جب میں مر جاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تا کہ تجھ پر دوبارہ قربان ہو سکوں تیری مٹی میرے لئے مایۂ حیات ہے۔ کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ہے۔

اردشیر خبردار

ستاج کے پھولوں میں

ستاج ایک قسم کا (Daisy) کا پھول ہوتا ہے جو مسوری اور چکراتا کے پہاڑی جنگلوں میں بہار کے موسم میں کھلتا ہے۔ نظم ان ہی پھولوں میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔

(۱)

اِن پھولوں کی اِن آنکھوں کی
ہے آپس میں بندھی ٹکٹکی
یہ لے بیٹھے سُندرتا
میں بیٹھا لے کر دل اپنا

(۲)

دیکھ رہے مجھ کو یہ جیسے
دیکھ رہا اِن کو میں ویسے
ہوں پہچان رہا اِن کو میں
یہ مجھ کو پہچان رہے ہیں

(۳)

اِن کا میرا، میرا اِن کا
ہے کیا کوئی ناتا پچھلا
جس سے ہو کر انجانے بھی
بڑھ کر لگتے جانوں سے بھی

(۴)

ایک گھڑی پھر یدی جو لیں آ
تو میرا دل کھنٹوں جھیلے
اُن کی مسکاہٹ معمولی
پوزن خوشی ہے میرے دل کی

(۵)

اِن ننھے پھولوں کے اندر
اتنی کیسے چھب جاتی بھر
ہنستے ہنستے لُٹ لُٹ کر۔
ہو نہیں جس کا انت کہیں پر

(۶)

اری کلی کیا سپنے میں بھی
تو دل میں یہ سوچ سکی تھی
کھلتے ہی تیرے۔ دنیا کی
تجھ پر آنکھیں لگ جائیں گی

(۷)

چھوٹی چھوٹی پنکھڑیوں کا
کھل کر آپس میں مل جانا
اچرج بھری بنا ہے دیتا
ایک نئی پھولوں کی دنیا

(۸)

گُن گُن کرتی مدھو کی مکھی
دے جا وہ رس کچھ مجھ کو بھی
ہو متوالے جس کے مد میں
پھول سدا ہنستے رہتے ہیں

(۹)

دھاگے جیسی پتلی ڈالی
تو پتوں سے بالکل خالی
ایک پھول سے تو نے پالی
دنیا کی ساری خوشحالی

(۱۰)

برسے پانی۔ برسے اولا
چلے ہوا کا پربل جھکولا
پر اِن کی مسکان وہی ہے
ادا وہی ہے شان وہی ہے

(۱۱)

پھیلے دن کا گھور اندھیرا
چھائے نِشی کا کیوں نہ اندھیرا
کوئی دیکھے یا نہیں دیکھے
مست ہیں خوش ہیں اپنے میں یہ

(۱۲)

شوخ پنکھڑی پیلی پیلی
مل کر کریں کیسی دل لگی
جس کو دیکھو وہی کھلا ہے
کیا ستاج کو راج ملا ہے

اپنا، حسن، بھگانے، اگر، مسکراہٹ، کامل ۔ خوبصورتی، اچنبھا، حیرت انگیز، شہد، نشہ ۔ زمین، جھکڑ، سہانا، منھ، اجالا، سفید

(پروفیسر) ونشی دھر ودیالنکار (جالندھر)

بچوں سے دو باتیں

سب رس کا پہلا پرچہ تم نے دیکھا۔ تمھیں اس کو پڑھنے میں مشکل ہوئی ہوگی اس لئے کہ وہ باریک خط میں لکھا گیا تھا۔ اب کی دفعہ ہم نے ایسے خط میں لکھایا ہے کہ تم آسانی سے پڑھ سکو گے۔

اب کے ہم نے تمہارے لئے بہت سی تصویریں بھی سب رس میں دی ہیں۔ آئندہ بھی اس کا سلسلہ قائم رہے گا۔ ہاں۔ ایک بات تم سے پوچھنا ہے۔ تم نے اپنے رسالہ کا سرورق دیکھا ہوگا۔ آفتاب نکل رہا ہے۔ سڑک پر دو بچے ایک دوسرے کی مدد سے بھاگ رہے ہیں۔ تم سمجھے بھی کہ اس تصویر کے بنانے والے جن کا نام مسٹر خلیل ہے، اس میں تمہارے لئے کیا باتیں رکھی ہیں۔ اگر تم سوچ کر اس کا جواب ہمارے یہاں بھجوادو تو ہم تمہارے جواب کو "سب رس" میں چھاپیں گے۔

تم اپنے رسالوں کو حفاظت سے رکھو۔ اچھی طرح پڑھو اور اپنے مدرسہ اور گھر کے دوستوں کو پڑھ کر سناؤ۔

تم تو ضرور مضمون لکھتے ہو گے۔ اپنے مضمون استاد صاحب کو بتا کر ہمارے پاس بھیج دیا کرو۔ وہ اچھے ہوں گے تو ہم ان کو ضرور چھاپیں گے...... اور اگر سال بھر میں تمہارے چھ مضمون چھپ گئے تو ہم تمھیں ایک اچھا سا تحفہ بھی دیں گے۔

ادارہ

دل کی آواز

مولا ہے بیکسوں کا مفلس کا یار تو ہی
جس کا نہ ہو سہارا پروردگار تو ہی

مایوسیوں میں تجھ سے ہر قسم کی توقع
رونق ہو بے چمن کی جان بہار تو ہی

بے چین دل کو تجھ سے ہوتا ہے چین حاصل
میرا شکیب تو ہے میرا قرار تو ہی

عباس کا ہے یارب دنیا میں درد کس کو
بے دست و پا کا آقا اک غمگسار تو ہی

عباس حسین نقوی



فلک پر جو تارے ہیں یہ جگمگاتے
کہاں سارا دن امی جاں ہیں یہ جاتے

ہے شاید کوئی مدرسہ ان کا امی
اندھیرے ہی سے جس کی بجتی ہے گھنٹی

بہت ہی سویرے سے تیار ہو کر
یہ سب وقت پر جا کے ہوتے ہیں حاضر

وہیں ہوں گے دن بھر یہ سب لکھتے پڑھتے
حساب اور قواعد بھی ہوں گے یہ کرتے

وہ تارا کتابیں بڑی ہوگا پڑھتا
یہ ننھا سا پڑھتا الف۔ بے۔ تے ہوگا

بہت دور گھر سے یہ بیچارے دن بھر
پڑے رہتے ہوں گے جماعت کے اندر

بڑے ہوں گے استاد ان کے غصیلے
جگہ سے سرکنے بھی ہوں گے نہ دیتے

جو ہوگا کوئی بھی ذرا جھانک لیتا
تو کونے میں ہوگا کھڑا ہونا پڑتا

یہ تاروں کا ہے مدرسہ کیسا امی
بڑی دیر سے اس کو ہوتی ہے چھٹی

نظر آتے ہیں بعد مغرب کے تارے
نہیں دیکھتے ماں کو دن بھر بیچارے

ترس ان پہ آتا ہے امی مجھے تو
اندھیرے میں آتے ہیں بیچارے گھر کو

سب رس فروری ۱۹۳۸ء

لطیف النساء بیگم بی۔ اے

بچوں کی بستی

ملک روس کے پایہ تخت ماسکو سے تقریباً چالیس میل پر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے جس پر مو ماست رفتار ریلیں بھی ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا کرتیں، اس کا نام "شکولینا" ہے جس کا لفظی ترجمہ "اسٹیشن مدرسہ" ہو سکتا ہے۔ یہ سرو کے گھنے جنگل سے گھرا ہوا ہے اور دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان بھی نہیں نظر آتا۔ ہاں حدود جنگل سے باہر نکلو تو سرسبز کھیت اور چھوٹے چھوٹے گاؤں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ حصہ اپنی سرسبزی و شادابی کے باعث ضلع ماسکو میں خوبصورت ترین مانا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں روس کے مشہور معروف مصور لیوتینٹن نے اپنی شہرۂ آفاق تصویریں بنائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں چیکوسکی اور اسکرابین برسوں رہے اور موسیقی کو اس کمال پر پہونچایا کہ وہ رہتی دنیا تک اپنی دلکشی اور اثرانگیزی سے بے جان تن میں جان ڈالتی رہے گی۔

اس جنگل کے بیچوں بیچ ایک پختہ احاطہ ہے جس میں ایک خوبصورت باغ اور مکان ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جائداد کا مالک ایک امیر "ہینی ہال" تھا جس کی آسامی میں ایک چھوٹا سا مفلس و نادار بچہ "پشکن" تھا جس کے کلام سے دنیا کی ہر متمدن زبان آشنا ہو چکی ہے۔ آج کل اس احاطہ کے دروازہ پر نیلے رنگ کے جلی حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے "سرخ فوجیوں کے بچوں کی بستی"

ضلع ماسکو میں سردی میں خوب سردی اور گرمی میں خاصی گرمی ہوا کرتی ہے لیکن یہ باغ و مکان ہر موسم میں راحت و آرام پہونچاتے ہیں۔ سخت سے سخت گرمی میں بھی جب کہ سرد ملک کے باشندے پریشان ہو جاتے ہیں، ننھے ننھے بچوں کے منہ سوکھ جاتے ہیں اور زبانیں خشک ہونے لگتی ہیں۔ ان کی ٹھنڈک اور فرحت میں کمی نہیں ہوتی۔ باغ میں چھوٹے چھوٹے سپاہی نیلے نیلے جانگیے پہنے اور سفید سفید ٹوپیاں اوڑھے سرو کے سربلند درختوں کے سایہ میں کھیلتے اور اپنی میٹھی میٹھی آوازوں سے پرلطف سماں پیدا کرتے ہیں۔ گھاس کے ترشے ہوئے قطعات پر چھوٹی چھوٹی میز کرسیاں، چھوٹے چھوٹے خیمے اور سائبان موجود ہیں۔ اونچے تناور درخت کی ایک شاخ سے ہوائی چھتری (Parachute) لٹک رہی ہے مکان کے بالکل سامنے جو باغ کے وسط میں ہے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اطراف سیب کے درخت پھلوں کے بار سے جھکے چلے جاتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑی دور احاطہ سے ملا ہوا ایک بڑا دالان سا ہے جو کھانا کھلانے کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے قریب ہی ایک کمان پر ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر "ہمارا ترکاری کا باغ" لکھا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً سو مربع فٹ ہوگا۔ اس باغ میں سات اور آٹھ برس کی عمر کے بچے بڑی متانت اور سنجیدگی سے کام میں لگے ہوئے ہیں، کہیں تو کیاریوں میں چھوٹے چھوٹے پودے جا رہے ہیں اور کہیں کیاریوں کو کریدتے اور صاف کرتے ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے فواروں سے پانی بھی دے رہے ہیں، بعض تیار ترکاریوں کو چن کر کھانے کے لئے کمرے میں لے جا رہے ہیں تاکہ اپنی ہی محنت کا پھل مزے لے لے کر خود کھائیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی کھلائیں۔ یہ "بچوں کی بستی" اکیلی نہیں ہے۔ بلکہ تمام ملک روس میں ایسی بستیاں پرفضا اور شاداب مقامات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سو سو

پون پون سو بچوں کی ٹکڑیاں رہتی ہیں جن کی عمریں پانچ سال سے آٹھ سال تک ہوتی ہیں۔

اس بستی کی منتظمہ باربارا نکڑا ایک دوشیزہ خاتون ہیں جو اپنے کئی سال کے تجربہ کی بناء پر کہتی ہیں کہ وہ بچے جن کے متعلق ان کے والدین کا خیال ہوتا ہے کہ وہ ایسے کمزور، خائف اور شرمیلے ہیں کہ ماں کی آغوش کے بغیر ہنسی خوشی زندہ نہیں رہ سکتے یہاں تھوڑے ہی دن میں ایسے گھل مل جاتے ہیں اور ایسے بہتر "شہری" بن جاتے ہیں کہ خود ان کے والدین کو حیرت ہونے لگتی ہے۔

ہر بچے کو پنسل، کاغذ، برش، رنگ، نمونہ بنانے کی مٹی اور ہر قسم کے کھلونے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں پورا دن زیر سماں گزارتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے حوضوں میں نہاتے ہیں۔ بستی کی گاڑی یا موٹر میں سوار ہو کر پھرتے ہیں۔ باغ میں کام کرتے ہیں۔ لکھتے پڑھتے ہیں۔ گاتے ہیں، ناچتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بچہ اس سے بہتر طریقہ پر زندگی بسر کر سکتا ہے؟ چھ مدرسین، ایک طبیب، ایک دایا (نرس) ایک موسیقی داں، چار خادمات اور باورچی وغیرہ بچوں کی ہر قسم کی نگہداشت کے لئے مامور رہتے ہیں۔

حسن اتفاق سے ایک روز دو بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو غالباً آٹھ سال کا ہوگا۔ ایک سات سالہ لڑکی سے کہہ رہا تھا "ہمارا گھر بہت اچھا ہے"۔ لڑکی نے کہا۔ اچھا تو تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ تمہارے گھر پر ایسا کھیل کود ہو سکتا ہے؟ ایسا ترکاری کا باغ تو ہرگز نہ ہوگا۔ لڑکا "میری اماں"..... کہہ کر رہ گیا۔ لفظ "اماں" منہ سے نکلنا تھا کہ دونوں کے چہروں پر اداسی سی چھا گئی۔ لیکن لڑکی دم بھر میں سنبھل کر بولی۔ میری ماں تو گھر میں بھی نہیں ہے؟ کیا تم کو یقین ہے کہ تمہاری ماں گھر پر ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکے کا ہاتھ گھسیٹا اور دونوں اچھلتے کودتے باغ کی اس جانب روانہ ہو گئے جہاں اور بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ ان بچوں کو دن میں پانچ مرتبہ غذا دی جاتی ہے۔ یہ صبح آٹھ بجے اٹھتے ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر نو بجے ناشتہ کرتے ہیں۔ گیارہ بجے دودھ پیتے یا ہلکی سی کوئی چیز کھاتے ہیں پھر ایک بجے دوپہر کا کھانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سب کے سب کھلی جگہ لیٹ کر آرام کرتے ہیں۔ اکثر سو جاتے ہیں۔ پھر کھیل کود کام کاج شروع ہو جاتا ہے اور ساڑھے چار بجے چاء پیتے ہیں۔ آٹھ بجے رات کا کھانا ہوتا ہے اور نو بجے سونے کا وقت مقرر ہے۔ سونے کے لئے ایک بڑا ہوادار کمرہ ہے۔ خود غرضی یا ضد کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں حالانکہ کوئی گھر نہیں جہاں بھائی بہنوں میں کبھی ان بن نہ ہوتی ہو۔ اس بستی میں تو بچے خود غرضی کے اظہار یا ضد سے خود بخود شرماتے اور جھجکتے ہیں۔ منتظمہ یا دوسرے کارپرداز حتی الوسع پس پشت رہتے ہیں اور بے معنی محبت یا بے جا لاڈ پیار کا موقع ہی نہیں آنے دیتے۔ اگر کوئی بچہ شرارت کرتا ہے تو از خود دوسرے بچے اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اسے اپنی مصروفیات اور مشاغل میں شریک نہیں سمجھتے ہیں۔

رہے والدین بڑی خوشی سے اپنے بچوں کو موسم گرما میں بالخصوص اس بستی کو روانہ کرتے ہیں اور جن کی آمدنی وافر ہے وہ بچوں کے اخراجات کا فی کس پچیس تیس فی صدی خرچ اپنی ذات سے ادا کرتے ہیں۔ باقی کل مصارف حکومت برداشت کرتی ہے۔ اس بستی کے رہنے والوں کی زیر نگرانی اور باقاعدہ مصروفیات، مشاغل، کھیل کود، سادہ گر موزوں غذا، پرسکون فضا، اور ماہرانہ دیکھ بھال بے نتیجہ نہیں رہتی۔ بچے مل جل کر رہنا سیکھتے ہیں۔ پاک صاف عادات اختیار کرتے ہیں۔ ضبط کے پابند ہو جاتے ہیں۔ کام اور کھیل دونوں میں برابر کی دلچسپی لیتے ہیں۔ ذہنی ترقی کے ساتھ جسمانی ترقی بھی کرتے ہیں۔ اور دو تین مہینے میں ان کا وزن اوسطاً دو تین سیر بڑھ جاتا ہے۔

اس بستی کی منتظمہ باربارا نکڑا کی صورت سے وہی تمکنت، اطمینان اور خوشی ٹپکتی ہے جو اس خوش قسمت عورت کے چہرہ پر نظر آتی ہے جو تنومند صحت مند حسین اور ہونہار بچوں کی ماں ہو۔ ان سے ملنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ایسی بستی کی ذمہ داری ایک ایسی ہستی ہی کے سپرد ہو سکتی ہے۔

جس میں نہ صرف انتظامی مادہ ہو بلکہ اس کے دل میں مادرانہ محبت کے کشش کا ایسا دریا بہہ رہا ہو جس سے ہر بچہ اپنی پیاس بجھا سکے ۔

محمد سجاد مرزا ایم ، اے ، آکسن

تھوڑا تھوڑا بہت

دانہ دانہ غلہ غلہ — قطرہ قطرہ دریا دریا
ذرہ ذرہ پہاڑ اونچا — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
پتہ پتہ ٹہنا ٹہنا — ٹہنا ٹہنا پودا پودا
پودا پودا جھاڑ جھڑولا — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
کونپل کونپل پتی پتی — پتی پتی ٹہنی ٹہنی
ٹہنی ٹہنی جھاڑی جھاڑی — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
پائی پائی پیسہ پیسہ — پیسہ پیسہ آنہ آنہ
آنہ آنہ روپیہ روپیہ — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
اک اک دو اور دو دو چار — دس دس سو اور سو سے ہزار
بوندا باندی موسلا دھار — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
چھوٹا چھوٹا بڑا بڑا سا — آج کا بچہ کل کا بوڑھا
تھوڑا تھوڑا بہت بہت سا — دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ

سید محمد حسین آزاد

کھویا ہوا گھر

چار سو سال پہلے کی ایک قدیم اردو کتاب کا دلچسپ قصہ جس کو آج بچوں کی زبان میں لکھا ہے۔

شیخ چلی کے چار گھر پاس پاس ہی تھے۔ ایک گھر کی چھت پر وہ صفائی کرانے کے لئے چڑھا۔ وہاں سے دوسرے گھروں کو دیکھنے لگا جب ان کو گنا تو جس مکان پر چڑھا تھا اس کو بھول گیا۔



ایک - دو - تین - تین ہی گھر دکھائی دیے بار بار گننے لگا۔ اور ہر وقت جس گھر پر کھڑا تھا اس کو بھول جاتا۔ آخر میں اس کو خیال ہوا کہ ایک گھر کھو گیا وہ جلد جلد نیچے اترا اور اپنی گلی کے لوگوں سے پوچھنے لگا میرا ایک ایسا گھر تھا، اس کا ایسا دروازہ تھا ایسی کھڑکی تھی۔ وہ ابھی ابھی مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ شاید اس کو یہ برا معلوم ہوا کہ میں نے پہلے اس کی صفائی کیوں نہیں شروع کی۔

لوگ ہنسنے لگے۔ انھوں نے اس کو ستانے کے لئے کہا۔ ہاں ابھی ابھی ایک ایسا گھر گلی سے نکل کر سڑک کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔

شیخ چلی سڑک کی طرف بھاگا۔ اس نے وہاں لوگوں سے پھر وہی پوچھا کہ "........"

سڑک کے لوگ بھی ہنسنے لگے اور انھوں نے بھی اس کو ستانے کے لئے کہا کہ ہاں ابھی ایک ایسا گھر سیدھا جا رہا تھا۔ شیخ چلی دوڑا۔ اور ہر سڑک پر یہی پوچھتا گیا۔ دوڑتا دوڑتا شہر کے باہر ایک مسجد میں پہنچا۔

وہ اب تھک گیا تھا مسجد میں جا کر اس نے

دم لیا، وضو کیا، نماز پڑھی، اس مسجد میں
قلندر رہتے تھے۔ ان سے اپنا سارا حال
بیان کیا۔ وہ بھی ہنس پڑے شیخ چلی
رونے لگا۔ قلندروں نے کہا اب رات
ہو گئی ہے تم یہیں سو جاؤ۔ صبح ہی تمہارا گھر
مل جائے گا۔

شیخ چلی رات کو مسجد میں سو گیا۔
قلندروں نے شرارت سے نیند میں
اس کی ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دیا۔
صبح کو جب موذن نے اذاں دی تو
شیخ چلی اٹھ بیٹھا۔ اور فوراً وضو کرنے
کے لئے حوض پر پہنچا وہاں جو پانی میں اپنی صورت دیکھی تو اس کو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا شخص ہے۔ اب وہ بھاگا اور اس جگہ پہنچا جہاں سو رہا تھا وہاں اسے کوئی نہیں نظر آیا۔ وہ خود اپنا نام لے کر پکارنے لگا کہ اے شیخ چلی تو کہاں چلا گیا۔ نماز کا وقت جا رہا ہے۔ قلندر ہنسنے لگے۔ اور اس سے کہا کہ تو ہی شیخ چلی ہے۔ تو اب کس کو پکار رہا ہے۔ شیخ چلی نے کہا نہیں جناب میں تو کوئی قلندر ہوں۔ شیخ چلی کی صورت شکل ایسی تھوڑی ہی ہے۔ قلندر ہنسنے لگے۔ شیخ چلی رونے لگا کہ افسوس کل مکان ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور آج خود شیخ چلی بھی کھو گیا۔"

شیخ خوب محمد چشتی

لکھنؤ کی نمائش



ایک دلچسپ سفر کی یاد

سال گذشتہ لکھنؤ میں جب نمائش منعقد ہوئی تھی۔ تعطیلات سرما کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد سے باہر جانے اور اتنا بڑا سفر کرنے کا میرے لئے پہلا موقع تھا۔ چونکہ اور عزیز بھی ساتھ تھے۔ ڈبہ محفوظ کرایا گیا اور آٹھ بجے شب اسٹیشن سکندرآباد سے ہمارا سفر شروع ہوا۔ آرام کا وقت ہو چکا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سو رہے۔ حسب عادت صبح سویرے اٹھے اور ناشتہ کے بعد راستہ کی سیر میں مشغول ہو گئے۔ دن بھر مناظر قدرت نے دل بہلایا کئے۔ کئی بڑے بڑے پلوں اور زمین دوز راستوں سے ہماری گاڑی گذرتی رہی۔ اس طرح دو راتیں اور ایک دن ریل میں گزار کر تیسرے روز صبح چار بجے آگرہ پہونچے۔ سردی بے حد تھی۔ کہر کا یہ حال کہ صبح ہو جاتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ دوران قیام میں کبھی سورج نظر ہی نہ آیا۔ سب سے پہلی خواہش آگرہ پہونچ کر تاج محل دیکھنے کے سوائے کیا ہو سکتی تھی! لہذا آٹھ بجے تاج محل روانہ ہوئے۔ صبح کا وقت صاف و شفاف سڑکیں دو رویہ سبز درختوں کی قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ تاج محل کا کیا کہنا سنگ مرمر کی جالیاں کیسی نازک کیسی خوبصورت، سب کی مختلف وضع و شکل، رنگین نقش و نگار بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں بھی مختلف قسم کے پھول پھل کے درختوں کی شکلیں، بس حیرت ہوتی ہے کہ ان کے بنانے والے کیسے ہنرمند لوگ تھے۔ چپہ چپہ ان کی کاریگری اور صنعت کی داد دیتا ہے۔ فرش کے سفید اور سیاہ پتھر بھی اسی طرح کی وضع سے جڑے ہیں۔ موجودہ زمانے کے لوگ اگر اپنی نئی نئی تعمیری ایجادوں کی وجہ سے خوش ہوں تو ہوں مگر تاج محل اور مقبرۂ اعتماد الدولہ دیکھنے کے بعد میرا تو یہ خیال ہے کہ موجودہ زمانے کی کوئی عمارت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہر وضع اور شکل کے باریک سے باریک کام وہاں موجود ہیں۔ اس بے مثال عمارت کو دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے آتے ہیں اس وقت بھی ہر قوم کے لوگ کثرت سے تھے۔ اور اس شاندار عمارت کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ چند لوگ جن کے پاس کیمرے تھے، مختلف مقامات سے تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ ہم نے بھی اپنے کیمرہ سے چند تصویریں لیں۔

اس کے بعد مجبوراً واپسی کا خیال ہوا۔ کیونکہ اعتماد الدولہ کا مقبرہ دیکھنا باقی تھا۔ اور طے یہ پایا کہ چاندنی راتیں ہیں شب میں پھر ایک دفعہ آئیں گے۔ مقبرۂ اعتماد الدولہ کی عمارت بھی بہت خوبصورت ہے۔ بعض اس کو تاج محل پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی پسند پر موقوف ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں رہ کر ان کو نہ دیکھنا قابل افسوس ہے اور ایک دفعہ دیکھنے کے بعد پھر کسی عمارت کو دیکھنے کی خواہش نہیں رہتی۔ کئی گھنٹے ہم اس سیر و تفریح میں صرف کر کے کافی تھک چکے تھے ایک بجے کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس ہوئے۔ کھانا کھا کر جن کو آرام کی عادت یا ضرورت تھی لیٹ گئے۔ بعض اپنے کام کرتے رہے اور ہم سہ پہر تک ہوٹل کی گشت کرتے رہے۔ فوٹو گرافی کی دوکان قریب تھی وہاں سے تصاویر منگوا کر دیکھے اور خریدے۔ چار بجے کے بعد سب چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ سردی اس وقت تک بڑھ گئی تھی ہم سب تو اچھے رہے لیکن سفر کی تھکن سردی کی زیادتی بچوں کا ساتھ آسان نہ تھا۔ میرے چھوٹے بھائی کو بخار آگیا۔ اسی پریشانی میں شام گزری لیکن کھانے کے بعد

جب بچے سو چکے تو شب ماہ میں تاج محل کی سیر کی سوجھی اس وقت کچھ اور ہی لطف آیا جمنا کا نظارہ بھی بہت دل فریب تھا چند تصویریں اس وقت بھی لیں۔ کچھ وقت اس طرح اور کچھ چلتے پھرتے گزرا لیکن جیسے ہی آرام کی غرض سے تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ سردی ناقابل برداشت ہونے لگی اور ناچار دل میں ایک دفعہ اور دیکھنے کی حسرت لئے ہوئے واپس ہوئے۔ سردی اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے بہ مشکل کھانا کھا کر فوراً سو گئے۔ گو آتش دانوں میں آگ روشن تھی لیکن پھر بھی جسم پر چار پانچ کپڑے ہونے کے باوجود سردی برابر محسوس ہوتی تھی۔ دوسرا دن ہمارا سکندرہ و فتح پور سیکری کی سیر میں گزرا لیکن بھائی کی علالت کی وجہ سے لطف نہ آیا تیسری صبح تو ہم دہلی جانے کے لئے اسٹیشن پر تھے اس طرح آگرہ کا سفر ختم ہوا اور ہم دہلی سے قریب ہوتے گئے۔ صبح نکلے ہوئے دو بجے قریب دہلی پہنچے۔ بچوں اور زنانہ کو ویٹنگ روم میں چھوڑ کر سامان کی طرف متوجہ ہی ہوئے تھے کہ ہوٹلوں کے نمائندے آنے شروع ہوئے ہر ایک کا یہ اصرار کہ ان کی ہوٹل میں ٹھیریں مگر ہم کو ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں دھوپ کافی مل سکے اور اس سردی کی بلا سے کسی قدر نجات ہو آخر کو ایک ہوٹل کے چند کمرے پسند کر لئے گئے دوپہر ہو چکی تھی سامان ٹھکانے لگانے، کھانے اور آرام لینے تک شام ہو ہی گئی۔ وقت کم تھا اس لئے صرف جامع مسجد اور وائسریگل لاج کی سیر ہوئی جس کو دیکھنے پر لوگوں کا خیال ہے کہ ولایت کا منظر پیش نظر ہوتا ہے مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس صفائی اور خوبصورتی کے باوجود مغلیہ طرز تعمیر کی نزاکتیں مفقود ہیں۔ دوسرا اور تیسرا دن مقبرۂ ہمایوں قلعہ اور دوسرے مشہور تاریخی محلات و مقامات کے دیکھنے میں صرف ہوا اور کچھ وقت شاپنگ میں گزرا جس کی غرض حیدرآبادی اعزہ کے لئے تحفہ تحائف خریدنے کی تھی۔ دن تو خیر ان دلچسپیوں میں گزرے لیکن رات کسی قدر تکلیف دہ ہو گئی۔ ہوٹل کی اتنی بڑی عمارت پر بھی لوگوں کی کثرت سے ایک شور سا رہتا تھا۔ محلہ چاندنی چوک غلہ کی منڈیاں ہر قسم کے بازار موٹروں اور ٹرموں کی آمد و رفت سودے والوں کی چیخ پکار ہوٹل سے نکلیں تو کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی تھی صبح چار بجے سے چائے والوں کی آوازوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس شور کا سلسلہ رات تک رہتا یہ تو باہر کی حالت تھی ہوٹل میں رات بھر مختلف باجوں اور گانے کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ اس ہوٹل میں ہر چیز زیادہ قیمت پر ملی یہاں تک کہ گرم پانی کی قیمت بھی بھرتے رہے۔ برخلاف اس کے آگرے میں ہر طرح کا آرام ملا۔ کھانا بھی حسب پسند ضرورت سے زیادہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ہم گھر سے باہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوران سفر میں اور واپسی کے بعد بھی آگرے کا قیام دونوں یاد رہا اور رہیگا۔

چوتھے روز ہم دہلی سے لکھنؤ کے لئے سوار ہوئے بذریعہ ٹیلی گرام پہنچنے کی اطلاع اپنے اعزہ کو دے چکے تھے اور انہی کے یہاں فرنگی محل میں ہمارا قیام ہونے والا تھا۔ سہ پہر دہلی سے نکلے تھے شب میں تقریباً دو بجے جھانسی پر ریل بدلنا پڑا اتفاقاً گاڑی دیر سے آئی اس لئے چند ہی منٹ ٹھیری۔ ہم بہ مشکل سوار ہوئے تھے کہ چلنے لگی باقی رات جوں توں گزری صبح نو بجے عین حالت انتظار میں لکھنؤ کا اسٹیشن نظر آیا۔ پھر ان اعزہ پر نظر پڑی جو ہم کو لینے آئے تھے اور جن سے ملنے کی خواہش برسوں بعد پوری ہوئی۔ سواری تیار تھی بیٹھ کر روانہ ہوئے اور آن کی آن میں فرنگی محل پہنچے۔ یہاں سب چشم براہ تھے سب سے مل کر کھانا کھایا اس کے بعد ایک علیحدہ مکان "اقامت خانہ" میں ہم ٹھیرائے گئے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ اپنے گھر پہنچ گئے ہیں۔ چاہتے تھے منہ ہاتھ دھو کر تیار بھی نہ ہوئے تھے کہ چائے ناشتہ موجود۔ دال موٹھ تازہ و گرم سموسے تلی ہوئی مٹر متعدد میوے۔ غرض سب چیزیں تیار۔ چائے کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بندھا وہاں جانے کا اور بعضوں سے ملنے کا

ہمارے لئے پہلا اتفاق تھا سب اعزہ ملنے چلے آتے اور ہم کو بھی جانا ہوتا بعض لوگوں نے جن سے خاص تعلقات ہیں ہماری دعوتیں کیں۔ ان کا خلوص اور مہمان نوازی خاص کر قابل ذکر ہے سردی کی جواب تک تکلیف ہوئی یہاں پہنچ کر وہ بھی دور ہوئی ہر ایک کے لئے وہیں کی بنی ہوئی نرم و نفیس لحاف اور رضائیاں دی گئیں اور عصر کے بعد ہی انگیٹھیاں سلگی ہوئی تیار رہتی تھیں کہ گو کہ یہ شدت کہ مغرب سے پہلے دھواں چھا جاتا چوں کہ ہم اس کے عادی نہ تھے۔ سانس رکتی ہوئی اور دم گھٹتا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے سفر کے یہ دن بہتوں گذرے جہاں ہمارے آرام کا خیال رکھا جاتا وہاں ہماری دلچسپی بھی پیش نظر تھی ایک موٹر ہماری سواری کے لئے ہمیشہ موجود رہتی۔ یہاں کے مشہور مقامات اور امام باڑے وغیرہ بھی دیکھے آگرے کی تقریباً سب عمارتیں سنگ مرمر کی تھیں۔ دہلی میں زیادہ تر سنگ سرخ کی بنی ہوئی اور یہاں کی چونہ اور گچ کی گران کی خوبصورتی میں بھی کوئی شک نہیں میوزیم بھی بہت دلچسپ اور تفصیل سے دیکھنے کا موقعہ ملا یہ بھی قابل تعریف ہے مگر مفصل لکھنے کا اس وقت موقعہ نہیں ہے۔ "نمائش" جس کے دیکھنے کے لئے ہم اور ہماری طرح بے حساب لوگ دور دور سے آئے تھے حقیقت میں تعریف کے قابل اور دیکھنے کے لائق تھی مختلف شہروں مثلاً حیدرآباد، میسور، رام پور، بنارس کانپور، وغیرہ کے علیحدہ علیحدہ پویلین بنے ہوئے تھے۔ اور ان میں انہی مقامات کی مصنوعات جمع کی گئی تھیں۔ دکانیں بھی ان گنت تھیں سب میں ہندوستان ہی کی ملکی صنعتیں فروخت کی جا رہی تھیں تفریح کے بھی کل سامان مہیا تھے کہیں چکر دار جھولے کہیں میری گو راؤنڈ کے گھوڑے اور کہیں الکٹرک سے چلنے والی موٹریں۔ چکر دار جھولوں کی یہ کیفیت تھی کہ ہر نشست میں دو دو آدمی بیٹھ سکتے کئی نشستیں اس میں ہوتی ہیں اور یہ ایک وقت کئی لوگ اس پر بیٹھتے بڑے شوق سے لیکن جب وہ گھومنے لگتا تو شاید خوف زدہ ہو جاتے کیوں کہ جب وہ اوپر سے نیچے کی طرف چکر لگاتا تو سب چیخ اٹھتے تھے اور بہت شور و غل مچاتے اس منظر سے ہم بھی کچھ دیر لطف اندوز ہوتے رہے ہنسی بھی آئی کہ جب اتنی ہمت نہ تھی تو بیٹھنے کا ارادہ ہی کیوں کیا آگے بڑھے تو میری گو راؤنڈ کے گھوڑے نظر آئے یہ چیز ایسی تھی کہ ہمارا بھی ارادہ اس میں شرکت کا ہوا یہاں بھی وہی اژدحام تھا جلد جلد ٹکٹ لے کر سوار ہوئے۔ خوبصورت مصنوعی گھوڑے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لگے ہوئے تھے جب سب بیٹھ چکے تو چلنا شروع ہوئے اور چکریں لگاتے رہے اس پر بیٹھنے سے ایسا معلوم ہوا کہ ہم جاندار گھوڑوں پر سوار ہیں یہاں بھی حسن اتفاق سے چند برقعہ پوش عورتیں موجود تھیں اور موقعہ بے موقعہ شور مچاتی رہیں چند منٹ بعد گھوڑے رکے سب اتر پڑے اور دوسرے لوگ جو منتظر تھے ان کو موقعہ ملا خالی گھوڑوں پر جا بیٹھے۔ آج کا بہت وقت انہی کھیل تماشوں میں گذرا۔ دیر ہو رہی تھی اس لئے مکان واپس ہوئے اور باقی کھیل تماشوں کو دوسرے دن کے لئے رکھا جب گھر پہنچے تو آدمی ہمارے منتظر اور کمرے حسب عادت کھلے ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہر کی وجہ سے مکان دھوئیں سے بھر گیا جوں ہی اس سے آگاہ ہوئے فوراً دروازے بند کر دئے گئے اور رفتہ رفتہ یہ دھواں کم ہو گیا اور سب اپنی اپنی جگہ سو رہے دوسرے روز علی الصباح اٹھے دن حسب معمول کچھ کاموں میں کچھ ملاقاتوں اور کچھ نمائش کے تذکروں میں گذرا اور شام سے پہلے ہی ہم پھر جانے کے لئے تیار ہو گئے مغرب کے بعد ہی کھانے سے فارغ ہو کر نمائش کی راہ لی اور سیدھے الکٹرک سے چلنے والی موٹروں کے پاس پہنچے اور باقی نمائش کا دیکھنا دوسرے وقت کے لئے رکھا آج ارادہ ہوا کہ موٹر میں بیٹھ کر دیکھیں گے دس بارہ چھوٹی چھوٹی موٹریں ایک پلیٹ فارم پر جو ریلنگ سے محفوظ کیا گیا تھا ادھر ادھر کھڑی تھیں۔ چھوٹے بڑے سبھی تو اس میں بیٹھتے تھے اور جب سب بیٹھ جاتے تو ایک جاپانی موٹر کو بجلی کی قوت سے چلاتا بیٹھنے والوں کا یہ کام تھا کہ

اسٹیئرنگ تھامے رہیں اور جب ضرورت سمجھیں موڑیں اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی بہت آسانی سے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہم تو بہت بچا کر چلایا کئے مگر دوسرے لوگ اپنی موٹر سے ٹکرا ہی دیتے تھے اکثروں کو اسی میں کچھ لطف آتا بعض وقت تو ایسی مل جاتی تھیں کہ نکلنا مشکل بعض تھوڑی ہی جگہ میں چکراتے رہ جاتیں اس صورت میں تماشائیوں کے قہقہوں کی آواز سے پلیٹ فارم گونج جاتا اور بیچارے شرمندہ ہو کر رہ جاتے نگران کار یہ دیکھ کر فوراً دوڑتے اور موٹریں علیحدہ کر کے آگے بڑھا دیتے۔ وقت مقررہ تک ہم بھی بیٹھے گھمائے گئے موٹریں رکیں اور ہم سب اتر گئے اس کے بعد ٹکٹ لے کر لافنگ گیلری میں داخل ہوئے قد آدم آئینوں پر جونہی نظر پڑی بے اختیار ہنسی آگئی ایک میں تو آدمی بہت موٹا اور دوسرے میں اسی قدر دبلا مگر تیسرے میں سر نیچے پیر اوپر گویا ہم سر سے چل رہے ہیں لوگ ہنسی سے بیتاب تھے اس ہجوم کی وجہ جلد یہاں سے نکل گئے دوسری جگہ مختلف شعبدے دیکھنے میں آئے کہیں سرکٹی عورت تھی، کہیں ایک بڑی مکڑی پر عورت کا سر تیلایا گیا تھا، کہیں جنگ عظیم کے زمانے کی مری ہوئی جرمن لڑکی اور ایک جگہ ایک چوبی صندوق تھا جس میں کئی سوراخ تھے ایک لڑکی اس میں داخل ہوئی اور ایک شخص نے ان سوراخوں میں نیزے لگائے دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ نیزے لڑکی کے جسم سے گزر رہے ہیں مگر جب نیزے نکال کر صندوق کھولا گیا اور لڑکی صحیح و سلامت دوسرے لباس میں برآمد ہوئی تو تماشائی سب حیران ہو گئے۔ سینما اور گانے وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔ ایک تماشہ وہاں قابل دید تھا ایک شخص بہت بلندی سے اپنے کپڑوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگاتا اور اوپر سے نیچے پانی میں کودتا تھا ہزاروں آدمی اس تماشے کو دیکھنے کے لئے میدان میں جمع ہوتے تھے

بہرحال نمائش کو پوری طرح دیکھنے کے لئے کئی دن درکار تھے اور ہمارے بھی تین چار روز اسی کے نذر ہوئے۔ لکھنؤ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا تھا اس پر بھی ہمارے بزرگ روانگی کی اجازت کسی طرح نہیں دیتے تھے لیکن سکول کی حاضری بھی ضروری تھی مجبوراً اجازت دینا پڑا روانگی کا مقررہ دن آ پہنچا سب سے مل کر اسٹیشن روانہ ہوئے اس وقت کی حالت ناقابل ذکر ہے اتنی مدت کے بعد اپنے اعزہ سے ملنا اور اس قدر جلد پھر ان سے جدائی پرملال تھی مگر مجبوری تھی۔ بعض عزیز و احباب اسٹیشن پر بھی پہنچانے آئے تھے۔ چار بجے ریل روانہ ہوئی شب میں پھر ایک دفعہ جھانسی کی سردی کا مقابلہ کرنا پڑا دو راتیں اور ایک دن ریل میں گزرے جوں جوں حیدرآباد سے قریب ہوتے گئے اپنے مکان و مدرسہ کا خیال اور اپنے لوگوں سے ملنے کی خواہش و خوشی میں زیادتی ہوتی گئی تیسرے روز صبح سویرے دو ہفتہ کی مختصر سیاحت کے بعد پھر ہمارا چھوٹا سا خاندان سکندرآباد پر تھا موٹریں ہمارے لئے آئی تھیں مکان روانہ ہوئے سبھوں نے بخیر و عافیت واپسی پر اظہار مسرت کیا اور اس طرح ہماری تعطیلات موسم سرما کا اختتام ہوا دوسرے روز سے پھر ہم تھے اور مدرسہ تھا اور گذرے ہوئے دنوں کی یاد۔

معین الدین احمد انصاری
متعلم فورتھ فارم　　(رفعت منزل)

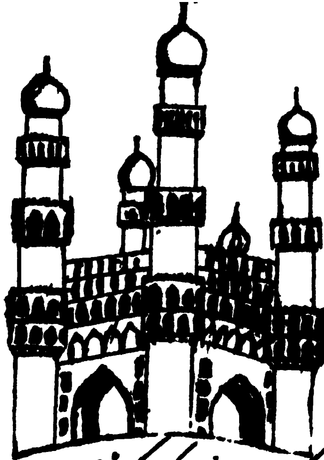
سلکِ ثریا

اگر گدھا مجھے لات مارے تو کیا میں بھی اس کو لات ماروں؟

وہ جو دیر سے بستر سے اٹھتا ہے ضرور تمام دن ڈکی چلتا ہے۔

آرام محنت کی چاشنی ہے۔

"ثریا جبیں"



چارمینار

قطب شاہوں کا راج پاٹ لُٹ جانے کے بعد بھی ایک عمارت اُن کی نیک نیتی اور بلند ہمتی کا برابر ثبوت دیتی رہی اور وہ عمارت ہے حیدرآباد کا ہردلعزیز چارمینار جس کی تاریخ اس پرانی شہر کی گذشتہ اور موجودہ عظمت کو ایک رشتے میں پرو دیتی ہے جس طرح یہ بستی ایک انوکھی چاہت کی یادگار ہے، اسی طرح یہ من موہنی عمارت بھی بڑی منت مرادوں کی عمارت ہے جس کا تھوڑا سا حال بیان کرنا گویا پریم اور منت کے اس بھولے ہوئے سبق کو تازہ کرنا ہوگا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جبکہ سارے ہندوستان میں لوگ میل ملاپ کے صرف گن گانے کے عادی ہو رہے ہیں لیکن خود سچے دل سے اس پر کبھی عمل نہیں کرتے۔

چچلم کے آس پاس جب بھاگ نگر آباد کرنے کا خیال محمد قلی قطب شاہ کے دل میں سمایا تو اس کی پہل چارمینار سے ہوئی۔ اس عمارت کی بنیاد بطور نیک شگون کے ڈالی گئی تھی۔ وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ اس وقت چچلم میں وبا پھیلی ہوئی تھی بادشاہ نے ایک تعزیہ موضع میں گشت کرانے کے بعد اسے ایک ہموار میدان میں رکھا۔ اور یہ منت مانگی کہ "اگر وبا جلد ختم ہو جائے گی تو اسی مقام پر تعزیے کے نمونے کی ایک عمارت تعمیر کروں گا" خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ منہ مانگی مراد بر آئی اور جب وبا ختم ہو گئی تو بادشاہ نے ۹۹۹ھ میں اس عمارت کی تعمیر شروع کی جو تقریباً ایک سال میں ایک لاکھ روپے کے صرفے سے بن کر تیار ہو گئی۔ جیسا کہ "یا حافظ" کے اعداد سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ عمارت شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے اور پتھر اور گچ سے بنائی گئی ہے۔ اس کا ظاہری روپ مسجد اور تعزیے کی شکل سے ملتا جلتا ہے چاروں سمت چار بڑی محرابیں ہیں جو ۶۰ فٹ چوڑی اور ۴۲ فٹ اونچی ہیں۔ اس کی پہلی منزل پر گھڑیالوں کے پیچھے چار محراب دار دالان ہیں ان ہی میں مدرسے اور طالب علموں کے رہنے بسنے کا انتظام تھا۔ اسی منزل کے

بیرونی حصے میں گھڑیالوں کے برابر ننھی ننھی محرابیں بھی ہیں جن سے عمارت بڑی بھلی لگتی ہے۔ دوسری منزل پر
ایک خوبصورت مسجد ہے جس کے سامنے ایک صحن ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ یہاں پہلے پانی کا ایک خزانہ تھا
جس کا پانی جل پلی کے تالاب سے آیا کرتا تھا۔ اور پھر یہاں سے شاہی محلات کو پہنچایا جاتا تھا۔ صحن کے تین طرف
خانقاہ کی عمارت کا سلسلہ ہے۔ اس عمارت اور مسجد کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں۔ جو زمین کی سطح سے ۱۶۰ فٹ
بلند ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ساری عمارت چار مینار کہلانے لگی۔ ہر ایک مینار پر چھ درجے ہیں۔ پہلے اور
دوسرے پر میناروں سے ملے ہوئے دو کمرے ہیں۔ ان کے اطراف جالی ہے اور یہ بالکل محفوظ ہیں تیسرے
درجے سے عمارت کی پہلی منزل یعنی مدرسہ اور دار الاقامہ میں پہنچتے ہیں۔ چوتھا درجہ عمارت کی دوسری منزل یعنی مسجد میں
پہنچتا ہے۔ ان دونوں درجوں پر میناروں کے صرف بیرونی جانب محراب وار منڈیریں ہیں۔ لیکن پانچویں
اور چھٹے درجے پر میناروں کے چاروں طرف منڈیریں ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں سے
سارا شہر اچھی طرح نظر آتا ہے۔

چار مینار کو بن کر ساڑھے تین سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں ملک نے کئی ایک
انقلاب دیکھے۔ لیکن یہ سب رام کہانی ہمارے مضمون سے خارج ہے۔ یہاں صرف انہی باتوں کا ذکر
ہوگا جو حیدرآباد کی اس ہردلعزیز عمارت سے کچھ نہ کچھ علاقہ رکھتی ہیں۔

جب شہنشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈے کو فتح کرلیا تو یہ ریاست مغلیہ سلطنت کا صوبہ بن گئی۔ یہاں دلاور خاں
کی صوبے داری کے زمانے میں چار مینار کا جنوب مغربی مینار بجلی گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ جس کی ضروری مرمت
ساٹھ ہزار روپے کے صرفے سے کرائی گئی۔

سنہ ۱۲۹۳ھ میں نواب سر سالار جنگ اعظم کے زمانے میں پوری عمارت کی باریک چونے سے استرکاری کرائی گئی۔
اس پر ایک لاکھ روپے صرف ہوئے۔

سنہ ۱۳۰۲ھ میں سلطان نواز جنگ بہادر کے علاقے کے عربوں اور پولیس کی آن بن نے ہنگامے کی صورت

اختیار کرلی۔ اس کی روک تھام کے لئے حضرت غفران مکان نے چارمینار پر کچھ مہینوں تک باقاعدہ فوج کا پہرہ مقرر فرمایا۔ فوجی پہرہ اٹھنے کے بعد یہاں پر پولیس کی تعیناتی ہوئی اور کوتوال اکبرجنگ کے زمانے میں چارمینار افغان پولیس کا صدر تھانہ قرار پایا۔

۲۸ صفر ۱۳۰۲ھ میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اس وقت آراستگی کے خیال سے اس عمارت کے گرد لوہے کا کٹہرا لگایا گیا اور آمد و رفت کے لئے ایک آہنی دروازہ شمال کی طرف قائم کیا گیا تھا۔ لیکن جب چارمینار کے چاروں طرف سیمنٹ کی سڑکیں ڈالی گئیں تو سڑکوں کو وسیع کرنے کے لئے کٹہرا نکال دیا گیا۔

۷ محرم ۱۳۰۸ھ میں چارمینار کی پہلی منزل پر چاروں سمت گھڑیالیں لگائی گئیں۔ ان میں سے وہ گھڑیال بجتی ہے جو شمال کی طرف ہے اور جس کا رخ چارکمان کی جانب ہے۔ اس کی آواز دور دور تک جاتی ہے۔ رات میں وقت کا ٹھیک اندازہ ہونے کے لئے گھڑیالوں کے دونوں جانب قندیلیں بھی لگائی گئیں۔ جب سے بجلی کی روشنی کا چلن ہوا، قندیلوں کی جگہ بجلی کی روشنی نے لے لی۔

آج کل تو ہر خوشی کی تقریب اور اہم موقع پر چارمینار کو بجلی کے قمقموں سے روشن کیا جاتا ہے۔ لیکن اس رسم کی ابتدا پہلے پہل حضرت غفران مکان کی تسمیہ خوانی سے پڑی جب کہ پوری عمارت کو شیشہ و آلات بلوری جھاڑ، لنتر اور ہانڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ ۲ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ میں جب لارڈ رپن وائسرائے ہند حیدرآباد تشریف لائے تو دوسری بار اسی طرح روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ بجلی کے صدمے سے بچانے کے لئے چارمینار کے نیچے سے اوپر تک لوہے کا تار لگا دیا گیا ہے۔ اور اس عمارت کی مرمت اور دیکھ بھال محکمہ آثار قدیمہ کے ذمے ہے۔ چارمینار کے جنوب مشرقی کونے میں حضرت محبوب سبحانی کا چلہ ہے۔ اسی کے نزدیک عمارت سے باہر کی طرف ایک لمبا پتھر ہے جس کو ہندو لوگ پوترمانتے ہیں اور یہ اب تک موجود ہے۔ ہندو مسلم عقیدت کا یہ انوکھا سنگم آصف جاہی بادشاہوں کی رواداری اور نیک نیتی کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جو آفات ارضی و سماوی اور آثار قدیمہ کی خدمات سے سدا بے نیاز رہے گا۔

جی، ایس بھان

پہیلیاں

سب رسن کے بھائیوں اور بہنوں سے ان پہیلیوں کے جواب پوچھتے ہیں۔ دیکھیں مارچ کے رسالہ میں کن کن کے جواب صحیح نکلتے ہیں۔

۱۔ اتنی سی جان گز بھر کی زبان
۲۔ ہاتھ میں لیجئے، دیکھ لیجئے
۳۔ بال بچے، کپڑے پھٹے، موتی لئے آنار
۴۔ گھر کے اندر گھر، اس میں گر کے مر
۵۔ ایک گڑھے میں چار جوان لڑتے لڑتے لہو لہان۔
۶۔ باغ جہاں میں آکر پایا نہ ہم نے چین
تن میں رنگ حسن ہے، بدن میں رنگ حسین

مرسلہ۔ مس اقبال باسط علی

کئے کی سزا

دلیری اپنی جتا رہے تھے
نڈر پن اپنا بتا رہے تھے
پکڑ کے لائے تھے اک مکوڑا
بہن کو اپنی ڈرا رہے تھے
سہم کے ہٹتی تھی پیچھے مریم
یہ باؤ کہہ کر جو آرہے تھے
غریب بچی بلک رہی تھی
ذکی میاں کھلکھلا رہے تھے
نہ بھایا قدرت کو ظلم ان کا
جو بے خطا کو ستا رہے تھے
مکوڑے نے اب جو کاٹ کھایا
سزا کئے کی یہ پا رہے تھے
تڑپ رہے تھے دبائے انگلی
بری طرح بلبلا رہے تھے

لطیف النساء بیگم (بی اے)

تبصرے

تبسم پارے مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی بی، اے، ڈپ ایڈ (عثمانیہ) کے تین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ادبیات مین مزاح کا عنصر دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے اور اس لئے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں مین معیاری مزاح کے کافی ذخیرے موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو ادب مین اس جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے اور جن انشا پردازوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے ان مین سے چند اپنے مقصد مین کامیاب ہوئے ہیں۔ مزاح نویسی بجائے خود ایک آرٹ ہے۔ اس لئے کہ ایک خفیف لغزش مزاح کو مسخرہ پن بنادیتی ہے۔ اور اس قسم کا ادب زبان کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بن جاتا ہے۔

پطرس اور رشید احمد صدیقی نے بلاشبہ مزاح نویسی کی ایک خداداد قابلیت پائی ہے۔ خواجہ حسن نظامی اپنی زبان کے باعث بڑے اچھے مضامین لکھ جاتے ہیں۔ "ناکارہ" اور مرزا فرحت اللہ بیگ بھی غنیمت ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے جو مزاح نویس ہیں ان کا ہر مضمون 'بیگم' 'مرزاجی' 'بھابی جان' 'چچا چھکن' وغیرہ جیسے پامال کرداروں کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ "ملا رموزی" نے تو گلابی اردو کے نام سے بڑی ستم ظریفی کی ہے۔

پیش نظر کتاب "تبسم پارے" مین تین مضمون ہیں ان کی دلچسپی سے ہمیں انکار نہیں لیکن ان کو "مزاحیہ" کہنے مین تامل ہوتا ہے بصرف "لفظی بازیگری" کو مزاح نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان مضامین کا طرز بیان بہت دلچسپ ہے اور بلاشبہ انہیں پڑھنے کو جی چاہتا ہے خصوصاً "ہم نے انگریزی اور عربی کیسے سیکھی" اور "اردو کس طرح سیکھی" بہت اچھا مضمون ہے۔

ان تینوں مضامین مین "طنز" کا پہلو پایا جاتا ہے اور طنزیہ نگاری کی ادب مین خاص اہمیت رہتی ہے۔ "گولڈاسمتھ" کے طنزیہ پیرایۂ بیان نے انگلستان کی معاشرت مین بہت کچھ اصلاح کروی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ "تبسم پارے" کے مصنف اس خاص صنف کی جانب توجہ کریں گے اس لئے کہ ان کے زیر تبصرہ افسانوں کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان مین طنزیہ نگاری کی کافی صلاحیت موجود ہے۔

م

المُوسیٰ الموسی کا تازہ شمارہ بغرض تبصرہ وصول ہوا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مین گزشتہ شماروں کی طرح عربی اور فارسی کی وہ عجیب و غریب ترکیبیں اور سنسکرت کے الفاظ کی وہ بے جوڑ بھرمار نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس خاص طرز کا ایک دھندلا عکس نظر آتا ہے۔

"الموسی" کی سب سے پہلی خصوصیت اس کا سرورق ہے۔ اس کا ہر شمارہ ایک دیدہ زیب سرورق لئے ہوئے نکلتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خصوصیت اردو کے کسی رسالہ کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے پیش نظر شمارہ کا سرورق ملک کے ہونہار حسن کار مسٹر خلیل نے بنایا ہے اور اس مین بھی ہمیشہ کی طرح اپنی اچھی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

"الموسی" چونکہ سٹی کالج کے طلبہ کی علمی اور ذہنی سرگرمیوں کا نمائندہ مجلہ ہے اس لئے اس کے مضامین کی فہرست مین طلبہ کے زیادہ نام دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

مضامین تقریباً سب قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن حصۂ نظم کی جانب خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ "ہندی کو اور دل دے" قسم کی نظموں سے احتراز کیا جائے تو مناسب ہے اس لئے کہ شاعری میں ادائے خیال کی نزاکت اور تخیل کی بلندی جب تک ہم آہنگ نہیں ہوتی تو اور کیف نہیں پیدا ہوسکتا۔ الفاظ کو محض اقلیدسی انداز مین جما دینے کا نام شاعری نہیں ہے۔ "علامہ شبلی کے خطوط" اردو ادب کے ذخیرۂ خطوط

دل آویز اضافہ ہیں۔ "ہمارے شہر" کو ہر چند معلومات آفرین نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کا طرز بیان اور اسلوب اور اس کی شگفتگی اس میں ایک کشش رکھتی ہے۔ "گدھے کی کہانی اسی کی زبانی" فوقانی شعبہ کی ابتدائی جماعت کے ایک طالب علم کے قلم سے واقعی قابل تعریف ہے۔

حیدرآباد کے دوسرے تعلیمی اداروں کے مجلوں کی طرح "المدیا" کو بھی تجارتی نقطۂ نظر سے چلانے کی غالباً کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی اشاعت بھی طلبائے کلیہ کی حد تک محدود نظر آتی ہے نوجوانوں کی رجحانات کے ترجمان مجلوں کو تمام ارباب ملک تک پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ نوجوان نسل کے ذہنی نمو کا اندازہ قائم کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے علاوہ مجلوں کی ادارتی تربیت کے سلسلہ میں طلبہ کو کاروباری تربیت دینے کے لیے بھی تجارتی نقطۂ نظر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

"کمسن اور ہونہار طلبہ" کے لئے ایک خاص حصہ وقف کرنے کا خیال مستحسن ہے۔ اس لئے کہ حیدرآباد میں کوئی ایسا خاص رسالہ نہیں ہے جو کمسن طلبہ کے لئے مختص کیا گیا ہو۔ "المعلم" اور "سب رس" بھی اس ہونہار طبقہ کے لئے ضمیمے نکال رہے ہیں امید ہے کہ یہ کوششیں بچوں میں علمی و ادبی شوق پیدا کرنے کے لئے بار آور ثابت ہوں گی۔ م

تمدن ہند میں دکن کا حصہ

کتاب کا موضوع نہایت دلکش ہے لیکن اس کو پڑھنے کے بعد وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں جو اس موضوع کے تصور سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مولوی محمد عبداللہ صاحب چغتائی کو حیدرآباد کے متعلق جو مواد ملا ہے اس سے کسی پہلو پر بھی اچھی روشنی نہیں پڑتی۔ اور جو کچھ مواد ملا ہے غالباً اس سے اچھی طرح فائدہ بھی نہیں اٹھایا گیا۔ اس لئے کہ کتاب کے آخر میں ان دکنی مولفین کی جن کی تحریرات سے اس کتاب کے لکھنے میں فائدہ اٹھایا گیا ہے جو فہرست دی گئی ہے اس میں ایسی بڑی غلطیاں ہیں جن کا الزام کاتب پر بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے مولوی سید محمد (سٹی کالج) نے محمود گاواں پر کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ "حسن کار" کوئی محلہ نہیں ہے بلکہ ایک مجلہ ہے جس کے مرتب مولوی اکبر خاں خلقانی نہیں ہیں بلکہ مولوی اکبر وفا قانی اور "حسن کار" میں کیپٹن محمد علی کا کوئی مضمون شایع نہیں ہوا۔ البتہ کیپٹن اعجاز علی شہرت کے کئی مضامین شایع ہوئے ہیں۔ بہرحال ان اہم غلطیوں سے کتاب کا ماخذ تلاش کرنے والوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

ہر چند مصنف نے اس کتاب کا مدعا ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ "یہ مقالہ حیدرآباد دکن کی کوئی مستقل اور مبسوط تاریخ نہیں ہے" لیکن اجمالی طور پر بھی جو کچھ بیان کیا گیا ہے ان میں بہت کم اہم امور کا تذکرہ ہے اور ہر جگہ فروعی باتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص حیدرآباد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ملک کے موجودہ رجحانات اور شاندار ترقی کا حقیقی عکس بہت کم نظر آتا ہے۔ لائق مصنف نے ہر جگہ "عہد عثمانی" کی برکات اور اس کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس "عہد میمون" کی زرین خصوصیات کا اظہار بہت کم ہونے پایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں چغتائی صاحب زیادہ مواد پیش کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ "خصوصاً اہم شخصیتیں"، "اردو کا چرچا" اور "علمی ادارے" والے ابواب اس قابل ہیں کہ ان کی طرف خاص توجہ کی جائے۔

بہرحال حیدرآباد کے تمدن سے متعلق ایک غیر حیدرآبادی مخلص کی یہ "قلمی عقیدت" اور "علمی کاوش" اس قابل ہے کہ اس کو "اہل دکن" "بہ نظر استحسان" دیکھیں۔

حیدرآباد انجینیرنگ گزٹ

حیدرآباد دکن سے ایک فنی ہفتہ وار جریدہ میر نظام الدین حسین خاں صاحب شمسی کی ادارت میں نکلنے لگا ہے۔ جس کا پہلا ماہوار شمارہ ہمارے پیش نظر ہے۔ گزٹ کی پہلی خصوصیت اس کا جاذب نظر ہفت رنگی سرورق ہے۔ جس کو نواب زین یار جنگ بہادر

تیار کر کے اپنے حسن کارانہ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

اس گزٹ کا مقصد فن انجنیری کی ترقیوں سے قارئین کرام واقف کرانا ہے اور اس فن کے مختلف اور وسیع پہلوؤں اور جدید رجحانات کے متعلق معلومات بہم پہنچانا ہے اور اس فنی مضمون مین ایسی دلچسپی پیدا کرنا ہے جس سے پبلک عام طور پر محروم ہے۔ بلا شبہ یہ گزٹ ایک ایسے مقصد کے تحت جاری کیا گیا ہے جو اردو کے فنی ادب کو غنی بنانے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اردو مین ادبی اور علمی رسالوں کی بہتات ہے لیکن فنی شعبوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی جانب اردو صحافت نے ابھی اتنی توجہ نہیں کی ہے جسے قابل لحاظ کہا جا سکے۔ "حیدرآباد انجنیرنگ گزٹ" امید ہے کہ اپنے مقصد مین نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کامیاب ہوگا اور اردو کو ترقی دینے والوں کے لئے نئی راہوں کی طرف رہنمائی کرے گا۔

ہم مدیر گزٹ کے اس خیال سے بالکل متفق ہیں کہ "ہماری ترقی پذیر ریاست حیدرآباد کے ساتھ یہ ایک بے انصافی ہوگی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حیدرآباد میں ایسے فنی جرائد کے لئے جگہ نہیں ہے۔" اور سمجھتے ہیں کہ اس گزٹ کا اردو دنیا مین خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے گا۔

گزٹ کے "پیش نظر شمارہ" مین بعض مضامین بہت دلچسپ ہیں جن سے حیدرآبادی انجنیری کی ترقیوں اور اس کے مستقبل پر روشنی پڑتی ہے۔

انجنیرنگ کے اصطلاحات چونکہ اردو مین بہت کم منتقل ہو کر مستعمل ہیں۔ اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ مین اگر جامعہ عثمانیہ کے ترجموں سے مدد لی جایا کرے تو غلطیوں کا احتمال بہت کم باقی رہ جاتا ہے۔ م

آخری رسول جناب ماہر القادری کی ایک قابل قدر تصنیف ہے جس کو جناب خواجہ بہاء الدین صاحب مہتمم مکتبہ علمیہ حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا اسلوب بہت شگفتہ ہے۔ اور ہر وہ شخص اس سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے جو آنحضرت کی مقدس زندگی کے مطالعہ کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ قیمت ۸/

اولیائے دکن اور قرآن

مصنفہ ابو محمد مصلح قیمت (۱۲/)

یہ مسلم ہے کہ اولیائے دکن کے حالات معلوم کرنے کے لئے عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری کی کتاب بہت کافی ہے۔ اس کے علاوہ اور جو کتابیں ہیں ان مین پورے ہندوستان کے ولیوں کا ذکر موجود ہے۔ حیدرآباد کے بعض قدیم شہروں کی تاریخوں کا آخری حصہ ولیوں کے حالات پر مشتمل ہے چنانچہ "تاریخ قندہار" "تاریخ بیدر" "تاریخ بیڑ" "تاریخ نرل" اس کی شاہد ہیں۔ تاریخ برہان پور مین بھی مختلف ولیوں اور مشاہیر کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب جس کے دو حصے ہیں، ان سب سے مختلف ہیں۔

عوام کا مذاق ولیوں کے حالات معلوم کرنا ہے لیکن کسی ایک خاص پہلو پر تفصیلی معلومات نہ تو نہیں پہنچ سکتیں اور نہ عوام کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تمام اولیا لکھے پڑھے تھے، ذاکر و شاغل تھے اور ریاضت مین منہمک رہتے تھے۔ اور جو تعلیم سے عاری تھے وہ مجذوب تھے۔ اگر ولیوں کو قرآن شریف سے انس نہ ہو تو پھر کون شخص ان سے الفت رکھے گا۔ اس لحاظ سے کتاب اور اس کا مطمح نظر ستم ظریفی کے مرادف ہے۔

حصہ اول "اولیائے دکن اور قرآن" کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ؎ این رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است۔

دکن سے عام طور پر حیدرآباد اور اس کا جنوبی حصہ مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن تبت کے رہنے والے کو حق ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو دکن کہہ لے۔ گجرات کو دکن سے کیا تعلق ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں ۴۰ ولیوں کا قرآن سے تعلق تبلایا گیا ہے۔ سب میں سے ان میں تقریباً پندرہ اولیا گجرات کے ہیں اور چند کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں کے ہیں۔

اگر کسی کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے۔ "کہتے ہیں کہ........" "نقل ہے کہ........" "لکھا ہے کہ...." ہم نے سعدی کی گلستان میں "می گویند" اور "آوردہ اند" اور افلاطون کی کہانیوں میں "ایٹ از سیڈ" اور "ونس اپان اے ٹائم" پڑھا ہے لیکن عصرِ جدید کی تاریخی یا تحقیقی یا اصلاحی کتابیں ان جملوں کی حامل نہیں۔ آج کل کے روشن زمانے میں جب کہ ہر لفظ پر ثبوت پوچھا جاتا ہے ایسی کتابیں لکھنا بہت دور از کار فعل ہے۔

صفحہ ۴ پر سید احمدؒ اور سید محمدؒ کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

"آپ دونوں صاحبزادے سید عبداللہ مدنی کے ہیں سید احمد صاحب اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ قرآن بغیر حسنِ تلاوت اور حسنِ صوت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں بھائی ایک ہی مقام پر مسجد کے صحن میں مدفون ہیں"

صفحہ ۴۴ پر مخدوم العالم شیخ نور الدین کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں "آپ دس برس کی عمر میں حافظِ قرآن ہوئے۔ آپ کا مدرسہ ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوا...... آپ کے مدرسہ میں ایک لاکھ کتابیں تھیں ... یہ مدرسہ اپنے وقت کا گویا نظامیہ اور ازہر تھا۔"

مسجد، مدرسہ اور کتب خانے کا ذکر کر دیا گیا لیکن مقام کا پتہ نہیں تبلایا گیا۔ ان بیانات سے قاری متاثر ہونے کی بجائے متنفر ہو جاتا ہے۔

دوسرا حصہ سلاطینِ دکن اور قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ یہ حصہ بھی پہلے کی طرح غلطیوں سے پُر ہے۔ مثلاً حسن گنگو کے متعلق لکھتے ہیں۔ "لکھا ہے کہ صبح کے وقت دہلی میں جمنا کے کنارے پہنچا۔"

راجہ دیوراٹ کے متعلق لکھتے ہیں "انہی کے حکم سے اس کے دربار میں اس کے سامنے تعظیم کے ساتھ قرآن مجید ہمیشہ رکھا رہتا تھا تاکہ لوگ جب دربار میں آئیں تو بجائے راجہ کے قرآن کو سلام کریں۔" بہتر ہوتا کہ ان کے ماخذ تبلائے جاتے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس کتاب کو کسی طرح کارآمد نہیں سمجھ سکتے۔ (اکبر صدیقی)

ایشیا۔ بابتہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۴۷ء

ایشیا ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ ہے جو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم و ترقی صوبہ بہار کی نگرانی اور جناب ساغر نظامی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت کے لئے "ساغر پریس" کا نام لینا کافی ہے۔ اس پریس سے جتنی کتابیں طبع ہوتی ہیں ان میں سلیقہ و حسن کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ ایشیا کے صفحات چار حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں تاریخ، سیاسیات و ادب سے متعلق مضامین ہیں۔ لیکن کچھ نظمیں بھی شریک کی گئی ہیں جو بہت بے محل معلوم ہوتی ہیں، اس لئے کہ پہلے تو ان کا کوئی تعلق تاریخ و سیاسیات یا ادب سے نہیں ہے۔ دوسرے نظموں کے لئے ایک علیحدہ حصہ مختص بھی کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں اردو شاعری پر نقدانِ جذبات اور رفعتی کے تتبع کا الزام اور لارڈ ڈلہوزی کے سیاہ کارنامے پڑھنے کے قابل مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ نظموں اور غزلوں کے لئے ہے۔ حضرت جوش کی نظم "نئی دنیا" اپنے مضمون اور رنگ کی حامل ہے۔ تیسرا حصہ افسانوں اور ڈراموں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ افسانوں میں "جوانی کا خواب" بہت اچھا ہے۔ "پیار ولی کی امانت" ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس کو نہ اچھا کہا جا سکتا اور نہ برا۔ البتہ بعض مقامات پر اس کی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔ چوتھے حصہ میں کتب، رسائل و اخبارات پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔

اگرچہ ایشیا میں ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت کچھ سامان دلچسپی ہے لیکن ایک ششماہی رسالے سے جس معیار کی توقع کی جا سکتی ہے وہ اس میں بڑی مشکل سے تو نظر آتا ہے۔ تین ماہ کی مدت میں رسالہ کو اس صورت میں بڑھایا جا سکتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے اس سے بہت کچھ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایشیا کے آئندہ شمارے زیادہ توجہ کے ساتھ مرتب کئے جائیں گے اور مضامین کے معیار اور نظموں کی کیف آفرینی کا خاص خیال رکھا جائیگا۔

پ ج

ادارۂ ادبیاتِ اردو

حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی مرکز ہے جو سات سال سے سرگرم کار ہے اور نوجوانوں میں علم و ادب کے صحیح ذوق کی نشو و نما اور ادب اردو کے اضافہ و استحکام کے لئے خاموشی کے ساتھ مسلسل کام کر رہا ہے۔ اس کے مؤسسین حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ۲۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری

۳۔ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ۴۔ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی

۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور .... (مدیر عمومی ادارہ)

ان کے خلوص اور جذبہ خدمت گذاری کے علاوہ حسب ذیل علم دوست اور اہل ذوق ہستیوں کی علمی و عملی دلچسپیاں اور ہمدردیاں ادارہ کی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

۱۔ نواب سالار جنگ بہادر ۲۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر ۳۔ خان فضل محمد خاں صاحب

۴۔ مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب ۵۔ مولوی محمد حسین صاحب جعفری ۶۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب

۷۔ مولوی مرزا حسین علیخاں صاحب ۸۔ مولوی غلام یزدانی صاحب ۹۔ مولوی عبدالحق صاحب

۱۰۔ مولوی سجاد مرزا صاحب ۱۱۔ مولوی سید خورشید علی صاحب ۱۲۔ راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی ۱۳۔ مولوی میر اکبر علی خاں (بیرسٹر)

۱۴۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر ۱۵۔ نواب عنایت جنگ بہادر ۱۶۔ مولوی عبدالرؤف صاحب وکیل ہائی کورٹ ۱۷۔ مولوی سید محمد صاحب

ان معاونین کے ساتھ حسب ذیل نوجوان خدمت گزاران علم و ادب کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے ادارہ کو تقویت بخشی اور جن میں سے بعض کی ادبی خدمات ادارہ کی طرف سے اردو دنیا میں روشناس کی گئیں۔

۱۔ نواب محمد ظہیرالدین خان صاحب بی اے ۲۔ مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے ۳۔ مولوی میر حسن صاحب ام اے

۴۔ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے ۵۔ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے، ال ال بی ۶۔ جناب مہندر راج صاحب سکینہ ام ایس سی

۷۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی اے ۸۔ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ بی اے ۹۔ مولوی سید ابوالفضل صاحب ام اے

۱۰۔ صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش ۱۱۔ مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب بی اے ۱۲۔ مولوی محمد اکبرالدین صاحب صدیقی

ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کے متعلق اردو کے مشہور مستند ادیبوں اور صاحبان نظر کی رائیں دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہوں۔

خواجہ حمیدالدین (عثمانیہ) مہتمم ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات اردو

کی سرگرمیوں کے متعلق اردو کے مشہور و مستند ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کے خیالات

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی

سلسلہ ادبیات اردو کو جاری ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل مدت میں وہ متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ حال میں اس نے اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے جشن سیمین کی یادگار میں "بزم سخن" کے نام سے دکن کے پچیس مشاہیر شعراء کا تذکرہ شائع کیا ہے۔ اس کی تالیف میں جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور دوسرے اہل قلم کی کوششیں شریک ہیں۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں میں تقسیم ہے۔ ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس دور کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس عہد کے چند مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے۔ شعراء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے ادبی ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے وہ ہم عصر شعراء جو اس عہد میں دکن گئے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی نام دیدئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ تذکرہ گویا دکن کی شاعری اور اس کی تدریجی ترقی کی پوری تاریخ ہے۔۔

حالات کے ساتھ ان (شعراء) کے اور ان کے اکثر ہم عصر دکنی شعراء، فرمانروایان دکن، اور متعدد ادب و شعر کے قدردانوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جن سے معنوی خوبیوں کے ساتھ یہ تذکرہ حسن ظاہر کا بھی مرقع بن گیا ہے۔ (معارف مارچ ۱۹۳۴ء)

۲۔ مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے۔

پہلی جلد میں (کل) پچیس شاعروں کا تذکرہ اور منتخب کلام آگیا ہے۔ اگرچہ ان شعراء پر لکھنے والے مختلف اصحاب ہیں لیکن تاہم یک رنگی پائی جاتی ہے ہر شاعر کے حالات کے ساتھ اس کے منتخب کلام پر تبصرہ ہے۔

دوسری جلد میں بھی دور آصفیہ کے پچیس شعراء کا تذکرہ اور کلام ہے۔ اور اس کی ترتیب بھی اس ڈھنگ پر ہے جیسی پہلی کی ہے تصویروں نے جو کثرت سے ہیں کتاب کا حسن بڑھا دیا ہے۔

اردو شاعری کا فروغ اعلیٰحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کے زمانے سے شروع ہوا اور روز بروز ترقی پر ہے۔ اس وقت بھی حیدرآباد میں بہت سے خوش گو شاعر موجود ہیں ان دونوں جلدوں سے حیدرآباد کی گذشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ (اردو جولائی ۱۹۳۴ء)

ورڈزورتھ اور اس کی شاعری

۱۔ مولانا اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اس کے تجربات حیات نے جس جس طرح اس کے شعری جذبات کی تعمیر و تشکیل کی ہے ان کو واضح کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علیحدہ ہے اور جدید نظر اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے ...... انگریزی کے ذخیرہ ادب کو جلد سے جلد اردو میں منتقل کر لینا اردو کی بہت بڑی خدمت ہے اس اعتبار سے مصنف نے ورڈزورتھ کے حالات زندگی کے ساتھ اس کی نظموں کو اردو زبان میں منتقل کر کے درصل اردو کی ایک نہایت ضروری خدمت انجام دی ہے .... ہمارے عہد مطبوعات میں ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔ (ہندستانی جولائی ۱۹۳۳ء)

ٹیگور اور ان کی شاعری

۱۔ مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے۔

ٹیگور کی مختلف تحریروں کے تراجم اردو زبان میں کثرت سے شائع ہو چکے ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب لکھی گئی تھی جو ان کی شخصیت کو واضح کرتی پیش نظر کتاب میں ٹیگور کی شخصیت، ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلو اور ان کے فلسفۂ زندگی پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ ٹیگور کا پیام، گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتن پر علیحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے.....

اس کتاب میں انسان اور فلاسفر کی حیثیت سے ٹیگور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کے لکھنے میں مخدوم صاحب نے محنت کی اور باذوقی و سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ (اردو اکتوبر ۱۹۳۵ء)

ہوش کے ناخن

ا۔ مولانا نیاز فتحپوری۔

ڈرامہ ہے جسے حیدرآباد کے دو فاضل نوجوانوں نے اسٹیج کے لئے لکھا ہے۔ اور جس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی پیش کی گئی ہے۔ یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے لیکن پیش کیا گیا ہے ایسی صورت سے کہ بالکل اپنی چیز معلوم ہوتا ہے۔ یہ دو بار حیدرآباد میں اسٹیج ہو کر لوگوں کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکا ہے۔ رسالہ نگار مارچ ۱۹۳۵ء

بادۂ سخن

ا۔ مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے

ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام موزوں کا انتخاب ہے اور نہایت خوبصورت انتخاب ہے مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے۔ دکن میں پرورش پائی لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سراہے گئے کلام میں جس قدر ہمارے پیش نظر ہے آمد ہی آمد ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ معلوم ہوتا ہے حضرت فصیح الملک مرحوم کے صحبت یافتہ ہیں۔ ان کے کلام میں جو بے تکلفی ہے وہ خداداد ہے۔ اور مقدمے میں دکن کی اردو شاعری پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے وہ تو نہایت بصیرت افروز ہے اس لئے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بادۂ سخن میں بہت سی کارآمد چیزیں مل سکتی ہیں۔

۲۔ مولوی سجاد مرزا صاحب ام، اے۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ملک کے ان نادر نوجوانوں میں سے ہیں جن کو کام کے بغیر چین نہیں آتا۔ یہ نہیں بلکہ وہ نگرانی میں ایک جماعت بھی تیار کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جدید ترین اصول پر ادبی کام کرنا سکھا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے تین شعرائے دکن کے انتخابات ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جناب زور صاحب نے ایک زوردار مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو ہر انتخاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جس شاعر کے کلام کا انتخاب ہے اس کے مختصر حالات زندگی جمع کر دئے گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کو توقع ہے کہ ان تینوں اور دلکش انتخابات کو جن کی قیمت صرف ۱۲ فی جلد ہے خرید کر ہر محب وطن اپنے ذوق سلیم ...

ثبوت دے گا۔ اور ہر مدرسہ اپنے کتب خانہ میں اس سلسلے کو جگہ دے گا۔ المعلم۔ دی ۱۳۴۵ف

کیفِ سخن

ا۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ام۔ اے پی۔ اچ۔ ڈی۔

حضرت کیفی (صاحب کیف سخن) ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں آزادمنشی و لطیفہ سنجی ان کے کلام پر خط جلی لکھی ہوئی ہے۔ اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے جدید دور احیاء العلوم و نشاۃ ادب کے بلند بانگ و قوی آہنگ نقیب ہیں کیفی ایک جامع قال و حال انسان تھے۔ جامعہ جون ۱۹۳۶ء

۲۔ مولوی سید احمد محی الدین صاحب۔

ڈاکٹر صاحب جس قدر خاموشی اور خوبی کے ساتھ ملک میں اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ان سے پہلے کسی سے ممکن نہیں ہوئی آپ کی کوششوں سے دکن کے اردو ادب کا ایک بڑا حصہ منصۂ شہود پر آگیا ہے۔ اور ابھی بہت سی توقعات ہیں۔ سید ضمی الدین حسن کیفی دکنی دورحاضر کے ان بڑے شعراء میں داخل ہیں جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ نہ صرف دکن کی اردو شاعری کو بلند کیا ہے بلکہ پورا اردو ادب لطیف کے پرشکوہ ایوان کی زینتوں میں اپنی فکر بلند و لطیف کی نہایت نفیس گلکاریاں کیں اور کچھ مینا کاریاں کر گئے ہیں۔ جمیعہ مہر دکن جولائی ۱۹۳۶ء

متاعِ سخن

ا۔ مولوی شاہد احمد صاحب بی، اے۔

یہ جناب عزیز کا انتخابی کلام ہے مگر نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز شاعرانہ فکر کا بہترین نمونہ ان (عزیز حیدرآبادی) کا شاعرانہ ذوق دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ حضرت نعتی مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں چٹکی لی تھی اور میرا حسن مرحوم کس لئے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اگر میرے سامنے جناب عزیز کی مختصر شاعری اور ان کے حالات سے بے خبر ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے علیحدہ ہو کر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے۔ زبان میں ان کی لغزش نہیں بیان میں ان کے زور بندش ان کی بہت خوش کر شاعری کے لئے جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ رسالہ ساقی نومبر ۱۹۳۶ء

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کی مشہور و معروف کتابیں

(۱) "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سات سو سے زیادہ صفحات کی ضخیم کتاب، اس میں انگلستان، اسکاٹلینڈ اور پیرس کے کتب خانوں کی دکھنی قلمی کتابوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، نمونہ کلام کے ساتھ اختلافات بھی واضح کئے ہیں۔ (قیمت مجلد عمہ ۔ غیر مجلد للعہ)

(۲) "دکن میں اردو" طبع ثالث، دکن میں اردو کی ابتدا، اور ارتقا کی مفصل تاریخ۔ بہت کچھ اضافہ کے بعد اب تیسری مرتبہ شایع ہوئی ہے۔ (قیمت مجلد سے)

(۳) "خواتین عہد عثمانی" خواتین دکن کی پچیس سالہ ہر جہتی ترقی کا مرقع، بقول اڈیٹر رسالہ المعارف اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان کی منفرد کتاب ہے۔ (قیمت مجلد عہ ۱۲ غیر مجلد عہ)

(۴) "حضرت امجد کی شاعری" حضرت امجد کی ہستی اب کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کتاب میں آپ کے ہر قسم کے کلام پر تبصرہ کیا گیا اور کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ ار

(۵) "مکتوبات امجد" حضرت امجد کے مکتوبات جو تصوف اور ادب کے انمول جواہر ہیں۔ (قیمت ۱۲ ار)

(۶) "رہبر سفر یورپ" جو درحقیقت رہبر سفر یورپ ہے، سفر یورپ کے لئے نہایت کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ (قیمت ۱۲ ار)

(۷) "ذکر نبی" آنحضرت صلعم کی مبارک سیرت کے سات مختلف پہلو پر فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ (قیمت ۱۲ ار)

(۸) "خیابان نسوان" ہاشمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ جو خواتین کی تعلیم اور معاشرت وغیرہ سے متعلق شایع ہوا ہے۔ (زیر طبع)

(۹) "مقالات ہاشمی حصہ اول" ہاشمی صاحب کے علمی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

دفتر سب رس رفعت منزل خیریت آباد

حیدرآباد دکن

گاڑی بان

ڈھلتے ہوئے سورج کی ہلکی سی دھوپ۔ دونوں جانب گھنے گھنے جنگل اور پھر گاڑی بان کی دیہاتی تانیں۔ میں کیف و سرور میں کھویا ہوا سا تھا۔ ایک گاؤں قریب آ رہا تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جانور چرتے چرتے ہماری طرف نظریں اٹھا کر دیکھ لیتے تھے اور پھر چرنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

"یہ مقام میرا دیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے گاڑی بان سے کہا۔

"ہوگا حضور۔" اس نے اپنی تان ختم کر کے کہا۔

"ہاں، ہاں، دیکھا ہوا ہے۔ وہ دیکھو اُس چٹان کو۔ غالباً میں اسی پہ بہت جو بیٹھتا رہا ہوں۔ ہاں وہ درخت ــ وہ، وہ۔ اسی جگہ پر تھا۔ بالکل چھوٹا سا تھا۔ مگر وہ قبر۔ وہاں شاید قبر تو نہ تھی لیکن ہو سکتا ہے۔ قبر تو بعد میں بھی بن سکتی ہے۔"

"یہ قبر حضور" گاڑی بان نے گانا ختم کر کے کہا۔ "اس قبر سے ایک غمگین کہانی متعلق ہے"

"کس کی ہے یہ قبر" میں نے پوچھا۔ "ایک غریب لڑکی کی ہے حضور۔"

اس نے کہا "ہاں۔ وہ قصہ" میں نے دریافت کیا۔

"بہت زمانہ ہوا حضور، یہاں ایک انسپکٹر صاحب آئے تھے۔ وہ یہیں گاؤں میں ٹھہر گئے تھے۔ اُن کے لڑکے سے اِس کی بڑی دوستی ہوگئی۔ دونوں ملکر تمام دن اسی درخت کے نیچے کھیلا کرتے یا اُس سامنے والی چٹان پر، شام میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے کے لئے اس پتھر پر چڑھ جاتے اور بہت دیر تک بیٹھے رہتے۔ یہی ان کا معمول تھا۔ ایک دوسرے سے وہ جدا نہ رہ سکتے تھے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت بڑھتی گئی۔ لیکن اسی زمانہ میں انسپکٹر صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔ جدائی کا دونوں کو انتہائی صدمہ ہوا۔ وہ گلے ملکر رونے لگے آخر لڑکے نے اُسے سمجھایا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ایک مہینہ بعد وہ اسی درخت کے پاس اس سے آ کر ملے گا۔ دوسرے روز سب چلے گئے۔" میری سانس تیز تیز چلنے لگی۔ گاڑی اپنا راستہ طے کرتی چلی جا رہی تھی۔

"اس کی حالت دن بدن ابتر ہوتی گئی۔ وہ روتی تھی اور سرد آہیں بھرتی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے وعدہ کا دن آیا۔ وہ سہ پہر ہی سے درخت کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سورج اپنی روزمرہ کی رفتار سے منزلیں طے کرتا ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اُسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ ٹھہر گیا ہو۔ وہ ٹہلنے لگی۔ ٹہلتی ہوئی دور تک نکل گئی۔ لیکن شاید اسے خیال آگیا کہ اُس سے اُسے درخت کے نیچے ملاقات کرنی ہے۔

وہ پھر واپس آئی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ سردی کافی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ درخت سے پیٹھ لگائے کھڑی راہ تک رہی تھی۔ سورج غروب ہوگیا۔ فضا میں تاریکی پھیلنے لگی۔ کسان اپنے گھروں کو واپس ہونے لگے۔ گلوں نے گاؤں کا رخ کیا۔ سردی بہت بڑھ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سوئیاں سی چبھنے لگتی تھیں۔ مگر وہ اسی طرح کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ رات ہوگئی۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن وہ گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"ذرا سی آہٹ پر کسی کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔" میں عجیب پریشانی کے عالم میں قصہ سن رہا تھا۔ گاڑی اپنا راستہ طے کرتی چلی جا رہی تھی۔

"اس رات سردی انتہائی زور پر تھی۔ تمام گاؤں سویا ہوا تھا۔ لیکن وہ کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ صبح سویرے جب کسان ہل اور بیل لے کر نکلے، تو انھوں نے دیکھا کہ وہ اسی طرح درخت سے پیٹھ لگائے کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ لیکن نزدیک جانے پر انھیں معلوم ہوا کہ

رات کی سردی نے اُسے زندہ نہ چھوڑا تھا۔ اُسے وہیں زمین کی آغوش کے سپرد کر دیا گیا۔ شاید اس کی روح اب تک بھی انتظار کر رہی ہو۔

امیر آدمیوں کی عادت ہی ہے حضور غریب لڑکیاں اُن کا کھلونا ہوتی ہیں۔ وہ اُن سے محبت نہیں کرتے، کھیلتے ہیں۔"

میری حالت قابل رحم تھی۔ گاڑی اپنا راستہ طے کرتی چلی جا رہی تھی۔

"گاڑی بان! ذرا گاڑی پلٹا لو"۔ میں نے کہا۔

"کدھر حضور" اس نے پوچھا۔

"اسی قبر کے پاس" میں نے جواب دیا۔

"مگر حضور! ہم بہت دور نکل آئے ہیں"

"کچھ پروا نہیں"

"پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی"

"ہو جانے دو"

"واپسی تک بہت رات ہو جائے گی"

"میں کہتا ہوں ہو جانے دو۔ گاڑی واپس لے چلو۔ مجھے وہاں چل کر عقیدت کے آنسوؤں کی چادر چڑھانی ہے۔"

محمد دلاور خاں مہدوی

ساون

باؔبر کی نظمیں سلیس زبان میں ترقی پرور خیالات لئے ہوئے ہوتی ہیں ان کی نظم "ہائے سو" نے علمی طبقوں میں بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس نظم میں شاعر نے ایک فرقت نصیب "دکھیاری" کی زبان سے، جس کا من اپنے پریتم کے لئے اداس ہے۔ "ساون" کی کیف آفریں داستان سنائی ہے۔ "سادگی و پرکاری" اس نظم کی خصوصیت ہے۔ (سب رس)

سب درختوں نے ہے سبز جوبن لیا
دیکھ کالی گھٹا میرے سندر پیا
گو کہتی ہے پپیہے کی پیہو
یاد آنے لگے تیرے گیسو

(۲)

پھر غم نامرادی کے آکاش پر
پھر جہانِ تصور میں اے سیم بر
ابر بن بن کے چھائی ہیں آہیں
بجلیاں بن گئیں تیری باہیں

(۳)

مدبھری وہ کنول جیسی آنکھیں تری
اور پتلی ترے نین کی جل پری
وہ رگ برگ گل جیسے ڈورے
تیرے دیدے رُو پہلی کٹورے

(۴)

چپ کے چپ کے کٹاری چلانے لگیں
یاد آنے لگیں یاد آنے لگیں
تیری چھوٹی موئی جیسی پلکیں
فتنہ گر برق افگن نگاہیں

(۵)

عکسِ گل کو وہ پیہم نچاتی ہوئی
شہر میں بن میں اودھم مچاتی ہوئی
چھیڑ کرتی ہوئی کھیتیوں سے
آ کے ندی ملی ندیوں سے

(۶)

لوٹ جاتی ہے موجِ نسیم بہار
ہائے نوخیز کلیوں کا منہ بار بار
لاجونتی کی ہر اک ادا پر
چومتے ہیں سیہ مست کافر

(۷)

راج ہنسوں کی دیکھو قطاریں چلیں
اور خشکی پہ بگلے کھڑے ہیں کہیں
صاف پانی میں کیا ہولے ہولے
دھوپ کھانے پر و بال کھولے

(۸)

دیدۂ شوخ نرگس کا سرمہ بنی
آہ پروان چڑھتی ہیں بیلیں ہری
کائناتِ محبت سمٹ کر
ڈوریوں سے لپٹ کر چمٹ کر

(۹)

گدماں باپ کے کود کر پھاند کر
پیارے پیارے ہرن ہیں کھڑے بے خطر
شادماں شادماں ہیں لوا رے
سبزۂ رمنوں میں ندی کنارے

(۱۰)

سب وفورِ محبت سے سرشار ہیں
پھنک رہا ہے بدن گرم رخسار ہیں
میں انھیں دیکھ کر جل رہی ہوں
ہاتھ ہائے ستم مل رہی ہوں

(۱۱)

آہ ساون کا موسم ہو اور تم نہ ہوں
جوش و مستی کا عالم ہو اور تم نہ ہوں
چین کیسے پڑے میرے من کو
آگ لگ جائے سارے چمن کو

(۱۲)

آؤ من موہنا ماہ پارے سے ہو تم
میری آنکھوں کے تارے دلارے ہو تم
میرے گھر کے اُجالے کنھیا
دل کو گرمانے والے کنھیا

ظہیر الدین احمد بی، ایس سی، ال ال بی

آزاد وطن کے باشندے

۱

کیوں حبِّ وطن میں مست نہ ہوں آزاد وطن کے باشندے
ہم گائیں وطن کے گیت نہ کیوں، بلبل ہیں چمن کے باشندے
رکھتے ہیں دلوں پر قبضہ جو، اس خلدِ عدن کے باشندے
فرزندِ بلادِ گیتی ہیں، بے شبہ دکن کے باشندے

۲

یہ خطۂ ارض وہ گلشن ہے، جو رنگِ خزاں سے دور رہا
گلزارِ دکن کا فضلِ خدا سے پھولوں سے معمور رہا
افلاس یہاں کافور رہا، دل شاد یہاں مزدور رہا
ہر فردِ بشر مسرور رہا، سرکش حاسد مقہور رہا

۳

یہ باغ و راغ و کوہ و دمن، یہ دشت و جبل سب پیارے ہیں
"ساگر" کے آبِ سیمیں میں، موسیٰ ندی کے دھارے ہیں
وہ چاندنی راتوں کے دلکش، کتنے یا رب نظارے ہیں
یکجا ہیں آب و آتش، یا تالاب کے اندر تارے ہیں

۴

غنچے جو چٹکتے جاتے ہیں، تو پھول مہکتے جاتے ہیں
انبار سے ورد و احمر کے گلزار دہکتے جاتے ہیں
ہر سمت ہے جنگل میں منگل، صحرا بھی مہکتے جاتے ہیں
مرغانِ چمن، روشِ گل پر مسرور چہکتے جاتے ہیں

۵

اے ارضِ وطن! کیا بات ہے تیری خاک بھی ہم کو پیاری ہے
مانند لہو، الفت تیری، رگ رگ میں، اپنی ساری ہے
مسکن ہے وطن عافیت کا، آزادی ہی، خودداری ہے
ہر درد رسیدہ گیتی کی دلداری ہے، غمخواری ہے

۶

یاں علم کے دریا بہتے ہیں، آباد دیارِ دولت ہے
شاداب نہالِ ملت ہے، یہ جوشِ عمل کی برکت ہے
پامال بنائے تفرقہ ہے، قائم واللہ اخوت ہے
قوموں میں یہاں ہے پھوٹ کہاں، باہم وہ ربطِ الفت ہے

۷

آزاد ہے یاں ہر فردِ وطن، پابندِ عمل ہر انساں ہے
لعنت ہے دورِ غلامی کی، مستقبل و حال درخشاں ہے
بجلی کی نہیں یہ روشنیاں، یہ نورِ رحمتِ یزداں ہے
جو مہرِ منور تاباں ہے، وہ چہرۂ ذی شاں عثماں ہے

۸

اے حبِّ وطن کے متوالو! ایثار تمہاری فطرت ہے
تم ملک و وطن کے خادم ہو، خدمت میں نہاں عزت ہے
تم محسنِ نوعِ انساں ہو، احسان تمہاری عادت ہے
وہ دستِ سخا پایا تم نے، دنیا میں جس کی شہرت ہے

۹

ہاں! آؤ وطن کے فرزندو! دنیا کو دکھائیں نکہت سے
حاصل ہو مقصد ہستی کا، مخلوقِ خدا کی خدمت سے
مٹ جائے جہل و نادانی، آزاد ہوں بندِ ذلت سے
افلاس مٹے، دکھ درد گھٹے، بچ جائیں رنج و کلفت سے

۱۰

تربیت انسانیت کی ہر چند جہاں میں مشکل ہے
کوشش ہی لیکن چیز ہے وہ، آساں جس سے ہر منزل ہے
ہمدردی کا اعلیٰ جذبہ، انسانیت کا حاصل ہے
بیدردی زہرِ ہلاہل ہے، خود غرضی سمِ قاتل ہے

نوشابہ خاتون بی اے

سحر زدہ

میں نے مشرقی افریقہ میں مہتمم کوتوالی کی حیثیت سے کئی سال گذارے اور وہاں کے تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ جادو، ٹونے اور ٹوٹکے انسانی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اِس بیان کی تصدیق کریں گے جنھوں نے افریقہ کے سیاسی دفاتر یا کوتوالی میں کام کیا ہے یا صرف شکار کے شوق میں برازیل کی خاک چھانی ہے۔ آپ اپنی رائے قائم کرنے سے پہلے میری سرگذشت سن لیجئے تاکہ آپ کو صحیح نتیجے پر پہنچنے میں مدد مل سکے۔

برازیل کے علاقے میں اگوی نامی ایک نہایت بدمعاش قبیلہ کا جادوگر اور دولتمند سردار تھا۔ اس کے لڑکے نے ایک قتل کی ناکام کوشش کی میں اس کی گرفتاری کے لئے اگوی کے گھر گیا اور اس کو گرفتار کرلایا۔ اس وقت کی اگوی کی وہ ڈراؤنی شکل کبھی نہیں بھول سکتا جب اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے، منہ آسمان کی طرف کئے اور نہایت کریہہ صورت بنائے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی زبان میں مجھے بددعا دی۔ غالباً بددعا یہی تھی کہ اس دن سے مجھے آئندہ راحت نہ ملے۔ جو لفظاً بہ لفظاً پوری اتری۔

مقدمہ عدالت میں دائر ہوا اور عدم ثبوت میں خارج بھی ہوگیا لیکن اگوی کی بددعا میرے سر منڈلانے لگی اور شاید یہی اس کا پہلا اثر ہوا ایک صبح، جب کہ مقدمہ چل رہا تھا میں نے اپنی مسہری کے نیچے سے کپڑوں کا صندوق نکالنا چاہا۔ جوں ہی میں جھکا ایک بڑا کالا ناگ پھنکارتے ہوئے میرے پیروں میں سے ہوکر نکل گیا چونکہ کمرے کا دروازہ بند تھا وہ گھومنے لگا۔ میں فوراً مسہری پر ہوکر سرہانے سے ریوالور نکالا اور ناگ کو وہیں ختم کردیا۔ یہ پہلا واقعہ تھا میں نے اس کو اہمیت نہ دی۔

دوسرے دن میرا منشی بیمار ہوگیا اور دواخانہ چلا گیا۔ سال ختم ہو رہا تھا اور کام کی کثرت تھی اس کے کام کا بار بھی میرے سر پڑ گیا میں دن غروب ہونے تک کام کرتا اور رات میں بھی پانچ گھنٹے جاگتا۔ ایک رات چالانات جانچتے ہوئے مجھے چند مثلیں دیکھنی پڑیں میں نے لیمپ کی مدھم روشنی میں مثلوں کا بستہ اٹھایا۔ لیکن آپ میرے خوف کا اندازہ کرسکتے ہیں جب میں نے بستے کے پیچھے ایک زہر انداز اژدہا کو کنڈلی ڈالے محو خواب پایا۔ یہ اس علاقے میں بہت عام ہے اور اپنی نیند کی وجہ سے بھی مشہور ہے میں نہایت آہستگی کے ساتھ کمرے کے دروازے کے قریب آیا اور پہرا اسی کی رائفل لے کر اژدہا کو وہیں ہمیشہ کی نیند سلادیا۔

تین چار روز بعد ایک رات دفتر برخاست کرنے سے پہلے مجھے دستاویزات اور سرکاری رقوم کی جانچ کرنی تھی۔ میری عادت ہے کہ میں خزانوں یا کاغذ مہر کے صندوقوں کو اس وقت تک نہیں کھولتا جب تک کوئی شاہد موجود نہ ہو۔ اس لئے خزانہ دار کو بلایا اور خزانہ کی جانچ کرنی شروع کی لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ خزانہ خالی تھا اور مہریں اور قفلوں کی چٹھیاں بالکل اچھی حالت میں تھیں۔ میں نے خزانہ دار کو تاکید کردی کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرے اور دوبارہ مقفل کرکے ان پر حسب معمول چٹھیاں چسپاں کردیں گھر آکر واقعات کی کنہہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ رات بھیگتی جارہی تھی اور اگوی کی بددعا دیتی ہوئی بھیانک شکل میری نظروں میں پھر رہی تھی میں یقین کرتا جارہا تھا کہ یہ سب اسی جادو کے اثرات ہیں۔

اس کے دوسرے دن رات میں لباس تبدیل کرتے ہوئے میری نظر مچھردان کے پیچھے جا پڑی وہاں مجھے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔۔۔۔ میں بہت تھکا ہوا تھا کوئی توجہ نہ کرسکا لیکن جوں ہی میں نے مچھردان اٹھایا میرا خون جم گیا کیونکہ وہی سایہ مچھردان کا طواف کر رہا تھا۔ اسی وقت

پھر وہ ان پہاڑ ڈالا اور اس کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی اس خیال سے بنادی کہ اگر اس میں کوئی چیز ہو بھی تو اسی میں مقید ہے لیکن اس معاملے میں اتنی عجلت نہیں کی گئی جتنی ضروری تھی۔ سایہ موجود تھا وہ پھیلتا گیا' بدشکل ہوتا گیا اور اب کمرے کی دیواروں پر تیزی سے گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے روشندان کی جانب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لمپ کی مدھم روشنی میں ایک بڑا پتنگا لمپ کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو اگر پرندہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس پر گولی چلانا میری حماقت تھی اس لئے میں نے کرکٹ کے بلے سے پہلی ہی ضرب میں اس کا کام تمام کردیا۔

صبح گذشتہ واقعات سے گھبرایا ہوا یہ خیال دل میں لئے ہوئے دفتر پہنچا کہ ہر چیز کو ایک نظر دیکھوں گا دفتر کا معائنہ کرنے کے بعد معاً مجھے خیال ہوا کہ اس وحشت انگیزی میں میرے منشی کا ہاتھ تو کام نہیں کر رہا ہے!

دوران معائنہ میں بیس ہزار کارتوس میں سے پانچ ہزار غائب نظر آئے۔ حالانکہ قفلوں پر چٹھیاں بجنسہ موجود تھیں۔ یہ معاملہ نازک تھا کیونکہ تنہا میں ہی ان اشیاء کا ذمہ دار تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہر کارتوس ایک زندگی کو تباہ کرسکتا ہے۔ اور پانچ ہزار کارتوس کی گم شدگی پانچ ہزار جانوں کے اتلاف کے مرادف تھی۔

ایک روز فوج کو قواعد کراتے ہوئے فوجیوں کے گھروں کا جائزہ لینے لگا جو قریب ہی سامنے نظر آرہے تھے مجھے کارتوس کے دس ڈبے تین فوجیوں کے مکانوں کی چھت کے نیچے رکھے ہوئے نظر آئے۔ اور بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ اسی گم شدہ کا ایک حصہ ہیں دفتر میں آیا اور تینوں فوجیوں کو برطرف کردیا ان میں ایک کا کارنامہ ہی خراب تھا لیکن دو کو میں نیک کردار سمجھتا تھا۔ اس معاملے میں دوسرا قدم میں نے یہ اٹھایا کہ منشی کو دواخانے سے واپس بلوالیا یہ میرے مستقر سے نوے میل دور تھا۔ مہر اور خزانے وغیرہ کی کنجیاں اسی کے پاس رہتی تھیں کیونکہ اسی پر مجھے اعتبار تھا لیکن اب میں چاہتا تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو انھیں اپنے قبضہ میں کرلوں۔ باوجود اس کے احتجاج کے میں نے کنجیاں لے لیں وہ میرے راز کو سمجھ چکا تھا۔ اس لئے اس نے گم شدہ رقم میرے حوالے کی لیکن اس کے اسباب بتانے میں تجاہل سے کام لینے لگا اور آہ وزاری کے ساتھ معافی بھی چاہی لیکن اس کا جرم (سرکاری رقم غبن کرنا) قابل معافی نہ تھا۔ اتفاقاً ہم ایک سمجھوتہ پر پہنچ گئے اس نے میرے پیش کردہ اقرار نامے پر دستخط کردئے اور میں نے وعدہ کیا کہ اس کو قید خانے تک نہ جانے دوں گا چونکہ ایسے شخص کا وجود میرے لئے خطرناک تھا میں نے اس کو اپنے ناظم کی اجازت سے برطرف کردیا۔

کارتوس کی گم شدگی ابھی راز ہی میں رہی۔ اُن کے گم ہونے کے ایک ہفتہ بعد بھی میری خفیہ تلاش میں ناکام رہی۔ اس اثناء میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے مستقر سے دو سو میل کے فاصلے پر اطالوی شمالی لینڈ میں ہاتھی دانت کا کام کرنے والوں نے دو قتل کئے ہیں یہ میرا ہی علاقہ تھا اس لئے مجھے تحقیقات کے لئے وہاں جانا ضروری تھا۔ فوراً سامان سفر درست کیا گیا۔ چار عسکری ایک سارجنٹ جو نیزے سے مسلح تھا' چار ساربان اور آٹھ اونٹ جو بار برداری کے لئے تھے تین چھولداریاں پٹرول کے ڈبوں میں پانی بھر لیا گیا تھا ایک سپاہی تھا جس پر کارتوس کے ڈبے' کچھ بندوقیں اور بستر لادو ئیے گئے تھے۔ غرض یہ مختصر سا قافلہ صبح ہی روانہ کردیا گیا میں خود شام میں اپنے باورچی اور اردلی کے ساتھ موٹر میں نکلا۔ (۴۵) میل کا سفر طے کرنے کے بعد ایک ندی کے کنارے سڑک ختم ہوگئی اور جھاڑی شروع ہوئی۔ مجھے اپنی موٹر یہاں چھوڑ دینی پڑی۔ صبح کا قافلہ بھی یہاں پہنچ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ رات وہیں بسر ہوئی صبح کو ایک ملازم اور اردلی موٹر کی حفاظت کے لئے وہیں چھوڑ دئے گئے۔ ایک رائفل ایک بندوق اور کچھ کارتوس بھی رکھ چھوڑے کہ ان لوگوں کو ضرورت پر کام آسکیں۔ ایک ساربان بھی بیمار ہوگیا تھا۔ وہیں چھوڑ دیا گیا۔ باقی ہم سب جھاڑیوں کو طے کرنے کے لئے اپنی اپنی جان ہتیلی میں لئے آگے بڑھ گئے۔ تین دن تک متواتر چلتے رہے گرمی انتہائی شباب پر تھی اور میں "جھاڑیں جائیں

ایسے لیل و نہار" کا ورد کرنے پر مجبور تھا۔ یہی وہ جنگل ہے جہاں کے ارنے، گینڈے، چرخ، شیر، ببر اور سور وغیرہ اپنی خونخواری میں عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کے قبیلوں نے اپنے زہریلے تیروں کی بوچھار سے انھیں اور زیادہ ہراساں کر دیا ہے ان میں سے اکثر زخمی ہوئے لیکن کوئی مرنہ سکا ایک رات ساربان آگ کے قریب سو رہا تھا۔ کہ ایک چیتے نے غراتے ہوئے اس کے سوتی ہوئی حالت میں ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ لیکن ساربان نے بھی نہایت ہوشیاری کے ساتھ جرأت کر کے جلتی ہوئی لکڑی اس کے کھلے منہ میں ٹھونس دی، اس وقت یہ لکھتے ہوئے مجھے ہنسی آرہی ہے لیکن جس وقت واقعہ گذر رہا تھا میری روح تھرتھرا رہی تھی اور اس تخیل سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ساربان کی مرہم پٹی کر کے ہم آگے بڑھ گئے اور مقام واردات تک پہنچے، وہاں مجھے معلوم ہوا کہ اصلی مقام ابھی (۵۰) میل آگے ہے اور ایسے جنگل سے گذرنا ہے جہاں بیس بیس فٹ لانبی درختوں کی ڈالیاں دن میں بھی تاریکی چھا دیتی ہیں۔ میں وہاں کے باشندوں کی مدد سے منزل پر پہنچ کر قاتلوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ قتل ہماری حکومت کی سیاست سے تعلق رکھتے تھے اور اس وجہ سے اہم تھے ورنہ میں اور یہ طول طویل سفر، کوئی مناسبت نہ تھی۔

ہم واپس ہو رہے تھے کہ ایک ساربان کا پیر بُری طرح زخمی ہو گیا اس لئے اس کو ایک خچر پر لے لیا گیا۔ میں نے اپنی وزن دار رائفل بھی بوجھ سے بچنے کے لئے اس کے حوالے کی۔ حالانکہ بندوق کی جگہ شکاری کا کندھا ہے، مگر میں نے اس کے خلاف عمل کیا۔ دوسرے دن اثنائے سفر میں اپنے پیچھے چیخ پکار کی آوازیں سنیں خچر جس پر ساربان سوار تھا الف ہو گیا تھا، ساربان الگ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا میری رائفل کے دستے کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور اب ہم ارنے بھینسوں اور گینڈوں کے مقابلے کے نا قابل ہو گئے کیونکہ ان سے بچاؤ کے لئے یہی ایک اچھا ہتھیار تھا۔ اس غریب نے بہتیرے کوشش کی کہ اس کو بچائے لیکن خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ کیا بچا سکتا پھر بھی اس نے گائے کی آنتوں سے دستے کو باندھا مگر سب بے سود تھا اگر اب میں اس کو استعمال کرتا تو بجائے شکار کرنے رائفل کا شکار ہو جاتا۔

ہمارے قافلے میں اب صرف چار معمولی بندوقیں اور ایک نیزہ رہ گیا تھا اور دو قیدیوں کی حفاظت کرنی تھی یہ بھی گمان تھا کہ رہزنوں کا گروہ ہماری تاک میں ہے ہم اسی کی سلامتی دیکھ رہے تھے جس کے پاس رائفل یا بندوق تھی۔ راستہ دشوار گذار تھا، درختوں کی ڈالیاں سیدھا چلنے باز رکھتی تھیں اور ہم انھیں راستوں سے جانے پر مجبور تھے جو گینڈوں اور جرخوں نے بنایا تھا۔

ہماری بے بسی کے متعلق ابھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ گینڈے کی گرج دار آواز سنائی دی میں نے اپنے ہوش سنبھالے، سارجنٹ اور زخمی ساربان میرے قریب آگئے۔ میں نے ساربان سے اپنی رائفل، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر لے لی۔ ہماری اس بے سود تیاری کے فوراً ہی بعد ایک بہت بڑا گینڈا ہمارے مقابل اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلا آرہا تھا۔ اس نے ہم پر ایک غلط نظر ڈالی اور ڈکارنے لگا۔ اس کی آواز جوں جوں تیز تر ہوتی گئی ہمارے ہوش اڑتے گئے۔ لیکن میں نے اور ہمارے رہبر نے اتنا ضرور کر لیا کہ پچھلے آدمیوں کو ہوا کے رخ کھڑے رہنے کی ہدایت دے دی ساربانوں نے ہمارا مطلب سمجھ لیا اور اونٹ بھی خود بخود ہوا کا رخ لے کر جھاڑیوں میں دبکنے گئے ہم نے بھی اپنے بچاؤ کی تدبیریں کیں بندوقیں اور نیزے سنبھال لئے سارجنٹ نے اپنا نیزہ جھکا دیا اور میں بھی نشانہ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ گینڈا قریب سے قریب تر ہو رہا تھا اور اس وقت تک تمام اونٹ جان بچانے کی خاطر جھاڑی میں چھپ چکے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک انتظار کرنا پڑا مجھے تو یہ معلوم ہوا گویا آدھا گھنٹہ گذر چکا ہے لیکن انتظار کی گھڑیاں کٹھن ہوتی ہیں در اصل پانچ ہی منٹ مشکل سے گذرے تھے۔ خچر جھاڑی میں خود کر رہے تھے اور اونٹ بلبلا رہے تھے گینڈے نے ہمیں چھوڑ دیا اور اس آواز کا رخ کیا۔ اس کے پلٹتے ہی سارجنٹ نے نیزہ پھینکا اور میں نے لبلبی دبا دی۔ دانستہ یا نادانستہ۔ میں نہیں بتلا سکتا خوش قسمتی سے

گولی گینڈے کے سر میں لگی لیکن اس کو گرانا تو کجا روک بھی نہ سکی۔ وہ بڑھتا چلا گیا اس کی زد میں ایک اونٹ آگیا جو اس کے دھکے کی تاب نہ لاکر تڑپنے لگا میں نے اس کو اپنی گولی سے ہلاک کر دیا۔ گینڈا معلوم نہیں کدھر چل دیا اور ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ اور دو ایک معمولی حادثات کے بعد ندی پر پہنچ گئے۔ پہاڑوں پر بارش ہو رہی تھی ندی چڑھاؤ پر تھی اندھیرا چھا چکا تھا اور اس وقت دو سو گز چوڑا پاٹ عبور کرنا مصلحت کے خلاف تھا اور اس صورت میں جب کہ ندی پہاڑی ہو اور اس میں مگر مچھ کا بھی خوف ہو۔ میں نے کسی چیز کی پرواہ نہ کی اور خوش قسمتی سے ندی عبور کر لیا۔ میرے اردلی نے موٹر کے لمپوں کی تیز روشنی سے معلوم کر لیا کہ میں آرہا ہوں اس لئے وہ اور ملازم دونوں نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ایک خبر یہ بھی سنائی کہ جو ساربان یہاں چھوڑ دیا گیا تھا وہ شیروں کا لقمہ بن چکا ہے کیونکہ اس نے موٹر میں سونے سے انکار کر دیا تھا اور باہر آگ بھی نہیں روشن کی تھی۔

اردلی نے مجھے بتلایا کہ اس کے خون آلود کپڑے اور ہڈیاں ایک میل کے فاصلے پر پڑی ہوئی ملیں اس نے کپڑے یادگار کے طور پر ساتھ رکھ لئے۔ اس کا بیان تھا کہ ہماری عدم موجودگی میں شیر اور ہر رات بھر موٹر کا طواف کرتے رہتے تھے۔ ایک رات وہ بجائے موٹر میں سونے کے ایک بڑے درخت پر چڑھ گیا اور اس کی بو پاکر شیروں کا ایک غول تمام رات درخت کے نیچے گھومتا اور چھلانگیں مارتا رہا اور درخت پر چڑھنے کی بے سود کوشش بھی کیا اردلی نے شیر کی کھال کے شوق میں چھ شیر مارے تھے لیکن جو کارتوس میں یہاں چھوڑ گیا تھا ان میں صرف تین باقی رہ گئے تھے

میں نے گھر پہنچنے کے خیال سے اردلی اور باورچی کو تیار ہونے کا حکم دیا لیکن انھوں نے کہا کہ ایسے وقت جب بارش ہو رہی ہو ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو، نالے زوروں پر ہوں اور بھیانک رات ہو سفر خطرہ سے خالی نہیں ممکن ہے موٹر کہیں کیچڑ میں پھنس جائے یا رات کی تاریکی میں پتھروں وغیرہ سے ٹکرا جائے یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے میں نے اس کے تمام معقول اعتراضات کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا اور موٹر تیار کرا۔ اردلی باورچی اور ایک ساربان کو ساتھ لے موٹر کے تیز لمپ روشن کئے اور چل پڑا۔ بارہ میل کا سفر طے ہوا تھا کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی مجھے لمپوں کی تیز روشنی کے باوجود سڑک اور جنگل ایک معلوم ہو رہے تھے۔ موٹر کی رفتار باوجود تیز چلانے کے سست ہو رہی تھی۔ اردلی باہر کی ہر ایک چیز غور سے دیکھتا جا رہا تھا اس نے مجھے موٹر روکنے کے لئے کہا۔ میں نے اس کا کہنا سن تو لیا لیکن بہت دیر بعد۔ موٹر یکایک ایک نالے میں پھسل گئی اور پانی موٹر کے اطراف چکر کاٹنے لگا۔ میں نے ناامید ہو کر موٹر پیچھے لی جو خوش قسمتی سے کچھ پیچھے ہٹ آئی۔ اس کے بعد ایک دھماکہ ہوا اور پھر ایک کر...... کی ایک کرخت آواز، اور انجن ٹھنڈا ہو گیا، مجھے خیال ہوا کہ پچھلا پہیہ کسی پتھر یا پیڑ سے ٹکر گیا ہے جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ ایکسل بھی ٹوٹ گیا ہو کیونکہ موٹر ایک طرف کو بالکل جھک گئی تھی اور پانی کی وجہ سے میں کچھ تمیز کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ یہ تقریباً ڈھائی سو روپیہ کا نقصان تھا۔ ہم نے موٹر کو باہر لانے کی کوشش کی لیکن اس کو جگہ سے بھی نہ ہلا سکے۔ صبح ہوئی ہم ایک خاردار جھاڑی کے نیچے تھکے ماندے ٹھٹھرے ہوئے بیٹھے تھے میں نے اپنے اردلی کو لئے ہوئے پیدل ہی گھر کا رخ کیا اور ۲۳ میل کا سفر آٹھ گھنٹے میں طے کر کے ہم گھر پہنچ گئے۔ اسی وقت ایک دوست کی موٹر لے کر اپنی موٹر کے پاس آیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ نالے اتر گئے تھے۔ اور قافلہ بھی وہاں آکر ٹھیر گیا تھا۔ میں نے انجن پر سے بانٹ اٹھایا لیکن اٹھاتے ہی پھر چھوڑ دیا کیونکہ انجن میں پٹرول کے ڈبے پر ایک معمولی سانپ گھیرا ڈالے بیٹھا تھا اور اس کے وزن کی وجہ سے غالباً موٹر پھسلتے وقت ڈبہ ٹوٹ گیا اور چونکہ گاڑی پانی میں تھی اس لئے پٹرول وغیرہ کو کہیں آگ نہ لگ سکی۔ سانپ علحدہ کر کے مار ڈالا گیا اور موٹر درست کر کے لائی گئی۔

میرے استقبال کے لئے ایک نیا منشی آگیا تھا اس نے مقام خراب ہونے کی شکایت کی۔ چونکہ میں تھکا ماندہ تھا یہ شکایت مجھے ناگوار ہوئی۔ اگر ایسے نازوں کے پالے تھے تو ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی ملازمت بھی محکمہ پولیس میں! کہیں اور گئے ہوتے۔ میں نے اسے کہہ دیا

"اگر وہ کام کر سکتے ہیں تو کریں ورنہ ایک خط لکھ کر بڑھائے دیتا ہوں اور میں اپنا آپ انتظام کر لوں گا۔"

دوسرے دن حسب معمول میں فوج سے تو امد لینے میں مصروف تھا کہ میرے دوست جن کی موٹر میں کل ہی لے گیا تھا آئے اور مجھ سے پوچھا کہ ان کی موٹر کے انجن اور اس کے ڈھکن کے درمیاں کیا ہے۔ ابھی میں اس غیر متوقع اور اچانک سوال کے جواب پر غور ہی کر رہا تھا کہ وہ خود بول اٹھے کہ اس میں ایک زہر اگلنے والا کالا ناگ ہے۔ میں اس کو تمھیں بتلانے کے لئے یہاں تک لایا ہوں' میرے مکان کے آس پاس ہی سانپوں اور ناگوں کی کیا کمی تھی جو اس ایک کا مزید اضافہ کیا جارہا تھا۔ میں نے اپنی رائفل منگوائی اور شوفر سے بونٹ اٹھانے کو کہا۔ لیکن میرے دوست آڑے آئے اور کہا "کیا غضب کرتے ہو؟ میری گاڑی ستیاناس ہو جائے گی!" میں نے بھی وجہ معقول پائی اور پیچھے ہٹ کر سارجنٹ سے نیزہ لیا۔ بونٹ اٹھا کر دیکھا ایک بڑا کالا ناگ گھیرا ڈالے پڑا تھا۔ میں نے دور کھڑے ہو کر ناگ کے کچوکے دئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے جری ہو کر قریب سے نیزہ کا وار کیا۔ وہ تڑپ اٹھا اور پھنکارتا ہوا اپنا منہ کھولا اور زہر کی ایک دھار میری آنکھوں پر دے ماری۔ میں سب کچھ بھول گیا اور اب اپنی بصارت کو بچانے کے لئے طبی امداد طلب کی اور ایک دو آدمیوں کو دودھ لانے کے لئے دوڑایا۔ ڈاکٹر آکر علاج میں مصروف تھا اس کے آنے سے پہلے دودھ آچکا تھا لیکن بعد از وقت تھا میں اس وقت تو بالکل اندھا تھا۔ ناگ کا حشر تو مجھے معلوم نہیں البتہ مجھے دواخانے میں لایا گیا اب صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ کارتوسوں کا پتہ لیکن وہ لاپتہ تھے اور میں اس تکلیف کے باوجود بھی اسی دھن میں تھا۔ کافی احتیاط کے ساتھ علاج کے باوجود میری سیدھی آنکھ بصارت سے بالکل محروم ہو گئی۔ ناگ کے حملہ کرتے ہی اگر میری آنکھ دودھ سے دھلوا دی جاتی تو ممکن تھا کہ ضائع نہ ہوتی۔ دودھ اس زہر کے اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔

جب گھر واپس ہوا تو منشی ڈاک لئے کھڑا تھا۔ میں نے اسی سے تمام خطوط پڑھوائے اس میں ایک مراسلہ یہ بھی تھا کہ ایک مہینے کے اندر ہی اندر کارتوس کی چوری کی تحقیقات کے لئے کمیٹی کا انعقاد ہوگا۔ اور ایک مراسلہ یہ بھی تھا کہ میری لاپرواہی کی بنا پر مجھے گم شدہ کارتوس کی تین گنی تعداد داخل کرنی ہوگی دوران تحقیقات میں یہ بھی معلوم ہوا کہ پانچ سو کارتوس بغیر کسی کے صرفہ کا اندراج کئے ہوئے خرچ کردئے گئے ہیں۔

اگوری کی بددعا کے پورے ایک مہینے بعد مشاہدوں نے ثابت کر دیا کہ بددعا صرف ایک مہینے ہی تک محدود تھی۔ دوسرا مہینہ ان پریشانیوں کا معاوضہ تھا۔ سب گم شدہ کارتوس خفیہ طور پر سگریں کے دروازے پر لا کر رکھ دئے گئے تھے۔ پانچ سو کارتوس جو بغیر اندراج کے صرف ہوئے تھے دراصل ڈپو سے ہی روانہ نہیں کئے گئے تھے حالانکہ رسید میں اُن کا اندراج تھا۔ میرا جرمانہ بھی میری کارگذاریوں کے مدنظر معاف کر دیا گیا تھا۔ اور قاتلوں کی گرفتاری کی وجہ سے دو سو پونڈ کی رقم بھی انعام میں ملی تھی۔ تمام واقعات میں ایک لفظ بھی افسانہ نہیں ہے، میری اس طویل ملازمت میں صرف یہی ایک ایسا مہینہ تھا جو میرے لئے تباہ کن ثابت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی پُرسکون زندگی شروع ہو گئی اب اس کو جادو کا اثر سمجھیں یا محض واقعات' یہ قارئین کی مرضی پر منحصر ہے۔ (ماخوذ)

اکبر صدیقی

بکھرے ہوئے پھول

بُرے لوگوں کے ساتھ بُرا اور نیکوں کے ساتھ نیک سلوک کر۔ پھول کی جگہ پھول بن جا اور کانٹے کی جگہ کانٹا (سعدی)

دوست نما دشمن سے تو دشمن ہی ہزار درجہ بہتر ہے (فیثا غورث)

مالدار وہی ہے جس کا دل [redacted] کی دولت سے مالا مال ہو (پلوٹارک)

خواجہ حمید الدین

آپ کے تمام طباعتی ضروریات

یعنی

دفاتر کے فارمس، دعوتی رقعے، شادی کے کارڈس، رسالے، کتابیں وغیرہ

غرض

معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑا کام

حتی الامکان

پوری صحت کے ساتھ خاص توجہ سے نہایت عمدہ وعدہ پر

احمدیہ پریس

واقع چارمینار حیدرآباد دکن میں انجام پاتا ہے

تصدق حسین تاج ناشر و تاجر کتب و مالک احمدیہ پریس
چارمینار حیدرآباد دکن

سب رس

The Sabras

...



"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

۱۵ نظمیں
۷ غزلیں
۹ افسانے اور قصے
۱ ڈرامہ
۱۳ عام دلچسپی کے مضمون
۸ علمی اور تاریخی مضمون

صفحات تبصرہ کے ختم پر مہتمم سب رس کا اعلان ضرور دیکھئے

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیرِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

بہ اہتمام

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہوکر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب ازبس لے لو — مرغوب دلِ ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ سلسلۂ ادبیاتِ اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر۔	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وو حیہ یا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپے	۴۰ روپے	۱۵ روپے	۶ روپے
آدھا 〃	۳۰ 〃	۱۵ 〃	۱۰ 〃	۴ 〃
چوتھائی 〃	۱۵ 〃	۱۰ 〃	۴ 〃	۲ 〃

سب رس

جلد ۱ شمارہ ۴

اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

اداریہ

ماضی کے نقوش

اس شمارہ سے "سب رس" کے پہلے سال کی دوسری سہ ماہی شروع ہوتی ہے۔ گزشتہ تین مہینوں میں ہم نے جو کچھ کیا اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ ہم "مستقبل" کے متعلق کچھ کہنے کی بجائے اپنے "ماضی" پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالتے ہیں۔ اگر ہمارے "ماضی" کے نقوش اس قابل ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہمارے "مستقبل" کے متعلق خوش گوار رائے قائم کی جاسکتی ہو تو ہم سمجھیں گے، ہم نے اِن توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کی جو "سب رس" سے وابستہ کی گئی ہیں۔

"سب رس" کی تدریجی ترقی کے پیش نظر ہم اپنے عزم میں زیادہ گرم جوشی محسوس کر رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ اس کا "شش ماہی" شمارہ پیش کرتے ہوئے ہم زیادہ مسرت کے ساتھ اپنے لائحہ عمل کی تکمیل کا اعلان کریں گے۔

"سب رس" کے گزشتہ تین شماروں میں عام دلچسپی کے سنجیدہ مضامین نظم و نثر شائع ہوتے رہے۔ اور ان کی دلچسپی اور افادیت نے ہمیشہ خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بھی روز بروز ترقی پذیر رہی۔ فضا کی عدم مساعدت کے شکوہ کی فرسودگی میں اب کوئی لذت باقی نہیں رہی ہے اس لئے ہم رکاوٹوں اور اعتراضوں میں الجھ کر اپنے احساس خدمت کو مجروح کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اُن "معاونین" کی مخلصانہ اعانتوں کو بھول جانا ہماری فطرت کے بالکل منافی ہے، جن کا "سب رس" کی ترقی میں بڑا حصہ ہے۔ ہم ان تمام کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی پُرخلوص رہنمائی نے ہماری "لغزش" کو "جادہ پیمائی" میں بدل دیا ہے۔ ہمارے سامنے "خدمتِ ادب" کی ایک طویل راہ ہے اور ہم اپنے قدم میں آگے بڑھنے کی ایک اضطراری قوت پا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے وسیع تجربوں سے مستفید کر کے ہمیں "صحافت" کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔ اور اس کام میں جس کا آغاز "امید و بیم" کی کشمکش میں ہوا تھا ہم ایک "لذت کاوش" پا رہے ہیں۔

ہم "سب رس" کے ذریعے اپنی "صلاحیت کار" اور "ذوق نمو" کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس "شوق بے پایاں" میں اتنا کر جائیں کہ ایک دن فخر کے ساتھ کہہ سکیں ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم! شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر پیام اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں سے ہیں۔ ان کی تصانیف "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" نے دلآویز طرز نگارش اور نفسیاتی خد و خال کے باعث ہندوستان گیر مقبولیت حاصل کی۔ ان کا ڈرامہ "انتقام" جو اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے بہت دلچسپ ہے۔ امید کہ ہم وقتاً فوقتاً دلچسپ ڈرامے شائع کرتے رہیں گے۔ یہ حقیقت اب کوئی راز نہیں رہی ہے کہ حیدرآباد کی نوجوان نسل نے اردو ڈرامہ کو ترقی دینے میں جو مخلصانہ کوشش کی ہے، وہ اس قدر منظم اور وسیع پیمانے سے کسی جگہ نہیں کی گئی۔ انھوں نے اب تک کئی بلند پایہ ڈرامے لکھے جن میں سے، زندگی، زمانہ، مالن، کالج کے دن، مستقبل، حشرات الارض، ظاہر باطن، غلط در غلط، نئی روشنی، فریب تخیل، ریہرسل، اردو کا گھمنڈ، ہوش کے ناخن، او ڈاکٹر، مغالطہ، غلط فہمی، ہوش ربا، طبیب حاذق اور مرشد اسٹیج ہو چکے ہیں۔ چند ڈرامے طبع بھی ہو چکے ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ان تمام کو شائع کر دیا جائے۔ ہم تمثیلی انجمنوں کو جن کی سرگرمیوں سے اردو ڈرامہ کی فن کارانہ ترقی میں بڑی مدد مل رہی ہے اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔

اردو میں مزاح نگاروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ان اصحاب کی تعداد بہت کم ہے جو مزاح نگاری کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بھی ان گنے چنے مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کے مذاق میں ایک سنجیدگی اور جن کی تحریر میں ایک تبسم آفریں متانت ہوتی ہے۔ ہم نے گزشتہ نمبر میں "جھٹکہ" اور "بندر بھبکی" شائع کئے تھے جو ملک کے سنجیدہ طبقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ امید ہے کہ "یا باغ" بھی شوق سے پڑھا جائے گا۔

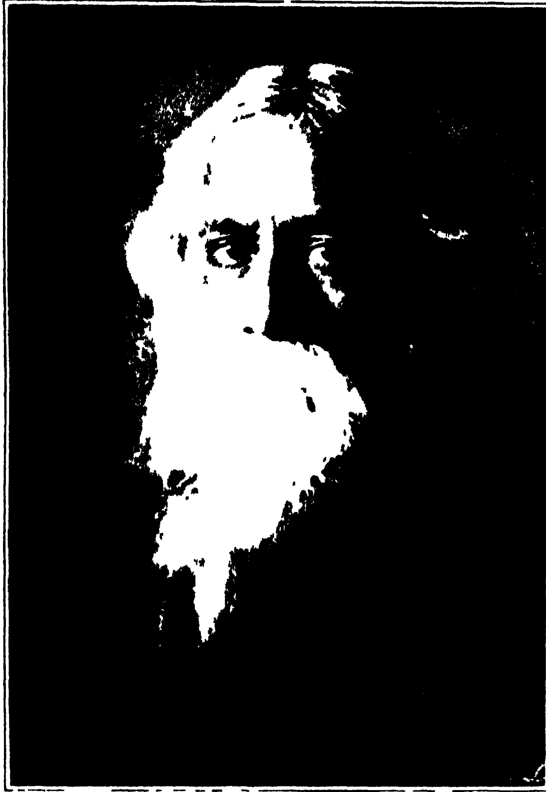
نذر ولی "ادارۂ ادبیات اردو" نے حال ہی میں ایک دیدہ زیب اور باصرہ نواز کتاب "نذر ولی" کے نام سے شائع کی ہے اور اس طرح اپنی اس کمی کی تلافی کر دی ہے جو اس کے دائرۂ عمل میں خواتین کی عدم شرکت کے باعث رہ گئی تھی۔ ہمیں آرزو تھی کہ "ادارہ" خواتین کی تصانیف اور ان کے مضامین کے مجموعوں کو اسی طرح شائع کرے جس طرح طلبہ کے نتائج علم کو شائع کیا گیا ہے۔ "ادارہ" کی یہ پہلی کوشش یقیناً قابل مبارکباد اور ہماری توقع کے مطابق ایک یقین آفریں ابتدا ہے "نذر ولی" میں حضرت ولی اورنگ آبادی سے متعلق ہماری جامعہ کی چار طیلسانی خواتین کے سلیس، شگفتہ اور معلومات آفریں مضامین ہیں جو ڈاکٹر زور کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ کی علمی و ادبی خدمتوں سے "سب رس" کے ناظرین ناواقف نہیں ہیں۔ ان دونوں کے مضامین میں ایک حلاوت اور کشش ہوتی ہے محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے غالباً پہلی دفعہ ادبی میدان میں قدم رکھا ہے لیکن اس مضبوطی کے ساتھ رکھا ہے کہ "نقش ثانی" کے متعلق ہمیں بہتری کی بشارت مل رہی ہے۔

یہ چاروں مضامین اگرچہ طویل ہیں تاہم ان کی دلچسپی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہم نے ان کو نہایت شوق و انہماک سے پڑھا اور ہمیں خوشی ہوئی کہ مادر جامعہ کی فیض یافتہ بہنیں، ہمارے اہل قلم برادران جامعہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جس طرح عثمانی نوجوانوں نے ملک کے نوجوانوں میں حرکت و حیات کی ایک لہر دوڑائی ہے وہ دن دور نہیں جب کہ عثمانی خواتین بھی، صنف نازک میں ایک جذبۂ عمل پیدا کر دیں گی۔

ہولی گذشتہ مہینے میں ملک کی دونوں بڑی قومیں مصروف رہیں۔ مسلمانوں نے معمول کے مطابق "واقعہ کربلا" کی یاد منائی۔ "سب رس" نے بھی ایک خاص نمبر کے ذریعے اس تاریخی واقعہ کی یاد میں حصہ لیا۔ ہندوؤں کی عید "ہولی" بھی اسی مہینہ میں ہوئی۔ "ہولی" کی مذہبی وجہ خواہ کچھ ہو لیکن اس کی سماجی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موسم گرما کی آمد کا اعلان ایک دوسرے پر رنگ ڈال کر کیا جاتا ہے اور اس طرح "دعوت آب و ہوا" کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہولی کی محفلیں ثقہ لوگوں میں بہت کیف آفریں ہوتی ہیں، اسی کیف آفرینی کے باعث اس نے موسیقی میں اپنی ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے۔ الغرض "ہولی" کو "جنت نظر" اور "فردوس گوش" بنایا جاتا ہے۔ ہم کسی آئندہ موقع پر "ہولی نمبر" کے ذریعے ہولی کے متعلق ناظرین "سب رس" تک معلومات پہونچانے کی کوشش کریں گے۔

میکش

ہندستان کا مشہور آفاق شاعر



ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

یہ تصویر خود شاعر نے ادارۂ ادبیات اردو کی کتاب
"ٹیگور اور ان کی شاعری" کے لئے روانہ کی تھی۔

پیارے وطن کی جے ہو!

یہ نظم دکن کے ماضی و حال کا ایک بہترین مرقع ہے، جناب وجؔد نے سیتاپور (یو پی) سے بھجوائی ہے، جہاں وہ ایک سال کے لئے سول سروس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں مقیم ہیں۔ دکن کی تہذیب و تمدن اور اس کی صحیح عظمت کا تذکرہ اس کمال کے ساتھ شاید ہی کوئی اتنے مختصر الفاظ میں بیان کرسکے۔

"سب رس"

ہندو پجاریوں نے جس کو گلے لگایا — بدھ بھکشوؤں نے جس کو اپنا وطن بنایا
حصے میں جس کے گنجِ بندہؒ نواز آیا — تغلق نے جس کی خاطر اپنا چمن لٹایا

(حضرت خواجہ بندہ نواز — سلطان محمد تغلق)

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

خلجی نے جس کے صدقے میں راج پاٹ پایا — شاہ قلی نے جس پر اپنا مکاں بسایا

(سلطان علاء الدین خلجی — سلطان قلی قطب شاہ)

مغلوں نے جس زمیں پر برسوں لہو بہایا — رعنائیوں نے جس کی آصفؒ کا دل لبھایا

(حضرت آصف جاہ اوّل)

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

ہیروں سے جس کے تختِ طاؤس جگمگایا — دستِ فنا سے جس نے اقوام کو چھڑایا
جس ملک نے عروسِ تہذیب کو سجایا — اردو زباں کو جس نے جینے کا گر سکھایا

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

قدرت نے جس کو علم و فضل و ہنر دیا تھا — جوشِ عمل دیا تھا، ذوقِ نظر دیا تھا
حیران تھا زمانہ وہ کر و فر دیا تھا! — فطرت نے جس کی شب کو حسنِ سحر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

جس کو جگت گرو نے نورس ثمر دیا تھا   گاواں نے نذر اپنا خونِ جگر دیا تھا
سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی   خواجہ محمود گاواں (بیدر)

عنبر نے جس پہ سب کچھ قربان کر دیا تھا   لاری نے جس کا دامن کشتوں سے بھر دیا تھا
ملک عنبر نظام شاہی   عبدالرزاق لاری (گولکنڈہ)

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

ہر پوت رام جس کا، ہر کنیا پدمنی ہے   عصمت کی ہے یہ دیوی، وہ بات کا دھنی ہے
ماضی و حال جس کا سو بار دیدنی ہے   بگڑی جہاں ہمیشہ اقوام کی بنی ہے

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

قندیل جستجو پھر سینوں میں جل رہی ہے   پیغامِ امن پہنچا حالت سنبھل رہی ہے
رسمِ کہن کی بیڑی آخر پگھل رہی ہے   اب نخلِ آرزو کی جو شاخ پھل رہی ہے

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

ہر موج زندگی کی، پھاوں اچھل رہی ہے   دنیائے رنگ و بو کی رنگت بدل رہی ہے
بھیگے گلوں کی نکہت پنکھے سے جھل رہی ہے   جس باغ میں شمیم الفت مچل رہی ہے

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

صدیوں جہاں فروزاں شمعِ عمل رہی ہے   انسانیت جہاں پھر سانچے میں ڈھل رہی ہے
جو سرزمین لعل و گوہر اگل رہی ہے   اک مرد قوم جس کی گودی میں پل رہی ہے

میرا وطن وہی ہے، پیارے وطن کی جے ہو!

میر سکندر علی وجد (بی، اے ایچ سی ایس)

انتقام

تین منظر

تمہید

سید محمود صاحب کا خاندان شہر کا بہت قدیم اور شریف خاندان تھا۔ اس جیسا صحیح النسب سیدوں کا خاندان دُور دُور کوئی نہ سمجھا جاتا تھا۔ بہادر شاہ اول کے زمانہ تک سید محمد صاحب کے آبا و اجداد مغلیہ سلطنت کے معزز جاگیردار اور منصب دار تھے مگر غدر کے ہنگامے میں ان کی ثروت برباد ہو گئی۔ پھر بھی وہ کافی خوش حال تھے۔

زمانے کے انقلابات اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات نے رفتہ رفتہ اس خاندان کی نئی نسلوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ سید محمد اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی ماں بہت ہوش مند اور زمانہ شناس بی بی تھیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد جب ان کا بچہ بہت کم عمر تھا انھوں نے اس کی تعلیم و تربیت پر اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔

میاں "سیدو" فطرتاً لاابالی مزاج رکھتے تھے۔ جب تک ماں کے قبضے میں رہے، انگریزی تعلیم بھی پائی، مذہبی تربیت بھی حاصل کی اپنی جاگیر کا انتظام کرنا بھی سیکھا، لیکن ابھی ان کی عمر میں، اکیس سال ہی کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ رکھ رکھاؤ کی زنجیریں ٹوٹ گئیں، طبیعت نے اپنا راستہ نکالا، چنانچہ سیدو میاں اپنے عالی شان مکانات میں تالے ڈال کر ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دنیا کی سیر کرنے نکلے تو ایسے نکلے کہ ۲۰ سال تک پتہ ہی نہ چلا کہ کدھر گئے اور کہاں ہیں! اب جو ۲۰ برس بعد ڈھلتی عمر میں وطن واپس آئے تو ایک عورت بھی ساتھ لائے۔ عام طور پر مشہور یہ تھا کہ کوئی "باہر والی" ہے اور ان کے خاندان والے تو دبی زبان سے یہ بھی کہتے تھے کہ وہ "نکاحی" بھی نہیں بلکہ محض "داشتہ" ہے۔ بہرحال یہ تو واقعہ ہے کہ خاندان کی غیرت مند سیدانیوں نے اس "غیر کفو" کو منہ نہ لگایا، منہ لگانا تو کجا اس گھر کی دیواروں کے سایہ کو بھی ناپاک سمجھا، خاندان کے خاندان نے منہ موڑ لیا، سیدو میاں کی بیوی کا منہ دیکھنا کسی کو گوارا نہ تھا۔ مگر ان حضرت کی طبیعت، خاندان اور رشتہ داری اور کفو کی پابندیوں سے کچھ اس قدر آزاد تھی کہ وہ "ان قدیم احمقوں" کی حماقتوں پر بیٹھے ہوئے ہنسا کرتے تھے جو کوئی خاندان والا ملتا تھا وہ کہہ دیتے تھے کہ اچھا بھائی، اچھا! تم روٹھے ہم چھوٹے! خاندان کے بعض مرد البتہ ان سے عزیزانہ اور نیاز مندانہ ملتے رہتے تھے، زیادہ تر اس لئے کہ سارے خاندان میں سب سے زیادہ خوش حال یہی تھے اور ضرورت مند عزیزوں کے ساتھ سلوک بھی کرتے تھے۔ پھر بھی ان اہل غرض کے قلوب بھی تعصبات سے پاک نہ تھے۔ چنانچہ جب سیدو میاں کے یہاں پہلوٹی لڑکی پیدا ہوئی تب بھی خاندانی حیثیت سے کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ تو مبارک باد دینے آیا اور نہ کسی نے پیدائش کی تقاریب میں شرکت کی، البتہ ان کے والد کے ایک پرانے دوست میر امانت علی ہر حال میں شریک رہتے تھے۔ یہ میر صاحب تھے تو بہت پرانی وضع قطع کے آدمی لیکن ان کو سیدو میاں کے خیالات سے بڑی حد تک اتفاق تھا۔ اپنے دوست کے بیٹے سے وہ نہ صرف وضعداری نباہتے تھے بلکہ بڑے میاں خود بھی باوجود بہت قدیم ہونے کے نہ جانے کس طرح جدید خیالات سے بھی متاثر ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی کا فلسفہ تقریباً وہی تھا جو سیدو میاں کا۔ بادی النظر میں یہ دونوں ایک ہی زندگی کی مختلف منزلوں پر تھے۔

نومبر ۱۹۴۳ء میں دفعتاً سید محمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور اب ان کی بیوہ (جس کو اہل خاندان نے کبھی ان کی بیوی مانا ہی نہ تھا) بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئی۔ سوائے ایک میر امانت علی کے جو اب بھی نہ صرف اپنی وضع داری نباہتے تھے بلکہ ہر موقعہ پر ماں اور بیٹی کا ساتھ دیتے اور خاندان والوں کے حملہ سے ان کو بچاتے۔ میر صاحب کا ذاتی وقار بھی کچھ ایسا تھا کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ ماں بیٹی کو ستائے یا میر صاحب سے آنکھ ملا کر مقابلہ میں آئے!

میر صاحب نے اپنی نگرانی میں "عطیہ" کی تعلیم جاری رکھی اور اُن ہی کے مشورہ سے عطیہ کی ماں لطیفہ بیگم دنیا داری کے تمام کام انجام دیتی تھیں۔ باپ کو مرے دو سال ہوگئے۔ عطیہ کی عمر ۱۹ سال ہے۔ میر صاحب اور لطیفہ بیگم اس فکر میں ہیں کہ عطیہ کے لئے کوئی اچھا شوہر تلاش کیا جائے۔

افراد

میر امانت علی	لطیفہ بیگم اور عطیہ کے سرپرست۔
لطیفہ بیگم	سید محمد صاحب کی بیوہ۔
عطیہ	سید میاں اور لطیفہ بیگم کی اکلوتی لڑکی۔
ناصر	سید محمد صاحب کا بھانجا۔ کالج میں تعلیم پا رہا ہے اور ابتدائی زمانے میں عطیہ کا ہم سبق بھی رہا ہے۔ عمر ۱۹ سال۔
ڈاکٹر رضا	شہر کے ایک معزز ڈاکٹر جس سے عطیہ کی شادی ہوئی۔ تہذیب جدیدہ کے دلدادہ ہیں۔ عمر ۴۰ سال۔
ریحانہ	ڈاکٹر رضا کی بیٹی پہلی بیوی سے۔
نازو	ڈاکٹر رضا کے گھر کی ماما۔

منظر اول

(لطیفہ بیگم کا مکان۔ ایک انگریزی وضع کے دالان میں چوکی کے فرش پر لطیفہ بیگم بیٹھی ہوئی ہیں، کچھ کپڑا سامنے پھیلا ہوا ہے، جس کو وہ قینچی سے قطع کر رہی ہیں، سینے کی مشین پاس رکھی ہے، میر امانت علی لطیفہ بیگم کی چوکی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔)

لطیفہ۔ جی ہاں! تو پھر کیا کہا انھوں نے؟

میر صاحب۔ کہا کیا! وہی جک مار رہے جو ہمیشہ مارتے ہیں! کہنے لگے کہ عطیہ بہت معقول لڑکی ہے مگر میرے گھر میں تو غیرت کا سوال اُٹھتا ہے۔ اور اس کا کوئی جواب نہیں۔ میں نے کہا، مرد خدا! نسل اور خون کے امتیازات کو اسلام نے مٹا ڈالا، بت پرستی کا خاتمہ کر دیا، لیکن تم لوگ ہو کہ ابھی تک نسل و خون کے بت کو پوجے جاتے ہو!

ایسا ہی ہے تو جاہلیت کے سارے قدیم بتوں کو اپنے گھر کے طاقوں میں بٹھا لو! کہنے لگے، میر صاحب! آپ تو لڑتے ہیں، میں نے کہا، میں لڑتا نہیں ہوں، تم لوگوں کے کان کھینچتا ہوں!

غرض ایسی ہی واہیات باتیں کرتے رہے۔

لطیفہ۔ میر صاحب! اس خاندان کی طرف تو اب خیال ہی کرنا فضول ہے، اور پھر اگر آپ نے کہہ سن کر راضی بھی کیا تو کیا؟ عطیہ کی عزت نفس کو کتنا صدمہ پہنچے گا جب وہ یہ محسوس کرے گی کہ اس کو زبردستی کسی لڑکے کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ میر صاحب! آپ تو عمر بھر از وہ لج کی زنجیروں سے آزاد رہے، آپ شاید......

میر صاحب جی نہیں نہیں! یہ تو سچ ہے کہ بیاہ میں نے نہیں کیا۔

جسے کہتے ہیں گھر آباد کرنا! مگر دنیا میں تو میں اس طرح رہا کہ میرے آنکھ کان کھلے رہے! جانتا ہوں آپ کیا کہنے والی ہیں۔ آپ یہی تو کہیں گی کہ میں عورت کی نفسیات سے واقف نہیں! جی نہیں! جی نہیں! ایسا نہیں! کچھ تو میں بھی سمجھتا ہوں!

لطیفہ۔ بات یہ ہے، میر صاحب! کہ بازاری اصطلاحوں میں جس چیز کو عورت کی شرم و حیا کہتے ہیں وہ درحقیقت عزت نفس کا ایک جذبہ ہے عورت اس لئے کسی مرد کے ساتھ اظہار محبت سے باز نہیں رہتی کہ وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتی یا شرماتی ہے، نہیں صاحب، نہیں! اصل یہ ہے کہ عورت کسی مرد کی طرف جھکنا اس لئے گوارا نہیں کرتی ہے کہ وہ ایسا کرنا اپنی جنسیت کے وقار منافی سمجھتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے، کہ وہ مطلوب ہو سکتی ہے، طالب نہیں ہو سکتی!۔ اور یہ اس کی فطرت ہے!

میرا تو اب یہ خیال ہے کہ اس نک چڑھے خاندان سے قطع نظر ہی کیجئے وہ ساتویں آسمان پر رہنے والا ملکوتی خاندان ہے اور میں غریب، ناپاک زمین پر رہنے والی ایک ناپاک اور ذلیل عورت ہوں ــ بازاری! سنا میر صاحب! بازاری! اس لئے کہ میرے پاس کوئی شجرۂ نسب موجود نہیں! کوئی نسب نامہ نہیں جو قرن در قرن اور صدی در صدی تیرہ سو برس ادہر کسی پیغمبر کے خاندان سے ملایا جا سکے!

میر صاحب۔ سچ کہا تم نے! ہم زمین والے، زمین ہی کی باتیں کریں، آسمان تک کیوں جائیں۔ لطیفہ! میں تم سے کہتا ہوں، یہ غرور ایک دن بری طرح ٹوٹے گا، بڑے بڑے سرافراز لوگ سر ٹوٹ رہے ہیں! اندھے دیکھتے نہیں، دنیا میں ہو کیا رہا ہے مٹکے کی مینڈکیں! لکیر پیٹے چلے جاتے ہیں! ایک طرف تو دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا مذہب دنیا کی تمام ضرورتوں پر حاوی ہے اور دوسری طرف خود کولہو کے بیل بنے ہوئے ایک کیل کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ نہ ادہر قدم بڑھتا ہے اور نہ ادھر!

لطیفہ۔ اچھا تو پھر ناصر کے لئے بھی دروازے بند ہونے چاہئیں کل کو عطیہ اور ناصر کے دلوں میں اگر کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے۔ جو نہ ہونا چاہیئے تو دقتیں پیدا ہوں گی۔ سنتی ہوں کہ ناصر کی والدہ تو کئی مرتبہ فرما چکی ہیں کہ ان دونوں کی دوستی کے پیچھے لطیفہ کچھ اور ہی فکریں کر رہی ہے!

میر صاحب۔ کیسے دیکھئے کیسے دیکھئے غریب عطیہ کا تو بچپن کا دوست ہے ساتھ کا کھیلا ہوا، دونوں کا ایک دوسرے سے دل بہلتا ہے، ہم کیوں دروازے بند کریں، عطیہ کی تربیت ماشاءاللہ خود ایسی ہے کہ وہ ناصر کو بھی پیش قدمی نہ کرنے دے گی اور اول تو مجھے اس کے کوئی آثار بھی معلوم نہیں ہوتے۔

لطیفہ۔ مگر ناصر کی اماں ....

میر صاحب۔ ناصر کی اماں! نکتہ چینی، عیب پروری، بہتان، بغض اور جہالت کی اماں! ان کے لئے وہ دروازہ کھلا بھی ہوتا تو ہم بند کر دیتے! ہماری زندگی میں یہ گنتی کی گانٹھیں ہیں جن میں رس نہیں! رہا عطیہ کا معاملہ، سو وہ تو لڑکی ہی کچھ اور ہے۔ خواہش بھی ہو تو وہ دھوکہ نہ کھائے گی، ناصر میاں کی کوششیں ایسی ہیں جیسے پانی اور اس میں عطیہ کا عکس! نظر آئے گا مگر بھیگے گا نہیں! اچھا تھا یا برا، ہمارا تمہارا وہ زمانہ تو گزر گیا جب کبوتروں کے جوڑے بنا بنا کر ماں باپ کابکوں میں بند کر دیا کرتے تھے! گودڑ بھری ہوئی گڑیوں کی طرح۔ چچا کی بیٹی، تایا کے بیٹے کو اور تایا کا نواسا، چچی کی بھتیجی کے لئے! ماموں کے چچا کے سمدھی کے بھتیجے کا چھوٹے تایا کی خالہ کے پوتے کے ساتھ نکاح ہوا اور کابک میں بند! اب جو یہ بوڑھیاں اور بوڑھے چاہیں کہ وہی کبوتر کے سے جوڑے لگایا کریں تو یہ ممکن نہیں! کبوتر کے جوڑے ....

(دفعتاً عطیہ داخل ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ ہے

عطیہ۔ کبوتر کا جوڑا؟ دادا! کیا کہا آپ نے؟ کوئی اچھا جوڑا ہو تو منگا دیجئے نا! کل ہی تو میرے شیرازی جوڑے کی کبوتری مر گئی

مجھے دادا! ضرور ضرور منگوا دیجیے!

میر صاحب۔ بیوقوف چھوکری! کیا ناصر ٹینس کھیلنے آیا ہے؟

عطیہ۔ جی ہاں! دادا۔ ہم آج پیچ کھیل رہے ہیں.....
مگر وہ کبوتر کا جوڑا؟

میر صاحب۔ عجیب لڑکی ہے تمھاری۔ لطیفہ بیگم! ماشاءاللہ اتنی بڑی ہوگئی اور باتیں کرتی ہے بچوں کی سی!

لطیفہ۔ جا بیٹی! جا! دن ڈھل رہا ہے، پھر ٹینس کا وقت ہی کیا رہے گا۔

(عطیہ جاتی ہے، مگر جاتے جاتے کہتی ہے۔ دادا! کبوتر کا جوڑا منگا لیجیے ضرور ضرور، ہاں؟)

میر صاحب۔ (کچھ سوچتے ہوئے۔ کمان کی طرح خدا کھینچتا ہے اپنی طرف مگر پھینکتا دور ہے۔ اوس کا کھینچنا ہی پھینکنے کی تمہید ہو۔ کمان کی طرح..... کس کو معلوم کہ تیر کتنی دور جائے گا.... بازو والا ہی اپنے بازو کی قوت جانتا ہے!)
آؤ! لطیفہ تھوڑی دیر ان بچوں کا کھیل دیکھیں۔

دوسرا منظر

(شب کے وقت عطیہ اور ناصر بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے ہیں)

عطیہ۔ ایک چال زیادہ چل گئے تم، ورنہ مار لیا تھا میں نے فرضی!

ناصر۔ گن لو! گن لو! میں تو ایک چال کم چل کر مات دینے والا ہوں! جی!

عطیہ۔ جی ہاں! آپ ہیں بھی ایسے ہی شاطر! لیجیے! (ایک مہرہ بڑھاتی ہے!)
ہے کچھ جواب اس چال کا؟

ناصر۔ (ایک مہرہ بڑھا کر) اور ہے کچھ جواب اس چال کا؟

عطیہ۔ (پھر ایک مہرہ بڑھا کر) اور ہے کچھ جواب اس چال کا؟

ناصر۔ (مہرہ بڑھاتے بڑھاتے رک جاتا ہے) ہاں! تو یہ چال ہے آپ کی! جی؟

عطیہ۔ خاک بھی نہیں سمجھے! وہ چال ہی کیا جو سمجھ میں آجائے۔

ناصر۔ اور پھر عورت کی چال!

(عطیہ بساط سے نظر اٹھا کر بغور ناصر کا چہرہ دیکھتی ہے۔ ناصر آنکھیں جھکائے ہوئے ہے)

ناصر۔ (ایک مہرہ اٹھا کر) لیجیے، یہ چلا میں!

(عطیہ خاموش اور کھوئی ہوئی۔ بساط سے اس کی توجہ ہٹ گئی ہے)

ناصر۔ کیا تم چال نہ چلوگی؟ سوچ کیا رہی ہو؟

عطیہ۔ (چونک کر) کیا میں؟ کچھ بھی نہیں!

ناصر۔ تو پھر چلیے چال؟ چلیے نا!

عطیہ۔ (نظر نیچی کئے ہوئے) یہ کیا کہا تھا تم نے، عورت کی چال؟

ناصر۔ اوہو! آپ اس سوچ میں ہیں، میں نے جو مذاقاً ایک کہہ دیا۔

عطیہ۔ سنجیدگی یا شدت اور سختی کے ساتھ جو بات کہی جائے وہ اس قدر مجروح نہیں کرتی جس قدر کہ وہ توہین جو مسکراتے ہوئے طنزاً اور ہنستے ہوئے مزاح کے ساتھ کی جائے۔ تم جانتے کیا ہو؟ عورت کے متعلق؟ تم جانتے کیا ہو؟ عورت کی چال کے متعلق؟

ناصر۔ کیوں؟ کیوں نہیں جانتا میں، عورت کی نفسیات پر کوئی پچاس کتابیں تو پڑھ چکا ہوں! اور وہ میرا مضمون یاد نہیں جو رسالۂ تہذیب جدید میں نکلا تھا؟

عطیہ۔ (کاوش کے ساتھ) کتابوں میں عورت کی فطرت کا مطالعہ کرنے والا، اور مضمون لکھنے والا گدھا! مرد!

ناصر۔ واہ عطیہ! واہ! یہ گدھوں کی نئی قسم بتائی تم نے۔ کتابیں پڑھتے ہیں مضمون لکھتے ہیں، اور شاید ٹینس اور شطرنج بھی کھیلتے ہیں!

عطیہ۔ بکو نہیں، بکو نہیں، وہ چال چلو! چلو چال۔

ناصر۔ بھئی اب چال وال کو رہنے دو، برابر اٹھاؤ بازی۔

عطیہ۔ بازی تو برابر نہ اٹھے گی، ہار تمھاری ہو گی۔

ناصر۔ بازی تو برابر ہی اٹھے گی، دیکھنا تم!

عطیہ۔ دیکھنا!

ناصر۔ دیکھنا!

عطیہ۔ شرط ہے؟

ناصر۔ شرط ہے۔

عطیہ۔ لاؤ ہاتھ!

ناصر۔ لاؤ ہاتھ!

(ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں، اور اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ لئے ٹہلنے لگتے ہیں)

ناصر۔ (عطیہ کے ہاتھ کو دبا کر) اور جو میں جیت گیا عطیہ؟

عطیہ۔ اور جو میں جیت گئی ناصر؟

ناصر۔ جس کی قسمت زور کرے۔

عطیہ۔ قسمت کا کھیل نہیں ہے، ناصر! ہمت کا کھیل ہے!

ناصر۔ آج تو کچھ معمے بول رہی ہو تم؟

عطیہ۔ ساری زندگی ایک معمہ ہے۔ خصوصاً عورت کی زندگی۔

ناصر۔ اور مرد کی زندگی!

عطیہ۔ دھول سے بھری ہوئی ایک گٹھری۔ ایک ٹھیلیا ہے گناہوں کا اور فریب کا۔

ناصر۔ (متعجب ہوکر) کیا کہہ رہی ہو! کیا کہہ رہی ہو! میری طرف تو دیکھو۔

عطیہ۔ لو دیکھا! (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) لو دیکھا! تمھیں کیا نظر آئے گا۔ میری آنکھوں میں۔ مگر میں تمھاری آنکھوں کو اس طرح پڑھ رہی ہوں جیسے کھلی ہوئی کتاب کو!

ناصر۔ بتاؤ! میری آنکھوں میں تم نے کیا دیکھا؟

عطیہ۔ بتاؤں؟ بتاؤں؟ میں تمھاری آنکھوں میں ایک چمک دیکھتی ہوں، جذبۂ طلب کی۔ ایک بے چین جذبۂ طلب۔ ایک وہ خواہش جو بچہ کے دل میں تازہ مٹھائی کے بھرے ہوئے تھال دیکھ کر پیدا ہوتی ہے!

ناصر۔ نہیں عطیہ! نہیں! تم ظلم کر رہی ہو میری طلب اتنی ادنیٰ نہیں، وہ کچھ اور ہے۔ زیادہ بلند، زیادہ صاف، زیادہ پاکیزہ۔ میری آنکھوں میں اس چراغ کا نور ہے جو میرے دل میں روشن ہے!

عطیہ۔ چراغ تاریکی کو کہا جاتا ہے، مگر پھر کاجل کی صورت میں تھوکتا ہے!

(ناصر ایک جوش اور ہیجان کی حالت میں عطیہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

تجھے معلوم بھی ہے، تجھے معلوم بھی ہے۔ رنگین اور بے پرواہ تیتری ——"

عطیہ۔ (بات کاٹ کر) ارے ارے! کچھ بہک رہے ہو! کہہ کیا رہے ہو!

ناصر۔ یہ کہہ رہا ہوں، یہ کہہ رہا ہوں۔ رنگین تیتری۔ تو جس کو بچوں کا کھیل سمجھ رہی ہے وہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کو تو طلب اور خواہش سمجھ رہی ہے وہ طلب ہے صادق اور خواہش ہے بے پناہ! — محبت کی طلب! آج میں نے کہہ دیا جو میں عرصہ سے کہنا چاہتا تھا! کتنی دفعہ میں نے کہنا چاہا ——

عطیہ۔ شکریہ! اس عزت افزائی کا! ایک بازی عورت کی بیٹی کے ساتھ اظہار التفات! آپ نے سوچا نہیں! آپ سمجھے نہیں! (زیر لب) مرد! مرد کہتا سب ہے اور سوچتا کم ہے!

ناصر۔ نہیں، عطیہ! میں نے سوچا، میں نے سمجھا! مگر محبت نسل و خون کے مفروضہ امتیازات کی پابند نہیں ہوسکتی!

عطیہ۔ جی ہاں! مگر اس کو باپ اور ماں اور چچی اور خالہ اور خالو کے حکم کا پابند ہونا ضرور ہے! دنیا کے شکاری کتوں کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں! ناصر! جس کو ہم سماج کہتے ہیں وہ ایک شکاری کتا ہے۔

جہاں شیر حق رکھتا ہے کہ ہرن کو کھا جائے! — اور شیر کے دانتوں کا حال، مجھ سے پوچھو، میری ماں سے پوچھو جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ان ہی کتوں کے دانتوں سے — ہزاروں زخم کھا کر گزارا ہے!

ناصر ۔ مگر کیا محبت سماج کی پابندیوں کو گوارا کر سکتی ہے؟

عطیہ ۔ اس نے گوارا کی ہیں، وہ گوارا کرتی ہے اور وہ گوارا کرے گی!

ناصر ۔ لیکن جب ہی، جب کہ میں تم سے اپنی محبت کا جواب پاؤں!

عطیہ ۔ (مسکرا کر۔ مگر اس کا تبسم غمگین ہے)

ناصر ۔ میں جواب کیا دوں، جب مجھے سوال ہی کا یقین نہ آئے!

(میر امانت علی داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ ہی سے کہتے چلے آتے ہیں)

ارے بھئی، آخر یہ شطرنج کب ختم ہوگی، کوئی چال بہت ہی الجھ گئی ہے؟

عطیہ ۔ جی نہیں دادا! آئیے تشریف لائیے۔ بازی ختم ہی کہاں ہوئی، ابھی تو ہم لوگ بحث ہی کر رہے ہیں کہ بازی ٹیڑھی ہوئی کس کی ہے! ناصر کہتے ہیں کہ بازی ان کی ٹیڑھی ہوئی ہے اور میں کہتی چلی کہ میری!

میر صاحب ۔ ابھی تم دونوں کی یہ بحث تو ختم ہونے سے رہی۔ کھانا جو دسترخوان پر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

عطیہ ۔ چلئے چلئے دادا! زندگی کی اصلی بازی تو دسترخوان کی بساط ہی پر ہاری اور جیتی جاتی ہے!

تیسرا منظر

(چند خاندانی بڈھے جمع ہیں۔ دو صاحب صحنچی میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ دو سامنے مونڈھوں پر۔ ایک بڑا سا حقہ درمیان میں رکھا ہے۔ ایک طرف پرانی وضع کا ایک شمع دان رکھا ہوا ہے)

"جی ہاں! عقلا تو پہلے ہی کہہ گئے ہیں کہ پسر نوح با بداں بنشست،

..... جناب! وہ تو خاندان پر دھبہ لگنا تھا لگ گیا، انصار مرحوم خود تو باپ دادا کا نام ڈبو کر رخصت ہو گئے اور یہ کلنک کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے ہم لوگوں کی پیشانی پر چھوڑ گئے!"

"آپ نے کچھ اور بھی سنا؟ وہ صاحبزادی عطیہ آج کل ناصر سے بہت گھل مل رہی ہیں"

"جناب میں خوب جانتا ہوں! خوب جانتا ہوں! انصار مرحوم کی داشتہ بڑی چالاک عورت ہے۔ بڑی چالاک جناب! اور چالاک نہ ہوتی تو خود انصار کو کیسے پھانستی؟ اب وہ دن رات اس فکر میں ہے کہ عطیہ کو پھر اسی خاندان میں کھپا دے۔"

"لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ، ہمارا شجرہ نسب... سو برس سے"

"... سو برس کیسے جناب! چودہ سو برس کہئے جناب! چودہ سو برس!"

"جی ہاں، جی ہاں، یہی تو میں کہتا ہوں کہ چودہ سو برس سے ہمارا شجرۂ نسب اس قدر صاف رہا ہے کہ کوئی شخص نقطہ نہیں لگا سکتا، اس میں، جی! اور اب خدا کی شان، کہ ایک بازاری عورت اپنی بیٹی کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہے!"

"استغفر اللہ، استغفر اللہ!"

"لاحول ولا!"

"العظمۃ اللہ!"

"لیکن جناب! لیکن جناب! ناصر کی والدہ کو ذرا سمجھانا دنیا ہے، ہوشیار رہیں ذرا!"

"سمجھا دیا ہے جناب! خوب سمجھا دیا ہے! وہ خود ہی کہتی ہیں کہ انصار کے باپ زندہ ہوتے تو کیا مجال تھی اس کی اس گھر کی طرف بھی جاتا۔ اور رشتہ کشتہ — تو جناب وہ تو صاف کہتی ہیں کہ ناصر نے معمولی تفریح دل لگی کے علاوہ اگر ذرا بھی کچھ اور خیال کیا تو سنکھیا کھا کے سو رہوں گی!"

"مگر، بھائی صاحب! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ناصر کو زیادہ روک ٹوک کی ضرورت نہیں! نوجوان ہے، تھوڑی سی تفریح کر لیتا ہے، آخر جانتا تو وہ بھی ہے کہ جب ماں ہی کا کبھی نکاح نہ

ہوا تھا تو اب لڑکی کا نکاح کیسا — اجی بات تو یوں ہے کہ ادھر ادھر بالاخانوں کوٹھوں پر تفریح نہ کی چلو گھنٹہ آدھ گھنٹہ عطیہ سے ہنس بول لئے"

"بھئی واہ، بھائی صاحب، بات تو خوب نکالی آپ نے!"

"خوب نکالی بات — خوب، خوب، آخر ہیں تو یہ بھی پرانے گناہگار!"

"ارے میاں! یہ کام تو ہم سب نے کئے ہیں، سب ہی کرتے ہیں، اب دیکھ لیجئے نا، ہمارے یہ بھائی صاحب بیٹھے ہیں، ان کے قصے کس کو یاد نہیں! وہ مشتری کو بھگا کر لانا، ان کی بیوی کا خفا ہو کر چلے جانا، پھر مقدمہ بازی، پھر بچوں کی پرورش کے جھگڑے، مہر اور نان نفقہ کا جھگڑا، جہیز کی واپسی — سب ہی کچھ ہوا، اور سب ہی کچھ کیا انھوں نے، مگر یہ تو نہیں کہ خدا نخواستہ اپنے حسب نسب پر حرف لائے ہوں! —"

"جی نہیں! جی نہیں! اس معاملہ میں میں نے ہمیشہ احتیاط برتی، اجی، غلطیاں تو انسان کرتا ہی ہے لیکن باپ دادا کی قبروں پر کیسے لات مارے! شریف آدمیوں کا تو یہ کام نہیں ہے!"

"بجا ہے، بجا ہے"

"شرافت بڑی چیز ہے جناب! بڑی چیز ہے، شرافت!"

"اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا شک ہے"

"اب دیکھئے نا، بھائی عابد علی نے نکاح کے بعد بھی بیوی کی صورت دیکھنے سے انکار کیا مگر نیکبخت عمر بھر ان ہی کے نام پر بیٹھی اللہ اللہ کرتی رہی! روٹی اس نے پکائی، جھاڑو اس نے دی، پوتا اس نے جوتا، مگر اُف نہیں کی، انتہا یہ کہ بھائی عابد علی کی رنڈیوں کو کھانے پکا پکا کر کھلائے — کیا کچھ نہیں کیا اس اللہ کی بندی نے، شرافت اس کو کہتے ہیں۔ پھر بھلا اس قسم کی گانے ناچنے والی عورتوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے، جیسی لطیفہ اور عطیہ ہیں! ہُڑدنگی، عیش پسند، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں، غیر مردوں میں بیٹھ بیٹھ کر ہی ہی کریں، — خدا محفوظ رکھے جناب!"

"سنتے ہیں کہ لطیفہ کے یہاں تو میر امانت علی کا عمل دخل ہے"

"بہت! اجی جناب، سب سے بھی کچھ زیادہ! بڈھا بھی ایک خرانٹ ہے، وہ اس فکر میں ہے کہ عطیہ کو کہیں ٹھکانے لگا کر لطیفہ کو اپنے قبضہ میں لائے، وہ تو دراصل مال کی فکر میں ہے!"

"سچ کہا، آپ نے!"

"سچ کہا آپ نے!"

"سنتا ہوں کہ بھائی احسان علی کے یہاں میر صاحب نے عطیہ کے متعلق کچھ تحریک کی تھی، مگر ایسا صاف جواب ملا کہ بیچارا منہ لے کے رہ گئے!"

"تو کیا بھائی احسان علی عطیہ کو اپنی لڑکی کے لئے قبول کرتے! اجی لاحول ولا........"

"انھوں نے تو صاف کہہ دیا کہ جب تک زندہ ہوں، خاندان کے شجرہ پر دھبہ نہیں آ سکتا، بلکہ جب میر صاحب نے کچھ زیادہ کہا تو وہ بگڑ گئے، انھوں نے کہا سنئے جناب! لطیفہ ہوں یا عطیہ، وہ تو وہی ہیں جو ہیں! گھروں رہیں یا کوٹھے پر بیٹھائیں! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ یا ان کی اولاد ہمارے گھروں کو ناپاک کرے!"

"خوب کہا انھوں نے!"

"ایسا ہی کہنا چاہئے تھا!"

"اچھا جناب بھائی صاحب، تو اب میں چلتا ہوں!"

"کہاں؟ کہاں؟ تشریف رکھئے نا!"

"جی، مجھے آج بھائی معصوم علی کے مقدمہ میں شہادت دینے عدالت جانا ہے!"

"ہاں! ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا، آج شہادت، آپ کی کیا ارادے ہیں پھر؟"

"اجی ارادے وارادے کیا، نکاح میں ہم موجود تھے،

بلکہ دولھا کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، مہر کہنے کو تو ایک لاکھ کا بندھا، مگر مہر کے ادا کرنے کا تو ہمارے خاندان میں کوئی دستور ہی نہیں، آج تک تو کسی نے ادا کیا نہیں، شمشاد علی کی بیوی کو طلاق ہوئی، ناظم حسین اور کاظم حسین دونوں بھائیوں نے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کر لیا، خود ہمارے دادا نے شادی کے تین سال کے بعد ہی بیوی کو میکے بھیجا تو پھر عمر بھر نہ بلایا، بلکہ ۱۵ سال تک تو ہمارے والد کی پرورش بھی ماں کے گھر ہوئی پھر کیا کسی نے مہر ادا کیا؟ اور علاوہ برین میری شہادت تو یہ ہے کہ مہر معاف ہو چکے ۔۔۔ (کسی قدر مسکرا کر) جناب جب شوہر کہتا ہے کہ معاف ہو چکے تو ضرور معاف ہو چکے!

"اچھا تو خدا حافظ!" سلام علیکم!

وعلیکم السلام! وعلیکم السلام! (محفل برخاست ہوتی ہے)

(باقی آئندہ) قاضی عبدالغفار (مدیر پیام)

پردیسی پریتم

چھم چھم برست برکھا آئی — کوئل کوک کے یاد دلائی
ساون آیا تم نا آئے

ننھی بوندیاں من کو بھائے — ملن کی اچھا خوب رجھائے
برہ کی آگ کو کون بجھائے — اس دکھیا کو کون منائے
ساون آیا تم نا آئے

اس رت میں پردیس نہ جاؤ — برہ کا دکھڑا چھوڑ نہ جاؤ
من کو مورے توڑ نہ جاؤ — آؤ! آؤ!! پیا مورے آؤ
ساون آیا تم نا آئے

سب سکھیاں جھولیں جھولن — تم بن نا ہی آئے چینن
نیند نہ آئے ساری رینن — مورے پھوٹیں رو رو نینن
ساون آیا تم نا آئے

کشو تلکر کیف (عثمانیہ)

"تعلیمی سفر یورپ"

ڈائری کا پہلا ورق

شنبہ ۲۹ مئی ۱۹۳۶ء

خدا کا نام لے کر دن کے گیارہ بجے میں جہاز رانپورہ پہ سوار ہوئی جس وقت ہسپتال سے نکلی ہوں میری طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک گھنٹے پیشتر ڈاکٹر نے انجکشن دیا تھا۔ مجھ کو عجیب پریشانی سی ہو رہی تھی۔ دل میں طوفان مایوسی برپا تھا تلاطم ناامیدی گرداب خوف میں جاگزیں ہو رہا تھا۔ کبھی تو خیال ہوتا تھا کہ کاش کوئی ایسی طاقت ہو جو مجھ کو گھر واپس جانے پر مجبور کر دے۔ کبھی کہتی تھی نہیں۔ دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے مجھ کو جانا ہی چاہئیے۔

جہاز پر میرا بھائی وزیر سلطان، میرا لڑکا انور اور میرے چچازاد بھائی عبدالعزیز میرے ساتھ آئے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور گلدستے تھے۔ جہاز کے چلنے کا وقت جب قریب ہوا تو انھوں نے مجھ کو پھول پہنائے گلدستے دئیے۔ انور نے میری متعدد تصویریں لیں اور سب مجھ کو کیبن تک پہونچانے آئے۔ انور نے چھوٹی سی صورت بنالی تھی۔ عبدالعزیز اس کو زبردستی باہر لے گئے۔ جہاز ایک بجے روانہ ہوا۔ سمندر کی موجوں کی طرح میرے دلی جذبات و تحسرات بھی موجزن ہو رہے تھے۔ کبھی تنہائی کا خیال ہوتا تھا کبھی بچوں کی یاد تڑپاتی تھی۔ دن بھر مجھ کو بے چینی و بے قراری رہی، مرض میں شدت رہی۔ تمام جسم میں گرمی پھنک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا گویا رگ رگ میں آگ بھری ہے۔ مسز دتا ہماری رہنما نے جو ایک اسکاچ خاتون ہیں مجھ کو کئی بار آکر دیکھا اور دلاسا دیتی رہیں میرے کھانے کا انتظام دو روز کے لئے نیچے کروا دیا۔ بڑی مہربان و خوش اخلاق ہیں۔ ہماری پارٹی میں اتفاق سے ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں۔ مسز دتا نے ان کو شام کے وقت میرے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ میں نے اپنی کیفیت بیان کی دوا اور نسخے دکھلائے۔ یہ پہلی ڈاکٹر ہیں جنھوں نے مجھ کو گرم غذا کھانے سے روکا حتیٰ کہ گوشت کو بھی منع کر دیا۔

یکشنبہ ۳۰ مئی۔

میں نے بالکل انڈے گوشت اور مچھلی چھوڑ دی۔ صرف ترکاری، روٹی، مکھن اور میوے پر اکتفا کرتی ہوں۔ خدا کے فضل سے آج ذرا طبیعت پر سکون ہے۔

ہماری پارٹی کی ایک خاتون مس گول سنجانا بمبئی کی پارسی لیڈی میری شریک کیبن ہیں، ان کا متلی سے برا حال ہو رہا ہے ان کی ہم قوم لڑکیاں آکر ان کو زبردستی ڈک پر لے جاتی ہیں لیکن وہ کچھ دیر بعد چلی آتی ہیں اور لیٹ جاتی ہیں ان کے سر میں شدت کا چکر ہے۔

دوشنبہ ۳۱ مئی

اب تک میں اوپر نہیں گئی، کیبن ہی میں رہتی ہوں۔ نوکرانی اصرار کرتی رہتی ہے کہ ڈک پر جا کر بیٹھئے ہوا کھانے سے

آپ کو فائدہ ہوگا۔ مسز دتا ابھی آئیں تھیں، میں نے اُن کو ایک تار لکھ کر دیا "میں بہتر ہوں فکر نہ کیجئے" اور اُن سے درخواست کی کہ از راہ عنایت بذریعہ لاسلکی اسس کو میرے گھر روانہ کردیں۔ آج میری ظاہری حالت بہت بہتر ہے۔ نیند اچھی آئی۔ کوئی درد و بے قراری نہیں۔

سہ شنبہ یکم جون ۱۹۳۷ء

ڈک پر بیٹھنے اور تازہ ہوا کھانے سے میری طبیعت بہتر اور افاقہ معلوم ہو رہا ہے۔ آج میں نے ناچ دیکھا، جہاز پر سے ہی یورپین زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ مختلف کھیل اور ذرائع تفریح مہیا رہتے ہیں بیڈمنٹن، ٹینس کوٹ، پنگ پونگ، برج، ریسز، کانسرٹ، فینالسی ڈریس وغیرہ غرض کہ مصروفیت اور سیر دل بہلانے کے جملہ سامان موجود رہتے ہیں، کتب خانے سے پڑھنے کے لئے کتابیں ملتی ہیں، ہر کھانے پر تمام مسافر ڈائننگ ہال میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی میزوں پر سب مل کر کھاتے ہیں رات کے کھانے پر عموماً لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر آتے ہیں اور کھانے کے بعد بیانڈ کے ساتھ ناچ ہوتا ہے۔ اہل یورپ کی طبیعت بھی ایک طرفہ تماشا ہوتی ہے۔ سمندر پر ہوں ہوا پر ہوں پہاڑ پر یا زمین پر ہمیشہ زندگی کو مسرت آگین و خوشگوار بنانے کی سعی کرتے ہیں گو وہ خوشی دیرپا نہ ہو نہ سہی۔ ڈانس میں بڈھے، جوان و نوجوان سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

چہارشنبہ ۲ جون

آج شام جہاز عدن پہونچے گا۔ ہم سفر خواتین بندر پر اترنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ مجھ سے مسز دتا کہہ رہی ہیں آپ کو ہمارے ساتھ نہیں چلنا چاہئے۔ آپ عقلمند بنیں اور جہاز پر سے ہی تماشا دیکھیں۔

تقریباً تین بجے جہاز عدن پر پہونچا، سب سے پہلے نیچے اونچے پہاڑ نظر آئے جن پر درخت کا نام نہیں، پہاڑوں پر اور دامن میں بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں، شہر عدن دور سے نظر آتے ہی میں نے درود شریف پڑھنا شروع کیا اور اپنی صحت کے لئے دعائیں مانگیں، سرزمین حرم زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً گو نظروں سے بہت دور رہتی ہے لیکن نہ معلوم کیوں ایک اندرونی روحانی فرحت و مسرت کا احساس ہوتا ہے، سمندر میں سیکڑوں کشتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے جہاز کے بہت سے مسافر کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر گئے اور سیر کر کے واپس آئے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب و حبشی سامان بیچنے کے لئے لاتے ہیں اور رسیوں کے ذریعہ تھیلیوں میں اشیاء اوپر پہونچاتے ہیں۔ اکثر میموں نے ان سے چیزیں خریدیں، اوپر سے مول کرتی رہیں۔ بڑی دیر میں قیمتوں کا تصفیہ ہوا۔ ڈک پر بھی چند اشخاص کارڈ، اخبار و کتابیں فروخت کرنے لائے۔ ان لوگوں کی عموماً تباہ حالت ہوتی ہے، ان کے سروں پر ترکی ٹوپیاں ہوتی ہیں، اکثر افسر سوٹ میں ہوتے ہیں لیکن ترکی ٹوپی پہنتے ہیں، بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

مسز صوفی ام۔ اے (علیگ)

ذوقِ نظر

رہا ہے سامنے آنکھوں کے وہ بیدادگر برسوں
اٹھائی ہم نے گویا لذتِ ذوقِ نظر برسوں

تماشا ہے کہ ہم اس راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں
نہیں ہوتا جدھر اس فتنۂ قامت کا گذر برسوں

علاج اس کا سمجھ میں کچھ نہ آیا گو بہت سوچا
رہا چکر میں دردِ دل سے میرے چارہ گر برسوں

کنشت و کعبہ و دیر و کلیسا سب سے واقف ہوں
پھرایا ہے کسی کی جستجو نے در بدر برسوں

نہ کھایا رحم اس سفاک نے بھولے سے بھی ہم پر
نہ آیا نالۂ و فریاد میں رنگِ اثر برسوں

درازیٔ شبِ فرقت کا قصہ مختصر یہ ہے
نہ دیکھا ہم نے اے پیغام بر روئے سحر برسوں

گھڑی بھر چین سے رہنے نہ دے گی یہ تڑپ دل کی
رلائے گا کسی کے ہجر میں دردِ جگر برسوں

کبھی تھی ایک دن اغیار سے ترکِ تعلق کی
نہ آیا بس اسی اک بات پہ وہ میرے گھر برسوں

نہ کیونکر اے معینؔ ہو پاک عیبوں سے کلام اپنا
کہ آخر ہم نے کی ہے خدمتِ اہلِ ہنر برسوں

نواب اِعانت جنگ معین الدولہ بہادر معینؔ

غزل بطرز فارسی

کہا میں نے یہ پردہ چشمِ مردم سے بشر ہو کر
کہا پھر کیا بپا کر دیں قیامت جلوہ گر ہو کر

کہا میں نے ستم کا داغ ہے اے ماہ دامن پر
کہا ممکن ہے کیونکر داغ سے بچنا قمر ہو کر

کہا میں نے بڑی شہرت ہے خورشید قیامت کی
کہا تجھ کو تماشا ہم دکھا دیں جلوہ گر ہو کر

کہا میں نے کہ دل پتھر ہے شاید اِن حسینوں کا
کہا پھر دل میں گھر پتھر کے پیدا کر شرر ہو کر

کہا میں نے ہوا انجام کیا شمعِ شبستاں کا
کہا دم بھر میں وہ بھی بجھ گئی شمعِ سحر ہو کر

کہا میں نے دلِ زاہد پہ بت خانے میں کیا گزری
کہا اب تک تپاں ہے بسمل تیرِ نظر ہو کر

کہا میں نے وہ اپنے قول تم نے سب بھلا ڈالے
کہا سہو و خطا سے کون خالی ہے بشر ہو کر

کہا میں نے کہاں حسن خم ابرو کہاں خنجر
کہا یہ بھی پری بن جائے گا زیبِ کمر ہو کر

کہا میں نے رہے صدق و صفا سے ربط اچھا ہے
کہا چھپتا ہے ہم تو صدقؔ سے شیر و شکر ہو کر

صدق جائسی

(افسانہ)

"تصویر کی قیمت"

بیگم شفیع نے گلاب کی پتی کو توڑتے ہوئے کہا، ریاض کی اٹھائیسویں سالگرہ کی تقریب میں ہمیں کیا تحفہ پیش کرنا ہوگا، یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں، نوشابہ نے جواب دیا، ایک باکمال مصور کے لئے چند حسین اور قیمتی تصویروں کے سوا اور کیا تحفہ موزوں ہو سکتا ہے لیکن سالگرہ تو ان کی ہے تصویروں کی نہیں بیگم شفیع نے کہا،

"کچھ ہو" نوشابہ بولی، میں نے بھی ایک تصویر دینے کا ارادہ کر لیا ہے، اس نے رومال میں لپٹی ہوئی تصویر نکالی، مشرقی حسن کا بہترین نمونہ۔ اس تصویر حسن کا مضمون امریکہ کے شہرۂ آفاق مصور پال رومو Palumo کا قلم ہے۔

تصویر حد درجہ حسین ہونے کے علاوہ غضب کی اپنے اندر جاذبیت رکھنے والی تھی۔

بیگم شفیع نے تصویر لے لی! اور چند منٹ تک اسے بغور دیکھتی رہیں لیکن نوشابہ! بیگم شفیع نے چند سے توقف کے بعد کہا، تم نے یہ کیسے حاصل کی؟ اب جبکہ اس کا اشتیاق انھیں بے چین کر رہا تھا اس کی وضاحت ایک طوالت چاہتی ہے، نوشابہ نے تصویر کو واپس لیتے ہوئے کہا، یہ سمجھ لیجیے گا کسی ذریعے سے۔ اور وہ ذریعہ مسٹر مجیب ہیں —— کیوں نا

بیگم شفیع کے اس چست جملہ پر نوشابہ کی صندلی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور مسٹر مجیب نے —— کیسے حاصل کی؟ یہی نا۔ نوشابہ نے جملہ کی تکمیل کی۔ انھیں اپنے ایک ساتھی سے ملی۔ اور ساتھی نے اپنے دوست مصور سے حاصل کی۔ اور مصور نے خود تصویر بنائی۔ جملہ ختم ہو گیا

دوسرے دن ریاض نگار خانے میں بیٹھا ہوا تصویر بنا رہا تھا —— مقابل کی تصویر جو اپنی سالگرہ کی تقریب میں اس نے نوشابہ کے ذریعے حاصل کی تھی۔ مستعدی کے ساتھ وہ تصویر میں منہمک تھا۔

موٹر کے انجن کی پھٹ پھٹ آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی، ریاض جھنجھلا کر اٹھا —— دریچے کے پاس جا کر اس نے معلوم کیا —— ایک موٹر مکان کے دروازے پر آ رکی۔ اور دو لڑکیاں کار سے اتر رہی تھیں —— ایک دراز قامت گندمی رنگ والی —— دوسری بھورے بالوں والی ——

ریاض کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا۔ متعدد خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے، اس نے خیال کیا ایک دفعہ شاید کسی شادی کی محفل میں میں نے انھیں دیکھا ہے —— اور قبل اس کے وہ یہ معلوم کر سکے کہاں؟ اور کب؟ —— پیروں کی آہٹ سے وہ چونک اٹھا —— لڑکیاں اس کے نگار خانے میں داخل ہوئیں۔ مصور ان کے استقبال کے لئے اٹھا مصافحہ کے بعد ان کے لئے کرسیاں پیش کیں۔ اور خود تصویر لئے بیٹھا —— لڑکیاں نگار خانہ کی سیر کر رہی تھیں، چند لمحے گھومنے کے بعد وہ ریاض کے قریب آئیں —— اور اس کو تصویر بناتے دیکھا ——

"کتنی خوبصورت ہے" بھورے بالوں والی لڑکی نے کہا،

کیا قیمت ہے اس کی دوسری لڑکی نے دریافت کیا ——

مصور مسکرایا، تعظیماً وہ اٹھا —— تصویر اس کے ہاتھ میں تھی ——

ایک لڑکی نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی ——

ہم اس کے لئے کیا خدمت کر سکتے ہیں، تصویر والی لڑکی نے کہا۔

یہ تصویر، مصور نے ہلکی آہ کے ساتھ کہا، نہیں دی جا سکتی ——

اوہ! یہ آپ کی ہے بھورے بالوں والی لڑکی نے مسکرا کر کہا، معاف کیجیے ہم نے غلط اندازہ لگایا —— جی نہیں، ریاض نے پہلو بدل کر کہا، یہ میرے ایک دوست کی ہے، جو مقابل کی تصویر بنانے کے لئے حاصل کی گئی ہے، بڑی نوازش ہوگی اگر ایک کاپی ہمیں بھی مل جائے۔ اگر اجازت ملی تو —— مصور مسکرایا ——

ورنہ اللہ اللہ خیر صلّا۔ لڑکی نے شوخ لہجہ لئے ہوئے کہا، کل تک آپ انتظار کریں ۔ میں اس کے متعلق جواب دونگا شکریہ! لڑکیوں نے مصافحہ کیا۔ اور رخصت ہوئیں۔

لڑکیوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ آج پہلی مرتبہ اسے ان لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا یہ ڈپٹی صاحب کی لڑکیاں ہیں جو سامنے والی کوٹھی میں رہتی ہیں ان کا نام اُس نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت اُس کا حافظہ کام نہ دے سکا۔

تصویر کو مکمل کئے بغیر ریاض اٹھا اور بلا ارادہ لباس تبدیل کر کے گھر سے روانہ ہوا، معلوم نہیں کہاں، اب جبکہ اس کی موٹر حسین ساگر کے کٹہرے سے گزر رہی تھی دفعتہً وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ اسے اپنی نوعیت پر سخت نادم ہونا پڑا۔ اُس کی موٹر بند پر کھڑی ہونے والی کار سے ٹکرائی ۔ فوری بریک کرنے پر خفیف ساجھٹکا اس نے محسوس کیا۔ اُس کی موٹر کا سامنے والا مڈ گارڈ کچھ ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ ریاض جھنجھلا کر موٹر سے اترا۔ لیکن قریب کی نسوانی مانوس آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "ہلو ریاض تم کدھر۔

اوہو آپ، نوجوان مصور نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا

آپ مصور ہیں نا۔ دوسری لڑکی نے مذاقاً کہا۔

لیکن میں نے پہلی مرتبہ آپ کو یہاں دیکھا ہے بھورے بالوں والی لڑکی نے کہا۔ میرے خیال میں آپ یہاں روز تشریف لاتے ہیں روز نہیں تو کبھی کبھی ضرور ۔ دوسری لڑکی نے جواب دیا۔ آئیے بیٹھیں اس کرسی پر۔ اُن میں سے ایک لڑکی نے کہا۔

نہیں اب مجھے اجازت دیجئے، مصور رخصت ہونے لگا۔ لیکن کل تک مجھے اس کا جواب ملنا چاہئے لڑکیوں نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

انشاء اللہ اُس نے کہا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا موٹر میں سوار ہوا۔

دوسرے دن ریاض صوفہ پر دراز تھا، اس کے ہاتھ میں تصویر تھی، جو کل رات ان تھک کوششوں کے ساتھ تیار کی تھی کتنی خوبصورت ہے، اس نے بدستور تصویر کو گھورتے ہوئے کہا میں نہیں کہہ سکتا یہ تصویر مجھے کتنی پسند ہے۔ اگر میں اس کو حاصل کر سکوں تو کس طرح۔

شوفر نے مصور کی خدمت میں ملاقاتی کارڈ پیش کیا۔ نجمہ صدیقہ کے نام نجمہ صدیقہ۔ اس نے مدھم لہجہ میں دہراتے ہوئے کہا۔ انھیں اندر بھیج دو

معاف کیجئے گا مسٹر ریاض میں ذرا وقت سے پہلے ہی چلی آنے والی لڑکی نے کہا۔ بڑی خوشی کی بات ہے مصور نے کہا تشریف رکھیے آپ، فرمائیے آپ نے تصویر کے متعلق کیا فیصلہ صادر کیا ۔

آپ شوق سے یہ تصویر لے جا سکتی ہیں، ریاض اٹھا اور میز کے دراز سے تصویر نکال کر اُن کے آگے پیش کی ۔

نجمہ ریاض کی اس غیر متوقع آمادگی پر حیران تھی "۔ اور آپ پاس" اُس نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ میرے پاس یہ رہے گی اُس نے دوسری تصویر دکھلائی۔ جو کل رات نہایت جانفشانی کے ساتھ ختم کی تھی۔ لڑکی کانپ اٹھی۔ شرم وحیا کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی ۔ سر سے پیر تک اُس نے مصور کو دیکھا۔ یہ تصویر میں نے بنائی ہے، مصور نے جواب دیا۔ آپ کو پسند ہے نا۔

نہیں۔ میری ہے "حسین لڑکی نے نگاہیں نیچی کرلیں۔

یہ کتنے داموں میں دی جائے گی ۔ مصور نے دریافت کیا۔

اس کے دام نہیں لئے جائیں گے۔ لڑکی نے بیباک ہو کر کہا، اگر وہ دیوار والی تصویر مل جائے مصور کی نگاہیں اٹھیں ۔ اور تصویر تک جا کر رکیں ۔ ایک غیر معمولی جذبہ اُس نے اپنے دل میں محسوس کیا۔ اُس نے آہستہ سے لڑکی کی کلائی دبا کر کہا۔ یہ میری ہے اور یہ ۔ لڑکی نے اپنی تصویر دکھا کر کہا ۔ اس کی قیمت ۔ اُس تصویر کے معاوضہ ۔

صابر کوسگوی

بولتی تصویریں

"پریس، ریڈیو اور فلم انسانیت کو ایک روحانی رشتہ میں منسلک کرتے ہیں۔ روحانی اپیل کے ذریعہ زندگی کو عام طور پر ایک سانچے میں ڈھال دیتے ہیں پریس اپنے الفاظ، ریڈیو اپنی آواز اور فلم اپنی متحرک تصویروں سے خبروں، واقعات اور خیالات کو فراہم کر کے اپنے ذریعہ اس حد تک معلومات کو وسعت دیتے ہیں کہ جس کا اندازہ ممکن نہیں، وہ جذبات اور احساسات کے باہمی تبادلہ کا ایک ذریعہ ہیں اور اس طرح اقوام عالم میں ایک ایسے سمجھوتے کو پیدا کرتے ہیں جو روز بروز مستحکم ہوتا جاتا ہے"!

آل انڈیا موشن پکچر سوسائٹی کے صدر سر فیروز سیٹھنا کی ایک تقریر کا یہ اقتباس ہے، اپنی اسی تقریر میں سر فیروز نے یہ بھی کہا کہ:-

"سینما اور فلم کو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے"۔

فلم کی تعلیمی و تعمیری اہمیت تمام متمدن ممالک میں مسلمہ ہے، فلم کے ذریعے جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اُس کے نقوش بہت گہرے لوح دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں جس ملک میں تعلیم یافتہ افراد کم ہوں، جہاں جہالت کا دور دورہ ہو اور مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں وہاں فلم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے نہایت آسانی اور خوش اسلوبی سے تعلیم دی جا سکتی ہے، اخلاق بلند کئے جا سکتے ہیں، عادات و اطوار سدھارے جا سکتے ہیں اور طرز معاشرت کو سادہ اور با اصول بنایا جا سکتا ہے۔ فلم کے اس پہلو پر قطعاً توجہ نہیں کی گئی، فلم کا یہ رُخ بالکل تاریکی میں ہے سخت ضرورت ہے کہ ہماری فلمساز کمپنیاں اس طرف متوجہ ہوں اور فلم کے اس رُخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔

موجودہ دور میں تفریح و تفنن کے سلسلے میں جو فلم تیار ہوئے ہیں اُن میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ ہماری فلمساز کمپنیوں کو چاہیے کہ ایسے فلم تیار کریں جن میں تفریح و تفنن کے پیرایہ میں انسانی زندگی کے ایسے سبق آموز حقائق پیش کئے جائیں جن کا مظاہرہ نوخیز لڑکے اور لڑکیوں کے لئے کارآمد ہو۔ ہماری فلموں کو بدمذاقی کی سرحد سے بہت دور اور اخلاقی پستی سے بالکل مبرا ہونا چاہیے۔ فلموں کا معیار اتنا بلند اور پاکیزہ ہو کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں عشق و محبت کے جذبات کو متحرک کرنے کے عوض اپنے ملک کے شاندار ماضی کی یاد کو تازہ کریں، تاریخی روایات کو دہرائیں، ہماری دماغی فضا کو منور کریں، ہمارے تمدن اور معاشرت کی اصلاح کریں اور۔ ہم کو مغرب کی اندھی تقلید کی برائیوں اور نقصانات سے واقف کرائیں۔

اکثر فلموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلم کے آرٹ کا ذوق کس قدر پست ہے، ہر فلمی کہانی کا پلاٹ تقریباً یکساں ہوتا ہے، ایک ہی افسانۂ عشق ہوتا ہے جو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کی داستان محبت سے فلم کا آغاز ہوتا ہے عاشق و معشوق کے راستے میں اقسام کی دشواریاں اور رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں مگر آخر میں انجام بخیر ہوتا ہے۔ یہ خلاصہ ہے تقریباً ہر طربیہ" ڈرامے کا اگر وہ "حزنیہ" ہے تو عاشق و معشوق گاتے بجاتے سیدھا جنت کو سدھارتے ہیں۔ ان ہر دو قسم کی فلموں میں ناظرین کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کی خاطر کودا پھاندی، مار دھاڑ، نام نہاد موسیقی اور مخرب الاخلاق ظرافت کی کمی نہیں ہوتی جس کو

مذاق کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں بد مذاقی اور اخلاقی پستی کا قابل نفرت نمونہ ہوتا ہے، بوس و کنار کی وہ عریاں نمائش ہوتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے، ہمارے فلمسازوں نے مغربی فلموں سے بس اتنا ہی سیکھا ہے۔ گانے موقع اور بے موقع اس قدر بھر دیئے جاتے ہیں کہ فلم دو ڈھائی گھنٹے میں ختم ہونے کے عوض تین ساڑھے تین گھنٹے میں ختم ہوتی ہے۔ عاشق کا دم آخر ہے مگر وہ چیخ چیخ کر گا رہا ہے، معشوقہ دم توڑ رہی ہے مگر مرتے مرتے ایک آدھ ٹھمری یا غزل سنا جاتی ہے۔

ناچ گانے ہندوستانی فلموں کا ایک بڑا جزو بن گئے ہیں، بغیر ان کے کوئی فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ مغربی قسم کے نیم عریاں ناچ اور ان کے حیا سوز، غیر مہذب اور مخرب الاخلاق مناظر مرد اور عورت کے جذبات میں ایک تلاطم برپا کر سکتے ہیں، علاوہ اس کے ہندستانی فلم کے مشرقی ماحول میں جذبات کو برانگیختہ کرنے والے مغربی ڈانس مغرب کی اندھی تقلید اور بھونڈی نقالی کا قابل نفرین مظاہرہ ہوتے ہیں اور ہمارے فلمسازوں کی ذہنیت کا ماتم کراتے ہیں۔ بے محل اور بے موقع گانوں، بھونڈے مذاق اور نیم عریاں مغربی طرز کے رقص کو ہماری فلموں سے قطعاً خارج کر دینا چاہیے، ایسی فلمیں بجائے اخلاق و معاشرت اور عادات و کردار کی تعمیر کے اُن کی تخریب کا ذریعہ ہوئی ہیں اور اپنے ناظرین کو بد مذاقی اور بد اخلاقی کی دعوت دیتی ہیں۔ جب تک ہماری فلموں سے یہ خرابیاں دور نہ ہوں گی اُن کا تخریبی پہلو نمایاں رہے گا۔

شاذ ہی کوئی فلم ایسی نظر آتی ہے جس میں عیسائی اور یہودی لڑکیوں کے نیم عریاں ناچ نہ ہوتے ہوں اور اُن کے حسن عریاں کی نمائش نہ کی جاتی ہو۔ جن مغربی فلموں کی تقلید میں ہماری فلموں میں اسی قسم کے ناچ ٹھونس دیئے جاتے ہیں اُن میں اس قسم کے بے موقع اور بے محل ڈانس ہرگز نہیں ہوتے۔ اگر ہماری فلموں سے یہ ناچ نکال دیے جائیں تو فلم اپنی جگہ قائم رہتی ہے، کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا۔ پھر ایسے بے موقع ناچ خواہ مخواہ ٹھونس دینے سے فائدہ؟ بجز اس شے کے کہ فلم کی طوالت میں اضافہ کیا جائے۔

یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ ناچ سے انسانی دل و دماغ کو ایک قسم کی تفریح ہوتی ہے۔ مگر جب تک فلموں میں ناچ کا انتخاب فن رقص کے اصول پر نہ کیا جائے موجودہ بھونڈے ناچ ہرگز کسی قسم کی تفریح کا باعث نہیں ہو سکتے۔ فلمی کہانی میں رقص کی نمائش کیلئے موقع و محل کا لحاظ رکھنے کی سخت ضرورت ہے، ہمارے فلمساز ایسے ڈرامے لکھوائیں جن میں رقص کی کافی گنجائش ہو اور ایسے موقع پر رقص کے لئے عیسائی اور یہودی لڑکیوں کا انتخاب کرنے کے عوض بہتر ہوگا کہ ایسی ناچنے والیوں کو فراہم کریں جو رقص کے فن سے بخوبی واقف ہوں۔

فلموں کی کامیابی کا راز زیادہ تر اداکاروں کی صحیح اداکاری اور اُن کی ذہنیت پر منحصر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اداکاری ایک فطری چیز ہے ہر کس و ناکس میں یہ صفت نہیں پائی جاتی، باوجود اس کے اداکاری کو کامیاب بنانے اور منظر عام پر لانے کے لئے ایک اچھے ڈائرکٹر کی نگرانی میں کافی مشق کی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے فلمساز اپنے اداکاروں کو ایک دو مرتبہ مشق کرنے کے بعد کیمرے کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں اور اداکاروں نے اپنی اداکاری کا معیار یہ سمجھ لیا ہے کہ کیمرے کے سامنے آتے ہی دونوں ہاتھوں کو ادھر ادھر کھینچنا اور بے موقع جذبات کا اظہار کرنا اُن کی اداکاری کی انتہائی کامیابی ہے۔ جب تک وہ فلم میں کہانی کے لحاظ سے ایسی فضا پیدا نہ کریں جس کا اثر دیکھنے والوں کو کہانی کے ماحول میں نہ پہنچا دے اور نقل میں اصل کا رنگ

نہ پیدا کرے کوئی فلم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک اداکار اپنی ہستی کو اپنے کرداروں کی ہستی میں جذب نہ کریں نہ فلمی ماحول پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دیکھنے والوں پر کوئی خاص اثر پڑ سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے اداکار ابھی تک اس ذہنیت سے محروم ہیں۔ نہ ڈائرکٹر ہی اپنے فرائض سے واقف ہوتے ہیں اور نہ اداکار۔ ان کے تصور میں چند اداکاروں اور چند مناظر کو فراہم کرنا اور ان کی مسلسل تصویریں کھینچنے کا نام فلم ہے، انھیں یہ نہیں معلوم کہ جب تک کوئی فلم آرٹ کے نقطۂ نظر سے نہ بنائی جائے وہ "فلم" کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ ہماری فلمساز کمپنیاں بہت کم ایسے فلم بناتی ہیں جو آرٹ کے معیار پر اتر سکیں اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ عوام کے عامیانہ مذاق کا لحاظ کرنا ضروری ہے ورنہ فلم سے آمدنی ہونا دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے اگر ہماری فلمساز کمپنیاں ذرا اپنی نظر کو وسیع کریں تو اُن کا یہ تخیل غلط ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ نیو تھیٹرز، بمبئی ٹاکیز اور پربھات کی اکثر معیاری فلمیں ہفتوں چل چکی ہیں اور اپنے بنانے والوں اور پیش کرنے والوں کو کافی معاوضہ دے چکی ہیں۔

مرزا سیف علی خاں

میرا کھیل

غبارِ رہگذر سے کھیلتا ہوں! سفر میں ہم سفر سے کھیلتا ہوں
جہانِ فتنہ گر سے کھیلتا ہوں! میں اس کے فتنہ و شر سے کھیلتا ہوں
شبِ غم کی ستم انگیزیوں میں! ستاروں سے قمر سے کھیلتا ہوں
کبھی دلچسپیاں ہیں داغِ دل سے کبھی دردِ جگر سے کھیلتا ہوں
کبھی موجِ تبسم اور کبھی اشک جہانِ بحر و بر سے کھیلتا ہوں
نہیں ہوں تیری محفل میں تو کیا غم تری دیوار و در سے کھیلتا ہوں
لگا کر جان کی بازی ستم گر! تری ترچھی نظر سے کھیلتا ہوں
نہیں آسان کچھ اے شور جینا مگر شام و سحر سے کھیلتا ہوں

سید عزیز حسین شور عابدی (گلبرگہ)

امتحان

منشی پریم چند کے ہندی افسانہ کا ترجمہ

جب ریاست دیوگڑھ کے دیوان سردار سجان سنگھ بوڑھے ہو گئے تب انہیں پرماتما کی یاد آئی۔ مہاراجہ کے یہاں جا کر انھوں نے عرض کی "غریب پرور۔ غلام نے چالیس۴۰ سال تک خدمت کی اب یادِ خدا میں زندگی بسر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں دوسرے اب میری عمر بھی ڈھل گئی۔ امورِ سلطنت کے انجام دینے کی طاقت نہیں رہی۔ کہیں بھول ہو جائے تو اس بڑھاپے میں بٹہ لگے اور پھر ساری زندگی کی نیک نامی مٹی میں مل جائے"۔

راجہ صاحب اپنے تجربہ کار دیوان کی عزت کرتے تھے انھوں نے بہتیرا سمجھایا لیکن جب دیوان صاحب نے نہ مانا تو اُن کی درخواست منظور کر لی اور یہ شرط لگا دی کہ ریاست کے لئے نئے دیوان کی تلاش انہیں کو کرنا ہوگا۔

دوسرے روز ریاست کے اخبارات میں یہ اعلان نکالا گیا کہ "دیوگڑھ کے لئے ایک قابل دیوان کی ضرورت ہے۔ جو صاحب اپنے کو اس خدمت کے اہل سمجھیں وہ دیوان سردار سجان سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ گریجویٹ ہوں مگر انہیں طاقتور ہونا چاہیئے۔ مریضوں کو یہاں تک زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ایک مہینہ تک امیدواروں کی چال چلن کی دیکھ بھال کی جائے گی علم کے مقابل فرض کو زیادہ ترجیح دی جائے گی۔ جو صاحب اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس اہم خدمت پر مامور ہوں گے"۔

(۲)

اس اعلان نے سارے ملک میں ہل چل مچا دی۔ ایسا اونچا عہدہ اور پھر کسی طرح کی قید نہیں صرف تقدیر کی یاوری ہو۔ سیکڑوں آدمی اپنی قسمت آزمائی کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ دیوگڑھ میں ہر قسم کے لوگ دکھائی دینے لگے ہر ریل گاڑی سے امیدواروں کا ایک گروہ اترتا کوئی پنجاب سے چلا آتا تھا تو کوئی مدراس سے۔ کوئی نئی تہذیب کا دلدادہ تھا تو کوئی پرانی سادگی پر مٹا ہوا تھا۔ پنڈتوں اور مولویوں کو بھی اپنی قسمت آزمائی کا موقعہ ملا بیچارے سند کے نام کو رویا کرتے تھے یہاں اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ رنگین عمامے، اچکنیں، ٹوپیاں اور طرح طرح کے انگرکھے، دیوگڑھ میں اپنی شان دکھانے لگے لیکن سب سے زیادہ تعداد گریجوٹوں کی تھی کیونکہ سند کی قید نہ ہونے پر بھی سند سے پردا تو ڈھکا رہتا ہی۔

سردار سجان سنگھ نے ان لوگوں کی خاطر تواضع کا بڑا اچھا اہتمام کر دیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے روزہ دار مسلمانوں کی طرح مہینے کے دن گنا کرتے تھے۔ ہر شخص اپنی زندگی کو اچھی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا۔

مسٹر 'الف' پہلے تو نو۹ بجے دن تک سویا کرتے تھے لیکن آج کل وہ باغ میں ٹہلتے ہوئے اوشا کا درشن کرتے تھے۔ مسٹر 'ب' کو حقہ پینے کی لت تھی لیکن آج کل بہت رات گئے کواڑ بند کر کے اندھیرے میں سگار پیتے تھے۔ مسٹر 'د' 'س' 'ج' سے ان کے گھروں کے نوکروں کی ناک میں دم تھا۔ لیکن یہ آج کل آپ اور جناب کے بغیر نوکروں سے بات نہیں کرتے تھے۔ مہاشہ 'ک' منکر تھے ہکسلے کے نام لیوا تھے۔ مگر آج کل اُن کی عقیدت دیکھ کر مندر کے پجاری حیران تھے۔ مسٹر 'ل' کو کتابوں سے نفرت تھی اب مذہبی کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ کرتے رہتے جس سے بات کیجئے وہ انکسار اور اخلاق کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ شرابی بڑی رات ہی سے وید منتر پڑھنے لگتے اور مولویوں کو تو نماز تلاوت کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ایک مہینہ کسی نہ کسی طرح کاٹ لیں گے۔ انسانوں کو پرکھنے والا بوڑھا جوہری آڑ میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ ان بگلوں میں ہنس کہاں چھپا ہوا ہے۔

(۳)

ایک دن نئی تہذیب والوں کو سوجھی کہ آپس میں ہاکی کا کھیل ہو جائے۔ یہ تجویز ہاکی کے منجھے ہوئے کھلاڑیوں نے پیش کی۔ یہ بھی تو آخر ایک فن ہے اسے کیوں چھپا رکھیں کچھ ہاتھوں کی صفائی ہی کام کر جائے۔

چلیے طے ہو گیا میدان بن گئے کھیل شروع ہو گیا اور گیند کسی بے نوکری کے امیدوار کی طرح ٹھوکریں کھانے لگی۔ ریاست دوگڑھ میں یہ کھیل بالکل نرالی بات تھی پڑھے لکھے لوگ شطرنج اور تاش جیسے سنجیدہ کھیل کھیلتے تھے۔ اچھل کود کے کھیل بچوں کے سمجھے جاتے تھے۔ کھیل جاری تھا لوگ جب گیند لیکر تیزی سے دوڑتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی لہر بڑھتی چلی آتی ہے۔ لیکن دوسری طرف سے کھلاڑی اس بڑھتی ہوئی لہر کو لوہے کی دیوار کی مانند روک لیتے۔ شام تک یہی دھوم دھام رہی لوگ پسینہ میں تر ہو گئے۔ خون کی گرمی آنکھ اور چہرے سے جھلک رہی تھی۔ ہانپتے ہانپتے بیدم ہو گئے لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اندھیرا ہو گیا تھا اسی میدان سے دور ہٹ کر ایک نالہ تھا اس پر کوئی پل نہ تھا۔ آنے والوں کو نالے میں سے چل کر آنا پڑتا تھا کھیل ابھی بند ہوا تھا اور کھلاڑی بیٹھے دم لے رہے تھے کہ ایک کسان اناج سے بھری ہوئی گاڑی لئے اس نالے میں آیا لیکن کچھ تو نالے میں کیچڑ تھا اور کچھ چڑھائی اتنی اونچی تھی کہ گاڑی اوپر نہ چڑھ سکتی تھی۔ وہ کبھی بیلوں کو للکارتا کبھی پہیے کو ہاتھوں سے ڈھکیلتا لیکن بوجھ زیادہ اور بیل کمزور تھے۔ گاڑی اوپر کو نہ چڑھتی اور چڑھتی بھی تو کچھ دور چڑھ کر پھر نیچے اتر آتی کسان بار بار زور لگاتا اور جھنجھلا کر بیلوں کو مارتا لیکن گاڑی پار نہ ہوتی۔ بیچارہ مایوس ہو کر ادھر ادھر تاکتا مگر وہاں کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ گاڑی کو اکیلی چھوڑ کر کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔ بڑی مشکل میں تھا۔ اُدھر سے کھلاڑی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے جھومتے آنکلے۔ کسان نے ان کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا لیکن کسی سے مدد مانگنے کی جرأت نہ ہوئی کھلاڑیوں نے بھی اس کو دیکھا مگر بند آنکھوں سے جن میں ہمدردی نام کو نہ تھی وہاں کچھ تھا تو غرور اور تمکنت۔

(۴)

کھلاڑیوں میں ایک ایسا آدمی تھا جس میں رحم اور ہمدردی تھی آج ہاکی کھیلتے ہوئے اس کے پیروں میں چوٹ لگی ہوئی تھی۔ لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا آتا تھا یکایک اس کی آنکھ گاڑی پر پڑ گئی وہ ٹھٹک گیا اس نے کسان کو دیکھتے ہی ڈنڈا ایک طرف رکھ دیا کوٹ اتار ڈالا اور کسان کے پاس جا کر بولا "تمہاری گاڑی نکال دوں؟" کسان نے دیکھا کہ ایک گٹھے ہوئے بدن کا لانبا آدمی سامنے کھڑا ہے ڈر کر بولا "حضور آپ سے کیسے کہوں" نوجوان نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم یہاں بڑی دیر سے پھنسے ہوئے ہو اچھا تم گاڑی پر جا کر بیلوں کو بڑھاؤ میں پہیوں کو ڈھکیلتا ہوں ابھی گاڑی اوپر آتی ہے"

کسان گاڑی پر جا بیٹھا نوجوان نے پہیوں میں زور لگا کر کھسکایا کیچڑ بہت زیادہ تھی وہ گھٹنے تک زمین میں گڑ گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور پھر زور کیا ادھر کسان نے بیلوں کو للکارا جانوروں کو سہارا ملا۔ ان کی بھی ہمت بندھ گئی انھوں نے کندھے جھکا کر ایک بار زور کیا بس گاڑی نالے کے پار تھی۔ کسان نوجوان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا بولا "مہاراج آپ نے آج مجھے بچا لیا نہیں تو رات ساری یہیں بیٹھے رہنا پڑتا" نوجوان نے ہنس کر کہا "مجھے کچھ انعام دو گے؟" کسان نے کہا "نارائن چاہیں گے تو دیوانی آپ کو ہی ملے گی"

نوجوان نے کسان کی طرف غور سے دیکھا اس کے دل میں شبہ ہوا کیا یہ سجان سنگھ تو نہیں ہے؟ آواز ملتی ہے صورت شکل ملتی ہے کسان نوجوان کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا اور مسکرا کر بولا "گہرے پانی میں ڈوبنے سے موتی ملتا ہے"

ایک مہینہ ختم ہوا۔ چیا ؤ کا دن آ پہونچا۔ امیدوار بہت سویرے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے منتظر تھے۔ دن کاٹنا پہاڑ ہو گیا ہر شخص کے چہرے پر امید و یاس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ نہیں معلوم آج کس کے نصیب جاگیں گے نہ جانے کس پر لکشمی کی کرپا ہو گی۔ شام میں راجہ صاحب کا دربار سجایا گیا شہر کے رئیس، معززین، عہدہ دار اور دیوانی کے امیدوار سب دربار میں جمع ہو گئے تب سردار سبحان سنگھ نے کھڑے ہو کر دیوانی کے امیدواروں سے کہا "میں نے آپ کو جو کچھ زحمت دی ہے اس کے لئے ایسے شخص کی ضرورت تھی جس کے دل میں رحم اور ساتھ ہی ہمت ہو۔ دل وہی ہے جو صاف ہو ہمت وہی ہے جو بہادری کے ساتھ ہر مصیبت کا سامنا کرے۔ چنانچہ خوش نصیبی ہے کہ ریاست کے لئے ایسا آدمی مل گیا ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان تک ہماری پہونچ ہی نہیں۔ میں ریاست کو پنڈت جانکی ناتھ جیسا دیوان پانے پر مبارکباد دیتا ہوں۔" ریاست کے عہدہ داروں اور رئیسوں نے پنڈت جانکی ناتھ کی طرف دیکھا امیدواروں کی آنکھیں بھی ادھر کو اٹھیں۔

سردار صاحب نے پھر کہا "آپ لوگوں کو یہ قبول کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی جو انسان خود زخمی ہونے پر ایک غریب کسان کی بھری ہوئی گاڑی کو کیچڑ سے نکال کر نالے کے اوپر چڑھا دے اس دل میں رحم، کرم اور ہمت ہے۔ ایسا آدمی غریبوں کو کبھی نہ ستائے گا۔ اس کا عہد سچا ہے جو اس کی راہبری کرے گا وہ چاہے دھوکا کھا جائے لیکن دیا اور دھرم سے کہیں نہ ہٹے گا۔

گرو چرن داس

درسِ صداقت

مانا کہ ہر آنسو میں صداقت کی جھلک ہے
ہر آہ ہے بے سوز مگر بے اثری سے !!
ہر آہ میں خونِ دلِ زخمی کی مہک ہے
ہر اشک ہے برباد الم بے خبری سے

جب دل میں تڑپ ہی نہیں فریاد سے حاصل؟
فریاد ہی کرنا ہو تو فریاد کرو تم !!
یہ بھول ہے سوچو، سطحی یاد سے حاصل ؟
وہ درسِ صداقت بھی مگر یاد کرو تم !!

پیغامِ عمل کیا یوں ہی سونے کے لئے تھا !
اب بھی نہ کھلی آنکھ تو سوتے ہی رہو گے
گزرے ہوئے ایام یہ رونے کے لئے تھا
یہ وقت گزر جائے گا روتے ہی رہو گے

میکش

ہندوستانی صنعت .... عروج وزوال

مغربی مورخین کے بیانات کی روشنی میں

یہ کہنا کہ ابتداء سے ہندوستان ایک زرعی ملک تھا اور آئندہ بھی اس میں صنعتی ملک بننے کے امکانات نہیں ہیں واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس کو تو محض چند سیاسی و معاشی حالات کے تحت ایک زرعی ملک بنا دیا گیا ورنہ یہ نہ صرف ایک زرعی ملک تھا بلکہ اس کی صنعتی حیثیت دور مغلیہ کے زوال تک بھی بہت نمایاں رہی۔ اس دعوی کی دلیل میں مغربی مورخین کے بیانات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مسٹر ویور (Mr. Weaver) مشہور مورخ کا بیان ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں بھی ہندوستان بابل کے ساتھ تجارت کرتا تھا۔ مصر کے مقبروں سے دو ہزار قبل مسیح کی جو لاشیں برآمد ہوئی ہیں وہ اعلیٰ ہندوستانی ململ میں لپٹی پائی گئیں۔ سلطنت روما میں بھی ہندوستانی مصنوعات کا عام استعمال تھا۔ اس بیان کی تصدیق رومی مورخ پلینی (Pliny) کے اس شکایت آمیز جملے سے ہو سکتی ہے کہ "ہر سال سلطنت روما سے بڑی بڑی رقمیں مصنوعات کی خریداری کے سلسلہ میں ہندوستان چلی جاتی ہیں"۔ مشہور مورخ مسٹر ولسن نے (Mr. Wilson) یہ لکھا ہے کہ "صدہا سال سے ہندوستان میں فولاد اور آہن سازی کی صنعت چلی آرہی ہے" دہلی اور دوسرے مقامات میں عہد اشوک کی جو آہنی لاٹیں برآمد ہوئیں ہیں ان سے ان بیانات کی تصدیق ہو سکتی کہ لوہے کی صنعت نے آج سے پندرہ سو سال قبل کس حد تک ترقی کی تھی۔ آسام میں توپیں ڈھالی جاتی تھیں اور خود انگلستان چھری اور کانٹے بنانے کے لئے ہندوستانی فولاد کا خریدار تھا۔ مصر و عرب چین و جاپان سے اس کے تجارتی تعلقات بہت زمانہ پہلے سے قائم ہیں۔ پندرھویں سولھویں صدی تک ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی و آہن سازی نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔

دور مغلیہ میں ہندوستانی مصنوعات کو پورا عروج حاصل رہا۔ شاہان مغلیہ نے ہندوستانی صنعت کی خاص طور پر سرپرستی کی۔ صناعوں کو بلا امتیاز مذہب وملت درباروں سے تنخواہیں اور انعامات ملتے تھے اور بعض عمدہ صنعتی نمونوں کو لاگت سے زیادہ قیمت دی جاتی تھی تاکہ صناعوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہو۔ ڈھاکہ کا ململ، کشمیر کی شال بافی اور لکڑی کی صنعت، بنگال کا ریشم، جنوبی ہند کے تانبے پیتل چاندی اور لوہے کی مصنوعات بین الاقوامی شہرت کی حامل تھیں۔ رنگ، کاغذ، شکر، شیشہ اور عطر کی صنعتیں دور مغلیہ کے زوال تک موجود رہیں۔

۱۶۰۰ء میں انگلستان کے تاجروں کی ایک کمپنی قائم ہوئی جس نے ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے ملکۂ الزبتھ سے فرمان حاصل کیا جس کے یہ الفاظ کہ:۔

"انگلستان کی مصنوعات کا تبادلہ ہندوستان کی خام پیداوار سے کیا جائے"۔

"اور ہندی مصنوعات کو براعظم یورپ کی منڈیوں میں فروخت کیا جائے"۔

اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اس وقت تک ہندوستانی مصنوعات کی طلب یورپی ممالک میں خاطر خواہ موجود تھی یہہ آزادانہ تجارتی حالت ڈیڑھ سو سال تک برابر جاری رہی ۱۷۵۷ء میں پلاسی (Plassey) کی فتح کے بعد لارڈ کلائیو نے پہلی مرتبہ مرشد آباد کو دیکھ کر یہہ الفاظ لکھے ہیں کہ "شہر مرشد آباد مجموعی طور پر دولت، آبادی اور خوش حالی میں لندن سے کم نہیں۔ تقسیم دولت کا اصول نہایت کامیابی سے جاری ہے۔" ۱۸۹۰ء میں یعنی تقریباً ایک صدی بعد سر ہنری کاٹن (Sir Henry Cotton) نے اسی شہر کا حال یوں بیان کیا ہے کہ:-

"ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے کہ شہر مرشد آباد کی تجارت کی مالیت ایک کروڑ روپیہ کے قریب تھی اور آبادی بھی تقریباً دو لاکھ تھی ۱۷۸۷ء میں ڈھاکہ سے تیس لاکھ روپیہ کا ململ برآمد کیا گیا لیکن تیس سال بعد ہی یعنی ۱۸۱۷ء میں یہہ تجارت بالکل ختم ہوگئی یا کردی گئی اور فن پارچہ بافی تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔"

ہندوستانی صنعت کا زوال یوں تو دور مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا لیکن اور بھی بہت سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستان ایک زرعی ملک بن گیا۔ سترھویں صدی تک کپڑے کی برآمد برابر جاری رہی لیکن اس کے بعد ہی برطانیہ کی تجارتی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوئی اور یہہ کوشش کی جانے لگی کہ ہندوستان سے صرف خام پیداوار کی درآمد کی جایا کرے۔ یہہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگلستان کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ۱۷۶۰ء کے صنعتی انقلاب نے غیر معمولی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ اور مشنری کی ایجاد اور کارخانوں کے قیام نے خام پیداوار کی طلب کو بڑھا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی مصنوعات اور خصوصاً کپڑے کی درآمد کے خلاف انگریز تاجرین نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ تامینی یا بندیاں عاید کرے اس لئے کہ ہندوستانی ریشمی اور سوتی کپڑا برطانوی علاقہ میں مقامی کپڑے سے زیادہ سستا فروخت ہوتا تھا۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر امتناعی یا حکمت عملی اختیار کی چنانچہ ۱۸۱۳ء میں ہندوستانی روئی کی مصنوعات کی درآمد پر ۸۱ پونڈ فیصدی کروڑگیری عاید کی گئی اور اس کے خلاف ہندوستان میں برطانوی کپڑے کی درآمد پر ۲ ½ روپیہ فیصدی محصول لگایا گیا جس سے ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہنری ولسن (Henry Wilson) کے یہہ الفاظ کہ

"اگر ہندوستانی صنعتوں کے خلاف امتناعی کاروائیاں نہ کی جاتیں تو باوجود بھاپ کے استعمال کے بھی ہندوستانی صنعتیں نئی صنعتوں کا مقابلہ کرسکتی تھیں۔"

ہندوستانی مصنوعات کے عروج پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ہندوستانی مصنوعات کے زوال کا دوسرا سبب حکومت وقت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے اعتنائی اور لاپرواہی بھی تھی۔ ۱۸۱۳ء سے ہندوستانی مصنوعات کی برآمد میں مسلسل کمی ہوتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۲۰ء میں روئی کی مصنوعات بالکل ختم ہوکر رہ گئیں۔ بقول مسٹر رمیش چندر دت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایسے مراسلات موجود ہیں جن سے یہہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ انگلستان کے پارچہ باف بنگالی پارچہ بافوں کے مقابلہ کا دباؤ محسوس کرنے لگے تھے اس لئے یہ کوشش شروع کردی گئی کہ بنگال میں صرف ریشم کی خام پیداوار پر زور دیا جائے اور صناعوں کو یہہ ترغیب دی جائے کہ

بجائے خانگی طور پر کام کرنے کے کارخانوں میں کام کریں۔

مسٹر ہنری جارج ٹکر Mr. Henry George Tucker نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ذمہ دار عہدہ دار تھے ۱۸۲۳ء کی ہندوستانی صنعت کی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:-

"ہندوستان کی ریشمی مصنوعات اور سوتی و ریشمی کپڑے عرصہ ہوا کہ ہمارے (انگلستان) بازاروں میں آنا بند ہوگئے ہیں اور حال ہی کچھ تو ساٹھ فیصدی کرؤڑ گیری کے اثر سے لیکن خاص طور پر اعلیٰ قسم کی مشنری کے استعمال کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانی مصنوعات یہاں فروخت نہیں ہوتے بلکہ ہماری مصنوعات سے برطانوی ایشیائی مقبوضات کی بہت کافی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس طرح ہندوستان اب اپنی صنعتی حالت سے گذر کر زراعتی ملک بن گیا ہے"

مشین سے بنے ہوئے سامان کا مقابلہ ۔ ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں قدیم درباروں کا زوال اور حکومت ہند کی بے تعلقی و بے اعتنائی بھی صنعتی زوال کے اسباب قرار دئے جاسکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا اقتباسات سے اس کی کافی توضیح ہوسکتی ہے کہ ہندوستان کو کس حد تک زرعی ملک بنایا گیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتداء سے یہہ پالیسی رہی کہ ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے اور برطانوی مصنوعات خریدنے والا ملک بنایا جائے۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک خام مال کی برآمد اور مصنوعات کی درآمد برابر جاری ہے۔

سید کرار علی

تبسّم

حسن پھر بے نقاب ہوتا ہے
عشق پھر بے حجاب ہوتا ہے

پھر کوئی مسکرانے والا ہے
غنچۂ دل کھلانے والا ہے

میری آنکھیں ہیں پھر تماشائی
حسن کی پھر ہے جلوہ آرائی

پھر کوئی چھیڑتا ہے ساز عشق
پھر عیاں ہو رہا ہے راز عشق

ہاں سنبھل جائیں سارے صاحب ہوش
حسن پھر ہو رہا ہے جلوہ فروش

مسکرانے کے دیکھئے انداز!
کہہ رہا ہے جمال سحر طراز!

دیکھئے ان کے حسن نمکیں کو!
دیکھئے جلوہ ہائے رنگیں کو!

دیکھئے مسکرائے جاتے ہیں
دل کی دنیا بنائے جاتے ہیں

ہے ابھی ابتدا تبسم کی
ہے نرالی ادا تبسم کی

دل میں طوفاں یوں ہی اٹھائے جا
ہاں اسی طرح مسکرائے جا

سید سعادت علی

آرزوئے زلیت

کعبہ و دیر سے پیام آئے
تیری جانب جو چند گام آئے

لب پہ مستی میں تیرا نام آئے
ہوش اتنا کہ ناتمام آئے

عشق کا معرکہ معاذ اللہ
کیسے کیسے جوان کام آئے

پھر مجھے آرزوئے زلیت ہوئی
پھر ترے لب پہ میرا نام آئے

یوں بسر کر جہانِ فانی میں
صبح رخصت نہ ہو کہ شام آئے

پھر دکھائی ہے ان کو قدرتِ حسن
پھر کوئی خوش نصیب کام آئے

ابھی خاصانِ عشق باقی ہیں!
کیوں نویدِ صلائے عام آئے

سن رہے ہیں، تمہارا افسانہ
کہیں شاید ہمارا نام آئے

دل کی مطلب پرستیاں مت پوچھ
وہ خدا ہے جو دل کے کام آئے

راہِ تسلیم عشق یوں طے کر!!
منزلِ حسن سے سلام آئے

ان کی ہستی میں کھو گیا میں بھی
ان کے جلوے ان ہی کے کام آئے

نجم صاحب کو راستہ دینا
مذہبِ عشق کے امام آئے

نجم آفندی

چھوڑ دے

بجلیاں دل پر گرانا چھوڑ دے
منہ پھرا کر مسکرانا چھوڑ دے

مل گئے پر رنج اتنا کس لئے؟
چھوڑ دے اب تو جلانا چھوڑ دے

دید کو آنکھیں ترستی کیوں رہیں؟
سامنے آ منہ چھپانا چھوڑ دے

دیکھ، ظاہر ہو نہ جائے دل کی بات
جھوٹ سچ باتیں بنانا چھوڑ دے

بیٹھتے اٹھتے سنورتے گھورتے؟
اس طرح فتنے اٹھانا چھوڑ دے

کچھ خطا کچھ جرم کچھ میرا قصور؟
بے سبب ظالم ستانا چھوڑ دے

یہ شرارت یہ ادا اچھی نہیں؟
آگ پانی میں لگانا چھوڑ دے

جان کر بھی تیرے کوچے کی فضا
کوئی کیونکر آنا جانا چھوڑ دے

وہ ہیں جب انجان تو بھی اب عزیز
رسم و رہ ملنا ملانا چھوڑ دے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

سب رس اپریل ۱۹۳۸ء

محبت کی خرید و فروخت

محبت ایک ساحرانہ اور پُرکشش قوت ہے۔ وہ ہر ماحول میں ایک حسین تصویر کھینچ سکتی ہے۔ تمھارا مسکن ایک حقیر جھونپڑا ہو خواہ عالیشان محل، اس مسلک میں کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے۔ اگر تم محبت میں مبتلا ہو تو تمھاری دنیا قابلِ صد رشک ہے۔ ہر جا خوبصورتی اور شادمانی کی گنگا بہتی نظر آئے گی۔

افسوس کہ موجودہ زمانہ ایک مادی اور مالی زمانہ ہے۔ ہر چیز کو دولت کے پیمانہ پر ناپ کر جانچا جاتا ہے۔ جب کبھی محبت میں ناکامی ہوتی ہے، تو اس زخم خوردہ دل پر دولت ہی کے مرہم کی پٹی باندھی جاتی ہے۔ جب کسی بیوی کو محبت کی کھینچ تان میں اپنے شوہر سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے آرام و آسائش کے سامان فراہم کر لیتی ہے۔

محبت کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جب کیوپڈ کی لطیف و نازک تیر و کمان میں زر و دولت کی مداخلت شروع ہو جائے تو محبت کا حساس دیوتا تھرا جاتا اور فنا ہو جاتا ہے۔

اکثر لڑکیاں دولت کو حبالۂ عقد میں لانے کا عزم صمیم کر لیتی ہیں، لیکن اس ارادہ کی تکمیل میں عموماً وہ نااہل ثابت ہوئی ہیں ایسے مرد بھی ہیں کہ جب شادی کی خواہش ہوتی ہے تو کسی جائیداد کی مالکہ کی تلاش کرتے ہیں لیکن اکثر دیکھا یہ گیا کہ وہ محبت کے ہمہ گیر دام میں ایسے گرفتار ہو جاتے ہیں، اور ایک دلآویز بیخودی، راحت زار و ماں میں کچھ ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ زر و دولت کا بھوت ان کے دل و دماغ سے معدوم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دولت کے دیوتا کے سامنے اپنی روحوں کی بھینٹ چڑھا دی، جن کا ہر خیال حرص و ہوس سے داغدار ہے۔ وہ برسوں بیشتر خیالی منصوبے باندھتے بیٹھتے ہیں، تمام وقت یہی امید پیش نظر ہوتی ہے کہ آخر کار انھیں بیکر دولت کا وصال نصیب ہو جائے گا۔ اس طرز کے لالچی ہمیشہ شاطر و چالاک دیکھے گئے ہیں اور اپنی چالبازیوں کو بکمال خوبی انجام دیتے ہیں۔ حصول مقصد کے لئے یہ لوگ دھوکہ، جھوٹ، چوری حتیٰ کہ قتل و خون کو بھی آلۂ کار بنا لیتے ہیں ان کے سینہ میں دل نہیں، انسانی ہمدردی کا نام و نشان نہیں، گویا یہ مادہ پرست بے روح مخلوق ہیں۔ یہ بے وقوف سوچتے ہیں کہ ان کی من مانی دولت اگر ہاتھ آ جائے تو وہ مسرت کی انتہائی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ آخر کار انھیں جس حوصلہ شکن نامرادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی صحیح تصویر کھینچنے کے لئے ہمارے یہاں الفاظ نہیں ہیں۔ کیونکہ روح کو مطمئن کرنے والی مسرتیں ایسے خود فروش اور خود غرض لوگوں کے حصہ میں نہیں آ سکتیں۔ دولت کی راہ چلتے ہوئے محبت کے سکون بخش سرور، وجد آور کیف سے بغلگیر نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف جو اپنے کو خود دھوکہ میں رکھتے ہیں، یہاں تک کہ دولت کی ریل پیل میں سب کچھ بھلا بیٹھتے ہیں، انھیں اپنے عادات و اطوار کا خوفناک صلہ ملتا ہے۔

سچی خوشی اسی وقت میسر ہوتی ہے جب واقعی محبت کی جائے۔ کسی کی محبت کی خاطر دنیا کی ہر چیز، بلکہ زندگی کو بھی قربان کر دینے کا احساس پیدا ہو جائے تو محبت کے حقیقی رومان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب تم محبت کو فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہو، تو سمجھ لو! کہ چند حقیر ٹکڑوں سے اپنی روح کا تبادلہ کر رہے ہو۔

(ملفوظ)

یس۔ بی۔ اننتا

یار باش

ایک مزاحیہ شاہکار

فارسی ہم نے بھی پڑھی ہے اور بڑی دور تک پڑھی ہے۔ مگر "یار باش" کی ترکیب اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ "سگ باش" تو ایک ضرب المثل میں موجود ہے چنانچہ کہتے ہیں "سگ باش برادر خورد مباش" مگر "یار باش" نہ کسی فارسی محاورہ میں سنا اور نہ کسی ضرب المثل میں دیکھنے میں آیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے۔ میں کیا خود آپ نے بھی کہا اور سنا ہوگا کہ فلاں صاحب "بڑے یار باش" ہیں۔ اب رہا "یار باش" سے مطلب۔ تو یہ لفظ ایسا گہرا ہے کہ اس کی "رتھاہ" کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے معنی نہ "یار" کے ہیں۔ نہ "دوست" کے اور نہ "مصاحب" کے۔ میں نے تو اس لفظ کو صرف ایسے لوگوں کے لئے استعمال ہوتے دیکھا ہے جن کی صحبت میں وقت بآسانی کٹ جائے۔ شرابی اپنے ایسے دوست کو "یار باش" کہتے ہیں جو ان کو مفت کی پلائے۔ یار لوگ اپنے ایسے دوست کو "یار باش" کہتے ہیں جو پھبتیوں، ضلع جگت اور بیہودہ مذاق سے محفل کو گرما دے۔ شرفاء میں یہ لفظ ایسے شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ہر فن مولا ہو۔ اور جس کی صحبت میں بیٹھ کر زندگی کے کچھ تلخ گھنٹے آرام سے گزر جائیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو اس لفظ کی تعریف کرنا مجھ جیسے شخص کے لئے مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو ایک ایسی محفل کا نقشہ دکھاؤں جہاں ایک "یار باش" بھی ہوں۔ ان کی گفتگو آپ کو سنا دوں، ان کا رکھ رکھاؤ آپ کو دکھا دوں۔ اور پھر آپ سے پوچھوں کہ براہ کرم آپ ہی بتائیے کہ "یار باش" کی تعریف کیا ہے۔ لیکن میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ آخر میں آپ بھی یہی فرمائیں گے کہ یہ وہ لفظ ہے جو "شرمندۂ معنی" نہیں۔ "یار باش" دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر الفاظ میں اس کی صحیح تعریف نہیں ہو سکتی۔

احسن اللہ خاں کے نام کے ساتھ "خانی" کا دم چھلّہ تو لگا ہوا ہے مگر پٹھان نہیں ہیں۔ نام کے شروع میں "احسن" ضرور ہے مگر "حسن" کا کوئی تعلق ان کی شکل و صورت سے نہیں۔ اب رہا "اللہ" تو "اللہ" ان کے ساتھ کیا۔ ہر شخص کے ساتھ ہے اس لئے اس پر اعتراض کرنے کا موقع ہی نہیں۔ اب رہی خاندانی شرافت و وجاہت تو وہ بس "اللہ ہی اللہ" ہے مگر میرا یار ایسے لوگوں میں بھی گھس جاتا ہے جو دقیانوسی خیالات کے ہیں اور ایرے غیروں نتھو خیروں کو اپنے پاس جگہ دینا اپنی خاندانی عزت کو بٹہ لگانا سمجھتے ہیں۔ امیر نہیں مگر امیر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پیتا نہیں مگر پینے والوں کی ہر صحبت میں شریک رہتا ہے۔ چالیس سے گزر چکا ہے مگر بچوں میں بچہ اور بڈھوں میں بڈھا ہے اور جہاں جاتا ہے وہاں یہ اللہ کا بندہ شمع محفل بن جاتا ہے۔ پڑھا لکھا کچھ واجبی ہی واجبی ہے مگر جب حالات زمانہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب دنیا کا سارا انتظام صرف اس کی عقل پر چل رہا ہے۔ شاعر تو نہیں مگر "شعر بند"* ضرور ہے۔ جب تعلّی پر اُتر آتا ہے تو میر ہوں یا مرزا سب بارہ پتھر باہر ہو جاتے ہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر کوئی اس کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ ہر شخص اعتراض پر اعتراض جڑتا ہے۔ آپس میں خوب چوٹیں چلتی ہیں مگر کیا مجال کہ ذرا کسی کے دل پر میل آجائے ہنسی خوشی بیٹھتے ہیں، ہنسی خوشی باتیں کرتے ہیں اور ہنسی خوشی اٹھتے ہیں اور ہر شخص کے منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "بھئی احسن بھئی کیا "یار باش" آدمی ہے"۔

* "شعر بند" کی وہی ترکیب جو "جھپر بند" کی ہے۔

میں اکثر ایسی صحبتوں میں گیا ہوں جہاں میاں احسن "شمع محفل" تھے اور اس طرح میری اور ان کی "ملاقات" بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ گئی ہے ۔ لیکن اب بھی میں ان حضرت کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہوں ۔ ہاں یہ ضرور جان گیا ہوں کہ ان کی "یار باشی" کا اصلی گر یہ ہے کہ یہ کسی دوسرے پر کبھی حملہ نہیں کرتے اور گفتگو کا مرکز اپنے آپ کو بنا لیتے ہیں ۔ خود یاروں کے حملے سہتے ہیں ۔ خود اپنی مدافعت میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں ۔ اپنی حمایت میں جو تکما لڑتے ہیں اور اس طرح ہر محفل بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ختم ہو جاتی ہے ۔ یعنی بے وقوف اہل محفل "احسن" کو بے وقوف سمجھتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ خود بے وقوف بنکر ان سب کو بے وقوف بناتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا کے اگر چند لمحے ہنسی خوشی میں گزر جائیں تو بہت غنیمت ہے وہ جانتا ہے کہ جہاں دو آدمی مل کر بیٹھیں گے وہاں کسی نہ کسی وقت اختلاف رائے ہونا ضرور ہے اور جہاں اختلاف رائے ہے وہاں دلوں میں فرق آنا ایک لازمی امر ہے اس لئے وہ جاتے ہی گفتگو کا رنگ بدل دیتا ہے ۔ اور کوئی نہ کوئی ایسی بات چھیڑ دیتا ہے کہ سارے حملے اس کی ذات پر شروع ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلۂ گفتگو اس طرح بڑھتا ہے کہ اگر وقت کی قلت اور لوگوں کی ضرورت محفل کو ختم کرنے پر مجبور نہ کرے تو یہ گفتگو بھی کبھی انجام کو نہ پہنچے ۔

محفل میں آتے ہی ان حضرت کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اہل محفل پر نظر ڈالکر یہ دیکھ لیں کہ ان میں کن کن خیالات کے لوگ ہیں اور کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اس چیز کا اندازہ کرنے کے بعد ہی یہ گفتگو میں دخل دیتے اور تھوڑی ہی دیر میں اس موضوع کو اپنے سے متعلق کر لیتے ہیں ۔ اب اصل بحث تو گئی جہنم میں ۔ سب کے سب ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں دوسرا کوئی ہو تو زچ ہو جائے مگر نہ اس شخص کی زبان رکتی ہے اور نہ یہ دبنے کا نام لیتا ہے ۔ فقرے بھی چلتے ہیں ۔ شاعری بھی ہوتی ہے ۔ بے تکی بحث بھی ہوتی ہے ۔ مذاق بھی ہوتا ہے اور آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ یہ حضرت ہارتے ہیں اور نہ اہل محفل ۔ اور سب کے سب اس بحث کو آئندہ کے لئے "کونڈے کے نیچے ڈھک"[1] اٹھ کھڑے ہوتے ہیں نہ ان کو کسی سے رنج ہوتا ہے اور نہ کسی اور کو ان سے ملال اور یہی وہ چیز ہے جس کو محاورہ میں "یار باشی" کہتے ہیں ۔

یہ تو ہوا مسٹر احسن کے طریقۂ گفتگو کا مجمل بیان ۔ اب میں بعض واقعات سے اس کی توضیح کرتا ہوں تاکہ "یار باشوں" کی اصلی غرض کا اندازہ ہو سکے اور اگر کوئی صاحب "یار باش" بننا چاہیں تو ان حضرت کے اصول کو شمع ہدایت بنا سکیں ۔

کئی برس کی بات ہے کہ ہم چھ سات دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ اسی زمانہ میں فورڈ کی نئی وی ۸ موٹر اور شورلیٹ کا نیا ماڈل آیا تھا ۔ احمد نے وی ۸ لی تھی اور محمود نے شورلیٹ ۔ اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی ۔ احمد اپنی موٹر کو اچھا کہتے تھے اور محمود اپنی موٹر کو ۔ احمد محمود کی موٹر کی خرابیاں بتا رہے تھے اور محمود احمد کی موٹر کی ۔ اسی سلسلہ میں ایک دوسرے کے خرابیٔ دماغ کی بحث بھی چھڑ جاتی تھی ۔ غرض جوش بہت بڑھا ہوا تھا ۔ اور کیوں نہ بڑھتا ۔ جب بعض دوست احمد کا ساتھ دیتے تھے اور بعض محمود کا ۔ یہاں یہ بحث چل رہی تھی کہ اتنے میں مسٹر احسن رونق افروز ہوئے ۔ سلام علیکم و علیکم السلام کے بعد انہوں نے دیکھ لیا کہ مجلس کا رنگ کچھ بگڑا ہوا ہے

---

[1] اس فقرے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو کبھی میرٹھ کی کسی سرائے میں ٹھیرا ہو وہاں بھٹیاریوں میں جو لڑائی چلتی ہے وہ کئی کئی دن ختم نہیں ہوتی دنیا میں رہ کر سونا اور کام کرنا بھی ضرور ہے اس لئے یہ لڑنے والیاں آٹے کا کونڈا لیتی ہیں اور اس کو اوندھا کر کہتی ہیں کہ اب کل کسی فرصت کے وقت یہ لڑائی پھر شروع ہوگی ۔ گویا اس بحث کو کونڈے کے نیچے "تا فرصت آئندہ" بند کر دیا جاتا ہے ۔

پہلے تو انہوں نے اس جھگڑے کی وجہ پوچھی اور پھر خود ہی حکم (ج) بنگئے۔ کہنے لگے " ارے بھائیو تم خواہ مخواہ لڑتے ہو۔ آج کل کی موٹریں بھی کوئی موٹریں ہیں۔ بیل سے ٹکر ہوئی مڈ گارڈ ٹوٹ گیا۔ ذرا گڑھے میں گریں " دھڑا " دو ٹکڑے ہوگیا پتہ بیٹھ گیا۔ یہ اب کوئی موٹریں رہی ہیں ٹین کے جاپانی کھلونے ہیں جتنی رقم ہوتی ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ میں لگا دیجاتی ہے۔ اب رہے کل پرزے تو ان کا اللہ ہی مالک ہے اور پھر اس پر یہ غضب ہے کہ میاں احمد کہتے ہیں کہ میری موٹر اچھی اور میاں محمود کہتے ہیں کہ میری موٹر اچھی " احمد نے جل کر کہا کہ " تو آخر آپ کا مطلب کیا ہے " احسن نے کہا " مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ اچھی چیزوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بری چیزوں کا مقابلہ ہی کیا۔ کبھی کوئی یہ بحث بھی کرتا ہے کہ میں تم سے زیادہ بے وقوف ہوں۔ بندۂ خدا اگر بحث ہی کرنی ہے تو پہلے کسی اچھی موٹر کو معیار بناؤ اس کے بعد اپنی موٹروں سے اس کی ہر چیز ملاؤ۔ جب کہیں جاکر کوئی نتیجہ نکلے گا۔ اور جب تمہارے سامنے ایک معیار موجود ہے تو پھر تمہیں دور جانیکی کیا ضرورت ہے۔" محمود نے کہا کہ " وہ معیار کونسا ہے " احسن نے کہا کہ " میری وکلن موٹر " یہ سنتے ہی سب یاروں نے ایک قہقہہ مارا اور کہوں نہ مارتے جب موٹر کا معیار مسٹر احسن کی وکلن موٹر قرار پائے ان کی موٹر روز ہی دیکھتے تھے مگر یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ ۱۹۰۳ء کی موٹر وی ۸ اور شیورولٹ کا معیار ۱۹۳۶ء میں بنائی جائے گی۔ پٹرول سے چلتی تھی اس لئے لغوی معنی میں موٹر تو کہی جاسکتی تھی مگر اس کی ظاہری اور باطنی حالت کے لحاظ سے اس کو موٹر سے تعبیر کرنا خود لفظ " موٹر " کی توہین کرنا ہے بلندی کے لحاظ سے اونٹ گاڑی ساخت کے لحاظ سے بگھی۔ چال کے لحاظ سے چھکڑے اور آواز کے لحاظ سے چرخے کی تعریف اس پر پوری طرح صادق آتی تھی جب ہنستے ہنستے سب تھک گئے تو میاں احسن نے بہت متانت سے کہا کہ " دیکھو بھئی تم یہ سمجھتے ہوگے کہ میں تمہارے ہنسنے سے برا مان جاؤں گا تو جناب اس سے آپ بفکر رہیئے۔ آپ کے ہنسنے سے میری موٹر کی خوبیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ جیسی تھی وہ ہے اور آئندہ رہے گی اگر آپ کو اس کے خلاف کچھ فرمانا ہے تو اس کا جواب دینے کے لئے بندہ حاضر ہے۔ مگر براہ مہربانی میری دلیل کو محض ہنسکر توڑنے کی کوشش نہ کیجئے۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے نہ کہ ہی ' ہی ' ہی سے " ناصر نے کہا کہ " یہ آپ کی موٹر صاحبہ کب عدم سے وجود میں آئی تھیں " احسن نے کہا " ۱۹۰۳ء میں " ناصر نے کہا " جی نہیں۔ یہ مرزا سودا کے زمانہ میں بھی تھیں چنانچہ انہوں نے انہی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے لیکن مجھے از روئے تواریخ یاد ہے شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار " احسن نے کہا " بہت خوب اگر آپ کی یہی حجت ہے تو اسی پہلو سے چلئے۔ آپ اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ یہ موٹر جنت کی ایک سواری ہے اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دنیا کی بنی ہوئی ہر چیز سے بہتر ہے۔ بھلا فرشتوں کی بنائی ہوئی چیز کا مقابلہ کہیں مسٹر فورڈ کے کارخانے والے کرسکتے ہیں " ناصر نے کہا " مگر شیطان اس پر بیٹھ کر نکلا تھا " احسن نے کہا کہ " اس سے کیا ہوتا ہے اگر رولز رائس پر کوئی گدھا بیٹھ کر نکلے تو اس سے رولز رائس کی کسی خوبی میں فرق آسکتا ہے۔ اور کچھ ارشاد ہو " میاں ناصر تو اتنی ہی بحث میں ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر خالد نے اب اس سلسلۂ گفتگو کو لیا اور کہا " حضرت۔ یہ موٹر اس زمانہ کی ہے جب میں اور آپ شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اب اس کو موٹر کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے ایسی پرانی چیزیں اب بھلے آدمیوں کے نہیں کباڑیوں کے کام کی ہیں " احسن نے کہا " تو آپ کی بحث کا یہ مطلب ہے کہ پرانی چیزیں دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔ مجھے تو یہاں ایک بھی نظر نہیں آتا جو بڑھا ہونیکے بعد اپنے بال بچوں سے کہے کہ میرا گلا گھونٹ دو۔ اب میں دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ حضرت نیا نو دن اور پرانا سو دن۔ کیوں جی۔ یہ دنیا بھی تو

بہت پرانی ہوگئی ہے ۔ اتنے دن سے برابر چل رہی ہے پرزے گھس گئے ہونگے اس کے متعلق کوئی نہیں کہتا کہ اس کو کباڑئے کے ہاں بھیجدو ۔ اب یہ ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہی ہے ۔ میں یہ زبانی جمع خرچ نہیں جانتا ۔ میری موٹر میں کوئی خرابی بتاؤ"۔ احمد نے کہا "اونچی بہت ہے فیشن کے خلاف ہے" احسن نے کہا "بھئی واہ کیا سمجھ کی بات کی ہے میاں قد اونچا اچھا یا ٹھنگنا" میاں محمود ٹھنگنے تھے اس لئے انہوں نے اس اعتراض کو اپنے اوپر لیکر کہا "نہ اتنا اونچا کہ سرا نچے کا بانس معلوم ہو" احسن نے جواب دیا کہ اس کا تصفیہ تم خود بآسانی کرسکتے ہو کہ سرانچے کا بانس ہونا اچھا یا دھنیئے کی مٹھیا ۔ پرسوں کا فٹبال میچ بھول گئے کہ کس طرح لوگوں کے پیچھے کھڑے اچک اچک کر دیکھ رہے تھے ۔ دیکھئے صاحب موٹر کے اونچے ہونے میں کئی فائدے ہیں ۔ نیچی موٹر کے سامنے اگر کوئی پتھر آجائے تو انشاء اللہ کوئی نہ کوئی حصہ ضرور شہید ہوجائے گا ۔ اب رہی ہماری موٹر تو اس کے سامنے پتھر تو کیا اگر پہاڑ بھی آجائے تو خبر نہ ہو موٹر کے نیچے سے صاف نکل جائے"۔ قاسم نے کہا "اونچی موٹر الٹ جلدی جاتی ہے" احسن نے جواب دیا "بیوقوفی سے چلاؤ تو موٹر کا الٹنا لازمی ہے خواہ وہ اونچی ہو یا نیچی دیکھنا یہ ہے کہ نقصان کس میں زیادہ ہوتا ہے اونچی میں یا نیچی میں ۔ یہ تو تم نے سنا ہوگا کہ اونٹ پر سے گرنے میں چوٹ کم لگتی ہے اور گدھے پر سے گرنے میں زیادہ ۔ کیوں کہ اونٹ پر سے گرتے گرتے آدمی سنبھل جاتا ہے ۔ یہی حال موٹر کا ہے آخر اونچی موٹر کے لڑھکنے میں کچھ تو دیر لگے گی ۔ اگر اتنی دیر میں بھی انسان نہ سنبھل سکے تو یہ خود اس کا قصور ہے نہ کہ موٹر کا ۔ اب رہی آج کل کی نیچی موٹریں تو جناب ان میں ماشاء اللہ ایسا مضبوط ٹین استعمال ہوتا ہے کہ ایک ہی قلابازی میں بیچ کر بتاشہ ہوجاتی ہیں اور ہماری موٹر تو حضرت یہ خدا کے فضل سے بیس پچیس دفعہ لڑھک چکی ہے اب تک جیسی کی ویسی ہے ۔ قسم خدا کی فولاد کا باڈی ہے ۔ کہو تو پہاڑ سے جاکر ٹکر دیدوں ۔ ذرا کہیں سے دب جائے تو میرا ذمہ"۔ نصیر نے کہا "اور یہ جو چلنے میں غل مچاتی ہے اس میں بھی کوئی خوبی ہے"۔ احسن نے کہا "اور کیا آپ کی رائے میں یہ برائی ہے ۔ میں نے تو جان بوجھکر اس کی یہ "آواز محشر" قائم رکھی ہے ۔ میاں آج کل کے زمانہ کو دیکھو ذرا کچھ اونچ نیچ ہوئی اور "چل میرے بھیا عدالت کو" چھوٹتے ہی سوال ہوتا کہ کیا انہوں نے موٹر کا ہارن دیا تھا ۔ کیا ہلوک کو یہ باور کرنے کا موقعہ تھا کہ کوئی موٹر قریب سے گزر رہی ہے یا گزرنے والی ہے ۔ ہم بارہ برس سے اس موٹر میں بیٹھ رہے ہیں ہماری موٹر کے نیچے آدمی تو کیا کبھی چوہے کا بچہ بھی نہیں آیا ۔ اور کیوں آنے لگا جب منٹوں پہلے تمام سڑک والے واقف ہوجاتے ہیں کہ مسٹر احسن کی موٹر آرہی ہے پولیس نے زبردستی ایک دفعہ چالان کردیا تھا مگر میں نے مجسٹریٹ صاحب سے کہا کہ جناب والا اس مقدمہ میں کسی شہادت لینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ تھوڑی دور میری موٹر میں بیٹھکر چلئے ۔ اس کے بعد اگر آپ کی رائے ہو کہ اس موٹر کے نیچے کوئی آسکتا ہے تو جو چاہے سزا دیجئے" وہ بیچارا کچھ سمجھدار آدمی تھا راضی ہوگیا موٹر میں آکر بیٹھا ۔ شوفر نے موٹر اسٹارٹ کی ایک دفعہ ہی موٹر نے ایسی چیخ ماری کہ غریب اچھل پڑا ۔ کہنے لگا کہ "ول انجن پھٹ جائے گا" میں نے کہا ۔ جناب آپ گھبرائیں نہیں ۔ چالیس برس میں جب اس کا انجن نہیں پھٹا تو اب کیوں پھٹنے لگا"۔ بہرحال موٹر چلی ۔ تھوڑی ہی دور جانیکے بعد صاحب نے کہا "ول ۔ ہم سمجھ گیا موٹر واپس لے چلو"۔ اجلاس پر آنے کے بعد بلا شہادت لئے مقدمہ خارج کردیا اور لکھا کہ "اس موٹر میں ہارن کی ضرورت نہیں ہے ۔ اگر اس کے آنے سے پانچ منٹ پہلے راستے والے ہوشیار ہوکر اپنی حفاظت کا بندوبست نہ کریں تو یہ خود ان کا قصور ہے"۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ موٹر میں اتنی آواز ہونا خوبی میں داخل ہے

یا برائی میں" احمد نے کہا "یہ سب کچھ ہے مگر آپ کی موٹر کی رفتار خوب ہے۔ ع کہیے تو کہ بادِ بہاری چلی" احسن نے کہا:۔ "جی ہاں صحیح ارشاد ہوا گویا آپ کی رائے میں تیز رفتاری موٹر کی خوبی میں داخل ہے۔ حضرت۔ تیز چلنے والا ہی گرتا ہے۔ ذرا اس تیز رفتاری کی تعریف میاں قاسم سے پوچھو۔ پرسوں ہی کا واقعہ ہے کہ آپ کی تیز رفتاری نے دو بھلے آدمیوں کو جنت نصیب کر دیا تھا وہ تو کہو اللہ نے ان کو امیر بنایا ہے جو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ مجھ جیسا کوئی غریب آدمی ہوتا تو خدا معلوم کتنے دن جیل کی ہوا کھاتا اور اس کی رفتار ایسی بری کونسی ہے خاصی نو دس میل فی گھنٹہ جاتی ہے تم میں سے کوئی اس میں بیٹھا ہی نہیں۔ یونہی خواہ مخواہ اعتراض ٹھونک دیا"۔ رام کشن نے کہا "کیوں نہیں بیٹھا، میں بیٹھا ہوں وہ جھٹکے پڑے ہیں کہ پیٹ میں جو کچھ تھا الٹ پلٹ ہو گیا۔ احسن نے کہا "لیجئے آپ کی سنیئے۔ اجی لالہ جی۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ کھانا ہضم ہو گیا۔ اس موٹر میں یہی تو کمال ہے کہ ناکوں ناک کھا کر بیٹھو اور جب اترو تو یہ معلوم ہو کہ کچھ کھایا ہی نہیں۔ اگر ہر اسپتال میں ایسی ایک ایک موٹر رکھ لیجائے تو بدہضمی کے مریضوں کو دوا دینے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ذرا موٹر میں بٹھا کر دو ایک میل کا چکر دیا۔ اور بدہضمی رفو چکر ہوی"۔ احمد نے کہا "تو آپ کی رائے میں بدہضمی پیٹ کے ملنے سے جاتی ہے۔ یہ تو حکمت کا ایک نیا اصول معلوم ہوا" احسن نے کہا "نیا اصول کیوں یہ تو بہت پرانا اصول ہے۔ بدہضمی کیا ہے۔ معدہ میں غذا کا جم جانا اور جمنے کی وجہ سے سدے پڑ جانا۔ جامنوں کو کس طرح نرم کیا جاتا ہے۔ برتن میں ڈالکر ہلانے سے، جب ہلانے سے جامنیں گھل جاتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ موٹر میں ملنے سے پیٹ کے سدے نہ ٹوٹ جائیں"۔

بہرحال اس طرح کی گفتگو کا سلسلہ کوئی تین چار گھنٹہ تک چلتا رہا۔ رات زیادہ آگئی تھی اس لئے سب اٹھے کوئی تو دل میں کہتا تھا کہ "یہ احسن کیسا بیوقوف شخص ہے۔" کوئی کہتا تھا "الٹی کھوپری کا آدمی ہے" کوئی کہتا تھا کہ "بڑا لسان ہے۔" کوئی کہتا تھا "بڑا خوش مذاق ہے" مگر سب یہ ضرور سمجھتے تھے کہ بڑا دلچسپ اور یار باش ہے لیکن باوجود اس کے یہ کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے خود بیوقوف بنکر مجلس کو گرما دیا اور دو دوستوں کی گفتگو کو اتنا نہ بڑھنے دیا کہ رنجش تک نوبت پہنچ جاتی۔

یہاں چلتے چلتے یہ بھی سن لیجئے کہ مسٹر احسن کی اس نایاب موٹر کا کیا حشر ہوا۔ کوئی پرزا ٹوٹ گیا تھا وہ بنوا کر ڈالا۔ اس الٹ پھیر میں پچاسی روپے خرچ ہوئے اسی زمانہ میں ایک رگبی موٹر ان کو پسند آگئی خرید لی۔ گارج ایک تھا نئی موٹر اس میں رکھی گئی پرانی صحن میں کھڑی کر دیگئی۔ برسات کا موسم تھا۔ وہ گلنی شروع ہوئی آخر بیچنے کی فکر ہوئی سو روپے میں ایک کباڑئے سے سودا ہوا۔ بیس روپئے شوفر صاحب ہضم کر گئے۔ اسی روپے ان کے پلے پڑے۔ ان میں پانچ روپئے ملا کر پچاسی کارخانہ والے کو دئے اور اس طرح موٹر بھی گئی اور پانچ روپیے ساتھ لے گئی۔ یہ جلے تو اس وقت جب ان کو معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن کباڑئے نے اس موٹر کا صرف میگنیٹو ایک سو پچاس روپئے میں بیچا۔ رگبی موٹر سیکنڈ ہینڈ تھی اور بہت گھسی پسی مگر ان کے پاس آنیکے بعد اس کا مقابلہ دوسری کوئی موٹر نہیں کر سکتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ یہ خود اس کو کوئی لاجواب چیز سمجھتے ہوں بلکہ تھا یہ کہ یار دوستوں کی گفتگو میں لطف پیدا کرنے کے لئے وہ اس سڑیل موٹر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے لوگ اعتراض جڑتے تھے یہ جواب دیتے تھے طبیعت میں مذاق تھا۔ اس لئے محفل چمک جاتی تھی۔ اور اس مزے کی باتوں میں کئی کئی گھنٹے گزر جاتے تھے۔

ان حضرت نے اس دوسری موٹر کو ایسا رگڑا ایسا رگڑا کہ دو ہی برس میں ٹھیکرا ہو گئی۔ یہ تیسری موٹر لے آئے ہیں اور

رنگین موٹر ان کے بچوں کی سواری میں ہے مگر اب بھی کسی کی مجال نہیں کہ رولز رائس کا مقابلہ اس ٹھیکرے سے کر کے ان کو قائل کر سکے اور قائل کر بھی کس طرح سکتا ہے جب ان کو دراصل موٹر سے کوئی غرض نہیں۔ غرض ہے تو صرف یاروں میں بیٹھ کر لطف صحبت پیدا کرنا ہے ان کی تیسری موٹر کے پیچھے ان کے دو دوست زاہد اور عابد بہت بُری طرح پڑے ہیں۔ یہ اپنی موٹر کو آسمان پر چڑھاتے ہیں اور وہ تحت الثریٰ میں پہنچانا چاہتے ہیں جہاں یہ حضرت اور اُن کے دوست ملے خواہ وہ کوئی عام محفل ہو یا گوشۂ تنہائی۔ اس نئی موٹر کا ذکر نکلنا لازمی ہے۔ گھنٹوں اس پر گفتگو ہوتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا کہ آخر یہ سچ کہتے ہیں یا وہ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ احسن دون کی لیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ چلو اس طرح یاروں کا دل بہل جاتا ہے اور دن بھر کی کوفت دور ہو جاتی ہے میں نے کئی دفعہ ان تینوں میں یہ گفتگو ہوتے سنی ہے اور میری یہ رائے قائم ہوئی کہ ان کے دوست سمجھتے ہیں کہ احسن بیوقوف ہے اور میاں احسن سمجھتے ہیں کہ ان یاروں نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔

(باقی)

مرزا فرحت اللہ بیگ بی اے

نوائے گل فروش

آئے ہیں مرے پھول ستاروں کے وطن سے
ہیں پھول بڑے شوخ حسیں لعل یمن سے
پالا ہے شفق نے انھیں صد رنج و محن سے
خورشید کے خوش رنگ سمندر میں جتن سے
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

ہر پھول میں رعنائی شبنم کا تبسم
مہتاب کی ضو پاش تجلی کا تلاطم
توبہ شکن آنکھوں کا پری زاد تکلم
رخسار شگفتہ کے بھڑکتے ہوئے سو خم
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

ہر پھول ہے اک شمع رہ وادی اسرار
شاعر کا دل کیف مکاں نغمۂ بیدار
دوشیزۂ مشرق کا لب شعبدہ آثار
رنگینیٔ فردوس کی تابش کا نگہدار
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

ہر پھول ہے موسیقیٔ جامد کا ستارہ
ٹوٹے ہوئے ثاقب کی اداؤں کا شرارہ
روح طرب انگیز کا خاموش اشارہ
انگڑائیاں لیتی ہوئی فطرت کا نظارہ
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

لو! چاند کے ٹکڑے ہیں مرے پھول مرے پھول
پرویں کے جھمکڑے ہیں مرے پھول مرے پھول
الماس کے بُندے ہیں مرے پھول مرے پھول
یاقوت کے عقدے ہیں مرے پھول مرے پھول
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

زاہد کے لئے پیکر ایماں ہیں مرے پھول
پاکیزہ برہمن کو دل و جاں ہیں مرے پھول
شاہوں کے لئے طرۂ تاباں ہیں مرے پھول
مفلس کو مسرت کے خیاباں ہیں مرے پھول
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

یہ پھول ہیں بھارت کے پرستار کے نغمے
یہ پھول ہیں آزادی گفتار کے نغمے
یہ پھول ہیں اردو کے چمن زار کے نغمے
یہ پھول ہیں قومیت زرکار کے نغمے
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

ہر پھول ہے نقش جگر بلبل خنداں
عاشق کی طبیعت کا ابلتا ہوا وجداں
کاوش کے چھلکتے ہوئے اشعار کا دیواں
زرکاری قدرت کا دمکتا ہوا عنواں
ہے کوئی خریدار کہ ہیں پھول طرحدار

کاوش

پیرس کے لیٹن کوارٹرز

پیرس کا یہ محلہ پیرس کی تمام نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ سب میں بڑی خصوصیت یہاں کا اعلیٰ ذہنی معیار ہے۔ یہاں آرٹ، فلسفہ، سائنس اور زندگی کی نسبت انتہا پسندانہ اور انقلابی خیالات رکھنے والے بستے چلے آئے ہیں۔ یہ جگہ مولیر اور راسین، والٹیر اور روسو کی یاد تازہ کرتی ہے۔ قدیم پیرس کے اسی حصہ کے قہوہ خانوں میں انقلاب کی شمع روشن ہوئی تھی جس کا مقصد حقوق انسانی اور آزادی کے احترام سے دنیا کو منور کرنا تھا۔ یہیں تھیٹر سارا برنہارڈ (THEATRE SARAH BERNHARDT) کے سامنے وہ شاندار ستون ہے جو انقلاب کی فتح کی یاد کو تازہ رکھتا ہے۔ یہیں شہدائے انقلاب کی یادگار ہے جو دنیا کو "آزادی کے ساتھ زندہ رہو یا مر جاؤ" کا پیام دیتی ہے۔ طالب علم، آرٹسٹ اور نقاد کا دل اس جگہ کے نام سے اچھلنے لگتا ہے اور یہی جگہ ان کے دلوں میں پیرس کی یاد تازہ رکھتی ہے۔

یہ درحقیقت طالب علموں کا محلہ ہے جہاں ہر طبقے کے طالب علم رہتے ہیں۔ یہیں پیرس کی سوربون یونیورسٹی ہے جو ماضی کی تمام روایات اور حال کی تمام جدتوں کے ساتھ قائم ہے۔ یہ فرانسیسی قوم کی روح اور زائرین علم کا مکہ ہے۔ دنیا کے کسی مقام پر طالب علم کو اتنی سہولتیں اور اتنی آزادی حاصل نہیں ہے جتنی کے پیرس میں۔ کشادہ مطالعہ گھر، وسیع کتب خانے، عجائب خانے، تجربہ خانے، ہمدرد پروفیسر اور ماہرین فن، بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل ہر طالب علم کے لئے موجود ہیں۔ اظہار خیال اور فکر کی کامل آزادی، تعصب اور مصنوعی ثقاہت کی عدم موجودگی، وسیع النظری اور اخوت انسانی نے پیرس میں علم و فن کی ایک نئی جمہوریہ قائم کی ہے۔ پیرس کی تمدنی تصوریت اسی جامعہ کی بدولت قائم ہے۔

اس دنیا کا سب سے بلند اور قابل احترام قانون "حریت، مساوات اور اخوت" ہیں۔ یہاں کی ہر جگہ، قہوہ خانے، سینما، ناچ گھر سنجیدگی اور بیہودہ تکلف سے پاک لیکن اخوت انسانی اور نشاط زندگی کے گہرے جذبات سے پُر ہے۔ یہاں کی جو چیز سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے وہ قہوہ خانے ہیں جن کی فضا رومانی ہمدردی اور بے تکلفی سے معمور رہتی ہے۔ وہی لوگ جنہوں نے فرانسیسی افسانے پڑھے ہیں یا پیرس دیکھا ہے ان کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ عوام کی پسندیدہ جگہیں ہیں اور تنہائی کے وقت دل بہلانے کے لئے ان سے بہتر کوئی مقام نہیں۔ آپ یہاں کافی کی ایک پیالی یا بورڈو پیتے ہوئے بآسانی خوش مزاج لوگوں کے ساتھ دلچسپ گفتگو میں شریک ہو جائیں گے۔ نوع انسانی کا مشاہدہ کرنے والے کے لئے ایک ایسے قہوہ خانہ سے بہتر کوئی مقام نہیں۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک معمل ہوتا ہے۔ ایک نقاد حسن کو یہاں خوشنما چہروں کا ایک سلسلہ متحرک نظر آئے گا۔ یہاں ہر وقت آپ لوگوں کو کھیلتے اور شوخیاں کرتے ہوئے پائیں گے۔ یہاں سر نیاز سجدوں کے لئے بیتاب ہوتا ہے لیکن جبین کو آستان نہ ملنے کی شکایت نہیں ہوتی۔ ہر قدم پر جبین ایک نیا آستانہ تلاش کر لے سکتی ہے۔ اسی لئے یہاں زندگی اور آسودگی ہم معنی ہیں۔ یہاں رسمی ضوابط انسانی طبیعت کے فطری جوش اور ولولے کا خون نہیں کر سکتے۔ یہاں اخلاقی اور مذہبی ضوابط انسان کی روح کو پامال کر کے اس کو زندگی سے محروم نہیں کر سکتے۔ یہاں کام ایک ناگوار فرض اور ناگزیر مصیبت نہیں ہے

جس سے روح پر افسردگی مسلط ہو جاتی ہے۔ یہاں کام اپنے فطری ذوق کی تسکین، اپنی خلقی استعداد کی تکمیل اور اپنے ولولۂ حیات کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ غرض یہاں کی زندگی ایک خواب معلوم ہوتی ہے جس میں انسان تمام روحانی اور مادی نعمتوں سے لطف اٹھاتا ہے۔

یہاں کی کشادہ سڑک پر اگر آپ دن میں تفریح کے لئے نکل جائیں تو حسن اور معصومیت سے ابلتا ہوا، طالب علمانہ زندگی کا ایک سرچشمہ نظر آئے گا۔ اپنے اپنے لکچروں سے واپس آتے ہوئے اور ان کو سننے کے لئے جاتے ہوئے طالب علموں سے آپ کے کندھے چھلیں گے ادھر کچھ لڑکے اور لڑکیاں بغلوں میں کتابیں دبائے زور زور سے باتیں کرتی چلی جا رہی ہیں۔ زندگی ان کے لئے ایک خندۂ مسلسل ہے۔ کچھ لڑکے اخباروں میں سر چھپائے چلے جا رہے ہیں۔ اُدھر کچھ سڑک کے کنارے درختوں کے کنج میں مصروف مطالعہ ہیں کچھ لڑکے کسی کتاب کے جدید ترین اڈیشن یا کسی رسالہ کے سرورق کی داد دے رہے ہیں۔ یہاں چند شریر عجائبات کی دوکان میں شوخ فروشندہ لڑکی کو دق کر رہے ہیں۔ وہاں ایک ہال کی بلوریں پیش دیوار سے کچھ لڑکے اور لڑکیاں اپنے کام میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ان کے پنسل اور موقلم نقشہ کشی کے کاغذ پر تیزی سے چل رہے ہیں۔ یہ تعمیر کاری کے طالب علموں کا نگارخانہ ہے۔ گراما فون بج رہا ہے اور کچھ لوگ رقص کر رہے ہیں۔ رقص کے دوران میں طالب علم ساتھ والی لڑکی سے ہندوستانی لکڑی کی قسمیں نرخ اور مصرف بھی دریافت کرتا جا رہا ہے۔ گو رقص کے لئے جگہ کم ہے لیکن دلوں میں مسرت کے سمانے کے لئے گنجائش کی کمی تو نہیں ہے!

یونیورسٹی کے علاوہ پیرس کے اس حصہ میں تعلیم اور فن کاری کے بہت سے مشہور ادارے ہیں۔ یہاں سینٹ ژینی ویو (ST. GENEVIEVE.) کا بڑا کتب خانہ ہے۔ نقاشوں اور بت تراشوں کے نگارخانے ہیں۔ موسیقی اور رقص کے اسکول ہیں۔ فنون لطیفہ کی اکیڈمی ہے۔ جمنازیم اور تیرنے کے حوض، فزیکل کلچر اور کھیلوں کو ترقی دینے والے ادارے ہیں۔ بڑے بڑے بک اسٹال ہیں جہاں ہر قوم اور ہر زمانہ کی سائنس، ادب اور فن کاری کے متعلق کتابیں، سلیقہ اور نفاست سے سجی ہوئی، شائقین علم کے لئے باعث کشش ہیں۔ ہزاروں انجمنیں، مجلسیں اور کلب ہیں۔ سیاسی فکر کے ہر مکتب کی اپنی ایک خاص تنظیم ہے۔ یہاں فاشسٹ، اشتراکی، نراجی، فرانسیسی شاہ پسند اور روسی نہلسٹ سب ہی ملیں گے۔ ان جماعتوں کی طرف سے دلچسپ تقاریر، نمائشیں، تفریحی سفر مطالعہ کی کلاسیں، اسپورٹس، ٹورنامنٹس اور چاء کے رقص منعقد کئے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کی تائید اپنے مقاصد کے لئے حاصل کی جا سکے۔ بیشمار، اخبار، رسالے اور پمفلٹ اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لئے تقسیم کئے جاتے ہیں۔

دھندلکے کے ساتھ ہی فضا موسیقی کی تانوں سے بھر جاتی ہے۔ ایسے رسٹورنٹ اور موسیقی کے ہال موجود ہیں، جہاں مختلف اقوام کی موسیقی سے حظ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لااوڈین (L. ODEON.) میں مولیر، راسین اور دیگر مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگاروں کے شاہکار دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ محلہ اپنے ناچ گھروں، کیبرے (CABARET) اور سنیماؤں کے لئے مشہور ہے جہاں ہر شخص اپنی دلچسپی کی چیز تلاش کر سکتا ہے۔ نوکٹمبول (NOCTAMBULES.) میں مقبول عام فرانسیسی گانے سنے جا سکتے ہیں۔ ولان (VILLON) میں آپ جدید ترین کان کان (CAN-CAN.) یا قدیمی والٹز ناچ سکتے ہیں۔ یا آپ پسند کریں تو شامپین اڑاتے ہوئے کسی برہنہ رقاصہ کے کمال کی داد دے سکتے ہیں۔

طالب علموں کے علاوہ یہاں مصنف، فن کار، پرچارک، علمی اور ادبی شہدے، آزاد طبع اور رند منش لوگ بھی رہتے ہیں

یا آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں کی دنیا مختلف اور متضاد رنگوں سے مرکب ہے۔ حسن فرشتی تعیش اور افلاس، فقیروں کے بھیس میں شہزادے اور شہزادوں کے بھیس میں لفنگے، ملزم جو روپوش ہونا چاہتے ہیں۔ شہدے جو نمایاں ہونا چاہتے ہیں پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے۔ جیالے نکتہ چین، خواب دیکھنے والے آئیڈیلیسٹ، انتہائی حقیقت بین، رومانوی اور افسانوی تخیلات و تصورات میں ڈوبے ہوئے، ہر طرح کے لوگ ملیں گے یہاں کے وڈولسر اور ڈائرکٹر اپنے کھیلوں کے لئے اداکار، ستارے، پرائماڈونا (PRIMA-DONA.) اور بالیرینا (BALLERINA-) تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

ہر شخص کسی اعلیٰ اور ابدی شئے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہر شخص اس جدوجہد سے واقف ہے جو بقائے زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن پھر بھی ولولہ حیات اور نشاط زندگی سے فضا معمور ہے اور اس فضا کے اثرات سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے۔ مسکراتے چہرے اور چمکتی آنکھیں زندگی کو قوس قزح کی طرح رنگین بنائی رہتی ہیں ہر ایک دن جو گذرتا ہے اپنے تاثرات اور ارتسامات دل پر نقش کرتا جاتا ہے۔ جولائی کی چودھویں فرانس کے جشن قومی کا دن ہے۔ اس دن یہ محلہ بقیہ فرانس کی طرح سہ رنگی جھنڈیوں، بیرقوں اور دیگر آرائشوں سے لہراتا رہتا ہے۔ صبح کے وقت آسمان شور کرتے ہوئے طیاروں سے چھپ جاتا ہے۔ یہ آرک ڈی ٹرئیف (ARC DE TRIONPHE.-) کے سرکاری مظاہرے سے واپس ہو رہے ہیں تماشائیوں کے ہجوم میں سے کوئی بیساختہ چیخ اٹھتا ہے۔ "واہ! کیا شاندار" ایک لڑکی بازو سے جواب دیتی ہے "واہ! انسانی خونخواری کی کیا شاندار علامتیں ہیں"۔ دوپہر میں باسٹل کے محل سے (BASTILLE) عوام کے محاذ (FRONT POPULAIRE-) کا شاندار کئی میل لمبا جلوس نکلتا ہے۔ یہ عصر جدید کا ایک لاجواب مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ اس دن کی یادگار ہے جس نے دنیا کو "عوام کی آزادی" کے مفہوم سے روشناس کرایا۔ تمام طبقوں کے لوگ مل کر نا انصافیوں کے مقابلہ، اور حقوق عامہ اور امن عالم کی حفاظت کے لئے ایک متحدہ محاذ پیش کرتے ہیں۔ جلوس کیا ہوتا ہے آدمیوں کا ایک لہریں مارتا سمندر، نعروں کی داد چیخوں اور تالیوں سے ملتی ہے۔ آپ کے بازو والا ساتھی متاثر ہو کر کہہ اٹھتا ہے "امن عالم کی حفاظت دیو تمثیل طیارے نہیں بلکہ عوام کی آواز کرے گی"۔

سید حامد علی

پوچھ لے

حالِ دل نوکِ سناں سے پوچھ لے
سوزِ غم برقِ تپاں سے پوچھ لے

ہجر میں بے چین تھا میں رات بھر
شب کے تاروں کی زباں سے پوچھ لے

روتے روتے رات آنکھوں میں کٹی
دیدۂ اشکِ رواں سے پوچھ لے

کرلی توبہ میں نے اے ابر بہار
پوچھ لے پیرِ مغاں سے پوچھ لے

حالِ دل تجھ سے محبت کیا کہے
ناوکِ نامہرباں سے پوچھ لے

عظیم الدین محبت
متعلم بی اے۔

بھلے اور بُرے

(قطب شاہی سب رس سے)

بھلا آدمی لوگاں بھلیاں کوں بُرے کر جانتے، بُریاں کوں بھلے کر پچھانتے۔ بھلے آدمی کوں جینا بہوت مشکل۔ دل میں کیتا ہت دھرے تند آسب کرے، ولے کسے بھلا آدمی نہ کرے۔ اپنا ہیرا آپی کھانا، اپنا لہو آپی پینا تو دنیا میں بھلا آدمی ہو کر جینا۔ بُرے بھلا جانتے دغا دے جاتے، جیوں تیوں کس پاس تے کچھ لے جاتے۔ جاں لگن بھلا آدمی ہے واں لگن خوار ہے۔ بُرے لوگاں کوں سب کہیں ٹھار ہے۔ بھلا آدمی کیوں بھاوے۔ گائے قصائی ہج کوں پتیاوے۔ یو سمجے نیں دراصلا، دکھن کا ہے یو مسلا جو کوئی آوارا، وہ بھائی ہمارا۔ جو کوئی کرے ہٹ، مار نکالیں نٹ۔ اُلٹی چلتی دنیا داری، بھلے لوگاں کی ہوئی خواری۔ نااہل پاس جو سوال کرنا ہے، وو جیونا نیں مرنا ہے۔ بلکہ مرنا بہتر ہے، اپنے جیو پر قصد کرنا بہتر ہے۔ شرم کے آدمی کوں شرم کا آدمی اچھے سو جانے جس میں شرم نیں وہ شرم کے آدمی کوں کیا پچھانے۔ حیا کے لوگ اکثر رزق کے باب تنگی سوں گزرانتے ہیں۔ دنیا جھوٹیاں کی ہے دغا بازاں کی ہے، بے ایماناں کی ہے۔ یو خوبی جانتے ہیں حق کڑوا ہے۔ یو کڑا جسے میٹھا لگا وو بڑا۔ اس باٹ میں پاؤں پھسلتا ہے پر کوئی نیں ہوتا کھڑا۔ اگر کسی میں بات سمجے کا مایا ہے تو حدیث میں الحق مر بھی آیا ہے۔ اگر توں میں کار کھنے منگتا پانی، تو تم کوں کھا انکھیاں کھلے انکھوپی اسے سارے بھلیاں کی زندگانی۔

برا آدمی "شیطان اگر کسے لگے تو کوئی تیٹی چھڑائے۔ آدمی کسی کی پے میں پڑے تو جیو ہچ جائے۔ شیطان کوں مٹی کھول اتنی بٹی دئے تو جاتا ہے، آدمی بُرائی پر آیا تو کلیجا کھاتا ہے۔ شیطان کا فکر سہل ہے، شیطان کا فکر کیا کرنا۔ بُرا آدمی بُرا، بُرے آدمی تے ڈرنا۔ شیطان شیطان کی صورت سوں اپس کوں دکھلاتا، اُس کا علاج کیا جاتا۔ بُرا آدمی بڑا شیطان، فرشتے کا لباس لے آتا۔ بھلا آدمی بچارا کیا جانتا، دغا کھاتا۔ بھلا جانتا کہ یو بھلا چ ہے، سچیں میں یو فرشتا چ ہے۔ آدمی بچارا کیتا پچھانے، غیب کی بات خدا چ جانے، غیب کا عالم کسے دکھلایا۔ و عندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ہو۔ یعنے غیب کے کیلیاں، غیب کے صاحب پاس، غیب کے صاحب کوں معلوم، غیب کے صاحب نے جسے معلوم کیا اسے معلوم ہوے یو غیب کے علوم"۔

ملک الشعرا ملا وجہی قطب شاہی

ریختی

نہ بچھڑوں سائیں سوں یک تل سہیلی
پیا کی رنگ سوں میں ہوں رنگیلی

سکیاں پیاریاں منے لگیں پیو کی پیاری
ہوی پیو نیہہ سوں پھل جوں نویلی

پیا مطلق منجے دل تھے بسارے
پیا بن کیوں جیوں سکھ ری سہیلی

نبی صدقے قطب شہ ہر سیتے
نہ چھوڑے سیج پر منج کد یکیلی

سلطان محمد قلی قطب شاہ

محمود گاواں کے قتل کے بعد

"یہ مضمون پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کی غیر مطبوعہ کتاب کا ایک حصہ ہے جو بہمنی تمدن سے متعلق ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے"

"سب رس"

خواجہ محمود گاواں کا قتل دکن کی فرقہ واری رقابت کا منتہا بنا۔ اگر ہنگامہ چاکنہ کو جس میں خلف حسن بصری اور اس کے رفقا بیرحمی کے ساتھ قتل کر دئے گئے تھے اس کتاب کا پہلا باب کہا جائے تو محمود گاواں کے قتل کو اس کا دوسرا باب کہنا چاہیے لیکن اپنے عظیم الشان اسباب و نتائج کا لحاظ کرتے خواجہ محمود گاواں کے واقعہ کو ہنگامہ چاکنہ سے جو ۸۵۰ھ میں ہوا تھا کوئی نسبت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۸۸۶ھ کی تمام سیاسی فضا جس میں خواجہ محمود گاواں قتل ہوا ۸۵۰ھ کی نقش ثانی تھی کیوں کہ اس کے تمام جراثیم چاکنہ ہی سے اڑکر یہاں آئے تھے اور اس وقت بھی وہی ۲۵ سال کا پرانا مرض متعدی عود کر آیا تھا لیکن اس وقت جس شدت کے ساتھ یہ مرض پھیلا اور ملک میں جو عالمگیر بربادی کی اس کی پہلے واقعہ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بات یہ تھی کہ ہنگامہ چاکنہ کے وقت دونوں فرقے اس قدر قوی دست نہیں ہوئے تھے۔ ترک و ایرانی ملک میں ضرور موجود تھے لیکن ان کو آئے ہوئے ابھی بہت دن نہیں ہوئے تھے اور اس وجہ سے ابھی ملک میں ان کے قدم مضبوطی سے جمے نہیں تھے اور ان کے مقابلہ میں اہل ملک کافی طاقتور تھے۔ چنانچہ جب اہل ملک نے ترکوں کا پیچھا کرنا چاہا تو ان کو آسانی سے موقع مل گیا اور چاکنہ کے مقام پر انہوں نے ترکوں کا ایسا خاتمہ کر دیا کہ اگر حکومت ان کی مدد نہ کرتی تو تقریباً نصف صدی تک ان کا سر اٹھانا ناممکن تھا۔ اس کے برخلاف محمود گاواں کے عہد میں ترکوں کی خوب جڑیں گڑ گئی تھیں اور اس کا باعث محمود گاواں کی زبردست شخصیت اور اس کے اثرات تھے۔ محمود گاواں کا یہ کھلا منصوبہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے ترکوں اور مغلوں کو ترقی دے اور اس منصوبہ میں وہ اچھی طرح کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ۲۵ سال کے دوران میں نہ صرف مرکزی حکومت ترکوں کے ہاتھ میں آگئی بلکہ ملک کے دور دراز اقطاع بھی ان کے قبضہ و اقتدار میں آچکے تھے ان کے مقابلہ میں اہل ملک نے ہزار ابھرنے کی کوشش کی اور ان کے علمبرداروں نے مختلف ہتکنڈوں سے کام لیکر اپنے کو اٹھایا لیکن حالات بتاتے ہیں کہ یہ ترکوں کی طرح اجاگر نہیں ہو سکے۔ اول تو علاءالدین ثانی کی تعزیر سے ملک کے اچھے لوگ مر چکے تھے اور اس وقت محمد شاہ لشکری کے عہد میں ملک کی جو نئی پود پیدا ہوئی تھی اور اس میں جو رہنمایان سیاست منظر عام پر آئے تھے ان میں سے کوئی بھی میاں من اللہ دکنی کی طرح لائق و سنجیدہ نہ تھا۔ ملک حسن بحری کی تمام کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بے ڈھنگی تھیں۔ اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا کافی مطالعہ کرتا۔ اول تو اس کو اس مطالعہ کا کافی موقع نہیں ملا۔ تقریباً دس سال تو وہ شمالی تلنگانہ کا صوبہ دار تھا اور اس طریقہ سے وہ گویا مرکزی حکومت سے جلاوطن تھا۔

اس دوران میں محمود گاواں نے اپنے ہتکنڈے ٹھیک کر لئے تھے۔ یہ سلطنت کا وزیر اعظم تھا اور اس طرح ملک کا تمام سیاہ و سفید اس کے ہاتھ میں تھا۔ گو ملک حسن کو بادشاہ سے کتنا ہی تقرب صحیح لیکن اس کو مرکزی حکومت میں اتنا اقتدار کہاں تھا۔ خود اس کی بحالی بھی محمود گاواں کے احکام سے عمل میں آتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اہل ملک کا فریق اس قدر طاقتور نہیں ہو سکا کہ وہ ترکوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکے۔ ملک حسن صرف اس قدر کر سکتا تھا کہ اہل دکن کو کچھ جاگیریں دے دیں تھیں اور یہ اس وقت ہوا تھا

جبکہ تلنگانہ کی گورنری اس کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ فرشتہ کہتا ہے کہ جب سے ملک حسن تلنگانہ کا گورنر ہوا یہاں سوائے اہل دکن کے کوئی دوسرا جاگیردار نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب سلطنت بہمنی منتشر ہوئی ایک جنیر کے سوا جہاں ملک حسن کا خاندان قابض تھا باقی تمام عملداریاں ترکوں اور ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس وقت ترک ملک پر اس قدر حاوی تھے کہ گویا دوسرے الفاظ میں سلطنت کے اجزائے لاینفک ہوگئے تھے جن کو سلطنت سے علحدہ کرنا ناممکن تھا۔ محمود گاواں نے غالباً اسی چیز کو پیش نظر رکھ کر ترکوں کی ایک بڑی جماعت کھڑی کردی تھی جو تمام ملک پر مسلط تھی اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں ایک محمود گاواں کے قتل کرنے سے پورے ترکوں کا خاتمہ نہیں ہوسکتا تھا۔ محمود گاواں کے مرنے کے بعد اس کا جانشین یوسف عادل خان سوائی موجود تھا جو پہلے سے ترکوں کی علمبرداری کرتا تھا۔ اس چیز کو ملک حسن اور اس کا فریق نہیں سمجھ سکا۔ یہ لوگ کوتاہ نظری سے سمجھتے تھے کہ محمود گاواں کے قتل سے تمام سیاسی میدان ان کے ہاتھ آجائے گا۔ اور یہ کسی طرح صحیح نہیں تھا۔ اس قتل سے اہل دکن کے تمام پانسے الٹے پڑ گئے۔ ان کا مقصد تو ایک طرف رہا۔ رقابت کی تھا پیں اور زیادہ سخت ہوگئیں۔ اور جب ترکوں نے مرکزی حکومت کی بے اعتمادی سے کنارہ کشی کی تو قدرتی طور پر سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا کیونکہ تمام حکومت انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ اہل ملک کو ترکوں کے مقابلہ میں ابھی ایک طویل مدت اور ایک تعمیری پروگرام کی ضرورت تھی جس سے ان کو ترکوں کی جگہ ملتی۔ جب ترکوں کا فریق غالب تھا تو حکومت ہر حالت میں انہیں کے ہاتھ میں ہوتی۔ یہ لوگ محمود گاواں کے مرنے کے بعد سلطنت کے اس طرح حصہ دار رہے جس طرح اس کی زندگی میں تھے۔ صرف فرق یہ تھا کہ اس کی زندگی میں یہ حکومت کے ملازم اور فرمانبردار تھے برخلاف اس کے محمود گاواں کے مرنے کے بعد سلطنت کے حصے بخرے کرکے اس کے مالک بن گئے۔ مال غنیمت کی اس تقسیم میں اہل ملک کو کچھ نہیں مل سکتا تھا اور کچھ نہیں ملا۔

ہنگامہ چاکنہ سے سلطنت پر کچھ برا اثر نہیں پڑا تھا کیونکہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی حکومت پر اتنا مسلط نہیں ہوا تھا۔ باہمی رقابت سے ایک فریق کا دوسرے فریق کے ہاتھ سے سر ٹوٹا تھا۔ حکومت نے انتقام لینے کے لئے دوسرے فریق کا سر کچل دیا۔ اور دونوں فریق بہت دنوں کے لئے نیم جان ہوکر رہ گئے۔ اور اس طریقہ سے سلطنت اس دار و گیر سے صحیح سالم نکل گئی۔ برخلاف اس کے اس وقت دونوں فریق حکومت پر حاوی تھے۔ ترک تو اس طرح مسلط تھے کہ یہ اس عمارت کے حقیقی ستون بن گئے تھے۔ اور جب ستون متزلزل ہوئے تو عمارت فوراً منہدم ہوگئی۔ محمود گاواں کے قتل کے بعد ترکوں کا حکومت سے کنارہ کشی کرنا ضروری تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی جان و مال سے ڈرنے لگے کہ محمود گاواں کی طرح ان کا بھی حشر ہوگا۔ دوسرے ان کو شاہی دربار اور دکنی فریق سے انتقام لینا تھا۔ قتل کی خبر مشہور ہوتے ہی ترکوں نے دربار سے قطع تعلق کرلیا جو بہمنی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا اگرچہ بادشاہ نے بہ زور ترک ترک سرداروں کو دربار میں طلب کیا لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ہم دربار میں نہیں آتے۔ چونکہ سلطنت کی تمام سیاسی اور دولی طاقت ترکوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے بادشاہ اپنے کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا۔ جب پہلی دفعہ فتح اللہ عماد الملک اور خداوند خان حبشی کی طرف سے انکار ہوا تھا تو محمد شاہ کو ہل چل کرنی چاہئے تھی لیکن حالات ایسے نازک تھے کہ بادشاہ کی ہل چل ناممکن تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ترک دربار کی حاضری سے پہلوتہی کرنے لگے بلکہ اپنے منہ بولے شرائط منوانے لگے اور

اس طریقہ سے ہر طرف خودسری کے آثار نمایاں تھے۔ جہاں تک اہل ملک کا تعلق تھا ان کی ہستی پادشاہ کے لئے ناگزیر ہوگئی تھی۔ بادشاہ ان کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اگرچہ چند روز کے بعد پادشاہ کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ محمود گاواں کے قتل میں اہل ملک نے بڑی زیادتی کی اور وہ بڑے جرم کے مرتکب تھے اور اس وجہ سے وہ علاء الدین ثانی کی طرح ان لوگوں کو جو جرم کے مرتکب تھے سزا دینا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اول تو محمود گاواں کے قتل کے بعد یہ لوگ دربار میں ذی اثر ہوگئے تھے۔ ان کو سزا دینا آسان نہیں تھا۔ دوسرے جب ترک دربار سے کنارہ کش ہونے لگے تو امور سلطنت کی نگہداشت کے لئے انہیں لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا ورنہ اگر یہ رشتہ بھی توڑ دیا جاتا تو سلطنت کا قیام ناممکن تھا۔ اس طریقہ سے جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ترک سلطنت سے منحرف ہوگئے اور ان کا زیرنگیں ہونا دشوار ہے تو اس نے مجبوراً اہل ملک کا بازو پکڑنے کی انتہائی کوشش کی۔ ملک کی تمام خدمات اس نے ان لوگوں میں تقسیم کر دیں چنانچہ نظام الملک ملک حسن بحری نائب و پیشوا بنایا گیا۔ نظام الملک دکھنی دولت آباد کا طرفدار بنایا گیا عماد الملک اور خداوندخان حبشی جاگیروں پر متعین کئے گئے۔ قوام الملک کبیر اور قوام الملک صغیر طرفدار ورنگل و راجمندری بنا دئے گئے اگرچہ یہ دونوں ترک تھے لیکن ملک حسن کے ساتھ ہمخیال تھے۔ اس طریقہ سے بادشاہ دکھنی فریق سے بھی ڈرنے لگا۔ اور اس وجہ سے اس کے اختیارات بہت گھٹ گئے تھے۔ محمد شاہ نے تو اپنی زندگی میں ایک خاص سلیقہ سے کام لیکر دونوں پہلوؤں کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالات بدستور رہیں گے لیکن اندر سے بادشاہ کے اختیارات بہت گھٹ گئے تھے اور جب اس کا بیٹا محمود شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو علانیہ خودسریاں ہونے لگیں اور طوائف الملوکی کے قرائن پیدا ہوگئے اس لحاظ سے ۸۸۶ ہجری کو جس میں محمود گاواں قتل ہوا ہے سلطنت بہمنی کی ایک حد فاصل سمجھنی چاہئے۔ جہاں سلطنت بہمنی کے حصے بخرے ہوگئے اور اس کی اصل عظمت غائب ہوگئی۔

عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی

شکستِ خوردہ بھائی کے نام

سطور ہیں مٹی مٹی صحیفۂ حیات کی
کہ روندتی ہوئی گئی ہے فوج کائنات کی

یہ قصر زندگی بہت کشادہ و فراز ہے
نیاز مند بھی یہاں کا محو خواب ناز ہے

زمانہ فروغ رنگ و بوئے مشکبار ہے
پسینہ بھی شباب کا لہو کا آبشار ہے

تو زندگی کی ٹھوکروں پہ قہقہے لگائے جا
پھنسے کسی بھنور میں بھی تو یوں ہی مسکرائے جا

نہ ظلمتوں کی سمت جا جہاں ہے آب زندگی
ترا خمیر برق ہے، بن آفتاب زندگی

عمل ہے مستقیم اگر نہ خوف کر مآل کا
کہ موت آدمی کی خود فریب ہے خیال کا

سکون و امن کی طلب ہے موت نوجوان کی
اسی میں غرق کشتیاں ہوئی ہیں اک جہان کی

فقیر ہو کے جینے میں تری شکست فاش ہے
کہ ہمت جواں تری ابھی سے پاش پاش ہے

عرش تیموری

تنقید باقیاتِ فانی کا جواب

پہلے شعر اور پھر اس پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ نقل کیا جائیگا اور اس کے بعد جواب عرض کیا جائے گا۔

۱؎ کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا ۔ دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

۱ اعتراض ۔ منِ بیقرار کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اس لئے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے

جواب ۔ منِ بیقرار میں "من" مضاف نہیں ہے موصوف ہے ترکیب اضافی نہیں توصیفی ہے ع میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

۲؎ آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوے ملے ہیں ۔ دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

۲ اعتراض ۔ دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے ۔ ردیف رویا کی بجائے روتا ہے چاہئیے

جواب ۔ ماضی مطلق کبھی حال کے معنی دیتی ہے مثلاً ناسخ فرماتے ہیں ؎ خانۂ عاریتی میں جو درم بھرتے ہیں ۔ عقل سے مجھ کو نظر آئے وہ انساں خالی

یعنی ایسے لوگ مجھ کو عقل سے خالی نظر آتے ہیں ۔

۳؎ کیا اس کو بے قراری یاد آ گئی ہماری ۔ مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

۳ اعتراض ۔ دونوں مصرعوں میں ربط نہیں چونکہ پہلے مصرع میں کیا حرف استفہام ہے اس لئے دوسرے مصرع میں مل مل کی جگہ کیوں مل چاہیے

جواب ۔ کیا یہ قاعدہ ہے کہ جب پہلے مصرع میں استفہام ہو تو دوسرے مصرع میں کیوں ہونا ضروری ہے تاکہ ربط ہو جائے دیکھئے غالب کا

شعر ہے ۔ ؎ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مطلب سنئے تو ربط بھی معلوم ہو جائے گا شاعر اپنے نزاکتِ تخیل کی بنا پر بجلی کے کوندنے اور موسم بہار میں پانی برسنے پر حسن تعلیل صرف کر کے

کہتا ہے کہ یہ موسم بہار کا بادل جو بجلیوں سے گویا مل مل کر زار زار رو رہا ہے تو کیا اسے ہماری بے قراری یاد آ گئی جو اس کی یہ حالت ہے ۔

۴؎ آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں ۔ یہ جانتا ہوں دل اِدہر آیا اُدہر گیا

۴ اعتراض ۔ اس شعر میں دل آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے (مثال چھوڑ کر) یعنی اِدہر آیا اُدہر گیا'

اگر دل کا آنا مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی اِدہر آیا اُدہر گیا سے کیا مراد ہے

جواب ۔ شعر کی توضیح ملاحظہ فرمائیے پھر آنا جانا معلوم ہو جائے گا ۔

دل آیا ۔ کسی کی محبت ہوئی کسی پر طبیعت آئی ۔ دل گیا ۔ دل پہلو سے چلا گیا یعنی اِدہر کسی پر طبیعت آئی اُدہر دل پہلو سے نکل کر پرایا ہو گیا مطلب

یہہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بتاؤ دل آیا یا گیا تو میں اس کا کیا جواب دوں میں جانتا ہوں یہی کہہ دوں گا کہ اِدہر کسی پر میری طبیعت آئی

اُدہر میرے پہلو سے میرا دل چلا ۔

۵؎ شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اٹھے ۔ صبح بہارِ حشر کا چہرا اتر گیا !

۵ اعتراض ۔ جی اٹھے یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ "شام ہجر کے مارے" کشتگان شام ہجر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی یہ ہیں

"وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے مصیبت کا مارا جو مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے ۔ کشتۂ مصیبت کا نہیں ۔

جواب۔ مارا۔ کے معنی فرہنگ آصفیہ میں ہیں۔ مقتول، قتل شدہ، کشتہ، جان دادہ۔ مذبوح، ذبح شدہ ہجر ہجر کے مارے کا ترجمہ ہجر کا ستایا ہوا آپ مصیبت کے مارے پر قیاس کرتے ہیں اور اس سے مصیبت زدہ معنی لیتے ہیں اور کشتۂ مصیبت نہیں کہتے صحیح ہے مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے مارا کے معنی کشتہ اور مقتول کے بھی لغت میں ہیں تو پھر ہجر کے مارے کا ترجمہ کشتہ ہجر کہنے میں کیا قباحت ہے۔ مارا کے معنی ڈسا ہوا۔ گزیدہ اور کشتہ کے ہو سکتے ہیں جیسے سالک کا شعر ہے ؎

وہ سرد مہریاں تری نظروں میں ہیں بھری پانی بھی مانگتا نہیں مارا نگاہ کا

اب نگاہ کے مارا کا ترجمہ کشتہ نگاہ صحیح ہے یا ستایا ہوا نگاہ کا درست ہے میرے خیال میں جو نگاہ کا مارا پانی تک نہ مانگے اس کے کشتہ اور مقتول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ایسے ہی ہجر کا مارا یعنی کشتہ ہجر مراد لیں تو کیوں غلط؟ سمجھ میں نہیں آتا۔!

۵۶ فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

اعتراض ۶۔ پہلے مصرع میں غم ہستی کا ذکر ہے دوسرے میں غم کی تکرار ہے اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ دفتر غم آیا ہستی کا ہے یا عشق و ہوس کا۔

جواب۔ شعر کا مطلب لکھنے سے واضح ہو جائے گا کہ کون سا غم ہے کہتے ہیں کہ فانی کی زندگی تک دنیا کا غم بھی نمایاں رہا آج دیکھو اس کے بعد دفتر غم کا شیرازہ بکھرا ہوا نظر آرہا ہے یعنی غم عالم اس کے ساتھ ساتھ تھا اور وہ غم کا ساتھی اب نہ وہ موجود ہے نہ غم کا پتہ۔

۵۷ ہزار ڈھونڈئے اس کا نشاں نہیں ملتا جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

اعتراض ۷۔ "جبیں ملے تو ملے" اس سے کیا مراد ہے۔ جبیں تو آستاں کے ہر متلاشی کے ساتھ ہے۔

جواب۔ جبیں ملے تو ملے یعنی پیشانی تو موجود ہے جیسے کہتے ہیں خدا ملے تو ملے مگر روزگار نہیں ملتا یعنی خدا تو موجود ہے اس کا ملنا آسان ہے مگر ملازمت غیر موجود اور اس کا ملنا عنقا ہے مطلب یہ ہے کہ جس قدر تلاش کرو خدائے بے نشان کا پتہ ملتا ہی نہیں پیشانی تو مشتاق سجدہ ہے مگر اس کے آستانے کو لاکھ لاکھ ڈھونڈو کہیں پتہ نہیں۔ شعر صاف ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اعتراض سے کیا مقصود ہے اور یہ متلاشی آپ نے کہاں سے تراشا محققین کی رائے ہے کہ متلاشی بمعنی تلاش کرنے والا محض غلط ہے کیونکہ عربی قاعدہ یہاں جاری نہیں ہو سکتا

۵۸ دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا چشم ساقی اثر مے سے نہیں ہے گلرنگ

اعتراض ۸۔ پیمانے کو دل کا مضاف الیہ قرار دینے کے بجائے اگر یوں کہا جاتا کہ پیمانہ میرے دل کے خون سے لبریز ہے تو شعر بامعنی اور تشبیہ کامل ہوتی

جواب۔ شعر بامعنی ہے اور تشبیہ اب بھی کامل ہے۔ دل کا پیمانہ۔ یعنی پیمانہ اضافت مجازی ہے۔ چشم ساقی کو پیمانے سے تشبیہ دی ہے اور مے کو خون سے۔ گلرنگ۔ وجہ شبہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ساقی کی آنکھیں شراب پینے سے گلرنگ (لال) ہو گئی ہیں بلکہ یہ پیمانے ہیں جو میرے خون سے چھلک رہے ہیں

۵۹ لوح دل کو غم الفت کو قلم کہتے ہیں کن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

اعتراض ۹۔ غم کو قلم سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہے اور "کو" کی تکرار بھی مخل فصاحت ہے! کن ایک کلمہ لفظی ہے اسی لحاظ سے انداز رقم کی جگہ انداز بیان زیادہ موزوں تھا۔

جواب۔ غم کو قلم سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ قلم کی روسیاہی مشہور ہے اور وہ اسود الصحائف (جن کے نامۂ اعمال زیادہ سیاہ ہوں) دو "کو" ایک مصرع میں آگئے تو آپ مخل فصاحت خیال کرتے ہیں حالانکہ ایک شاعر نے پانچ "کو" ایک مصرع میں جمع کر دئے ہیں

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں ! الم کو، یاس کو، حسرت کو، بے تابی کو، حرماں کو

اور " رقم " انداز بیان سے اس لئے بہتر ہے کہ وہ لوح ، قلم کی مناسبت سے لایا گیا ہے ۔ افصح اور فصیح سے بحث نہیں مطلب یہ ہے کہ کلام غلطی سے پاک ہے ۔

شلہ زندگی بھی تو پشیماں ہی یہاں لاکے مجھے ! ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

اعتراض ۔ پہلے مصرع میں بھی کے بعد تو کا لفظ زائد اور مخل فصاحت ہے ۔ بھی تو کی بجائے لفظ آپ چاہئے ۔ علاوہ بریں مصرع ثانی کی ترکیب بھی مہمل ہے کیونکہ کسی کے مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا البتہ مار ڈالنے کے لئے حیلہ درکار ہے ۔

جواب ۔ پہلے مصرع میں بھی کے بعد تو زائد اور بیکار نہیں ہے حسن کلام اور تاکید کے لئے تو آتا ہے مثلاً داغ کا شعر ملاحظہ ہو ۔

معجزہ حضرتِ عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں درد اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر غم مجھ کو

دوسرے اعتراض کا جواب کہ مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا جب کوئی مار ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا تو چاہتا ہے کہ کسی طرح خود ہی مرجائے اور مار ڈالنے کا حیلہ اس وقت درکار ہوگا جب خود میں مار ڈالنے کی طاقت ہو آپ کی اصلاح سے دو ت ایک جگہ جمع ہو کر کانوں پر گرانی پیدا کرتے ہیں

عبداللطیف لکچرار (ورنگل کالج)

شریکِ زندگی

ہاں مجھے چمکائے جا تو اے شریکِ زندگی
سب یہ ہے تیرے حسن کے پرتو کی ہے تابندگی

ہے مرے جذبات کی دنیا ترے زیرِ نگیں
تو ہی کہہ دلکش ہے میری شاعری اب یا نہیں

تیری باتوں سے "خیال آرا" جہانِ حسن ہے
تجھ سے ہی پُر لطف ہر اک "داستانِ حسن" ہے

ہر ادا تیری نویدِ کیف و مستی ہے ضرور
میری آنکھوں میں ہے تیری خوش نگاہی کا سرور

تیری شوخی سے ہوا حاصل سکونِ زندگی !
ورنہ میں خود تھا کبھی "صیدِ زبونِ زندگی"

کیا تبسم کیا تکلم دونوں "جزو ساحری"
ساحری سے تیری میں لیتا ہوں درسِ شاعری

حسنِ فطرت کا ہے شاہد اپنا "عشقِ پاکباز"
تیرے آگے کیوں میں چھیڑوں ذکر محمود و ایاز

خواجہ محمد فاروق علی خاں علیؔ

صاحبزادہ میر آفتاب علی خان مہ



صیاد ! شاخ گل سے مقدر کی بات ہے
تیری نظر اٹھی نہ مرا آشیاں اٹھا
میں کون تھا کہ میرے مٹانے کیواسطے
دشمن اٹھے ، زمین اٹھی ، آسماں اٹھے

سید محمد حسین آزاد



غور سے دنیا کو دیکھیں تو یہ سمجھیں کے ضرور
سب ہمارے واسطے ہیں ہم خدا کے واسطے
ایک ہے اپنا خدا ہو جائیں ہم بھی مل کے ایک
بھائیو ایکا کرو باہم خدا کے واسطے

خاکِ پاک

لحم، مقلوبِ محل ہے، اور محل ہے عینِ کاخ
کاخ کو بھی تم اگر مقلوب کر دو خاک ہے
شاہدِ مقصود، دو پردے الٹ کر مل گیا
یعنی اپنی صورتِ لحمی سراسر خاک ہے
خواہ تو ہو، خواہ میں ہوں، خواہ بد ہو خواہ نیک
خاک میں جو مل گیا وہ سر سے پا تک پاک ہے
خاک ہی ہوں، اور خاک پر ہوں، خاک ہی میں جاؤں گا
خاک ہی خوراک ہے اور خاک ہی پوشاک ہے
خاک کی بدلی ہوئی صورت ہے ساری کائنات
ابتدا بھی خاک ہے اور انتہا بھی خاک ہے
خاک کیا ہے؟ خاک ہے اک پاک طاقت کا نزول
خاک سے خوراک ہے، خوراک سے ادراک ہے
ہستیٔ خاکی ہی کا صدقہ ہے ساتوں آسماں
شاہد اس میرے سخن پر معنیٔ لولاک ہے

امجد

مرے آگے ہر چیز نا چیز ہے
یہ نا چیز بندہ بھی کیا چیز ہے
تری سر فرازی سے ہوں سر نگوں
یہ نا چیز ہر طرح نا چیز ہے
جدائی بھی ہے اک سمجھنے کی چیز
نہ سمجھو تو اب یہ جدا چیز ہے
انھیں جان کہہ کے میں ٹھہر گیا
کہ یہ چیز اک بے وفا چیز ہے
اسی حسن نے لی ہزاروں کی جان
دکھاوے میں کیا خوش نما چیز ہے
عداوت میں بھی دل سے جاتی نہیں
محبت بڑی دیرپا چیز ہے
غمِ عشق سے ہے مری آبرو
صفیؔ اس کا کھایا پیا چیز ہے

صفی

بچوں سے

پسندیدہ کھیل کے عنوان پر یوں تو کئی مضمون وصول ہوئے لیکن سیدہ خلیل الدین اور ممتاز الدین خاں کے مضمون قابل اشاعت ہیں۔ ہم دو مضامین اس لئے منتخب کر رہے ہیں کہ ایک بچیوں سے متعلق ہے اور دوسرا بچوں سے۔ اس ماہ تم کہو ہی کا عنوان ہے "تمہیں سب سے زیادہ ہنسی کب آئی؟"

بلقیس جہاں بنت نواب محمد یار جنگ اور غوث محی الدین (حبیب نگر) نے فروری کے حل اور بہت سے بچوں نے سب رس کے سرورق کے جواب دیر سے بھیجے اس لئے مارچ کے پرچے میں شایع نہ ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ سب رس کے بچے وقت کا خیال رکھیں گے۔

پرچہ دو جزو کرنے کے لئے بیدار علی (سٹی کالج) کی جو تجویز "سب رس" کے مارچ نمبر میں شایع ہوئی تھی اس کی تائید کئی بچوں اور بچیوں نے کی ہے جن میں حبیبہ حبیب الرحمٰن، ممتاز الدین خان، حبیب شمس حسین شریف، واجد حسین، آغا ابراہیم، زین العابدین، معین الدین احمد انصاری، مسیح الدین خان اور محمد عبد العلی نے تفصیلی طور پر لکھا ہے کہ ان کے خیال میں کس لئے دو جزو کی ضرورت ہے۔ لیکن خواجہ معین الدین فاروقی نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ہم دوسرے بچوں اور بچیوں کو اس تجویز کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ بچوں اور بچیوں کے خیالات سے واقف ہوں:

تمام معمے کسی نے حل نہیں کئے معین الدین احمد انصاری کے انعامی معموں کے درست حل ایس بی رلج اور مسیح الدین خان اقبال نے اندرون مدت روانہ کئے اس لئے دونوں انعام کے مستحق قرار پائے۔ اور ان کو چاہیے کہ دفتر سے وصول کریں۔ عقیل حسین نے بھی صحیح حل روانہ کئے لیکن بعد مدت۔ زیادہ صحیح حل میر خورشید علی اور باقر احمد صدیقی کے وصول ہوئے جو تعداد میں مساوی ہیں۔ باقی حل کنندوں کے نام یہ ہیں ان کے محاذی، تعداد حل بھی لکھ دی گئی ہے۔

محمد عبد الرزاق.... (۵) زہرہ ہاشم علی (۲) فیروزہ صدیقی (۱) مسیح الدین خان اقبال بشیر آباد (۳) شبلی کرمانی (۵) خواجہ معین الدین فاروقی (۲) احسن الدین شریف (۱) محمد نفیس احمد (۳) احمد کلیم مہاجر (۳) محمد عبد الباسط (۴) رام کشن (۲) عبد الغفور (×) اشتیاق رسول صدیقی (۲) ممتاز الدین خان (۳) محمد عبد العلی (۴) سید زین العابدین (۲) عقیل حسین (۵) محمود عبد الماجد (۵) گم نام۔ (×)

مارچ نمبر کی پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں:۔

ا ۔ ۱۔ ہاتھ، ۲۔ پسینہ، ۳۔ مینڈک، ۴۔ کوا، ۵۔ خربوزہ، ۶۔ روپیہ، ۷۔ ریل

ب ۔ ۱۔ مرونگ، ۲۔ رام پھل، ۳۔ آئینہ، ۴۔ مچھر، ۵۔ کھر۔

ج ۔ ۱۔ تارہ، ۲۔ ۳۔ نقشہ حیدرآباد

شکل نمبر (۳) (ب)

شکل نمبر (۲)

امیروں کے مکانات

غریبوں کے مکانات

شکل نمبر (۱) (۰) درخت ہیں

نئی پہیلیاں

(ا) آج ہم سب بہن بھائی بہنوں کے لئے ایک نیا تحفہ لائے ہیں ذیل میں چند فقرے دے جاتے ہیں ہر فقرے میں کسی ملک کا نام پوشیدہ ہے آپکی آسانی کے لئے پہلا فقرہ حل کیا جاتا ہے، لفظ فارسی میں سے ی کو نکال دیجئے فارس ہو گیا جو ایران کا دوسرا نام ہے۔ دیکھیں آئندہ پرچے میں کن بھائی بہنوں کے جوابات صحیح ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا آپ کو فارسی زبان آتی ہے ۲۔ میرا باجا پانی میں گر گیا۔
۳۔ حامد تم سبق یاد نہ کرو گے تو ہنٹر کھاؤ گے۔ ۴۔ احمد مت رو ساجد بھائی آئیں گے تو تم کو سیر کو لے جائیں گے۔ ۵۔ آج ہمارا باورچی نہیں آیا۔
۶۔ میری کاجر منیر نے چھین لی۔ ۷۔ تو بہت بے ادب ہے جعفر انسانیت سیکھ۔ آنسہ ناہید عمرانہ الہ آبادی

(ب) اِن پہیلیوں کے حل روانہ کریں

۱۔ سر کاٹے ہوا امن، پاؤں کاٹے ہوا پیالہ، خوشبو کہتے تجھے رنگ تھا کالا
۲۔ چار پاؤں کی چمگاڈر چھت سے پاؤں لٹکائے، اپنے پیٹ میں کھانا رکھ کر ہم سب کو کھلوائے۔ ۳۔ اتنے سے ملو میاں گز بھر کی دُم۔ بھاگ گئے ملو میاں سڑ گئی دُم۔ خطیب محمد سلیمان (بھیک)

(ج) ۱۔ ایک جانور ہم نے دیکھا چلتے چلتے تھک گیا، لاؤ چاقو کاٹو گلا پھر بھی چلنے لگ گیا ۲۔ جڑ کستی، بیل بڑھتی ۳۔ گوشت پکتا اور چمڑا سکتا اور بکرا چرتا۔ ۴۔ خدا کا ایسا ولی، کو ٹیلا پھاڑ کر نکلو نکلی گلی۔ ۵۔ چلو سہیلیاں بازار کو جائیں گے، ایک شیشی میں دو رنگ لائیں گے ۶۔ ایک آدمی اصل جس کو ہڈی نہ پسلی
شبلی کرمانی (جماعت ہشتم مدرسہ سلطانیہ خیام)

(د) ۱۔ اترا ایک جانور جس کے ہیں تیس پر (۲) دو پرے لگے ہیں جس میں جھالر لگی ہوئی اس کے بیچ ہے ایک شہزادی ٹہلتی ہوئی
۴۔ ایک تالاب ہے اس کے اس پار ایک آدمی جانا چاہتا ہے اس کے ساتھ تین چیزیں ہیں (۱) کتا (۲) بکری (۳) پان کا گٹھا اور اس تالاب میں ایک کشتی ہے اس میں صرف وہ شخص صرف ایک ایک چیز اپنے ساتھ لے جاتا ہے، کتا بکری کا مخالف اور بکری پان کی مخالف ہے۔ بتائیے کہ وہ کس طرح پار ہو سکیں گے؟
میر بیدار علی

لفظوں کا زینہ

تین حرفوں کا ایک لفظ ہے شام، تم اس کے حرفوں کو تبدیل کر کے بال بنا دو، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک دفعہ میں صرف ایک ہی حرف بدلا جائے اور زینے کی سیڑھیاں چھ سے زیادہ نہ ہوں، اس کا طریقہ یہ ہے

۱ شام ------ ش ام ۴ نار ------ ن ا ر
۲ خام ------ خ ام ۵ رال ------ ر ا ل
۳ خار ------ خ ار ۶ بال ------ ب ا ل

دیکھو پہلا لفظ شام تھا اس میں پہلے حرف ش کو خ سے بدل دیا اور باقی دو حرفوں ا اور م کو یوں ہی رہنے دیا تو لفظ خام بن گیا اب خام کے تیسرے حرف م کو ر سے بدل دیا تو لفظ خار بن گیا اب لفظ خار کے پہلے حرف خ کو ن سے بدل دیا گیا تو لفظ نار بن گیا اسی طرح نار کے پہلے حرف کو ل سے بدل دیا گیا تو لفظ رال بن گیا، اور لفظ رال کے پہلے حرف ر کو ب سے بدل دیا تو بال بن گیا
اب ہم سمجھیں کہ تم اسی طرح لفظ شاخ کو رات سے بدل دو۔ مگر زینے کی سیڑھیاں چھ سے زیادہ نہ ہوں اور نہ کم۔ ایک بار میں صرف ایک ہی حرف بدلا جائے۔

ش ا خ	۱
	۲
	۳
	۴
	۵
رات	۶

محبوب علی

سب رس اپریل ۱۹۳۹ء

میرا پسندیدہ کھیل

یوں تو دنیا میں بہت سے کھیل ہیں۔ ایک کھیل اگر کسی کو بھاتا ہے تو وہی کھیل دوسرے کو نہیں بھاتا۔ یہ اپنی اپنی مرضی ہے۔ میں نے بہت سے کھیلوں میں حصہ لیا ہے مثلاً آنکھ مچولی، ہنگلیسی، پوسر جھمک جھگڑا، چھپا، ایسے فلنگ چھٹی، آٹھ خانہ، انڈہ بڈہ، باگ بکری، وغیرہ لیکن ان سب میں میں نے آنکھ مچولی کو پسند کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ ایک یہ بھی ہو کہ ہم یہ کھیل آم کے باغوں میں کھیلتے تھے جب کہ بور آیا ہوتا، ہر طرف خوشبو سے جنگل مہکتا رہتا یا اس کے کچھ اور دن بعد درختوں پر خوبصورت ہری ہری کیریاں لٹکتی رہتیں، یا اس سے کچھ زیادہ دن بعد جب کہ اچھا خاصا پکتی ہوتیں اور دوڑتے دوڑتے اور چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے شاخوں کو لینے کی کوشش کی جاتی۔ قدرت کے مناظر میں گھرے رہنے سے بہت زیادہ لطف آتا، دوڑ دھوپ کی وجہ سے ہم عرق عرق ہو جاتے بارہ بجے یعنی ٹھیک دوپہر کے وقت سب کے سب باؤلی کا رخ کرتے جہاں مالی موٹ سے پانی سینچا رہتا ہم تھکے ماندے تو رہتے ہی تھے حوض کے کنارے بیٹھ جاتے اور پیر پانی میں ہلاتے رہتے تھے۔ آنکھ مچولی کھیل کر تھک جانے کے بعد آم کے درخت کے سائے میں حوض میں پیر لٹکائے بیٹھنا کسی کو بھائے یا نہ بھائے میں تو یہ لطف عمر بھر نہ بھولوں گی۔ اس کے بعد بھوک خوب معلوم ہوتی تھی۔ کیریاں جوار کی روٹی۔ ڈھپاٹے، ایک بڑی نعمت تھے۔ جن کے مقابلے میں بریانی وغیرہ کی بھی کوئی قدر نہ ہوتی۔

میں نے اوپر جن کھیلوں کا ذکر کیا ہے ان میں ہنگڑی ہی ایک ایسا کھیل ہے جو کچھ تھوڑا بہت تھکا سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپس میں مل کر کھیلنے کا کچھ مزا بھی آجاتا ہے۔ لیکن اگر کسی ایک کا بھی ہاتھ غلطی سے چھوٹ جائے، اس بری طرح سے گرتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور پھر وہ کھیل ہی کیا کہ جس میں صرف دو آدمی کھیلیں اور باقی سب تماشا دیکھتے رہیں آنکھ مچولی کا یہ لطف کہ اپنے آپ کو چھپائے رہنا اور دوسروں کو دیکھنے کی کوشش کرنا میرا جہاں تک خیال ہے کسی کھیل میں بھی نہیں آسکتا۔ میں نے اپنے پسند کا کھیل آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ پڑھنے والے بھائی اور بہنیں اس کو پسند کریں یا نہ کریں یہ اُن کی مرضی ہے۔

سعیدہ خلیل الدین

کرکٹ

یوں تو مجھے ورزشی کھیل بھاتا ہے۔ لیکن کرکٹ سے مجھے خاص دلچسپی ہے کھلاڑیوں کا سادہ لباس میدان کی کھلی ہوا اور گیند کی تیز حرکت بلا بازوں کا تیزی سے مقام بدلنا یہ وہ چیزیں ہیں جن پر میں تو کیا میرا ہر ایک ساتھی خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سردی کا موسم ہے دھوپ جسم کو خوش گوار معلوم ہو رہی ہے۔ مدرسے کو چھٹی ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کتابیں سامنے رکھ کر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن میرا سارا خیال کرکٹ میں ہے میرے بڑے بھائی دفتر کے وقت پر میرے کمرہ کے سامنے سے گذرتے ہوئے آئے۔ مجھے مخاطب کر کے کہا ممتاز کیا تم بھی میرے ساتھ کھیل دیکھنے سکندرآباد چلو گے۔ لیجئے۔ کیا بن آئی ہے بندہ تو اسی سوچ ہی میں تھا، ایک پل بھر میں تیار ہو ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ اور موٹر میں سوار ہو کر تھوڑی سی دیر میں سکندرآباد کے بڑے میدان کے قریب پہنچا۔ آدمیوں کا ہجوم گھما گھمی اور ڈیرہ حل کی خوش وضع ترتیب دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اور کیا بتلاؤں کہ وہ سارا دن میں نے کس مسرت میں گزارا ہے۔

اس لئے قدرتاً میرے دل میں کرکٹ کھیلنے کا شوق پیدا ہوا اور اب میری ہر ایک شام پُرمسرت ہو گئی ہے۔ مدرسہ برخاست ہوتے ہی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدرسے کے میدان کو چلا جاتا ہوں۔ کوئی گیند پھینکنا شروع کرتا ہے اور کوئی بلّا بازی۔ یہاں ایک شکایت یہ ہے کہ

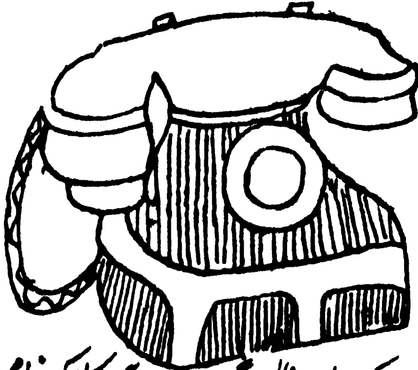
اگر مولوی صاحب میدان پر نہ ہوں تو لڑکوں میں تِلّا بازی کے لئے ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ خود کھیلے جس کے سبب بعض لڑکے محروم رہ جاتے ہیں۔

یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ اس کھیل میں کیوں اتنی دلچسپی ہوتی ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں فٹ بال کی سی دوڑ اور ہاکی سا اندازہ اور ٹینس کی طرح مقابل کو گولے کی دست رس سے محروم کرنے کی کوشش ضرور ہوتی ہے۔ اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں ان تمام کھیلوں سے واقف ہوں۔ ایک طرف گیند انداز اس کوشش میں ہوتا ہے کہ گولا کھلاڑی سے کسی طرح چوک جائے۔ اور کھلاڑی یہ چاہتا ہے کہ اس کے گولے کو جتنی دور ہو سکے مار کر زیادہ سے زیادہ دوڑیں حاصل کرے۔

سچ تو یہ ہے کہ موسم سرما کی خوشگوار دھوپ میں جتنی دلچسپی اس کھیل سے ہوتی ہے کسی دوسرے کھیل سے ممکن نہیں۔

ٹیلیفون

محمد ممتاز الدین خان



ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن !!!! احمد "یہ کس چیز کی آواز ہے" محمود "کیا آپ نہیں جانتے یہ ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز ہے" احمد "اس آلہ سے کیا کام لیا جاتا ہے اور کب استعمال ہوتا ہے" محمود "اس آلہ سے وقت ضرورت ایک دوسرے سے بہ آسانی گفتگو کر سکتے ہیں پہلے جس کام کے کرنے کو کئی دن درکار تھے آج اسی کام کے لئے صرف چند منٹ درکار ہیں اسی طرح کسی کو کچھ پیغام بھیجنے کے لئے ایک خادم کی ضرورت تھی اور خادم کی تنخواہ وغیرہ کے مصارف علحدہ مگر اب ..... آپ کا ایک خادم ہمیشہ آپ کی خدمت کرتا ہے اور تقریباً ہر امیر گھر میں موجود ہے منٹ کے (۶۰) سکنڈ گھنٹے کے (۶۰) منٹ دن کے (۲۴) گھنٹے ہفتہ کے (۷) دن مہینے کے (۴) ہفتے سال کے (۱۲) مہینے آپ کی خدمت کرتا ہے" احمد "اچھا یہ تو بتاؤ یہ کب اور کس طرح وجود میں آیا اور اس کا موجد کون تھا؟" محمود "ہاں ہم ضرور بتائیں گے لو سنو! مختصر طور پر اس کے حالات سناتے ہیں۔ ٹیلیفون ۱۸۷۶ء میں ایجاد ہوا۔ اس کا موجد الگزینڈر گراہم بل ہے جو ۱۸۴۷ء میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا اس کے ابدا واس مدرسے کے استاد تھے جہاں بہروں کی تعلیم ہوتی چونکہ وہ سن نہیں سکتے ہیں اس لئے کسی بات کا سمجھانا بہت مشکل کام تھا الگزینڈر کا باپ بھی وہاں کا استاد تھا۔ ابتدا میں الگزینڈر کو شوق ہوا کہ ہم جو بات کرتے ہیں وہ ہوا کی مدد سے کہاں تک جا سکتی ہے اور کس طرح جاتی ہے معلوم کرنا چاہیئے چنانچہ وہ اپنے ارادے میں ایک حد تک کامیاب رہا رفتہ رفتہ مختلف تجربوں سے اس کو تمام باتیں معلوم ہوگئیں چند روز بعد اس نے امریکہ کا سفر کیا جہاں بجلی کے ذریعے آواز پہنچانے کے تجربے کرنے لگا۔ پہلے اس نے لوہے کے دو ٹکڑے لئے اور دونوں کو ایک تار کی مدد سے ملا دیا جس سے ایک لوہے کے ٹکڑے سے دوسرے لوہے کے ٹکڑے تک آواز جانے لگی اس طرح تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر رکھ کر ابتدا میں صرف آواز پہنچانے کی کوشش کی جس میں اس کو کامیابی ہوئی اب وہ گفتگو کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی کوشش کرنے لگا اور بہت محنت و مشقت کے بعد چند آلات تیار کئے

جس کے ذریعہ بات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اسی کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک تار کے اس کے ایک سرے پر اپنے دوست واٹسن سے بات کرنے لگا جو دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا جہاں اسی تار کا دوسرا سرا رکھا گیا تھا الگزینڈر نے اس طرح گفتگو کی "واٹسن!! ذرا میرے کمرے میں آئیے آپ سے مجھے کچھ کام ہے" واٹسن نے لفظ بہ لفظ اس گفتگو کو سنا اور خوش ہو کر جواب دیا "دوست! میں نے تمہاری تمام باتیں سن لی ہیں" الگزینڈر کو یہ دوسری بڑی کامیابی ہوئی۔ اسی زمانے میں فلیڈلفیا میں ایک نمائش منعقد ہوئی جس میں الگزینڈر گراہم بل نے اپنے تمام آلات بھیج دئے جس سے لوگوں کو بہت حیرت اور خوشی ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس نے دور دور تک آواز پہنچانے کی کوشش کی اور پہلے کی طرح اس میں بھی کامیاب رہا۔ لیکن اس کے لئے روپیہ درکار تھا لہٰذا اس نے کئی شہروں کا سفر کر کے اپنے اس کام کی خبر لوگوں کو پہنچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ پھر اس نے ایک کمپنی قائم کی جس کا نام "بل ٹیلیفون کمپنی" رکھا۔ رفتہ رفتہ اس ایجاد کی بہت شہرت ہوئی سب لوگ اس سے واقف ہو گئے اب تقریباً ہر دفتر میں اس کا استعمال ضروری ہو گیا ہے۔ ہم کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی ضرورت کی کوئی نہ کوئی چیز ایجاد کریں تاکہ ہمارا بھی نام الگزینڈر گراہم بل کی طرح ہمیشہ مشہور رہے۔

احمد۔ "محمود بھائی آپ کا بے حد شکریہ جو آپ نے اتنی کارآمد باتیں بتائیں" محمود۔ "اس میں شکریہ کی بات ہی کیا ہے جو کچھ میں اس کے متعلق جانتا تھا تمہیں بتا دیا یہ تو ایک انسانی فرض ہے کہ اپنے علم و عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔" احمد۔ "لو پھر گھنٹی بجنے لگی" ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن!!!

معین الدین احمد انصاری

کامیاب زندگی کے چند کمیاب ضابطے

آج کل کی دنیا میں بہر صورت کامیابی حاصل کرنا ہو تو چاہیے کہ ہر وہ انسان جو ترقی چاہتا ہے حسب ذیل ضابطوں پر کاربند ہو جائے۔ ان ضابطوں کی سرسری سی وضاحت کی جاتی ہے۔ عاقل را اشارہ کافی است۔

۱۔ انسانیت اس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے سے ہر بڑے عہدہ دار کو خدا سمجھو اور اپنے سے ہر چھوٹے (خصوصاً ماتحتین) کو کم از حیوان۔

۲۔ مصالحت۔ اپنا الو سیدھا کرو اور دوسرے کا ٹیڑھا۔ کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

۳۔ تفریح۔ وقت فرصت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ بڑے عہدہ داروں کی یا ان کے ماتحتین کی یا ان کے نوکروں ہی کی دل بہلائی یا خوش آمد کی جائے۔ اس کے لئے تو صاحب ہی وقت نکالنا چاہیے۔

۴۔ مدرسہ۔ وہ جگہ جہاں طلبہ چار و ناچار حاضری دینے پر مجبور ہیں مگر اجازت ہے کہ حاضری کے بعد فرار ہو جائیں۔

۵۔ گلی کوچہ۔ وہ جگہ جہاں مدرسے میں حاضری دلوانے کے بعد طلبہ بطیب خاطر جمع ہو سکیں، خوش فعلیاں کریں اور زندگی کی عملی تعلیم حاصل کریں۔ بیرون مدرسہ یا زائد از نصاب مصروفیات اسی کو کہتے ہیں۔

سید اکبر اعظم

چور کی عقلمندی

ایک صاحب کے پاس سونے کی گھڑی تھی ۔ وہ روزانہ اُس کو لگا کر دفتر جایا کرتے تھے ۔ اُس محلے میں ایک چور اُس کی تاک میں تھا۔ ایک مرتبہ وہ صاحب گھڑی بھول کر دفتر چلے گئے تو راستے میں اُن کو چور نے دیکھ لیا کہ آج یہ صاحب گھڑی بھول کر جا رہے ہیں۔ چور ایک زمانے سے اُس کی تاک میں تھا ہی جھٹ سے بازار چلا گیا اور ایک بڑا مرغ خرید لایا۔ پھر وہ صاحب کے گھر گیا اور کہنے لگا کہ آج صاحب گھڑی بھول گئے ہیں وہ مجھے دیدیجئے اور یہ مرغ رکھ لیجئے۔ گھر والوں نے سچ جان کر مرغ رکھ لیا اور گھڑی اس کے حوالے کر دی ۔ شام کو گھر کے مالک تشریف لائے تو گھر والوں نے پوچھا کہ کیا آپ آج گھڑی منگوائی تھی ! تو مالک نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ گھر والوں نے حیران ہو کر گزرا ہوا واقعہ سنایا ۔ وہ بھی بہت پریشان ہوا، اور الٹے پاؤں دوڑ کر پولیس میں اطلاع دے دی ۔ پولیس چور کی تلاش میں تھی دوسرے دن چور نے مرغ بھی وصول کرنے کی ترکیب سوچی۔ جب مالک دفتر چلا گیا، تو پھر چور بھیس بدل کر مکان پہنچا اور کہنے لگا کہ صاحب کا گھڑی والا چور مل گیا ہے اور صاحب کہتے ہیں کہ اس کا مرغ اس کو دے کر گھڑی لے لیں ۔ نادان گھر والوں نے سچ جان کر مرغ بھی اس کے حوالے کر دیا ۔ چور مرغ اور گھڑی لے کر فرار ہو گیا۔

اورنگ آباد کی سیر

ابوالحسن
خیریت آباد

حیدر آباد میں نظام اسٹیٹ ریلوے کی طرف سے ایک تفریحی ٹرین جاری ہوئی ہے ۔ اس میں مختلف چھٹیوں میں ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ چنانچہ ان بقرعید کی چھٹیوں میں یہ ٹرین اورنگ آباد گئی تھی ۔ جہاں وہ تین دن تک ٹھہری رہی ۔ ہر روز صبح میں ناشتے کے بعد ہم ایک خاص موٹر میں سوار ہو جاتے اور جگہ جگہ کی سیر کے بعد کسی اچھی جگہ دوپہر کا کھانا کھا کر اور سہ پہر کی چائے پی کر بعد مغرب اسٹیشن واپس ہوتے اور رات کے کھانے کے بعد سو جاتے ۔ پہلے روز ہم کو نوکھنڈہ مبارک چکی اور بی بی کا مقبرہ دکھایا گیا ۔

نوکھنڈہ اسٹیشن سے قریب ہے ۔ وہاں اورنگ زیب کا دربار اور نو محلات ہیں لیکن اب سوائے اس جگہ کے جہاں دربار ہوا کرتا تھا سب کھنڈر ہے ۔ نو محلوں کی وجہ سے اس کا نام نوکھنڈہ رکھ دیا گیا ہے ۔ باہر میدان میں اعلیٰحضرت کی جوبلی کی یادگار کے طور پر ایک خوبصورت چمن بنایا گیا ہے ۔ یہاں سے ہم پن چکی پہنچے یہ جگہ بہت روح افزا ہے ۔ یہاں ایک بڑا حوض ہے جس میں مچھلیاں بھی ہیں ۔ اس حوض میں سے پانی بہہ کر ایک ندی میں گرتا ہے ۔ پاس ہی ایک کمرے میں چکی ہے جو پانی کے زور سے چلتی ہے ۔

سنا ہے کہ اورنگ آباد کے پہاڑوں میں ایک نہر ہے جس کا پانی یہاں لایا جاتا ہے اس حوض کے آگے ایک اونچی دیوار ہے جس پر پانی چڑھتا ہے اور حوض میں گرتا ہے ۔ آگے ایک چمن ہے جس میں ایک درگاہ ہے ۔ اس چمن میں تہ خانے کا راستہ ہے ۔ تہ خانے میں اتنی ٹھنڈک ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اوپر حوض ہے جس کے چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں اور اس میں فوارے بھی ہیں ۔ یہاں سے ہم بی بی کے مقبرے کو گئے اور وہیں دوپہر کا کھانا کھایا ۔ یہ مقبرہ اورنگ زیب کی اہلیہ رابعہ دورانی کا ہے ۔ شہزادہ اعظم شاہ نے اپنی ماں کی یادگار میں ۱۶۵۰ء اور ۱۶۵۷ء کے درمیان تاج محل کے نقشے پر تعمیر کرایا تھا اور اس میں شک نہیں کہ نقل خوب اتاری ہے لیکن تاج محل خالص سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور یہ مقبرہ چونے پتھر کا ہے البتہ کہیں کہیں اس میں بھی سنگ مرمر سے کام لیا گیا ہے ۔ ہم نے اندر جا کر رابعہ دورانی کی قبر دیکھی ۔ دکن میں اس عمارت کا شمار

مسلمانوں کی بہترین یادگاریں ہیں ۔ جنائی لوشش ... ہیں اورنگ آباد کے غار جو حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں دیکھے اور پھر اسٹیشن واپس آگئے
دوسرا دن صرف اجنٹا کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اجنٹا کے غار اورنگ آباد سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہیں اس لئے وہاں پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ راستے میں اجنٹا سے کوئی ۲ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جسے (VIEW POINT) کہتے ہیں۔ یہاں سے اجنٹا کے غاروں کا بہت خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب غار دیکھنے اوپر چڑھے۔ غاروں کی کل تعداد ۲۹ ہے جن میں سے ۵ عبادت خانے اور باقی خانقاہ ہیں اور سب بدھ مت سے متعلق ہیں۔ اجنٹا میں بس دیکھنے کی چیز صرف نقاشی ہے۔ سنگ تراشی بالکل کم ہے اس سنگ تراشی اور نقاشی میں جو کمال ہے وہ یہ کہ اس میں احساسات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اجنٹا کے آرٹ سے بدھ مت کے لوگوں کی زندہ دلی اور اطمینان کا پتہ چلتا ہے۔ اجنٹا کے غار چونکہ بند ہیں اس لئے وہاں اندھیرا رہتا ہے۔ اور تصویریں روشنی ڈال کر دکھائی جاتی ہیں۔ چند لوگوں نے اعتراض کیا کہ اُس زمانے میں روشنی کا کیا قاعدہ تھا۔ تو بتایا گیا چونکہ برقی روشنی نہ تھی اس لئے لوگ سورج کی طرف آئینہ رکھ دیتے اور اندر ایک سفید چادر بچھا دیتے۔ چنانچہ اس آئینہ کا عکس اس کپڑے پر پڑکر روشنی ہو جاتی۔ اجنٹا میں یوں تو ہر غار میں نقش و نگار ہیں لیکن جو اپنی اصلی حالت پر ہے وہ غار نمبر ۱۲ میں ہے۔ چونکہ ہم بہت تھک گئے تھے اس لئے سب غار نہیں دیکھ سکے اور چند دیکھ کر واپس ہو گئے۔ اسٹیشن پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی

تیسرے دن جو سب سے آخری دن تھا۔ دولت آباد کا قلعہ۔ ایلورا کے غار اور آصفجاہ اول اور اورنگ زیب کا مقبرہ دکھایا گیا۔

سب سے پہلے ہم دولت آباد کے قلعے کو پہنچے۔ یہ اورنگ آباد سے ۹ میل پر واقع ہے۔ اس قلعہ کے اطراف ایک قدرتی خندق ہے۔ جس میں پانی بھر دیا گیا ہے۔ یہ .. افٹ گہری ہے جس پر ایک چھوٹا سا پل بنا دیا گیا تھا جو بوقت ضرورت اٹھا لیا جاتا تھا۔ داخل ہو کر تھوڑی دور جانے پر ایک بڑا منار نظر آیا جو ۲۱۰ فیٹ اونچا ہے۔ اس کا نام "چاند منار" ہے ذرا آگے بڑھنے پر ایک چبوترا ہے جس پر ایک توپ ہے اس کا نام "مینڈھا توپ" ہے۔ اس کا سر مینڈھے کا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر "چینی محل" ملتا ہے۔ اس میں ابوالحسن تانا شاہ ۱۲ سال قید رہے اور وہیں اس فقیر منش بادشاہ کا انتقال ہوا۔ قلعہ کے اندر قابل دید چیز ایک اندھیری گلی ہے اس میں داخل ہونے کے بعد تین دروازے ملتے ہیں ایک دروازہ بہت چھوٹا ہے جو بالا حصار کو جاتا ہے اگر دشمن اس میں گھسنا چاہے تو ایک سپاہی پوری فوج کے لئے کافی ہوتا ہے کیونکہ ایک سے زیادہ آدمی اس میں سے گزر نہیں سکتا۔ دوسرا راستہ توے کی طرف جاتا ہے۔ یہ توا اس زمانے میں ہر وقت گرم رہتا تھا جس کی تپش کی وجہ سے دشمن اوپر نہ آسکتے تھے۔ اور جو آجاتے تھے وہ وہیں ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ تیسرا دروازہ خندق کی طرف جاتا ہے یہاں اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی وجہ سے خندق دشمنوں کو نظر نہ آتی تھی۔ اور وہ اس میں گر پڑتے تھے۔ لیکن آج کل ایک دیوار توڑ دی گئی ہے جس کی وجہ سے خاصا اجالا رہتا ہے اور اس خندق پر ایک دیوار بنا دی گئی ہے تاکہ کسی کو دھوکا نہ ہو۔ ہم کو اس خندق سے آگے جانے سے روک دیا گیا چنانچہ ہم وہیں سے لوٹ پڑے۔ یہاں سے ہم ایلورا پہنچے یہ اورنگ آباد سے ۱۴ میل پر واقع ہے۔ یہاں مندروں کا ایک سلسلہ ہے جو پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ان کا تعلق بدھ، برہمن اور جین مذہبوں سے ہے۔ بدھ مت کے غار ۱۲ ہیں۔ برہمن کے ۱۷ اور جین کے ۵ ہیں۔ وہاں آثار قدیمہ کے ایک مددگار صاحب نے تقریر کی جس میں ایلورا کے چند اہم غاروں کے متعلق حالات بیان کئے۔ ایلورا کے غار اجنٹا کے غاروں کی طرح بند نہیں ہیں اس لئے اجالا رہتا ہے۔ سوائے چند غاروں کے کسی غار کو چھت نہیں ہے۔ یہاں دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چاء ہوئی اور ہم واپسی میں آصفجاہ اول اور اورنگ زیب کے مقبرے دیکھتے ہوئے اسٹیشن واپس ہوئے۔

حبیبہ حبیب الرحمن

پیپل

ہندو اِس درخت کو بڑا متبرک مانتے ہیں اور اِس کی پوجا بھی کرتے ہیں، معلوم نہیں کہ پوجا کرنے کی کیا وجہ ہے۔ مہاتما گوتم بدھ کی وفات اِسی درخت کے نیچے ہوئی تھی لیکن ہندوستان میں پیپل کے درخت کی پوجا مہاتما گوتم بدھ کے پہلے سے ہوتی ہے پیپل اُن درختوں میں سے ہے جو نہایت آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں، اس لئے اس کی عمر بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پیپل کے پتے چکنے اور نوکدار ہوتے ہیں جس سے یہ فائدہ ہے کہ بارش کی بوندیں ان کے اوپر سے بہ آسانی بہہ جائیں ورنہ جتنی دیر یہ گیلے رہیں مسام بند رہتے ہیں اور یہ اپنا کام نہیں کرسکتے۔

پیپل کا پھول اور پھل ایک ہی ہوتا ہے جس کو پیپلیاں کہتے ہیں جب یہ پکتی ہیں تو ان کے اندر بیج بنتے ہیں یہ بیج پرندوں کے معدہ میں ہضم نہیں ہوتا بلکہ فضلہ کے ساتھ ویسا ہی نکل جاتا ہے۔ اگر پرندوں کی بیٹ کسی درخت کی کوکھ یا شگاف میں گرجائے تو یہ درخت وہیں اگنا شروع ہوجاتا ہے اور جب تک اس کی جڑیں زمین میں نہیں پہنچتیں یہ اپنی غذا صرف مینہ کے پانی اور ہوا سے حاصل کرتا ہے، پیپل کے پتے ہاتھی، بھیڑ اور بکری بڑی خوشی سے کھاتے ہیں اس کا دودھ دواؤں میں کام آتا ہے اس کی لکڑی بہت کمزور ہوتی ہے اور صرف جلانے کے کام آتی ہے۔

محمد ابراہیم ملّا جاوید (گلبرگہ)

عطر اور کلیجہ

ایک روز دو گاؤں والے بھائی اپنے ایک شہری دوست کے ہاں عید ملنے کی غرض سے گئے، شہری دوست نے حسب معمول اُن دوستوں کی خدمت میں عطر پیش کیا، گاؤں والوں میں سے ایک نے عطر لے کر چاٹنا شروع کردیا۔ شہری دوست نے بڑے بھائی کو اشارہ کیا وہ کہنے لگا "ہو جی حجت (حضرت) میں اس کو ہمیشہ بولتوں کہ کلیجہ سے لگا کر کھا مگر وہ بس (نہیں) سنتا میرا جی بے جار (بیزار) ہوگیا تو میں کاموش (خاموش) بیٹھ گیا۔"

میر محمد علی

سینما

میں نہیں جاؤں گا بیکار کی ضد ہے حامد — امی جان ان کو بلا لیجیے نہیں یہ سنتے
سینما جاؤں کہ میں اپنا سبق یاد کروں — یاد ہے ان کو سبق پوچھیے تو یہ ان سے
امتحاں سر پہ ہے کیوں ڈٹ کے میں محنت نہ کروں — ایسی محنت کہ مرا ایک بھی پرچہ نہ دبے
ذہن ہانڈی کی طرح ہے تو سبق گوشت کے مثل — شوق کی آنچ نہ ہو تیز تو کیسے یہ گلے
بدزبانی ہی پہ کل آپ نے مارا تھا انھیں — سنئے پھر کہتے ہیں کیا تجھ کو غرض مجھ سے ایسے

سید ابوالقاسم سرور

کہانیاں

(۱) کسی سپیرے نے ایک بڑا سا سانپ پکڑا، اُسے مٹی کی ہانڈی میں ڈال، اوپر سے چپنی ڈھانک، آٹا گھول کے ہانڈی کے منہ پر لگا، دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھ دیا۔ جب گیلا آٹا سوکھ کے پتھر سا ہو گیا تو ڈہری تہری ڈوری ہانڈی کے گلے میں باندھ اور ہاتھ میں لٹکا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھا۔ چلتے چلتے ایک جگہ گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں ستانے کے لئے جا بیٹھا، گھنی چھاؤں کی ٹھنڈک اسے ایسی اچھی لگی جو وہیں گھاس پھوس پر پڑ کے سو گیا، وہاں کے پیڑوں پر بہت سے چھوٹے بڑے بندر سپیرے کی کوری ہانڈی میں اپنا کھاجا سمجھ کے اچھل کود رہے تھے۔

سپیرے کو سوتا دیکھ کر ایک بڑا اُجگا دری بندر نیچے اترا اور چپکے سے وہ ہانڈی اٹھا، اس کی ڈوری گلے میں ڈال پیڑ پر چڑھ گیا۔ کھانے کی دھن میں ہانڈی کے منہ پر کا جما ہوا پپڑا آٹا پنجوں سے کھرچنے لگا۔ سوکھا ہوا آٹا کھرچ کھرچ کے جب سب پھینک چکا تو جھٹ پٹ ہانڈی کا چپنی ہٹایا، چپنی ابھی پورا ہٹا بھی نہ تھا جو ہانڈی میں سے ایک بڑی پھنکار کے ساتھ بڑا کالا سانپ پھن اٹھائے اس کے منہ کے آگے لہرانے لگا۔ یہ دیکھتے ہی بندر ادھ موا ہو کے رہ گیا۔ ہانڈی میں سے پھن نکالے سانپ اس کے آگے لہرا رہا ہے اور وہ سکڑا، سمٹا ہوا چپ چاپ کنکھیوں سے اسے دیکھتا جاتا ہے۔

ہوتے ہوتے سانپ پھر ہانڈی میں بیٹھنے لگا اور جوں ہی اس کا پھن جھکتے ہوئے دیکھا بندر نے پھرتی سے پھن پکڑ ہی تو لیا اور پھن پکڑتے ہی پیڑ کی چھال سے رگڑنے لگا۔ پھن کا پکڑنا تھا جو سانپ نے اپنا پورا دھڑ ہانڈی سے نکال کے اس سے بندر کے ہاتھ پاؤں اور گلے کو لپیٹ کے پورا جکڑ لیا۔ اس پر بھی یہ دونوں ہاتھوں سے لگاتار اسے رگڑتا ہی رہا اور سانپ مر کے رہ گیا۔

جب سانپ مر چکا تو بندر نے اپنے گلے، ہاتھ، پاؤں سے اسے نکال کر پیڑ کے نیچے پھینک دیا۔ پھر وہاں سے دوسرے پیڑ پر کود کے اپنے ساتھیوں کے پاس ہنستا ہوا آ بیٹھا اور کہنے لگا۔ تم نے دیکھا؟ یہ بات دھیان میں رکھو جب کبھی اچانک کسی بپتا سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گھبرانا اور پیچھے ہٹنا نہ چاہئے۔ وہیں ڈٹ کے جو بن پڑے وہ کرے، ہاتھ پاؤں ہلانے کی جگہ ڈر کر چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے چپنی بھر پانی میں ڈوب مرنا کہیں اچھا ہے۔" سیّد ابوالقاسم سرور

(۲) برات دیکھنے کا شوق

ایک دفعہ شیخ چلی کے گھر کی طرف سے ایک برات جا رہی تھی شیخ سن رسیدہ ہو چکے تھے لیکن برات دیکھنے کا شوق بچوں سے بھی زیادہ تھا۔ گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کے دیکھنے لگے لیکن دل میں یہ خیال کیا کہ اس طرح دیکھنے میں ہماری توہین ضرور ہو گی۔ اسی وقت گھر کے بالاخانے پر چڑھ گئے جہاں شیخ کے گھر کی عورتیں برات دیکھنے میں مشغول تھیں۔ یہاں آکر شیخ چلی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان عورتوں کے درمیان مجھے کسی نے دیکھ لیا تو بڑی ہنسی ہو گی۔ فوراً ایک زنانہ ڈوپٹہ اوڑھ لیا اور برات دیکھنے لگے۔ دفعتہً ایک لڑکے نے نیچے سے غل مچایا کہ ارے دیکھو تماشا اس عورت کی کتنی لمبی ڈاڑھی ہے۔ یہ سن کر شیخ کو طیش آگیا ڈوپٹہ پھینک دیا اور لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "عورت ہو گی تمھاری اماں ہم تو مرد ہیں۔"

فریدہ خاتون (محبوبیہ گرل اسکول)

جماعت پنجم (الف)

وقت کی قدر

وقت پر ہر کام کرنے سے مختلف فائدے ہیں اگر ہم روزانہ صبح سے لے کر شام تک اپنے تمام کام وقت پر کیا کریں تو ہم ہمیشہ کامیاب ہوتے رہیں گے۔ پڑھنے کے اوقات پر پڑھنا اور کھیلنے کے اوقات پر کھیلنا بہت ہی ضروری ہے اس لئے کہ اگر پڑھنے کے وقت کھیلنے لگیں اور جماعت کا کام نہ کریں تو ہم اپنے سبق پوری طرح نہ سمجھ سکیں گے اور نہ امتحان میں کامیاب ہو سکیں گے جو وقت ہم نے کھیلنے میں گذار دیا وہ پھر واپس نہیں آسکتا کیونکہ ماسٹر صاحب جماعت میں جو کتاب کا سبق پڑھائیں گے پھر دوبارہ سال بھر تک نہیں پڑھائیں گے اور ہم اس سبق کی حد تک پیچھے رہیں گے ہر کام اگر وقت پر کیا جائے تو صحت بھی درست رہتی ہے اور طبیعت بھی خوش رہتی ہے جو لڑکے وقت پر اپنا کام نہیں کرتے وہ ہمیشہ فیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کی صحت بھی خراب رہتی ہے مدرسے میں اگر وقت پر نہ آئیں تو ماسٹر صاحب کی سزا سے نہیں بچ سکتے اور اس کے علاوہ سبق پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملتا، بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ وقت وہ دولت ہے جو دوبارہ نہیں کمائی جا سکتی اگر ایک مرتبہ وقت گذر جائے تو دوبارہ لاکھوں روپیے خرچ کئے جائیں تو بھی گذرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا اس لئے کہا جاتا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ لہٰذا ہم کو اپنا وقت بیکار نہیں گذارنا چاہئے اور ہر کام وقت پر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے دنیا میں ہر جگہ وقت مقرر کر دیا گیا ہے تاکہ تمام کام وقت پر ہوا کریں ریل گاڑی اگر وقت پر نہ پہونچیں تو نہیں ملتی اس دن کا سفر روکنا پڑتا ہے دواخانہ کو اگر وقت پر نہ جائیں تو ڈاکٹر صاحب نہیں ملتے دن بھر بیماری کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے امتحان میں اگر وقت پر نہ جائیں تو پورا پرچہ نہیں لکھ سکتے کھانا وقت پر نہ کھائیں تو ہمیشہ پیٹ کی بیماری میں مبتلا رہتے ہیں ہم طالب علموں کو ابھی سے وقت کی قدر کرنا چاہئے اگر ہم ابھی سے وقت کی پابندی کریں گے تو آئندہ ہم تمام کام وقت پر کیا کریں گے وقت پر کھانا، وقت پر سونا، وقت پر پڑھنا اور وقت پر کھیلنا صحت قائم رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔

ہاشم بن سعید

بلند ارادہ

کہے جو لڑکا "کروں گا کوشش" تو سمجھو پہنچے گا آسماں پر
کہے جو لڑکا "نہیں یہ ممکن" رہے گا زیر زمین وہ جا کر
"کروں گا کوشش" سے کام ہونگے "نہیں" سے ممکن نہیں کچھ ہونا
یقین ہو تب کہو "کروں گا" نہیں تو بہتر ہے چپ ہی رہنا

میر کاظم علی واصل

سب رس اپریل ۱۹۳۸ء

اگلی بات خدا کے ہاتھ

رام سنگھ ایک غریب کسان تھا بڑی مدت کے بعد اس کی مراد بر آئی اور اس کے گھر ایک لڑکا سندر سنگھ پیدا ہوا مگر اس کی پیدائش کے چند روز بعد تمام زمینوں کا محصول دوگنا ہو گیا رام سنگھ سمجھ رہا تھا کہ اس لڑکے کے منحوس قدم سے ہماری کمائی میں کمی ہو رہی ہے آخر اپنے میں اس کی پرورش کی سکت نہ پاکر سندر کو محلہ کے ایک متمول آدمی رتن سنگھ کے حوالے کیا چار سال کی عمر سے اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ وہ ایک مدرسے میں داخل کر دیا گیا' وہاں سندر نے اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے تمام مکتب میں ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ سرکار سے اس کو چھ روپے ماہانہ کا ترغیبی وظیفہ منظور ہوا۔ اب اس کے والدین افسوس کر رہے تھے کہ ہم نے بغیر سوچے سمجھے سندر کو ایک غیر شخص کے سپرد کر دیا' وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سندر ہم کو واپس مل جائے مگر اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت' سندر اس غیر شخص کے پاس رہ کر ترقی کے منازل طے کرتا گیا اور آخر کار اس نے اعلیٰ تعلیم کے لئے مغربی ممالک کا سفر کیا اور قانون میں امتیازی ڈگریاں حاصل کیں۔ واپس ہو کر آزادانہ پیشۂ وکالت انجام دینے لگا جب اس کی خداداد قابلیت کی شہرت ہر طرف پھیل گئی یہ خبر ایک جاگیردار کے کانوں تک پہنچی تو اسے بلا کر اپنی جاگیر کی معتمدی پر سرفراز کیا۔ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوتے ہی سندر نے اپنے والدین اور سرپرست کو اپنے پاس بلا کر نہایت آرام سے رکھا' وہ شرمندہ تھے کہ وہ لڑکا جس کو ہم نے اپنے گھر سے نکالا تھا وہی اب ہمیں پناہ دے رہا ہے' جاگیردار کی صرف ایک لڑکی رادھا تھی جب وہ قریب المرگ ہو گیا تو سندر سنگھ کو بلا کر رادھا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور کہنے لگا کہ اس لڑکی کا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں تم کو اپنا داماد اور جانشین بناتا ہوں میرے بعد تم جاگیر کے مالک ہو۔ جب جاگیردار مر گیا تو سندر سنگھ نے جاگیر اپنے ہاتھ میں لی اور ایسے اچھے طریقہ پر حکومت کی کہ رعایا خوش حال ہو گئی غریب لوگ امیر بن گئے جب سندر سنگھ چھوٹا تھا تو اس کے والدین اس کی منحوس صورت دیکھنا نہ چاہتے تھے ان کو کیا معلوم تھا کہ یہی صورت ہمارے ملک کو ایک نئی زندگی دینے والی ہے اس واقعہ کے بعد ملک کا کوئی آدمی بھی کسی کے مستقبل کے متعلق کچھ نہ کہتا' اگر کبھی آئندہ زمانے کے متعلق کہنا ضروری ہوتا تو کہتا "اگلی بات خدا کے ہاتھ"۔

محمد فیروز الدین صدیقی (متعلم جماعت ب سٹی کالج)

حرص و طمع کو چھوڑ دو

حرص و طمع کو چھوڑ دو — خُم کو ہوس کے توڑ دو
جوڑو نہ مال و زر کبھی — قلبِ شکستہ جوڑ دو

خوفِ خدا

جو مرضی ہو وہی کرتے رہو تم! — خدا سے رات دن ڈرتے رہو تم
خدا کا خوف دل میں جاگزیں ہو — اسی کا دم سدا بھرتے رہو تم

نوشابہ خاتون (بی اے)

اچھا بچہ

یہ مجھ سے مری امی جاں نے کہا ہے
کہ اللہ میاں تو ہی سب سے بڑا ہے

ترے حکم سے بن گئے ہیں یہ سارے
زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے

تو ہی نے کہیں پودے زمیں سے اگائے
تو ہی نے ہیں پھل پھول ان میں لگائے

مرے اچھے بابا مری پیاری امی !!
یہ دونوں ملے مجھ کو رحمت سے تیری

دیئے تو نے ہی یہ بہن بھائی میرے
کھلونوں سے بڑھ کر جو ہیں مجھ کو پیارے

تو ہی مجھ کو دیتا ہے کھانے کو میوے
تو ہی مجھ کو دیتا ہے پھولوں کے کپڑے

تو اے میرے اللہ کیسا ہے اچھا
کہ بے مانگے ہر چیز ہے مجھ کو دیتا

نہیں کام کرتا میں تیرا ذرا بھی !!
نہ دینے میں تو نے مگر کچھ کمی کی !!!

مری یہ دعائیں بھی اللہ سن لے !
مجھے شوق پڑھنے کا سب سے سوا دے

میں پڑھ لکھ کے بن جاؤں بس پیارا بیٹا
کہا میں ہمیشہ سنوں باپ ماں کا !

نہ دل کو کسی کے دکھاؤں میں یارب
مجھے دیکھ کر اچھا بچہ کہیں سب

لطیف النسا بیگم (بی، اے)

دلچسپ معلومات

دنیا کی عجب گھڑی - دنیا میں سب سے بڑی عجیب و غریب گھڑی برن دار الخلافہ سوئٹزرلینڈ میں ہے سولھویں صدی کی ساختہ ہے۔ گھنٹہ ختم ہونے پر مرغ بانگ دیتا ہے اور دو منٹ قبل ایک بیٹھی ہوئی سوزن کے سامنے سے ریچھوں کی فوج گذرتی ہے۔

شتر مرغ کی عمر - شتر مرغ کی اوسط عمر کا اندازہ ستر سال سے زیادہ لگایا گیا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑا پل - نیویارک (امریکہ) اور بروکلین کے درمیان بنایا گیا ہے اس کا طول پانچ ہزار نو سو نوے فٹ ہے (۵۹۹۰)

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیشن - نیویارک (امریکہ) کا ریلوے اسٹیشن دنیا میں سب سے بڑا مانا گیا ہے، اس پر ۹۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ مزدوروں کے ایک بڑے لشکر نے دس سال تک کام کیا اسٹیشن کے اندر ریلوے لائینوں کی لمبائی ۳۲ میل ہے ۶۹ علحدہ علحدہ پٹریاں اور ۴۶ پلیٹ فارم ہیں اس اسٹیشن پر ہر روز آٹھ سو ریل گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ اور ایک لاکھ مسافر آسانی سے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس میں دھواں نام کو نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسٹیشن کے باہر ۲۵ میل کے فاصلہ پر بھاپ کا انجن ٹرین سے اتار دیا جاتا ہے اور ٹرین کو بجلی سے چلنے والی موٹر سے اسٹیشن میں لایا جاتا ہے اسٹیشن کی چھت آسمان کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔ اس کا رنگ نیلا ہے، اس میں ۵۰ ہزار ستارے لگے ہوئے ہیں جو رات کے وقت بجلی سے روشن کئے جاتے ہیں۔

محمد ممتاز الدین خاں
جماعت پنجم (الف) سٹی کالج

سب رس اپریل ۱۹۳۸ء

ننھی کا خواب

ننھی ایک سات سالہ خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کو ماں باپ بہت پیار کرتے تھے۔ وہ روز صبح نماز سے فارغ ہو کر دل بہلانے کے لئے باغ میں چلی جاتی جس میں اس نے اپنی مرضی کے پودے لگوائے تھے ان سے اس کے مکان کی زینت تھی۔

ایک دن ننھی دستور کے موافق صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کر اپنے باغ میں چلی گئی اُس کے ساتھ اس کا ننھا کتا بھی تھا۔ یہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے چنبیلی کے منڈوے کی طرف بھی نکل گئے اور وہاں سے بھی چند پھول توڑ لئے۔ پھر آگے چلے جا رہے تھے کہ ایک پھول کے پودے پر ایک ننھی سی نہایت خوبصورت تیتری دکھائی دی ننھی اسے دیکھتے ہی دوڑی اور اس کے پیچھے پہنچ کر آہستہ آہستہ پاؤں دبائے چلنے لگی تیتری یہاں سے اڑی تو وہاں کبھی اس پھول پر تو کبھی اُس پھول پر ننھی بدستور اُس کے پیچھے پیچھے اُسی طرح جا رہی تھی۔ اس کا کتا اُسے اِس طرح جاتے دیکھ کر بہت ہی حیران ہوا وہ بھی اسی طرح اس کے پیچھے چلا۔ جوں ہی اس کی نظر اس تیتری پر پڑی تو وہ ایک دم اس کے پکڑنے کو اچھلا اور زور زور سے غرانے لگا جب تیتری نے اس کی آواز سنی تو ہوا کی طرح اڑنے لگی۔ ننھی نے کتے کو ڈانٹا اور بہت جھنجھلائی، کتا دُم دبائے سر نیچے کئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ادھر ننھی اسی طرح تیتری کے پیچھے پیچھے چلی لیکن تیتری اور بھی تیز ہو گئی۔ ننھی اب اس کے پیچھے دوڑنے لگی۔ آخر کار تیتری گلاب کے تختے میں پہنچ کر پھولوں میں غائب ہو گئی، ننھی بھی بہت تھک گئی تھی، وہ ایک نہایت ہی خوبصورت گلاب کے پودے کے نیچے بیٹھ گئی، اس نے اپنی گود کے سارے پھول اپنے سامنے زمین پر ڈال دئیے اس کا کتا بھی اس کے سامنے زبان نکالے اپنے مالک کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، ننھی وہاں بیٹھ گئی اس کا سانس پھول رہا تھا وہ ہانپ رہی تھی اور پھولوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک بہت خوبصورت گلدستہ بنا رہی تھی پھولوں کو جھوڑتی جاتی اور پسینہ پونچھتی جاتی تھی۔ کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتی کبھی گردن پر، اور ساتھ ہی ہنس ہنس بھی کرتی جاتی۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر اُس تیتری کو بھی دیکھتی جاتی وہ اس کو نہیں بھولی تھی جب ننھی گلدستہ بنا چکی تو اس نے اپنے کتے پر نظر ڈالی وہ اسی کو دیکھ رہا تھا کبھی ننھی کو دیکھتا کبھی گلدستہ کو جیسے وہ اس کو بہت پسند آیا، ننھی نے اسے دیکھتے ہی ایک زور کا قہقہہ لگایا اور گلدستہ اس کے سامنے پھینک کر جھاڑ کے نیچے دراز ہو گئی اور جھاڑوں کو دیکھنے لگی کہ شاید اس کو تیتری نظر آ جائے لیکن تیتری تو نظر نہیں آئی بلکہ وہ خود اسے دیکھتے دیکھتے سو گئی جوں ہی اس کی آنکھ لگی اس نے خود کو اسکول میں پایا، ننھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اس کے تمام دوست کھیل رہے تھے وہ ننھی کو دیکھتے ہی چلائے کہ آؤ ننھی کھیلیں اِدھر سے بعض لڑکیاں کھینچنے لگیں کہ آؤ ننھی ہمارے ساتھ کھیلو لیکن ننھی یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ میرے سر میں درد ہے وہ ہر ایک کو اسی طرح ٹالتی ہوئی جھاڑوں پر نظر دوڑائی تاکہ تیتری نظر آئے وہ اسی طرح ڈھونڈھتی پھر رہی تھی کہ گھنٹی کی آواز نے اُسے چونکا دیا سب بچیاں اپنی اپنی جماعتوں کی طرف بھاگ رہی تھیں۔

ننھی بھی تیتری کے غم میں سر جھکائے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ڈالے پھولوں کے پیچھے جا رہی تھی بچیاں اسے اس طرح جاتے دیکھ کر کہنے لگیں کہ ننھی جلدی چلو دیر ہوگئی لیکن ننھی کسی کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی طرح جا رہی تھی سب اپنی اپنی جماعتوں میں جا چکے تھے جب ننھی اپنی جماعت میں پہنچی تو حاضری ہو چکی تھی اور استادنی ماں بھی موجو تھیں ہوم ورک کی کتابیں جمع ہو چکی تھیں استادنی ماں نے ننھی کو دیکھتے ہی کہا آؤ ننھی جلدی آؤ تمھاری ہوم ورک کی کتاب لاؤ ننھی خوف سے جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی ہیبت میں استادنی ماں کو سلام تک نہیں کیا ہائیں میں نے تو ہوم ورک ہی نہیں کیا ایک دم ننھی کی زبان سے نکلا اتنا سننا ہی تھا کہ استادنی ماں آگ بگولا ہوگئیں اور غصہ سے ننھی کے ایک ہلکا سا طمانچہ رسید کیا خوف سے ننھی کی آنکھ کھل گئی تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ پھولوں کی ڈالیوں کے نیچے لیٹی ہوئی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں گلاب کی بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی سورج کی سنہری کرنیں ڈالیوں میں سے چھن چھن کر ننھی کے گلابی چہرے پر پڑ رہی تھیں، گلاب کے پھول ننھی کو دیکھ کر مسرت سے کھل کھلا رہے تھے، جھوم رہے تھے اور جھک جھک کر ننھی کو دیکھ رہے تھے اس کا ننھا سا کتا اس کے سامنے گلدستہ پر سر رکھے پڑا تھا جو ننھی نے خود اپنے ہاتھ سے بنا کر اس کو دیا تھا، یکایک وہ چونکا اور ننھی کے گال کو حیرت سے تکنے لگا ننھی نے اسے دیکھ کر اپنے گال پر ہاتھ رکھا جوں ہی اپنے گال پر ہاتھ رکھا اسے ایک خوبصورت گلاب کا پھول ملا جو اس کے گال پر پڑا ہوا تھا۔

فاطمہ صفدر حسین

محنت

قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے
ذرہ ذرہ پہاڑ بن جاتا ہے
محنت سے ہیں کیا نہیں ہوتا حاصل
کوشش سے خدا بھی مل جاتا ہے

سید شاہ بلیغ الدین حسین (ورنگل کالج)

ایک آنہ

نند کمار غریب تھا۔ گردشِ زمانہ نے اسے غریب سے غریب تر بنا دیا اس میں نند کمار کا کیا قصور تھا دولت نے نند کمار کا ساتھ نہ دیا، مفلسی نے اس کی سرپرستی قبول کی۔

نند کمار ریل گاڑی پر چائے فرخت کرنے لگا، اس کی روزی پیدا کرنے کا یہی ایک واحد ذریعہ تھا ایک مسافر نے چائے خریدی، گاڑی کو حرکت ہوی اور آگے بڑھنے لگی، غریب قیمت کے لئے چلایا مگر حریص و بے رحم مسافر کو رحم نہ آیا، اس ظالم نے ایک نہ سنی، آخر نند کمار دوڑ کر گاڑی پر سوار ہونے لگا ——— دھڑام سے نیچے گر پڑا اور اس کا ایک بازو ریل کے پہیوں کے نذر ہو گیا۔

اب وہ لاچار ہے، محنت و مشقت کر کے روزی کمانے کے قابل نہیں، اس لئے لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے کہتا ہے "غریب پرور غریب کے بازو کی قیمت ایک آنہ ہے"

بابو راجہ (متعلم میٹرک)

سب رس اپریل ۱۹۳۹ء

گلبرگہ شریف

اپنے اُن ننھے منّے سب رسی بھائیوں کو جنھیں "سب رس" اپنی دل پسند اور پیاری چیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہے گلبرگہ شریف کا مختصر سا خاکہ بتلانا چاہتا ہوں، کہتے ہیں یہہ بڑا پرانا شہر ہے اِس کو بسے ہوئے کوئی ہزار برس ہوتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ پہلے "راجہ گلی چند" نے اِس کو آباد کیا اور اپنے نام پر "گل برگی" اِس کا نام رکھا مگر بعض تاریخ دانوں کا یہہ بھی خیال ہے کہ نام موزونیتِ مقام کے لحاظ سے رکھا گیا ہے، یعنی کنڑی زبان میں پتھریلے مقام کو "کل برگی" کہتے ہیں اور یہاں پتھر بھی بکثرت پایا جاتا ہے لہٰذا یہی اسم صفت اسم خاص بن گیا۔

مگر جب مسلمانوں کا دور آیا تو سلاطینِ بہمنیہ نے اِس کو اپنا دار الخلافہ بنایا پھر اس کے بعد اُن کی نازک خیالی نے مٹی پتھر کو پھول پتوں سے بدل کر "کل برگی" سے گلبرگہ بنا دیا، اِن کے مذاقِ سلیم نے ایسی یادگارِ زمانہ عمارتیں کھڑی کر دیں جو اب تک زبانِ حال سے مسافروں اور سیاحوں کو داستانِ پارینہ سنا سنا کر سبق دے رہی ہیں۔

اِن عمارتوں میں چوٹی کی عمارت قلعہ احتشام کی مسجد ہے جو ٹھیک قلعہ میں ہے اور جس کے متعلق مورخین کا خیال ہے کہ یہہ مسجد قرطبہ (اندلس) کا نقشِ ثانی ہے۔ گلبرگہ شریف کا شہر محض اس کی قدامت ہی میں پوشیدہ نہیں بلکہ اس کی شہرت و پسندیدگی کا راز اس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مقدس اور مذہبی مقام ہونے میں بھی پوشیدہ ہے۔

یہاں سال میں دو بڑے زبردست میلے لگتے ہیں جن میں ایک حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا ہے، جو ہر سال ۱۵ ذیقعدہ کو بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے، اِس کے انتظامات کے لئے شاہانِ بہمنیہ نے ایک بڑی جاگیر دے رکھی ہے۔

حضرت خواجہؒ گلبرگہ کا اسم گرامی خواجہ خواجگان حضرت خواجہ سید صدر الدین ابو الفتح بندہ نواز گیسو درازؒ ہے کہتے ہیں آپ کو حضرتِ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ (دہلی) کے خلیفہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بیعت و خلافت حاصل ہے اور خوانِ نعمت حضرت شیخ سراج الدین جنید بغدادی پیر و مرشد علاء الدین حسن گنگو اول بہمنی گلبرگہ نے عنایت فرمایا اور آپ دکن کے سلطان الاولیا کہلائے جاتے ہیں۔

دوسرا میلا سادھو سری شرن بسپا کی جاترا ہے جو ہندوؤں کی ہولی کے پانچ روز بعد شاندار تیاریوں سے شروع ہو کر برابر پندرہ روز تک جاری رہتا ہے۔ اس کے انتظامات کے لئے سرکار آصفیہ نے ایک بڑی جاگیر دے رکھی ہے جو متولی دیول یا اپا کے جانشین کی ملکیت کہلاتی ہے۔

عرس اور جاترا میں زائرین اور جاتری بڑی دور دور سے چلے آتے ہیں دوکانیں لگتی ہیں، بیوپار خوب ہوتا ہے۔ درگاہ شریف اور دیول کے احاطوں میں ایک ہجوم رہتا ہے۔ طرح طرح کی آرائش ہوتی ہے، غرض فیضِ عام کا دریا ہر وقت جاری و ساری ہے۔

محمد فخر الدین ارمان

ٹیگور کے خیالات

باپ مسان گڑھ کی دہکتی ہوئی زمین سے واپس آتا ہے۔ سات سالہ بچہ، برہنہ تن، طلائی تعویذ گلے میں ڈالے تنہا کھڑکی سے لگی ہیں نظر دوڑا رہا ہے، وہ کیا سوچ رہا ہے؟ خود اسے خبر نہیں۔

صبح کا آفتاب نیم کے درخت کی پھننگ سے سامنے کے ایک مکان پر ابھی نمودار ہوا ہے۔

کیبریوں والا گلی میں ابھی ابھی پھیری لگا کر واپس ہوا ہے۔ باپ آتا ہے اور بچے کو اپنی گود میں لے لیتا ہے۔

بچہ۔ "بابا! اماں کہاں ہیں"؟

باپ سر کو اٹھاتے ہوئے کہتا ہے۔ "بیٹا بیکنٹھ میں"

اسی رات کو رنج کے صدمے سے بے دم ہو کر باپ پھر اسی طرح نیند میں کراہنا شروع کر دیتا ہے۔

کواڑ کے قریب ایک لالٹین ٹمٹما رہی ہے۔

دیوار سے چپکی ہوئی دو چھپکلیاں بھی سو رہی ہیں۔

بچہ قریب کی کھلی چھت پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن کسی کو اطلاع نہیں ہوتی کہ وہ کب آیا——؟

چراغ گل ہو چکے ہیں اور آس پاس کے مکانوں کے در و دیوار دیو ہیکل محل کے سنتریوں کی طرح کھڑے اونگھ رہے ہیں۔

برہنہ تن بچہ آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے اور حواس باختگی کے عالم میں وہ نہ جانے کس سے پوچھ رہا ہے "بیکنٹھ کو کون سا راستہ جاتا ہے"؟

آسمانوں کے منہ سے بھی کچھ نہیں نکلا۔ صرف بے زبان تاریکی کے چند آنسو تاروں کی چمک میں جگمگا اٹھتے ہیں۔!

مترجمہ ریاض احمد

—— ۱ ——

خدا ممتحن ہے اور دنیا ایک آزمائش گاہ ہے، اپنی نقلی یونیورسٹیوں کے ساتھ خدا کی سچی یونیورسٹیوں کا مقابلہ مت کرو خدا کی یونیورسٹی میں نہ تو امتحان ہوتا ہے اور نہ امتحان کی کوئی ضرورت ہے۔ اس یونیورسٹی میں صرف تعلیم ہی دی جاتی ہے، یہاں صرف نشو و نما ہی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کے دل میں احساس حسن کی زبردست خواہش ہے، اسی کے ذریعے ہماری نشو و نما ہوتی ہے۔ آفتیں آتی ہیں تو آنے دو لیکن ان کے سبب سے اگر ہم ترقی کا راستہ چھوڑ دیں گے تو ہمارا بھلا نہیں ہوگا

—— ۲ ——

یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ انسان کا علم اس بات سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا جانتا ہے بلکہ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے۔ انسان کا علم ہمارے لئے حیرت پیدا کرتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نے حق کی خاطر جلا وطنی کی سزا منظور کر لی ہے تب ہی بہادر آدمی کا معیار مسرت ہمارے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مسرت نے اتنی وسیع جگہ پر قبضہ کر لیا ہے کہ جلا وطنی کے رنج کی تکلیف قدرتاً ہی اس کا ایک جز بن گئی ہے۔ اس تکلیف ہی سے مسرت کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ جن کی مسرت صرف دولت ہی میں محدود ہے وہ مالی نقصان کے ڈر سے جھوٹ اور بے عزتی کو منظور کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی نوکری کے لئے بے انصافی کرنے میں بھی نہیں جھجکتے، وہ خواہ کتنے ہی امتحانات کیوں نہ پاس کر لیں خواہ کتنے ہی عالم کیوں نہ بن جائیں، ان کی حقیقت کا پتا اس سے چلتا ہے کہ وہ کن سطحی چیزوں سے شادماں ہوتے ہیں۔

مہاتما بدھ کی مسرت کا دائرہ کس قدر وسیع تھا کہ حکومت کے عیش کی مسرت بھی انھیں نہ روک سکی۔ (مترجمہ: پنڈت وشنی دھر دویا النکار)

تبصرے

ہمایوں کا مشاعرہ نمبر

ہمایوں اُردو کا ایک ایسا ماہ نامہ ہے جو اپنے معیار کو قائم رکھتے ہوئے نہ صرف تعلیم یافتہ اصحاب کے ذوقِ ادب کی پیاس بجھا رہا ہے بلکہ عوام میں اُردو کا صحیح شوق بھی پیدا کر رہا ہے۔ اس کا پیشِ نظر شمارہ تمام تر ان منتخب نظموں اور غزلوں سے مزین ہے جو لاہور کے حالیہ عظیم الشان مشاعرہ کے سلسلہ میں لکھی گئی تھیں۔ اور مشاعرہ میں شرکت کرنے والے شعراء کا عکس بھی ہے۔ اس محفل میں ہندوستان کے مشاہیر شاعروں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوئی تھی۔

احسان بن دانش، جوش، روش اور ساغر کی نظمیں بہت اچھی رہیں خصوصاً احسان بن دانش کی نظم "پردہ" کو ہم نے بار بار پڑھا اور اس سے بار بار لطف اندوز ہوتے رہے۔

غزلوں کا معیار بھی برا نہیں۔ ہر چند بعض غزلیں اس قابل نہیں تھیں کہ ان کو اس مجموعہ میں جگہ دی جاتی جس غزل پر طلائی تمغہ دیا گیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس کی مستحق نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ اس "طرح" پر دوسری غزلیں اس سے بھی گری ہوئی ہوں۔

"ظریف" کی غزل "مزاح" کا کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کرتی لیکن ان کی نظم "قصدِ حیات" کے کیا کہنے، ہر بند دعوتِ تبسم دیتا ہے۔ م

شاعر

ماہ نامہ شاعر آگرہ سے زیرِ ادارت اعجاز صدیقی کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس کی تازہ اشاعت جس پر ہم تبصرہ کر رہے ہیں، سائز کی تبدیلی کے ساتھ زیادہ صوری اور معنوی محاسن لئے ہوئے شائع ہوئی ہے۔ اس شمارہ میں کئی بلند پایہ نظمیں ہیں، جن میں حضرت سیماب اکبرآبادی کی نظم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اُردو زبان و ادب سے متعلق جو مضامین ہیں وہ قابلِ مطالعہ ہیں۔ آخر میں دو مشاعروں کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔

شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے شاعر کی خریداری ضروری ہے۔ م

ماہ نامہ شہاب

معاصر شہاب کا موجودہ نمبر ایک نئی خصوصیت کے ساتھ نکلا ہے۔ اس کا ایک حصہ "بزمِ خواتین" کے نام سے صرف انشا پرداز خواتین کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اور حیدرآباد میں کسی اچھے نسوانی رسالہ کی عدم موجودگی میں یہی بہت غنیمت ہے۔ بہتر ہوتا اگر اس کے ساتھ ہی کچھ صفحات بھی بڑھا دئے جاتے کیوں کہ اس مقصد کے لئے صرف سولہ صفحے کچھ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔

جدید حیدرآباد میں تعلیمِ نسواں کی ترقی نے طبقۂ خواتین میں ایک علمی لہر دوڑا دی ہے خصوصاً جامعۂ عثمانیہ کے باعث اس طبقہ میں بعض اچھے دماغوں کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع مل گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ج نقوی صاحبہ کی ادارت میں "بزمِ خواتین" ایک اچھے رسالہ کے اجراء کی ابتدا ثابت ہوگا۔ اور بسمل صاحب کی کوشش اس کو عملی جامہ پہنائے گی۔ م

طوفان

حکیم انصاری صاحب نے صحافتی دنیا میں جو علمی خدمتیں انجام دی ہیں ان سے اربابِ ملک ناواقف نہیں ہیں "الاعظم" کے بعد جو ایک زمانہ تک دیہاتی عوام میں اُردو کا پرچار کرتا رہا ہے۔ حکیم صاحب نے بمبئی سے ایک اخبار "طوفان" کے نام سے جاری کیا ہے۔ اس میں نہ صرف اچھے مضامین، افسانے اور نظمیں شائع ہوتی ہیں بلکہ دنیا بھر کی خبروں کے خلاصے دلچسپ انداز میں

پیش کئے جاتے ہیں جہاں تک ہم نے اس کی تحریرات پر غور کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "الاعظم" کی طرح "طوفان" کا مقصد بھی دیہاتی زندگی کی اصلاح، دیہات میں رہنے والوں کی نمائندگی اور دیہات میں اُردو کا پرچار ہے اور بلاشبہ اس قصد کو نہایت ہی مستحق اور قابل حوصلہ افزائی سمجھا جائیگا۔

اسلام اور حق خلع تالیف ملا عبدالباسط صاحب مددگار معتمد عالمکور دریافی تقطیع صفحات (۰۷) قیمت ساڑھے آٹھ آنے مولف کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اس مختصر رسالہ میں لائق مولف نے آیات قرآنی۔ احادیث اور فقہ سے مواد لیا ہے اور اس کی بنیاد پر عورتوں کے حق خلع کی پرزور حمایت کی ہے۔ وہ بیس سال سے اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ اس بیست سالہ دلچسپی نے ان کے دل میں حقوق نسوانی کی حمایت کا غیر معمولی جوش پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس جوش حمایت کے آثار اس کتابچہ میں جابجا نمایاں ہیں۔ ان کا موضوع مسئلہ خلع ہے۔ لیکن انھوں نے نہ صرف اسلامی شریعت میں عورت کی حیثیت پر بحث کی ہے بلکہ شرع اسلامی کے شارح سے بڑھ کر تحریک نسوانیت کی وکالت بڑے شد و مد سے فرمائی ہے۔ اسلامی قانون میں زن و شوہر کے حقوق ایک مکمل توازن کے ساتھ مقرر کئے گئے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس قانون کے وضع کرنے میں باپ، بھائی اور شوہر کے خیالات و جذبات کو مطلق دخل نہیں بلکہ ان حیثیتوں سے بالاتر رہ کر اس کی تکمیل و ترتیب عمل میں آئی ہے۔ ملا صاحب نے باپ اور بھائی کی حیثیت سے اس کی تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے اور اہل علم کو دعوت دی ہے کہ وہ شوہرانہ حیثیت کو چھوڑ کر پدرانہ و برادرانہ حیثیت سے اس پر نگاہ ڈالیں

سوال یہ ہے کہ جب قانون کا تعلق زن اور شوہر دونوں کے ساتھ برابر کا ہے تو شوہرانہ حیثیت سے قطع نظر کرنا اور صرف بیوی کے باپ اور بھائی کی حیثیت ہی سے قانون پر نگاہ ڈالنا کہاں تک جائز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس جانب دارانہ تعبیر سے اسلامی قانون کا اصلی اور صحیح توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔

قانون کی تعبیر میں اگر حیثیتوں کا لحاظ کیا جائے تو گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو تعبیر بیوی اور اس کے باپ بھائی کی حیثیت سے کی جائے گی وہ اس تعبیر سے مختلف ہوگی جو شوہر اور اس کے باپ بھائی کی حیثیت سے کی جائے گی۔ اس قسم کی تعبیروں سے وہ ازدواجی مسائل اسلامی اصول قانون کے مسئلہ کے مطابق حل نہ ہو سکیں گے جن سے اس وقت مسلمان دوچار ہیں فقط

شیخ چاند (مرحوم) ام اے۔ ال ال بی ریسرچ اسکالر

حکیم دکن (اشاعت خاص) چندہ سالانہ ڈھائی روپیہ قیمت اشاعت خاص (۸) ملنے کا پتہ یونانی طبی بورڈ حیدرآباد دکن۔ "حکیم دکن" حیدرآباد دکن کے چند لائق حکیموں کی ادارت میں شایع ہو کر حکیموں اور طب کی مخلصانہ خدمت کر رہا ہے۔ اس میں طب یونانی سے متعلق مفید مضامین شایع ہوتے ہیں، جن کا مطالعہ استقرار صحت کے لئے بہت کارآمد ہوتا ہے۔ اس ماہنامہ کی دوسری جلد کا پہلا نمبر "قوت مردانہ" کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور اس سے متعلق بڑی اچھی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس اشاعت خاص کی ایک قابل لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مضامین عام فہم اور سلیس ہیں اور ہم بھی جو طب سے دور کا تعلق نہیں رکھتے، اس کے مضامین سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ البتہ معیار کے متعلق کوئی طبیب ہی بہتر رائے دے سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہماری نوجوان نسل کمزور سے کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ بیان کرنے کے لئے ہم "چند خیالات" کی پردہ داری کرنا نہیں چاہتے۔ ممکن ہے جوانی کا جوش غلط کاری کا باعث ہوتا ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جسمانی تربیت سے لاپروائی اور دماغی کاموں میں غیر معمولی انہماک نے

ہم سے وہ تنومندی چھین لی ہے۔ جو جسم اور دماغ میں قوت اور توازن کا باعث ہوا کرتی ہے۔

ہم اپنی نوجوان نسل سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ "حکیم دکن" کے اس خاص شمارہ کو ضرور دیکھے، اس لئے کہ اس "حدیث دیگراں میں سر دلبراں" کے بہت سے نقوش پوشیدہ ہیں۔ اور اُن سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ م۔

ختم نبوت اور قادیانیت

از علامہ اقبال۔ ترجمہ میر حسن الدین بی اے ال ال بی۔ ناشر تصدق حسین تاج قیمت ۱ر ملنے کا پتہ احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد دکن یا تاج کمپنی لمیٹڈ۔

"ماڈرن ریویو" کلکتہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے تین مضامین شایع ہوئے تھے، جن کی اشاعت کے بعد اکثر مذہبی اور سیاسی مسلک رکھنے والے مسلمانوں نے علامہ اقبال سے خواہش کی کہ وہ احمدیوں کے بارے میں مسلمانان ہند کے طرز عمل کی مزید توضیح کریں اور بعضوں نے استفسار کیا کہ وہ احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتے ہیں؟ - اس عالمانہ مقالہ میں ڈاکٹر اقبال نے ان مطالبات کو پورا کیا ہے جن کو وہ جائز بھی سمجھتے ہیں اور ان سوالات کے جوابات دئے ہیں جو پنڈت نہرو نے اٹھائے تھے۔ علامہ اقبال نے بڑے سلجھے ہوئے اسلوب میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے واضح کیا ہے کہ "ختم نبوت" دراصل اسلامی تعلیمات اور ترقی کا آخری زینہ ہے۔ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر اس کو قرون وسطی کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لیجا سکتا۔ اپنے مقالہ کے دوسرے حصہ میں علامہ نے پنڈت نہرو کے ان غلط تصورات کو دور کیا ہے جو اسلام سے متعلق قائم کئے گئے تھے۔ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے، ال ال بی نے اس مقالہ کا بہت شگفتہ ترجمہ کیا ہے اور اس طرح اس کو اردو دانوں کے لئے کارآمد بنا دیا

تصدق حسین صاحب تاج قابل شکریہ ہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی اہم اور دلچسپ اردو کتابیں شایع کرکے مطالعہ کا ذوق پیدا کررہے ہیں۔ انہوں نے میر حسن الدین صاحب کے اس ترجمہ کو کتابی صورت میں شائع کرکے اردو کی خدمت کی ہے۔ علامہ اقبال کا مقالہ جس قدر بلند پایہ ہے، میر حسن الدین صاحب کا ترجمہ بھی اسی قدر دلکش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو اسلامی تصور کا سیاسی اور مذہبی نقطہ نظر سے صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ (م)

تین افسانے

تصدق حسین صاحب تاج نے سر شیخ عبدالقادر کے ان تین افسانوں کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے جو انھوں نے اروپائی زبانوں سے ترجمہ کئے ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر نے ان افسانوں کا ترجمہ کرکے اردو کے افسانوی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ افسانے بجائے خود دلچسپ ہیں اور ان کا ترجمہ بھی بُرا نہیں۔ سر شیخ عبدالقادر نے اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے، اور وہ عمر سے اس نصب العینی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ اردو زبان و ادب پر ان کے عالمانہ مقالے علمی دنیا میں ایک خاص وزن رکھتے ہیں۔ ان کے یہ افسانے بھی اس لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ پہلا افسانہ "تاجدار بیوی کا تاجدار شوہر" ہے۔ دوسرا "وطن آخر وطن ہے" اور تیسرا "دولت کی توسیع"۔ ان تینوں افسانوں میں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک خاص ذہنی تخیل پیش کیا گیا ہے جن سے افسانہ نگاروں کی وسعت نظر اور بلندیٔ تخیل کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے ان افسانوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ (م)

پرانی اور نئی تعلیم

از محمد شمس الدین صدیقی صاحب منصف وظیفہ یاب۔

مولوی شمس الدین صاحب صدیقی حیدرآباد کے قدیم انشاپردازوں میں سے ہیں۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قدیم ذوق تحریر کو جاری رکھا ہے اور اپنی وسیع معلومات اور پختہ خیالات سے دوسروں کو بھی ایک عرصۂ دراز سے مستفید کررہے ہیں ادھر کچھ عرصہ سے ملک۔ کی نوجوان نسلوں کو فیض یاب کرنے میں منہمک ہیں۔ ان کے خلوص کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کی تحریریں

تلخی بھی پیدا ہوگئی ہے وہ نئی نسلوں کو سخت اور بے لاگ باتیں سنانا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں بعض جگہ واعظانہ انداز بھی پیدا ہوجاتا ہے جس سے نوجوان بہت گھبراتے ہیں۔

زیر نظر کتاب مصنف کے ۱۲ مضمونوں پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر مختلف مقامی اخباروں میں شائع ہوکر پسند کئے جاچکے ہیں۔ ہماری رائے میں مولوی شمس الدین صاحب کی یہ خدمات اس لئے بہت زیادہ قابل قدر ہیں کہ ان میں بعض ایسے دلچسپ تاریخی واقعات بھی جگہ جگہ قلمبند کر دیئے گئے ہیں جن سے آئندہ حیدرآباد کی معاشرت اور دکن کے تمدن کی تاریخ لکھنے والے کو مفید مواد دستیاب ہوگا۔(ق)

کلام اعجاز یہ مولوی محمد یعقوب خان صاحب اعجاز وکیل ہائیکورٹ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اعجاز صاحب گلدستہ نعت او رعمدۃ النصائح وغیرہ کے مصنف اور بیدر کے رہنے والے ہیں ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور پختہ مشق شاعر ہیں لیکن بہتر ہوتا کہ وہ صرف غزلوں کا مجموعہ شائع کرنے کی بجگہ اپنے کلام سے جملہ اصناف سخن کے منتخب نمونے پیش کرتے۔ (ق)

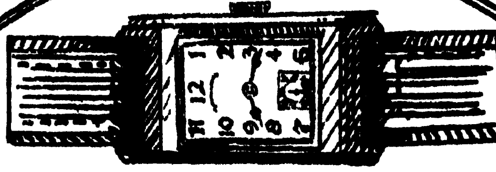
فہرس کتب خانہ سٹی کالج کی اردو فارسی اور عربی کتابوں کی مکمل فہرست مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب۔

مولوی غلام رسول صاحب کو اردو و ہندی ادبیات کا خاص ذوق ہے چنانچہ انھوں نے ہندی رسالوں سے جو فسانے ترجمہ کر کے شائع کئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولوی سید محمد اعظم صاحب کی مردم شناس نظر نے اس خداداد قابلیت کو ایک بڑے اچھے مصرف کے لئے منتخب کرلیا۔

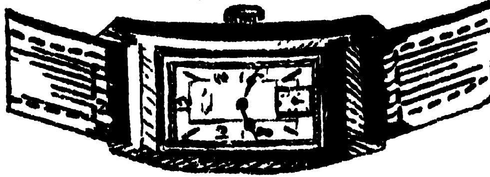
حیدرآباد کے کسی مدرسہ فوقانیہ کے کتب خانہ میں نہ اتنی بلند پایہ اور معیاری کتابیں جمع ہیں اور نہ ان کو اس خوش سلیقگی اور قاعدہ کے ساتھ مرتب کر کے ان کی فہرست شائع کی گئی ہے زیر نظر فہرس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سٹی کالج کے طلبہ کی سہولتوں کی خاطر اس کے صدر اور اساتذہ کس توجہ، انہماک اور سلیقہ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس کی ترتیب کے متعلق مرتب نے لکھا ہے کہ "علم کتاب داری پر یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں مستقل لٹریچر موجود ہے۔ اس کے علاوہ رسالے اور مطبوعات بھی آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کتابوں کی تقسیم کے بہت سے طریقے رائج ہیں جن میں ڈیوی ڈسمل کلاسیفکشن کیٹر کلاسیفکشن اور کانگرس کلاسیفکشن زیادہ مشہور ہیں جامعہ مدراس کے مہتمم کتب خانہ ایس۔ آر۔ رنگناتن۔ ام۔ اے ایل ٹی ایف۔ ال۔ اے کچھ عرصہ کے لئے سرکاری طور پر کتب خانوں کے معائنہ اور ان کی تنظیم کے معائنہ کے لئے یورپ بھیجے گئے تھے انھوں نے خاصکر برطانیہ عظمی کے مشہور کتب خانہ برٹش میوزیم کے علم کتاب اور تنظیم کتب خانہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور مروجہ طریقوں کا موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد کتابوں کی تقسیم کا ایک جدید طریقہ تجویز کیا جو کولن کلاسیفکشن یا کولن تقسیم کہلاتا ہے۔" اس تقسیم کی خصوصیات اور قواعد بیان کرنے کے بعد لائق مرتب نے اردو زبان میں جدید اصولی طریقہ پر فہرست کتب شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور اپنے درس گاہ کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے اس کام کی طرف خاص توجہ مبذول کی یہ فہرست واقعی اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے اور ہم ارباب سٹی کالج کو اس کی تدوین و تکمیل پر مبارکباد دیتے ہیں اور دوسرے مدارس کو بھی متوجہ کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح کی فہرستیں شائع کر کے اپنے طلبہ میں اردو کے مطالعہ کا ذوق پیدا کریں۔

(ق)

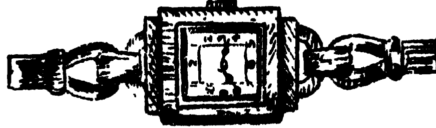
RECORD FOR QUALITY & REILIABILITY



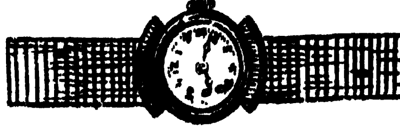
RECTANGULAR



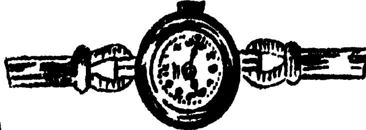
CURVED



MINIATURE



MINIATURE



MINIATURE

ہائی گریڈ لیور مومنٹ

پندرہ اعلیٰ قسم کے لعل سے مرصع

تین سال کی گیارنٹی

جلال اینڈ سنس

عابد روڈ حیدرآباد دکن

ماہرین فن

ہیڈ آفس مدراس

(وابستہ کمپنی)

سب رس کے قلمی معاونین اور خریدار اصحاب سے

۱ ۔ بلدہ کے بعض خریدار اصحاب کے پتے غلط معلوم ہوتے ہیں یا واضح نہیں ہیں جس کی وجہ سے تقسیم کنندوں کو دقت ہو رہی ہے ۔ اور یا تو بعض پرچے نہیں پہنچ رہے ہیں یا دیر میں پہنچ رہے ہیں ۔ جن اصحاب کو ایک ہفتہ کے اندر پرچے نہ مل رہے ہوں وہ اپنے ٹھیک پتے اور نمبر مکان وغیرہ سے مطلع فرمائیں ۔

۲ ۔ بعض اصحاب نے دفاتر یا مدارس کے پتے دئے ہیں ۔ اگر انگریزی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں چھٹیاں ہوں تو سب رس اُن کو وقت پر نہیں پہنچ سکتا ایسے اصحاب اگر مکان کے پتے روانہ کر سکیں تو دفتر کو سہولت ہوگی ۔

۳ ۔ بلدہ کے بعض اصحاب بار بار پتہ تبدیل کرنے کی اطلاع دیتے ہیں یا اضلاع کے اصحاب عارضی طور پر بلدہ آکر اپنے پرچے طلب کرتے ہیں ایسی صورتوں میں اکثر پرچے وقت پر نہیں پہنچ سکتے ۔ اگر دو مہینے سے زیادہ قیام کرنا نہ ہو تو قدیم پتہ ہی سے منگوالیں ۔ اور پتہ نمانہ کو اپنے پتہ کی تبدیلی سے مطلع کر دیں تو رسالہ وقت پر مل جائے گا ۔

۴ ۔ خریدار اور مضمون نگار اصحاب کے اتنے استفساری خطوط آتے ہیں کہ ادارہ ان کا فوری جواب بعض دفعہ نہیں دے سکتا ۔ یہ امر واضح رہے کہ جن خطوط میں جواب کے لئے اسٹامپس روانہ نہیں کئے جاتے ان کے جواب کی توقع نہ رکھنی چاہئیے ۔ مراسلت میں نمبر خریداری کا حوالہ بھی ضروری ہے ۔

۵ ۔ بعض اصحاب اپنے مضمون یا نظمیں روانہ کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ ہر مضمون یا نظم کے نیچے نام اور پتہ کا اندراج ضروری ہے کیونکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ صرف خط کے نیچے دستخط کر دئے جاتے ہیں جو بعض اوقات واضح نہیں ہوتے اور خط کے ساتھ دوسرے کاغذات پر جو مضامین یا نظمیں ہوتی ہیں ان کے ختم پر نام لکھنا بھول جاتے ہیں ۔ بچوں کے بعض مضامین اور خط بغیر نام کے بھی وصول ہوتے ہیں ۔

سب رس کی جلد

سب رس کے سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے ایک جدید قسم کا "فائیل کور" بطور جلد کے تیار کیا گیا ہے جس کے پشتہ پر سنہری حروف میں "سب رس" منقش ہے ۔ اور جس میں نہایت سہولت کے ساتھ ہر ماہ پرچہ لگایا یا نکالا جا سکتا ہے ۔ یہ ایک بالکل جدید چیز ہے اور یورپی طرز پر بنوائی گئی ہے ۔ اس میں رکھنے سے پرچے خراب نہیں ہوتے اور نہ سب رس کے رنگین سرورقوں کو نقصان پہنچتا ہے ۔ جو اصحاب سال بھر کے سب رس کے بارہ پرچوں کو ایک جگہ کر کے جلد بنوانا چاہتے ہوں وہ ابھی سے یہ فائیل کور خرید لیں تو ان کے رسالے محفوظ رہیں گے اور اس نفیس و خوشنما فل کیلیکو کی جلد سے ان کی میزوں اور الماریوں کی آرائش و زیبائش میں بھی اضافہ ہوگا ۔ اس کی قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے صرف (عمہ) ہے ۔ سب رس کے ایجنٹوں سے یا راست دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔

خواجہ حمید الدین شاہد ۔ مہتمم سب رس

نذرِ ولی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا نیا کارنامہ

ادارۂ ادبیاتِ اُردو اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتہ نوجوانوں کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے لئے قائم کیا گیا تھا اور خدا کے فضل سے اس اثنا میں اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کے اغراض و مقاصد میں توسیع عمل میں آئی۔ اور وہ اب حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی ادارہ بن گیا ہے جو اپنے مطبوعات کے ذریعہ سے اُردو زبان اور ادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں اُردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کرنا اور اہلِ ملک کو اُردو ادب کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں اس نے غیر معمولی کام کیا۔

اس وقت تک اس ادارہ نے جامعہ عثمانیہ کے پچاسوں طلبہ کے مضامین کے مجموعے اور دیگر کتب شائع کی ہیں۔ اب اس نے اسی جامعہ کی ایم۔اے۔ کی طالبات کے مضامین کا یہ نفیس مجموعہ پیش کیا ہے جو اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔

اس میں دکن کی مایہ ناز خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔اے۔ محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی۔اے۔ محترمہ نعیم النسا بیگم صاحبہ بی۔اے۔ اور محترمہ نجم النسا بیگم صاحبہ بی۔اے۔ کے دلچسپ مضامین شامل ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ مجموعہ کے متعلق ڈاکٹر زور کی یہ رائے ہے کہ

> ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدمِ اُردو تھے۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، اُن کے تخیل، ان کے فنِ شعر، اور ذوقِ عرفان کے علاوہ اُن کے اسلوبِ زبان، اور انتخابِ الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اُردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب ان کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت اور جلد بندی ایسی ہی نفیس ہے جیسی کہ صنفِ نازک کی ایک نفیس ترین کتاب کے لئے ہونی چاہیئے۔ نذرِ ولی، اقبال اور جوش کے کلام کے مجموعوں کی سائز پر نہایت دیدہ زیب جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس پر دو جگہ خوبصورت خطِ کوفی میں نام کے سنہری ٹھپے ہیں۔ تعدادِ صفحات ۲۵۰۔ قیمت مجلد ؏ ۸/

دفتر سب رس یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

خواجہ حمید الدین مہتمم ادارہ

محض خریداران سب رس کے لئے

صرف تین ماہ تک اُردو کی مشہور و معروف کتابیں رعایتی قیمتوں پر

صرف سب رس کے خریداروں کو حسب ذیل بیش مشہور و معروف اردو کتابیں ۳۰ جون ۱۹۳۸ء تک ادارہ کی طرف سے رعایتی قیمت سے پیش کی جائیں گی۔

قیمتوں میں قابل لحاظ تخفیف کرانے کا واحد مقصد یہی ہے کہ ادارہ سب رس چاہتا ہے کہ

(۱) سب رس پڑھنے والوں کے لئے وسعت مطالعہ کا زرین موقع حاصل ہو۔

(۲) بہترین اُردو کتابوں تک شائقین کی سہولت سے رسائی ہو سکے۔

(۳) کم صرفہ سے وہ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا دلچسپ کتب خانہ جمع کر سکیں۔

رعایتی قیمتوں اور بازار کی رائج قیمتوں کا مقابلہ کر لینے سے سب رس کی اس مفید تجویز اور ایثار کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

ہر فرمایش کے ساتھ سب رس کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

اگر دس روپیہ سے زیادہ کی کتابیں منگوائی جائیں تو محصول ڈاک دفتر سب رس ہی ادا کرے گا۔

نوٹ۔ اگر اس رعایت سے فائدہ اٹھایا گیا تو ادارہ کوشش کرے گا کہ اُردو کی دیگر مفید اور اہم کتابیں بھی اسی طرح رعایتی قیمتوں پر اپنے خریداروں کے لئے فراہم کر سکے۔

			بازار کی قیمت	رعایتی قیمت
۱۔ اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	وہ معرکۃ الآرا کتاب جو یورپ میں دو سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی۔ سب رس کی مانند کے بارہ منتخبات بارہ تصاویر مجلد	لہر	للعہ
۲۔ اردو ادب بیسویں صدی میں	مولوی علی حسنین صاحب زیبا ام اے ریسرچ اسکالر	عہد حاضر کے اردو ادب کا پر لطف تبصرہ جس پر مصنف کو ام اے کی ڈگری حاصل ہوئی	۱۲ر	۸ر
۳۔ جدید اردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	حالی سے لیکر موجودہ عہد تک اردو شاعری کے مختلف دبستانوں کی مستند اور مقبول تصویر تاریخ	عہار	عال
۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات	مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل	یورپ کے کتب خانوں کی دکنی قلمی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ۔ سات سو سے زیادہ صفحات	للعہ	سے
۵۔ اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	اردو نثر نگاری کی تاریخ۔ انشا پردازوں کی نثر کے اسلوب و خصوصیات پر تبصرہ۔ مستقبل کے متعلق مشورے	عہر	۱۲ر
۶۔ یادگار ولی	مولوی سید محمد صاحب ام اے	اردو شاعری کے ابو الآبا حضرت ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار کا باتصویر دلچسپ مرقع	عال	عہ۸ر
۷۔ ارمغان عزیز	نواب عزیز یار جنگ بہادر	حیدرآباد دکن کے مشہور استاد اور باکمال شاعر کے بلند پایہ کلام کا مجلد باتصویر اور دیدہ زیب مجموعہ	عال	عہ۸ر
۸۔ مرقع سخن جلد دوم	مرتبہ ڈاکٹر زور	حیدرآباد کے پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو صفحات اور پچاس تصاویر مجلد	عمہ	عہ
۹۔ سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت مستند انتخاب جس کے ساتھ حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی ہے	۱۲ر	۸ر
۱۰۔ خواتین عہد عثمانی	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	خواتین دکن کی پچھلی دس سالہ ترقی کا مرقع۔ بقول مدیر معارف اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتا	عہ۸ر	عمہ
۱۱۔ مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صاحب صدیقی	دکن کے مشہور مردم خیز خطہ قندھار شریف کے اولیا علما و مشائخین اور شعرا و مصنفین کا مکمل تذکرہ	عمہ	۸ر

کتاب	مصنف	کیفیت	بازار کی قیمت	رعایتی قیمت
۱۲۔ عہدِ ابراہیم عادل شاہ کی لسانیات	مولوی علی محسن صاحب ایم اے	بیجاپور کی تاریخ کے ایک اہم دور کے متعلق نہایت دلچسپ اور مفید تحقیقی مقالہ جس پر مصنف کو ایم اے کی ڈگری ملی	عہ	عہ
۱۳۔ فنِ انشاپردازی	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	مضمون نگاری اور انشاپردازی کے راز اور فنِ تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے اور ترقی کے وسائل	عہر	۱۲ر
۱۴۔ بادۂ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	دکن کے مشہور شاعر ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی اور انتخاب کلام معہ تصویر شاعر	۱۲ر	۸ر
۱۵۔ مثنویات میرؔ	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اردو شاعروں کے سرتاج میر تقی میرؔ کی مثنویاں جو کئی قلمی نسخوں کے مقابلے کے بعد حاشیہ و مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئیں	عار	عہر
۱۶۔ تنقیدی مقالات	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	اردو اور فارسی کے بہترین مصنفوں اور شاعروں کے کارناموں پر اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں (۱۹ مقالات) مجلد	عہر	عار
۱۷۔ کیفِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	دکن کے مشہور شاعر سید رضی الدین حسن کیفیؔ مرحوم کے حالاتِ زندگی اور انتخاب کلام معہ تصویر شاعر	۱۲ر	۸ر
۱۸۔ حضرت امجدؔ کی شاعری	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	عہدِ حاضر کے سب سے بڑے اہل دل شاعر حضرت امجدؔ کے کلام پر تبصرہ اور نمونہ	۱۲ر	۸ر
۱۹۔ متاعِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ کے چار دیوانوں کا دلچسپ انتخاب معہ حالات و تصویر شاعر	۱۲ر	۸ر
۲۰۔ فیضِ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	استاد الاساتذہ حضرت میر شمس الدین محمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام معہ تصویر	۱۲ر	۸ر

جملہ ۱۲ر ۳۸ — ۴ر ۲۷

نوٹ بازار کی قیمتوں اور سب رس کی رعایتی قیمتوں کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ سب رس کے خریداروں کے لئے کتنی زیادہ سہولت بہم پہونچائی جارہی ہے یعنی بیس کتابوں کی خریدی پر سب رس کے خریدار کا بیک وقت گیارہ روپئے آٹھ آنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ اہل ذوق اصحاب اس زرین موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے کیونکہ دفتر سب رس نے محض علم و ادب کی خدمت کی خاطر ان کتابوں کے مصنفین و مولفین سے قیمت کی یہ رعایت صرف تین ماہ کے لئے حاصل کی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

گولکنڈہ کے افسانے

دکن کی عظیم الشان قطب شاہی سلطنت کی شہرۂ آفاق ثروت، تہذیب، معاشرت، اور اصلی زندگی معلوم کرنا ہو تو ڈاکٹر زورؔ کے یہ عجیب و غریب افسانے ضرور پڑھئے۔ ان میں بقول مولانا عبدالحق بی اے معتمد انجمن سکرٹری اردو "تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

تاریخی معلومات کے علاوہ جو اصحاب جدید اردو نثر اور افسانوں کے پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے بھی "سیرِ گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا، اور جنہوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

دونوں کتابیں باتصویر ہیں۔ — سیرِ گولکنڈہ صفحات ۱۹۰ تصاویر ۱۲ اور قیمت صرف ۱۵ر

گولکنڈے کے ہیرے مجلد " ۱۳۶ " ۸ " " ۱۲ر

ہر کتب فروش اور خلیس کر دفتر سب رس یا مکتبہ ابراہیمیہ سے طلب کیجئے۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی مطبوعات

۱۔ **مُرقع سخن** (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات، پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (عمہ) اس بیش قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ **مُرقع سخن** (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (عمہ) اس میں سلاطین خانوادۂ آصفی و امرائے کبار کا ذکر بھی درج ہیں جن کی شاعری علم دوستی قابل ذکر ہے۔

۳۔ **سراج سخن** حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ال ال بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲/) مع تصویر مزار سراج

۴۔ **ایمان سخن** استاد الشعراء شیر محمد خان ایمان حیدرآبادی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد صاحب لکچرار اردو صفحے (۱۲۰) قیمت (۱۲/) ایمان عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ **فیض سخن** استاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۴۴) قیمت (۱۲/) مع تصویر درگاہ فیض

۶۔ **بادۂ سخن** ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے پی ایچ ڈی۔ صفحے (۱۲۸) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۷۔ **کیف سخن** سید رضی الدین حسن کیفی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصناف سخن کا انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ صفحے ۱۲۲ قیمت (۱۲/)

۸۔ **متاع سخن** نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۲۵) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۹۔ **ورڈزورتھ اور اس کی شاعری** انگلستان کے مشہور شاعر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام جس نے اُردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ صفحے (۱۸۴) قیمت (عہ) مع تصویر شاعر۔

۱۰۔ **ٹیگور اور اس کی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر اعظم کے حالات زندگی و تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے صفحات (۱۲۸) قیمت (۱۲/)

۱۱۔ **ہوش کے ناخن** حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ایم اے۔ صفحات (۹۲) قیمت (۱۲/)

۱۲۔ **یوسف ہندی قید فرنگ میں** مرزا غالب مرحوم کے واقعہ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی صفحہ قیمت (۸/)

۱۳۔ **نذر ولی**۔ بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طالبات جامعہ عثمانیہ کی نذر عقیدت صفحات (۵۰) قیمت مجلد (عالی ۸/)

المشتہر خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اُردو

ادارۂ ادبیات اردو کی زیر طبع کتابیں

۱ ۔ گنج سخن ۔ انتخاب کلام حضرت میر احمد علی صدر مرحوم .... از مولوی سید محمد صاحب ام ۔ اے ۔

۲ ۔ انتخاب کلام حکیم مظفر الدین صاحب فراج مرحوم .... از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

۳ ۔ گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش کی نظموں کا مجموعہ

۴ ۔ اردو مرثیہ نگاری .... از مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے ۔

۵ ۔ شمس الامراء کی اردو خدمات .... از نواب محمد ظہیر الدین خان صاحب بی ۔ اے ۔

۶ ۔ تاریخ ادبیات انگریزی .... از مولوی میر حسن صاحب ام ۔ اے ۔

۷ ۔ تاریخ ادبیات عربی .... از مولوی سید ابو الفیض صاحب ام ۔ اے ۔

۸ ۔ تاریخ ادبیات اردو .... از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام ۔ اے ۔ پی ایچ ڈی

۹ ۔ تاریخ ادبیات ہندی .... از پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ام اے ۔ ال ال بی

۱۰ ۔ تاریخ گولکنڈہ .... از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام ۔ اے ۔ ال ال بی ۔

۱۱ ۔ نقد سخن ۔ کلام فانی کی سخنورانہ تنقید .... از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ۔

۱۲ ۔ بہمنی تمدن .... از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ۔ ال ال بی

ضمیر
ایک دلچسپ ڈرامہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی طالب علم کے واردات سفر یورپ ، نہایت دلچسپ اور اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں ۔ اس کتاب کے مصنف مولوی محمد عبد الرحمن خان صاحب اے ۔ آر ۔ سی ۔ اس ۔ بی ۔ اس ۔ سی ۔ سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ ہیں جنہوں نے طالب علم اور استاد دونوں حیثیتوں سے یورپ میں قیام کیا ۔ مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور مغرب کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ اس کے علاوہ ایشیا اور یورپ کے طالب علموں کے حالات محاسن و نقائص اور ضروریات و رجحانات پر کافی عبور رکھتے ہیں ۔ اس کتاب کی دلچسپی اور مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف مصنف کا نام کافی ہے ۔

ڈیمی تقطیع ۲۰۶ صفحات ۔ طباعت کتابت پاکیزہ قیمت صرف ۱۲ ؍ دفتر سب رس یا مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے ۔

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد، اضلاع، اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاصکر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوتی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

رباعیات امجد حصہ اوّل	عہر
رباعیات امجد حصہ دوم	عہر
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجد سی پیوند	مہ
نذر امجد	۶ر
حج امجد	عا ۱۲ر
میاں بیوی کی کہانی	۱۲ر
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	سے
گلستان امجد	سے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

ارباب نثر اردو	عا
گلشن گفتار	۱۲ر
مثنویات میر	عا
ابتدائی فارسی	۱۲ر
یادگار ولی	عا

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ارمغان عزیز	عا
متاع سخن	۱۲ عہر

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

اردو کے اسالیب بیان	۱۲ عہر
اردو شہ پارے	۱۲ ہے
روح تنقید	۱۲ عہر
تنقیدی مقالات	۱۲ ہے
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	۸ عہر
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عا
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	۱۲ عا
فن انشا پردازی	۱۲ عہر
طلسم تقدیر	۸ر
سیر گولکنڈہ	۱۵ر
گولکنڈہ کے ہیرے	۱۲ر

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

دنیائے افسانہ	۸ عہر
کردار اور افسانہ	۱۲ عہر
جدید اردو شاعری	۸ عا
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶ر
انگریزی افسانے	۱۲ عہر

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

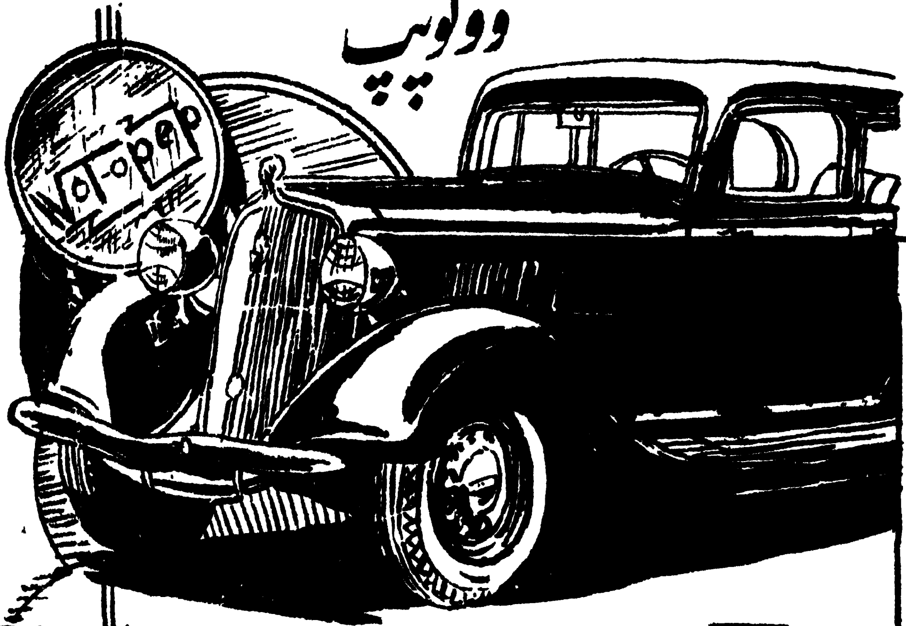
خیالات آزاد جلد اول	
خیالات آزاد جلد دوم	

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	۸ ہے
خواتین عہد عثمانی	۸ عہر
حضرت امجد کی شاعری	۱۲ر
مکتوبات امجد	۱۲ر
رہبر سفر یورپ	۱۲ر
ذکر نبی	۱۲ر

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

مہتمم



پیٹرول کم کیونکر خرچ کیا جائے
وولوپپ کے استعمال سے

جو وولوپپ کمپنی آف گریٹ برٹن کی حیرت انگیز کیمیائی ایجاد ہے پیٹرول کے خرچ میں تیس فیصدی کی کمی پیٹرول میں فی گیلن وولوپپ کی ایک ٹکیہ ملا دیجئے اور تعجب خیز نتائج کا انتظار کیجئے موٹر پانچسو میل وولوپپ پر چلنے کے بعد سلنڈر اور پسٹن کی کاربن مفقود ہو جاتی ہے انجن کھولکر صاف کرنیکی ضرورت نہیں ہوتی وولوپپ کا استعمال سلنڈر اور پسٹن پر گریفائٹ کی جھلی جما دیتا ہے جس سے گھساوٹ رک جاتی اور طاقت بڑھ جاتی ہے

دی وولوپپ کمپنی آف انڈیا۔ صدر دفتر برائے ہندوستان برما سیلون مہ بلڈنگ فورٹ بمبئی
تار کا پتہ ہیپچ بمبئی
حیدرآباد دکن کا پتہ۔ تاڑبن حیدرآباد دکن

وولوپپ کی
دھوم
دنیا کے
ہر حصہ میں



MUNNA LAL ONKARMULL
BANKERS
STATION ROAD
HD DESCAN
فکسڈ ڈپازٹ
شرح سود بالمشافہ یا بذریعہ مراسلت
منصب و وظائف
خزانہ عامرہ سرکار عالی سے حاصل کرکے ایصال کرنے کے علاوہ بینکنگ کے جملہ کام انجام دیئے جاتے ہیں
کرنٹ اکونٹ
(۳) فیصد سالانہ روزانہ بقایا پر رقم بذریعہ چک حاصل کی جاسکتی ہے
سیونگ بنک
(۴) فیصدی سالانہ روزانہ بقایا پر رقم بذریعہ چک حاصل کیجاسکتی ہے



اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس



"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیرِ ادارت
صاحبزادہ میر محمد علیخان میکش

بہ اہتمام خواجہ حمید الدین

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ "رفعت منزل" خیریت آباد سے شائع ہوا

رب ارنی انظر الیک

تو اور امجد کے روبرو کیونکر ہو تیری مری بات دوبدو کیونکر ہو
آنکھوں کی یہ خواہش ہے کہ تجھ کو دیکھیں آنکھیں جسے دیکھ لیں وہ تو کیونکر ہو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ سلسلہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وچر یا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپے	دو روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
حیدرآباد سے باہر۔	چار روپے آٹھ آنہ	تین روپیہ	سات آنہ

—

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایکدفعہ
ایک صفحہ	۵۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۱۵ روپیہ	۶ روپیہ
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

سب رس

جلد ۱ شمارہ ۱

جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

پیش لفظ

سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اردو" کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کر کے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہلِ ذوق ہی مستفید ہو سکتے تھے اس لئے ادارہ ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔

ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو سب رس بن سکیں، اور ایسے ماہنامے اور روزنامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا نچوڑ ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوشگوار طریقہ پر گذارنا چاہتا ہو۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اُردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ہماری آواز دور دور تک پہنچ سکے گی۔ یہی طریقہ ہماری بہت سی خامیوں کو دور کرنے کا باعث بھی بنے گا اور ہم میں ایسی خوبیاں پیدا کرے گا جن کا نہ ہونا ہماری ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔

ہم میں اتحاد و یگانگت کی لہر نہیں دوڑ سکتی اور نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت یا ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے ملک کے زیادہ سے زیادہ بسنے والوں یا اپنی زبان کے زیادہ سے زیادہ سمجھنے والوں سے مخاطب نہ ہوں، اور ان کی ضرورتوں اور رجحانوں کا اپنی تحریروں میں خیال نہ رکھیں۔ ہماری زبان کی بہت سی خرابیاں اور اسلوب کے بہت سے گنجلک بھی اس طرح دور ہو جائیں گے جن کے لئے موجودہ زمانہ میں اکثر خیر خواہانِ اردو توجہ دلا رہے ہیں۔ ہندوستان کے ایک مشہور قومی رہبر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ :- " ہماری زبان کو مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم ہونا چاہئے ...... اس کی بنیاد اُسی وقت مضبوط ہوگی جب لکھنے والے عوام کے لئے لکھیں گے ... ہر ادیب کو اپنے سے سوال کرنا چاہئے کہ میں کس کے لئے لکھ رہا ہوں۔"

سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لئے ہو۔ وہ سب کے لئے اُسی وقت بن سکے گا جب اُس کی زبان سلیس اور

سادہ ہوگی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعوں پر دلچسپ مضمون، نظمیں، اور افسانے چھپتے رہیں۔ ادارہ اسی وقت خود کو کامیاب سمجھے گا جب سب رس بچوں اور بوڑھوں، اور عورتوں اور مردوں سب کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکے۔ اسی لئے بچوں اور طلبہ کا حصہ بھی رکھا گیا ہے جس میں نظمیں، کہانیاں اور دلچسپ مضمون ہوں گے جو یا تو بچوں اور ادیبوں اور مدرسوں کے طلبہ یا طالبات ہی کے لکھے ہوئے ہوں گے یا ان کے لئے خاص اہتمام سے لکھوائے جائیں گے۔ اسی طرح حصۂ نسوان علحدہ تو نہیں کیا گیا (اور نہ اس کو جدا کرنے کی ضرورت تھی) مگر نسوانی دلچسپیوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا اور ہر رسالہ کی ترتیب میں صنف نازک کا کافی حصہ ہوگا۔

مضامین کے انتخاب میں بھی بڑی وسیع نظری ملحوظ رہے گی۔ افسانوں، نظموں، علمی، ادبی اور تنقیدی مضمونوں، اور اُردو کی مطبوعات پر غیر جانب دار تنقیدوں کے سوا آرٹ اور تصویر (سینما) پر بھی دلچسپ مصور مضمون چھپتے رہیں گے۔ نہ صرف دکن بلکہ تمام اُردو دنیا کے اچھے اچھے شاعروں اور انشا پردازوں کی نظمیں اور مضمون حاصل کرنے اور چھاپنے کا التزام کیا گیا ہے، اور کوشش کی جارہی ہے کہ سب رس تمام ہندوستان میں پہنچے اور ہر جگہ شوق سے پڑھا جائے۔ حُسن کاری اور اُردو ادب سے متعلق تصویریں بھی شامل رہیں گی اور رسالہ کا سرورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہوگا جس کے لئے ہندوستان کے مشہور حسن کار خان بہادر عبدالرحمان چغتائی نے اپنی بیش بہا خدمات سے ادارہ کو مستفید کیا ہے چنانچہ موجودہ سرورق انہی کے ایک سنگی نمونۂ حسن کاری کا خاکہ ہے جو آئندہ پوری شان سے جلوہ گر ہوگا۔

ایسی اہم اور ہمہ گیر خصوصیتوں کا رسالہ نکالنے کا خیال ابتدا میں "خیال است و محال است و جنوں" معلوم ہو رہا تھا لیکن جب ادارۂ ادبیات اُردو کے مدیر عمومی نے ادارہ کے ایک قدیم ہمدرد اور بہی خواہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات حکومت آصفیہ سے اِس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بڑی ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ ایسا رسالہ ضرور نکالنا چاہئے۔ چنانچہ انہی کے حسب ارشاد اجازت کی درخواست دی گئی اور آن کی اور دیگر متعدد علم دوست اصحاب کی توجہ اور دلچسپیوں نے آج ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ سب رس کی اشاعت کے ذریعہ سے اس الزام کو رفع کرسکیں کہ " اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی معارف نوازیوں اور علم پروری کے باوجود حیدرآباد صحافت کے میدان میں بہت پیچھے ہے "۔

ممالک محروسہ سرکار عالی سے جو اُردو رسالے شائع ہوتے ہیں اُن میں بیشتر مدرسوں اور کالجوں کے رسائل ہیں جن کا دائرۂ عمل استادوں اور طالب علموں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب تک محدود ہے۔ مجلۂ تحقیقات علمیہ، مجلۂ عثمانیہ، الموسیٰ، مجلۂ ورنگل اور نورس جامعہ عثمانیہ کی مختلف درسگاہوں کے ترجمان ہیں۔ دو رسالے مجلۂ طیلسانین اور مجلۂ نظامیہ۔ دو درسگاہوں (یعنے جامعہ عثمانیہ اور مدرسہ نظامیہ) کے فارغ التحصیلوں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ اور اُردو انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں بلند پایہ

محققانہ مقالے اور ادبی مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کا ایک رسالہ شہاب ایسا ہے جو ماہوار ہے اور عام ادبی رسالہ سمجھا جاسکتا ہے اور پابندی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ آج حیدرآباد کو علم و فضل کا مرکز سمجھا جاتا ہے' اور جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے یہاں اُردو کے اہل علم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اخبار و رسائل کے مطالعہ کا ذوق ابھی عام نہیں ہوا۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہر اُردو داں اپنی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر ضرور مطالعہ کیا کرے۔ جب تک مطالعہ کا ذوق وسیع نہ ہوگا نہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوسکیں گے' نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت پیدا ہوسکے گی' نہ ہمارا ادب وسعت حاصل کرسکے گا' اور نہ ہماری زبان میں ترقی ہوگی۔

رسالہ سب رس ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے نکل رہا ہے اس لئے اس کی نگرانی ادارہ کے مدیر عمومی کے سپرد ہے اور ادارہ کے ایک سرگرم رکن صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش کو اس کی ادارت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایک پرجوش اور اہل ذوق نوجوان ہیں ان کی سرگرمیوں اور سلامتی طبع سے توقع ہے کہ سب رس ان کی ادارت میں ہر طرح سے کامیاب ثابت ہوگا۔

پہلے نمبر میں جو مضامین اور نظمیں شائع ہو رہی ہیں وہ صرف چار پانچ ہفتوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کی خصوصیات کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا ضرور ہے کہ آئندہ ہر مہینہ میں ہمارے پڑھنے والے سب رس کو اپنی توقعات سے زیادہ دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ کیونکہ اُردو کے اکثر بلند پایہ انشا پردازوں اور شاعروں کے نتائج قلم حاصل کئے جارہے ہیں۔ اور توقع ہے کہ ہر شمارہ میں ہر ذوق کی تشفی کے اسباب مہیا کئے جائیں گے۔ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں خاصکر ہندی' مرہٹی' تلنگی اور کنڑی کے جدید ادبی جواہر پاروں کو بھی سب رس کے ذریعہ سے اُردو میں روشناس کیا جائیگا۔

سب رس میں بچوں اور طلبہ کے لئے جو ۱۶ صفحے وقف کئے گئے ہیں ان کو ایک علیحدہ مدیدہ زیب سرورق کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جارہا ہے تاکہ جو بچے اور طلبہ سب رس نہ خرید سکیں وہ سالانہ ایک روپیہ چندہ میں ہر ماہ سب رس کے اُس حصہ سے فائدہ اٹھاسکیں جو اُن کی دلچسپی اور ضروریات کی تکمیل کے لئے خاص اہتمام سے مرتب کیا جائیگا۔

سید محی الدین قادری زور

"سبزۂ بیگانہ"

"خاکسار شایانِ التفات نہ تھا من کہ باشم کہ براں خاطرِ عاطر گزرم شکر کرم حدِّ رقم سے برتر ہے امتثالِ امر میں چند بیتیں پیش کش ہیں کہ گلزارِ علم و ادب اس سبزۂ بیگانہ سے خالی نہ رہے۔"

چشمِ پُرفن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی
گردشِ ساغر و مینا کو سلام اے ساقی

سطوتِ جام کی جاتی رہی عالمگیری
اب کہاں ولولۂ شُربِ مدام اے ساقی

شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشیدِ ازل
مجھ کو درکار نہیں ماہِ تمام اے ساقی

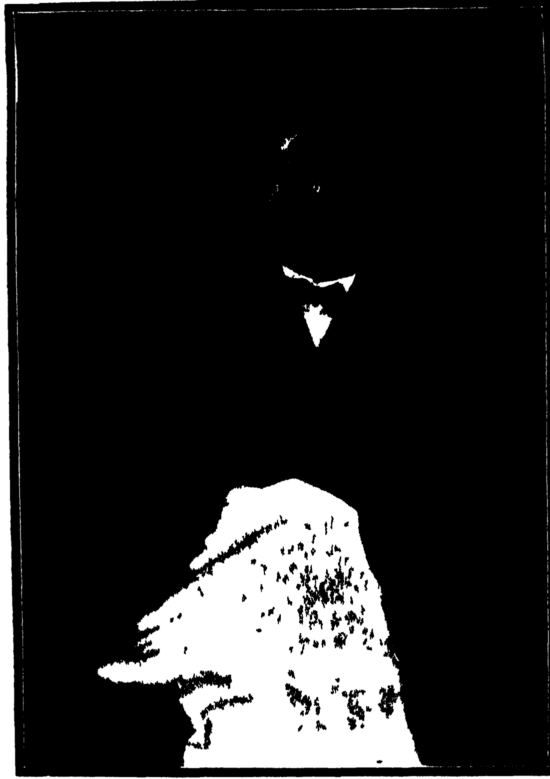
کعبۂ دل میں بُتوں کو ہے خدائی کا غرور
لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی

تیغِ ابرو سے جگردار کہیں ڈرتے ہیں
دمِ شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

مئے گلرنگِ شہادت کا چلے بزم میں دَور
آ چلی ساعتِ افطارِ صیام اے ساقی

پرتوِ صبحِ بناگوش سے ہوگی روشن
گیسوئے ہندِ جگرخوار کی شام اے ساقی

(علامہ عبداللہ) عمادی



ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

جن کی خدمات علمی و شعری کا اعتراف، ہندوستان کے مختلف مقامات میں عظیم الشان جلسوں کے ذریعہ کیا جارہا ہے اور جن کے متعلق آئندہ شمارہ میں ایک دلچسپ مضمون شایع ہوگا۔

فنِ افسانہ اور اُردو ادب

قصے اور افسانے سے انسان کی دلچسپی ابتدائے آفرینش سے پائی جاتی ہے اور یہ کچھ عہدِ حاضر کی خصوصیت نہیں اور نہ اُردو ادب پر موقوف ہے بلکہ آج کل ہر زبان اور ہر ملک میں لاتعداد افسانے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اردو زبان کا کوئی (سوائے چند مخصوص رسالوں کے) کوئی رسالہ اور اخبار ایسا نہیں جس میں افسانے نہ ہوتے ہوں۔ افسانوں کی اس گرم بازاری کے باوجود عام طور پر یہی خیال ہے کہ اردو زبان میں اچھے افسانے نہیں پائے جاتے۔ بعض لوگوں کو اس خیال پر اس قدر اصرار ہے کہ انھیں اردو کے قدیم و جدید مضمون نگاروں اور انشا پردازوں میں ایک بھی اچھا افسانہ نویس نظر نہیں آتا۔

اردو اگرچہ کافی قدیم زبان ہے لیکن ایک عرصے تک اس میں صرف شاعری ہی کا رواج رہا اور نثر کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی۔ ہر قسم کا ادب کیا افسانہ اور کیا داستان، دونوں نظم ہی کے قالب میں پیش ہوتے رہے۔ نثر کی طرف باضابطہ اور باقاعدہ توجہ انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ ابتدائی پچاس، ساٹھ برس میں قصے کی کئی کتابیں اردو نثر میں لکھی گئیں لیکن یہ سب قدیم طرز کی تھیں جن میں فوق فطری عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اردو کا عہدِ ترقی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ناول نویسی یعنے نئی طرز کی قصہ گوئی کی ابتدا ہوئی اور کئی ناول نویس جن میں خاص طور پر نذیر احمد، سرشار، شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، محمد علی، راشد الخیری اور پریم چند مشہور ہیں، پیدا ہوئے۔ ابھی ناول نویسی اردو میں اس درجہ ترقی کو نہیں پہنچی تھی جو دوسری اور خصوصاً یورپ کی زبانوں میں اس صنفِ ادب کو حاصل ہے کہ اس کا دور گذر گیا "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔ اب اردو میں افسانہ نگاری (مختصر قصے لکھنا) شروع ہوئی۔ بعض پرانے ناول نویس جیسے راشد الخیری اور پریم چند نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور نئے انشا پرداز تو زمانے کے تقاضے سے بالکل اسی طرف مائل ہو گئے۔ افسانہ نگاروں کے اس جمِ غفیر میں جن کی تعداد میں آپ اردو کے ہر نئے رسالے سے چند اشخاص کے نام لے کر اضافہ کر سکتے ہیں، ضرور چند اچھے اور بلند پایہ افسانہ نگار ہوں گے اور یہ کوئی محض حسنِ ظن یا اپنی زبان کی محبت کی بات نہیں کہ خواہ مخواہ میں بڑائی کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

بلند پایہ افسانہ نویسوں کو پہچاننے اور اچھے بُرے میں تمیز کرنے کے لئے ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی ضرور ہے ورنہ پھر وہی شکل ہوگی کہ جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ میری مراد افسانہ نگاری کے متعلق فنی اور تنقیدی ادب سے ہے تاکہ تنقید ادب اور دیگر اصنافِ حسن کاری کے لئے علمی اور فنی نقطۂ نظر سے بحث و تحسین کا مسالہ نہ ہو، یہ کہنا کہ فلاں افسانہ نویس

اچھا ہے یا بُرا، یا اردو میں سرے سے کوئی افسانہ نویس ہی نہیں، اپنی اپنی پسند کی بات ہوگی۔ اگرچہ بعض دفعہ یہی انفرادی رائیں بھی بلند پایہ تنقید کا درجہ رکھتی ہیں اور اپنی انفرادی قیل وقال سے تنقید کے مبادی پیدا ہوتے ہیں لیکن زبان وادب کی ترقی کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس قسم کا فنی اور تنقیدی ادب بھی وجود میں آئے جس سے ایک طرف افسانہ خوانوں کو اچھے اور برے افسانوں میں فرق کرنا آسان ہو جائے تو دوسری طرف خود افسانہ نویسوں کو اور خصوصاً ایسے افسانہ نویسوں کو جن کا ذوق فطری اور موزونیت طبعی ہوتی ہے، اپنی فطری صلاحیتوں سے بہ احسن الوجوہ کام لینے اور انسانی نقایص کو حتی المقدور دور کر کے اپنے کارناموں کو مہتم بالشان بنانے کے موقع حاصل ہوں۔

اردو زبان میں اس کی ضرورت ایک فطری تقاضے کی طرح مدت سے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ اردو زبان ہر صنف ادب پر تنقیدی لٹریچر سے ایک حد تک خالی ہے لیکن کسی خاص صنف ادب جیسے افسانہ نگاری کی روز افزوں ترقی کے مدنظر اس فن پر فنی کتابوں اور تنقیدی رسالوں کی ضرورت بہت ہی زیادہ محسوس کی جانی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حضرات کی جنبش قلم اور افسانوں کی کتابوں کے مقدمہ نویسوں نے اپنے موضوع کے کام پر بحث یا محاسن شماری کے دوران میں کبھی ارادتاً اور کبھی بے ارادہ بعض اصول اور تنقیدی نکات پیدا کئے ہیں اور اس طرح جو مواد یا ادب اردو میں پایا جاتا ہے وہ ضرور قابل مطالعہ اور لایق توجہ ہے لیکن خاص فنی نقطہ نظر سے اس موضوع پر بحث و تمحیص بہت ہی حال کی پیداوار ہے۔

اس خاص شعبۂ تحریر کی طرف جن لوگوں نے قلم اٹھایا ہے اور اپنی مساعی اہل ذوق کے آگے پیش کی ہیں وہ ہر طرح اردو دانوں کے شکریے کے مستحق اور لایق قدر ہیں۔ اور یہ امر ہر بہی خواہ اردو کے لئے مسرت کا باعث ہونا چاہیئے کہ اب ہمارے اہل قلم اس طرف کافی توجہ کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اس خصوص میں اولیت کا سہرا جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کے سر ہے اور سب سے پہلے اس کے ایک ہونہار سپوت مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے اس ضرورت کو محسوس کر کے "دنیائے افسانہ" کے نام سے جو ہمارے مرحوم استاد امداردو کے مشہور اہل قلم مولانا وحیدالدین سلیم کا مجوزہ ہے، اس فن کے اصول و مبادیات کو روشناس کرایا اور افسانہ کے اجزا، اقسام، محاسن و معایب اور اردو میں افسانہ کا ارتقا وغیرہ مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک دوسری کتاب میں افسانے کے بہت اہم عنصر یعنے کردار نگاری (کریکٹرائی زیشن) پر اصولی بحث کرتے ہوئے اردو ادب کے مشہور کرداروں کی خصوصیات کو بے نقاب کیا۔

اس ابتدائی کوشش کا نہایت مفید نتیجہ برآمد ہوا اور اب کئی اور اہل قلم حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے میں اور دو حضرات کی مساعی بطور خاص قابل ذکر ہیں، ایک مجنون صاحب گورکھپوری اور دوسرے وقار عظیم صاحب احمد صدیقی صاحب مجنون نے "افسانہ" کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ کافی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے۔

یہ اصل میں اُن کے دو لکچروں کا مجموعہ ہے جو انجمن اردوئے معلی علیگڈھ کے اردو ہفتے اور کلکتہ کی لٹریری کانفرنس کے لئے لکھے گئے تھے۔ اس طرح اس مختصر رسالے کے دو حصے ہوئے۔ حصۂ اول میں انھوں نے افسانہ اور اس کی غایت کے عنوان سے افسانے کے عناصر ترکیبی، افسانہ نگار کا نقطۂ خیال، افسانے کے اسلوب بیان، افسانہ نگاری کی غرض و غایت پر بحث کی ہے۔ یہ حصہ تمام تر انگریزی کی مشہور تنقیدی اور افسانے کی نئی کتابوں کے استفادے سے مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں مولف نے اردو کے قدیم وجدید قصہ نویس اور فسانہ نگاروں کے منظوم اور مشہور قصوں، ناولوں اور افسانوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ تبصرہ بہت ہی مختصر اور سرسری ہے لیکن اردو ادب کے عام مطالعہ کنندوں اور خصوصاً طلبائے مدارس کے لئے کافی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

وقار عظیم صاحب نے اس موضوع پر زیادہ اہتمام اور کاوش سے قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے "افسانہ نگاری" اور "ہمارے افسانے" کے نام سے دو رسالے لکھے ہیں جو ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں یا ایک کتاب کے دو حصے سمجھے جانے چاہئیں۔ دنیائے افسانہ اور افسانہ کے برخلاف ان رسالوں کا موضوع محدود ہے۔ یہ صرف مختصر افسانے کے متعلق ہیں۔ پہلی کتاب یعنے "افسانہ نگاری" میں مختصر افسانے کی حقیقت و ماہیت۔ اس کے اجزائے ترکیبی یعنے پلاٹ، کردار، سرخی، فنی ترتیب، افسانے کی ابتدا اور خاتمہ، افسانے میں حقیقت اور واقعیت اور محبت کے عنصر پر کسی قدر وضاحت اور تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور دوسری کتاب یعنے "ہمارے افسانے" میں اردو زبان میں فسانہ نگاری کے آغاز و ارتقا سے بحث کر کے اولاً اردو افسانوں کی اجتماعی خصوصیات، ان کی نوعیت اور افسانہ نویسی کے مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اردو کے (۲۷) مختصر افسانہ نویسوں کے کارناموں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ "افسانہ" میں مجنون صاحب نے صرف مختصر افسانہ نویسوں میں سے صرف پریم چند، سدرشن، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر اور جلیل قدوائی ہی کا ذکر کیا ہے مگر وقار عظیم صاحب نے موجودہ دور کے اردو رسالوں کے کم و بیش تمام افسانہ نویسوں سے بحث کی ہے جس میں تین خواتین بھی شامل ہیں۔ وقار عظیم صاحب کی تنقید کا مقصد جیسا کہ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے محاسن کے مقابلے میں معایب کو ذرا نرمی اور رعایت سے بیان کرنا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ہمارے افسانہ نگاروں کے بعض برے پہلوؤں کو بھی کافی جرأت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ان کا یہ خیال کہ "ابھی ہمارا ادب ایسی منزل تک نہیں پہنچا ہے کہ وہ سخت تنقید کے بار کا متحمل ہو سکے، ابھی اُسے پروان چڑھانے کی ضرورت ہے اور اسلئے اپنی ادبی تخلیقوں پر تنقید کرتے وقت تک ان کے محاسن پر زور دینا ضروری ہے" بہت درست ہے۔ اپنی کتاب کے لئے افسانہ نگاروں کی فہرست بنانے میں انھوں نے اپنے مذاق کے موافق صرف ان لوگوں کو انتخاب کیا ہے جو ان کے نزدیک افسانہ نگاری کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے جہاں بعض ایسے پرانے افسانہ نویسوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو اگرچہ مدتوں سے افسانہ لکھتے ہیں مگر ان میں اس فن کی فطری صلاحیت کی کمی ہے اور بعض ایسے نئے اور غیر معروف افسانہ نگاروں کو لے لیا ہے جن کے افسانے ان کی فطری صلاحیت اور آیندہ ان کے اچھا،

قابل قدر افسانہ نگار بننے کا پتہ دیتے ہیں۔ تعمیری تنقید کی وجہ سے جو وقار عظیم صاحب کے پیش نظر رہی ہے، انکی کتابیں کافی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں۔

اس سلسلے میں اگر صوبہ متحدہ کے ایک اور نوجوان مولف اویس احمد صاحب ادیب کا بھی ذکر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اویس احمد صاحب نے "اردو کا پہلا ناول نگار" کے عنوان سے مولانا نذیر احمد کے ناولوں پر ایک تنقیدی مقالہ ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے۔ اور مولانا کو ناول نگار کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے عمومی طور پر فسانہ نویسی کے اصول و مبادیات سے بھی بحث کی ہے۔ اگرچہ ان کا موضوع اس لحاظ سے بہت محدود اور مختصر افسانہ نویسی سے بالکل الگ ہے لیکن ناول اور افسانہ کے مشترک پہلوؤں کے مدنظر یہ بالکل قابل نظر انداز نہیں۔

یہ ایک مختصر جائزہ ہے ان فنی اور تنقیدی کتابوں کا جو اردو میں افسانہ نویسی کے متعلق گذشتہ چند سال میں لکھی گئی ہیں۔ اگرچہ ہمارے افسانوں اور افسانہ نگاروں کی طرح یہ بھی بعض نقادانِ ادب کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں لیکن ان کی تصنیف و اشاعت اردو کی ترقی کے لئے ایک فال نیک ہے اور یقیناً یہ اپنے موضوع کی آئندہ بڑی بڑی کتابوں کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔

محمد سید ام۔ اے

"سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لئے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکن کو سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غمگسار اور ہمدم ہو جائیں۔ انسان کی روح کو صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہو جائیں گے تو رہنمایانِ خلق کو مستقبل کی اصل راہ طے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا سور کیا ہے اور زمانہ کس نغمہ کو سننے کے لئے بے چین ہے۔ اس وقت انھیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انھیں پہچاننا چاہیئے۔"

رابندر ناتھ ٹیگور



حو کچه بهی مصیبتیں هیں تجه پر کم هیں
خوشیاں دنیا کی تیرے حق میں سم هیں

عم سے کیوں بهاگتا هے میرے طالب
معلوم نہیں تجه کو که غم میں هم هیں

"امجد"

شادی

یہ ایک کل قومی، کل مذہبی اور کل تہذیبی ادارہ ہے۔ جس کی گوناگونیوں کو تمام و کمال حصر کرنا اور جس کے مالۂ و ماعلیہ کو ذہن نشیں کرنا، ذرا دشوار امر ہے۔ اس کی صورت حال اور اس کے متعلق صاحبان فکر کے اختلافِ خیال کا لحاظ کرتے یہ تصفیہ کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم ترین انسانی ادارے کا وجود، معقولیت پر مبنی ہے یا محض خوش اعتقادی، رسم پرستی اور تقلید پر۔ لیکن عقل یہ کہتی ہے کہ، یہ یقیناً ضرورت کا پیدا کردہ ادارہ ہے۔ بعد میں، مذہب نے اس کو قانون بنا دیا اس کا بھی ایک نفسی یا نفسانی سبب تھا۔ انسان کی جدت پسندی سے ڈر تھا کہ وہ اپنے آپ کو بندشوں اور قیود کی ذمہ داریوں میں کم پھنسنے دے گا۔ مذہب نے اپنے مافوق الفطرت اثرات کے ذریعہ یہ اہم مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور گریز پا کو تہ دام کیا۔ تہذیب، مذہب کا بچہ تھی اس نے مذہب کے تصفیوں کو تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ قبول کر لیا۔

بہر حال شادی کا، ایک نہایت ہی عہد آفریں موقع ہوتا ہے۔ جس کے بے شمار منازل اور مراحل میں سے دو، یعنے ماقبل اور ما بعد نہایت اہم ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی موشگافی کرنا چاہے تو اس کی ایک تیسری منزل بھی مقرر کرے، جو اس ماقبل اور ما بعد کا وسط یا ان کے اتصال کا خط ہے، جس کو عرف عام میں، پورے واقعہ کا مترادف یعنے عین شادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصل میں یہ ایک وسیع سلسلۂ واقعات ہے جس کو ایک حقیقی افسانے کی طرح، تمہید، آغاز، منتہا، اور انکشاف کی تمام کیفیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے تنہا عقد، نکاح، لگن، یا کلیسا کی رسم نہ تو پورا واقعہ ہے اور نہ اصل واقعہ اسی طرح یہ شادی کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ سلسلۂ واقعات کے اس وسط کو ہم چاہیں تو منتہا، Climax سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ایک قصے کے منتہا میں جو اوصاف ہونے چاہئیں وہ اس میں سب موجود بھی ہوتے ہیں۔ شادی کے ماقبل اور ما بعد جو اس کے اصلی اور نمایاں مراحل ہیں، اپنی کیفیات کے اعتبار سے بے حد مختلف ہیں مثلاً

اس کا قبل ہمیشہ مفتوح ہوتا ہے اور ما بعد مضموم۔ جیسا کہ تمام جذباتی موقعوں کو ہونا چاہیئے، ماقبل کا زمانہ انبساط، کشادگی، سرور اور کیف سے لبریز ہوتا ہے۔ یہ بے پردہ یا در پردہ کورٹ شپ یعنے پیام سلام کا رومان آفریں زمانہ ہے اس میں فریقین کے دل میں ایک دوسرے کی محبت ہوتی ہے، احترام ہوتا ہے اور اچھے خیالات ہوتے ہیں، خواہ وہ یکجا ہو سکیں یا ان کے درمیان قطبین کی دوریاں حائل ہوں۔ گویا حیات انسانی کی مسرتیں ان لمحات میں، اپنے معراج کمال پر ہوتی ہیں۔ اس پوری مسرت کا راز، اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ناواقفیت اور نادانی میں مضمر ہوتا ہے۔

جب یہ مرحلہ خیر خوبی سے گزر جاتا ہے، تو اس کی رسمی منزل آتی ہے جو واقعتاً کوئی منزل نہیں، بلکہ دو وقتوں کا

"دوشام" کا ملاپ ہے، جس کو مذہب کے اثرات نے نہایت مقدس بنا دیا ہے۔

جو لوگ محض اس مرحلہ کو شادی کا اہم ترین جز سمجھتے ہیں، وہ ایک نفسیاتی مغالطے میں مبتلا ہیں۔ یہ ماقبل کی نفسی کیفیات کا منتہا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت یہ ہیں کہ، یہ اسی وقت وجود پذیر ہوتا ہے، جب فریقین شادی پر وہی نفسی کیفیت طاری رہے۔ ورنہ اس کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی۔ دوسرے اگر اسی کو پوری شادی سمجھ لیں، تو شادی کی جدید ترین صورتوں، جیسے ہم جلیسی شادیوں، وغیرہ میں اس کو ہم کہاں تلاش کریں گے؟

شادی کا مابعد مفہوم اس لئے ہوتا ہے کہ یہ مفتوح نہیں ہوتا۔ اس میں بندشیں ہوتی ہیں، ذمہ داریاں ہوتی ہیں، بیڑیاں ہوتی ہیں، ہتکڑیاں ہوتی ہیں، بسا اوقات یہ مذموم بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ اگلی نادانیوں کے کیف و سرور کا نشہ ضرورت سے زیادہ واقفیت کی بدولت، اترنے لگتا اور خمیازوں اور انگڑائیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لیکن اکثر کلیوں کی طرح، اس کلیہ کی بھی ایک مستثنیٰ شکل ہے۔ یہ رنڈوے کی شادی ہے جس کا ماقبل اور مابعد دونوں مفقود ہوتے ہیں۔

شادی، اپنے تمام ظاہری اور باطنی لوازم کے اعتبار سے ایک معاملہ ہے۔ خواہ اس میں جذبات کے مبالغے، سپردگیوں کے مظاہر ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ معاملے کے تمام پہلو اس میں نمایاں ہیں۔ معاہدہ۔ ایجاب و قبول۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ دو شریف گھرانوں میں یہ معاملہ طے پا رہا تھا۔ دلہن کے بھائی نے، چھان بین کی نئی نئی راہیں اختیار کیں تو دولہا کے باپ کو غصہ آیا۔ انھوں نے شکایت کی۔ اس پر دلہن کے بھائی نہایت متانت سے فرمانے لگے۔ "دیکھئے جناب! ایک پیسے کی ہانڈی خریدی جاتی ہے تو اُسے ہر طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیتے ہیں۔ یہ تو بیٹا بیٹی کا معاملہ ہے.........."۔

اس معاملے کی تکمیل کے بھی عجیب عجیب انداز ہیں۔ کہیں یہ جبری ہوتا ہے جیسا کہ وحشی قوموں، بادشاہوں وغیرہ کی شادیوں کے معاملے میں دیکھا جاتا ہے۔ کہیں یہ اندھا ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ معاملہ نیابتی ہوتا ہے یا وکیلوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے جو فریقین عقد کے فائدے کے لئے اس کی تمام جزئیات طے کرتے ہیں۔ یہ ہماری شادیوں کا معاملہ ہے، اس میں مشتری گویا مال کو بے دیکھے خریدتا ہے۔ کہیں یہ دیکھا اور پرکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس صورت میں مشتری گویا خریدے ہوئے مال کو خریدتا ہے۔

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ بیاہ، اصلاً اور نسلاً ایک معاملہ ہے، اس کے اہم خدوخال، ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں۔ دو جائدادوں کی بیع و شریٰ کے اس معاملہ میں یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ کس فریق کو مشتری سمجھیں اور کس کو بائع؟ قدیم زمانے میں خریدار مرد ہوتا تھا، لیکن اس زمانے میں بظاہر تو کوئی فریق مجہول نہیں معلوم ہوتا۔ دونوں دل کھول کر قیمت بڑھاتے جاتے ہیں۔ اب شاید فریقین کی حیثیتوں کا کچھ کچھ تعین ہونے لگا ہے۔ نسوانی فریق

غالباً اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ مجہول ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی حیثیت کچھ مشتری سے زیادہ مشابہ ہوگئی ہے۔ کیونکہ یہ دام لگاتا ہے۔ لڑکے والا فریق گویا بایع، اور خود لڑکا "شئی مبیعہ" یا مال قابلِ فروخت۔ جہیز کو دام سمجھ لو۔

بعض ستم ظریف شادی جیسے اہم معاملہ کو ایک ڈراما سمجھتے ہیں۔ جس کے اہم کردار دلہا اور دلہن، ہیرو اور ہیروئین ہیں۔ اور ضمنی کردار دونوں کے رشتہ دار اور احباب۔ ان میں بھی خاصی اہمیت لڑکے کے رشتہ داروں اور دوستوں کے حصے میں آتی ہے۔ چنانچہ یہی لوگ شادی کے تمام مناظر میں، ایک حقیقی اداکار کی سنجیدگی کے ساتھ، نقل و حرکت میں معروف نظر آئیں گے۔ حتیٰ کہ عقد کے روز، دلہن کے باپ کے مکان میں بھی، نمایاں اداکار یہی ہوتے ہیں۔ اس منظر کے حقیقی اداکار بھی، ان کے مقابلے میں، عموماً پس منظر میں پڑ جاتے ہیں۔

عبدالقادر سروری

ام، اے، ال ال، بی

ادب اس بغاوت کا نام ہے جو انسان کے دل میں ظلم، بے انصافی اور غرض پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ادیب اپنے خوبصورت پیرایہ میں اسی بغاوت کی ترجمانی کرتا ہے۔ دوسروں کے دلوں میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل ہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتے۔ ادب ان زخموں کی گہرائی کو اس طریقے سے ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اُٹھتے ہیں۔

پریم چند

میں اُن کے لئے لکھتا ہوں جو بڑھتی ہوئی فوج کے پیشوا ہیں۔ میں اُن کے لئے لکھتا ہوں جو اس بین الاقوامی جنگ میں شریک ہیں جس میں فتح یاب ہونے کے بعد ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں نہ اونچ نیچ کا فرق ہوگا اور نہ جغرافی حدود ہوں گی۔ ہم جو ادیب ہیں پسنڈی لوگوں سے کہتے ہیں کہ بڑھے چلو، لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کرتے۔ یہ ان کا فرض ہے کہ دوڑ کر ہمارے پاس آئیں۔ چڑھتا ہوا دریا کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

روماں رولاں

جادۂ یقیں

حریم کعبہ بنا دی وہ سر زمیں میں نے　　ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

یہ مجھ سے پوچھ کہ اجزائے رنگ و بو کیا ہیں　　کئے ہیں چاک بہت جیب و آستیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب　　وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

نشاطِ ہستیٔ فانی مری نگاہ سے دیکھ　　بہت اٹھائے ہیں رنجِ گراں نشیں میں نے

چٹک میں غنچہ کی وہ صوتِ جانفزا تو نہیں　　سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

اسی جہان میں دیکھا کیا غمِ مسرور　　یہیں مشاہدہ کی عشرتِ حزیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈھ لیا جادۂ یقیں میں نے

علی اختر

سب رس

تین سو گیارہ سال قبل کی مشہور اردو کتاب

تین سو گیارہ برس گزر گئے۔ دنیا بدل چکی۔ قطب شاہی سلطنت مٹ گئی، اور اسکے مٹانے والے بھی باقی نہ رہے۔ گولکنڈہ کے ہیرے اقصائے عالم میں منتشر ہو گئے۔ دکن میں ہون برسنے کا واقعہ افسانہ بنگیا۔ لیکن قطب شاہوں کی لکھی اور لکھائی ہوئی کتابیں ابتک موجود ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے لکھنے والوں کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق، پاکیزہ کردار، اور آزاد منشی کی یاد دلاتی رہیں گی۔ اور اُن کا مطالعہ کرنے والے ہر وقت اپنے اندر زندگی اور زندہ دلی کی نئی اُمنگیں موجزن پائیں گے۔ علم کی دولت کو کبھی زوال نہیں۔ یہ ہیروں اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسکو کوئی لوٹ نہیں سکتا۔

قطب شاہی سلطنت عروج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ مغلوں کی سازشیں اور میر جملہ کی بے ایمانیاں ابھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا عنفوان شباب تھا۔ اور ابھی ابھی اس کی والدہ دکن کی محبوب ملکہ حیات بخشی بیگم نے اپنے فرزند کو زمام حکومت سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ نوجوان بادشاہ کو اپنے عالم و فاضل باپ سلطان محمد قطب شاہ اور مشہور و معروف نانا سلطان محمد قلی جیسے بلند پایہ شاعر سے نہ صرف گولکنڈہ کی غیر معمولی دولت بلکہ علم وادب سے خاص دلچسپی بھی ورثہ میں ملی تھی۔ جہاں اسکے خزانے اور محل اسکے آباو اجداد کے جمع کئے ہوئے جواہرات اور ہیروں سے معمور تھے اس کا دربار اور اسکی راجدھانی ایسے سیکڑوں علما و حکما اور شاعروں اور ادیبوں سے بھری پڑی تھی جن میں سے چند کا بھی ایک جگہ جمع ہوجانا تہذیب تمدن اور علم و فضل کی ایک خاص فضا پیدا کر دینے کے لئے کافی تھا۔

انہی مغتنم روزگار ہستیوں میں سے ایک ملک الشعرا ملا وجہی بھی تھے جو اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اس جواں سال بادشاہ کے باپ، اور نانا، اور دادا (سلطان ابراہیم قطب شاہ) کے علم پرور درباروں میں گذار چکے تھے اور اب ان کی عمر ستر سال سے کم نہ تھی۔ انہوں نے اپنی جوانی ہی میں قطب مشتری جیسی بلند پایہ اُردو مثنوی لکھکر شہرت دوام حاصل کر لی تھی اور اسکے بعد سے ملک الشعرا کی حیثیت سے بیسیوں قصیدے، مثنویاں، اور مرثیے لکھے تھے اور سیکڑوں شاعروں کو استادی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔ ایسی بزرگ ہستی کا سلطان عبداللہ کے دربار میں موجود رہنا ہی باعث برکت تھا یہی وجہ ہے کہ

نوجوان سلطان نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سنہ ۱۰۴۵ھ میں ایک روز صبح کے وقت اپنے نانا کے دربار کے اس بوڑھے ملک الشعرا کو اپنے حضور میں بلا بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اردو نثر میں ایک کتاب ایسی لکھی جائے جس میں عشق کا بیان ہو۔

وجہی سے بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ اپنے آقا محمد قلی کے نواسہ اور دودمان قطب شاہیہ کے اس واحد چشم و چراغ کی بات کو ٹال دیتے۔ انہوں نے دل و جان سے قبول کیا چنانچہ وہ اس واقعہ کو اپنی کتاب میں اس طرح بیان کرتے ہیں:—

سلطان عبداللہ، ظل اللہ، عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ۔ ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر، دل کے خطرے سے باخبر، صورت میں یوسف سے اگلے، آدم بیہوش ہوئے تھے پھر ایکلے۔ دارا، فریدوں فر، مسیحا دم، خورشید علم۔ صبح کے وقت، بیٹھے تخت۔ یکایک غیب سے کچھ رمز پاکر، دل اپنے میں کچھ لاکر۔ وجہی نادر من کو، دریا دل گوہر سخن کو۔ حضور بلائے، پان دیئے، بہت مان دیئے، اور فرمائے کہ انسان کے وجود میں کچھ عشق کا بیان کرنا۔ اپنا نام عیاں کرنا۔ کچھ نشان دھرنا۔ وجہی ہو گنی گن بھرا، تسلیم کر کر سر پر ہاتھ دھرا۔ بہت بڑا کام اندیشا، بہت فکر کیا۔ بلند ہمتی کے بادل سے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا، قدرت کے اسراراں برسایا۔ بادشاہ کے فرمائے چھپیا، نئی تقطیع میں تلہ کہ آگے کے آنے ہارے، ہم بی کچھ تھے کر سمجھیں یار۔ ہارے گن کو دیکھے سو ہنا دیکھے، گنگا دیکھے سو جمنا دیکھے۔ ہم سے آگے تھے ہو ان کا بھی کچھ تمیز کریں، ریاضت ہماری مشقت ہماری چیز کریں[1]۔"

اسکے بعد بوڑھے انشاپرداز وجہی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دنیا میں کچھ یادگار ہے تو خوب ہے۔ اور انسان وہی ہے جو دوسروں کو کچھ فیض پہنچائے۔ ان کے یہاں ہزار کعبے بند ھانے اور ہزار حج کرنے سے بہتر یہ ہے کہ کسی کو کچھ دیا جائے اور کسی کے دل کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ وہ اس کتاب کا نام سب رس رکھتے ہیں اور اسکا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"یہ عجب کتاب ہے سبحان اللہ۔ اس کتاب کا نام سب رس، سب کچھ پڑھنے آوے ہوس، بول بول کو چڑھے اُس، یادگار ہو رہے گا دنیا میں کئی لاکھ برس۔ بہت ہی لذیذ، عاشقوں کے گلے کا تعویذ۔ یہ کتاب سب کتابوں کا سرتاج، سب باتوں کا راج، ہر بات میں سو سو معراج، اس کا سواد سمجھے نا کوئی عاشق باج۔ ...... یہ رنگ رنگ کے پھول، خوش رنگ مقبول، سب کو بھاتے یہ پھول۔ دایم تازے ہرگز نہیں کھملاتے۔ ..... اگر کسی میں سخن شناسی اور اسرار دانی ہے تو یہ کتاب گنج العرش بحر المعانی ہے۔"

اسی سلسلہ میں وہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ پہلے اردو انشاپرداز ہیں جنہوں نے نثر میں ایسی کتاب لکھی ہے:—

"جتنے فہم دار جتنے گن کار ہوئے سو آج تک، کوئی اس جہاں میں، ہندوستاں میں، ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم اور نثر ملا کر گھلا کر یوں نہیں بولا۔ اس بات کو، اس نبات کو یوں کوئی آب حیات میں نہیں گھولا۔"

---

[1] اس مضمون میں قطب شاہی سب رس کے جتنے اقتباسات دئے گئے ہیں اُن میں بعض الفاظ کو اُن کی موجودہ شکل کے مطابق لکھا گیا ہے تاکہ ہر شخص ان کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکے۔

آخر میں وہ بہت کچھ اپنی تعریف بھی کر لیتے ہیں۔ اور یہ ہر فن کار، شاعر، اور ادیب کا شیوہ ہے خاصکر جب کہ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ وجہی شاعر بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، اور بوڑھے بھی۔ وہ کہتے ہیں :-

"میں تو یہ بات نہیں کہا ہوں، عیسیٰ ہو کر بات کو روح دیا ہوں۔ دانش کے باغ میں آیا، بہار ہو کر پھولاں کھلایا،......
بہت نادر نادر باتیں بولا ہوں، دریا ہو کر موتی رولا ہوں۔ موتیوں کی موجوں کا میں دریا ہوں، تمام موتیوں سے بھرا ہوں۔"

غرض اسی طرح خودستائی کرتے چلے گئے ہیں۔ اور پھر "آغاز داستان زبان ہندوستان" کی سرخی سے اصل کتاب یوں شروع کی ہے۔

"ایک شہر تھا، اس شہر کا نام سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کا نام عقل۔ دین و دنیا کا تمام کام اُس سے چلتا۔ اُسکے حکم باج ذرہ کہیں نہیں ہلتا۔"

وجہی نے اس قصہ میں عبداللہ قطب شاہ کی خواہش کے مطابق عقل و عشق اور حسن و دل کی کشمکش کو ظاہر کیا ہے۔ آئندہ نمبر میں ہم اس قصہ کا خلاصہ شائع کریں گے جو مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو کا لکھا ہوا ہے یہاں صرف اس واقعہ کا اظہار ضروری ہے کہ اصل قصہ کے ساتھ ساتھ وجہی نے جگہ جگہ تربیت و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے متعلق ایسی ایسی باتیں لکھدی ہیں جو بہت کم کتابوں میں اس خوبی اور قوت کے ساتھ لکھی گئی ہوں گی۔ تب ہی تو اسکا نام سب رس رکھا ہے۔ ان باتوں میں نہ صرف بیان کی ندرت اور زبان کی شیرینی ہے بلکہ خیال کو بھی دعوت عمل دی گئی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ سب رس آصفی کے ہر نمبر میں سب رس قطب شاہی کے چند جملے جو کسی خاص موضوع سے متعلق ہوں التزام کے ساتھ شائع کرتے رہیں۔

قطب شاہی سب رس کو مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کر کے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا ہے اور اس کے آغاز میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ دلچسپ کتاب جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے کے نصاب میں شامل ہے اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ چونکہ زبان قدیم ہے اور کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اسلئے جنھیں نستعلیق خط پڑھنے کی عادت ہے اُن کو پہلی نظر میں مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ :-

"ہم وجہی کو استاد مانتے ہیں اور جو کام اُسنے کیا ہے اسکا احسان نہ ماننا حقیقت میں ناانصافی ہے.... سب رس اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے اور اسکی فضیلت اور تقدم کو ماننا پڑتا ہے۔ نثر میں قافیہ کا التزام بذات خود ایک ایسی چیز ہے کہ تکلف اور آورد سے بچنا محال ہے.... لیکن اس میں بے صد فصاحت، روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ حال کے زمانے میں جو اسی ڈھنگ پر بعض کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً فسانۂ عجائب وغیرہ اُنسے یہ کسی طرح کم نہیں بلکہ میری رائے میں بیان کی سادگی میں اُنسے بڑھکر ہے۔"

سب رس پونیا تقطیع کے تین سو صفحات میں شائع ہوئی ہے۔ اور ہر صفحہ میں ایسے متعدد جملے یا اشعار ملتے ہیں جو ضرب المثل کا کام

دیکھتے ہیں اور جن میں سے بیسیوں کہاوتوں کی طور پر حیدرآباد اور اسکے اطراف واکناف کے دیہات میں رہنے والی بڑی بوڑھیوں کی زبان پر ابتک باقی ہیں۔

وجہی کی یہ نثر کی کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعد کے شاعروں نے اسکو منظوم کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس وقت تک دو شاعروں کے منظوم کارنامے دستیاب ہو چکے ہیں۔ سب رس کی تصنیف کے چالیس سال بعد بیجاپور کے ایک مشائخ شاعر شاہ بیر اللہ محرمی نے ۱۰۸۶ھ میں اسکو مثنوی کی شکل میں منتقل کیا اور اس کا نام "گلشن حسن و دل" رکھا۔ پھر ۱۲۰۹ھ میں دکن کے ایک اور صوفی شاعر بحر العرفان شاہ حسین ذوقی نے سب رس کے قصہ کو منظوم کرکے "وصال العاشقین" نام رکھا۔ انکے علاوہ نہ معلوم اور کن کن شاعروں نے وجہی سے اخذ فیض کیا ہے مگر ان کے کارنامے یا تو تلف ہو گئے یا ابھی منظر عام پر نہ آسکے جس طرح ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" بعد کے شعرا طبعی و ابن نشاطی کے لئے باعث الہام ثابت ہوی اور انہوں نے اپنے کارناموں "گل بادام" و "پھولبن" میں "قطب مشتری" کے اثر کو ظاہر کر دیا ہے اسی طرح سب رس کے بعد کے نثری کارناموں کا بھی اس سے متاثر ہونا ضروری تھا مگر چونکہ ابھی قدیم اردو نثر کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے اسلئے یہ موضوع ابھی تشنہ ہے سب رس کو ختم کرنے سے پہلے ملا وجہی نے اسکا سن تصنیف بھی بیان کر دیا ہے اور اسی سلسلہ میں اپنی اور کتاب کی تعریف اس طرح کی ہے :-

"(سب رس) سبکے دلوں کا آرام، سب کو اس سے کام۔ بہت اس میں عقل، بہت اس میں فہم، سب کام میں تمام۔ جہاں یہ رہے وہاں لڑگیری نہ آوے، صحبت اسکی سب کو بھاوے۔ بات اس کی جوں شکر جوں نبات جب تک دنیا تب تک اسے حیات۔ بارے جس وقت تھا ایک ہزار و چہل و پنج اس وقت ظہور پکڑا یہ گنج۔ جو کوئی صاحب سخن ہوگا، جو کوئی صاحب فہم ہوگا، اسے یہ سخن اثر کرے گا، مستے خبر کریگا۔ وہ پہچانے گا، وہ اس بات کی قدر جانے گا۔ ہم کو یاد کریگا، اپنا دل شاد کریگا۔ دل پر سے جائے گا فکر، اسے لگے گا ہمارا ذکر۔ ہماری بات کی نطافت کے پیالہ کا اثر چڑھے گا۔ عجب مرد تھا کہے گا، عجب صاحب درد تھا کہے گا۔ عجب کامل تھا کہے گا، عجب واصل تھا کہے گا۔"

آخر میں سب رس کے دعائیہ اشعار مصنف نے اپنے آقا اور اسکے متعلقین کیلئے جو دعائے خیر کی ہے اسکے ایک ایک حرف سے خلوص ٹپکتا ہے۔ وجہی لکھتے ہیں :-

"بادشاہ اور بادشاہ کے دوستاں، بادشاہ کے عزیزاں، بادشاہ کے خویشاں، قرابتیاں۔ بادشاہ کے پیاریاں پیارے، منتیاں مانگنے ہارے۔ بادشاہ کے خدمتگاراں دولت خواہاں، دعاگویاں امیدواراں، سب اپنی مراد کو اپڑو، انکو غیب کی نعمت پہنچو، عمر دراز ہو، دائم بدولت ہو۔ عاقبت بخیر ہو، ایمان سلامت ہو۔"

اس طرح آج سے تین سو گیارہ سال پہلے کی حیدرآباد میں لکھی ہوی اُردو کتاب "سب رس" ختم ہوتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا اثر ہمیشہ باقی رہیگا اور اردو دنیا اس سے فیض حاصل کرتی رہیگی۔ یہ کچھ کم اثر نہیں ہے کہ تین صدیاں گزر جانے کے بعد بھی حیدرآباد سے ایک عام فہم دلچسپ ادبی رسالہ نکالا جاتا ہے تو وہ گولکنڈہ کے ملک الشعراء ملا وجہی کی اسی یادگار زمانہ اُردو کتاب کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس نام میں لطافت کی جو گہرائیاں ہیں وہ بہ یک نظر واضح نہیں ہوتیں قطب شاہی "سب رس" کی طرح یقین ہے کہ آصفجاہی سب رس کو بھی وہ مقام خوبیاں نصیب ہونگی جو قوموں کی علمی وادبی زندگی اور ملکوں کی سماجی اور تمدنی حالت سنوارنے میں رہتی ہیں۔

سید محی الدین قادری زور

عبدالرزاق لاری

یہ گولکنڈہ کا وہ مشہور ہیرو ہے جس کا نام تاریخ دکن میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور جس کی سرفروشی سے آنے والی نسلیں اپنے ملک و مالک کی وفاداری اور جاں نثاری کے سبق سیکھتی رہیں گی۔ ایسے مایوس ماحول میں جبکہ گولکنڈہ کے اکثر سپہ سالار مغل سازشوں کا شکار ہو چکے تھے اور قطب شاہی سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا عبدالرزاق لاری نے آخر وقت تک ہمت نہ ہاری اور ثابت کر دیا کہ ع

"وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے" اگرچہ وہ اپنے بادشاہ اور اپنی سلطنت کیلئے آستانۂ قطب شاہی کی حفاظت میں شہید ہونے سے محروم رہ گیا اور بیہوشی کی حالت میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی کی بارگاہ میں روانہ کر دیا گیا اور بعد کو عرب کی مقدس سرزمین میں دفن ہوا لیکن کیا تعجب ہے کہ اسکی روح ابتک گولکنڈہ کے قطب شاہی کھنڈروں کا طواف کر رہی ہو ـــــ

اورنگ زیب جیسے مدبر اور مردم شناس بادشاہ کا یہ جملہ ہمیشہ بہادروں کے تذکرہ میں یادگار رہے گا کہ "اگر لاری جیسا ایک اور شخص قطب شاہ کے لشکر میں ہوتا تو قلعہ گولکنڈہ کا فتح ہونا دشوار تھا" اس جانباز کو اپنے دربار میں جگہ دینے کیلئے اورنگ زیب نے طرح طرح سے کوشش کی لیکن اس نے آخر تک انکار کیا اور ہفت ہزاری منصب کو بھی ٹھکرا کر مدینہ منورہ کو ہجرت کر گیا۔

جناب وحید نے اس نظم کے ذریعہ سے دکن کے اس مشہور جانباز کی ستائش کا حق ادا کیا ہے۔ "سب رس"

زندہ کوئی سلطاں کا ہوا خواہ نہیں ہے
ہے عکسِ اجل تختِ قطب شاہ نہیں ہے

ہے کون جو انجام سے آگاہ نہیں ہے
لیکن تجھے انجام کی پرواہ نہیں ہے

غصے میں رخ تیغِ دو دم چوم رہا ہے
خادم درِ آقا پہ کھڑا جھوم رہا ہے

لڑنے لگے خونخوار مغل قلعے کے در پر
تیغوں کی چمک سے ہیں در و بام منور

لاری کی شجاعت سے پریشان ہے لشکر
بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا فوج عدو پر

یہ ہاتھ ہے یا دستِ اجل طالبِ جاں ہے
قبضے میں ترے تیغ ہے یا برقِ تپاں ہے

ملبوس لہو سے ترا، گلنار ہوا ہے
قد، خون میں ڈوبی ہوی تلوار ہوا ہے

ہر عضوِ بدن زخم سے بیکار ہوا ہے
یہ ضعف ہے سر تن پہ ترے بار ہوا ہے

لے جاتے ہیں گو تجھکو شہنشاہ کی جانب
آنکھیں ہیں تری تختِ قطب شاہ کی جانب

اقبال کا ساتھی ہے پدر ہو کہ برادر
ادبار میں تسکیں نہیں دیتا کوئی دم بھر

اس معرکۂ دہر میں ہوتا ہے یہ اکثر
قسمت کے بدلتے ہی بدل جاتے ہیں تیور

پر عہدِ وفا تو نے مصیبت میں نہ توڑا
جب تک رہی طاقت درِ آقا کو نہ چھوڑا

مشکل میں گوارا نہ کیا غیر کا احساں
ٹھکرا دیا یہ کہہ کے شہنشاہ کا فرماں

"مفتوح یداختر کی امانت ہیں دل و جاں
میں ملک ہوں مالک کی یہی ہے مرا ایماں

روکے سے مرا جوشِ وفا رُک نہیں سکتا
گردن مری کٹ سکتی ہے سر جھک نہیں سکتا!"

شمشیرِ دکن تو نے عجب دھاک بٹھا دی
دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھا دی

اے مردِ خدا! قدرِ وفا تو نے بڑھا دی
قرباں ترے! مالک کیلئے جان لڑا دی

جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہے گا
تاریخِ دلیراں میں ترا نام رہے گا

سکندر علی وجد
بی۔اے، ایچ۔سی۔ایس

میری تصاویر

"صدر للمہام نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمایا۔ مجھے چغتائی کی تصاویر میں جو لطیف شئے نظر آتی ہے یا میرے محسوسات کو چھیڑتی ہے وہ ہماری تہذیب کے نشان ہیں۔ چغتائی نے عجمی نگارش اور مغل رنگ آمیزی سے جو اپنی دنیا آباد کی ہے وہ ہمارے فن کے مستقبل کا ایک لائحہ عمل ہے جو ہماری تہذیب کے وقار کو ہمیشہ بلند کرتا رہیگا۔"

اس ارشاد کے مطابق اگر میں یہ کہوں کہ میری یہ کوشش ہماری زندگی اور ذوق کا ثبوت ہے تو یقیناً کوئی شیخی یا تعلی نہ ہوگی۔

میری تصاویر کو مختلف نگاہیں اور مختلف نکتہ چین دیکھتے ہیں اور ہر کوئی اُن کے متعلق مختلف نظریہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ان کے متعلق پڑھا اور سنا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے یا سنا گیا ہے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو میرے لئے اتنا طمانیت بخش نہیں جس قدر وہ جمالیاتی اور فنی حیثیت سے دلچسپ ہے۔ جو کچھ میں رنگوں اور خطوں میں ترتیب دیتا ہوں اور پیش کرتا ہوں وہ قدرت کا دین اور میری فطری مجبوری ہے۔ کیونکہ ہر صناع کو چاہے وہ مصور ہو یا شاعر ان فطرتی نتائج سے مجبور ہے۔ اکثر لوگ تصاویر کو اس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں گویا وہ اُن کا عکس ہے۔ وہ ان پر اس طرح نکتہ چینی کرتے ہیں۔ جس طرح وہ گھر کی چاردیواری میں اپنے آپ پر یا اپنے بچوں پر کیا کرتے ہیں۔ وہ تصاویر کو دیکھتے وقت کسی مصور کی تخلیق نہیں سمجھتے وہ انھیں اپنی روزمرہ کی زندگی خیال کرتے ہیں۔ اور کرنا چاہیئے لیکن وہ کیوں ہمارے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتیں جب ہم انھیں اپنے جذبات سے ناپتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ مصور اپنے جذبات کا ترجمان ہے جو فطرتی مقاصد سے جذبات کو شکل وصورت دیتا ہے۔ جہاں تک مرد کامل کا تعلق ہے۔ ہر ایک یہی کہتا چلا آیا ہے۔ میں قدرت کا ترجمان ہوں اور میری تخلیق مقصود فطرت ہے میری بیوی ہیں خلق کی بھلائی ہے۔ مگر راہ سے بھٹکے ہوئے۔ سیاہ دل والے ان کا استقبال ہمیشہ پتھروں سے اور ان کا مطالعہ ہمیشہ ذاتی جذبات سے کرتے رہے۔ وہ اس بخشش سے ہمکنار نہ ہو سکے جس میں ان کے لئے اطمینان اور ہمیشہ کی زندگی تھی۔ جنہوں نے ان کے پیغام کا

استقبال خندہ پیشانی اور روشن دلی سے کیا تھا۔ خالق نے اُن کے قلب روشن اور ان کی پیشانیوں پر حیات ابدی کی مہریں ثبت کردی تھیں۔ ان کی فضیلت اور شخصیت کے آگے ہمارے سر اور دل جھک جاتے ہیں اور ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ یہ ان شخصیوں کا کرشمہ اور معجزہ ہے جو خالق کی طرف سے بھیجے گئے تھے اور ہماری فطرتوں کو اور ہمارے جذبات کو ایک نئے رنگ میں جلا دینا چاہتے تھے۔

ہر مصور اور شاعر قدرت کا پیغام بر ہے اور یہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے اور یہی اُس حسن کار کا شاہکار ہے۔

صناع چاہتا ہے کہ وہ ہمارے اندر روحانی انقلاب پیدا کرے اور ہماری روزمرہ کی زندگی کو ایک ایسی شراب سے مخمور بنادے جس کو ہمیشہ عام زندگی سے فضیلت رہی ہے۔ ہمیں ایک ایسی دنیا کی طرف لے اڑے جس کی جھلک اور روشنی سے وہ خود سرفراز کیا گیا ہے جو یقیناً اُس چلتی پھرتی دنیا اور سطحی چیزوں سے بہت بلند اور دائمی ہے۔

شاہجہاں نے جب تاج محل کی بنیاد رکھی اور اُس کو تکمیل دینے کا عزم کیا تھا۔ تو اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نازک سا جذبہ تھا۔ اسے محض اس کی ترجمانی مقصود تھی۔ اسے یہ گمان تک بھی نہ تھا کہ وہ مغلوں کی یادگار بن جائے گا یا فن تعمیر کا شاہکار کہلائے گا۔ اسے دنیا بھر کے سیاح دیکھنے کی غرض سے آئیں گے اور اس کی محبت کا ثبوت بہم پہنچائیں گے۔ اس پر کتابیں لکھی جائیں گی۔ عمارت کے نام کی تحقیق کو تلاش ہوگی یا یہ عظیم الشان تخلیق ہمیشہ رفیع المرتبت شاعر اور مصوروں کے خیالات میں وسعت اور بلندی پیدا کرتی رہے گی۔

یہ ایک تمہیدی بیان ہے۔ سب رس کے آئندہ نمبروں میں اس تمہید کی شکل وصورت واضح طور سے بیان کرسکوں گا تاکہ ایک تصویر کے ارتقا اور ایک مصور کے جذبات جن کو وہ رنگوں اور خطوں میں ملبوس کرکے زندہ جاوید بنادینا چاہتا ہے۔ صاف شفاف نظر آئیں اور تصویر خود بخود مصور کی ترجمانی کرسکے کہ وہ اسکو کہاں تک ذہنی انقلاب کیلئے ذریعہ کار بنا سکا ہے۔ وہ کیوں دنیا کو اپنے رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہے اور اسے کیوں اس قسم کے انقلاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں اس تمہید کو اعلیحضرت خسرو دکن سلطان العلوم کے ایک فرمان کے آخری فقرہ پر ختم کرتا ہوں جو حیدرآباد کے عجائب خانہ میں آویزاں ہے۔ ”یہ گھڑی جو میں اس عجائب خانہ کو بطور یادگار کے دیتا ہوں ہمیشہ نیک ساعتوں کی یاد دلاتی رہیگی“ حضور کے اس فرمان مبارک کے آخری فقرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ کہونگا کہ یہی تخلیق اور شخصیتوں کا مقصدِ حیات ہے کہ انکے کام اور پیغام ہمیشہ کسی نیک ساعت کی یاد دلاتے رہیں۔

(خان بہادر) عبدالرحمٰن چغتائی

تین سو پچاس سال پہلے کی اُردو

سلطان محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدرآباد کی دو ۲ نظمیں
(سنہ ۹۷۳ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ)

مُناجات

مناجات میرا تو سن یا سمیع　　مجھے خوش توں رکھ رات دن یا سمیع
مرے دوستاں کوں توں نت دے جنت　　مرے دشمناں کوں اگن یا سمیع
اباداں کر ملک میرا سو توں　　بسا سو توں دے میرا من یا سمیع
سکل تخت پر میرا یوں تخت کر　　انگوٹھی پہ جوں ہے نگین یا سمیع
مرا شہر لوگاں سوں معمور کر!　　رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع
مرادات کا حکم نرنگ سار قطب　　اسے سار ہت دے عنین یا سمیع

ختمِ ماہِ صیام

نس عید جلوہ گر ہو گئے دن صیام ساقی　　نو چند سے ساغراں میں بھرے مدام ساقی
زہد ریا تھے بہو دن بدنام ہو رہیا ہوں　　پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی
مستی تھے اپ صراحی کرتی تھی سرکشی نت　　کرتی ہے جام کوں اب ہر دم سلام ساقی
تیس دیس کی خماری توڑن کیے تائیں مجکوں　　کم کم نہ کر توں دم دم بھر بھر دے جام ساقی
صدقے نبیؐ قطب کوں اپڑیا ہے مے طہورا　　کوثر تھے ساغر اپڑا صدقے امام ساقی

رازِ زندگی

ہے نوائے تلخ یارب سوز و سازِ زندگی
نغمۂ شیریں سنا بربط نوازِ زندگی

منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا
آشکارا ہوگیا دم بھر میں رازِ زندگی

ہے حجابِ زیست اک پردۂ دوئی کا پھر یہ کیوں؟
جستجو طولِ امل کی بے نیازِ زندگی

اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن
شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گدازِ زندگی

انبساطِ روح ہے سرگرمیٔ ذوقِ عمل
دل کی حرکت جس طرح ہے جاں نوازِ زندگی

ہے سکونِ مرگ سے بدتر سکوتِ انجماد
سعیٔ حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی

اعتمادِ نفس و استقلال و ایثار و کرم
عرصۂ فانی میں ہے اعلیٰ طرازِ زندگی

فلسفہ ہستی کا نوشابہ بڑا دلچسپ ہے
ہے "تنازع للبقا" دراصل رازِ زندگی

نوشابہ خاتون
بی۔ اے

زندگی کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟ اس کی اصل کیا ہے؟ اور کیا وہ از سرِ نو پیدا کی جا سکتی ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو گذشتہ صدی سے اکثر لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ سائنس کے روز افزوں انکشافات اور قوی ترین خوردبینوں کی ایجاد کے باوجود آج بھی ہم اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، اور کسی ایک رائے کے قائم کرتے ہوئے رکتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کائنات کا مبدءِ حیات درحقیقت کیا ہے؟ اور وہ کون سی قوت ہے جو کروڑوں سال سے سطح زمین کو مختلف شکلوں میں تبدیل ہونے والی زندگی سے آباد کر رہی ہے اور نہ کوئی ماہر سائنس اس کا یقین دلا سکتا ہے کہ کرۂ ارض پر حیات کی ابتداء کن وجوہ کے تحت ہوئی اور وہ کیا حالات تھے جن کے زیرِ اثر غیر جاندار مادے جاندار رطوبتوں میں تبدیل ہوئے؟

اس میں شک نہیں کہ ابتداء اور اصلیت حیات کے مسئلہ پر انسان اس وقت سے غور کر رہا ہے جب عناصر پرستی اور توہمات سے اس کا نیم متمدن دماغ ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ قدیم مصریوں کے یہاں آفتاب مبدءِ حیات سمجھا جاتا تھا اور شاید "رع" (آفتاب کا دیوتا) سے زیادہ مصریوں میں کسی اور کی اس قدر پرستش نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ وادئ نیل اور خصوصیت سے ہیلی پولیس میں اُس کے شاندار مندر موجود تھے حتیٰ کہ پانچویں سلسلے کے فرعونوں نے اسے اپنا خاندانی دیوتا بنا لیا تھا۔ اسی طرح بابل و نینوا اور قرطبہ کے قدیم تمدن میں ہمیں آفتاب کی پرستش کے اشارے ملتے ہیں۔

ہندی آریاؤں کے یہاں سورج ہی جملہ توانائیوں کا منبع تھا۔ اسی لئے وہ اس کی پرستش کیا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے تمدن کی ارتقاء کے ساتھ انسان کا تخیل وسیع اور اس کی نظر دقیق ہوتی گئی اُس نے اس مسئلہ پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے اس بحث کی ابتداء کی وہ یونان کا فلسفی "تھالیس" تھا۔ یہ حکیم ۶۲۴ء ق م کے قریب ایشیائے کوچک کے شہر مائی لیٹس میں پیدا ہوا اس کے یہاں کائنات کی تمام اشیاء کا مبدا اصل پانی ہے۔ ہر ایک شئے پانی سے ابتدا کرتی ہے اور پانی میں ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مرکب کی کیمیائی ترکیب سے واقف نہ تھا اور شاید اس سیال کی رقت پذیری، توسیع پھیلاؤ اور اس کی پوشیدہ قوتوں سے اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا۔ نیز وہ خیال کرتا تھا کہ تمام غذائی مادے مرطوب ہیں۔ رطوبت، حرارت کی موجب ہے اور حرارت سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح انکزی مینس (۵۶۰ء تا ۵۱۰ء ق م) نے ہوا کو توانائی اور حیات کا اصل مصدر قرار دیا۔ اس کے یہاں ہوا کو پانی پر اس لئے ترجیح تھی کہ یہ غیر محدود اور ابدی شئے ہے برخلاف اس کے پانی کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں مختلف حکماء یونان نے یکے بعد دیگرے عناصر اور مرکبات کو زندگی کے اصل محرک ثابت کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ کے طور پر آج بھی ہمارے ادب میں عناصر اربعہ "آب - باد - خاک و آتش" کا تصور موجود ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہ کرتے ہوئے بھی کہ یہ خیالات نہایت ہی ابتدائی اور ادنے ہیں یہ ماننا پڑیگا کہ یونانیوں کے ان مباحث نے دنیا کے آگے تحقیق و تلاش کی نئی راہیں کھولدیں۔ اور رفتہ رفتہ ان ہی اثرات کے تحت دیموقرطیس (۴۶۰ تا ۳۷۰ ق م) نے اپنا وہ مشہور نظریہ جواہر پیش کیا جس پر موجودہ سائنس کا دارو مدار ہے اور ڈھائی ہزار سال کے طویل عرصہ کے بعد آج بھی اس کی توثیق ہو رہی ہے اس فلسفی کے نقطۂ نظر سے زندگی دراصل ایک مادی شئے ہے۔ اس لئے وہ پہلا حکیم ہے جو کسی غیبی قوت کے وجود سے قطعاً انکار کرتا ہے۔

شاید ایسے ہی خیالات نے گزشتہ صدی کے سائنس دانوں کو متاثر کیا اور وہ دور جہالت کی فرسودہ بحثوں سے بالکلیہ علٰحدہ ہوکر اس مسئلہ پر آزادانہ غور کرنے لگے گو ابتداء میں مذہبی طبقہ کے بڑھے ہوئے اقتدار نے انہیں اپنی اصلی رائے کے اظہار سے روکے رکھا تاہم حقیقت کو عرصہ دراز تک چھپایا بھی نہ جاسکا اور عوام میں ایسے خیالات جو زیادہ ٹھوس سائنٹفک بنیادوں پر تھے بتدریج پھیلنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ان مسائل پر دنیائے سائنس میں دو مخالف گروہ نمودار ہوگئے۔

۱- وہ جو حیات کی محرک اصل ایک غیبی قوت غریزی کے وجود کے قائل تھے۔

۲- وہ جو زندگی کو دیگر مادی اشیاء کی طرح توانائی اور مادے کا منتفقہ مظہر تسلیم کرتے تھے۔

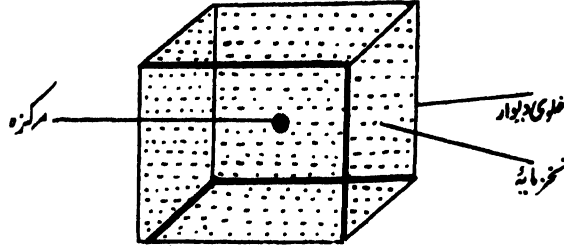
سچ پوچھئے تو گروہ اول کے یہاں کسی غیبی قوت کے وجود کا تصور ایک سہارا ہے جس پر وہ اعتراف جہل سے گھبرا کر تکیہ کرنا چاہتا ہے۔ نیز اس اعتقاد میں مظاہر زندگی کی بعض ایسی پیچیدگیوں نے بھی تقویت دی جنھیں سادہ کیمیائی اور طبعی اصولوں سے ابھی تک سمجھایا نہیں جاسکا۔ یا اگر ایسی کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ زیادہ عام فہم اور قابل قبول نہ ہوسکی۔ پھر بھی جیسا کہ آپ دیکھیں گے موجودہ سائنس کی روشنی میں ایسی خوش اعتقادی بہت دیرپا نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے افراد اب نسبتاً کم نظر آتے ہیں ہرچند ان کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۳۹ء میں شلیڈن اور شوان نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا کہ تمام پودوں اور جانوروں کی جسمی ساخت نہایت ہی خوردبین کرہ نما ساختوں سے بنی ہوئی ہے۔ ویسے ہی جنھیں آپ شہد کی مکھی کے چھتے میں دیکھتے ہیں۔ یہ خلئے ہیں اور ان پر جانداروں کی جسمی ساخت کا انحصار ہے۔

اس دریافت کے تقریباً بیس سال بعد ورشو نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہر ایک خلیہ دراصل زندگی کی اکائی ہے اور وہ فعلیات اور تشکلیات کے لحاظ سے ایک مکمل عضویہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس بحث کی مزید تفصیل سے قبل خلیہ کی ساخت اور اس کی بناوٹ کو ذہن نشین کرلیا جائے اس لئے کہ زندگی کے مختلف مظاہر کا دارو مدار بالکلیہ اسی پر ہے۔

بعد اس کی مختلف اشکال ہوتی ہیں لیکن تمثیلی خلیہ کم و بیش ایک مکعب نما ساخت ہے اور عموماً ایک سلولوزی جھلی سے گھرا ہوا ہوتا ہے

سلولوز کی کیمیائی ترکیب تقریباً وہی ہے جو معمولی کاغذ کی لیکن بعض وقت اس دیوار پر دیگر کیمیائی مادے بھی مجتمع ہو جاتے ہیں۔ خلیہ کے اندرونی مافیہ میں ایک شرج دانہ دار مایع ہوتا ہے۔ جو کم و بیش بیچ سے مشابہ ہے یہ ایک نیم شفاف جاندار شئے ہے جس کو ہم نخرمایہ یا ابتدائی جاندار مایہ کہتے ہیں اور اس کے درمیان ایک زیادہ لزج جسم مرکزہ ہے۔



ان خلیوں کی جسامت اِس قدر چھوٹی ہوتی ہے کہ اگر آپ ایک سوئی کی نوک اپنی جلد پر رکھیں تو اس کی زد میں چالیس پچاس خلئے آجائینگے اور بعض صورتوں میں تو اس سے بھی زیادہ۔ تمام جانداروں کا جسم انہی کے ترتیب وار مجموعے سے بنا ہے۔ جلد۔ عضلات۔ اعصاب۔ حتی کہ ہڈیاں بھی انہی پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح پودوں کی چھال۔ اندرونی ساختیں۔ پتے۔ پھل اور پھول سب میں یہ پھیلے ہوئے ہیں۔ البتہ باعث عمل ان کی مختلف اشکال ہو سکتی ہیں۔

خلیہ کی ساخت کے تفصیلی بیان میں سہارا دینے والی سلولوزی دیوار سے زیادہ اسکے اندرونی مافیہ زیادہ اہم ہیں۔ سب سے پہلے ہم نخرمایہ سے دو چار ہوتے ہیں۔ ہکسلے کے الفاظ میں وہ "زندگی کی طبعی بنیاد ہے"۔ یہ ایک جاندار مائع ہے جو عموماً زندہ حالت میں خلیہ کے اندر ایک خاص قسم کی موج دار حرکت کرتا رہتا ہے۔ نخرمایۂ کی یہ حرکت زندگی کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ اس میں دانہ دار خوردبینی اجسام ان رشتوں پر بہتے ہوئے نظر آسکتے ہیں جو مرکزے کو سہارا دیتے ہوئے ہوتے ہیں یا خلوی دیوار کو استر کرنے والی نخرمائی پرت میں اُن کی رفتار دیکھی جا سکتی ہے۔

تجربے شاہد ہیں کہ اس رفتار کی کمی و بیشی تپش پر ہے روسی مصنف پرنگ شائمن نے یہ بتلایا کہ شدت نور میں زیادتی رفتار میں سستی پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مہیج مثلاً میکانیتی جھٹکے تپش کی جک وقت کمی یا زیادہ۔ برقی رو وغیرہ اسکی حرکت کو کم کر دیتے ہیں۔ آکسیجن کی غیر موجودگی میں وہ مکمل طور پر رک جاتی ہے۔ لیکن اگر خلیہ مرا نہیں ہے تو ان مہیجوں کے بعد معمولی حالات کے لوٹ آنے پر دوبارہ یہ مظاہر جاری ہو سکتے ہیں۔ مزید براں اس کو الکحل، کلوروفارم وغیرہ نخرمائی زہر کے زیر اثر یہ حرکات ہمیشہ کے لئے رک جاتی ہیں اور دوبارہ عود نہیں کر سکتیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خلیہ مر جاتا ہے۔

نخرمایہ کی کیمیائی ترکیب ۔ حالیہ تحقیقات بتلاتی ہیں کہ نخرمایۂ مائع اور جلی کا ایک جسم آمیزہ ہے جس میں ہر دو اجزاء کا تناسب وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے بلند تپشوں پر وہ زیادہ جلی نما ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی تپش گرا دی جاتی ہے اگلی نسبت دوبارہ قائم ہو جاتی ہے یہ ایک بدقسمتی ہے کہ زندہ حالت میں نخرمایہ کے تجزیہ کی تمام کوششیں اب تک کامیاب نہ ہو سکیں اس لئے کہ کسی کیمیائی یا طبعی طریقے کے استعمال سے وہ زندہ باقی نہیں رہتا۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کی کیمیائی ترکیب بدل جاتی ہے چنانچہ مردہ نخرمایۂ کے کیمیائی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پروٹین پر مشتمل ہے۔ پروٹین پیچیدار ترکیب کے نامیاتی مادے ہیں۔ جن کی ساخت میں کاربن۔ ہائیڈروجن۔ نائٹروجن۔ آکسیجن اور گندھک حسب ذیل نسبت میں شامل ہوتے ہیں۔

کاربن - ۵۰ تا ۵۵ فی صد ہائڈروجن - ۶ء۵ تا ۷ء۳ فی صد نائٹروجن - ۱۵ تا ۱۷ء۶ فی صد
اکیسجن - ۱۹ تا ۲۴ فی صد گندھک - ء۳ تا ۲ء۴ فی صد

حقیقت پوچھئے تو یہ انتہا سے زیادہ اہم مرکبات ہیں اور نخزمایہ کی بناوٹ میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ اس کے علاوہ قدرت میں وہ جاندار اشیاء سے علحدہ کبھی نہیں پائے جاتے لہٰذا ان کی بناوٹ زندگی کا ایک زبردست فعل ہے پروٹین کی ساخت نہایت پیچیدہ ہوتی ہے ان کے سالمات غیر معمولی طور پر بڑے اور شاید معلومہ اشیاء سے کہیں زیادہ پر پیچ ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی ترکیب میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جواہر حصہ لیتے ہیں اس لئے ایسی ساختوں میں معمولی تبدیلیاں واقع ہونا تعجب خیز نہیں پروٹین کے علاوہ نخزمایہ کی ساخت میں دیگر عناصر کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں قابل ذکر فاسفورس۔ کلورین پٹاشیم۔ سوڈیم۔ میگنیشیم۔ کیلشیم اور لوہا ہیں۔

اس ضمن میں کیمیائی ساخت پر غور کرتے ہوے اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہئے کہ زندہ نخزمایہ کی ترکیب ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے سالمات ایک غیر متناہی تبدیل ہونے والی حالت میں ہوتے ہیں۔ ہر لمحہ بلکہ لمحہ کے سویں اور ہزارویں دفعہ میں وہ قدیم اجزاء کو خارج اور نئے مرکبات کی ترکیب کرتا ہے اس لئے بعض وقت نخزمایہ کی ساخت پر ان حالات میں کوئی قطعی رائے قائم کرنی مشکل ہوجاتی ہے۔

مرکزہ - نخزمایہ کے اندر ایک نسبتاً لزج ساخت کا جسم ہے جو ایک مرکزی جھلی سے گھرا ہوا ہوتا ہے گو بعض خلیوں میں موجود نہیں لیکن جہاں ہوتا ہے وہ خلئے کی زندگی اور مختلف عزیزی افعال کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔ خصوصاً تولید اور تغذیہ کا انحصار اسی پر ہے۔ اس کے علاوہ وہ قابل وراثت خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور نوع کا قیام اور نوعی کیفیت کا تحفظ اسی پر موقوف ہے۔ پھر بھی زندگی سے متعلقہ بحث میں مرکزے کو اس قدر اہمیت نہیں دی جاتی جتنی نخزمایہ کو۔

حیات کے بنیادی مظاہر زندگی کا اصل مفہوم سمجھنے میں کئی امور جو انفرادی اعتقادات کے باعث نمودار ہوگئے ہیں پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں ان میں سے مشہور کسی غیبی قوت کا وہ تصور ہے جس سے "ہربرٹ اسپنسر" جیسا صحیح الرائے فلسفی بھی نہ بچ سکا۔

سچ پوچھئے تو لفظ جاندار کی تعریف کرنی مشکل ہے۔ عموماً اس سے ہم ایسی اشیاء مراد لینے لگے ہیں جو مخصوص خواص کی مالک ہیں۔ لیکن کائنات کی جملہ اشیاء اپنی اپنی علحدہ خاصیتیں رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے جملہ موجودات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی جاندار اور بے جان۔

کسی شئے کی خاصیت بذاتہٖ اس کی نہیں بلکہ اس کے سالمات کی ترتیب و ساخت کی مظہر ہوتی ہے اور اسی کو ہم اس شئے سے منسوب کرنے کے عادی ہیں لہٰذا ہمارے گرد و پیش کی وہ اشیاء جو چند مخصوص خواص مثلاً تغذیہ تولید اور نمو کی حامل ہیں۔ جاندار کہلاتی ہیں۔ اور وہ جو یہ خصوصیات نہیں رکھتیں بے جان ہیں۔ اس طرح جاندار اور بے جان میں فرق محض خواص کا ہے اور "حیات" کا مبہم لفظ ہماری نظر میں اس قدر اہم نہیں جتنا کہ خوش اعتقاد فلسفیوں نے اسے بنا رکھا ہے۔ سادہ الفاظ میں جاندار نخزمایہ کے افعال اسی طرح سالمات کی مخصوص الٹ پھیر اور ان کی عاملیت سے پیدا ہوتے ہیں جیسے لوہے کی بعض ساختوں اور حالتوں میں سالمات کی ترتیب سے مقناطیسی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

ان وجوہات کے باعث مقناطیس اور حیات میں چونکہ ایک واضح مشابہت موجود ہے اس لئے یہ امر تعجب خیز ہے کہ کیوں ایک کو غیر جاندار اور دوسرے کو جاندار بیان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ محض الفاظ کا الٹ پھیر نہیں؟ یا ایسی تعریف محض اصطلاحی نہیں؟ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے جاندار بے جان مادوں کے درمیان کوئی قابل امتیاز حد فاصل قائم نہیں کی جاسکتی۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا گیا ہے محض چند مخصوص خواص کی

حامل اشیاء کا نام جاندار اور ان سے معرا کا نام ہم نے بے جان دیدیا ہے ورنہ یہ ہوسکتا ہے کہ بعض دیگر خاصتیں جو بے جان مادوں ٹھوس۔ مائع اور گیس میں موجود ہیں جاندار اشیاء میں نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کہ یہ خواص ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر مشترک ہیں۔

یہی وجہ ہوئی کہ آج تک "زندگی" کی صحیح تعریف نہیں کی جاسکتی۔ ہربرٹ اسپنسر نے اس کو یوں بیان کیا کہ "اندرونی اور بیرونی کیفیات کے مسلسل توافق کا نام زندگی ہے یا شلنگ نے اس کی اس طرح تعریف کی کہ "زندگی اصول انفرادیت ہے" یا "وہ قوت ہے جو اجزاء کو کُل میں متحد کئے ہوئے ہے" لیکن یہ توضیحات بھی محض تعریف کی حد تک ہیں ورنہ ان کے ابہام میں شبہ نہیں۔

مہندر راج سکسینہ ام اس سی

آگے

جدید ہندی نظم

پھر بس سویّم (خود) بہے بھاگے　　آگے بڑھ، آگے بڑھ آگے!
بیت گیا ہے وہ اَتیت (دنیا) تو　　کس کے لئے رکا تو
پیچھے چھوٹ گیا (ماضی) جو اس کا　　رس تو لوٹ چکا تو
پاکر نئی اَنریت نِر نتر　　نئے پاٹھ پڑھ آگے!
آگے اندھکار (اشک) تو پیچھے　　اَستاچل کی لالی
کرم کرم سے گرتی ہے اس پر　　امٹ یونیکا (شفق) کالی
پر دیکھے ہیں سبھی ورشتّے وے　　آ، رہسیّے (پردہ) بڑھ آگے!
گر گر کر ہی تو سنبھلے گا　　اٹکے گا مٹکے (پوشیدہ) گا
تبھی لگے گا تو ٹھکانے　　جب بھولے بھٹکے گا
اٹھ تو اٹھتا ہی جاوے گا　　اونچے چڑھ چڑھ آگے!
آگے بڑھ آگے بڑھ آگے!

متھلی شرن گپت
(ہندی کا شاعر اعظم)

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے

نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیل رواں میں ڈوب گئی

سمن بران فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا

وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا

دلوں میں بیٹھ گیا تیر آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

یہہ ساکنانِ فلک درد و غم کو کیا جانیں
یہہ خاکیوں کی روبیش و کم کو کیا جانیں

وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے

فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیر آہ کے مارے

یہہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریم عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

مخدوم محیّ الدین ام-اے

اُندلس کی شہزادی

[یہ افسانہ آسکروائلڈ کے ایک رومانی قصے سے لیا گیا ہے]

آج شہزادی معصومہ کی سالگرہ ہے جس کی عمر کوئی بارہ سال ہوگی۔ محل کے باغ بغیچوں میں دھوپ کھلی ہوئی ہے بڑا ہی پُر بہار دن ہے۔

کیاری کیاری پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جیسے کوئی فوج وردی پہنے کھڑی ہو۔ یہ دوسری کیاری والے گلاب کے پھولوں کو دیکھ رہے ہیں، اِترا کر کہہ رہے ہیں "دیکھو آج ہم بھی تم سے کچھ کم سج دھج میں نہیں"۔ یہ مٹکرا رغوانی تیتریوں کا جھرمٹ مچلتا ہوا ان پھولوں پر چھا گیا۔ ان کے سندر پروں پر سنہری افشاں تھی۔ یہ ایک ایک پھول کے پاس جاتیں اور انھیں چومتی تھیں۔

شہزادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ محل میں آنکھ مچولی کھیلتی تھی، کبھی بلورین گلدانوں کے پیچھے چھپتی، کبھی مرمریں مجسموں کی آڑ لیتی۔ گلدانوں میں خوشرنگ پھول کھلے تھے، مجسموں پر ہری ہری دوب اوگ آئی تھی۔

شہزادی معصومہ اور اس کی کمسن سہیلیوں پر اس وقت کچھ عجب شاہانہ پن تھا۔ بھاگتے میں یہ لڑکیاں اپنے لانبے لانبے آنچل سمیٹتی تھیں اور چاندی کی اُجلی اُجلی پنکھیوں سے جن میں نفیس سیاہ کام بنا ہوا تھا، اپنے کو چمکتے سورج کی نگاہوں سے بچالیتی تھیں۔ شہزادی سہیلیوں میں ایسی تھی جیسے تاروں میں چاند! اس کا پیرہن ہلکے سرمئی اطلس کا تھا، دامن اور چوڑی چوڑی جھالردار آستینوں پر روپہلی گجائی کا کام تھا۔ مشجر کی صدری تھی، جس پر سانچے موتی قطار در قطار ٹکے ہوئے تھے اور تو اور شہزادی کے چلنے میں اس کے لمبے پیرہن سے دو چھوٹی زیرپائیاں بھی جن پر بڑے بڑے گلابی پھول تھے جھانک جاتی تھیں۔

کھیلتے کھیلتے شہزادی شہ نشین میں آئی جو بادشاہ اور شاہی خواتین سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ شہزادی نے آتے ہی پھول پن سے بادشاہ کو مجرا دیا، اور پھر اپنی پنکھیا کی آڑ لیکر مسکرانے لگی۔ یہ اپنی ماں ملکہ بیگم کی ہو بہو تصویر تھی جو کچھ عرصہ ہوا کہ ہنس مکھ فرانس سے اندلس کے اداس چمن میں آکے مرجھا گئی تھی۔ بادشاہ نے جونہی معصومہ کو دیکھا آنکھوں سے آنسوؤں کے دو تارے ٹوٹ گئے۔

شہزادی آگے بڑھی۔ وزیر سلطنت نے دعائیں دیں۔ شہزادی نے اپنے پیارے سر کو جنبش دی اور اپنی چاہنے والی دوا کو

ساتھ لیکر سیڑھیاں اُترتی ہوئی ایک لمبے زمردیں دالان میں چلی گئی جو پائیں باغ کے ایک سرے پر ریشمی فرش سے سجا ہوا تھا۔ پیچھے پیچھے سہیلیاں بھی گئیں۔ ان میں جسے دیکھو مثالت سے بُت بنی چلی جاتی تھی۔ چلنے میں ترتیب یہ تھی کہ جس کا جتنا لمبا نام تھا وہ اتنے ہی آگے بڑھ رہی تھی!

دیکھنا! سامنے میدان میں بجاروں کی لڑائی ہو رہی ہے' کیسی عجیب ہے! شہزادی معصومہ اس سے جتنی خوش ہو کم ہے۔ ہے یہ کہ کچھ لڑکے بجاروں پر سوار ہیں جن کے رنگین فیتے ہواؤں میں لہرا رہے ہیں۔ کچھ اور لڑکے بجاروں کو سرخ سرخ جھنڈیاں دکھا کے لڑنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ لو وہ ایک بجار بپھر کے لڑکے کی طرف بڑھا' مگر مزا یہ ہے کہ یہ بجار اصلی بجار نہیں بلکہ گھاس پھوس کا بنا ہوا ہے۔ وہ دیکھو اس کے خول سے ایک امیر زادہ ہنستا ہوا نکل آیا!

پھر فرانس کے نٹوں نے تماشا کیا۔ رسیوں پر چلے اور اور بہت سے انوکھے کرتب دکھائے۔ یہ ہٹے تو اطالوی پتلیوں والے تماشہ دکھانے لگے۔ انھوں نے پتلیوں کا ایسا دلگیر کھیل دکھایا کہ شہزادی کی موتی جیسی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ یہ دیکھ کر وزیر سلطنت نے اپنے ساتھی سے کہا' دیکھو غم وہ بلا ہے کہ آدمی تو آدمی پتلیوں تک کی زندگی میں کام کر رہا ہے!

اب افریقہ کا مداری آیا۔ بانسری بجائی۔ اس کے لال ٹوکرے سے دو سانپ پھن کھولے اُبھرے' اور اس طرح جھومنے لگے جیسے پانی میں دو پودے ہلتے ہوں۔

یہ تماشہ بھی ختم ہوا۔ اب مصر کی سندریاں آئیں' آلتی پالتی مار کے حلقے میں بیٹھیں اور دھیمے سروں میں بڑے تال میل سے قانون بجایا۔ نغمے کے ساتھ ساتھ نرت بھی کرتی تھیں اور کچھ اس طرح گنگنا رہی تھیں جیسے کوئی خواب میں گاتا ہو۔ شہزادی انھیں دیکھ رہی تھی۔ ہتھیلیاں سے تھوڑی کو سہارا دیا تھا' روشن آنکھوں سے ٹکٹکی بندی ہوئی تھی گویا دو جگنو چمکتے تھے۔ شہزادی کو دیکھ کر سندریاں دل ہی دل میں کہنے لگیں کہ ایسی کامنی صورت کبھی بُرائی نہیں کر سکتی!

یہ سب کچھ ہوا' مگر ایک انوکھا تماشہ ابھی باقی تھا۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ میدان میں ایکا ایکی بونا قلا بازیاں لگاتا آتا ہے۔ ناچ میں چھوٹی چھوٹی ٹانگیں اُچھلتی ہیں جن پر بھونڈا دھڑ ہے اور ایک بڑا سر ہلتا جلتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے دیکھکر بچے بڑے سب ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ خود شہزادی بھی اتنا ہنستی ہے کہ دادا کو ٹوکنا پڑتا ہے۔ دیکھنا کیا مزے کی بات ہے' وطن میں دکھ تو اتنا ہو کہ شہزادی اپنے برابر والوں میں غم کے آنسو بہانے مگر شگفتہ اتنا بھی نہو کہ اپنے سے کم درجے والوں پر ہنسی کے دو پھول برسا سکے!

اس بونے کو لوگ عجوبہ سمجھ کے جنگل سے' شہزادی کو تماشہ دکھانے لائے تھے۔ سنا ہے اس کے ماں باپ نے اس لئے اپنے کلیجے سے اسے دور کر دیا تھا کہ یہ دنیا میں سب سے بدصورت تھا۔ کون کہے کہ اس کی یہ بدصورتی دنیا کی خوبصورتی کو اُجاگر کرنے والی تھی یا دنیا تو اس کی صورت پر ہنستی تھی' مگر اس کا دل شہزادی معصومہ کے حضور میں آکر مسرت کی کھلتی کلی بن گیا تھا۔ بونا اپنے آپے سے بے خبر تھا۔ بچے ہنستے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہنستا اور ہر ناچ کے ختم پر اس طرح خوشی خوشی سلام کرتا گویا یہ بھی ان بچوں میں سے

ایک ہے، کوئی کھلونا نہیں کہ قدرت نے دنیا کی دلگی کے لئے بنا دیا ہو!

شہزادی معصومہ کو وہ بھی اپنی شہزادی سمجھتا تھا۔ جیسے جیسے ناچتا، دل میں خیال کرتا کہ یہ سارا ناچ شہزادی کیلئے ہے۔ اتنے میں شہزادی نے کچھ تو ہنسی سے اور کچھ ددا کو چھیڑنے کے لئے اپنے جوڑے سے ایک سفید گلاب نکالا اور مسکراتے ہوئے بونے کی طرف پھینکا۔ بونے نے پھول کو سر آنکھوں پر لیا، خوشی سے آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اس بات نے گو شہزادی کے شاہانہ پن کو ٹھیس لگائی، مگر شہزادی شہزادی تھی، ہنسنے لگی اور اس کے چلے جانے پر بھی ہنستی رہی۔ یونہی ددا سے کہا کہ بونے کا ناچ پھر ہو، مگر ددا نے عرض کی کہ دھوپ تیز ہوئی، خاصے کا وقت بھی ہے، پھر دیکھئے گا۔ شہزادی اٹھی اور سہیلیوں کے ساتھ ساتھ آن بان سے چلی گئی۔

بونے نے یہ خبر سنی تو اتنا مگن ہوا کہ شاہی باغ میں ایک طرف جا نکلا اور مارے خوشی کے دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔

پھولوں نے یہ تماشا دیکھ کر کہا "بھلا، یہ بدصورت ہمارے سامنے ناچنے تھرکنے کے قابل ہے!" اس پر نرگس تنک کر بولی "موئے کو پوست کا عرق پلاؤ کہ سوئے کا سویا رہ جائے!" کیوڑے نے کہا "ہاں، دیکھو تو! کیسا گھناونا انسان ہے!! میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، میرے پاس آئے تو وہ کانٹے چبھاؤں کہ سارا تھرکنا بھول جائے!" گلاب نے کہا "ارے، اس کے پاس تو وہ پھول ہے جو میں نے صبح میں شہزادی کو تحفہ دیا تھا!" یہ کہہ کر چلانے لگا "چور! چور!" شور سن کے سفید مور اچھل پڑا۔ یہ شاخ گل پر بیٹھا دھوپ میں پر سینک رہا تھا، اور خود بھی اس طرح جھنگارا کہ مرمریں حوض کی رنگین مچھلیاں تک پانی سے سر نکال کے دیکھنے اور کہنے لگیں، "ہائیں، خیر ہے، قیامت تو نہیں آئی؟" —— مگر کچھ پرند ایسے تھے جنھوں نے بونے کو سراہا۔ ان میں بلبل تو بے اختیار ہوگئی۔ روز پھول بن میں اپنے سریلے نغمے الاپتی اور چاند کو اتنا مست بناتی تھی کہ نکلتے ڈوبتے وہ بھی نزدیک آکر اس کے گیت سنتا تھا۔ بلبل کو وہ دن بھولے نہ تھے کہ زور کے جاڑے پڑتے اور بن پر ایسی ویرانی چھا جاتی کہ گیدڑ بھی شہر کو بھاگنے لگتے تو یہ بونا اپنے آذوقے سے اس بولتی چڑیا کا پیٹ پالتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے بلبل اڑی، اس کے ساتھ اور پرند بھی اڑے اور بونے کے سر پر اڑتے ہوئے چہچہانے لگے۔ —— پھول اپنی جگہ مسکراتے رہے۔ کہا تو یہ کہا کہ "بھلے لوگ اپنی ہی جگہ بھاری ہوتے ہیں۔ مارے مارے نہیں پھرتے۔ پرند کی بھلی چلائی، جیسے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں، ویسوں ہی کو سراہتے ہیں۔" مگر بونا ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ وہ گل و بلبل کو تو دیکھ رہا تھا، لیکن دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں، اپنی اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے" —— مگر بونا شہزادی معصومہ کو یاد کرتا اور کہتا تھا "کاش میں قصر شاہی میں جاؤں، وہاں شہزادی کو اپنے کرتب دکھاؤں، اس کا جی بہلاؤں! مگر شہزادی ہے کہاں؟" یہ سوال وہ بار بار گلاب سے پوچھتا رہا مگر گلاب نے کوئی جواب نہ دیا۔

سارا محل پڑا سوتا تھا، اندر جانے کا کہیں رستہ نہ تھا۔ چوطرف زرکوبی پردے پڑے تھے۔ ہاں، ایک من چراغاں تھا کہ بونے کو رستہ دکھا رہا تھا۔ آخر ایک چور دروازے سے وہ راج محل میں پہنچ گیا، دیکھا کہ ایک شاندار دالان ہے جو دشت حیات سے بھی کشادہ ہے! اس میں ہر طرف سونے اور جواہر کا کام ہے۔ چمکدار فرش میں بھی رنگیں پتھروں کی گلکاری ہے۔ مگر شہزادی معصومہ

وہاں نہیں ہے۔ صرف مرمریں دیویاں عقیق کی لوحوں پر کھڑی بے نور آنکھوں سے گھورتی اور بے جان لبوں سے مسکراتی ہیں۔ دالان میں اس پار سیاہ مخمل کا زر دوزی ایک بڑا پردہ آویزاں ہے جس میں چاند تاروں کی افشاں کی ہوئی ہے۔ مُورکھ بُونے نے سوچا، ہو نہو شہزادی اسی پردے میں ہو! مگر شہزادی وہاں بھی نہ تھی۔

یہاں سے بونا مراقش کے بنے ہوئے نرم نرم قالینوں پر دوڑتا ہوا ایک اور دالان میں جاتا اور آواز دیتا ہے "شہزادی"! مگر شہزادی کہاں؟ سامنے ایک بھوت ہے، لنگڑا لولا، کبڑا، ڈراؤنا، بے ڈول سر والا، بڑے بڑے بالوں والا۔ اس پر بونے نے تیور بدلے، تو دیکھتا کیا ہے کہ بھوت نے بھی تیور بدلے۔ یہ ہنسا وہ بھی ہنسا۔ اس نے گھات لگائی تو اس نے بھی گھات لگائی۔ یہ اُس کی طرف بڑھا تو وہ بھی اِس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھاگ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی بھاگ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بونے نے دیکھا کہ جیسا پھول اس کے پاس ہے، ہو بہو ویسا ہی پھول اُس کے پاس ہے۔ اس نے پھول کو چوما تو اُس نے بھی چوما۔ یہ دیکھ کر بونا بہت گھبرایا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیکھا کہ ہر طرف بھوت ہی بھوت ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شفاف پانی کی طرح یہ سرو چادریں شاہی آئینہ خانہ کے آئینے تھیں جن میں وہ اپنا ہی روپ دیکھ رہا تھا!

بونا روتے ہوئے زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا۔ اس بے قراری میں اس نے شہزادی کے دئیے ہوئے پھول کو پتی پتی کر کے پھینک دیا۔ دیکھا کہ بھوت نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھ کر بونے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانک لیا، اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگے، مگر ہاتھ ہٹائے تو دیکھا کہ بھوت ابھی تک اس کی نقلیں اتار رہا ہے۔ اس پر بونا وہاں سے کھسکتا ہوا، ایک زخمی شیر کی طرح اندھیرے میں آ کر کراہنے لگا۔ اتنے میں خود شہزادی سہیلیوں کو ساتھ لئے آ گئی۔ بونا ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ یہ دیکھ کر سب قہقہے لگانے لگیں۔ شہزادی نے خوش ہو کے کہا "یہ ناچ بہت اچھا ہے" مگر بونے کی آنکھیں پتھرا گئیں، اس نے ایک آخری ہچکی لی اور موت کی نیند سو گیا!

شہزادی معصومہ نے کہا "خوب"! خاموش ہو گیا"؟ اب دوسرا ناچ دکھا، دیکھتا نہیں میں کھڑی ہوں؟" بونا اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

دوا نے جھک کر بونے کے سینے پر ہاتھ رکھا، دل کی دھڑکن دیکھی، مگر اب وہ ہمیشہ کے لئے خاموش تھا۔ شہزادی نے پھر پوچھا "آخر یہ ناچتا کیوں نہیں!"

دوا نے کہا "شہزادی! اس کا دِل مر گیا"

یہ سن کر شہزادی کے ابروُں پر بل آیا۔ خفگی سے اس کے لبوں پر شکن پڑے جیسے دھوپ میں گلاب کی پتیاں مڑتی ہیں۔ کہنے لگی "اب سے جو کوئی میرے پاس کھیلنے آئے، کہہ دو کہ اس کے پاس دل نہو!"

اتنا کہا اور بھاگتی ہوئی باغ میں چلی گئی!!

سیّد وزیر حسن

حمایت باغ میں

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر اور نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے خاص فیض یافتہ اور ان کے دبستان کے قادر الکلام استاد ہیں۔ کلامِ عزیز کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن اُن کی کوئی نظم مطبوعہ صورت میں نظر نہیں آئی تھی۔ ادارہ ”سب رس“ کی خواہش پر نواب عزیز نے اپنی ایک نظم روانہ فرمائی ہے جو ”اورنگ آباد“ کے ”حمایت باغ“ پر اُس وقت لکھی گئی تھی جب مہاراجہ سرتمین السلطنۃ بہادر نے یہ باغ اعلیٰحضرت بندگانعالی کو نذر گزرانا تھا اور حضور نے اُس کو حضرت ولی عہد بہادر کے نام نامی سے منسوب فرمایا تھا۔ (سب رس)

ہو مبارک شاہ کا آنا حمایت باغ میں
بلبلوں میں ہے یہی نغما حمایت باغ میں

خیر مقدم کے لئے نرگس کی آنکھیں منتظر!
سرو قد ہے سروِ استادا حمایت باغ میں

کہہ رہی ہے آج کچھ سوسن زبانِ حال سے!
بے زباں بھی ہو گئی گویا حمایت باغ میں

جھومتا ہے ہر روش پر بادہ خواروں کیطرح
ہر شجر پہنے ہوے گہنا حمایت باغ میں

جلوۂ رخسارِ آصف دیکھنے کو بن گئی!
چشمِ نرگس دیدۂ موسیٰ حمایت باغ میں

بٹ رہا ہے کشتیِ گل میں زرِ گل ہر طرف
بہہ رہا ہے فیض کا دریا حمایت باغ میں

جم رہا ہے بلبل و گل میں وفاداری کا رنگ
اُڑ رہا ہے عشق کا خاکا حمایت باغ میں

کہہ رہی ہے پتّے پتّے سے نسیمِ صبحدم!
دم بھرے میرا دمِ عیسیٰ حمایت باغ میں

طائرِ دل کے لئے مرغِ تصور کے لئے
سنبلِ پیچاں کا ہے پھندا حمایت باغ میں

پھول بھر کر دے رہی ہے ساغرِ گل میں نسیم؟
یہ نئی مے ہے نیا مینا حمایت باغ میں

طائرِ فکرِ معیشت کا ٹھکانا مٹ گیا!
آشیانہ ہو گیا عنقا حمایت باغ میں

یہ شگوفہ کس نے چھوڑا جو شگفتہ ہو گیا
پھول کے مانند ہر کانٹا حمایت باغ میں

انتسابِ شاہ زادہ سے لگے ہیں چار چاند
ورنہ پہلے کیا نہیں کچھ تھا حمایت باغ میں

بن پڑی قسمت سے ایسی بے بنائے بن گیا؟
سبزۂ بیگانہ بھی اپنا حمایت باغ میں

باڑ مہندی کی ہے یا یہ باڑ ہے تلوار کی؟
کٹ رہی ہے گردنِ اعدا حمایت باغ میں

ہُن برسنے کا یقیں ہے جھڑ یہ ہو بادِ خزاں
ہو اگر آنا تو یوں آنا حمایت باغ میں

خوشۂ پرویں ہے یا انگور کے خوشے عزیز
خوشہ چیں حیران ہیں کیا کیا حمایت باغ میں

دو مغالطے

ز

(۱)

میرے ایک دوست کا مرغوب مقولہ ہے کہ "بندہ بہرحال بندہ ہی ہے" اس میں کسے شک ہے لیکن اس کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ "اسی طرح عاجز و درماندہ، بے بس و بےکس جیسا کہ ہمیشہ تھا" یہ ہرگز نہیں۔ یہ کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ مغرب نے روحانی ترقی نہ کی ہو لیکن اس کی مادی ترقی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اور اسی مادی ترقی کی وجہ سے انسان کے اختیار میں بہت کچھ توسیع ہوگئی ہے۔ البتہ اگر ان کا منشاء یہ ہے کہ موت پر فتح نہیں پائی اور حادثوں کا پورا سدباب نہیں ہوگیا تو یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن ہندوستان کی غلام قوم کے سامنے اس سبق کو دہرانے سے کیا نتیجہ۔ حادثات اور موت تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ اور آج ان کی حالت چراغ رہ گزار باد سے زیادہ نہیں۔ اس طرح کی باتوں کو ان کے سامنے دہراتے رہنے کا ایک ہی نتیجہ ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ مادی علوم کو ہیچ سمجھ کر ان کی کوشش سے بالکل دست بردار ہوجائیں، اور کل کی موت کو آج ہی دعوت دے دیں۔

(۲)

ہم ہندوستانیوں میں جو یہ عام وصف نظر آتا ہے کہ آج کل ہم کو اپنی ہر چیز سے عار ہے۔ کس غیرت دار کا دل ہے کہ اس کو دیکھ کر خون نہیں ہوتا۔

اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی قوم پر

میرے ایک دوست اس کو آیت ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم کی تفسیر سمجھتے ہیں۔ انساھم انفسھم کے وہ یہ معنے لیتے ہیں کہ اپنی تمام چیزوں سے بیگانہ ہوگئے۔ اور اس کی مثالیں گناتے ہیں بیگانہ نوازی، زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کا دست نگر ہوجانا، اپنی آنکھ، کان، دل و دماغ کو اغیار کے اثرات و روایات کا تابع بنا دینا وغیرہ۔ یہ باتیں صریحاً مغربی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ان میں ایسی باتوں کو قومی غیرت

وخودداری کے منافی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو بھول نہیں بیٹھے۔ اور میرے دوست کا استدلال ہے کہ انساھم انفسھم سزا اور لازمی نتیجہ ہے نسوا اللہ کا تو کیا ان کے استدلال سے یہ لازم نہیں آتا کہ مغربی اقوام بہت باخدا ہیں یا کم از کم ہم سے تو زیادہ باخدا ہیں۔ تو کیا اس کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار ہیں۔

در اصل میرے دوست کا استدلال ایک مغالطے پر مبنی ہے۔ زید انسان ہے اور زید سیاہ فام ہے۔ ان دو باتوں سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان ہونے کا نتیجہ سیاہ فام ہونا ہے۔ دو حقیقتیں ایک ساتھ موجود ہو سکتی ہیں لیکن ضرور نہیں کہ ان میں کوئی تعلق ہو اور ان میں سے ایک علت اور دوسرا معلول ہی ہو۔ بیشک ہم آج خدا سے غافل ہیں۔ اور ہم آج اپنے آپ سے غافل ہیں لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ خدا سے غافل ہونے کا نتیجہ اپنے آپ سے غافل ہو جانا ہے۔ ہم میں یہ دو اور دوہی کیا ہزاروں عیب موجود ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ کونسی خرابی کس خرابی کی وجہ سے ہے اور کونسی کس کی وجہ سے۔ اس کے لئے بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ طوطے کی طرح یہ رٹ لگائے جانا کہ ہم نے خدا سے منہ موڑا اسلئے دنیا نے ہم سے منہ موڑا کہاں تک اس مسئلے کے حل میں مدد دے سکتا ہے۔

ضیاء الدین انصاری یم۔ اے' بی ایس سی آنرز

"ہم کو ہندوستانی (اُردو) زبان کی ترقی کے لئے اس پرانے خیال کو دل سے نکالدینا چاہیئے کہ یہ زبان فارسی یا سنسکرت سے پیدا ہوئی ہے یا وہ کسی بھاشا کا ضمیمہ ہے۔ بلکہ وہ خود ایک مستقل زبان ہے جس کے الفاظ خود اُسی کے ہیں اور جس کے قواعد خود اسی کے ہیں۔ یہ نکتہ ذہن میں نہ رہنے کے سبب ہم میں سے بعض صاحبوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ہندستانی لفظوں کی صحت اور غلطی کی پہچان' عربی' فارسی یا ہندی اور سنسکرت سے کرتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی

دو آتشہ

(۱)

دل رخصتِ آہ چاہتا ہے ... اقدامِ گناہ چاہتا ہے
اے رہروِ منزلِ محبت! ... ہر ذرّہ نگاہ چاہتا ہے
زاہد بھی کرم کا شور سُن کر ... توفیقِ گناہ چاہتا ہے
دل ضبطِ فغاں سے تنگ آ کر ... نالوں کی پناہ چاہتا ہے
ماہرؔ دلِ زار پر ترس کھا ... پتھر سے نباہ چاہتا ہے

۲

اک سانس کو آہ کر لیا ہے ... بھولے سے گناہ کر لیا ہے
پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو ... کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے
تم پر تو نہ آہ کا چلا زور ... ہاں! دل کو تباہ کر لیا ہے
دل نے تری دیکھ کر نظر کو ... اقرارِ گناہ کر لیا ہے
دیدار کی کیوں ہوس ہے ماہرؔ ... کیا دل کو نگاہ کر لیا ہے

ماہرالقادری

مذہبی اعتقادات اور درازئ عمر

اعادۂ شباب اور درازئ عمر کے متعلق ہندوستان میں لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق ام' بی' سی' ایچ' بی (ایڈنبرا) ام' ڈبلیو' ایل' ایس آر (برلن) کی علمی اور عملی کوششوں سے ارباب ملک ناواقف نہیں ہیں۔ وہ اردو کے مشہور ادیب شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی کے نواسے ہیں۔ انہوں نے اس خاص اور اہم موضوع پر نہ صرف کئی کتابیں تالیف کی ہیں بلکہ عملی تجربات کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مختلف طبی حکمی اور نفسیاتی اصولوں کے ذریعہ ضعیفی کا مقابلہ' تجدید شباب اور درازئ عمر ممکن ہے۔ ہماری خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاص موضوع کے ایک نئے پہلو پر قلم اٹھایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مختصر لیکن دلچسپ مضمون شوق سے پڑھا جائیگا۔

(سب رس)

انسان کی عمر کو کم کرنے اور اُس کو ضعیف کرنے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب انسان کا نفسیاتی اضمحلال بھی ہے۔ مستقبل کو ہمیشہ تاریک دیکھنا' مایوسی' فکر' پریشانی' خوف اور ایسے ہی دوسرے دل شکن جذبات انسان کی قوت حیات کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ بخلاف اسکے اطمینان قلب' رجائیت اور ہمیشہ امیدوں سے لبریز رہنا انسان کے دل کو قوی کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب بھی انسان کی عمر بڑھانے اور اُس کو جوان رکھنے کے اسباب میں سے ہے۔

مذہبی آدمی مشکلات کا مقابلہ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو نا امیدی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ بخلاف لامذہب آدمیوں کے جو بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔ مذہبی آدمیوں میں خودکشی کا واقعہ شاذو نادر ہی ہوا کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان لوگوں میں بیماریوں کے مقابلہ کی طاقت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمیشہ ان کو اسی بات پر یقین کامل ہوتا ہے کہ خدا ان کی مدد کرے گا۔ اور ہم نے اسی امر کا تجربہ کیا ہے کہ اس خیال سے اُن کو طبی علاج میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مذہبی خیال کے مریض کلوروفام وغیرہ کا مقابلہ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور انھیں تشویش بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے قلب کی حرکت بہت تیز نہیں ہونے پاتی۔ یہ بات بھی طرح معلوم ہے کہ دماغ کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ مذہب کا اثر دماغ پر ہوتا ہے اور دماغ کی حکومت تمام جسم پر ہوتی ہے۔

اہم

بعض مذہبی لوگ تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات کی بنا پر ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ بعض اعصابی امراض مثلاً اختناق الرحم اور عصبی کمزوری وغیرہ وغیرہ میں اس قسم کا علاج خاصکر مفید ہوتا ہے۔

مذہبی لوگ زندگی کے مصائب کا بوجوہ احسن مقابلہ کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے سائنس داں ہیں جو ایک برتر ہستی کے قائل نہیں ہیں۔ محض اس لئے کہ از روئے سائنس اسکے وجود کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچایا جا سکتا۔ لیکن بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کی ماہیت ہماری سمجھ سے باہر ہے لیکن باوجود اسکے وہ موجود ہیں اور ہم ان کے وجود پر یقین کامل رکھتے ہیں۔

حیوانی اجسام کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ نہایت دانشمندی کے ساتھ ان کے مختلف حصے تیار کئے گئے ہیں۔ پس ان کی پیدائش کا کوئی سبب ضرور ہوگا۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی چیز بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔ اور ایسا مہتم بالشان سبب ضرور کسی برتر قوت کا فعل ہوگا۔ بہت سے لوگ برتر ہستی کے وجود کو محض اسلئے نہیں مانتے کہ دنیا میں روزانہ ناانصافی اور مصائب کا بازار گرم رہتا ہے۔ لیکن قوانین فطرت اپنی روش نہیں بدل سکتے۔ ہمیں جب کوئی مرض لاحق ہوتا ہے تو وہ ہماری یا ہمارے آباؤ اجداد کی کسی خطا کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر بھی قدرت کا یہ حیرت انگیز کام ہماری نظروں کے سامنے ہے کہ ہمارے جسم میں بیماری کے مقابلہ کے لئے عجیب طریقہ سے سامان مہیا کیا گیا ہے اور ایک ہوشیار ماں کی طرح قدرت پہلے ہم کو متنبہ کر دیتی ہے کیونکہ ہمیں کوئی بیماری بلا ابتدائی علامات کے ظاہر ہوئے بغیر نہیں ہوتی۔ بدقسمتی سے یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہم قدرت کے کارناموں کی مثالیں پیش کریں کہ وہ ہمیں کس طرح ہر ممکن طریقے سے بچانے میں مصروف رہتی ہے اور اس صورت میں اگر کوئی بلا نازل ہو جاتی ہے تو اگر ہمیشہ نہیں تو بیشتر وہ ہمارے ہی غلط افعال کا نتیجہ ہوتی ہے یا نہ بھی ہو تو اسکے بعد نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہم قدرت کو ہر بات کا ذمہ دار ٹھیرا لیتے ہیں، حالانکہ یہ ہماری لاعلمی ہے۔ اس برتر ہستی کے مقابلہ میں ہمارا علم کچھ نہیں۔

لفٹننٹ کرنل محمد اشرف الحق

ام، بی، سی، ایچ، بی (اڈنبرا) ام، ڈبلیو، ایل، ایس، آر (برلن)

سکون و سکوت

رات تاریک سراپا ہے سراسر خاموش
بے خبر گوش و نظر، نور و صدا ہیں، بیہوش

نور جس طرح کہ یاد آئے کسی کو بچپن
اور صدا جیسے مسکتا ہوا گل کا دامن

موج امید کی جیسے دلِ انسانی میں
بلبلا جیسے کوئی ٹوٹ گیا پانی میں

اک تبسم کا تصور کبھی روتے روتے
آنکھ جس طرح کہ کھل جاتی ہے سوتے سوتے

لہر الہام کی جیسے دلِ پیغمبر میں
حرکت اشک کی جس طرح سے چشمِ تر میں

دھیان عزت کا کبھی عالمِ رسوائی میں
دل کی سرگوشیاں جیسے کبھی تنہائی میں

دل کی تصویر سی ہے دل مرا اس عالم میں
نہ مسرت کے اثر میں نہ فضائے غم میں

یاد ہے دل میں کسی کی نہ تمنا کوئی
روح جیسے کہ پڑی پھرتی ہے کھوئی کھوئی

یہ سکوں! اُف یہ سکوں تو مری فطرت میں نہیں
پیش خیمہ کسی طوفان کا یہ ہو نہ کہیں

علی حسنین زیبا ایم اے (ریسرچ اسکالر)

تصویر کا تعلیمی پہلو

ہندوستان میں سینما بینی کا شوق ترقی پذیر ہے۔ لیکن ابھی تک اسکے تعمیری پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عصر حاضر میں جبکہ بے کاری اور تعیش کا موقع نہیں ہے ہندوستانی فلم ساز کمپنیوں کو ایک جدید نقطۂ نظر سے ڈرامے تیار کرنے چاہئیں۔ "سب رس" وقتاً فوقتاً یہ بتانے کی کوشش کریگا کہ "سینما" کو کس طرح سماج کے لئے مفاد رساں بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی' اے (عثمانیہ) کے اس دلچسپ مضمون کو اس سلسلہ کی پہلی کڑی سمجھنا چاہئے۔

(سب رس)

چین کا ایک قدیم فلسفی کہتا ہے:— "ایک تصویر دس ہزار لفظوں کی قیمت رکھتی ہے۔

One picture is worth ten thousand words

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ:— "جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے دماغ یاد کرلیتا ہے"۔

What the eye sees the mind remembers

مشاہدہ ہی علم ہے۔

عمل جبتک نہو علم ایک جسد بے روح ہے۔ کسی قصہ کے پڑھنے میں لطف آسکتا ہے لیکن وہی قصہ اگر عملی پہلو سے نمایاں ہو اور اسکو اسٹیج کیا جائے تو دلچسپی دوبالا ہوجاتی ہے۔ فلم کے متحرک اداکار اس بے جان الفاظ کے گورکھ دھندے کو حرکت میں لاکر جاذب نظر بنادیتے ہیں۔ موسیقی کا تسلسل سامعہ کی حس میں ایک دلنشیں ہلچل ڈالدیتا ہے۔

اس عالمگیر نظریہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سینما کے فوائد اسکے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں۔ تاریخی' اصلاحی' سماجی اور اقتصادی فلم علمی دنیا کی روح رواں ہیں۔ انکے ذریعہ جہالت وگمراہی کی تاریکی کو ایک بڑی حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے ممالک کا مشاہدہ' وہاں کی طرز معاشرت تمدن' اخلاقی و معاشرتی حالت' تاریخی وجغرافیائی معلومات' غرض زندگی کے ان سب نکات کو

عملی جامہ پہنا کر ایک خوشگوار اور حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دنیا اب ایک ایسے دور سے گذر رہی ہے جس میں کوئی بات تعجب انگیز نہیں رہی۔ کوئی واقعہ عجیب و غریب نہیں معلوم ہوتا۔ ترقی کو جیسے پر لگ گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ سینما ایک عجیب سی بات تھی۔ پرانے زمانے کے لوگ سینما دیکھکر دنگ ہوئے جاتے ہیں۔ جب وہ متحرک اور بولتے فلم دیکھتے ہیں تو ان کے تعجب و حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ دنیا کی اس محیر العقول ترقی پر وہ محو حیرت ہو جاتے ہیں۔

انسان متجسس ہے کائنات کے علم کو معلوم کرنے کیلئے۔ چنانچہ انسانی تخیلات کی کسی مہم کو سر کرنے یا کسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے جذبات کو سینما کے پردوں پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے۔ سینما میں ایک طلسم چھپا ہوا ہے جس سے ان قوتوں کو ابھارا جاتا ہے۔ انسان کے دل کا یہ جوش کہ اپنے آپ کو ڈھونڈھے اور دنیا کو ڈھونڈ نکالے سینما بینی کے ذریعہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اخلاقی جرأت، شجاعت، ہمدردی، پاس ناموس، ایثار نفس، وطن پرستی، صبر و استقلال، خودداری، اطاعت، جذبۂ محبت، آئین وفا، ایفائے عہد غرض بیسیوں جذبات کا مرقع سینمائی پردوں پر رونما ہو کر انسان کی مردہ قوتوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ یہ زندگی کے کردار کی گوناگوں تمثیل اسکے کیرکٹر میں ایک خوش آئند انقلاب پیدا کر دیتی ہے اسکی سوئی ہوئی حس جاگ اٹھتی ہے۔ سینما ہی کے ذریعہ قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ تعلیمی فلم اور بالخصوص ایسے فلم جن میں اخلاقی اور اصلاحی پہلو مضمر ہوں آسمانی رحمتیں ہیں۔

الفاظ کی الٹ پلٹ کو جن میں جان نہ تھی کتابوں میں پڑھا تھا، رسائل میں جن کا سرسری مطالعہ کیا تھا۔ جن کے نقوش صفحۂ دل سے مٹ چکے تھے، ان کو جب عملی حیثیت سے ہم رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہی نقوش صفحۂ قلب پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے۔ شیکسپیر کے کسی مشہور ڈرامے ہی کو لیجیے۔ ہزار بار پڑھئے پھر وہ ذہن سے ایسا غائب ہوتا ہے کہ گویا کبھی پڑھا ہی نہ تھا۔ لیکن اسی ڈرامے کو کبھی اسٹیج پر دیکھ لیجئے یا کسی کی زندگی کی تصویر کو اس سے ملتا جلتا دیکھئے تو شاید عمر بھر نہ بھولئے گا۔ یہ برکتیں ہیں **action in thinks** کی۔ مگر سینما اس طرز کا ہو کہ اسکے دیکھنے سے آنکھ کھلے اور دل جاگ اٹھے۔ تماشہ کے نقوش دل پر اس طرح پڑیں کہ گویا اپنی ہی بیتا ہے۔ پر بیتی آپ بیتی کا مزہ دینے لگے۔ یہ تماشہ کی قوت ہے اور یہی اس کا جادو ہے۔

فی زمانہ انسان اپنے فطری اخلاق سے بہت دور ہٹ گیا ہے۔ بعض طبائع ایسے ہیں کہ ان پر سینما کا اخلاقی، اصلاحی، تعلیمی، سماجی اور معاشرتی پہلو بھی کچھ اثر نہیں کرتا۔ وہ جیسے ٹھنڈے لوہے ہیں یا پتھر جن میں جونک نہیں لگتی۔ اور بعض تو اتنے ذی حس اور اثر پذیر ہوتے ہیں کہ انکی زندگی میں تمثیل نگاری ایک نمایاں ہل چل ڈال دیتی ہے۔ انکے روزمرہ میں ایک زبردست ہیجان ہونے لگتا ہے اور انکی زندگی بتدریج سنورنے لگتی ہے۔ واقعی حیات انسانی گوناگوں دل فریبیوں اور دلچسپیوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اور اسی تصویر کو جب سینما اپنی جادونگاریوں سے طلسم ہوشربا بنادے تو پھر دیکھنے والے کیوں کر متاثر نہوں!!

ابتدائے آفرینش سے تعلیمی ترقی کی حدتک میدان مشاہدہ کے ہاتھ رہا۔ دنیا جب اپنے گہوارے میں جھول رہی تھی۔ ارتقائے تمدن کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ انسان زندگی کو سمجھنا چاہتا تھا اور سمجھ نہ سکتا تھا۔ حیات کا پیچیدہ مسئلہ اس سے حل نہ ہو سکتا تھا۔ فلسفۂ کائنات کی گتھی اس سے کسی عنوان نہ سلجھتی تھی جب اسکے لئے "دنیا حادث ہے۔ چنانچہ فانی ہے۔ ہر وہ چیز جو حادث ہے فنا ہونے والی ہے!" کے منطقی لاینحل نظریہ میں گم تھی۔ اسکے نزدیک علم ایک الفاظ سے بھری ہوی دکان تھی۔ جس کی گرمی بازار کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ تلاش اور جستجو کی حس اس سے زائل نہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ مضطرب تھا۔ بےچین تھا۔ پریشان و سرگردان تھا۔ رفتہ رفتہ سائنس نے اسکی قوتوں کو ابھارا زندگی کا میدان صرف Explain universe in words ہی نہ تھا بلکہ Life in action کے ہیجان نے اسکی نیندیں حرام کردی تھیں۔ یہ چشم تصور کا دہوکہ اسٹیج کے پردے پر اپنی نمائش کرنے لگا۔ اور دنیا نے سائنس کا لوہا مان لیا۔ تاریخ کے ذریعہ واقعات کا سمجھنا اور یقین کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ جسکے سیاہ و سفید میں حیات کے ارتعاش، واقعات کی فراوانیوں کا ایک دھندلا سا عکس ہوتا ہے۔ ان پردرد خونین واقعات کا منظر ہماری نظروں کے سامنے دو چار سطروں میں آجاتا تھا۔ اور بس۔ خواہ آپ اسکو پڑھ کر بھول جائیے یا سر دھنئے۔ لیکن ــ سینمائی دنیا نے اس کو اتنا واضح کردیا کہ دل بے اختیار اسکی حقیقت پر ایمان لے آیا۔ حقیقت کا علم متحرک یا غیر متحرک تصویروں کے ذریعہ کچھ ایسا نقش بنکر جم گیا کہ مٹائے نہ مٹ سکا۔ متمدن ممالک کا طرۂ امتیاز آج کل سینما ہے۔ اور وہاں فلم لائبریری قرار دئے جارہے ہیں۔ مغربی متمدن ممالک میں کچھ عرصہ سے یہ محسوس کرلیا گیا ہے کہ حقیقی تعلیم خاموش کتابوں سے نہیں دیجاسکتی۔ بلکہ "عینی مشاہدہ" تکمیل علم کا ایک نمایاں و درخشاں پہلو ہے۔ جس کے بغیر تعلیم کا منشاء ادھورا رہا جاتا ہے۔

آثار قدیمہ، غاروں اور پتھروں کے دھندلے نقش و نگار، پھر جغرافیائی نقشے، Charts .... طلسمی قنادیل، خاموش، اور پھر گویا فلم یہ ہے سائنس کی علمی و تدریجی ترقی ــ!

سینما کی زندگی مصنوعی ہے۔ لیکن اسکو زندگی نما (Life like) بنایا جاسکتا ہے۔ اور مغربی فلم نے نقل کو اصل کے برابر پیش کرنے میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن ہندوستانی فلم کمپنیوں کے مظاہرے ابھی اس فن سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ان میں تصنع کا عنصر غالب ہے۔ اداکاری میں فطری جھلک ابھی ناپید ہے۔ بلکہ انکا ہر کردار مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ بعض واقعات اتنے غیر فطری ہوتے ہیں کہ فلم کا حسن سلب ہوجاتا ہے۔ صرف آنکھیں ان کو دیکھتی ہیں۔ مگر دل اثر پذیر

ہونے سے پس وپیش کرتا ہے۔ بعض واقعات تو اتنے غیر مانوس اور طویل ہوتے ہیں۔ کہ طبیعت گھبرا اٹھتی ہے۔ فلم کے غیر ضروری تسلسل سے جی اکتانے لگتا ہے۔ مثلاً بستر مرگ پر بھی نغمہ سرائی۔ ہر سوال کا جواب ایک غزل یا گیت سے' ایک ہی قسم کا لباس شروع فلم سے آخری پردہ تک بچوں کے منہ سے موٹی موٹی باتیں کہ عقل دنگ رہ جائے' کسی دل ہلا دینے والے واقعہ کو سن کر ایک ایسا اچنبا کہ گویا اسکا پہلے ہی سے علم تھا۔ یا آنے والے فلم کے بیسوں پردے جن کو دیکھنے کے چکر میں اصل فلم کا مفہوم ہی فوت ہوجائے۔ یہ ہے کل کائنات آج کل کے ہندوستانی فلم کی۔

مغربی فلم کا مقابلہ ہندوستانی فلم سے کیجئے۔ تو آسمان وزمین کا فرق معلوم ہوگا۔ مثلاً بچوں کیلئے وہاں خصوصیت سے فلم بنائے جاتے ہیں۔ جن میں اخلاقی وعلمی پہلو کے ساتھ زندگی کے اس سنہری زمانہ کی خوش فعلیاں مختلف پیرایہ میں رونما کی جاتی ہیں جن سے بچے تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی درس بھی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی فلم سازوں نے اس نکتہ پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ یا جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہیں۔ یا شاید ان کے لئے فلم کو غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس طرف انکی توجہ مبذول ہی نہیں ہوتی کہ بچے آخر کیسے فلم دیکھیں۔ ان کے نازک اور ذی حس دماغ کس قسم کے واقعات کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے بنے ہیں۔ ہندوستانی فلم کا مطمح نظر صرف عاشقانہ خرافات سے مملو ہے۔ اور اسی جذبہ کو ان میں زیادہ ابھارنے کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے جس سے قوم اور پبلک کا دماغ ماؤف ہوچلا ہے۔ اور شاید اسکی اصلاح میں ابھی کئی برس باقی ہیں۔

جہاں بانو بیگم (بی ۔ اے)

بکھرے ہوئے پھول

(۱) انسان کی بقا عمل پر ہے نہ کہ تخیل پر اگرچہ وہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو (کارلائل)

(۲) غصہ کی آگ کو بھڑکانا گویا دوسروں کے قصور کا اپنے سے بدلہ لینا ہے (پوپ)

(۳) اعتدال ہی ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے حقیقی مسرت کے فوارے نکلتے ہیں (گوئٹے)

(۴) عالم بے عمل کی مثال ایک اندھے مشعلچی کی سی ہے جو خود تو ہدایت یافتہ نہیں ہوتا لیکن دوسرے اس سے ہدایت پاتے ہیں (سعدیؒ)

(۵) ماضی کا افسوس اور مستقبل کی فکر نہ کرو بلکہ حال کو درخشاں بنانے کی کوشش کرو (امجد)

(مترجمہ خواجہ حمید الدین)

سالِ نو

نیا دن ہے، نئے انداز سے محفل میں جام آئے
کہ ساغر کی کھنک میں ذوقِ مستی کا پیام آئے

مرے پاس آ کہ پھر دل میں، نئی امید پیدا ہو
شکستِ توبہ بھی ہم رنگِ تجدیدِ تمنّا ہو

مری افسردگی چھپ جائے ہونٹوں کے تبسم میں
سکوتِ زندگانی جذب ہو جائے ترنم میں

رگوں میں خون کے بدلے، مئے دو آتشہ بھر دے
صدائے زندگانی کو حدیثِ رنگ و بو کر دے

خزاں نا آشنائی ہو، بہارِ نوجوانی میں
حیاتِ جاودانی کے مزے ہوں زندگانی میں

مجھے لے جائے منزل ہی کی جانب لغزشِ پا بھی
کہ بے ہوشی کے پردے میں رہے ہوشِ تمنا بھی

اٹھا ساغر کہ پھر بابِ تمنا باز ہے ساقی
اٹھا ساغر کہ دنیا کا نیا انداز ہے ساقی

میکش

ایک "پیسہ"

سڑک پر میوہ بیچنے والے کی گاڑی کتنی جاذب نظر اور دلکش ہوتی ہے۔ کتنے سلیقہ سے وہ ہر میوہ کو جماتا ہے۔ کیا مجال جو کسی میوہ کا داغدار یا سڑا ہوا حصہ دکھائی دے۔ طبیعت خواہ مخواہ خریدنا چاہتی ہے۔ اور ان میووٴں کی تازگی کو دیکھکر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میوے غیر معمولی طور پر نفیس اور خوش رنگ ہیں۔ تھوڑی سی تکرار کے بعد میں نے دو سیب خرید لئے اور آگے بڑھنے کے خیال سے پلٹا ہی تھا کہ دو بچے چھ اور آٹھ برس کی عمر کے نہایت شوق اور تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے ان کے انداز کو دیکھکر یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ ساری گاڑی کو خریدے بغیر نہ مانیں گے۔ میں ٹھہر گیا تاکہ دیکھوں یہ سودا چکانے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ دونوں میں تھوڑی دیر رد و قدح ہوتی رہی اور طے یہ پایا کہ سودا بڑا لڑکا ہی چکائے گا۔ اس خریدار نے پہلے تو سیب کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور ایک سیب کے داغدار حصے کو میوہ فروش کی طرف پھیر کر پوچھا "اسکی کیا قیمت ہے؟" دکاندار نے ایک انداز تمسخر سے انکی طرف دیکھا اور چپ ہو رہا۔ کیونکہ وہ ان خریداروں کی کٹ حجتی سے خوب واقف تھا۔ سیب رکھدیا گیا۔ پھر ان دونوں نے ساری گاڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شاید انہوں نے دکاندار کی خاموشی سے سیب کے بکاوٴ نہ ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چھوٹے لڑکے نے سیب کی خریداری میں ایک نیا عذر پیش کیا۔

"میں سیب نہیں کھاوٴنگا۔ مجھے بخار آ رہا ہے" جس پر بڑے لڑکے نے جو ابتک ایک انگور کے خوشہ پر حریص نگاہیں جمائے ہوئے تھا کہا "تو پھر انگور ہی لے لیں" اور انگوروں کے بابت بھی ویسا ہی معصومانہ سوال کیا "پیسے میں کتنے انگور؟" ایک دکاندار کو برافروختہ کرنے کیلئے یہ سوال بہت کافی تھا۔ اس نے جھڑکی کے انداز میں انکو چلے جانے کیلئے کہا۔ وہ شاید اس پر تعجب کر رہے ہوں گے کہ ان کے پاس پیسہ موجود تھا تو پھر اسکو انگوروں کے دینے میں عذر کیوں ہو۔ ایک پیسہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ اسکو انہوں نے کتنے انتظار کے بعد اور کتنی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ انہوں نے کتنی دفعہ کہا تھا کہ "اماں ایک پیسہ دو.... اچھی اماں

ایک پیسہ دو" لیکن میوہ فروش کو اسکی کیا خبر تھی۔ میوہ فروش نے میووں پر سے دھول جھٹکی اور ان کو پرے ہٹا دیا۔ دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ سیب اور انگور نہیں خریدیں گے۔ بڑے لڑکے نے کہا "بہت خراب ہیں سیب' اور انگور بھی سڑے ہوئے ہیں۔ میں انھیں کبھی نہ کھاؤنگا" چھوٹے لڑکے نے پیسہ کو جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ایک آخری کوشش کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ایک پیسہ میں ایک چھوٹا سا سیب اور چند انگور کے دانے ملجائیں تو وہ پیسہ دینے پر راضی ہیں۔ میوہ فروش نے آنکھیں نکال کر ایک زور کی ڈانٹ بتائی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ چھوٹے لڑکے نے شکایت آمیز انداز میں کہا "تم نے اپنا پیسہ کیا کیا اب میں تو تمھیں حصہ نہ دونگا" بڑے لڑکے نے نہایت ملائمت سے اور ہنستے ہوئے کہا "وہ تو گم ہوگیا۔ چنے والے کی دوکان پر" اور چھوٹے بھائی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کسی دوسری دکان کا رخ کرنا چاہا جہاں ان کو اس چیز کے سستے داموں ملنے کی امید تھی۔ میں ابتک خاموش کھڑا ان کی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے میوہ فروش سے کہا "دیدو کچھ بھی۔" اس طریقہ سے دکانداری نہیں چلتی صاحب" میں نے اپنے جیب سے دو چار پیسے نکالے اور اسکے حوالے کر دیئے۔ اس نے اپنے ان دو ننھے خریداروں کو آواز دی وہ بھاگتے ہوئے آموجود ہوئے۔ میوہ فروش نے ان سے پیسہ لے لیا اور ایک سیب ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ انہوں نے سیب کو ہیر پھیر کر دیکھا۔ دو تین سیب اور بھی دیکھے اور ایک بڑے سیب کو دونوں نے پسند کیا۔ سیب چھوٹے لڑکے ہی کے ہاتھ میں رہا۔ بڑے لڑکے نے اپنی پتنگ دینے کا پختہ وعدہ کیا۔ اور کہا کہ وہ آئندہ کبھی اسے نہ ستائیگا۔ اور کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب تو تمھارا بخار بھی اتر جائے گا" جس پر چھوٹے لڑکے نے منہ بسورتے ہوئے کہا "مگر وہ انگور ..." بڑے لڑکے نے تیوری چڑھائی۔ اسے یقین تھا کہ سودا بہت سستا ہوا ہے اور قبل اسکے کہ میوہ فروش کو اس کا علم ہو انہیں بہت دور پہونچ جانا چاہیے اس نے اس کو گاڑی سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا "یہ انگور کھٹے ہیں۔ ان سے کھانسی ہوتی ہے۔ چلو۔ چلو۔ سیب کو ہوا لگ رہی ہے۔ لاؤ اسے میں اپنی جیب میں رکھ لیتا ہوں" چھوٹے لڑکے نے سیب کو دینے سے قطعی نارضامندی ظاہر کی۔ اور اس کو اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے اپنے بھائی سے آگے آگے نکل چلا۔ کیونکہ بڑے بھائی نے اس کو اپنے ساتھ چلنے سے منع کر دیا تھا۔

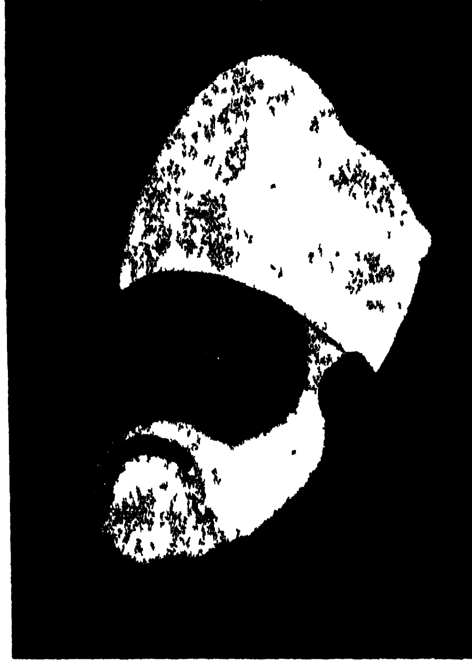
مجھے اپنا بچپن یاد آرہا تھا۔ ہر بیمار کے ساتھ میرا خود بیمار ہو جانا اور پرہیزی چیزوں میں شریک ہو جانا میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ میں نے دونوں لڑکوں کو گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا اور اپنی راہ لی۔ دو تین روز بعد پھر اس میوہ فروش سے ملاقات ہوئی۔ کہہ رہا تھا کہ وہی بچے دوبارہ آئے تھے اور خوب بحث کی اور خالی ہاتھ واپس گئے۔ اس دفعہ انکے دوست احباب بھی ساتھ تھے۔ اور ہر ایک کے پاس ایک ایک پیسہ تھا۔

میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ اور سیب لیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

عبدالرشید قریشی

اردو کے پہلے پروفیسر

سید وحید الدین سلیم مرحوم



اے مطلع عثمانیہ کالج کے ستارو — ہمت نہ کبھی علم کی تحصیل میں ہارو
بھائی ہو تم آپس میں نہ بھولو یہ سبق تم — گویا، کہ ہو بس ایک صحیفہ کے ورق تم
اقرار وفا کر کے مکرنا نہ خبردار — تسبیح کے دانے ہو بکھرنا نہ خبردار
تقریر جو کرنا تو دل آزار نہ کرنا — تلوار کا بھائی پہ کبھی وار نہ کرنا
تھے علم میں مشہور جو اسلاف تمہارے — وہ عالم بالا سے یہ کرتے ہیں اشارے

چمکے گی اسی علم سے تقدیر تمہاری
یہ ملک تمہاری ہے یہ جاگیر تمہاری

"سلیم"

مکتوباتِ سلیم

مولانا وحید الدین سلیم، اردو کے مخلص خدمت گزار تھے، ان کی قابلیت، وسعت نظر، اور جوش عمل نے اردو کے خط و خال میں بہت دل آویز رنگ کاری کی ہے۔ انہوں نے زبان کو وسعت دینے کی طرف خاص توجہ کی اور نئے نئے الفاظ کے اضافہ سے اس کے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا۔ مرحوم آخری وقت میں اردو زبان میں شعر بھی کہنے لگے تھے، ان کے کلام میں رجائیت اور جوش کا عنصر غالب ہے۔ "ادارۂ ادبیات اردو" کا ارادہ ہے کہ مرحوم کی خدمات کا خراج تحسین ادا کرنے کے لئے ان کے تمام غیر مطبوعہ علمی سرمائے کو شائع کرے۔ "سب رس" میں ان کے خطوط کا یہ سلسلہ اس زنجیرہ کی پہلی کڑی ہے۔ امید ہے کہ وہ حضرات جن کے یہاں پروفیسر سلیم مرحوم کے خطوط ہوں دفتر "سب رس" پر ان کی نقلیں یا اصل خطوط ارسال فرما کر شکر گزار کریں گے۔

"سب رس"

بنام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

عزیز محترم۔ آج مارچ ۳۶ء کو عزیزی سوری نے ایک کلنڈر آپ کی طرف سے مجھے لا کر دیا۔ آج ہی ڈاک جانے کا دن ہے۔ اس لئے آج ہی خط لکھ کر اس کلنڈر کا نہیں بلکہ آپ کی دلی محبت اور سعادت مندی اور شرافت کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ مجھے نہیں بھولے حالانکہ آج کل کالجوں کے شاگرد استادوں کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔ پاس ہو کر ان سے دور ہو جاتے ہیں۔ تم سید ہو اور میں بھی سید ہونے کا مدعی ہوں۔ لازم ہے کہ تم میں شرافت کا جوہر موجود ہو۔ شرافت کا ادنی جوہر یہ ہے کہ ادنی احسان کو بھی کبھی فراموش نہ کرے۔ یقین ہے کہ یہ جوہر کبھی تمہاری ذات سے ناپید نہ ہوگا۔ ساری عمر سید ہی جیو گے اور سید ہی مروگے۔

عزیزی سوری نے یہ کلنڈر دیر سے دیا۔ اس کا سبب یہ کہ جنوری میں ان کے پاس پہنچا تھا۔ میں جنوری میں سول ہاسپٹل سکندرآباد میں

زیر علاج تھا۔ مکان مقفل پڑا تھا۔ آئے ہوں گے اور چلے گئے ہوں گے۔ مجبوراً جنوری اور فروری کا تاریخنامہ کاٹ کر مارچ کا تاریخنامہ سامنے دیوار پر لگا لیا۔ اب دس مہینے تک برابر سامنے رہو گے۔ ہر وقت یاد آؤ گے کبھی فراموش نہ ہو گے جب ادھر دیکھوں گا تمھارے لئے مسرت اور کامیابی کی دعا کروں گا۔ واہ کیا تحفہ ہے۔ تحفہ ہو تو ایسا ہو۔ جو ہمیشہ بھیجنے والے کو یاد دلاتا رہے۔

اب اپنی بیماری کا حال لکھتا ہوں۔ چار مہینے ہوئے کہ دانتوں میں پائریا کی شکایت ہوئی۔ دانتوں میں درد ہونے لگا۔ دانتوں سے پیپ آنے لگی۔ ڈاڑھوں میں درد رہنے لگا۔ پہلے اسی شکایت کے سبب گیارہ بارہ دانت اکھڑوائے جا چکے تھے۔ اب ارادہ ہوا کہ سب باقی دانت اکھڑوا دئے جائیں اور مصنوعی دانت بنوالئے جائیں چنانچہ سب دانت اکھڑوا دئے گئے۔ بعض دانتوں کے اکھڑنے میں دانت کے ٹکڑے باقی رہ گئے۔ انہوں نے سخت تکلیف دی۔ کلورافارم دے کر وہ ٹکڑے نکالے گئے۔ مدت میں ان کے زخم اچھے ہوئے مگر بائیں طرف دونوں جبڑوں کے درمیان ایک زخم ایسا ہٹیلا ثابت ہوا کہ آج تک اچھا نہیں ہوا۔ اسکے سبب مونھ اچھی طرح نہیں کھلتا۔ کھانے کی چیز نہیں کھا سکتا۔ صرف پینے کی چیز پی سکتا ہوں۔ اس زخم کا درد بھی کان اور آنکھ تک پہنچتا ہے۔ غرارے کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ زخم اچھا نہیں ہوتا۔ نہ اس سے پیپ آنی بند ہوتی ہے۔ مقام ایسا نازک ہے کہ ڈاکٹروں کی رائے میں یہاں آپریشن نہیں ہو سکتا۔ پھر زخم اچھا ہو تو کیوں کر۔ بعض نے رائے دی ہے کہ رانچی (بنگال) میں ریڈیم انسٹیٹوٹ ہے وہاں ایسے امراض کا علاج ریڈیم کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ تم بھی اس زخم کا علاج وہیں کراؤ۔ میں نے رانچی کو خط لکھا ہے۔ انسٹیٹوٹ کے قواعد منگائے ہیں جب وہ قواعد آجائیں گے تو یہاں کے انگریز ڈاکٹروں سے رائے لوں گا۔ پھر لکھنؤ جا کر میڈیکل کالج کے انگریز ڈاکٹروں سے مشورہ کروں گا۔ اگر ان کی رائے ہوئی تو میں رانچی چلا جاؤنگا اور اس طرح سے اس زخم کا علاج کروں گا۔ زیادہ دعا۔ اپنی تعلیم کے اور دیگر ضروری حالات سے مطلع کرو۔

میں ہوں تمھاری یاد آوری کا دلدادہ اور ممنون

وحید الدین سلیم

کرشنا منزل۔ چراغ علی کی گلی

حیدرآباد دکن

22/3/29

بنام مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

عزیز از جان۔

تمھارے تین کارڈ ایک ساتھ ملے، میں دیر سے پانی پت پہنچا اس لئے جواب نہ دے سکا امید ہے کہ تم معاف کرو گے، بعض کامیاب شدہ طلبہ کے نام تمھارے خط سے معلوم ہوئے مگر پورا نتیجہ پانی پت میں نہ ہونے کے سبب مجھے نہ مل سکا، اگر ممکن ہو تو صحیفہ کا وہ پرچہ جس میں نتیجۂ امتحان شائع ہوا ہے میرے پاس بھیجدو۔ میں تمھارے لئے ہر وقت دست بدعا ہوں، اللہ تعالیٰ تمھیں اور تمھارے تمام عزیزوں کو خیر و عافیت کے ساتھ رکھے یہاں گرمی شدید ہے۔ اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے اور ضروری حالات سے خبردار کرتے رہو والسلام۔

وحید الدین سلیم

از پانی پت 21 - 6 - 11

بنام مولوی محمد عبد القادر سروری صاحب

عزیزی۔

پرسوں تیسرا اپلیکیشن ہوا چھ سات روز کے بعد اس کا اثر معلوم ہوگا ابھی حالت بدستور ہے۔

میں جب رخصت بیماری کا بند و بست کرنے پرنسپل صاحب کے پاس گیا تھا تو میرے ہی مشورہ سے آپ کا تقرر ہوا تھا اس لئے مجھے وہیں سے معلوم تھا۔

تمہاری بیوی کے بے وقت انتقال کا نہایت رنج ہے۔ اللہ اس کا نعم البدل دے۔

وحید الدین سلیم
از رانچی
26/5/28

عقل و دل

ڈاکٹر امیر علی خاں ہاشم پی ایچ ڈی۔ کی توجہ اگرچہ شاعری کی طرف مرکوز نہیں ہے تاہم جب کبھی ان کی طبیعت موزوں ہوتی ہے تو ان کے افکار نظم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ذیل کی نظم اگرچہ طویل ہے لیکن اس میں قوت تفکر کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے اپنا دلچسپ اور مفید قلمی مقالہ جس کا عنوان "مملکت حیدرآباد کے سماجی تغیرات ہے" "سب رس" کو اس غرض سے عنایت کیا ہے کہ اس کے بعض حصے شائع کئے جائیں۔ آئندہ شمارہ میں ہم اس مقالہ سے اخذ کر کے ایک دلچسپ مضمون شائع کرینگے۔ (سب رس)

اک شب کو نیند سے جو میں بے ساختہ اٹھا
چکر سا میرے سر میں تھا سینہ میں درد تھا
کچھ چپکے چپکے باتوں کی آنے لگی صدا
دیکھا اِدھر اُدھر تو نہ کوئی نظر پڑا

سوچا جو تھوڑی دیر تو معلوم یہ ہوا
میرا ہی دل، دماغ سے تھا میرے کہہ رہا

کیا سو رہا ہے اٹھ بھی بہت نیند لے چکا
حالت کو میری دیکھ، مری داد دے ذرا
یکساں تڑپ رہا ہوں بہت حال ہے بُرا
ہے ابتدا نہ کوئی، نہ ہے کوئی انتہا

ارمان تو بہت ہیں مگر حوصلہ ہے کم
کس طرح اپنے چین کا ساماں کروں بہم

میں چاہتا ہوں زیست کا ہر دم مزا چکھوں / فرطِ نشاط و رنج و الم کچھ نہ کچھ سہوں
پھولوں سے ہم کلام ہوں، یا شمع پر جلوں / لحظہ بہ لحظہ حق کی طرف اک قدم بڑھوں
جس طرح دن گزرتے ہیں ساماں بڑھتے ہیں
کیا یوں ہی ذی نفس سبقِ عشق پڑھتے ہیں

سن کر اسے دماغ نے کچھ سوچ کر کہا / اے دل خدا کے واسطے مجھکو نہ تو ستا
میں اپنی رائے تجھکو کئی بار دے چکا / لیکن کبھی نہ تو نے مری بات کو سنا
کیوں اس طرح خراب تو کرتا ہے اپنا حال
ناداں چل کبھی تو سلامت روی کی چال

دنیا میں حلم ہی سے نکلتا ہے سارا کام / ہوتے ہیں صبر ہی سے یہاں لوگ نیک نام
عجلت نہ کر کہ یہ نہیں تعجیل کا مقام / مجبور ہیں زمانہ کی گردش سے خاص و عام
کم سن ہے تو ابھی تجھے دنیا ہے دیکھنا
دیکھا ہی کیا ہے اور تجھے کیا کیا ہے دیکھنا

دنیا کی چال ڈھال کو، چالاکیوں کو دیکھ / رنگ شفق کو چرخ کی سفاکیوں کو دیکھ
گل کو چمن کو حسن کی بیباکیوں کو دیکھ / جو ہیں ملائکہ صفت اُن خاکیوں کو دیکھ
حسن و جمال دہر کی جاتی بہار ہے
قیمت ہر ایک چیز کی ناپائدار ہے

کیوں ایک ہی حسین پہ ہوتا ہے تو نثار / کیا حسن کے صفات نہیں تجھ پہ آشکار
ہے یہ تو ایسی چیز کہ جس کو نہیں قرار / اس گل پہ ہے جو آج، تو کل اُس پہ ہے بہار
باغِ جہاں میں بلبلِ شیدا کی چال چل
آج اس کلی کو دیکھ تو کر اس کو پیار کل

قصے ہی ہیں یہ عاشق و معشوق کے تمام   یاں شاعروں نے دی ہے تخیل ہی کو لگام
دیوانوں نے بنایا ہے دیوانوں کو امام   لیتا و گرنہ لیلی و مجنوں کا کون نام

سمجھا ہے تو کہ عشق سراپا خمار ہے
نادان اس شراب کا نشہ اتار ہے

تو چاہتا ہے ساری حقیقت کو جان لوں   وجہ وجود باعث خلقت کو جان لوں
اور سب تو سب تو چاہے ہے وحدت کو جان لوں   معنیٔ سجدہ، اصل عبادت کو جان لوں

کافی نہیں ہیں کیا تجھے دنیا کے مسئلے
جو چاہتا ہے حل کرے عقبیٰ کے مسئلے

نادان اپنے آپ کو بہر خدا سمجھ   ہستی سے اپنی تجھ کو توقع ہے کیا سمجھ
اہمیت سوال کو سائل ذرا سمجھ   تو کیا ہے اور پوچھتا ہے کیا، بھلا سمجھ

لازم ہے امتیاز تناسب خیال میں
آنے نہ پائے بوئے تکبر سوال میں

آخر کو دل نے ہاتھوں کو یوں جوڑ کر کہا   سب کچھ بجا جو تو نے کہا مجھ سے ناصحا
لیکن خدا کے واسطے یہ بھی تو دے بتا   فطرت کو اپنی اب کوئی نادان کرے تو کیا

خلقت ہوی ہے تیری جو دانش کے واسطے
پیدا کیا گیا ہوں میں خواہش کے واسطے

آتش کو رائے دے، کہ جلا مت کسی کو تو   اور باد سے یہ کہہ کہ اڑا مت کسی کو تو
سمجھا یہ آب کو کہ بہا مت کسی کو تو   کہہ جا کے خاک سے کہ مٹا مت کسی کو تو

جب ان سبھوں نے مان لیا رہنما تجھے
تب آکے ایسی پند و نصیحت سنا مجھے

پھولوں سے کر سوال مہکنے میں لطف کیا؟　　بلبل سے پوچھ روز چہکنے میں لطف کیا
پروانہ سے بھی پوچھ بھڑکنے میں لطف کیا　　شمع سحر سے پوچھ بھڑکنے میں لطف کیا
اپنا فریضہ چاہئے ہر اک ادا کرے
معشوق گرم ناز ہو، عاشق جلا کرے
دریافت کر یہ قیس سے صحرا کو کیوں گیا　　فرہاد سے یہ پوچھ کہ کیوں جاں کو کھو دیا
سرمد اگر نہ کہہ سکے کچھ اپنا ماجرا　　منصور ہی سے پوچھ انا الحق کا مدعا
تو اپنی عقل و ہوش پہ نازاں ہے ناصحا
ہاشم کے دل سے پوچھ کہ اُسنے ملے گا کیا
انجان ہو کے دونوں کی باتیں سنا کیا　　کچھ دیر لیٹے لیٹے یہی سوچتا رہا
جو کچھ دماغ نے تھا کہا تھا وہ سب بجا　　پر میرے دل کی باتوں میں بھی کچھ ضرور تھا
حیراں ہوں اس معمہ کو کس طرح حل کروں
اسکی سنوں، کہ بات پہ اس کی عمل کروں

ڈاکٹر امیر علی خاں ہاشم پی۔ایچ۔ڈی

تبسّم

(رباعی)
جادو کی طرح اثر دکھاتے آئے　　آنکھوں میں وہ جب نظر بچاتے آئے
یہہ خرمن صبر پر بھی بجلی اے رازؔ　　دل میں وہ ہمارے مسکراتے آئے

یوسف علی رازؔ ام۔اے

حیدرآباد کا پرانا پل

مسٹر جی، سورج بھان نے حیدرآباد کے بعض تاریخی مقامات پر سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ اس شمارہ میں "حیدرآباد کے پرانے پل" کے متعلق صاحب موصوف کا ایک مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ آئندہ شماروں میں دوسرے مضامین پیش کئے جائیں گے ہم مسٹر بھان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ان دلچسپ مضامین کا سلسلہ "سب رس" کو بہ غرض اشاعت دیا ہے۔

"سب رس"

ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانہ میں گولکنڈے کی حکومت کا ستارہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں گولکنڈے کی آبادی بڑھتے بڑھتے موسیٰ ندی کے کنارے تک پھیل گئی جہاں اب کاروان سا ہوا ہے۔ ندی کے اُس پار کچھ فاصلے پر ایک گاؤں چچلم آج کل کے محلہ شاہ علی بنڈے کے قریب آباد تھا۔ اس گاؤں میں ایک خوبصورت، نازک بدن، موہنی رقاصہ رہتی تھی جس کا نام بھاگ متی تھا۔ گولکنڈے کے شہزادے محمد قلی کا دل اس موہنی مورت پر بے طرح آیا۔ بڑھتے بڑھتے چاہت کا یہ عالم ہوا کہ شہزادے کو کسی چیز کی سُدھ باقی نہ رہی۔ ہر گھڑی اس رقاصہ کا دھیان رہتا تھا۔ ایک رات شہزادہ چپکے سے قلعہ سے نکلا اور گھوڑا اڑاتے ندی کے کنارے پہنچا۔ موسیٰ ندی چڑھاؤ پر تھی۔ پانی دور تک بڑھ آیا تھا اور زور شور سے بہہ رہا تھا۔ پانی کا یہ جوش و خروش دیکھ کر بہادر سے بہادر سپاہی کی بھی ندی کے اس پار پہنچنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت شہزادے کو اپنی جان سے زیادہ بھاگ متی کے بچانے کا خیال تھا۔ ندی کی موجوں کو دیکھ کر اس کے دل میں پریم کی لہریں اُمڈیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور گھوڑے کو ایک ایڑ لگا دی۔ وفادار گھوڑا مالک کا اشارہ پاتے ہی اپنے آقا کو لئے تیرتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ اُس طرف بھی پانی بہت دور تک بڑھ گیا تھا۔ لیکن موضع چچلم جو بہت اونچائی پر تھا پانی کی زد سے بچا رہا۔ یہاں سے شہزادہ سیدھا بھاگ متی کے مکان پر پہنچا۔

دوسرے دن پرچہ نویس نے بادشاہ سلامت کے حضور میں اس واقعے کی خبر پہنچائی۔ سلطان ابراہیم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اس نے پورن سنگھ داروغہ عمارت کو طلب کر کے موسیٰ ندی پر فوراً ایک پل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ بادشاہ نے اس کی تیاری کے لئے ایک لاکھ روپئے عطا فرمائے اور ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اس پل کی تعمیر شروع ہوئی۔ لیکن صاحب ماثر دکن کا خیال ہے کہ اس عمارت کی تعمیر پر ۲½ لاکھ روپیے صرف ہوئے۔ اس بیان سے بہتیروں کو اتفاق ہے اور یہی زیادہ معتبر مانا گیا ہے۔ ایک شخص نے "صراط المستقیم" (۹۸۱ھ / ۱۵۷۳ء) تاریخ نکالی جس سے سن تعمیر کا پتہ لگتا ہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس شخص کو پانچ سو اشرفیاں انعام میں دیں۔

موسیٰ ندی پر یہ سب سے پہلا پل ہے اسی لئے اس کو پرانا پل کہتے ہیں۔ اس پل کی تیاری میں آٹھ مہینے لگے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ پل ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں تیار ہوا جس کا سن تعمیر ایک فارسی شعر کی عبارت سے نکلتا ہے:۔

زتحت او گذرد ما، و ما بر او گذریم   ازیں سبب شدہ تاریخ او "گذرگہ ما"

۹۸۶ھ / ۱۵۷۸ء

اس پل کی لمبائی ۲۰۰ گز، چوڑائی ۱۲ گز اور اونچائی ۱۴ گز ہے۔ کئی دفعہ ندی میں طغیانی آئی، آس پاس کی عمارتیں ٹوٹ گئیں، انکا نام و نشان تک باقی نہ رہا، لیکن اس نے سب کا مقابلہ کیا اور ابتک موجود ہے۔ ۲۳ محرم ۱۱...ھ میں موسلادھار بارش کی وجہ سے طغیانی آئی۔ چادر محل کی مضبوط دیوار ٹوٹ گئی لیکن پل ٹس سے مس نہ ہوا۔ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ء) کی طغیانی کے بعد حضرت سکندر جاہ بہادر مغفرت منزل کے زمانے میں مہاراجہ چندو لال بہادر شاداں مدار المہام وقت نے اس پل کی مرمت کرائی۔ بادشاہ کی اجازت سے ذیل کے کتبے کو پرانے پل کے دروازے پر نصب کرایا جو ابتک موجود ہے۔

بعہد شاہ اسکندر شدہ تعمیر پل یکسر   زسعی راجہ چندو لال از سابق بود بہتر

بہ شاداں شد ندا "جائے غریبے بہر تاریخش"   زسیل اینک بود محفوظ چوں اندر صدف گوہر

۱۲۳۹ھ

اس کے بعد حضرت آصف جاہ سادس کے زمانے میں رمضان کی پہلی ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں پیر کے دن آدھی رات گئے پھر اس ندی میں بڑی بھاری طغیانی آئی۔ پانی پل کے اوپر سے بہنے لگا جس کی وجہ سے پل کے دونوں بازو کی منڈیریں ٹوٹ گئیں لیکن اس پل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا اور ابتک اچھی حالت میں ہے۔ حضرت غفران مکاں کے حکم سے فوراً اس کی مرمت کردی گئی۔ ہمارے موجودہ فرمانروا کے عہد میں محکمہ تعمیرات نے اس پر سمنٹ کی سڑک ڈالدی ہے اور کناروں پر سمنٹ کے پیدل راستے بھی قائم کردئے ہیں۔ نواب آصف جاہ اول نے حیدرآباد کے اطراف جب فصیل بنوائی تو ایک دروازہ بھی اس پل پر تعمیر کیا جو ابتک موجود ہے اور جس نے کئی مرتبہ شہر کو دشمنوں کی دستبرد سے بچایا ہے۔

جی۔ اس۔ بھان

شاعر کی آرزو

جہاں آزادئ رخشاں کے جوہر جگمگاتے ہیں
جہاں پیمانۂ عرفاں کے جلوے مسکراتے ہیں
جہاں حسنِ محبت کے ترانے گائے جاتے ہیں
وہیں لے چل، وہیں، اب اے خدائے گردشِ دوراں!

جہاں مذہب، محبت سے عبارت ہے وہیں لے چل
جہاں نورِ بصیرت ہے بصلت ہے وہیں لے چل
جہاں بے خوف، انساں کی جسارت ہے وہیں لے چل
وہیں لے چل، وہیں، اب اے خدائے گردشِ دوراں!

جہاں بستے نہوں ارباب فرقہ ساز اے مالک
جہاں ہے خرقہ سالوس بے انداز اے مالک
جہاں فردوس ہے موسیقئ گلباز اے مالک
وہیں لے چل، وہیں، اب اے خدائے گردشِ دوراں!

جہاں جوشِ سیاست میں نہ جوئے خوں سنکتی ہو
جہاں اغراض کی خاطر نہ چشمِ دل جھپکتی ہو
جہاں ظرفِ صداقت میں مئے رنگیں چھلکتی ہو
وہیں لے چل، وہیں، اب اے خدائے گردشِ دوراں!

جہاں جبریل نے پھیلائے ہوں تقدیس کے بازو
جہاں چلتا نہ ہو افسونِ رعنائی رنگ و بو
جہاں شاعر پہ بیٹھتی ہو سازِ فطرت و لجو
وہیں لے چل، وہیں، اب اے خدائے گردشِ دوراں!

محمد کبیر خاں کاوش

پشیمانی

"سب رس" میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبی شاہکاروں کو اُردو کے لباس میں پیش کیا جائیگا۔ اس شمارہ میں ایک معیاری ہندی افسانہ کا ترجمہ پیش ہے جس کے لئے ہم مولوی غلام رسول صاحب کے ممنون ہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب کو ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ ہے اور اُن کے ترجمے ہندوستان کے معیاری رسائل میں جگہ پاکر خراج تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں۔

"سب رس"

—— ۱ ——

گردھر سنگھ اپنے بھائی کا سب لے کر اور بیچ کر بھاگا تو بمبئی پہنچا۔ وہاں اس کے گاؤں کے دو ایک آدمی اور تھے، مگر سب فاقہ مست تھے۔ گردھر کے پاس ہزار دو ہزار روپیہ تھا اس لئے سبھوں نے اُس کا بڑا خیر مقدم کیا۔

گردھر پنجم سنگھ سے بولا۔ کیوں بھائی تم کیا کام کرتے ہو؟

پنجم نے جواب دیا۔ بھائی میں کیا بتاؤں کیا کرتا ہوں۔ طوائف کا دلال ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ کوئی کام نہیں ملتا، تو سوچا کہ جب گاؤں گھر چھوڑ کر آیا ہی ہوں تو جو کام مل جائے وہی سہی۔ بھاگتے کی لنگوٹی بھلی۔ کون یہاں دیکھنے آتا ہے۔

گردھر۔ یار تم تو گھر پر کہتے تھے کہ بمبئی میں کام لوٹا پڑتا ہے۔

پنجم۔ تو کیا یہ کام نہیں ہے بھائی؟

گردھر۔ یہ طوائف کی دلالی بھلا کوئی کام ہے۔ سراسر غلط۔ تمھیں ملتا کیا ہے؟

پنجم۔ ملتا کیا ہے۔ جتنے آدمی پھنسا لے جاؤں گا اگر اتنے ہی روپے ملیں تو بھی کھانے کے لئے بہت ہیں پھر جو صاحب لوگ جاتے ہیں ان کا سودا سلف بھی لادیتا ہوں۔ جب چلنے لگتے ہیں تو خوش ہو کر دھیلا پیسہ دے جاتے ہیں۔

گردھر بولا۔ تو ٹھیک ہے۔ ہاں میں تو باتوں میں لگ گیا۔ یہاں کھانے کا کیا انتظام کرنا ہوگا؟

پنجم۔ چلو ہوٹل میں۔ وہیں بھوجن ہوگا اور کیا۔

گردھر۔ کن لوگوں کا ہوٹل ہے بھائی؟

پنجم۔ میں تو جینوں کے ہوٹل میں کھاتا ہوں۔ یہاں کون پوچھتا ہے۔ کس کا ہوٹل ہے۔ یہ سب تو گاؤں کا ہی روگ ہے۔

گردھر بولا۔ تو چلو بھائی بھوجن کریں۔ میرے پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔

پنجم۔ چلو میں تو تیار ہوں۔

دونوں چلے گئے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۲۔۔۔۔۔۔۔۔

گردھر سنگھ کو بمبئی میں آئے دو مہینے ہو گئے۔ ایک دن اُن پر بھی رنگ چڑھا۔ پنجم سے بولے۔ تم جس کو چاہو اسے طوائف کے پاس لے جا سکتے ہو بھائی۔

پنجم بولا۔ جو روپیہ خرچ کر سکتے ہیں وہ سب جا سکتے ہیں۔ کوئی خاص آدمی ہوتے ہیں جو جاتے ہیں۔

گردھر شرماتے ہوئے بولا۔ تو اچھا آج میں بھی جانا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنا۔ دیکھوں کیسا رنگ رہتا ہے۔

پنجم ہنس کر بولا۔ پہلے اپنے کپڑے لتے درست کر لو۔ کیا اُسے بھی کوئی گاؤں کی چمارن سمجھ بیٹھے ہو کہ جیسا بھی ہو سب ٹھیک ہے۔ دو چار دفعہ تو تمھیں اُس کی صورت ہی دیکھنے کو ملیگی۔ جب خوش ہوگی تب کہیں اور کام کی باری آئے گی۔

گردھر بولا۔ چلو، چلو مجھے بھی کوئی اناڑی سمجھا ہے۔ میں اُس سے ایسی باتیں کرونگا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

پنجم بولا۔ سنو بھائی۔ وہاں کوئی وکالت نہیں کرنی پڑتی۔ جو جتنا ہی بے دریغ روپیہ خرچ کر سکتا ہے۔ اُسی کی جیت ہوتی ہے۔ اُسی کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھے آپ؟

گردھر سنگھ بولے۔ میرے پاس جو کچھ بھی روپیہ ہے۔ وہ سب میں کھونے کو تیار ہوں۔ زندگی میں کیوں ارمان باقی رہ جائے۔

پنجم۔ بھائی۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ چار دن کی زندگی رو رو کر کیوں کاٹیں۔ روپیہ پیسا تو آتا ہی جاتا رہتا ہے۔ جوانی تو بار بار نہیں ملتی۔ اس لئے جو عیش حاصل ہو سکتا ہے اُسے کیوں چھوڑیں۔

گردھر بولا۔ ہاں جی۔ رونا تو زندگی بھر کا ہے۔ کچھ دن تو ہنس بول لیں۔ تو کل کا ٹھیک سمجھیں۔

پنجم۔ ٹھیک ہے۔ میں تو اب اپنے کام پر جاتا ہوں۔

گردھر بولا۔ میں بھی کہیں گھومنے جاتا ہوں۔

پنجم۔ جاؤ' لیکن جلدی آنا۔ ایسا نہ ہو کہ پشیمانی اٹھانی پڑے۔ پنجم چلا گیا۔

۳

گردھر آج خوب سج رہے ہیں جیسے کوئی پہلی دفعہ اپنی سسرال جاتا ہو۔ پنجم باہر سے آیا تو دیکھا۔ بابو صاحب خاصے سیٹھ جی بنے بیٹھے ہیں۔

پنجم ہنس کر بولا۔ یار تم تو پہچانے نہیں جاتے ہو۔

گردھر بولا۔ تو کیا تم سمجھتے تھے کہ میں بیوقوف ہوں۔ میں نے بھی خوب سیکھا ہے۔ جو کچھ کور کسر باقی تھی وہ بمبئی آکر پوری ہو گئی۔

پنجم بولا۔ ہو تو یار تم ہوشیار۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ میں تو اتنے دن رہا اور رات دن یہ سب میرے ہاتھوں ہوتا ہے لیکن مجھے بننا نہیں آیا۔ جو پنجم گھر پر تھا وہی یہاں بھی رہا۔ کچھ نہ کرنے پایا۔

گردھر سنگھ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے۔ روپے میں ہی تو گن ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ایشور چاہے اور کچھ نہ دے۔ لیکن روپیہ ضرور دے۔ پھر ہیں اور کچھ ڈھونڈھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ پر جب پاس پیسا نہیں تو سبھی طرح کی مصیبت ہے۔

پنجم بولا۔ ہاں بھائی۔ روپے کی ہی سب کرامت ہے۔ جب ہی تو وطن چھوڑ پردیس میں پڑے ہیں۔

گردھر بولا۔ مجھے اور کسی سے خلوص نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ گاؤں کے نام سے تو مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ اپنا کھاؤ' پہنو دیکھنے والے جلے جاتے ہیں۔

پنجم بولا۔ ہاں بھائی۔ کہی تو میرے دل کی بات۔ گاؤں میں یہ روگ تو ہے۔ میری خواہش تو گاؤں دیکھنے کی کبھی نہیں ہوتی۔ کھاتا ہوں۔ آرام کی نیند سوتا ہوں۔ نہ کوئی اندیشہ نہ فکر۔

گردھر۔ میں تو گاؤں کو سلام کر کے آیا ہوں۔ اب تو یہیں مرنا ہے۔ چاہے جیسا بھی ہوگا۔ پھر کونسے بیوی بچے بیٹھے ہیں رونے کے لئے' جن کی فکر کی جائے۔

بارہ کا گھنٹا سنائی پڑا۔ دونوں اپنے بستر پر سونے لگے۔

گردھر۔ یار پنچم بارہ بج گئے۔ معلوم بھی نہ ہوا اتنی رات گزر گئی ہے۔ گاؤں میں تو سرِ شام ہی سناٹا پڑ جاتا ہے۔

پنچم۔ اب سوؤ بھائی۔ رات بہت ہوگئی۔ دونوں سو گئے۔

۴

دلّی میں جیسے سب کاموں میں بازی گردھر سنگھ کی تھی۔ اسی طرح طوائف کے گھر میں بھی بازی بابو صاحب کے ہی ہاتھ رہی۔ روزانہ نئے نئے جوش اور امنگ سے جاتے تھے اور تر و تازہ ہوکر گھر آتے تھے۔

پنچم آکر بولا۔ بڑے استاد ہو یار۔ یہاں بھی تم نے بازی مار لی۔ آج طوائف تمھاری بڑی تعریف کرتی تھی۔ مجھ سے کہتی تھی کہ تم اب تک جتنے گاہک لائے ان سبھوں میں یہ رتن ہیں اور خوش ہوکر مجھے پانچ روپے انعام دئے۔ سمجھ لو میں نے بھی خوب تعریفوں کے پل باندھ دئے۔ پھر کیا ہے۔ میں نے کہا۔ صاحب کوئی ایسے ویسے آدمی تھوڑے ہی ہیں۔ بڑے بھاری علاقہ کے مالک ہیں۔ آئے ہیں دو چار مہینے بمبئی کی سیر کرنے۔

گردھر بولا۔ سچ! میری تعریف کرتی تھی۔ نہیں بھائی تم جھوٹ بولتے ہو۔

پنچم بولا۔ نہیں بھائی تمھاری قسم۔ کہتی تھی کہ اب تک جتنے گاہک لائے ہو اُن سبھوں میں وہ رتن ہیں۔

گردھر غبارہ کی طرح پھول گیا اور بولا۔ انہیں باتوں کو دیکھ کر تو آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ کسی کا دل لیتی ہیں تو دل دینا بھی تو جانتی ہیں۔ اور اگر گھر میں شادی کرکے بیوی لاؤ اور خوش کرنے کے لئے جان بھی دو تب بھی مزاج ہمیشہ بگڑا ہی رہتا ہے۔ گھر میں جاؤ تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ میں تو بھائی کہتا ہوں گرہستی زندگی دوزخ سے بھی بدتر ہے۔ نہ جانے کیسے گدھے ہوتے ہیں جو زندہ رہتے ہیں۔

پنچم۔ تب ہی تو بھائی اب کوئی شریف اُس میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ کون اپنی زندگی کو دوزخ میں ڈالے۔

گردھر۔ میں تو اِن روگوں سے پہلے ہی کوسوں بھاگتا تھا اور اب تو کوئی بات نہیں ہے۔ یار پنچم سچ کہنا بھائی تم نے بھی ان کا کبھی پیار محبت پایا ہے۔ یا روپے ہی حاصل کرتے رہے ہو۔

پنچم جھینپ کر بولا۔ بھائی میرے پاس روپے کب تھے اور جب روپے ہوئے تو انہیں کے کام سے چھٹی نہیں ملتی۔ رات تو جاگتے ہی جاگتے گزر جاتی ہے دن کو آرام نہ کروں تو مر جاؤں گا کہ زندہ رہوں گا۔ پھر میری طبیعت یوں ہی بھر جاتی ہے کبھی کبھی خواہش ہوئی تو اوروں کے پاس چلا گیا۔ ان کے پاس پھٹکنے کو تو میری ہمت نہیں ہوتی۔

گردھر بولا۔ اس میں ہمت کا کیا سوال ہے؟

پنجم بولا۔ کیوں نہیں بھائی جن کا میں نوکر ہوں ان سے تو مجھے بولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور کیا کر سکتا ہوں۔
گردھر۔ تم ہو خاصے گادی
پنجم۔ اُن کے ساتھ اُن کی اور بہنیں بھی تو ہیں نا۔
گردھر۔ بھائی میری خواہش تو رہتی ہے کہ ہر دم سندربائی کے پاس بیٹھا اُن کا منہ تکتا رہوں۔
پنجم۔ جوانی کے تو یہی ہنسنے ہیں اور کیا رونے کو جی چاہے گا بھائی۔ اِس عمر میں!
گردھر۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیسے اپنی طبیعت پر قابو پاتے ہو۔
پنجم۔ بھائی مجبوری سب سکھلا دیتی ہے۔
گردھر۔ بھائی۔ مجھے تو پانچ چھ مہینے کے یہہ دن زندگی بھر نہیں بھولیں گے، لیکن یہہ عیش کا زمانہ اب بہت دن نہیں چل سکتا۔ اب میرے پاس کل سو روپئے اور ہیں۔
پنجم۔ منہ بنا کر بولا۔ اچھا اب خالی ہاتھ ہو گئے۔
گردھر۔ یہی تو کہتا ہوں کہ اب ایک دو دن اور ہیں یہہ سکھ کے دن بس۔ لیکن ہاں اگر مجھے کہیں کام مل جائے تو پھر کیا پوچھنا ہے۔ ٹھیک ہے نا بھائی؟
پنجم۔ رنجیدہ ہو کر بولا۔ بھائی تم نے یہہ بُری خبر سنائی۔
گردھر۔ اُوں۔ یہہ تو ہوا ہی کرتا ہے۔ اسکی کیا فکر۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ روپئے ملتے ہی . . . سب سے پہلے سندربائی ہی کے درشن کروں گا اور کام جائے چولھے بھاڑ میں۔
پنجم نے گھڑی دیکھی تو پانچ بج گئے تھے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور گردھر سے بولا بھائی میں تو جاتا ہوں کام پر۔ آج باتوں میں ایسا لگا کہ وقت کا ذرا بھی خیال نہ رہا یہی کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

۵

آج دو مہینے سے گردھر بیمار ہے امراض خبیثہ میں مبتلا ہو گیا پنجم کا بھی کہیں پتا نہیں ہے۔ مکان کا کرایہ بھی تین مہینے سے ادا نہیں کیا گیا ہر کئی دنوں سے مالک مکان آتا ہے اور دھمکی دے کر چلا جاتا ہے۔ گردھر سوچتا ہے۔ بس کل کا دن اور ہے اب تو وہ مکان سے ضرور نکال دے گا اور جو کپڑے لینے ہیں لے کر چل دے گا۔ میں راہ کا بھکاری بنا پڑا رہوں گا۔ چلنے کی طاقت بھی مجھ میں نہیں ہے بھیک مانگ کر کھاؤں گا۔ وہ بار بار پنجم کو کوستا ہے۔ پھر سوچتا ہے میں پنجم کو کیوں کوستا ہوں۔ پنجم میرا کون تھا۔ پھر میری قسمت ہی کونسی بڑی اچھی ہے۔ افسوس! بھائی کا مار ڈالنے والا خونی تو میں ہی ہوں ان کے سیدھے ہونے کا صلا انہیں ملا کیا؟ تڑپ تڑپ کر مرا اور چین کیا میں نے۔ تو بھلا ایسی روح کبھی مجھے معاف کر سکتی ہے؟ اُن کے بال بچوں کو بھوکا مارنے والا پاپی میں ہی ہوں بھیا جب میری ہی بھلائی کے لئے نصیحت کرتے تھے تو میں انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ بلنے بھگوان میں پاپی ہوں۔ فوراً ہی میرا خاتمہ کر دو۔ اسی سوچ بچار میں گردھر پر غنودگی طاری ہو گئی۔ خواب دیکھتا ہے کہ بھیا آئے ہیں۔ اور مسکرا کر

گردھر سے کہتے ہیں۔ سب ٹھیک ہی ہے یہی حال تو میرا بھی تھا۔ جب میں روتا تھا تو ہنستا تھا۔ ہاں کیا میں روتا تھا تو میری آتما نہیں روتی تھی یہیں بھائی میری بھی آتما روتی تھی۔ اِس لئے کہ میں نے اپنے بال بچوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ البتہ فرق مجھ میں تجھ میں اتنا ہی تھا کہ دنیا مجھے ظالم نہیں کہتی تھی اس لئے کم افسوس تھا۔ تیرے لئے سب ہنستے ہیں۔ میں بھی ہنستا ہوں پھر دیکھتا ہے۔ ساں بھاوج اور بھتیجا ہیں۔ ماں کہتی ہے تجھ کمینے نے میری کوکھ سے پیدا ہو کر میرے منہ کو کالک لگادی ہے۔ گردھر رو کر کہتا ہے میں تو خود ہی اپنی قسمت کو رو رہا ہوں معاف کر اماں۔ ماں ساڑی میں سے چھاتی ہوئی گٹھلی دکھا کر کہتی ہے۔ میں نے تو معاف کرنا سیکھا ہی نہیں۔ جو لڑکا ماں کے دودھ کی مان نہیں رکھتا۔ اسے ماں کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ماں کو اس کے مار ڈالنے میں کوئی پاپ نہیں ہے۔ معاف کرنا گناہ ہے۔ کیونکہ تو نے سماج کا خون کیا ہے۔ جو کروڑوں آدمیوں کے قتل کا باعث ہے اور اس قاتل کو جننے والی پاپن میں ہوں۔ اس لئے مجھ سے معافی مانگنا فضول ہے۔ جیسے ہی ماں اپنی کنارے کر آگے بڑھتی ہے گردھر کی بھاوج ماں کے ہاتھ سے کٹار چھین لیتی ہے اور ماں سے بولتی ہے۔ انہوں نے میرا خون کیا ہے۔ اِن کو مجھ سے معافی مانگنی چاہئے تھی مگر آپ میری بھی ماں ہیں۔ میں آپ سے انکے لئے معافی چاہتی ہوں یہہ تو خود ہی اپنی کرنی کا پھل بھگت رہے ہیں۔ گردھر رو کر بھاوج کے قدموں پر گرنا چاہتا ہے اور جونہی چارپائی سے اٹھنے کو ہوتا ہے گر پڑتا ہے۔ آنکھ کھل جاتی ہے

۶

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ گردھر دروازہ کھول دیتا ہے۔ دو پولیس کے سپاہی اور حسبِ معمول وہی مالک مکان کا چپراسی ہرک سنگھ آتے ہیں۔

ہرک سنگھ بولا۔ آج کرایہ دو۔ ورنہ جو سامان ہو دے کر مکان چھوڑ دو۔ اب تک بہت شرافت برتی گئی۔

گردھر رو کر بولا۔ ارے بھائی تم گھر چھوڑنے کو کہتے ہو میں دنیا چھوڑنے کو تیار ہوں۔

ہرک۔ تیرے جیسا کمینہ آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

گردھر رو کر بولا۔ ہرک بھیا۔ دو چار دن اور رہنے دو۔ نہیں تو بے موت مر جاؤں گا۔ دونوں سپاہی ہرک سنگھ سے بولے سیٹھ صاحب نے ہم لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اُس کے پاس جو سامان ہو جو ہو نیلام کر کے اسکو آج مکان سے باہر کر دو۔ منہ کیا دیکھتے ہو۔

ہرک گردھر سے بولا۔ اب کیا سوچتے ہو ؟

گردھر۔ کیا سوچتا ہوں۔ کچھ نہیں اور میرے پاس رکھا ہی کیا ہے "مرتا کیا نہ کرتا" والی کہاوت ہے۔

چپراسی بولا۔ بدمعاش فلسفہ بگھار رہا ہے۔

جو کچھ تھا باہر رکھ کر نیلام کر دیا جس میں مشکل سے بیس روپئے ہاتھ لگے۔ جوئے کر سب چلے گئے اور گردھر نے اپنا نام "پتھک" رکھا۔

۷

پتھک دن بھر سڑک کے کنارے پڑا تھا۔ بھوکا پیاسا کچھ پھٹے ہوئے گدڑے پھیلے پڑے ہیں۔ مکھیوں کا غول کا غول اس کے اطراف بھنبھنا رہا تھا۔ کوئی راہ گیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسکی طرف دیکھتا ہے تو وہ گویا خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اس دن جو خواب دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں رات دن پڑا سوچا کرتا ہے۔ کبھی کسی کو رحم آگیا تو دو چار پیسے مل گئے۔ اسی سے کھانا کھا لیتا ہے نہیں تو اپنے کرتوت کا خیال کر کے روتا ہے پچھتاتا ہے جہاں راتے ہوتی اس کے آنکھوں کے سامنے ڈراونے خوابوں کا بازار لگ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کالی دیوی کے منہ میں دیکھتا ہے۔

آج پندرہ دن کے بعد ایک عورت اس کے پاس جاکر بولی۔ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟

تھمک بولا۔ میں ایک پاپی ہوں میرا نام تھمک ہے اور پاپ ہی میری قسمت ہے۔

عورت۔ اگر تم میری جھونپڑی میں رہنا چاہتے ہو تو چلو میں تم کو لے چلوں۔ کیا تمہارا کوئی نہیں ہے؟

تھمک۔ نہیں ماں۔ پاپیوں کے کون ہو سکتا ہے۔ مجھ جیسے سے ایشور بھی منہ پھیرے تو کوئی ناممکن بات نہیں۔

عورت۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟

تھمک۔ ماں، جہاں مرنے کو جگہ ملے وہی میرا گھر ہے۔

عورت۔ ایک ڈولی والے کو لے کر آئی اور اسی میں بٹھا کر تھمک کو اپنے گھر لا لائی۔

۸

عورت نے تھمک کو اپنے گھر میں لاکر پہلے تو کھانے کو دیا۔

تھمک بولا۔ ماں تم مجھ پاپی پر کس لحاظ سے اس قدر مہربانی کا برتاؤ کر رہی ہو۔

عورت۔ بیٹا ہم سبھی پاپی ہیں۔ میں کونسی دھرماتی ہوں۔ ہم سبھی پاپی ہیں۔

تھمک۔ ماں، تم میری نظروں میں دیوی دکھائی دیتی ہو۔ میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں تو بہت ممکن ہے تمہیں میری صورت سے بھی نفرت ہو جائے۔

بڑھیا بولی۔ بیٹا! میری بھی کہانی بڑی عجیب وغریب ہے۔ یہی سمجھو کہ میں بڑی بلا کو ہوں۔

تھمک۔ ماں، سنا دے اپنی کہانی تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میں ہی پاپی نہیں ہوں۔ مجھ جیسی کروڑوں مخلوق دنیا میں بستی ہیں۔ جن سے میری پشیمانی کی تکلیف کم ہو جائے۔

بڑھیا۔ بیٹا کبھی سنا دوں گی۔ کوئی آج ہی شبھ گھڑی تو ہے نہیں۔ تم سو جاؤ کئی دن کے بعد آج تمہیں آرام ملا ہے۔

تھمک۔ اچھا ماں جیسا تم کہوگی ویسا ہی کرونگا۔ میں سوتا ہوں۔

بڑھیا۔ ہاں بیٹا۔ سو جاؤ کہا اور باہر نکل آئی۔

۹

آج بڑھیا کئی دن سے بیمار ہے اور تھمک تو پہلے ہی سے بیمار تھا۔ اس پر نہ دانہ نہ پانی۔ اسی طرح بڑھیا بھی پڑی ہے۔

تھمک سے بولی۔ سن لو میری انوکھی کہانی جو اس دن کہنے کو کہتے تھے۔

تھمک۔ ہاں ماں سنا دو۔

بڑھیا۔ سنو۔ میں ایک ٹھاکر کے خاندان کی عورت ہوں۔ میرے گھر میں میرا دیور اور خاوند تھے ایک لڑکا ہوا۔ میرے سسر پہلے ہی مر چکے تھے اور ساس میرے آنے کے کئی سال بعد۔ گھر زمین گرہستی سب کچھ میں اور میرے خاوند ہم دونوں نے مل کر بنایا تھا۔ کیونکہ میرے پہلے کے گھر کا صفایا ہو چکا تھا۔ خیر، جب میرا دیور جوان ہوا۔ ہاں ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی میرے خاوند دیور کو بیٹے سے بھی زیادہ چاہتے تھے

ہاں جب میرے دیور جوان ہوئے وہ میرے بیٹے کو برابر کھانا کپڑا ابھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ اِسی پر مجھ سے ان سے کبھی کبھی دو چار باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ میرے دیور گھر کا کچھ کام کاج نہیں کرتے تھے۔ میرے خاوند کو مجھ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کئی دفعہ مجھ سے اور میرے دیور سے جھگڑا بھی ہو گیا اور اس جھگڑے کی بناء وہ اپنے بھائی کو سمجھ کر اُن سے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ میرے خاوند نے ٹالنا چاہا لیکن وہ نہ مانے۔ اس پر خاوند الگ ہونے کو راضی تو ہو گئے لیکن بولے۔ میں حصہ بخرہ کر کے کچھ نہ لوں گا۔ تو لے کر آرام سے رہ۔ میں اپنے بال بچوں کو لے کر کھنڈر میں پڑا رہوں گا۔ میری خدا سے یہی دعا ہے کہ تو خوش رہے۔

گھر میں بھی روٹھی رہنے لگی وہ کام جی توڑ کر کرنے لگے۔ ان کی جان لینے کے لئے ملک الموت بازی لگا رہا تھا۔ میرے خاوند چاہتے تھے کہ میں جلدی سے پہلے کی طرح کر دوں لیکن ہتیلی پر سرسوں نہیں جمتا۔ ہائے وہ مجھ سے کتنا ڈرتے تھے جس سے میں اُن کے بھائی کو کچھ نہ کہوں! ایک دن مجھے ان کی حالت پر رحم آیا۔ غصہ بھی تھا اور رنج بھی تھا۔ اِسی لئے میں کچھ بولتی ہی نہ تھی۔ ہائے۔ اُس دن بھی غصہ میں رحم اور رحم میں غصہ ملا ہوا تھا۔ خیر میں بولی۔ " اب کیا کرنے پر لگے ہو۔ راہ کی بھکارن تو بنا دیا۔ سادھو ہی بننا تھا تو شادی بیاہ کیوں کیا" ہائے تب وہ بولے " میں تم لوگوں کو چھاتی سے لگائے ہوں لیکن تمہارے ہی لئے مرتا ہوں۔ میں نے اس وقت چبھتا ہوا فقرہ کہا۔ " یوں چھاتی سے لگائے رکھ کیا نہال کر دیا؟ میں سب جانتی ہوں۔ اتنی بچی نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں جو آدمی اپنے خون کے بچوں کو پیار نہیں کرتا ان کا ذمہ دار نہیں ہوتا اسکی عورت کو کیا امید ہو سکتی ہے۔ میں بھی اپنی قسمت کو رو کر بے فکر ہوں" ہائے اس وقت وہ رو کر بولے " سونا۔ مجھے گدھا کہہ لے مجھ میں سب عیب ہیں لیکن میں بے دل نہیں ہوں۔ اب میں تیرے سامنے قسم کھانے کے لائق نہیں ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ جسے میں منصف سمجھتا تھا اسی نے میرے ساتھ ناانصافی کی" ہائے میں پاپن ہوں۔ میں پھر سادگی سے بولی " یہ سب کہہ کر صفائی پیش کرو۔ دل میں کہتے ہوگے کہ یہ ماں بیٹا دونوں مر جائیں تو پھر اپنے چاہتے بھائی کو لے کر موج کروں گا۔ یہ کیوں نہیں کہتے" ہائے بھگوان کس طرح مجھ پاپن کو معاف کرے وہ پھر رو کر بولے " سونیا۔ میں اسی وجہہ سے کبھی تیرے سامنے منہ نہ کھولتا تھا کہ تو اب کی طرح مجھ کمینہ پر اعتبار نہ کرے گی" ہائے ' اسی رات کو انہیں بخار چڑھا۔ تیسرے دن وہ تو چل بسے میں بیٹھی اپنی قسمت کو روتی رہی۔ رونے دھونے کا اثر زیادہ دن تک نہ رہا۔ میں نے دیور کو اپنے خاوند کا قاتل سمجھا۔ سنا تھا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے۔ میں بھی ہاتھ میں کٹارے کر جس کو خون میں رنگ کر لال کرنا غرض اولیں تھا بمبئی کی راہ لی۔ ان کا قاتل ان کا بھائی ' میرا دیور ہے اس کو مار کر میں خوش ہو جاؤں گی۔ یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ کارخانہ والوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ ہائے میرا بیٹا بھی ان ہی میں تھا کارخانہ کے مالک نے گولی چلا دی۔ اس گولی کا نشانہ میرا بیٹا بنا۔ میرا لال۔ اب میرے دو دشمن ہو گئے۔ میں نے کارخانے کے مالک کے گھر آیا گری کی خدمت اختیار کر لی۔ میں پاپن ہوں۔ اس بچے کا پاپ لے کر میں اپنے بچے کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ کئی سال رہنے پر اس کارخانے کے مالک کا بیٹا موٹر سے چوٹ کھا کر مر گیا۔ ایک طرف میری خون کی پیاس تھی۔ دوسری طرف مجھے الہام ہوا۔ ایک روشنی دکھائی دی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایشور نے مجھے ماں کی خدمت عطا کی ہے۔ اس فرض کی ادائی کے لئے۔ اس کی ذمہ داری کی تکمیل کے لئے۔ لیکن ہائے مجھے عقل آئی بڑی دیر کے بعد جبکہ میرا سب کچھ اور خاندان تباہ ہو چکا تھا۔ مجھکو یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے خاوند کی قاتل میں خود ہی ہوں۔ میں عورت کی شکل میں پیدا ہوئی ماں بھی بنی ہے لیکن ماں کا دل نہ پایا۔ اگر ملا ہوتا تو میں اس پاپ کی حصہ دار نہ بنتی۔ عورت ہونے کے معنے ہیں ساری دنیا پر ماں کی سی محبت کا اظہار کرے۔

جس میں یہہ محبت نہ ہو اس میں نسائیت نہیں ہے۔ اسے عورت کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر دیوی مہاشکتیاں کیوں کہلاتی ہیں اس لئے کہ وہ دنیا کو آنچل میں، گود میں چھپا کر سب مصیبتوں سے اس کی حفاظت کرتی ہیں اگر آج اس میں یہہ بات نہ ہو تو وہ ماں کی خدمت سے فوراً دست کش ہو جائے۔ اُو خدا اب رنج والم کا صدمہ نہیں سہا جاتا۔ کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔

ہاتھ میں کٹار کو اٹھا کر کہتی ہے۔ ارے پاپی تو نے ہی سب خون اور پاپ کیا ہے۔ آج تیرے کھیل کا خاتمہ ہو جائے گا۔

گردھر۔ ماتا۔ تمہارا خون کرنے والا تو میں ہوں۔

بڑھیا کے ہاتھ سے کٹار چھین کر بولا تم آج اسے کلیجہ کے پار کر دو۔ میری سیاہ کارانہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے میں آپ کا ممنون ہوں گا کہتا ہوا وہ اس کے قدموں پر لوٹ گیا۔

بڑھیا تو قاتل نہیں بنے، تو تو میرا بیٹا ہے۔ گردھر کو جھک کر چھاتی سے لگا لینا چاہا لیکن وہ چھاتی تک آنے بھی نہ پایا تھا کہ بیہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ طائر نفس قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

وہ بھی گر پڑی اس نے گردھر کو معاف کرنا چاہا۔ وہ اپنا سب کچھ کھو کر اب متحمل مزاج و عفو پسند ہو گئی تھی لیکن وہ معافی گردھر برداشت کر سکا اس کو رنج وافسوس کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ پھر اٹھنے نہ پایا اور نہ شاید اس نے اٹھنے کی خواہش کی۔ اسے اس دیوی کے چرنوں میں زیادہ راحت معلوم ہو رہی تھی۔

شیورانی دیوی (اہلیہ منشی پریم چند) ماخوذ از مادھوری

موسم سرما اور غریب

(ایک طویل نظم کے چند بند)

کچھ اس شدت سے اب کے موسم سرما کی آمد ہے
مقدر میں ہے غربت، اور پھر تدبیر بھی ہے رد ہے
اکڑتے ہیں سمٹتے ہیں، بغل میں ہاتھ ہوتے ہیں
وہ بجنا دانت کا، ہاتھوں میں رعشہ اس زمستاں میں
ہوئی ہے سرد ساری آتش گل آج بستاں میں
جو کچھ بھی شکوۂ غربت میں باتیں منہ تک آتی ہیں
بڑی مشکل سے کٹتی رات ہے آرام کے بدلے
جو پلٹا کھائے قسمت گردش ایام کے بدلے
وفا پھر آتش مے کی رہے گی خوب ہی گرمی

ہر اک شے ٹھٹھری جاتی ہے، جو کچھ ہے حد سے بے حد ہے
غرض اس مفلسی میں اس کو گویا ہم سے اک کد ہے
ہیں گھٹنے پیٹ میں، سردی کو لے کر ساتھ سوتے ہیں
بدن میں کپکپی جیسے کہ لرزہ شمع سوزاں میں
بنے جاتے ہیں آنسو سارے اولے چشم گریاں میں
زباں کا دیکھ کر دامن وہ اپنا منہ چھپاتی ہیں
تمنا ہے کہ نکلے دن ہی پھر اس شام کے بدلے
لگا دے پھر سبو ساقی فقط اک جام کے بدلے
ہمیں محسوس ہو گی موسم سرما کی پھر نرمی

غلام محمد وفا
(سابق مدیر تاج)

اٹھو خدا کے واسطے

اے ناصرانِ دینِ حق
سینے ہوئے جاتے ہیں شق
دُہراؤ پھر پہلا سبق
الٹو زمانے کا ورق
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

قرآں ہے از بر تو کیا
ہے تیغ پُر جوہر تو کیا
مردوں کے ہیں تیور تو کیا
اُٹھے دمِ محشر تو کیا
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

دل کا دکھانا چھوڑ دو
باتیں بنانا چھوڑ دو
حیلہ بہانہ چھوڑ دو
قصّہ فسانہ چھوڑ دو
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

گر دل میں کچھ بھی درد ہو
ٹھوکر میں دنیا گرد ہو
اسلام کی اک فرد ہو
تم بھی تو آخر مرد ہو
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

قیدِ علائق توڑ دو
آپس کے جھگڑے چھوڑ دو
باطل کا اب سر توڑ دو
ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دو
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

غفلت کی نیندیں سو چکے
کھونا جو تھا وہ کھو چکے
دامن کے دھبے دھو چکے
بس رو چکے اب رو چکے
اٹھو خدا کے واسطے
اٹھو خدا کے واسطے

محنت کرو انعام لو　　　ہاتھوں سے تو کچھ کام لو
گرتے ہوؤں کو تھام لو　　　اب تو خدا کا نام لو
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

غفلت کی اب تو حد نہیں　　　تم کو نہیں اس کا یقیں
آیا ہے وقت واپسیں　　　اٹھو کہ ہلتی ہے زمیں
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

ظلمت کا بادل چھا گیا　　　اب مہر دیں گہنا گیا
سینے میں دم گھبرا گیا　　　منہ کو کلیجہ آگیا
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

شر سے امیدیں خیر کی　　　مسلم ہوا ہیں دیر کی
پنجرے میں خواہش سیر کی　　　تم اور غلامی غیر کی
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

دامن سے دیں کو بھر چلو　　　دیدیں ہم اپنے سر چلو
جو کرنا ہے وہ کر چلو　　　مرنے سے پہلے مر چلو
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

دھبہ نہ آئے شان پر　　　آجاؤ اپنی آن پر
وقت آگیا ایمان پر　　　اب کھیل جاؤ جان پر
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

ہنستے ہیں اب تم پر عدو　　　طوق غلامی در گلو
کب تک زبانی گفتگو　　　بہہ جائے گھٹنوں تک لہو
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

کب تک یہہ بے پروائیاں　　　بس ہو چکیں رسوائیاں
چھوڑو بھی یہہ خود رائیاں　　　بس لے چکے انگڑائیاں
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

یہہ بھی کوئی انداز ہے　　　نامردیوں پر ناز ہے
پوشیدہ تم پر راز ہے　　　قدرت کی یہہ آواز ہے
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

آہیں سدا بھرنے لگے　　　افسوس کیا کرنے لگے
ڈر ڈر کے اب مرنے لگے　　　مرنے سے تم ڈرنے لگے
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

اٹھنے سے گر گھبراؤ گے　　　تم عمر بھر شرماؤ گے
دیکھو بہت پچھتاؤ گے　　　مرجاؤ گے مرجاؤ گے
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

بڑھنے لگیں بیماریاں　　　ہیں عزتیں اب خواریاں
آساں ہوئیں دشواریاں　　　کیا ہو گئیں خودداریاں
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

شکوے ہیں کیا تقدیر سے　　　قرآں پڑھو تفسیر سے
سیکھو سبق شبیرؑ سے　　　کھیلو دم شمشیر سے
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

اے خیر خواہان چمن!　　　برہم ہوئی وہ انجمن
اٹھو نہیں وقت سخن!　　　برباد ہوتا ہے وطن
اٹھو خدا کے واسطے　　　اٹھو خدا کے واسطے

شہید یار جنگ شہید



محایق احمد

بچّوں اور طلبہ کے لئے

ماں کی گود

ملک میں علمی بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور اہل قلم مختلف موضوعات پر معیاری ادب کی تخلیق میں سرگرم ہیں لیکن ابھی تک بچوں کیلئے دلچسپ ادب کی جانب اتنی کم توجہ کیگئی ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ "سب رس" کے ہر نمبر میں بچوں کیلئے آسان و سلیس زبان میں قصے، مضامین اور نظمیں پیش کی جایا کریں گی تاکہ ملک کا وہ ہونہار اور معصوم طبقہ جو آئندہ چلکر تعمیر ملت کا سرمایہ دار ہونیوالا ہے، بچپن ہی سے ایک سنجیدہ علمی ماحول میں اپنی آنکھیں کھولے۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ) نے کمسن بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس باب میں انکی قلم کاریوں کے نتائج ایک خاص وزن رکھتے ہیں۔

"سب رس"

امّی جان! آپ سے میں ڈرتا ہوں ۔۔۔ اور اقرار صاف کرتا ہوں
آپ ہو جاتی ہیں جو مجھ سے خفا ۔۔۔ دل مرا کھیل میں نہیں لگتا
کسی پہلو نہیں مجھے پھر کل ۔۔۔ تیوری پر جو آپ کی ہوں بل
آپ سے انس بھی بہت ہے مجھے ۔۔۔ خوب ہوتا ہوں خوش لپٹ کے گلے
دیکھ کر آپ کے لبوں پہ ہنسی ۔۔۔ روح ہوتی ہے باغ باغ مری
اِس سے پیاری نہیں مجھے کچھ شئے ۔۔۔ آپ کی گود مجھ کو جنت ہے

(۲)

نام سے ہوں سزا کے گھبراتا ۔۔۔ گھڑکیاں سُن کے دل ہی ہل جاتا
لیکن اِن سب سے ہے سوا امّی ۔۔۔ ایک تکلیف دہ سزا امی
سر میں آجاتا ہے مرے چکر ۔۔۔ آپ کہتی ہیں جب خفا ہو کر
"جاؤ بس میری گود سے نکلو ۔۔۔ آج سے میرے پاس مت بیٹھو
ہے تمہاری خطا کی بس یہہ سزا ۔۔۔ میں سمجھتی نہیں تمہیں بیٹا"

لطیف النساء بیگم بی۔اے

بی مینڈکی کی کہانی

بہت دن گذرے قلعہ گولکنڈہ میں ایک سپاہی رہتا تھا۔ اسکا ایک چھوٹا سا گھر تھا جسمیں صرف وہ اور اسکی بیوی رہتے تھے سپاہی نیک دل اور شریف آدمی تھا۔ اُسکو بچوں سے محبت تھی خود اسکے بچہ نہ تھا اسلئے اُداس اُداس رہتا تھا۔ جو کچھ میسر ہوتا کھاپی کر وہ روز آنہ سویرے نوکری کو چلا جاتا اسکے جانے کے بعد اسکی بیوی گھر کا کام کاج کرتی۔ جھاڑتی جھوڑتی۔ ہانڈی برتن دھو کر رکھتی سیون ہوتا تو کچھ سی پرو لیتی اور بارہ بجے کھانا پکا رکھتی۔

سپاہی صبح کا گیا دوپہر کو تھکا ہارا گھر واپس آتا۔ جو کچھ بیوی سامنے لا رکھتی کھا کر خدا کا شکر ادا کرتا اور ایک دو گھنٹے ستا لیتا۔ سہ پہر میں سپاہی کو بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ وہ عصر کی نماز پڑھکر گھر کا سودا سلف لانے جاتا۔ اناج ختم ہو جاتا تو کسی بنئے کے ہاں سے اُدہار لے آتا۔ پیسوں کی ضرورت پڑتی تو پڑوس کے مہاجن کے ہاں (کوئی چیز گروی رکھ کر) روپیہ دو روپئے سود پر لے آتا۔ بیوی کی فرمائشیں بھی اُسی وقت پوری ہوتیں۔ کسی سے ملنا ملانا ہو تو اُسی وقت جاتا۔ گھر کیلئے پانی بھی اسی وقت لاتا تھا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو جاتا تو دو چار گھڑی جی بہلانے پاس کی مسجد میں جا بیٹھتا۔ نماز پڑھکر گھر آتا دونوں میاں بی بی جو حاضر رہتا کھاپی کر خدا کا شکر کرتے اور تھکن کے مارے سویرے تک پڑکر سو رہتے۔ غرض زندگی اسی طور بُری یا بھلی کٹ رہی تھی۔ ایک دن کا کرنا کیا ہوا۔ سپاہی روز کی طرح گھڑا لیکر گھر سے چلا اور پانچ بجتے بجتے لنگر حوض پر پہونچا یہ قلعہ کے تالاب کا نام ہے برکھا کی رت تھی اور ساون کا مہینہ۔ آسمان پر بادل آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ کچھ کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ تالاب کے پانی میں بوندیوں سے ہزار ہا چھلے بنتے اور مٹتے جاتے تھے۔ تالاب کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا کر اور چاندی جیسے پانی پر بنتے بگڑتے نقش و نگار دیکھکر سپاہی کا دل کھل گیا۔ گنگناتا ہوا اترا۔ تالاب کے کنارے لہراتی ہوی ہری گھاس کو دیکھکر جی للچایا۔ گھڑا بازو رکھکر تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ دونوں پاؤں پانی میں چھوڑ دئے اور لہک لہک کر ایک گیت گانے لگا۔ اس تالاب میں ایک ننھی منی پانی کی پری رہتی تھی اسکو سپاہی کا گانا بہت بھایا اسنے ایک مینڈک کا بھیس بدلا اور سپاہی کی گود میں جا بیٹھی۔ سپاہی نے مینڈک کو پھینکا نہیں بلکہ برابر گاتا رہا جب گیت ختم ہو گئی مینڈک کود کر پانی میں چلی گئی۔ سپاہی نے گھڑا اٹھایا

پانی بھرا اور چپکا گھر واپس چلا آیا۔ بیوی نے ملامت بھری نظروں سے دیکھکر کہا "اتنی دیر کہاں تھے"۔

سپاہی کھسیانا ہوکر بولا "ذرا تالاب پر دیر ہوگئی"

دوسرے روز بھی یہی گذری۔ اب تو سپاہی کا معمول ہوگیا کہ روز شام میں کچھ سپیاری پان اور ایک پھولوں کا ننھا سا ہار لے کر تالاب کو جاتا۔ گھڑا رکھکر تالاب کے کنارے بیٹھ جاتا اور یوں پکار کر کہتا۔

سنو بیوی مینڈکی آیا تمہارا داسی

آؤ پانی کے بھار پہنو پھولوں کا ہار

کھاؤ پان سپیاری بیٹھو گود ہماری

ننھی پری فوراً مینڈک بن جاتی اور کود کر سپاہی کی گود میں جا بیٹھتی۔ وہ گیت گاتا یہ سنا کرتی گیت ختم ہوجاتا۔ سپاہی مینڈک کو سپیاری پان کھلاتا پھولوں کا ہار پہناتا۔ وہ پانی میں کود کر نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔ سپاہی کچھ دیر ٹکٹکی باندھے تالاب کی سطح کو دیکھتا رہتا پھر اپنا گھڑا بھرتا اور اداس چہرے اور تھکے قدموں سے گھر واپس آتا۔ اسطرح ایک مہینہ گذر گیا۔

سپاہی کی بیوی کو اسکا اسطرح غائب ہوجانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ہر روز وہ اسکو ٹوکتی۔ "ارے میں پوچھتی ہوں یہ تم جاتے کہاں ہو"۔ "کیا تم کسی دوسرے تالاب سے پانی لانے لگے ہو"۔ "نہ بھائی یہ روز روز کی جھک جھک مجھ سے نہیں ہوتی تم سات بجے پانی لاؤ تو میں پکاؤں کیسے" سپاہی بات بنا دیا کرتا "راستے میں ایک دوست مل گئے تھے" "چٹا بھول آیا تھا پھر پلٹنا پڑا" دن بھر کے کام کاج سے تھک جاتا ہوں دو گھڑی تالاب پر ٹک جاتا ہوں تو جی بہل جاتا ہے"۔

ایک دن کا کرنا ایسا ہوا کہ سپاہی کو کسی کام سے چھ بجے تک نوکری پر رہنا پڑا۔ وہاں سے وہ گھر دوڑا دوڑا آیا اور گھڑا اٹھاکر تیز تیز تالاب کو چلا۔ قسمت کا چکر جب گھبراہٹ میں گھڑا لینے جھکا تو جیب سے پھولوں کا ہار گر پڑا اور سپاہی کی بیوی کی نظر پڑ گئی لیکن وہ انجان بن گئی۔ جب سپاہی کچھ دور نکل گیا۔ تو اس نے چادر اوڑھی اور کوئی دس قدم کے فاصلے سے میاں کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ ہمیشہ کی طرح سپاہی نے بی مینڈکی کو آواز دی وہ دوڑی دوڑی آئی گود میں بیٹھ گئی پان کھایا پھول پہنے گانا سنا اور پھر پانی میں چلی گئی۔ سپاہی بے دلی سے گھڑا بھرنے لگا۔ اسکی بیوی فوراً پلٹ گئی اور اسکے آنے سے آنے گھر میں آموجود ہوئی۔

دوسرے روز بھی سپاہی کو کام تھا۔ روز کے وقت پراسکی بیوی گھر سے نکلی۔ تالاب پر آکر اسی الفت بھری آواز سے مینڈک کو پکارا۔ وہ فوراً باہر نکل آئی بیچاری کا نکلنا ہی تھا کہ سپاہی کی بیوی نے کھولتا ہوا پانی جو وہ ساتھ لائی تھی اُس پر انڈیل دیا غریب پری درد سے ہائے ہائے کرنے لگی۔ وہ اپنی اصلی صورت میں آگئی اور سپاہی کی بیوی سے کہا "بیگم تم نے مجھے ناحق مارا خدا گواہ ہے میں بے گناہ ہوں" یہہ کہکر پانی میں ڈوب گئی ہیبت اور خوف و ندامت سے سپاہی کی بیوی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اپنے کئے پر پچھتائی واپس آگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب سپاہی نے تالاب پر آکر پکارا تو جواب نہ ملا۔ کہتے ہیں کہ سپاہی کو ایسا صدمہ ہوا کہ اُس نے تالاب کے کنارے دھونی رمائی اور زندگی وہیں گزاردی وہ ہر روز اسی طرح پکارا کرتا اب بھی کہتے ہیں کہ راتوں میں اس سپاہی کی الفت بھری آواز یہہ الفاظ دہراتے سنائی دیتی ہے۔

سنو بیوی مینڈکی آیا تمہارا داسی
آؤ پانی کے بھار پہنو پھولوں کا ہار
کھاؤ پان سپاری بیٹھو گود ہماری

لطیف النساء بیگم بی - اے

اجل کا فرشتہ

غریبوں کے گھر میں، کسانوں کے گھر میں
تڑپتے ہوئے بے زبانوں کے گھر میں
جہاں جان دیتے ہیں معصوم سارے
جہاں کے ہیں انسان مغموم سارے
جہاں لٹ رہی ہے، کسانوں کی دولت
جہاں بک رہی ہے شریفوں کی عزت
تڑپتے ہیں فاقوں سے انسان جس جا
ترستے ہیں پانی کو حیوان جس جا
جہاں کھیتوں پر تباہی ہے آتی
کسانوں کی لٹتی ہے جس جا کمائی
جہاں کوئی سنتا نہیں ہے کسی کی!
جہاں ہے حکومت فقط بے حسی کی

جہاں کے امیروں پہ خواب گراں ہے
"اجل کا فرشتہ" وہیں حکمراں ہے

سعادت علی

جشنِ نوروز

پپا کا نظام آباد آنے کے بعد پہلے ہی موقعہ پر جشنِ نوروز منانے کا خیال تھا۔ مگر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اہلِ نظام آباد ان مسرتوں سے ہم آغوش نہ ہو سکے۔ امسال یہہ ممکن نہ تھا کہ گزشتہ کی طرح ان کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا جائے۔ پندرہ روز پہلے سے علی ساگر جیسے خوشنما مقام پر انتظامات ہونے لگے یہہ نہایت خوش منظر تالاب ہے۔ جسکو دیکھنے کے لئے نظام ساگر کے بعد لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اگرچہ علی ساگر بڑا نہیں مگر علی نواز جنگ کے فن انجینرنگ کا مکمل نمونہ ہے اس خوش اسلوبی سے چمن بندی کی گئی ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے جھولے اور پھسل بنڈے بھی لگائے گئے ہیں۔ تالاب کی تین جانب پہاڑ ہے اور چوتھی سمت میں چھوٹا سا خطہ ہے جہاں چمن بندی کی گئی ہے۔ چمن سے متصل پہاڑ کو ایک خوشنما بنگلہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اور پہاڑ کاٹ کر ایک پیچدار راستہ بنایا گیا ہے جس کے ذریعہ سے بنگلہ تک موٹر بہ آسانی پہنچ سکتی ہے۔

بنگلہ پر سے منظر عجیب اور دلفریب ہے۔ سیدھی طرف علی ساگر کا موجیں مارتا ہوا نیلا پانی پہاڑ کے قدموں کو اپنی زبان نکالے ہوئے چاٹ رہا ہے۔ بائیں جانب سڑک سے کچھ پرے دھان کے ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے کھیت نسیم کے ہلکے ہلکے محبت بھرے تھپیڑوں سے بیخود ہو کر جھوم رہے ہیں۔ دور سے ایک ایک کھیت ایک ایک کیاری معلوم ہوتا ہے۔ سامنے علی ساگر کا چمن ہزاروں گلہائے آرزو بداماں لئے کھڑا ہے۔ اور عیدِ نوروز کی خوشی میں پھولے نہیں سماتا۔ خوش وضع فرنیچر نے بنگلہ کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ اور اس پر علی نواز جنگ بہادر کی فوٹو، نظام ساگر کے دلکش مناظر کی چند تصاویر، اور بعض اصحاب کی نظموں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

تالاب کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو "مامن طیور" کہلاتا ہے۔ اس جگہ شام کے وقت اس قدر بگلے جمع ہوتے ہیں کہ تمام جزیرہ کے درخت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سفید پھولوں کے ہار پہنے کھڑے ہیں۔ مغرب کے وقت یہہ سماں اور زیادہ نظر فریب ہو جاتا ہے شفق کی دلفریب سرخی جب اپنا رنگ خاموش پانی کو مستعار دینے لگتی ہے تو کون سا دل ہو گا جسمیں ہیجان بپا نہ ہو۔ ہماری نگاہیں ان مناظر کو احاطۂ نظر میں لینے کے لئے بیچینی سے اِدھر اُدھر دوڑتی تھیں۔ اور جوں جوں دن گزرتا ہماری وارفتگی میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا

جشن کے چار روز قبل پیا نے علی ساگر کا دورہ کیا اور ہمارے لئے ایک خوشنما مقام منتخب کر آئے۔ ساتھ ہی ایک اور تفریح کا مژدہ بھی سنایا۔ سب بچوں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا "ہم کل ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جو بہت خوبصورت ہے اور صرف ان بچوں کو لے جائینگے جو جشن نوروز عثمانی میں شریک ہونا نہیں چاہتے"۔ مگر کون اس میلہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور یہہ بھی گوارہ نہیں ہوسکتا تھا کہ کل کی تفریح سے گو نامعلوم مقام ہی کی سہی ۔ ہاتھ دھو بیٹھیں۔ عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔ کبھی سوچتے کہ کل کی تفریح ہی سے لطف اندوز ہوں کہ کل کی مرغی سے آج کا انڈا بہتر ہے مگر جب علی ساگر کے مناظر یاد آجاتے تو اس نامعلوم سفر سے جی ہٹ جاتا۔ بالآخر یہہ طے پایا کہ قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جائے۔ سب کی رائے پر چند چٹھیوں پر کل کا دن لکھا گیا اور چند پر نوروز کے میلے کا دن سبھوں نے ایک ایک چٹھی اٹھالی کل جانے والوں کی تعداد بہ نسبت میلے والوں کے زیادہ ہی تھی۔ مگر یہہ طریقہ بھی کارآمد ثابت نہیں ہوا سبھوں کا یہی خیال تھا کہ دونوں مقامات کی سیر کریں۔ خوش قسمتی سے تحصیلدار صاحب بھی چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انکی موٹر میں مردانہ تھا اور ہماری موٹر میں زنانہ ان بکھیڑوں کے بعد صبح کے نو بجے ہم سب یہاں سے روانہ ہوئے۔ ہم اب نظام ساگر کی سڑک پر دوڑ رہے تھے۔

گیارہ بجے کے قریب منزل مقصود پر پہونچے۔ جبکہ فلڈ گیٹس کچھ کھلے ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے پہونچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سب دروازے بند ہو گئے۔ پانی کے رکتے ہی ہم ندی میں اتر پڑے۔ اس وقت تک پانی کا بہاؤ بہت کم ہو گیا تھا: اور جن بلند مقامات سے پانی بہہ گیا تھا وہاں چھوٹی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں کبھی ابر چھا جاتا اور کبھی دھوپ چمکنے لگتی مگر توبہ کیجئے جو کچھ احساس ہوا ہو۔ ہم نے پانی میں اتر کر چھوٹی بڑی تڑپتی ہوئی مچھلیوں کا ہاتھ سے خوب شکار کیا۔ پانی سب کا سب بہہ چکا، مچھلیاں بھی نہیں رہیں تو دھوپ کی حدت ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور ہم ۲ بجے کے قریب لوکل فنڈ ڈاک بنگلہ میں پہونچے خلاف عادت ورزش سے اچھی طرح تھک گئے تھے۔ بھوک سے سب بیتاب ہو رہے تھے۔ جو بھی ملا دوپہر کا کھانا کھایا چار بجے تک گنجفہ سے دل بہلاتے رہے اور جب دھوپ میں نرمی آگئی تو تالاب پر پہونچے پیا نے انجینیر صاحب متعلقہ سے کہکر ہماری خاطر ڈیپ سلوس کھلوانے کا انتظام کیا تھا عجیب محو کن منظر تھا جب پانی دروازوں میں سے نکل کر سامنے کے پتھروں سے ٹکرا کر بلند ہوتا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک عظیم الشان پہاڑ برف کی چادر اوڑھے کھڑا ہے۔ بڑی دیر تک ہم لوگ مجسم حیرت بنے کھڑے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ابر نے بھی گوہر باری شروع کر دی۔ مگر ہوش کسے تھا جو اس زحمت سے گھبرا جاتے۔ نگاہیں اس پانی کے ستون پر کچھ اسطرح جمی تھیں کہ ہٹائے نہ ہٹ سکیں۔ دروازے مغرب سے کچھ پہلے بند کر دئے گئے۔ مگر اب کی دفعہ ہم مچھلیوں کے شکار کا لطف حاصل نہ کر سکے۔ مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا۔ اور ساڑھے نو بجے پھر نظام آباد میں تھے۔ تھکے ہوئے آئے تھے۔ مگر سوتے تو کیونکر شب معراج تھی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

اسکے بعد دوسرے دن جشن نوروز تھا۔ جس کی خوشی ہمارے لئے عید کی خوشی سے کم نہ تھی۔ آج ہی سے تیاریاں شروع ہو گئیں اہل ذوق حضرات کو اشعار لکھنے کی فکر تھی۔ کیونکہ وہاں مشاعرہ بھی ہونے والا تھا طرح مصرع یہہ دیا گیا تھا۔ ع

علی ساگر چلو نوروز عثمانی ہے میلہ ہے

ہونگے کوئی فکر مضمون میں پیچاں و غلطاں مگر ہم تو اپنے چلنے کی تیاری میں محو تھے۔ بارے انتظار کی گھڑیاں کٹیں اور وہ رات آئی

جس کا اختتام صبح سعادت پر ہونیوالا تھا۔ پپا نے فرمایا تھا کہ صبح کے تین بجے ناشتہ تیار ہوجائیگا۔ اور ۵ بجے علی ساگر روانہ ہو جائینگے۔ اسی دن دوپہر کی گاڑی سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے تشریف ارزانی فرمائی تھی۔ آپ اس جشن میں شرکت کی غرض سے مدعو کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ اور دو۲ چار مہمان آنیوالے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں نہ آسکے۔

ہمارا ارادہ جلد سوجانے کا تھا تاکہ علی الصباح اٹھ سکیں۔ کیونکہ پپا نے سنا دیا تھا کہ جو جلد تیار نہوگا وہ چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر خوشی میں نیند کسے آتی تھی۔ صبح کے میلہ کا تذکرہ کرتے کرتے گیارہ بج گئے۔ اب یہہ خیال ہوا کہ کسی طرح سورہیں۔ سب اپنے اپنے بستر پر لیٹ رہے اور بہت جلد عالم رُویا کی سیر کرنے لگے۔ صبح چار بجے اتفاقاً ایک کی آنکھ کھل گئی ؎

شکر خدا کہ شام امید زمانہ را صبح طرب ز مطلع عز و شرف دمید

انہوں نے ایک ایک کو جگانا شروع کیا۔ بہت جلد سب لوگ اٹھکر منہ دھو تیار ہو گئے۔ مگر پپا اور دوسرے بزرگ اب تک سو رہے تھے صبح کا وقت ہم نے باغ میں گزارنا مناسب جانا۔ تھوڑی دیر میں سب بیدار ہو گئے۔ مگر جب تک یہہ تیار ہوں آٹھ بج گئے۔ اب ناشتہ ہوا اور ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ موٹر میں سوار ہو کر علی ساگر پہونچ گئے۔ ابر کی وجہہ سے اب تک صبح کا سماں نظر آرہا تھا۔ زنانہ کیلئے علی ساگر کے داروغہ صاحب کا سفال پوش بنگلہ خالی کرادیا گیا تھا جو سرکاری انسپکشن بنگلہ کی پہاڑی کے بالکل محاذی پہاڑی پر واقع ہے جب ہم وہاں پہونچے تو ہُو کا میدان تھا پپا ہمکو یہاں چھوڑکر خود چمن میں چلے گئے۔

ہم بھی اس پہاڑ کے چکر لگانے کے خیال سے باہر نکلے مگر جھاڑی بہت تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے ہمراہ تھے۔ نہ یہہ ساتھ چل سکتے تھے اور نہ ان کو چھوڑا جاسکتا تھا۔ والدہ صاحبہ ابھی آئی نہ تھیں۔ سب میں بڑی میں تھی اس لئے سب ذمہ داری مجھ پر پڑی۔ بالآخر بڑے بچوں نے چھوٹوں کو گود میں اٹھالیا۔ اس سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے کہ رات کو انسپکشن بنگلہ میں ایک بارہ۱۲ سالہ لڑکا سو رہا تھا۔ کہ سانپ کاٹا اور وہ صبح دس بجے تک ختم بھی ہو گیا۔ یہہ خوف بالکل تازہ تھا۔ بہرحال ہم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی دور جانے کے بعد جھاڑی اور پتھروں میں بچوں کو لیکر چلنا بہت دشوار معلوم ہونے لگا۔ ساتھ ہی سانپ کا اندیشہ تھا۔ واپس ہوجانا پڑا۔ مکان پہونچے تو مالک مکان کی ہمشیرہ ہمارے ہی انتظار میں تھیں۔ تھوڑی دیر میں والدہ صاحبہ بھی آگئیں۔ اور دوسرے مہمانوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا چند پارسی عورتیں بھی آئیں۔ اسطرح تقریباً پچیس۲۵، تیس۳۰ خاتونوں کا چھوٹا سا میلہ جم گیا۔ یہاں سے جشن نوروز کے میلہ کی دوکانات وغیرہ تو نظر نہیں آرہی تھیں البتہ چکر کا جھولا اور باغ کا منظر سامنے تھا۔ وقت گزاری کے لئے ہم سب نے گنجفہ کھیلنا شروع کیا۔ بچوں کی پارٹی الگ تھی اور بڑوں کی الگ۔ اسمیں سب دو۲ بجے تک مصروف رہے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھاکر انہوں نے اپنے اپنے توشہ دان کھولے دسترخوان بچھے ہیں ناکافی ثابت ہوا۔ مگر کوئی اور جگہ تھی بھی نہیں۔ کمرے اس سے بھی چھوٹے تھے۔ بہرحال دب دباکر کسی طرح بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں خوب کھا گئے۔ کھانے کے بعد کچھ لوگ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

ہماری خوش قسمتی سے ایک قصہ گو خاتون ہمیں مل گئیں ہم نے ان سے ایک کہانی سنی تھی کہ بازو کے کمرے سے گانے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بھلا گانے کے آگے کہانی کا کیا لطف ہو سکتا تھا۔ ہم بھی وہیں پہونچ گئے۔ پارسی خواتین گا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر گانا سنتے رہے

اِس کے بعد ایک چھوٹی سی نہر پر پہونچے جو مکان کے دامن میں سے بل کھاتی چلی جاتی ہے وہاں پہونچکر منہ ہاتھ دہوئے۔ چند شریر طبیعتوں کو پانی کھیلنے کی سوجھی۔ مگر کپڑے ساتھ نہیں لائے تھے اور دھوپ بھی ڈھل چکی تھی سکھا لینے کا بھی موقعہ نہ تھا۔ اِس لئے خاموش ہو رہے پانچ بجے ہونگے کہ چاء بنی اور ہماری موٹر بھی آگئی۔ ہم مشاعرہ سننے کے لئے تیار ہوگئے۔ یوں تو چار روز پہلے ہی سے ہم بیا کو مجبور کر رہے تھے کہ ہم بھی مشاعرہ سننے گیں۔ مگر بیا باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا کرتے۔ ہم سب ممنون و مشکور ہیں ڈاکٹر زور کے کہ انہوں نے پپا سے سفارش کر کے ہمارے لئے موٹر روانہ کی۔ اور ہم مقام مشاعرہ پر پہونچ گئے۔ اور موٹر میں بیٹھے بیٹھے نظمیں اور غزلیں سنیں۔ تلنگی اور اردو میں ایسی پھڑکتی ہوئی نظمیں سنائی گئیں کہ مجمع مجسم حیرت بن گیا۔ مزاحیہ غزلوں پر پیٹوں میں بل پڑ جاتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے بھی اپنا کلام سنا کر سامعین کو مشکور ہونے کا موقعہ دیا۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ اور ہم پھر اپنے کنج قفس کی طرف رخ کئے نظر آئے۔

اِس طرح پُر مسرت اور خوشگوار جشن کا دن دیکھتے دیکھتے ختم ہوگیا۔ ہم سب گھر پہونچنے کے بعد اس قدر تھک گئے تھے کہ اکثروں کو رات کا کھانا بھی بار تھا۔ نیند کی میٹھی لوریوں میں بھوک کا احساس بھی نہ رہا۔ اب تک ہماری زبانیں جشن نوروز کے تذکرہ سے تھکتی نہیں ہیں۔

رضیہ بیگم (بنت قاضی زین العابدین)

سلکِ ثریّا

جہاں امید نہیں کوشش نہیں ہوسکتی۔

شہرت وہ سورج مکھی ہے جس میں خوشبو نہیں۔

اگر تم مصیبت میں کانپتے ہو تو بزدل ہو۔

حسد ایک قسم کی خودکشی ہے۔

مخلوق کی خدمت خدا کی خدمت ہے۔

بزدل موت سے پہلے کئی بار مر چکتا ہے۔

بہادر وہ نہیں جو شیر مارے بلکہ وہ ہے جو نفس کو مارے۔

ترقی کے سیار میں بہت گنجائش ہے مگر بیٹھ رہنے میں نہیں۔

ترجمہ۔ ثریا جبیں (زنانہ کالج نام پلی)

سفرِ انگلستان کی ڈائری

چند اوراق

پچھلے سال مئی میں ہمیں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ میرا ہندوستان سے باہر نکلنے کا پہلا توقع تھا اس وجہ سے دوران سفر میں اور منزل پر پہونچ کر بھی اکثر باتیں مجھے بہت دلچسپ اور نئی معلوم ہوتی تھیں میں کوشش کرتی تھی کہ ان کو یادداشت کے طور پر لکھ رکھوں یہاں سے نکلتے وقت میں نے ارادہ بھی کیا تھا کہ اپنے سفر کے حالات کی ایک مکمل ڈائری رکھوں گی لیکن وہاں پہونچ کر مجھ سے اس کی پابندی نہ ہو سکی۔ بعض اوقات تمام دن گھوم کر شام کو جب ہم لوگ گھر لوٹتے تو اس وقت ڈائری لکھنا دوبھر ہو جاتا۔ دوسرے دن جب تھکن اترتی تو بعض ضروری حالات محض یادداشت کے لئے مختصر پیرائے میں لکھ کر رکھ لیتی ذیل کی سطریں میری اسی ڈائری کے چند اوراق کا خلاصہ ہیں۔

۱۷ر اگست ۱۹۳۶ء (لندن)

آج شام ہم لوگ اسٹرانڈ پیالیس ہوٹل میں مدعو تھے۔ کھانا کھا کر وہاں سے پیدل لوٹنے کا ارادہ کیا۔ راستہ میں مجھے ایک جگہ ٹرام گاڑی زمین کے اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے پہلے سنا تھا کہ یہاں ایک ایسی سڑک بھی ہے جہاں سے ٹرام زمین کے نیچے سے ہو کر گذرتی ہے۔ لیکن اب تک اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے میں کھڑے ہو کر بغور دیکھنے لگی اس جگہ سے ٹرام زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور چونکہ زمین کے نیچے ٹیوب (لندن کی زمین دوز ریلیں جن کے اسٹیشن بھی زیر زمین ہی ہوتے ہیں) کی طرح کا اسٹیشن نہیں ہوتا اس لئے رکنے اور مسافروں کو لینے کے لئے بہت دور جا کر پھر زمین کے اوپر ہی آنا پڑتا ہے۔ میں نے یہاں کھڑے ہو کر ٹرام کے نیچے اترنے کا تماشہ دیکھا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ڈھلوان سا راستہ ہے جسکے اوپر سے ٹرام گویا پھسلتی ہوئی زمین کے اندر غائب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ٹرام کے راستہ میں ایک بجلی کا تار ہوتا ہے جسے وہ اوپر ایک ڈنڈے سے چھوتی ہوئی جاتی ہے۔ یہاں وہی تار دونوں پٹریوں کے بیچ میں سے گذرتا ہے۔ ٹرام بالکل دو منزلہ بسوں کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کی بسیں بھی لمبائی چوڑائی میں ہندوستان کی ٹرام سے کم نہیں ہوتیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ نشستیں کافی کشادہ اور آرام دہ ہوتی ہیں قریب قریب نہیں بیٹھنا پڑتا بڑے بڑے شریف لوگ انہیں بسوں اور ٹراموں میں سفر کرتے ہیں۔ یہاں کی آمد و رفت کا ذریعہ بھی بسیں یا زیر زمین ریلیں ہیں۔ کوئی کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو ہر وقت کرایہ کی موٹر گاڑی میں مارا مارا نہیں پھر سکتا جب تک کہ اس کی اپنی ذاتی موٹر گاڑی نہ ہو۔ اسکے علاوہ ایک سے دوسرے مقام تک اتنا زیادہ فاصلہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر سواری کے پہونچنا ناممکن ہے۔ ہندوستانی مردوں کے علاوہ ہندوستانی عورتیں بھی یہاں کافی تعداد میں ہیں اور برابر جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھار آنے جانے کے لئے ٹیکسی استعمال کی جا سکتی ہے یہاں باہر آنا جانا روز ہی ہوتا ہے۔ ہم ہندوستانی گھروں میں رہنے کے عادی ہیں لیکن یہاں شام کو کمروں میں نہیں رہ سکتے کہیں نہ کہیں

جانے کو جی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مکانات بہت تنگ ہیں۔ شہر کے باہر جن لوگوں کے اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں ان کو تو گھر بیٹھے ہی کھلی ہوا مل جاتی ہے مکان سے ملحق جو باغ ہوتے ہیں ان میں بھی شام کو بیٹھ سکتے ہیں لیکن شہر کے رہنے والوں کو خاص کر لندن میں رہنے کے لئے زیادہ تر فلیٹ ہی ملتے جن میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو کمرے ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ ہوتا ہے۔ اتنی تنگ جگہ میں زندگی بسر ہوتی ہے شام کو لامحالہ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ کہیں آنگن یا دالان ہوتا نہیں۔ چلنا ہو تو کمرہ سے باہر سڑک پر ہی نکلنا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ ہم لوگ ہندوستان میں بھرے گھر میں رہنے کے عادی اگر اتفاق سے کوئی رشتہ دار ساتھ رہنے والا نہ ہو تو کم از کم تین چار نوکر مامائیں تو ضرور سامنے رہتی ہیں۔ برخلاف اس کے یہاں آکر بالکل اکیلے رہنا پڑتا ہے میرا اکیلے گم سم بیٹھے بیٹھے جی گھبرا جاتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ تھوڑی دیر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سڑک کا تماشہ دیکھ لیا۔ یہاں کے لوگ تو اکیلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ لڑکیاں بھی جہاں کمانے کے لائق ہوئیں۔ ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہیں

یہاں والے کام کے بہت عادی ہوتے ہیں۔ ہر عورت یا لڑکی خود کماتی ہے چھوٹے چھوٹے لڑکے تک کہیں نہ کہیں کام میں ضرور لگے رہتے ہیں۔ ہوٹلوں چائے خانوں اور سینماؤں میں آٹھ آٹھ دس دس برس کے لڑکے وردیاں پہنے نہایت ادب و تمیز سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر سینما میں ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوں تو سیڑھیوں پر راستہ بتانے ایک لڑکا کھڑا ملے گا۔ کوئی دروازہ سامنے ہوا تو جھٹ بڑھ کر کھول دیگا۔ ورنہ آٹھ دس برس کا لڑکا اپنی ہی جگہ کھڑے اکڑ سے بولے گا Through the lounge please کیا مجال جو اسکی گردن تک ٹیڑھی ہو جائے یا اپنے کام میں کسی طرح کی سستی کرے۔ ہندوستان میں بھی اکثر جگہ لڑکے کام کرتے ہیں۔ مگر اس طرح مستعد اور فرض شناس نہیں ہوتے۔ بہت کم ایسے ہوں گے جو اپنے فرض کو پہچانتے ہوں ورنہ باقی تو لکڑی کے زور پر کام کرتے ہیں ہمارے یہاں اگر ایک چھوٹے لڑکے کو اس طرح کام پر کھڑا کیا جائے تو وہ یقیناً کبھی تھک کر دیوار سے سہارا لے گا۔ کبھی ایک پاؤں پھیلا کر کھڑا ہو جائے گا یا اگر کوئی دیکھنا نہ ہو تو سیڑھیوں پر ہی بیٹھ کر وہیں سے حکومت جتائے گا۔ لیکن یہاں کے لڑکے کیا مجال جو کبھی دیوار سے بھی ٹیکا لگا کر کھڑے ہوں ہر وقت مستعدی سے کام کے لئے موجود رہتے ہیں۔ یہاں کا بچہ بچہ محنت کا عادی اور اپنی ذمہ داری کو پہچانتا ہے اسی لئے یہ لوگ خوش حال اور فارغ البال نظر آتے ہیں۔

یہی باتیں ہیں جو اس قوم کے عروج کا باعث ہیں ہم لوگوں کو اپنی موجودہ پستی کی حالت پر نظر کرتے ہوئے غور کرنا چاہئے کہ ہم میں کیا کیا خامیاں ہیں جو ہمارے زوال کا باعث ہیں۔ جب تک ہم دوسروں کی بھلائیوں کو نہ دیکھیں گے اس وقت تک اپنی برائیوں کو دور نہیں کر سکتے ہمارے ملک میں بیکاری اور نکما پن بہت ہے۔ جن کو نوکریاں نہیں ملتیں انہیں بے روزگاری کا رونا ہے اور جو برسر روزگار ہیں انہیں کاہلی کی وجہ سے نوکری نبھانا نہیں آتی۔

عموماً شام کا وقت ہر ایک کے گھر لوٹنے کا ہوتا ہے اس وقت سڑکوں پر آمد و رفت بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ٹریم بسیں ریلیں سب بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ بیٹھنے کے لئے بھی جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ لندن کی آبادی اور آمد و رفت اتنی زیادہ ہے جب ہی ان لوگوں کو زمین کے اندر بھی ریلیں چلانی پڑی ہیں۔ سڑکوں پر یہ حال ہے کہ پکیڈلی (لندن کا ایک مشہور وسطی محلہ) میں ایک ایک جگہ سے پانچ پانچ منٹ میں

دو دو سو موٹریں گذرتی ہیں۔ پیدل کا راستہ الگ ہے مگر پھر بھی جب کبھی لوگوں کو سڑک پار کرنی ہوتی ہے تو دیر تک کنارے کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا ہے تب کہیں بیچ سے نکلنے کا راستہ ملتا ہے۔ بعض وقت تو ایک غول کا غول جمع ہو جاتا ہے۔ اسی انتظار میں کہ ادھر کی آمد و رفت رکے تو سڑک پار کریں۔ اسی لئے زمین کے نیچے بھی ریلیں چلائی ہیں۔ خاص کر لندن کے نیچے تو ریلوں کا پورا ایک جال بچھا ہوا ہے۔

آج شام کو جب میں اپنے بھائی کے ساتھ ان کے مکان سے اسٹیشن لوٹ رہی تھی، تو سامنے ایک موٹر نظر آئی جسکے پیچھے ایک بڑا سا سرخ روشنائی کا لکھا ہوا "L" لٹک رہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں یہ قاعدہ ہے کہ جسکے پاس مستقل لائسنس نہ ہو اور وہ سیکھنے کی غرض سے موٹر چلاتا ہو تو اسے اپنی موٹر کے آگے اور پیچھے جلی خط میں "L" لٹکانے پڑتے ہیں تاکہ دوسرے ڈرائیور سمجھ جائیں کہ حضرت نو سیکھ ہیں اور ان سے بچ کر چلنا چاہئے۔ میرے خیال میں تو یہ بہت اچھا قاعدہ ہے۔ نو آموز کو بہت آسانی ہو جاتی ہے وہ خود بھی احتیاط کرتا ہے اور دوسرے بھی اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہاں کی ہر ایک بات ہندوستان سے مختلف ہے گھسیارہ گھاس بھی کاٹتا ہے تو وہ بھی شان سے ان لوگوں کے واسطے ہر طرح کی آسانیاں ہیں۔ ہر ایک کام کو جلدی انجام دینے کی ترکیبیں نکالتے ہیں۔ میں نے راستہ میں دیکھا کہ ایک جگہ سڑک کے نیچے لمبی لمبی گھاس تھی اور دو دو آدمی کھڑے ہوئے کاٹ رہے تھے۔ ان کے کھرپے کی ڈنڈی تقریباً ڈیڑھ گز لمبی ہوگی اور اسکے نیچے کوئی آدھ گز لمبا خمدار پھل لگا ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے اطمینان سے ڈنڈا ہلا رہے تھے اور نیچے جڑ سے گھاس کٹتی چلی جا رہی تھی۔ آدھ گز لمبا پھل تھا منٹوں میں جگہ صاف ہو رہی تھی۔ یہ کٹ جائے گی تو کسی موٹر پر ساری گھاس لاد کر لے جائیں گے اگر ہندوستانی گھسیارہ ہوتا تو وہ بیچارہ سارا دن ایک چار انگل کی کھرپی سے بیٹھا گھاس کھودتا رہتا اور شام کو سر پر رکھ آہستہ آہستہ گھر کو روانہ ہوتا۔ ان کے کام کرنے کے طریقہ میں اتنا فرق ہے تو پھر حالت میں کیوں نہ ہو۔ یہی گھسیارہ شام کو اچھے لباس میں سینما میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوگا۔

میرے وہاں کے زمانۂ قیام میں لندن یونیورسٹی کی نئی عمارت بن رہی تھی۔ ہم لوگوں کا اکثر شام کو ادھر سے گذر ہوتا تھا اس وقت مزدور دن بھر کا کام ختم ہونے کے بعد گھروں کو واپسی کی تیاریاں کرتے تھے کوئی کوٹ پہنتا ہوتا کوئی اپنا اٹیچی کیس سنبھالتا نہ ان کے ہاتھوں اور پیروں میں چونا چھپا ہوا اور نہ ان کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہوتے ایک ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس (چاہے وہ سستا سا دفتی کا ہی کیوں نہ ہو) یا کوئی ڈبہ سا تقریباً ہر ایک کے پاس ہوتا جن میں وہ لوگ اپنا دن بھر کا کھانا اور دوسری ضروریات کا سامان لاتے ہیں اور چار چار یا پانچ پانچ کی ٹولیاں بنا کر ہنستے بولتے گھروں کو روانہ ہوتے اس وقت مجھے ہندوستان کے غریب مزدور یاد آتے انکی اور انکی حالت میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے ان بیچاروں کو تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہیں جو دن بھر کی جانفشانی کے بعد پسینے میں تر بتر افتاں و خیزاں گھروں کو لوٹتے ہیں اور تمام دن ٹوکریوں میں اینٹیں بھر بھر کر پاڑوں پر سے اترنے چڑھنے میں گذرتا ہے۔ برخلاف اس کے یہاں ہر کام مشین سے لیا جاتا ہے۔ جہاں کوئی عمارت بنتی ہو وہاں کرین لا کر کھڑے کر دیتے ہیں۔ مزدوروں کے اترنے چڑھنے کے لئے لفٹ لگا دی جاتی ہے اور کام دگنی اور چوگنی رفتار سے ہوتا ہے اس سے زیادہ اور کیا سہولتیں چاہئیں۔

طیبہ بیگم (زنانہ کالج نامپلی)

مدرسہ کا وقت

افراد ڈرامہ

نسیمہ اور شمیمہ ——— دو بہنیں

اکبر اور اختر ——— دو بھائی

نسیمہ (شمیمہ کو جھنجھوڑ کر) آپا جان۔ آپا جان اٹھو گی بھی یا نہیں؟ کتنا دن چڑھ گیا چھٹی کا دن تو ہے نہیں جو بے فکری سے نو بجے تک سوتی رہو گی۔

شمیمہ۔ اے ہے۔ سونے بھی دو۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ پندرہ منٹ میں تیار ہو جاؤں گی کیا بجا ہے؟

نسیمہ۔ پونے سات ہو گئے آپ کو ہوم ورک بھی تو کرنا ہے۔ نماز تو روز ہی قضا ہوتی ہے۔

شمیمہ۔ ایں سات بج رہے ہیں! ہاں وہ مضمون بھی تو لکھنا ہے۔ کل تمام دن تو یوں ہی ضائع ہوا چھٹی کا دن تو آنکھ جھپکاتے گزر جاتا ہے (شمیمہ پلنگ سے اٹھتے ہی ننگار کو بلا کر کپڑے جلدی نکالنے کی تاکید کرتی ہے اور بڑی بی کو ناشتہ لانے کی اور خود ضروریات سے فارغ ہو کر قضا نماز کی نیت کرتی ہے)

اختر۔ اوہو یہ کل دو پہر اٹھ گئیں! ابھی کیا جلدی تھی موذن نے اذان بھی نہیں دی اور یہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ شاید امتحان قریب ہے۔ آخر اللہ میاں کو بھی تو راضی کریں۔

شمیمہ۔ آپ تو بڑے نمازی ہیں۔ ذرا دیر ہو گئی تو ایک منہ سے ہزار سنا رہے ہیں۔ رات ممانی جان کے ہاں سے آتے تک ہی گیارہ بج گئے تھے۔ صبح جلدی آنکھ نہ کھلی تو کیا کریں۔ (شمیمہ لکھنے کی میز پر جا کر کتابیں الٹ پلٹ کرتی ہے لیکن مضمون نویسی کی کاپی نہیں ملتی۔ میز پر سے سب کتابیں ہٹاتی ہے۔ کمرے کا کونہ کونہ دیکھتی ہے۔ پھر نسیمہ سے بھی پوچھتی ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ کاپی مدرسے ہی میں رہ گئی۔ کچھ تردد کے بعد میز پر جا بیٹھتی ہے کہ مسودہ تیار کرے نقل کرنی رہ جائیگی اور وہ کسی فرصت کے گھنٹے میں کرے گی تین چار منٹ سب سامان یکجا کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔ پہلی دفعہ جوں ہی قلم کاغذ پر چلتا ہے تو سیاہی ہی سیاہی نظر آتی ہے دیکھتی ہے تو بغیر نب کا قلم ہے۔ غصہ میں آ کر کاغذ و قلم زمین پر دے مارتی ہے اور نسیمہ کو آواز دیتی ہے، نسیمہ آتی ہے مگر بہن کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر سبب دریافت کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔

شمیمہ۔ تمھیں ہزار بار سمجھا دیا کہ میری چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا کرو۔ لیکن تم سنتی نہیں ہو۔ بیوی بٹو کو خود تو رتی برابر سلیقہ نہیں ہاں دوسروں کی چیز بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

نسیمہ۔ آپا آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں میری تو سمجھ میں بھی نہیں آیا کیا معاملہ ہے۔

شمیمہ۔ ہاں تمہاری سمجھ میں اب کیوں آنے لگا۔ الٹا چور کوتوال ڈانٹے۔ اب تمھی بنتی ہیں۔ قلم میں سے نب جانے کس وقت غائب کر دی

یہ بھی کوئی مذاق کا وقت تھا۔ مجھے زک دیتی ہے کہ دیر ہو جائے اور کام بھی نہ ہو۔

نسیمہ۔ واہ آپ میرے سر کیوں الزام تھوپتی ہیں مجھے کیا غرض آپ کی چیزیں کھونے اور مذاق کرنے سے۔ اکبر میاں کل اپنی کھیلنے کی موٹر میں ٹھونس رہے تھے کہ اس کی کنجی کھو گئی ہے ملتی ہی نہیں۔ ٹوٹ گئی ہوگی۔

(شمیمہ، نسیمہ کو وہیں چھوڑ کر میاں اکبر سے باز پرس کرنے جاتی ہے۔ اکبر خوب ہنس رہا ہے منجن سے آدھا منہ کالا ہو رہا ہے۔ اور نگار ہاتھ پکڑے تلملا رہی ہے۔ نگار (شمیمہ کو دیکھتے ہی) دیکھئے بی بی منہ دھونے کے لئے گھنٹہ بھر سے پریشان کر رہے ہیں۔ کبھی پانی اوندھاتے ہیں تو کبھی لوٹے میں صابن گھولتے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ انگلی میں چوٹ لگ گئی ہے میرے دانت مانجھ دے مجھ شامت کی ماری نے جوں ہی انگلی منہ میں دی۔ جھٹ طوطے کی طرح انگلی کاٹ لی اب تو شمیمہ کو دل کا بخار نکالنے کا اچھا موقع تھا۔

شمیمہ۔ بدتمیز تو بہت شریر ہو گیا ہے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا۔ لو صاحب آج کو انگلی سے بیت گئی کل کو کسی کا گلا بھی کاٹنے کی ہمت ہو جائے گی دھو اپنے آپ خدا نے ہاتھ کس لئے دئے ہیں (نگار سے مخاطب ہو کر) پانی پھینک دو خود نل سے لوٹا بھر لائیں ان کی سزا یہی ہے کپڑے بھی اپنے خود ہی تبدیل کرنے دو۔ اس شور و غل کو سن کر گھر کے ہر کونے سے آدمی دوڑے چلے آرہے تھے۔ ایک طرف بڑی بی ہانڈی چولہا چھوڑ ہانپتی کانپتی چلی آرہی تھیں تو دوسری طرف بی مغلانی اپنی عینک سنبھالتی جوتیاں گھسیٹتی وہیں سے "کیا ہوا کیا ہوا" کا نعرہ بلند کرتی آرہی تھیں۔ اختر نسیمہ اور انّا کی لڑکی پہلے ہی سے موجود تھے۔ بیگم صاحبہ بھی چار و ناچار مصلے چھوڑ ہاتھ میں تسبیح پھیرتی ہوئی آپہنچیں۔

بیگم صاحبہ۔ ہے ہے لوگو یہ کیا مچھلی بازار لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے یہ کیسا شور ہے؟ آخر تم کیوں بچے کو گھیرے کھڑے ہو؟ ابھی تو دن کے پیر بھی نہیں نکلے اور یہ طوفان بدتمیزی شام دور ہے۔

شمیمہ (چیں بہ جبیں ہو کر) ہے کیا صاحبزادے کی شرارتوں میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اس غریب کی انگلی اس بری طرح چبائی ہے کہ تلملا رہی ہے جب سے ہر وقت نیا شگوفہ کھلاتے ہیں کسی کا ڈر نہ خوف۔

بیگم صاحبہ نے ایک مجسٹریٹ کی حیثیت سے باری باری سب گواہوں کے بیان سنے۔ مجرم کی طرف غور سے دیکھا اس نے منہ دوسری طرف انجان ہو کر پھیر لیا۔ لہٰذا شمیمہ کی تبائی ہوئی سزا پر اتفاق ہوا۔ شمیمہ فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوئی اپنی ذہنیت کی داد دل ہی دل میں دیتی پھر مضمون لکھنے چلی گئی۔ نسیمہ سے قلم مستعار لیا اور پندرہ بیس منٹ کی دماغی کوشش سے وہ کاغذ کے دو صفحہ سیاہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس وقت اس کی حالت اس سیاست داں سے کم نہ تھی جو کسی دقیق اور لاینحل مسئلہ پر عبور حاصل کر لیتا ہے۔ وہ بھی اس وقت اپنی قابلیت کی خود قائل تھی کہ کس خوبی و آسانی سے اس مرحلے کو طے کر لیا۔ رہ گیا نقل کرنا تو وہ کون سی جوئے شیر لانا ہے۔ اب صرف کپڑے بدل کر ناشتہ کرنا رہ گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے آڑی سیدھی ہو کر انگڑائی لی - پاؤں سیدھے کئے آنکھیں بند کیں اور ہاتھ سیدھے کر کے جو سامنے کی طرف جھکی تو آن کی آن میں دوات مضمون کی کاپی کو سیاہ کرتی ہوئی لڑھکتی لڑھکتی اس کی گود میں تھی اس اتفاقی حادثہ کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھی پل بھر میں اُس کی دماغی کاوش پر

پانی پھر گیا۔ چند سیکنڈ تک وہ ساکت اور مبہوت تھی کبھی خود کو دیکھتی کبھی کاپی کو۔ گھڑی پر جو نظر پڑی تو نو بج رہے تھے۔

سب چھوڑ چھاڑ غسل خانے کا رخ کیا بدقت انگلیوں سے سیاہی صاف کی، کپڑے بدلے اور ناشتے کی میز پر جلدی جلدی گرتے کی گھنڈیاں لگاتی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی پہنچی۔ غصہ میں جھنجلائی ہوئی اور موقع کی تلاش میں تھی کہ دل کی بھڑاس نکالے۔ شمیمہ۔ نگار۔ نگار۔

نگار۔ جی ابھی آئی۔

شمیمہ۔ کہاں غائب ہو جاتی ہو، جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہو گئے۔ نو بج گئے ناشتہ ابھی تیار نہیں ہوا تو کیا بارہ بجے ہوگا؟ بی مغلانی کی مہربانی ہے یہ اگر سامان جلدی دے دیتیں تو کیا رتبے میں فرق آجاتا تم کھاتی رہنا میں جاتی ہوں اب مدرسہ دیر ہو جائے گی۔

نگار۔ بی بی ناشتہ تیار ہو کر تو گھنٹہ بھر ہوا۔ میاں اختر اور نسیمہ بی بی تو کبھی کا کر چکے آپ کے لئے پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا بیگم صاحبہ نے کہا نے جاؤ جب منگوائیں لا دینا۔

شمیمہ۔ اب لاؤ گی بھی یا اپنی تقریر ہی سناتی رہو گی (نگار تھوڑی دیر میں ناشتہ کی کشتی لئے داخل ہوتی ہے) شمیمہ جلدی جلدی دو چار لقمے کھا کر جائے بناتی ہے۔ اختر نیچے سے شور مچاتا ہے کہ آنا ہے تو آؤ ورنہ ہم جاتے ہیں۔ موٹر بھجوا دیں گے فرصت سے آتی رہنا۔

شمیمہ۔ (گھبرا کر) نگار جلدی سے میرے موزے تو اٹھالا میں پہننا بھول گئی۔ نگار موزے پہنانے کو نیچے جھکتی ہے اور وہ منہ سے پیالی لگاتی ہے۔ نگار کے ہاتھ کا دھکا جو لگتا ہے تو چائے سب دوپٹے کو تر کر دیتی ہے اس کے بدن کو بھی اس کے چرکے لگتے ہیں! اس وقت شمیمہ کا پارہ ایکسو پانچ سے بھی متجاوز تھا۔ غم، غصہ اور سراسیمگی کی یکجائی سے اسکا دماغ معطل ہوا جا رہا تھا۔ نگار الگ گھبرائی ہوئی ٹوٹی ہوئی پیالی کے ٹکڑے فرش پر سے اٹھا رہی تھی۔

شمیمہ۔ مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے، کہتی ہوئی اپنے کمرے میں دوپٹہ بدلنے چلی جاتی ہے۔ وہاں موٹر جانے کا الارم دے چکی تھی اگر ایک سیکنڈ بھی دیر سے پہنچتی تو وہ انہیں چھوڑ کر چلتے نظر آتے۔ موٹر میں بیٹھ کر پیروں پر جو نظر جاتی ہے تو چپل پہنے ہوئے ہے اور ایک پیر میں موزہ ہے ایک میں ندارد۔ اعتراف شکست میں اس کو بھی اتار پھینکا۔ اتنے میں موٹر سکول کے احاطے میں تھی۔ کلاس میں پہنچیں تو پہلا گھنٹہ ختم تھا۔ اور استانی "جھوٹ کی برائی" والا مضمون طلب کر رہی تھیں۔ صالحہ (ایک لڑکی) کاپیاں جمع کر رہی تھی۔

صالحہ۔ شمیمہ جلدی کاپی نکالو استانی جی کو دیر ہو رہی ہے۔

شمیمہ۔ اری ایسی کیا تباہی ہے کتابوں کے نیچے دب رہی ہے۔ نکال تو رہی ہوں (پوری کتابیں الٹ پلٹ کرتی ہیں)

استانی۔ شمیمہ جلدی کرو تمہاری وجہہ سے مجھے دیر ہورہی ہے دوسری کلاس بھی تو لینی ہے۔
شمیمہ۔ (رونی صورت بناکر) استانی جی...... استانی جی..... کاپی..... شاید..... موٹر میں... رہ گئی
استانی۔ تمہاری سب کتابیں تو بستہ میں تھیں وہی کاپی کیسے رہ گئی؟ اچھا کل تک مجھے وہ مضمون اور ایک ۱
چار صفحہ کا مضمون ”آج کا کام کل پر“ لکھ کر صبح نو بجے سے پہلے بتادینا...... حقارت آمیز نظروں سے شمیمہ کو
دیکھتی ہوئی کلاس سے چلی جاتی ہیں۔

انور جہاں قریشی (محبوبیہ گرل اسکول)

لال بجھکڑ

پرانے زمانے میں، ایک بڑے عقلمند آدمی پیدا ہوئے تھے اُن کا نام لال بجھکڑ تھا۔ اُن کے شہر کے لوگوں کی سمجھ میں جب کوئی بات نہ آسکتی، تو وہ اُن سے جاکر پوچھتے۔ اُن کی عقلمندی کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک لطیفہ اُن کا لکھتے ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی صاحب کے مکان میں اوڈ، مزدور کام کررہے تھے۔ شام کے قریب، مکان والے صاحب کا بچہ، سب کی نظر بچاکر، سیڑھی پر سے چھت پر پہنچ گیا اور ایک گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب مزدور، سیڑھی لے کر چلے گئے اور رات ہونے لگی، تو بچہ اوپر رونے لگا۔ لوگوں کو بڑی فکر ہوئی کہ اس کو کس طرح نیچے اتاریں۔ جب اُن کے ذہن میں کوئی بات نہ آسکی تو وہ لال بجھکڑ صاحب کے پاس گئے۔ اور تمام ماجرا سنایا۔ یہ سن کر وہ فرمانے لگے۔ ”آپ فکر نہ کریں میں ابھی چلتا ہوں“ گھر پہنچ کر انہوں نے ایک لمبی رسّی منگائی۔ اور اس کے ایک سرے کو چھت پر پھینکا۔ لڑکے سے کہا کہ اس کو کمر کے اطراف لپٹ کر باندھ لو۔ لڑکے نے جب رسّی کمر میں باندھ لی، تو لال بجھکڑ صاحب نے نیچے لوگوں کو حکم دیا کہ رسّی کو زور سے کھینچیں۔ رسّی کے کھینچتے ہی کے ساتھ لڑکا دھم سے زمین پر گرا، اور اسے اتنی چوٹ لگی کہ وہ، بچ نہ سکا۔ جب لوگ رونے چلانے لگے تو لال بجھکڑ صاحب نے فرمایا۔
”تمہاری قسمت۔ میں بیسیوں دفعہ اسی طرح کنوؤں سے بچوں کو نکال چکا ہوں“

(س ر)

دو پتوں کی ڈالی

یہ نظم ایک چھوٹے سے گھاس کے پھول پر لکھی گئی ہے

— ۱ —

میں ہوں ڈالی دو پتوں کی   لائی ہوں بس ایک ہی پھول
گندھ نہ اِس میں، رنگ نہ اس میں   کوئی اچھا ڈھنگ نہ اِس میں

— ۲ —

بند کلی ہی جو یہ رہتا   تو کوئی کچھ بات نہ کہتا
کِھلنا تھا اِس لئے کِھلا ہے   ہنسنے ہی کو پھول بنا ہے :

— ۳ —

ہنسنے والو! ہنس لو مجھ پر   میں خود ہنستی اپنے اوپر
جو تم تھوڑا سا ہنس لوگے   جیون (زندگی) میرا سپھل (کامیاب) کروگے

وِشنی دھر ودیالنکار۔ استاذ سنسکرت و ہندی جامعہ عثمانیہ

تبصرے

ضمیر ڈیمی تقطیع۔ ۷۶ صفحات۔ طباعت صاف ستھری قیمت درج نہیں ہے مطبوعہ مطبع عہد آفرین۔

یہ مختصر ڈراما جو زیادہ تر فلسفیانہ مکالمات کی شکل رکھتا ہے جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ کا مصنفہ ہے۔ اس کا خاکہ یہ ہے کہ ایک نوجوان تعلیم یافتہ ہندوستانی جس کا نام عبید ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان جاتا ہے۔ لندن میں چند دوست پیدا ہو جاتے ہیں جن میں کئی ملکوں اور قوموں کے لوگ شامل ہیں مثلاً یہ ترک ہیں، مصری ہیں، شامی ہیں، ہندوستانی، اور انگریز ہیں مصنف ان اشخاص کو ان کی قومی سیرت کے نمونے بنانا چاہتے ہیں۔ عبید کے دوستوں میں، ضمیر ایک ہندوستانی نوجوان اس قصے کا اہم ترین کردار ہے اس کی شخصیت میں، مصنف نے ایک عملی مفکر نوجوان ہندوستانی کا کردار نمایاں کیا ہے، جو مصنف کا نصب العین ہے۔ اور اسی لئے اس ڈرامے کے اکثر اشخاص کے لئے اس کی سیرت اس کے افعال اور اقوال الہام کا کام دیتے ہیں۔ عبید اکثر معاملات میں اس سے مشورہ لیتا ہے اور کامیابی ہوتی ہے۔

تمام [illegible] اصابت فکر، وسعت معلومات، مشاہدات اور تجربات کے علاوہ حیات کے نہایت قابل عمل اعتدال پسند اور ترقی پرور خیالات سے پُر ہیں اردو میں قصے کے پیرایہ میں، حیات اور معاشرت کے ایسے سنگین مسائل بہت کم پیش کئے گئے ہوں گے۔ یہ قصہ پڑھنے اور لطف حاصل کرنے کی جگہ، پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے قابل ہے۔ اس کو ایک قصے یا ڈرامے سے زیادہ فکر و عمل کی کتاب کہنا چاہیے۔ جس میں جدید ہندوستانی زندگی اور اس کے اکثر مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ ہر اس نوجوان کے لئے مفید ہوگا جو عملی زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایسی کتابیں، ایک آسان اور دلچسپ پیرایہ میں، زندگی اور اس کے مالہٗ وما علیہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا سکھاتی ہیں۔

اردو میں اس طرح کی کتابوں کی کمی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ فاضل مصنف اس طرح کی کتابوں کے ذریعہ، ملک کے نوجوانوں کو اپنے اُن وسیع مشاہدات سے مستفید کرتے رہیں گے۔ جن کا ان قصہ نما مکالمات میں جگہ جگہ اظہار کیا ہے۔ اس قصے کے تقریباً ہر صفحے میں ایسے کئی خیالات ہیں جو سنجیدہ غور و فکر کے محتاج ہیں مثلاً صرف دو صفحات میں سے سرسری طور پر لئے ہوئے جملے حسب ذیل ہیں:۔

"کام جس قدر بلند معیار یا وسیع اثر ہوگا، اتنا ہی وقت طلب اور صبر آزما ہوگا۔ اگر اس کو کافی مہلت نہ دی جائے تو وہ بار آور نہ ہو سکے گا۔" ص ۲۷

"اہل مشرق نے اپنے قدیم استقلال کو آرام کی تلاش میں پڑ کر بالکل کھو دیا۔" ص ۲۷

"استقامت اس ریاست کو حاصل ہے، جس میں قوت اور اثر، سچے، اور ایماندار افراد کے ہاتھوں میں ہو۔" ص ۲۸

"برائی خواہ مطلق ہو یا اضافی دنیا سے ناپید تو نہیں ہو سکتی لیکن جس ملک میں برائی نیکی سے مغلوب رہتی ہے اُس کا عروج یقینی ہے" ص ۲۸

سروری

نظمِ اقبالؔ

علامہ اقبالؔ سنہ ۱۹۱۰ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اور ناممکن تھا کہ حیدرآباد جیسے ملک کا جو مشرقی ثقافت اور تہذیب کا سماجی مرکز ہے یہ سفر اُن کے شاعرانہ جذبات میں جولانی نہ پیدا کرتا چنانچہ ان کے تاثرات نے نظم کا جامہ پہن لیا۔ اور انہوں نے حیدرآباد سے متعلق دو بلند پایہ نظمیں کہہ دیں۔ جن کو سر شیخ عبدالقادر نے ایک مختصر تمہید کے ساتھ اپنے ماہنامہ "مخزن" میں شائع کیا تھا۔ ان ہی دو نظموں اور تمہید کو تصدق حسین تاجؔ نے سلیقہ کے ساتھ کتابی صورت میں طبع کیا ہے۔

پہلی نظم کا عنوان شکریہ ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؔ نے لکھا ہے کہ :-

"ہز اکسلنسی (مہاراجہ بہادر) کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلامِ شیریں سے شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آگئے۔"

نظم کے پہلے بند میں اقبالؔ نے ایک ہمنوا کی تخلیق کی ہے جو ان سے پوچھ رہا ہے کہ وہ اتنے دن اپنے وطن سے کہاں غائب رہے اور ان کے دل نے آخر کس دیس میں آشنا قرار پایا۔ دوسرے بند میں اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے حیدرآباد کے متعلق لکھا ہے کہ :-

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گذار
جس کے ذرّے مہرِ عالم تاب کو سامانِ نور
جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار
جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رخسارِ حور آئینہ دار
خطۂ جنّت فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئنہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار
جس نے اسمِ اعظمِ "محبوب" کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

مہاراجہ یمین السلطنۃ کی مدح میں کئی شعر تحریر فرمائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :-

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار
اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
لیلیٰ معنی کا محمل اس کی نثرِ دلپذیر
نظم اس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار
سلسلہ اس کی مروّت کا یوں ہی لا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

آخری شعر میں اپنے موقف کو واضح کیا ہے۔

شکریہ احساں کا اے اقبالؔ لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

دوسری نظم اقبالؔ کی وہ مشہور نظم ہے جس کا عنوان "گورستانِ شاہی" ہے جو بانگِ درا میں بھی شائع ہو چکی ہے

اس کے متعلق اقبال نے لکھا ہے کہ "مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا" اس نظم کو اقبال نے اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری کے نام سے منسوب کیا ہے اس کو "مخزن" میں شائع کرتے ہوئے سر شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے واہ نکلتی ہے سلاطین قطب شاہیہ کے مزار ان کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار شب ماہ مگر ایسی شبِ ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی۔ سچے شاعر جذبات کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کہاں ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اُتارا ہے۔ ان ہی کا حصہ ہے"

غرض یہ دونوں نظمیں پڑھنے اور لطف اٹھانے کے قابل ہیں اور ان کے ساتھ سر اقبال اور سر شیخ عبدالقادر کی جو تحریریں تاج صاحب نے شائع کی ہیں وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ م

پریم سوگ اس کتاب میں مولوی حسام الدین صاحب غوری نے منشی پریم چند کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ان کے قلمی کارناموں پر نظر ڈالی ہے پیش لفظ میں محمد اکبر زور نے منشی پریم چند کی تحریر کے اسلوب اور پیام کو اجمالی طور پر واضح کرتے ہوئے پریم سوگ کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"یہ ایک تعارفی کوشش ہے اور منشی پریم چند کی مکمل سوانح حیات کا پیش خیمہ سمجھی جا سکتی ہے"

ڈاکٹر صاحب نے منشی صاحب کی ملاقاتوں اور ان کی طبیعت کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ بھی آئندہ سوانح حیات لکھنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا کاش ڈاکٹر صاحب اپنی معلومات کو اور تفصیل کے ساتھ قلمبند فرماتے۔

منشی پریم چند اردو ادب کے اس عبوری دور میں جو جدید رجحانات کو لئے ہوئے ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں تصنع اور مبالغہ سے بچتے ہوئے حقیقت اور سادگی کو نمایاں کرتے تھے اردو میں مختصر افسانہ نویسوں کے طرح انداز کی حیثیت سے انہوں نے جو کارنامے پیش کئے ہیں وہ اردو ادب میں جاودانی جگہ رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کی زندگی بجائے خود ایک حزنیہ افسانہ تھی اس لئے ان کے افسانوں میں ہر جگہ ان کے دلی جذبات اور قلبی احساسات کا عکس نظر آتا ہے اور اس طرح ان کا اثر بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ ان کا اسلوب اردو ہندی کی اس کشمکش سے بہت دور تھا۔ جس نے فرقہ وارانہ تنگ نظری کے باعث ایک سیاسی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ وہ ایک ایسی زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی کوشش کرتے تھے جو ہر ہندستانی کے سمجھ میں آسکے۔

غوری صاحب نے "پریم سوگ" میں منشی جی کی مختلف تصنیفات پر اچھا تبصرہ کیا ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی خصوصاً ان کے مختصر افسانے تو زیادہ صفحات کے مستحق تھے

آخر میں "جواہر پارے" کے عنوان سے منشی جی کے بعض اچھے جملے نقل کئے گئے ہیں جو اپنے اندر تجربہ کی ایک وسعت رکھتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ "ہندوستانی" کے ایک محسن کے متعلق یہ کتاب اردو دانوں میں بہت مقبول ہوگی اور اس کی وجہ سے منشی صاحب کی حقیقی یادگار قائم کرنے کی جانب توجہ کی جائے گی اور وہ یادگار محض یہ ہے کہ اردو داں ادنیٰ تعصبات کو نظر انداز کرکے ایسی زبان میں لکھنا شروع کریں جو منشی صاحب سورگ باشی کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ م

گولکنڈے کے ہیرے ڈاکٹر زورؔ نے جو اردو کے ایک مایۂ ناز انشا پرداز ہیں ارادہ کیا ہے کہ قطب شاہوں کی اس تاریخ کو جس کا ہر ورق ایک افسانوی شان رکھتا ہے، نیم تاریخی افسانوں کے ذریعہ اردو دنیا میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب "سیر گولکنڈہ" گزشتہ سال شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکی ہے۔

سیر گولکنڈہ کی طرح اس سلسلے کی دوسری کتاب "گولکنڈے کے ہیرے" بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا سر ورق جو نہایت ہی دیدہ زیب ہے حیدرآباد کے نوجوان حسن کار مسٹر خلیل نے تیار کیا ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے کئی قلمی تصویروں کے عکس بھی کتاب میں موجود ہیں مصنف کی تصویر مشہور ہندوستانی مصور "اویاما" نے جو جامعہ ملیہ کے قوم پرور ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں اتاری ہے پنسل کی لکیروں میں زندگی کی تخلیق "اویاما" کی حسن کاری کا کمال ہے۔ غرض اس کتاب کو بھی ڈاکٹر زورؔ کی دوسری کتابوں کی طرح سلیقہ اور اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔

اس میں پانچ مختصر افسانے ہیں اور ان کے ساتھ وہ طویل افسانہ بھی شریک کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے "طلسم تقدیر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا تھا اور اپنی مقبولیت کے باعث اس کی تمام جلدیں بہت جلد ختم ہو گئی تھیں۔

ان افسانوں میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اگرچہ تاریخوں یا سفرناموں یا قدیم ادبی کارناموں میں موجود ہیں لیکن ان کو افسانوی انداز میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب نے ان کی دلچسپی میں چار چاند لگا دیئے ہیں ہر افسانہ اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے اور ایسی سلیس زبان میں لکھا گیا ہے جو اپنی سادگی میں ایک شعریت رکھتی ہے۔

ایک افسانے کا عنوان "پانچ گنڈے" ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے صرف حالی سکے میں چار پیسے کو گنڈا کہا جاتا ہے۔ بیرون حیدرآباد تو گنڈا سمجھنے کی چیز ہو جاتا ہے عنوان رکھتے وقت تمام اردو دنیا کا خیال پیش نظر رکھنا چاہیئے تھا یا گنڈے کی توضیح کر دینی چاہیئے تھی۔

ہمیں امید ہے کہ "سیر گولکنڈہ" کی طرح یہ کتاب عام طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ ڈاکٹر زورؔ اگر اس سلسلے کو قائم رکھیں تو ادبیات اردو کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ یقینی ہے۔ م

اورنگ آباد دکن محمد معین الدین صاحب متعلم مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء نے اورنگ آباد پر جغرافیائی اور تاریخی نقطۂ نظر سے ایک اجمالی نظر ڈالی ہے اور اس سلسلے میں وہاں کے تاریخی مقامات کا بالاختصار تعارف کرایا ہے (۱۶) صفحے کی اس کتاب میں ہرچند کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ اس لئے فائدہ مند ہے کہ وہ طالب علمانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

م

ادارۂ ادبیات اردو کی مشہور معروف کتابیں

مرقع سخن
جلد اول
حیدرآباد دکن کے پچیس شعرائے
دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ
پچاس سے زیادہ تصاویر
اور چار سو سے زیادہ صفحات
مجلد قیمت صہ ر

مرقع سخن
جلد دوم
حیدرآباد دکن کے پچاس دیگر
شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر
تذکرہ
پچاس تصاویر صـ ۴
مجلد قیمت صمہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی
مرتبہ
پروفیسر عبدالقادر سروری
معہ سوانح شاہ سراج
صـ ۱۵۲ قیمت ۱۲ر

ایمان سخن
انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان
مرتبہ
مولوی سید محمد صاحب ایم اے
معہ سوانح ایمان صـ ۱۲۰
قیمت ۱۲ر

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد
فیض مرتبہ: -
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح فیض
صـ ۱۴۴ قیمت ۱۲ر

بادۂ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح و تصویر مائل
صـ ۱۳۱ قیمت ۱۲ر

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن
کیفی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین
قادری زور معہ سوانح و تصویر
صـ ۱۲۲
قیمت ۱۲ر

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ
بہادر عزیز مرتبہ ڈاکٹر سید
محی الدین قادری زور
معہ سوانح و تصویر عزیز
صـ ۱۲۵ قیمت ۱۲ر

ورڈسورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات
اور کلام پر تبصرہ از
مولوی میر حسن صاحب ایم اے
معہ تصویر شاعر ۱۰۴ صفحات
قیمت صرف ۱۲ر

ٹیگور اور اسکی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر
رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات
اور کلام پر تبصرہ از مولوی
مخدوم محی الدین صاحب ایم اے
معہ تصویر شاعر صـ ۱۲۸ قیمت ۱۲ر

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے
حالات مرتبہ مولوی محسن ابن شبیر
صاحب بی۔ اے ال ال بی
صـ ۸۰
قیمت ۸ر

ہوش کے ناخن ڈرامہ
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا
خاکہ مصنفہ مخدوم محی الدین و
میر حسن صاحبان
صـ ۹۶
قیمت عہ

دفتر سب رس۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن
یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کی زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب کتابیں

زیرِ طبع کتابیں

نذرِ ولی

ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ۔ از لطیف النساء بیگم بی۔ اے۔ نجم النساء بیگم بی۔ اے
نعیم النساء بیگم بی۔ اے
جہاں بانو بیگم بی۔ اے

نقدِ سخن

کلامِ فانی پر نواب عزیز یار جنگ عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ

گریہ و تبسم

صاحبزادہ میکش
کی
نظموں کا پہلا مجموعہ

زیرِ ترتیب کتابیں

اردو ادب میں ہندی عناصر

از مولوی میر محمد علی خاں صاحب میکش

اردو مرثیہ نگاری

از
مولوی سید سعادت علی صاحب رضوی ام۔ اے

شمس الامرا کی اردو خدمات

از نواب محمد ظہیر الدین خان صاحب بی۔ اے

گنجِ سخن (انتخابِ کلام)

میر احمد علی عصر از مولوی سید محمد ام۔ اے

انتخابِ کلام حکیم مظفر الدین خان معزؔ

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

تاریخِ ادبیاتِ انگریزی

از
مولوی میر حسن صاحب

تاریخِ ادبیاتِ عربی

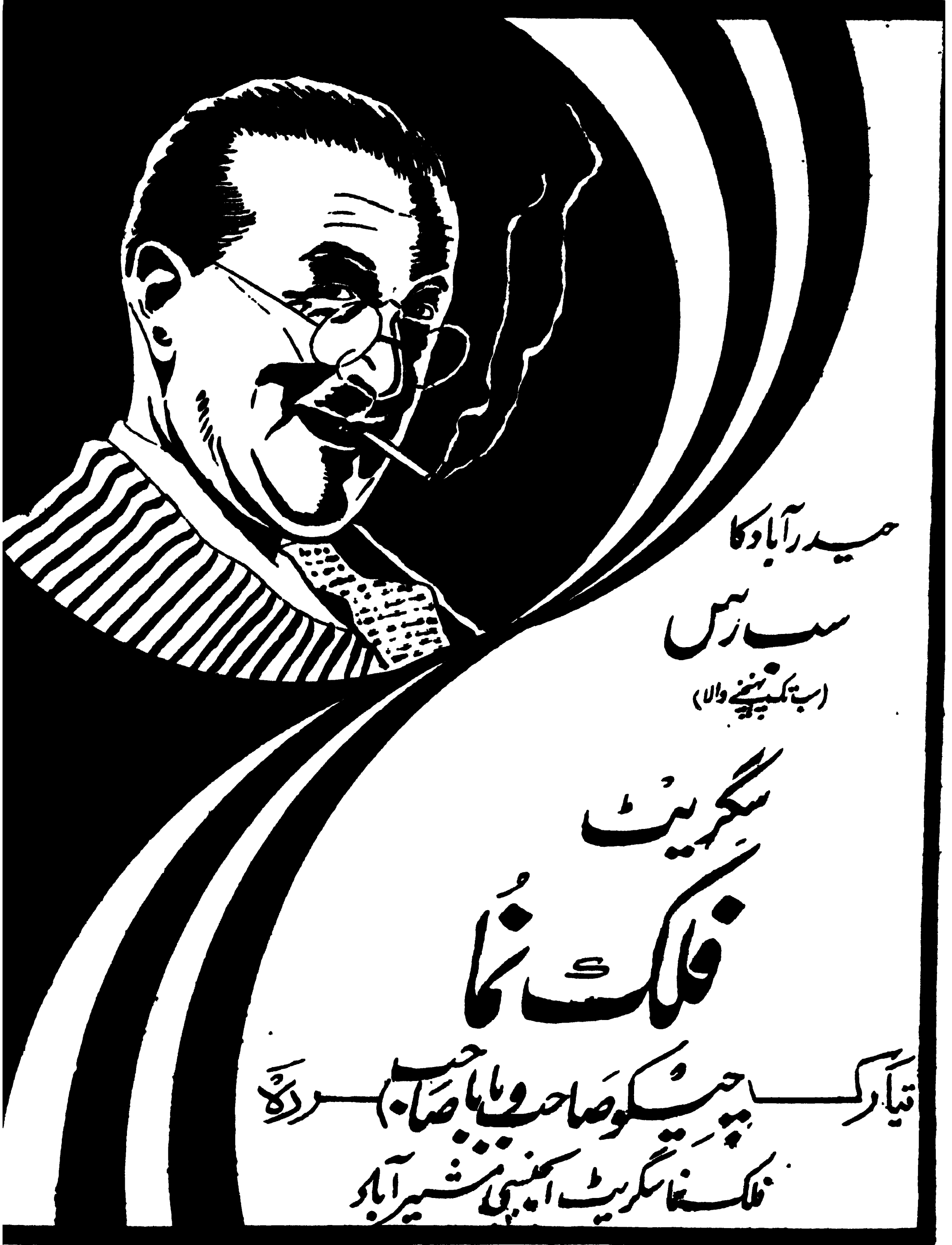
از
مولوی سید ابو الفضل صاحب

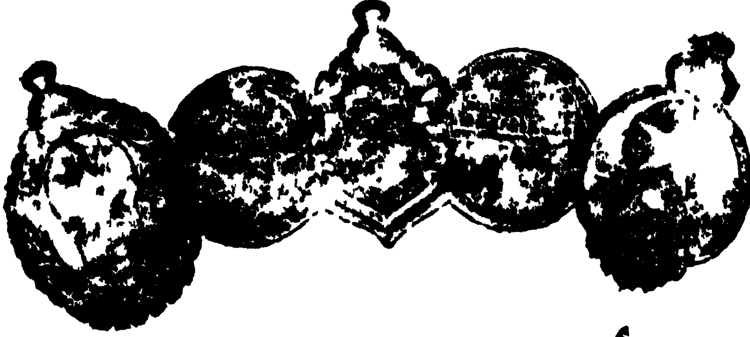
تاریخِ ادبیاتِ اردو

از
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

تاریخِ ادبیاتِ ہندی

از
مولوی عبد القادر صاحب سروری


حیدرآباد کا
سب رس
(سب تک پہنچنے والا)
سگریٹ
فلک نما
تیار کردہ (چیکو صاحب و بابا صاحب)
فلک نما سگریٹ ایجنسی مشیر آباد



سب رس

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

چاند سلطانہ



نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۴)

"اِدارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

جلد (۱) شمارہ (۸) اگست ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو کی جدید تنظیم

"ادارۂ ادبیات اردو" سے متعلق ہم نے گذشتہ شمارہ میں بعض باتیں لکھی ہیں۔ اب اس کے مقاصد قواعد اور معلومات ایک کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ادارہ" کی مجلس مؤسسین نے "ادارہ" کی جدید تنظیم میں غور و فکر سے کام لیا ہے۔ ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والا شان نواب اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار ہیں۔ ہز ہائنس کو جو علمی و ادبی ذوق ورثہ میں ملا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اس لئے "ادارہ" کی آپ سے وابستگی نے بڑی خوش گوار توقعات پیدا کر دی ہیں۔ ہز ہائنس کے بعد سرپرستوں میں ہز ایکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ بہادر ثالث اور راجہ شام راج راجونت بہادر کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قدر دانِ علم و ادب ہیں۔ سر اکبر حیدری کے اردو دنیا پر احسانات کا ایک علمی ثبوت جامعہ عثمانیہ ہے جس کی تاسیس میں انھوں نے انتہائی کوشش فرمائی تھی۔ نواب سالار جنگ بہادر قدیم دکنی ادبیات کا اپنے بیش بہا کتب خانہ میں ایک نایاب ذخیرہ رکھتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ صرف کتب خانہ کی الماریوں میں بند نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی اشاعت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ راجہ شام راج راجونت بہادر حیدرآباد کے ایک قدیم باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو علم و ادب کا اچھا ذوق ہے۔ "ادارہ" کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر نے قبول فرمائی ہے۔ نواب صاحب خوش ذوق وسیع المنظر اور علم و فضل کے مالک ہیں۔ ان کی رہنمائی میں "ادارہ" کی غیر معمولی ترقی یقینی ہے۔

ادارہ کے معاونین بھی اہل ذوق اور علم دوست اصحاب ہیں، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ، مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب، مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب، مولوی سید اظہر حسین صاحب، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، حضرت امجدؔ، مولوی قاضی محمد حسین صاحب، مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب، مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب، مولوی سید علی اکبر صاحب، راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ، مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی خورشید علی صاحب، مولوی مرزا احمد بیگ صاحب، ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب، محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ اور مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کی معاونت اور ادارہ کے مؤسسین، ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی علمی دلچسپی سے یقین ہے کہ ادارہ کی بڑھتی ہوئی ترقی میں برق رفتاری پیدا ہو جائے گی۔

ادارہ نے مستند علمی و ادبی خدمات اور ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں عملی ہمدردی کے اعتراف میں بعض اصحاب کو "رفیق" منتخب کیا ہے۔ یہ ایک اچھی ابتدا ہے، اور اس کا ارادہ ہے کہ ہر سال کے ختم پر وہ اسی طرح مجلس رفقا کی فہرست میں اضافہ کرتا رہے گا، اس سے ایک طرف تو ادارہ نے اپنا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف خدمت کا احساس رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اب تک ادارہ نے ان اصحاب کو رفیق بنایا ہے:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ڈاکٹر قاری

کلیم اللہ صاحب، ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب ہاشمؔ، مولوی سید محمد صاحب، مولوی سید محمد اکبر صاحب وفاؔقانی، نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب، مولوی میر حسن صاحب، مولوی مخدوم محی الدین صاحب، مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی میر سکندر علی صاحب وجدؔ، مسٹر اکھوریندر راؤ جذبؔ، محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، مسٹر مہندر راج سکسینہ اور میکش۔

"ادارہ" کے قواعد و ضوابط اسی شمارہ میں کہیں دوسری جگہ شائع کئے جا رہے ہیں۔ ہر صاحبِ ذوق کو ان کا مطالعہ کرکے یہ سوچنا چاہیئے کہ اسے اس ادارہ کی سرپرستی اور معاونت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ غور و فکر کے یہ لمحے انھیں ضرور "ادارہ" کی طرف متوجہ کرکے رہیں گے اور جو اصحاب سرپرستی اور معاونت قبول نہ کرسکتے ہوں، وہ کم از کم رکن بن کر ادارہ کی مطبوعات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ماضی کے کارنامے مستقبل کے لئے

"یوم ولی" کے بعد ہی دکن کے قدیم ادب کی تحقیق اور اشاعت کے لئے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب ہیں، نائب صدر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، معتمد مولوی سید محمد صاحب، نائب معتمد نواب سعادت علی صاحب رضوی اور اراکین مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر عبد القادر صاحب سروری اور پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی۔ یہ انجمن بڑی محنت سے قدیم دکنی کتابوں کو ترتیب دے رہی ہے۔ چنانچہ اب تک کوئی پچیس کتابیں مرتب اور طبع کی گئی ہیں جو عنقریب شائع ہو جائیں گی۔

اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدر آباد کے اُردو دیوان کی طباعت ہے۔ اس کی ضخامت کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں نہ صرف عاشقانہ شاعری ہی کا رواج تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ فطری شاعری کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کے دیوان میں سیکڑوں ایسی نظمیں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ کلیات عبد اللہ قطب شاہ، نصرتی کی کتابیں گلشن عشق اور علی نامہ، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، شاہ برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اور سکھ سہیلا، صنعتی کا قصۂ ابو تمیم انصاری، عبدل کا ابراہیم نامہ اور مثنویات شاہ سراج اورنگ آبادی مرتب اور طبع کی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں کے ساتھ دکنی الفاظ کی فرہنگ اور یادداشتیں شائع کی جا رہی ہیں۔ جن لوگوں کو تحقیق و تدقیق کا ذوق ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کام کس قدر دقت طلب ہے، لیکن نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی اور مرتب کرنے والوں کے ذوقِ عمل نے اس کو آسان کر دیا ہے۔ بلاشبہ اُردو ادب پر اس انجمن کا ایک احسان عظیم ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے اُردو دنیا میں نئے انکشافات کا رونما ہونا یقینی ہے۔

ایک کروٹ

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی تھی لیکن اس سال پھر اس نے اپنی کروٹ بدلی ہے اور زندگی کا ثبوت دیا ہے ــــ اس محو خواب کی طرح جو ایک احساسِ بیداری کے ساتھ چونک اٹھتا ہے ــــ لیکن صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آئے تو اُسے بھولا نہ سمجھنا چاہیئے۔ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک زمانہ تک ملک کے تعلیمی مسائل میں گہری دلچسپی لی تھی اور اس کی دلچسپیوں کے آثار اب بھی عملاً موجود ہیں۔ اس کی تحریکات کی



نواب سالار جنگ بہادر

خاص وقعت تھی اور ان میں سے اکثر ملک کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بروقت پیش کی جایا کرتی تھیں۔

کام کے وقت کسی ایک پر بھروسہ کر لینا اور ناکامی کے وقت کسی ایک کے سر تمام الزامات تھوپ دینا' دنیا کا دستور ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے جمود کے متعلق بھی "شکوہ و شکایت" کا ایک دفتر کھل گیا۔ اربابِ کانفرنس اگر برا نہ مانیں تو ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کانفرنس کا سارا نظام ایک ہی مرکز پر کار فرما تھا؟ اگر کسی ایک فرد نے اس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لی تو ساری ملت کیا اس ایک فرد کے تغافل میں گم ہو گئی ___ کسی کو سوتا ہوا دیکھ کر یہ ضروری نہیں کہ تمام جاگنے والے اپنے سر پر لحاف ڈال لیں بات یہ ہے جب اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے تو لوگ دوسروں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو' اس سال پھر یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس کی گذشتہ اہمیت کے پیش نظر ہم نے سب رس کا ایک حصہ اس کے لئے خاص طور پر وقف کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کانفرنس بہت جلد اپنی گذشتہ عظمتیں حاصل کر لے گی' اور اس کی رگ و پے میں وہی خونِ عمل موجزن ہو جائے گا جس نے اس کو ایک "زندہ ادارہ" کی طرح کار فرما رکھا تھا۔

دو نئی کتابیں

ادارہ ادبیات اردو نے دو نئی کتابیں شائع کی ہیں ___ نقدِ سخن اور گریہ و تبسم۔ نقدِ سخن' کلامِ فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر کی سخن ورانہ تنقید ہے۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں تنقید کی اہمیت ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر نقادوں نے تنقید اور ذاتیات کی حدیں ملا دی ہیں' اور جب کبھی وہ تنقید کرتے ہیں تو ان کی نظروں کے سامنے "کیا لکھا" کا سوال ضمنی بن جاتا ہے اور "کس نے لکھا؟" ان کے ذوقِ تنقید کا موضوع بن جاتا ہے۔ خلوص اور عداوت کے جذبات میں بہہ کر وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں جو بہ حیثیت دیانت دار نقاد کے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ نواب عزیز کی یہ تنقید بڑی حد تک اس عیب سے پاک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم نواب عزیز کے اُن تمام اعتراضات سے متفق ہوں جو انھوں نے کلامِ فانی پر کئے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص ان سے اتفاق کرے۔ یہ تنقید پبلک ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق ایک عام بحث شروع کی جائے۔ اسی خیال کے تحت ہم نے "سب رس" میں نواب عزیز کی تنقید کا جواب اور ان کی جانب سے اس کا جواب الجواب شائع کیا تھا۔

اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کھوٹے کھرے کا صحیح اندازہ قائم کیا جا سکے۔

"گریہ و تبسم" مدیر سب رس کی نظموں کا مجموعہ ہے اس کے "حسن و قبح" کے متعلق اس کے پڑھنے والے ہی رائے دے سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے' شباب کے تبسم کی یہ چند لہریں اور مرتعش دل کی ٹھیس سے بہنے والے آنسوؤں کی یہ چند بوندیں ___ محض جذبات اور احساسات کا سرمایہ ہیں جن کو "فن اور ادب" سے کوئی تعلق نہیں۔ "گریہ و تبسم" اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ دل کی آواز ہے اور اگر اس نے دلوں پر اثر کر لیا تو اس کے ہزاروں عیب' اس کی اس ایک خوبی میں دب کر رہ جا سکتے ہیں۔

خوش گوار تاثرات

گذشتہ مہینے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب صدر شعبۂ عربی جامعہ دہلی' ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی

صدر شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی، مولوی سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ اور مولوی شاہد احمد صاحب بی، اے مدیر ساقی دفتر" ادارۂ ادبیات اردو" پر تشریف لائے اور دفتر" سب رس" کا بھی معائنہ کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ اچھے اثرات لئے ہوئے گئے۔ ان چاروں اصحاب سے جو خدمت گزارانِ علم و ادب ہیں، اردو کے مستقبل، جدید ادب کے رجحانات اور اسی قسم کے بعض دوسرے مسائل پر تبادلۂ خیال کر کے ہمیں مسرت ہوئی۔

"خیر جاریہ" عربی ادبیات کی وسعت، اس کی بلندی اور لطافت اور سب سے بڑھ کر اس کی غیر فانی زندگی اس قابل ہے کہ مشرق اس کی جانب خاص طور پر توجہ کرے۔ ہم ہر چیز کے ایک ہی رخ کو دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں مغربی ادبیات کی افادیت مسلم لیکن ہم اپنے لٹریچر سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ اس کے جوہر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

دائرۃ المعارف، جس کے سالانہ اجلاس حال ہی میں ختم ہوئے ہیں، عربی ادبیات کی اشاعت کے لئے اعلیٰ حضرت غفران مکاں کی سرپرستی میں نواب عماد الملک، ملا عبد القیوم اور نواب فضیلت جنگ کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس ادارہ کا کام عربی ادب کی اشاعت ہے۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے عہد مبارک میں اس دائرہ نے بڑی ترقی کرلی ہے اور خوش قسمتی سے اس کے صدر سر اکبر حیدری اور معتمد نواب مہدی یار جنگ بہادر ہیں۔

اس سال فرخندہ بنیاد میں اس دائرہ کے سالانہ اجلاسوں کی وجہ سے بڑی علمی چہل پہل رہی۔ اکثر علماء و فضلاء بہ حیثیت سرکاری مہمان یہاں آئے اور اپنے علم و فضل سے اہل حیدرآباد کو مستفید کیا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا افتتاح اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے ایک گراں قدر پیام سے ہوا جس میں ارشاد ہمایونی ہوتا ہے کہ

"مجھے بہت مسرت یہ سن کر ہوئی کہ اس مرتبہ مجلس دائرۃ المعارف کا ایک سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا ہے جس میں علوم عربیہ کے متبحر عالم، ہندوستان کی مشہور جامعات اور دیگر علمی اداروں سے آکر شریک ہونے والے ہیں۔ پس میں امید کرتا ہوں کہ ان کی قیمتی معلومات سے دائرۃ المعارف کے کارکن نیز ہماری جامعہ عثمانیہ کے عربی شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ مستفید ہوں گے اور دوسری طرف یہ علماء خود ہمارے دائرۃ المعارف کی تحقیق اور تصحیح کے کام کو دیکھ سکیں گے جس کی بدولت حیدرآباد کو علوم عربیہ میں ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور جس کی شہرت نہ صرف بلاد اسلامی میں بلکہ یورپ کے اکثر حصوں میں پھیل گئی ہے، جہاں کے سربرآوردہ مستشرقین اس کام میں ہمارے علماء کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ آخر میں، میں امید کرتا ہوں کہ یہ نیک اور خالص علمی کام ایک خیر جاریہ کی طرح ہمیشہ برقرار رہے گا"

سر اکبر حیدری نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں دائرۃ المعارف کے کاموں کا مختصراً تعارف کرایا۔ اور آپ نے کہا کہ "مصر سے جامعہ ازہر کے ایک وفد نے جو حال ہی میں حیدرآباد آیا تھا، اس مجلس کا تفصیل سے معائنہ کرنے کے بعد نہ فقط اس کے طریق کار کی تحسین کی بلکہ یہ بیان کیا کہ گو کہ مصر میں بھی قدیم کتابیں شائع ہوتی ہیں، مگر مجلس دائرۃ المعارف کے پیش نظر جو علمی تحقیق اور احیاء علوم ہے، وہ اس کو دوسرے اس قسم کے اداروں سے ممتاز کرتی ہے۔" آپ نے اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

جشن سیمیں شاہانہ کی تقریب میں رائل ایشیاٹیک سوسائٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کو اس مجلس کے مطبوعات بھیجی گئیں فرمایا کہ "انڈیا آفس کے مشہور کتب خانہ نے بھی بعض کتابیں حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ ہندوستان کے بھی اکثر مشہور کتب خانوں سے فرمائشیں آتی رہی ہیں اور یورپ کے بھی اکثر مستشرقین نے ان مطبوعات کی تعریف کی ہے۔"

ان اجلاسوں میں شرکت کے لئے جو حضرات باہر سے تشریف لائے ان میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شمس العلما مولانا عبدالرحمان صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب، ڈاکٹر داؤد پوتا صاحب، ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم دائرۃ المعارف کے سالانہ اجلاس کی کامیابی پر نواب مہدی یار جنگ بہادر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ایک لائق باپ کے لگائے ہوئے پودے کو تناور بنانے میں ایک لائق فرزند کی مخلصانہ کوشش یقیناً لائق مبارک باد ہے۔

کچھ اپنے متعلق

گذشتہ شمارہ صرف (۴۴) صفحات پر شائع کیا گیا۔ اگرچہ یہ "سب رس" کے قواعد کے خلاف نہیں، تاہم ہماری گذشتہ ششماہی روایات کے پیش نظر ایک کمی ضرور تھی جس کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن "اقبال نمبر" کے سلسلے میں غیر معمولی مصروفیات نے ہمیں اس شمارہ کی ترتیب کے لئے کم مہلت دی اور ہم نے پابندیٔ وقت کی خاطر چند صفحات کی قربانی گوارا کرلی۔ اس کے علاوہ جب ہم محرم نمبر اور اقبال نمبر کی ضخامت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے بڑی حد تک قبل از قبل اس کمی کی تلافی کر دی تھی۔

"اقبال نمبر" کے انعامی مضامین اور نظموں کا تصفیہ اس وقت ہوا جب کہ جولائی نمبر شائع ہو چکا تھا۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ حسب ذیل مضامین کے لئے انعامات کا اعلان کرتے ہیں:—

کلام اقبال میں رجائیت کا عنصر از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب ولی دادخاں صاحب مندوزی)

اقبال (نظم) از حضرت علی اختر اختر حیدرآبادی (انعام عطیہ صاحبزادہ اشرف بی۔ اے)

اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی از ح انصاری متعلم زینسی مڈل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد)

دوستوں کا مکالمہ از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین صاحب انصاری)

محسن قوم اقبال (نظم) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ (انعامات عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب اعجاز)

سب رس کے حالیہ شمارہ کا ایک حصہ ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ اس کانفرنس کے متعلق معلومات آفرینی کا ذریعہ بن سکیں گے۔

اس نمبر میں نواب سالار جنگ بہادر کی تصویر شائع کی جارہی ہے۔ نواب صاحب معزز امرائے حیدرآباد میں نہ صرف تمول کے اعتبار سے ایک خاص درجہ رکھتے ہیں بلکہ آپ میں مشرقی امارت کی بعض اچھی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اب جب کہ قدیم زمانہ کے امیروں کی علمی سرپرستیاں افسانوں کی طرح سنائی جاتی ہیں، آپ کا وجود مغتنمات سے ہے۔ نواب صاحب قدیم دکنی کتابوں کو اپنی سرپرستی میں شائع کرو ارہے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل فراموش احسان ہے جس کے بوجھ سے

رہتی دنیا تک اُردو کی گردن خم رہے گی۔

چاند بی بی کی تصویر جو سکندر علی وجد کی نظم کے سلسلہ میں شائع کی جارہی ہے نواب صاحب کی عطیہ ہے۔ یہ تصویر نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اپنی ندرت اور نفاست کے اعتبار سے حسن کاری کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم حضرت کیفی مرحوم اور مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی تصویریں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں شائع کی جارہی ہیں۔ مولوی محمد مرتضیٰ اور حضرت کیفی اس کانفرنس کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب اس کے ابتدائی کارکنوں میں سے ہیں اور اس سال اس کانفرنس کے صدر ہیں۔ اول الذکر اور آخر الذکر حضرات کے متعلق مستقل مضامین بھی شائع کئے جارہے ہیں۔ حضرت کیفی کا نام ایک شاعر کی حیثیت سے تمام اردو داں طبقہ میں مشہور ہے لیکن غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے زمانہ میں ملک کے ایک بڑے قومی خدمت گزار بھی تھے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کا بڑا درد تھا اور وہ ان کی ترقی میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے تھے۔

میکش

"واردات"

مرے حبیب! یہ تاکیدِ ضبطِ غم کیسی
تجھے یہ فکرِ فراموشیٔ کرم کیسی

خیالِ ترکِ وفا ہی سے کانپ جاتا ہوں
سنبھال اے غمِ الفت کہ لڑکھڑاتا ہوں

بس ایک دُھن ہے اُسی دُھن میں گائے جاتا ہوں
ترا سکوتِ وفا آزمائے جاتا ہوں

یہ جانتا نہیں کس سمت جارہا ہوں میں
ہے اتنا ہوش کہ تجھ کو بُلا رہا ہوں میں

خدائے عشق کو اپنا بنا رہا ہوں میں
تو مجھ سے دور ہے نزدیک آرہا ہوں میں

رواں دواں ہوں کہیں اب مجھے قیام نہیں
یہ بیخودی مری پابندِ صبح و شام نہیں

جو اس کے سجدوں کو مل جائے پائے ناز ترا
خوشی سے جان ہی دے دے غریب ساز ترا

صمد رضوی ساز

ظریف اور ظرافت

ظریف (جسے عوام الناس مزاح نگار کہتے ہیں) بننے یا کہلانے کا روگ عموماً ایسے شریف لوگوں میں پایا جاتا ہے جنھوں نے اصل خیر سے صرف مڈل تک تعلیم پائی ہو۔ اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر افسانہ نویسی شروع کر رکھی ہو۔ اور افسانے بھی وہ افسانے کہ ارے معاذ اللہ! نہ تو بہ! ماشاء اللہ! ایسے گرما گرم۔ اتنے مزیدار اور اس قدر چٹ پٹے کہ ایک بار اگر کوئی پڑھ لے تو پھر مرتے دم تک افسانوں سے طبیعت بیزار رہے۔ ایسے گراں پایہ اہلِ قلم جب افسانہ نویسی کے میدان میں خم ٹھوک کر اترتے ہیں تو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بدولت اونہیں تو "فسانہ آزاد" کے ایک بار "خوجی" تو ضرور بن جاتے ہیں اور خدا سلامت رکھے ہمارے مدیر حضرات کو جو ایسے باکمالوں سے اکثر "بالسٹرین" کا کام لیتے ہیں

حکیم لقمان نے بوستاں میں ایک مزاح نگار کی جو تعریف لکھی ہے پہلے وہ سن لیجئے اس کے بعد پھر کچھ اور عرض کریں گے۔

ظریف حقیقت میں صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جسے دیکھتے ہی ایک صاحبِ عقل و ہوش کو ہنسی آجائے۔ (اگر کوئی رو بھی دے تو کچھ مضائقہ نہیں نہیں) قد و قامت کے لحاظ سے قطب صاحب کی لاٹھ کے برادرِ خورد معلوم ہوں کلے "طوطا پری" آم کی یاد تازہ کرتے ہوں۔ چہرے پر ہوائیاں (آتشبازی کی ہوائیاں نہیں) اُڑ رہی ہوں۔ اور لباس زبانِ حال سے صورت بیں حالت مپرس کی داستان کہہ رہا ہو۔ اور چال کا بے ڈھنگا پن دیکھ کر راہ چلتے بھی ذرا پلٹ کر دیکھ لیں۔ چنانچہ اگر یہ تحریر واقع ہوئی ہے تو صحافتی منڈی میں مانگ بھی زیادہ ہوگی اور جو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح جس پر سے چھلکا اتار لیا گیا ہو صاف اور ملائم ہے تو وہ قطعی مزاح نگار ہے۔ اور اس کی شہرت کا چاند اس طرح چمکے گا جیسے مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ یا آسمانِ ادب پر اس طرح درخشاں نظر آئے گا جیسے کسی شکیں نسب محبوبہ کے کان میں بنارس کے بنے ہوئے بادلہ کے آویزے۔ جو پونے تین آنے میں جوڑی ملتی ہے

تو جناب! یہ واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں شریف آدمیوں پر ہنسی کا دورہ صرف اس وقت پڑتا تھا جب وہ اپنے کسی ہم جنس میں کوئی ایسی چیز دیکھ پاتے جو بادی النظر میں انوکھی یا غیر مانوس سی معلوم ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس وقت جناب ابنِ آدم شکل و صورت میں "ستر پوشی" کے معاملے میں کوئی ایسی اختراع یا ایجاد فرما لیتے ہوں گے جو ہنسی کی محرک ہوتی ہوگی جس طرح آج کل ایک "راس مرد" مونچھیں منڈوا کر عقل سے فارغ البال ہو جاتا ہے اور بیوقوف لوگ اس شریف آدمی کی "مستورانہ" شکل دیکھ کر صرف معذرت کے طور پر مسکرا دیتے ہیں ممکن ہے کہ گئے وقتوں میں بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسی ہی ناشدنی حرکات کا مرتکب ہوتا ہوگا جو دیکھنے والوں کے لئے ہنسی کا باعث بن جاتی ہوں گی۔
اور یہ تو ایک مشہور تواریخی واقعہ ہے کہ ہنسامت تک محض ایک قسم کا مرض ہی متصور ہوتا رہا ہے۔ اور جو یقین نہ ہو تو ہندوستان کی کوئی جدید تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں قطب صاحب کی لاٹ کے بارے میں سب سے زیادہ پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ ہندوستان میں آٹھ سو سال تک مہاسبھائیوں نے مسلمانوں سے جو "رگڑے" کھائے ان کی فریاد برہما تک پہنچانے کے لئے ڈاکٹر ڈنڈا پرشاد اور بنارسی پنڈت جی مہاراج کی کوششوں سے یہ لاٹ تعمیر کی گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ "کسی مذہبی مزاجی" کے وصال میں جنھوں نے اپنے یہاں جنت البقیع بھی بنوا رکھی تھی پہلے آسمان پر بڑے بڑے جہاں پُرشوں اور علاموں کی ایک مجلس حضرت کو "بریں عقل و دانش" پر داد دینے کے لئے منعقد ہوئی لیکن نوریوں کو خاکیوں کی اس جسارت پر حیرت سی ہوئی تھی اور چپکے چپکے آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں جناب عزرائیل بھی کہیں سے آ نکلے اور سن کر بولے لو دیکھو لو ؎

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں ... شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

یہ سنتے ہی ایک طرف سے "الحق" کا نعرہ بلند ہوا اور ؎ کہا منصور نے خدا ہوں میں

پاس سے :- بولا ڈاروِن کہ بوزینہ ہوں میں

یہ سن کر :- ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست ... فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست !

غالباً سیمابؔ تھے ۔

تو جناب جس طرح مہاشے ڈاروِن جی کے نقطۂ نظر سے بندر شکل بدلتے بدلتے اِرتقائی قلابازی سے انسان بن گیا اسی طرح حکیم لقمان کے نظریہ کے مطابق ہنسی جو محض ایک قسم کی بیماری تھی عادت بن گئی۔

رہا ڈاروِن کا نظریہ ! تو ممکن ہے کہ آپ کی قوم پہلے بندر ہی ہو لیکن بندر "ضاحک" نہیں ہوتا اور ابنِ آدم ضاحک ہے۔ اور وہ بھی پیدائشی اس لئے اگر کوئی سیلانی طبیعت کے بزرگ سیر کرتے کرتے کہیں عدم میں جا نکلیں تو ڈاروِن سے مل کر ہمارا اعتراض ضرور پیش کر دیں۔ ہم رمضان میں استیصالِ ثواب کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس کسی بے روزہ دار کو پلا دیں گے۔

پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ بعض لوگوں نے ہنسانا اپنا پیشہ بنا لیا۔ ایسے لوگ ابتدا میں ہندوستان میں بھانڈ اور یورپ میں فُول یا جسٹر کہلانے لگے۔ اور جب تعلیم کا دور دورہ ہوا تو ڈاروِن کے نظریہ کے مطابق یہی فُول یا جسٹر ترقی کرتے کرتے "ہیومرسٹ" بن گیا اور اس نے لاکھوں کمائے۔ اب رہا ہندوستان، تو جناب ! اول تو کسی نے اس فن کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی لیکن جب اوروں کی دیکھا دیکھی کچھ غیرت آئی بھی تو وقت گذر چکا تھا

یعنی :- باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا

اور اس کی بجائے :- اب بحث میں اُردو ہندی ہے قربانی ہے یا جھٹکا ہے

غور کا مقام ہے کہ جب صورتِ حال اتنی خوشگوار ہو اور ملک کا ملک دوسروں کے لئے مکمل مذاق اور سامانِ ظرافت بن رہا ہو تو مزاح نگاری کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔ مغرب میں تو لوگ ادبی ظرافت کا لطف اٹھاتے ہیں اور ہم ہندوستان والے عملی ظرافت کی داد دیتے ہیں۔ آپ پیپل پر کلہاڑا چلائیے تو دوسرا آپ کی گردن پر کلہاڑا چلائے گا، آپ گائے ذبح کیجئے تو کوئی آپ کو ذبح کرنے اٹھ دوڑے گا۔ ظرافت کا لطف تو صرف ہم ہندوستان والے ہی کچھ اٹھاتے ہیں۔ یورپ والوں کی بات ہی جانے دیجئے۔

چہ داند بوزینہ لذاتِ ادرک

ایم اسلم

سیرتِ سلطانی

جب ہوئی مسجدِ اعلیٰ کی مکمل تعمیر — یادگارِ حشم حضرت سلطان ٹیپو !
کون؟ وہ شانہ کش کاکلِ آئینِ کہن — فرقِ مذہب میں نہ آنے دیا جس نے سرِ مو
جس کی ہستی تھی رخِ دینِ نبیؐ کا غازہ — جس نے معشوقۂ ملت کے سنوارے گیسو
گلِ رعنائے گلستانِ رسولِ اکرم — سارے عالم میں تھی پھیلی ہوئی جس کی خوشبو
شہ شیر افگن و جم جاہ و سکندر سطوت — نصب تھے جس کی صف آرائی کے "رن کھم" ہر سو
رزم گاہوں میں صفِ کفر الٹ دیتی تھی — اُس کی ہلکی سی بھی ایک جنبشِ تیغِ ابرو
عرض کی میرِ عمارت نے یہ سلطاں کے حضور — حسبِ فرماں ہوئی تعمیل بہر یک پہلو
افتتاحی کیا ایک جشن شہِ والا نے — تھے ہزاروں علماء گھر میں خدا کے مدعو
مشورے سے یہ ہوا طے وہ بنے پہلے امام — ہو اگر "صاحبِ ترتیب" بصد شانِ علو
یعنی جس نے نہ قضا کی ہو صلوٰۃِ خمسہ — عمر بھر جس نے کیا ہو نہ کوئی ترکِ وضو
سن کے یہ عالم و مفتی و مشائخ، صوفی — بن کے تصویرِ خجالت نگراں تھے ہر سو
شہ نے فرمایا کہ "وہ صاحبِ ترتیب ہوں میں — للہ الحمد وہ بندہ ہوں کہ جس میں ہے یہ خو"
پھر بڑھا بہرِ امامت وہ مجاہد وہ جری — وہ شہیدِ رہِ مولا وہ حرم کا آہو
کیوں نہ ان پر ہوا مشتاق خدا کی رحمت — بادشاہی میں بھی رکھتے تھے جو دل پر قابو

نوٹ:۔ "مسجد اعلیٰ" جس کی افتتاحی رسم کا واقعہ منظوم ہوا ہے۔ آج تک اپنے شاندار بلند میناروں کے ساتھ قلعہ سرنگاپٹم میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کی اولوالعزمی اور بلند تقویٰ کی شہادت دے رہی ہے

ابوالخیر مشتاق قریشی (بنگلوری)

مرکزِ خیال

(۱) دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم (سعدیؔ) ←
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے (غالبؔ)

(۲) بوئے یارِ من ازاں سست وفا می آید
ساغر از دست بگیرید من از کار شدم (نظیریؔ) ←
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سوداؔ)

مرسلہ سکینہ بیگم

محبت میں فتح و شکست

محبت کے برق رفتار بازو، ہمیں مسرت وانبساط کے ساتویں آسمان پر لے اڑتے ہیں، یہ فضا انتہائی سنسنی خیز و خمار آگیں ہوتی ہے۔ اس وقت سہانی خوابوں کے ایام بہار ہم پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔

لیکن ساغر محبت سے جرعہ کشی کے بعد — ناکامی و حرماں نصیبی!! آہ! ایک جگر سوز و جانگداز المیہ ہے۔

خلد بریں کی ٹھنڈی و معطر ہواؤں میں سانس لینے، کیف آور و مدہوش ماحول میں بسر کرنے کے بعد، کوئی خود کو شکست و ناکامی کے خونخوار و آتشین پنجہ میں گرفتار محسوس کرے، یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس میں قلب حساس و سوخ طبیعت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

یہ ایک تجربہ ہے جو تمہیں اعلیٰ و ارفع منزل پر پہونچا دے گا، یا قعر ذلت میں ڈھکیل دے گا۔ ان دونوں کیفیات کا انفرادی صلاحیت پر انحصار ہے۔ اس مہلک ناکامی و محرومی کے تاثرات برداشت کرنے کی سکت، اگر تم میں موجود ہے، تو تمہیں جو سبق ملا وہ بیش بہا ہوگا۔ اور اگر تم نے کشمکش و پیکار کے تمام ہتھیار ڈال دیئے، درد و اضطراب، سوز و گداز جس کی شدت کبھی ناقابل تحمل ہوجاتی ہے، اس سے دلیرانہ مزاحم ہونے کا اپنے میں قوی ارادہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں شاید تباہی و بربادی تمہارا انجام ہے۔

تم نے محبت کی — اپنی ہستی کامل و تمام نذر کردی — اور تمہیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی۔ اب تمہارے وجود کے کسی گوشہ میں ایک ایسا زخم پیدا ہوگیا ہو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ تمہاری تکالیف، آہ و زاریاں، تمہارے روبرو ایستادہ رہیں گی۔ تم گویا اپنے سلسلہ مصائب کو تحریک دیتے، اور جاری کرتے رہیں گے۔

ایسی نوبت پر، ماضی کو اپنے میں سے بالکل محو کردینا ایک صحیح چارہ کار ہے — اپنے دلخراش تجربات کی یاد رد کردو۔ دیگر دلچسپ و فرحت بخش مشاغل میں، بکمال انہماک و چستی کے ساتھ ایسے مصروف ہوجاؤ کہ تمہیں اپنی تکلیف سے پریشان و حواس باختہ ہونے کا موقع نہ مل سکے۔

کہا جاتا ہے مصیبت و غم ایک عظیم المرتبت معلم ہے۔ خود غرضی کے استیصال کے لئے اس سے مدد ملتی ہے۔ ہم جنسوں کے حالات کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے سے، ان کے واقعات کی قدر و قیمت سے انسان میں ہمدردی کے سدا جاری چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

اکثر لوگ جو ناکامی محبت کے رنج و الم سے کچلے اور روندے گئے تھے، بعد۔ مشاہدہ ہے، بلند کردار، ترقی یافتہ شخصیتوں اور وسیع عمیق فہم و شعور کے ساتھ ابھر آئے ہیں۔

شخصی تحلیل ہمیشہ پسندیدہ رہی ہے جب تمہاری ثابت قدمی میں لغزش آجائے، مایوسی کی انتہائی گہرائی میں تم نے اپنا مسکن بنالیا ہو، تو اپنی نبرد آزما جبلتوں کو بیدار کرنے کی مخلصانہ سعی کرو۔" اس سے کیا حاصل؟" کہکر شاید تم ہاتھ اٹھالو، اور اسی مایوسی کے عالم میں اپنے کو گم کردو، جو تمہیں کچل رہی ہے۔

صاحب فہم و فراست کا فرض ہے کہ ان خونخوار درندوں کے چنگل کو آزادی حاصل کرنے کی پہلی خواہش ہی سے فائدہ اٹھائے۔ کچھ نہ کچھ دلچسپ مشاغل کرو۔ ایسے اوقات میں جسمانی نقل و حرکت ایک حیرت انگیز علاج ہے۔ پیدل چلنا اور خوب چلنا، یہاں تک کہ تم تھک کر چور چور ہوجاؤ۔ حصول مقصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوا ہے۔

خواہ تم کسی امر پر عمل پیرا ہوجاؤ، لیکن اپنے عز و وقار کو قائم و مستحکم رکھو، خود کو شکست خوردہ ہرگز ہرگز نہ بناؤ۔ مزاحمتوں سے کشمکش کرتے ہوئے، جوں جوں تم آگے بڑھوگے، تمہاری طاقت، قوت ارادی اور مضبوط ہوتی چلی جائے گی۔

آخر کار، وہ قوت دمیرت جس کی نشو و نما تم میں ہوجائے گی، دنیا میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے تم میں زیادہ استطاعت پیدا کردے گی۔

ہاں! اگر تم نے کسی سے محبت کی — اور ناکامی نصیب ہوئی، حیرت زدہ و پریشان نہ ہوں۔ تقریباً ہر شخص کو اس قسم کے تجربہ میں گذرنا پڑتا ہے۔ یاد رکھو اپنے کو کامل طور سے سنبھال لینا، یہ تمہارے ہی قبضۂ قدرت میں ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک عملی تصور پسند، ایک تعمیری فلسفی بنجاؤ، اور اپنے تلخ تجربات سے دوسروں کو فائدہ پہونچاؤ۔

مترجمہ مس بی اختا

ہم سفر

تعطیلات ویسے بھی جلد گزرتے ہیں، جیسے پر لگ گئے ہوں۔ گاؤں پہنچ کر ہاتھ پاؤں بھی سیدھے نہ کرنے پایا تھا کہ آٹھ دن گذر گئے اور آنکھ جھپکانے ہی میں (مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوا) بیس۲۰ دن گزر گئے۔ دلچسپیوں کا یہ عالم تھا کہ بس اُڈی پڑتی تھیں آج شکار پارٹی ہے تو کل جلسۂ موسیقی، کہیں دعوت ہے تو کہیں ڈرامہ، ہر وقت دوست احباب کے جھرمٹ میں گھرا رہتا۔ ہنسی ہی لگی رہتی۔ ڈھول دھپا رہتا۔ اور اسی طرح تعطیلات ختم ہونے کو آگئے۔ واپسی کی ٹھہری۔ والدین کی جلدی نے دو چار دن ٹھہرنے کی بھی مہلت نہ دی سمجھتے ہوں گے کہ دو۲ چار دن پہلے چلا جاؤں گا تو واپسی میں شاید کچھ دن پہلے اجازت مل جائے۔ مجبوری تھی۔ سارے دوست احباب اسٹیشن پہنچانے اور خدا حافظ کہنے آئے تھے ان لوگوں کے جھرمٹ سے دور میری نظریں چند اور چیزوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہرے ہرے کھیت، گہری گہری باولیاں، گھنے جنگل، وحشی پرند سب مجھے حسرت سے تکتی دکھائی دیں میں نے سب پر الوائی نظر ڈالی۔ اور اپنا سر کھڑکی کے اندر کرلیا سوچا کہ اب چاہے گاڑی قیامت تک یہیں کھڑی رہے۔ میں تو اب جھانکنے والا نہیں ہوں۔ ڈبہ میں میرے اور ایک دو۲ مسافروں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اور میرے نزدیک دوسرے مسافروں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن گاڑی اب چھوٹنے کو ہوئی تھی کہ گاؤں والوں کا ایک قافلے کا قافلہ ڈبہ میں گھس پڑا۔ کسی کے ہاتھ میں ڈوئی ہے تو کسی کے ہاتھ میں چھاج: کوئی بچہ چمکار رہا ہے تو کوئی تمبا کو گھول رہا ہے۔ ایک عجیب سی ہربونگ مچ گئی۔ مارے چیخوں کے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ "ارے وہ ٹوکرا کہاں ہے" "ارے بچے کو ادھر دے" میں تو بوکھلا گیا۔ ڈانٹ کر کہا "جاؤ۔ اے۔ جاؤ، دوسرے ڈبے میں" وہ کہنے لگے "دوسرے اسٹیشن پر ہی اتر جائیں گے صاب" مجھے بہت غصہ آیا لیکن چپ ہو رہا۔ "اسٹیشن کا تو سوال ہے" سمجھا اور ان میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک بے تکلف ہم سفر نے میرے بستر پر بیٹھنے کی "سعئ بلیغ" کی۔ بھرا تو بیٹھا ہی تھا۔ اپنے پاؤں پھیلا دئیے۔ وہ کسمسا کر اٹھے۔ اور چپ چاپ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے ان کی اس "خاموشی" نے مرے دل پر بہت اثر کیا اور میں نے از راہِ عنایت اپنا بستر کھینچ لیا۔

سفر کئی طرح دلچسپ ہو سکتا ہے۔ یا تو کوئی "اچھا ہم سفر ہو" یا پھر کوئی دلچسپ ناول ہی اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر اس خاموش ہم سفر کی باتیں سنئے۔ راستہ بڑے مزے سے کٹ جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ناول "گہری چال" تھا۔ لیکن اپنے ہم سفروں کے بارے میں بڑا بدقسمت ثابت ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے بات چیت کرتا، دوسرے گھر سے بورڈنگ جاتے ہوئے کوئی بھی اس اقدام پر مائل نہیں ہوتا۔ گاڑی اپنی رفتار پر آگئی تو میں نے اپنا ناول نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی تو کوئی شعر گنگنانے لگ جاتا چند اسٹیشن گزر گئے لیکن یہ بات باعث اطمینان تھی کہ برآمد کی بہ نسبت درآمد کم ہے۔ آگے کے اسٹیشن پر ایک صاحب صورت و لباس سے تعلیم یافتہ معلوم ہونے والے، ڈبے میں گھسنے کے لئے لپکے۔ میں نے صورت بنالی۔ مخلصانہ انداز میں کہا "جگہ نہیں ہے" "کھڑا رہوں گا"۔ جواب دیا گیا "جی" کہہ کر خون کے گھونٹ پیتا میں پھر سے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔ اب ان نو وارد صاحب کی شرارت تو ملاحظہ کیجئے کہ کھڑے کھڑے ناول سے شوق فرما رہے ہیں۔ میں نے کنکھیوں سے ان کے اس قابلِ گرفت فعل کو دیکھا اور انجان بن گیا تھوڑی دیر بعد جب میں ورق پلٹنے کو ہوا تو کہنے لگے "جی ذرا۔ معافی چاہتا ہوں۔ بس ایک دو۲ سطریں اور۔ شکریہ" میں نے کتاب بند کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ بھلا وہ شخص جس نے ہمارا کہنا نہ مانا

ڈبے میں در آیا اس کا کیا لحاظ۔ کچھ جھجکے۔ پھر کتاب ہاتھ میں لے لی اور اسے میرے صندوق پر رکھ دیا۔ وہ برابر دو اسٹیشن کھڑے رہے۔ کوئی بات کرنے والا نہ کوئی ہمدرد۔ عجیب عالم بیکسی تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں سُند ہوگئے تھے اور آخر کسی نہ کسی طرح سامنے کی سیٹ پر جگہ نکال ہی لی۔ میں ان کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ کھنکار کر مجھے متوجہ کرنا چاہا مگر میں انجان بنا رہا۔ نہایت ہی ملائم لہجہ میں دریافت کیا گیا "کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے"۔ میں نے سنی ان سنی کردی۔ کچھ سٹ پٹائے، میرے گھٹنے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے آگے کے اسٹیشن پر پانی مل سکے گا"۔ میں نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آپ دق نہ کریں۔ میں کچھ پریشان سا ہوں" ان کے لئے یہہ جاننا کہ میں پریشان ہوں گویا کھلا دعوت نامہ تھا۔ نہایت ہی ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "آخر میں بھی تو سنوں! کیوں کوئی خاص بات تو نہیں"۔ "جی نہیں" میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں پریشان سا ہوں اور اگر پہلے نہ بھی تھا تو اب ہوگیا ہوں۔ انھوں نے بڑھ کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگئے۔ سارے ڈبے میں ہُو کا عالم تھا۔ تقریباً تمام مسافر ایک ایک کر کے اتر چکے تھے۔ خاموشی ناقابل برداشت ہو رہی تھی انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے کوٹ میں سے ایک کتاب نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک آہ کے ساتھ کتاب بند کردی مجھے بھی دل لگی سوجھی۔ میں نے انھیں مخاطب کیا۔ تنہا سفر میں یہہ ہم سفر ہی کچھ غنیمت معلوم ہوا۔ "آپ بھی کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں" "کچھ نہ پوچھئے" انھوں نے کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے جواب دیا۔ "آخر کچھ تو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کہنے لگے "جناب جس کا رنج اسی کو آپ کو بجائے ہمدردی کے ہنسی آئیگی"۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ سخت ہمدردی ظاہر کروں گا۔ تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھا اور نظر چار ہوتے ہی مسکرا کر کہنے لگے۔ "میں بڑا بدنصیب ہوں۔ بچپن ہی سے محبت کے نام سے بھاگنے والا۔ دنیا کو دارالمحن سمجھتا۔ جہاں انسان صرف رونے دھونے کے لئے آتا ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک رشتہ کی بہن سے ملاقات کے واقعات اور پھر پروفیسر صاحب کی بیوی سے محبت کا واقعہ اس درد انگیز اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ میں ہمہ تن گوش بن گیا "ہوں" "ہوں" کی آوازیں تیزی سے نکلنے لگیں۔ اور آخر میں میں نے ایک آہ کے ساتھ ہمدردانہ لہجہ میں کہا "آپ واقعی قابلِ رحم ہیں، آپ کی زندگی میں عجیب عجیب واقعات رونما ہوے۔ آپ ہی کا دل و جگر ہے جو سہہ گئے ورنہ مجھ جیسا ہوتا تو مر ہی جاتا"۔ اِس کے بعد میں نے توشہ نکالا اور اصرار کے ساتھ انھیں بھی شریک کر لیا میری نظروں میں ان کی عزت کئی گونہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کا دل بہلانا میرا اولین فرض بن گیا۔ میں نے کئی غزلیں گا کر سنائیں دلچسپ موضوع چھیڑے، بہت کھل کر بات چیت کی پوری دلچسپی سے ان کی باتیں سنیں۔ اپنے گزشتہ برتاؤ کی معافی چاہی، اُن کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ انھوں نے اپنا سامان درست کیا۔ اور جب گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی تو میرا سفری ناول بطور یادگار مانگا میں نے بخوشی پیش کر دیا جس پر انھوں نے بھی اپنی کتاب "خواب و خیال اور دیگر افسانے" مجھے تحفتہً دی کہ میں بقیہ فاصلہ اسے پڑھ کر کاٹوں۔ گاڑی چلنے لگی وہ اتر چکے تھے۔ مسکراتے ہوے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہا۔ بہت دور تک اُن کی مسکراتی ہوئی شکل آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

پہلا ہی افسانہ خواب و خیال، جوں جوں پڑھتا جاتا تھا حیرت بڑھتی جاتی تھی اور پھر غصہ بھی آنے لگا۔ دانت پیستے ہوئے میں نے کتاب بند کر دی جی تو چاہتا کہ کتاب کے پُرزے پُرزے اڑا دوں مگر ضبط کیا۔ "جھوٹا، مکار، دغاباز، فریبی، کُتا، گدھا" نہ جانے کیا کیا اس عیار ہم سفر کی شان میں کہہ گیا۔ اس کی داستان کا سارا پلاٹ اسی قصہ کا تھا۔ بیہودے نے کتنا دھوکہ دیا، اسی پیچ و تاب میں بیٹھا تھا۔ اپنی سادہ لوحی پر خود کو کوستا اور اس ناہنجار کو بد دعائیں دیتا رہا جس نے میری توجہہ سے اس بری طرح فائدہ اٹھایا دور سے یونیورسٹی کی سر بفلک عمارت نظر آرہی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اور میں سارے واقعات کو بھول چکا تھا۔

رشید قریشی

میم صاحب کا پردہ

ہمارے مکان کے بازو میں ایک اور ہمارا مکان ہے جو کرایہ پر دیا جاتا ہے وہ مکان ایک ہندو صاحب نے ہم سے کرایہ پر لیا ان کی بی بی سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی تھیں، ان کے میاں یورپ سے آن کر سکندرآباد کے ہوٹل میں معہ اپنی بی بی کے ٹھیرے تھے جب ہمارا مکان ملا تو اس میں آکر اتر گئے بی بی کو ایک لفظ اردو کا نہیں آتا تھا انھوں نے ہم سے کہا میں حیدرآباد میں کسی کو نہیں جانتی آپ جب کہیں جائیں مجھے ہمراہ لیجئے، اور حیدرآباد کی بیبیوں سے ملائیے چنانچہ جب میں کہیں جاتی ان کو بلا لیتی وہ میرے ساتھ اکثر شادیوں میں کلب وغیرہ میں جایا کرتیں نہایت شریف کم سخن بی بی ہیں ایک روز میں نے یک بیک کہلا بھیجا کہ میں شادی میں جا رہی مدعو ہوں آپ بھی چلئے انھوں نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر پہلے کہلا بھجواتیں تو میں آپ کے ہمراہ چلتی اس وقت میرے صاحب دفتر گئے ہیں ان سے میں نے اجازت نہیں لی، یہہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ایک یوروپین عورت کے ایسے اچھے خیالات ہیں۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی لیکن کبھی تنہا کسی کے پاس نہیں جاتی اپنے شوہر کے ہمراہ جایا کرتی ورنہ میرے ہمراہ یا اپنی کوئی دوست عورت کے ہمراہ۔ وہ سینما تھیٹر کا شوق نہیں رکھتی تھی ان کے کمرے میں بٹلر یا بائے وغیرہ بغیر اجازت نہیں آسکتا تھا ان کے شوہر کے دوست اگر آتے اور شوہر گھر پر نہ ہوتا تو وہ نہیں ملتی تھیں البتہ شوہر کی موجودگی میں وہ دوستوں سے ملتی تھیں، شوہر دفتر کو چلا جاتا خود گھر کا کام کیا کرتیں یا سلائی سیا کرتیں۔ ان کی زندگی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی یہہ اسی بی بی کا ذکر ہے جس کی ساتھ بشت نے پردہ نہیں کیا۔ اِس کا نام پردہ ہے، اصل پردہ آنکھ کا اور دل کا ہے اگر یہ ہے تو سب کچھ اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا

اندھا

سنتا ہے حسنِ شمس و قمر دیکھتا نہیں — یعنی نظامِ شام و سحر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی پیرہن پہ گناہوں کے داغ ہیں — دنیا کو چاہتا ہے مگر دیکھتا نہیں
اُس کو بھی ہیں نصیب محبت کی لذتیں — دل تھامتا ہے تیرِ نظر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی دل میں آگ بھڑکتی ہے عشق کی — جلتا ہے اور رقصِ شرر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی سر نے پایا ہے احساسِ بندگی — سجدہ میں گر تو جاتا ہے در دیکھتا نہیں
اُس کو سنبھال لیتی ہیں ہر بار ٹھوکریں — چلتا ہے اور راہ گذر دیکھتا نہیں
باتوں سے تاڑ لیتا ہے باطن کی حالتیں — ملتا ہے اور روئے بشر دیکھتا نہیں
ہنستا ہے صرف اپنے لئے غیر پر نہیں — روتا ہے اور دامنِ تر دیکھتا نہیں
معلوم ہے تمول و غربت کی کشمکش — آنکھوں سے امتیازِ نظر دیکھتا نہیں
اس کو سکون چاہئے جینے کے واسطے — رہتا ہے اور اپنا ہی گھر دیکھتا نہیں

میکش

غزل

خود وہ جفا پر مائل ہیں، ارمان جفا کا کون کرے
اُن کے کرم کی حد نہیں کوئی اُن سے تقاضا کون کرے

جانِ تمنا تو ہے مگر اظہارِ تمنا کون کرے
تیری بدولت ہم ہوئے رسوا اب تجھے رسوا کون کرے

زیست عبارت ناکامی سے زیست کا حاصل ناکامی
غم کے سوا دنیا میں نہیں کچھ پھر غم دنیا کون کرے

تو ہی قاتل، تو ہی مسیحا، تو ہی مارے تو ہی جلائے
دردِ محبت کا میرے جز تیرے مداوا کون کرے

ضبط سے ہے ناموسِ محبت کون بنائے غم کو ڈھائے
دل سے جو موجِ خون اٹھے اس موج کو دریا کون کرے

میری شکستہ کشتی کو ہر موج سہارا دیتی ہے
موجیں ہی جب ساحل ہوں ساحل کی تمنا کون کرے

دل کے ہیں سارے جلوے نمایاں کچھ نہ حقیقت کچھ نہ مجاز
دل اک رازِ سربستہ ہے رازِ دل افشا کون کرے

ہجر میں لب پر دم ہے مگر دے کون تجھے تکلیفِ خرام
تو اک محشر ہے سرتاپا محشر برپا کون کرے

تابش میں رودادِ محبت دل کو سناتے ڈرتا ہوں
دل ہے مرا ہم راز کسی کا دل پہ بھروسا کون کرے

مسعود الحسن تابش

غزل

جس کو دیکھا سو آپ کا دیکھا
جس کو پایا سو آپ کا پایا

تیری ہستی سے آشنا جو ہوا
ذرہ ذرہ کو آشنا پایا

زندگی کو وبالِ جاں سمجھا
موت کو صبر آزما پایا

اُن کی ہرجائی سے نقی ہم نے
اُن کی یکتائی کا پتہ پایا

نقی

چاند سلطانہ

تیرا دماغ واقفِ غیب و حضور تھا
رخ پر جلالِ عصمتِ مریم کا نور تھا
دل نورِ حق سے غیرتِ صد کوہِ طور تھا
بازو میں زورِ بازوئے حیدر ضرور تھا
اکبر کے دل میں صرف خلش تیرے دم سے تھی
کشتِ وطن ہری ترے ابرِ کرم سے تھی

طوفاں تھا، زلزلہ تھا، نہ تھا لشکرِ مغل
تیغیں کھنچی ہوئیں، وہ عیاں برچھیوں کے پھل
آوازِ طبلِ جنگ سے تھرا گئے جبل
وہ رن پڑا کہ خوف سے گھبرا گئی اجل
لیکن تری جبیں پہ شکن تک نہیں پڑی
مغلوں کے ہوش اڑ گئے تو اس طرح لڑی

دشمن یہ کہہ رہے تھے کہ رن اپنے ہات ہے
کل صبح سارے رنج و محن سے نجات ہے!
نقشہ وہ آ پڑا ہے کہ ہر چال مات ہے
واقف نہ تھے کہ رات قیامت کی رات ہے
ارماں دلِ عدو میں رہا قال و قیل کا
شب بھر میں تو نے بھر دیا رخنہ فصیل کا

مشکل کو تیرے عزم نے آسان کر دیا
ہمت نے سورماؤں کو حیران کر دیا
فوجِ شہنشہی کو پریشان کر دیا!
عزت پہ تو نے جان کو قربان کر دیا
احمد نگر کے دل پہ ترے غم کا داغ ہے
یہ داغ اس کی بزمِ عزا کا چراغ ہے

خدمت وطن کی تیری عبادت رہی مدام
تیری بہادری میں کسی کو نہیں کلام
ہے یادگارِ دہر ترا حسنِ انتظام
پلٹے ترے چمن سے شکاری شکستہ دام
تھا غم سے حال زار دلِ دردمند کا
لیکن جھکا نہ سر ترے عزمِ بلند کا

غربت کی بے بسی تجھے اپنے وطن میں تھی
سوزاں بسانِ شمع بھری انجمن میں تھی
بیگانہ مثلِ سبزۂ بیکس چمن میں تھی
اک حور تھی کہ صحبتِ زاغ و زغن میں تھی
پایا نہ حیف گوہرِ عصمت نے جوہری
اجڑی ترے شباب کی کھیتی ہری بھری

گردن پہ بارِ عمرِ گریزاں نہیں لیا
ہمراہ رختِ حسرت و ارماں نہیں لیا
دستِ عدو سے درد کا درماں نہیں لیا
جنسِ بقا کو تو نے کچھ ارزاں نہیں لیا
سرشار ہو کے توڑ گئی جامِ زندگی
لوحِ جہاں پہ چھوڑ گئی نامِ زندگی

سکندر علی وجد

تیسرا درجہ

یہ ایک بہت ہی معمولی سا حساب ہے۔ دو ایک سے زیادہ ہے اور تین، ایک اور دو، سب سے زیادہ۔ اس کے خلاف کہو تو حساب کا بتدی بھی منہ پر تھپیڑ لگائے گا۔ لیکن دفتری منطق نے اس بدیہہ کو نہایت دیدہ دلیری سے الٹ دیا ہے۔ اس کے ثبوت ہمارے اطراف بے شمار ہیں۔ دفتروں کے گریڈ ملاحظہ ہوں۔ امتحان کی کامیابی کے مدارج' اور ریل کے درجے دیکھئے۔ اس عالم کا ہر "ایک" "دو" "تین" پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہ اندھا حساب نہ معلوم کس جادوگر نے سکھایا تھا کہ آج جدھر دیکھو' اسی کا بول بالا ہے۔ ذہن اس قدر ماؤف ہو گئے ہیں! دفتروں میں ہر "پہلے گریڈ" والا' نازاں ہے کہ وہ دوسرے گریڈ والے سے برتر ہے۔ اور دوسرے گریڈ والا' تیسرے گریڈ والے غریب پر رعب گانٹھ رہا ہے۔ اسی طرح جو لڑکا' امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہو' اس کی ہر جگہ عزت ہے۔ دوسرے درجے والے بھی یوں توں گزار لیتے ہیں۔ لیکن درجہ سوم کے کامیاب کے لئے عرصۂ آفاق تنگ نظر آتا ہے۔ دفتروں میں اس کے لئے جگہ نہیں' کاروبار میں یہ اعتبار کے قابل نہیں اور کالج! یہیں سے تو وہ نکالا جاتا ہے۔ نہ معلوم خدا اس پر اتنا کیوں مہربان ہے کہ' دنیا میں اس کے لئے جگہ رکھ چھوڑی ہے! اب یہی' تیسرے درجہ کو ادنیٰ کہنے والے' اسی منہ سے' دق کے تیسرے درجہ کو' اعلیٰ ترین درجہ کہنے سے نہیں جھجکتے۔ آخر اس بے ربطی کا کچھ ٹھکانا بھی ہے! اسی کی بدولت چلتی' گاڑی بن گئی' اور زنگی' نارنگی۔

لیکن بہر حال ایک تشفی یہ ہے کہ یہ ساری بدتمیں حال کی پیداوار ہیں۔ قدیم زمانے میں صرف گاڑی تھی' درجے نہ تھے۔ خواہ اسے درجہ اول قرار دیجئے' یا درجہ سوم کہئے۔ یہی چیز ریل کی ایجاد تک بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس کے ثبوت اب تک بھی باقی ہیں۔ آپ کسی ریل گاڑی کو دیکھیں تو اس میں درجہ سوم ہی سب سے بڑا پائیں گے۔ اور اولین گاڑی جس پر آپ کی نظر پڑے گی اور آخری گاڑی جو آپ دیکھیں گے اور جو ہمیشہ آپ کے سامنے رہے گی' درجہ سوم ہی ہوگا۔ اور حقیقت میں ریل کے تمام ڈبوں میں یہی سب سے بڑا ہوتا ہے۔

اس بدیہہ کو الٹنے والا گروہ' دراصل دولت مندوں کا ہے۔ جن کا بدقسمتی سے اس دنیا پر ہمیشہ اثر رہا۔ دولت مند دنیا میں ہوتے کتنے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جتنے وہ ہوں گے' اتنا ہی ان کا ڈبا اور ان کا درجہ ہوگا۔ اس درجہ کو خواہ وہ پہلا کہیں یا دوسرا۔ اس کے برخلاف درجہ سوم ایک جہان ہے۔ کیونکہ احتیاج اصل ہے اور ثروت اس کی ایک فروع۔

درجہ سوم نہ صرف ظاہر میں بڑا ہے' بلکہ اس کے باطنی اوصاف بھی بڑے' اور گوناگوں ہیں۔ اس کی وسعت کو ساری دنیا کے دوسرے اور تیسرے درجے بھی' اکھٹے نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی زندگی' چہل پہل اور لطف کی ایک چھینٹ بھی' پہلے اور دوسرے درجے کے بزرگوں پر نہیں پڑی یہ وہ مقام ہے۔ جہاں فطرت کے رنگا رنگ جلوے ہر آن بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس فضا میں آزادی کی پرورش ہوتی ہے۔ اور یہاں کی نشستیں خدا کی زمین کی طرح کسی کے لئے مخصوص' معین اور محفوظ نہیں ہو سکتیں۔

غالبؔ کے گھر کی طرح اس عالم آب و گل کی رونق بھی ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ اور ہنگامہ' تیسرے درجہ کی' بلا شرکت غیرے' ملک ہے' پہلے اور دوسرے درجے۔ کے پھونک کر قدم رکھنے والے اور ناپ تول کر کہنے والے نازنینوں کو اس ہنگامہ کی ہوا تک نہیں لگ سکتی وہ بیچارے بس اسی پر نازاں رہیں کہ درجہ سوم کو اول بنا لیا ہے۔

ہنگامہ اصل میں "تیسرے درجہ" کی جان ہے۔ اس کے بغیر یہ ایک عالم بے رونق ایک انجمن بے شمع اور ایک خرمن بے برق ہے۔ اس ہنگامہ کی ابتدا ٹکٹ گھر سے ہوتی ہے۔ پلیٹ فارم پر یہ نشوونما پاتا اور ریل میں تو فرانے بھرنے لگتا ہے۔

جس چیز کی ابتدا ایسی اچھی اور جس کا اٹھان اس خوبی سے ہوا ہو اس کے انجام کا کیا پوچھنا۔ ہنگامہ کے اس مرز بوم میں جدھر دیکھئے ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔ گاڑی میں چڑھنے سے پہلے ہنگامہ، چڑھنے کے بعد ہنگامہ نشست پر ہنگامہ اس بات پر ہنگامہ، اُس بات پر ہنگامہ غرض بات بات پر ہنگامہ، اور ہنگامہ لازمۂ حیات ہے۔

حیات کے کیسے گوناگوں اور بوقلموں نقشے یہاں نظر کے سامنے ہیں۔ زندگی اور زندہ دلی، رنج ومسرت اور محبت ونفرت کی نئی نئی تصویریں یہاں ہر روز دکھائی دیتی ہیں، ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی شاعر یا مصور کی بصیرت چاہیئے۔ ہر وضع قطع کے لوگ یہاں موجود ہوتے ہیں اور ان کی صورت شکل کی طرح اُن کے لباس اور خیالات میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی کپڑوں کی گٹھڑی ہے تو کوئی "لنگوٹی آشنا"۔ ان میں کالے بھی ہیں گورے بھی ہیں، سانولے سلونے بھی ہیں۔ اندھے بھی ہیں، گونگے، بہرے اور کانے بھی ہیں "تنومند اور بجیم بھی ہیں۔ کسی کی ہاتھ بھر کی داڑھی ہے تو کوئی صفاچٹ، کوئی گولڈ فلیک سگریٹ کے کش اڑا رہا ہے تو کوئی پتوں کی بیڑی سے کام چلا رہا ہے۔

ان کے سامان کا تنوع بھی قابل دید ہے۔ کھانے کے لئے تانبے، پیتل، ایلومنیم، تام چینی، بانس کپڑے غرض ہر قسم کے توشہ دان یہاں موجود ہیں۔ ٹرنک چمڑے کے بھی ہیں، لوہے اور جست کے بھی ہیں اور انہیں کے پہلو بہ پہلو کپڑے کی گٹھڑیاں بھی ہیں۔ اسی طرح بستروں میں "آ" اور "آل" سے لے کر دری اور چادر کے بستر بند تک نظر آتے ہیں۔ کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو نہ بستر کے ممنون ہیں اور نہ توشے کے احسان مند۔ جہاں اسٹیشن آیا پیسے دو پیسے کے چنے کوڑیاں لے کر پھانک لیتے ہیں اور جب سونے کا وقت آتا ہے تو ڈبے کے فرش یا کمبل کا بستر اور ہاتھ کا تکیہ ان کے لئے نرم نرم بچھونوں سے زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ بھی آسانی سے گزار لیتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں درجہ اول اور دوم کے نشینوں کو دیکھیئے۔ وہاں زندگی کا ایک اصول اور سفر کا ایک ہی ضابطہ کار فرما ہے۔ جو چیز زید کے پاس ہے وہی بکر، عمرو اور ایرے غیرے غرض ہر شخص کے پاس موجود ہے۔ وہی سوٹ کیس، وہی اٹاچی کیس اور وہی "ہولڈ آل" وہی "پلاس کے تین پات" اور یہی ان کا سرمایہ ناز ہے۔

زندگی کے ایک اور رُخ پر نظر ڈالئے تو تیسرے درجے کے مناظر محض ہوش ربا ہیں۔ یہاں کی وسیع فضا میں، لوگ گروہ در گروہ، بیٹھے آپس میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی آلتی پالتی مارے بے تکلف بیٹھا ہے۔ کوئی نشست پر اپنے بازو ہی گٹھڑی رکھے اور اس پر سہارا دئے لیٹا ہوا ہے۔ گفتگو دنیا کے ہر معاملے سے متعلق ہوتی ہے۔ گھر اور بیوی بچوں سے متعلق صحت اور بیماریوں سے متعلق، معاشی اور سیاسی امور سے متعلق، ادب اور فنون لطیفہ زمینوں اور آسمانوں سے متعلق، دنیا و مافیہا سے متعلق، لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان کی گفتگو کے اصطلاحی موضوع کیا ہیں۔ وہ فقط بولنا جانتے ہیں، اور ہم اصطلاحیں بناتا، ان کی معلومات کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "سکنڈ ہینڈ" بلکہ ان کے درجے کی طرح "تھرڈ ہینڈ" ہوتی ہے یا اور سچ پوچھو تو فرسٹ ہینڈ علم ذرا مشکل ہی ہے۔

باتوں باتوں میں کبھی تو تو میں میں بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حیات کے لئے ضروری بھی ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے کو دشمن سمجھتا ہے اور دوست سمجھتا ہے۔ جہاں کسی کے تیور کڑے دیکھے، یہ جانی دشمن ہے۔ دوستی کے راستے سے آؤ تو یہ جان فدا کرنے تیار ہیں۔ ان کی دوستی اور لڑائی ہر چیز پُر خلوص ہے۔

چند خوش باش بھی تیسرے درجہ میں موجود ہوتے ہیں جن کی زندگی قہقہوں اور نغموں سے معمور نظر آتی ہے۔ کچھ نصیب کے مارے بھی ہیں، جن کی صورتوں کو دیکھ کر محرم یاد آتا ہے۔

کہیں قلی سے پیسے، دو پیسے پر ہنگامہ آرائی ہے۔ کہیں خوانچے والے سے مفت مال ہتیانے پر ہاتھا پائی ہے۔ ایک طرف بچوں کے رونے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، تو ایک جانب نظر بازیاں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ عموماً نوجوان ہوتے ہیں۔ جو گاڑی سے اسٹیشن پر رکتے ہی اپنے ڈبے سے اتر کر ٹہلنے یا سامان خریدنے کے بہانے زنانی گاڑیوں کے سامنے گھومنے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔

پہلے اور دوسرے درجے والے فطرت کی ان تمام تو قلوں اور رنگا رنگ کیفیتوں سے بے نصیب ہیں جو تیسرے درجہ والوں کو حاصل ہیں۔ وہ سردی کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور نہ گرمی ان میں تڑپ اور بے چینی پیدا کر سکتی ہے۔ سردیوں میں ان کے موٹے موٹے گدے اور دلائیاں اور بلانکٹیں انھیں مصنوعی طور پر گرم رکھتی ہیں اور گرمیوں میں پنکھے اور برف انھیں سردی پہنچاتے ہیں۔ پنکھے اور گدے ہی دراصل پہلے اور دوسرے درجہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کیا خوب وجہ امتیاز ہے؟ اس کو علیحدہ کر لیجئے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

تیسرے درجہ کے مسافر حقیقت میں فطرت کی آزاد روحیں ہوتی ہیں۔ جن سے کبھی نچلا بیٹھا نہیں جا سکتا۔ وہ کودتے پھاندتے چیختے، چلاتے، ہنستے بولتے، گاتے روتے، سفر کی گھڑیوں کو لطف کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ درحالیکہ پہلے اور دوسرے درجے کے لوگ نہایت متانت کے ساتھ، سگریٹ پیتے اور اخبار پڑھتے، اخبار پڑھتے اور سگریٹ پیتے، نرم گدوں پر بھی پہلو بدل بدل کر یہ کٹھن لمحے کاٹتے ہیں دنیا کی فلاح اور بہبود کو مطمح نظر بنا کر جتنے نظام آج معرضِ وجود میں آ رہے ہیں، سنتے ہیں کہ ان کا بڑا سہارا یہی تیسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ جب سب نقطۂ خیال نبڑ جائیں، تو زندہ رہنے کے لئے کچھ سہارا بھی تو ہو! اس کا مقصد یہ ہے کہ نصیب دشمناں تیسرے درجہ والوں کی حالت کچھ بری ہے۔ حالانکہ ان کی حالت بری تھی نہ اچھی ہوئی۔ یہ جیسے تھے ویسے ہیں اور جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔ توجہ پہلے اور دوسرے درجے والوں کی طرف منعطف ہونی چاہئے۔ یہ درست ہوئے تو دنیا درست ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ سب انہیں پیٹ بھروں کی تصنیفات ہیں۔ یہ خود اٹھنا چاہتے ہیں اور تیسرے درجہ والوں کو سہارا بناتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ خود شہرت اور دولت کما لیتے ہیں۔ اور تیسرے درجہ والے جہاں تھے وہیں رہ جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو آج دنیا میں تیسرا ہی تیسرا درجہ ہوتا۔

عبدالقادر سروری

مشکل

حسن کے رعب سے ہے آنکھ اٹھانا مشکل
ضعف اتنا ہے کہ ہے جان سنبھانا مشکل

بات بگڑی ہوئی بن جاتی ہے آسانی سے
بگڑی تقدیر کا ہوتا ہے بنانا مشکل

حال کہہ سکتے ہیں، فریاد بھی کر سکتے ہیں
درد وہ چیز ہے جس کا ہے دکھانا مشکل

اڑ گیا رنگ بہ عادت رز دھنا کی صورت
ان کی محفل میں ہوا رنگ جمانا مشکل

بارِ عصیاں سے جھکی جاتی ہے گردن میری
عرصۂ حشر میں ہے سر کا اٹھانا مشکل

رو کنا حسرتِ دیدار کا آساں ہے صمیم
بعد دیدار کے ہے ہوش میں آنا مشکل

صمیم

غزل

اک تبسم کی جھلک دکھلا گیا
طور تک آیا مگر شرما گیا

پھر زمیں کانپی فلک تھرا گیا
پھر کسی کا دل کسی پر آ گیا

ہائے وہ ساقی کی مستانہ نظر
میں بھی سارے میکدہ پر چھا گیا

ہو گئی بدنام دنیا آپ کی
ہم مسافر ہیں ہمارا کیا گیا

اس ادائے شرم سے الٹی نقاب
طالب دیدار بھی شرما گیا

جیسے برحق تھا تغافل آپ کا
جو کوئی آیا ہمیں سمجھا گیا

مژدہ باد اے آبروئے عاشقی
آج اشکوں میں لہو بھی آ گیا

کوئی آساں تھا سمجھنا دیکھنا
درد دل دیکھا گیا سمجھا گیا

کس کے نغمہ نے متانت چھین لی
نجم پھر عہد جنوں یاد آ گیا

نجم افندی

یگانہ آرٹ ہے

چھپائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے
احسان ہو سر کو آزماتا کیوں ہے
میں یہ نہیں کہتا کہ پلٹ آئے شباب
بھولا ہوا خواب یاد آتا کیوں ہے

(۲)
بیداری ہو تو مر کے پاداش ہے شب
کہنے کے لئے وقت بہت ہے بازی
کیا پائے کل سے آج تک کیا کرتے
اپنی کتنا ہا ہے کی کرتا ہے تک

مرزا یگانہ چنگیزی

ہنسی اور ظرافت

(بسلسلۂ گذشتہ)

"ایک مثلث کے تین زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے مساوی ہوتا ہے" اس کو انگریزی زبان میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ:۔

The three angles of a triangle are together equal to two right angles

اور اگر اسی کا فارسی زبان میں ترجمہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ: "مجموع زوایائے ثلاثہ یک مثلث مساوی دو زوایائے قائمہ باشد" اسی طرح عربی، ترکی، پشتو، ہندی، غرض یہ کہ جس زبان میں چاہو ترجمہ کرلو۔ ہر لفظ اپنی اپنی جگہ اسی خوبی سے بیٹھ جائے گا، جیسے انگوٹھی میں نگینہ پھر عبارت کی روانی کے ساتھ ساتھ مفہوم کے اصلی جوہر الگ چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر مذاق کی زبان میں ظریفانہ الفاظ و معنین کے وقت واحد میں ذو دو اشارے۔ بازاری اور معیاری زبان کا فرق۔ روزمرہ محاورے۔ ملکی رسم و رواج قومی روایات۔ تلمیحات۔ اشارات وضمیات یا دیو مالا کا ترجمہ اگر کسی اہل قلم نے کیا بھی تو ظرافت تو رہی ایک طرف اصل مضمون ہی خبط ہو جائے گا۔ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک حاشیے کا دم چھلا الجھن کی رسی دراز کرتا رہے گا۔ مثلاً کسی ظریف نے کاسینوں کے مذاق کا خاکہ اڑایا ہے کہ:۔

"برومن کہ فرستا یندند کوچہ بود خندق نہ رفت"

یہ بالکل اسی قسم کا مذاق ہے جیسے کسی صاحب نے لفافہ پر تحریر فرمایا تھا کہ "در شہر دیوار زرد۔ بخدمت لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب برسد" یہاں دیوار زرد سے مطلب پیلی بھیت اور لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب سے مطلب "لالہ نک چھید لال صاحب" تھا۔ یا یہ جملہ کہ "بر دو گوش نشستہ بودم۔ ہرچند طلبیدم مگر حجام" یہاں دو گوش سے مطلب دوکان یعنی دوکان اور حجام سے نائی یعنی نہ آئی مراد ہے۔ اس طرح پورے جملے کے یہ معنی ہوئے کہ دکان پر بیٹھ کر اتنے ہر چند بلایا مگر وہ نہ آئی۔ اسی طرح ایک شوقین طبع نے لفافہ پر بٹلر روڈ لکھنو کی بجائے سڑک موسومہ بنام نائب السلطنت از ۱۹۱۶ء لغایت ۱۹۲۲ء شہر لکھنؤ لکھا تھا۔

کسی صاحب نے انگریزی میں بھی اسی قسم کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (There is no grass but god) یعنی سوائے خدا کے کسی کو چارہ نہیں ہے یہاں چارہ کا ترجمہ انگریزی میں (grass) کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ کسی پروفیسر نے تاریخ انگلستان کا ترجمہ کیا۔ جس میں ایک جملہ یہ تھا (The pope innocent issued a bull) صاحب موصوف نے اس جملے کا ترجمہ کیا کہ "معصوم پاپائے روم نے ایک سانڈ چھوڑا" بہرحال ان پُر مذاق جملوں میں سے کسی جملہ کا ترجمہ اگر کوئی صاحب کسی دوسری زبان میں کریں تو انہیں مندرجۂ ذیل طریقہ اختیار کرنا پڑیگا۔ مثلاً وہی جملہ لیجئے کہ "برو[1] من کہ فرستا یندند کوچہ[2] بود خندق[3] نہ رفت[4]" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جامن جو بھیجی گئی تھی گلی ہوئی کھائی نہ گئی مگر جن الفاظ سے یہ مذاق پیدا کیا گیا ہے ان کی شرح اس طرح کی جائیگی۔

نوٹ نمبر (۱)۔ برو من برو "صیغہ امر" بمعنی جا اور من بمعنی من۔ یہاں من کے معنی واحد متکلم یعنی میں کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں من سے مطلب صرف "من" ہی ہے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر ایک اسم بنایا ہے یعنی "جامن" جامن ہندوستان میں ایک پھل ہوتا ہے۔

نوٹ نمبر (۲)۔ کوچہ بمعنی گلی یہاں دراصل گلی کوچہ کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ گلی یعنی سڑی یا پھپھوندی لگی ہوئی۔

نوٹ نمبر(۳)۔ خندق بمعنی کھائی مگر یہاں وہ کھائی مراد نہیں جو خندق کے معنوں میں مستعمل ہے بلکہ وہ کھائی مراد ہے جو فارسی میں خورد کے معنوں میں مستعمل ہے۔

نوٹ نمبر(۴)۔ رفت ماضی بعید بمعنی گیا یا گئی۔ مگر دراصل یہاں گئی جانے کے معنوں میں نہیں آیا ہے۔

غرض یہ کہ جو مذاق زبان سے متعلق ہو یا جس میں ضلع اور جگت وغیرہ کے چٹخارے ہوں کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرکے وہی چٹخارے پیدا کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ مثلاً یہاں ضلع سے مذاق پیدا کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے کسی طوائف سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ جواب ملا کہ مہری۔

انھوں نے کہا کہ "تم تو شیرا ہو" طوائف نے جواب دیا کہ اگر آپ اس میں خوش ہیں تو ہم شیرہ (ہمشیرہ) ہی سہی۔

دو شخص چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک کانا تھا۔ انھوں نے چار کانے کا داؤ رکھا۔ پانسا پھینکا تو تین کانے پڑے۔ ایک ظریف نے پوچھا کہ "پریشان کیوں ہو" کہا کہ "پانچ روپیہ کی بازی ہے داؤ رکھا چار کانے۔ پانسا پھینکا تو پڑے تین کانے" وہ کہنے لگا کہ "حضرت تین کانے یہ ہیں چوتھے کانے آپ ہیں چاروں کانوں کو ملاکر رنگ کو تو اٹھا جاؤ۔ بدرنگ کے جگ کو پھر دیکھ لینا" یا جملہ میں کوئی غلط یا غیر موزوں لفظ بٹھا دیا ہو مثلاً

ایک میراثی کا لڑکا نماز پڑھتے وقت التحیات بھول گیا۔ نماز توڑ کر مولوی صاحب سے پوچھنے لگا کہ "خلیفہ جی، بیٹھنے کا انترہ کیا ہے"

یا یہ واقعہ کہ :-

چڑیا خانے میں ایک صاحب مع اپنے صاحبزادے کے جانوروں کے ملاحظے میں مصروف تھے۔ جس وقت وہ اس احاطہ کے سامنے پہنچے جہاں ہاتھی بند تھا لڑکے نے گنا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ان کے والد نے چلاکر کہا "دیکھنا بیٹا۔ بچ کے رہنا کہیں اس کا ڈنک نہ لگ جائے"۔

یا بعض اوقات مذاق پیدا کرنے کے لئے جملے کے الفاظ الٹ دیتے ہیں۔ مثلاً :-

ایک صاحب شتر خانہ میں منشی کی جائداد پر نوکر ہوئے۔ دوسرے روز کوئی افسر معائنے کو آیا۔ اور ان سے پوچھا تم کون ہو یہ فوراً گھبراکر بولے میں منشی خانہ کا شتر ہوں۔

یا بعض اوقات لکھا ہوا کچھ ہوتا ہے مگر حرفوں پر نقطے وغیرہ نہ ہونے سے پڑھ کچھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک نسخہ میں لکھا تھا۔

"شربت بنفشہ وانہ الائچی" کسی صاحب نے اسے پڑھا۔ "شربت بنفسہٖ وانہ الٰہی"

غرض یہ کہ ان سب کے لطف صرف ایک اہل زبان ہی لے سکتا ہے۔ ترجمہ کیا اور مزہ کرکرا ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ لفظی مذاق کی کیفیت ایک آئینے کی سی ہے جس میں لطف زبان اور حسن بیان کے جلوے نظر آتے ہیں اور دور سے کھڑے رہ کر دیکھو تو سب کچھ ہے اور نزدیک آکر ٹٹولو تو کچھ بھی نہیں۔

ہاں اگر ظرافت لفظی الٹ پھیر یا کسی خاص گروہ کے لب ولہجہ یا طرز تکلم کی نقالی کو چھوڑ کر حیات نگاری اور سیرت نگاری کے میدان میں قدم رکھے کائنات کی متضاد کیفیتیں اور واقعات میں تناقض کی صورت پیدا کرے، مختلف قوموں کے عادات و اطوار اور ان کی خصوصیات اخلاقی رنگ میں پیش کرے تو اس میں ادبی خصوصیت اور معیاری ظرافت کا اصلی رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ ظریفانہ اور مضحکہ خیز افعال کون سے ہیں۔ ایک شیخی باز نواب جو زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہو ایک پروفیسر جو ہمیشہ اپنے خیالات میں غرق رہے یہاں تک کہ اگالدان کو گلاس سمجھ کر اپنے منہ سے لگائے۔

انہماک میں اپنا گھر سمجھ کر دوسرے کے گھر میں گھس جائے۔ اور لوگ کچھ پوچھیں اور وہ اپنے انہماک میں جواب کچھ کا کچھ دے جائے شلاً:۔
ایک لڑکے کا جوتا چوری گیا۔ اُس نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب ایک گھنٹہ سے "کفش" ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہی ہے۔
مولوی صاحب جو مطالعے میں غرق تھے۔ سر جھکائے ہوئے فرمانے لگے کہ "بیٹا غیاث اللغات میں کاف کے باب میں ڈھونڈو مل جائے گا۔
اسی طرح ایک کنجوس امیر، ایک سریص مفلس، بنے ہوئے مرشد، شریر طالب علم، بے وقوف عالم، مارواڑی، افیونی، افغانی، غرض یہ کہ
جدھر نظر اٹھاؤ گے ایک پرلطف مجمع نظر آئے گا۔ اور اُن کی باتیں سنو گے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ گے۔
"مشتے نمونہ از خروارے" چند مثالیں قابل ملاحظہ ہیں۔

ایک افیونی نے تقریباً ڈیڑھ سیر گوشت لا کر اپنی بیوی کو دیا۔ اتفاقاً وہ گھر میں سے غائب ہو گیا بیوی نے بلی پر شبہہ ظاہر کیا کہ شاید یہ کھا گئی ہو گی۔ افیونی نے کہا کہ بھلا اتنی سی بلی۔ اتنا گوشت کیسے کھا گئی۔ اچھا بلی کو تول کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا۔ بلی کو تولا تو اس کا وزن کل ڈیڑھ سیر نکلا افیونی نے تعجب سے کہا کہ گوشت تو مل گیا۔ لیکن بلی کہاں گئی۔

ایک بونا تھانے میں دوڑتا ہوا بدحواس آیا اور کہا کہ مجھے پناہ دو۔ تھانہ دار نے پوچھا کہ "واقعہ کیا ہے" بونے نے جواب دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو دست پناہ کھینچ کر مارا ہے" تھانہ دار نے پھر پوچھا کہ کیا وہ مر گئی" تو بونے نے جواب دیا کہ مری ہوئی تو نہیں مگر وہ مجھے پکڑنے آ رہی ہے۔

استاد نے جماعت میں ایک سوال کیا جو بچوں کی استعداد سے باہر تھا۔ یہ سن کر ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے کے کان میں کہا کہ ہمارا استاد بھی ذرا الو ہی ہے۔ استاد نے انھیں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھ کر سمجھا کہ شاید جواب کی فکر میں ہیں خوش ہو کر کہا کہ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں زور سے کہو شاید درست ہو۔

موہن گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ اے ایشور روم کو ترکی کا دارالسلطنت بنا دے! باپ نے پوچھا کہ "موہن تم یہ دعا کیوں مانگ رہے ہو" موہن نے جواب دیا۔ اس لئے کہ امتحان کے پرچہ میں میں نے غلطی سے روم کو ترکی کا دارالسلطنت لکھ دیا ہے۔

ایک وکیل نے دوسرے وکیل سے کہا کہ تم گدھے ہو۔ دوسرے نے کہا کہ تم الو ہو۔ دونوں نے جج سے شکایت کی جج نے کہا کہ آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جائیے۔ جب آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے پہچان لیں تو پھر آ کر بحث کریں۔

ایک شخص کا کتا کھو گیا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جو اسے ڈھونڈ لائے گا اس کو دس روپے انعام دیا جائے گا۔ اشتہار چھپا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے دفتر پہنچے اور کہنے لگے کہ "صیغۂ اشتہار کے منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ پھر کہا کہ اُن کے نائب سے مل سکتا ہوں۔ تو جواب ملا کہ وہ بھی نہیں ہیں۔ "اچھا تو ایڈیٹر صاحب ہیں" جواب دیا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں" پھر پوچھا کہ "سب ایڈیٹر صاحب تو ہوں گے۔ ان سے ہی مل لوں" جوان نے کہا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں" تو یہ فرمانے لگے کہ اوہو سب کے سب کتے کی تلاش میں مصروف ہیں۔ شکریہ۔ شکریہ۔

(باقی آئندہ)

مرزا عصمت اللہ بیگ

بھاکھا کے مُسلمان شُعراء

اس مختصر سے مضمون میں تقریباً سوا سو مسلمان شعراء کا کلام بقیدِ تاریخ درج کرنا ناممکن ہے۔ جنھوں نے زبان بھاکھا کو اپنا بنایا تھا۔ صرف بڑے بڑے چند افراد کا ذکر بہ تفصیل درج کر دیا جاتا ہے۔ اور کسی دوسرے موقعہ پر کسی دوسری محفل میں باقی شعراء جن کے یہاں پر صرف نام گنانے پر اکتفا کیا جاتا ہے مع نمونۂ کلام پیش کئے جائیں گے۔

پہلا مسلمان شاعر جس کا ذکر ملتا ہے۔ قطب علی تھا جو بارھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ مگر اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا۔ امیر خسرو کی پہیلیاں اور کہ مکرنیاں مشہور ہیں ہر خاص و عام کی زبان پر ان کی پہیلیاں اب تک ہیں یہاں صرف ایک نمونہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہاتھ چڑھا وہ گھر گھر ڈولے، بن مارے وہ روتا ہے
خسرو کہین بتاؤ پہیلی، بن دادے کا پوتا ہے

خسرو کے بعد مدت تک کسی مسلمان ہندی شاعر کا پتہ نہیں لگتا۔ لودھی خاندان کے دورِ حکومت میں کبیر صاحب پیدا ہوتے ہیں اگر سچ پوچھا جائے تو خسرو، کبیر اور رحیم۔ یہی تین شعراء ہیں جن کا نام زبان ہندی سے محو نہیں ہو سکتا۔ کبیر صاحب کے بچن زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اور کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ایک نمونہ ان کے مقدس کلام سے درج کیا جاتا ہے۔

دیا کون پر کیجیے، کا پر نردئی ہوئے
سائیں کے سب جیو ہیں، کیری کنجر دوئے

دیا۔ رحم، نردئی۔ بے رحم، کیری۔ چیونٹی، کنجر۔ ہاتھی، دوئے۔ دونوں، فرماتے ہیں کہ کس سے رحم کیا جائے اور کس پر ظلم جائز رکھا جائے۔ چیونٹی اور ہاتھی دونوں اسی رحمٰن و رحیم کی مخلوق ہیں۔

خاندانِ سوری کے مختصر سے دور میں دو شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک شیخ قطبن دوسرے ملک محمد مصنف پدماوت۔ جس طرح سروانٹیز کے باعث ڈلسینیا ڈل ٹوباسو (Dulcinia del Toboso) مشہور ہوئی اسی طرح ملک محمد نے سنگل دیپ کی پدمنی کو حسن و عشق کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اس کی داستانِ غم ہم پھر کسی وقت پیش کریں گے۔

دورِ مغلیہ میں جب کہ ہر طرف امن و اماں قائم ہو گیا۔ تجارت کے ساتھ دولت کی فراوانی ہوئی اور عوام آسودہ اور خوش حال ہوئے تو پھر ادب کا بھاگ جاگا۔ ہندی کے تمام مشہور شعرا اس دور میں گذرے ہیں۔ تلسی اور سور یا بہاری اور دیو، متی رام اور بھوکھن یہ وہ شعرا ہیں جو کسی زبان کے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔

یہ سب دورِ مغلیہ ہی میں گذرے ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دکن کی سرزمین سے اس نئی زبان کی ابتداء ہوتی ہے۔ جسے پہلے ریختہ اور اب اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر خود ہندی میں کلام کرتے تھے۔ بیربل کے مرجانے پر اکبر کو بڑا صدمہ ہوا اور اس کے احساسات نظم ہو گئے۔

دین دیکھ سب دین، ایک نہ دینو دسہ دکھ
سو اب ہم کو دین، کچھ نہیں راکھو بیربل

دین = قابل رحم، دکھی = رنجیدہ، دین = دے ڈالا، دینوں = دیا، دسہہ دکھ = ناقابل برداشت غم، راکھو = رکھا،
کہتے ہیں کہ غربا اور مساکین کو اس نے سب ہی کچھ دے ڈالا تھا صرف ایک ناقابل برداشت غم تھا جو اب ہم کو دیا ہے
بیربل نے اپنے پاس کچھ بھی تو نہ رکھا۔

اس خاندان میں شہزادہ دانیال اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی ہندی میں کلام چھوڑا ہے۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ نے ہندی نظم کو سنوارا اور اپنی تصنیف نورس یادگار چھوڑی۔

دربار اکبری کے نورتن میں سے ایک عبدالرحیم خانخاناں تھے۔ فارسی اور بھاکھا کے صدہا اہل قلم ان کی سخاوت سے مستفیض ہوئے۔ خود بھی نہایت پاکیزہ نظم لکھتے تھے۔ یہاں چند دو ہے بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

اب رحیم مشکل پڑی، گاڑھے دوؤ کام　　　سانچے تے تو جگ نہیں، جھوٹے ملے نہ رام

رحیم اس زمانے میں بڑی مشکل ہے۔ دونوں طرح مشکل ہے۔ سچ کہو تو دنیاداری نہیں نبھتی اور اگر جھوٹ کی راہ اختیار کی جائے تو عاقبت خراب ہوتی ہے۔

کملا تھِر نہ رحیم کہے، یہ جانت سب کوئے　　　پُرش پُراتن کی بدھو، کیوں نہ چنچلا ہوئے

کملا۔ دولت کی دیوی، پُرش پراتن = بوڑھا آدمی، وشنو کو بھی دیومالا میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بدھو = زوجہ، عورت، چنچل = چلبلی، تھِر = مستقل، پابند، جو چنچل نہ ہو، یہ سب کوئی جانتا ہے کہ دولت کسی کے یہاں مستقل طور پر نہیں رہتی۔ آخر پُرش پراتن کی زوجہ ہے کیوں نہ چنچل ہو۔

دیومالا میں کملا وشنو بھگوان کی زوجہ کہی جاتی ہے جن کا نام پُرش پراتن بتا کر رحیم کیا عمدہ چٹکی لیتا ہے۔

سب ہی ساتھی سبل کے، نبل نہ کوئی سہائے　　　پون جراوت انل کو، پاپک دیت بجھائے

سَبل = مضبوط، قوی، نبل = کمزور، سہائے = حامی، مددگار، پون = آندھی، تیز و تند ہوا، انل = آگ، پاپک = چراغ، دیا۔

قوی کا ہر ایک ساتھ دیتا ہے مگر کمزور کا کوئی حامی نہیں۔ ہوا کو دیکھو کہ آگ کو تو روشن کرتی ہے اور کمزور دیا کو بجھا دیتی ہے۔

دھور دھرت نج شیش پر، کہو رحیم کس کاج　　　جے ہی رج رشی پتنی تری، سو ڈھونڈت گج راج

دھور = مٹی خاک، نج = اپنے، شیش = سر، کاج = غرض، کام، جے ہی = جس، رج = دھور، خاک، رشی پتنی = گوتم کی ناری، اہلیہ، گج راج = ہاتھی

رحیم کہو ہاتھی اپنے سر پر خاک کیوں ڈالتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مٹی کی تلاش میں ہے جس کے چھونے سے اہلیا تر گئی۔

کہتے ہیں کہ اہلیا گوتم کی زوجہ تھی اور پتھر ہو گئی تھی جب بھگوان رام چندر جی اس راہ سے گذرے تو ان کی خاک پا سے اہلیا پھر آدمی ہو گئی۔ ہاتھی آج تک اسی مقدس خاک کو تلاش کر رہا ہے جس سے اس کی زندگی بھی سنبھل جائے۔

اسی دور کے ایک اور شاعر قادر بخش گذرے ہیں جو زمانے کی ناقدرشناسی کے باعث یوں شاکی ہیں۔

گُن کی نہ پوچھے کوؤ اوگن کی بات پوچھیں　　　کہا بھیو دئی کلجگ یوں کھرانو ہے
پوتھی او پران گیان ٹھٹھن میں ڈار دیت　　　چگل چبائن کو مان ٹھہرانو ہے
قادر کہت یا تے کچھو کہبے کی نا ہیں　　　جگت کی ریت دیکھ چپ من جانو ہے

کمل دیکھو ہو سب بھانتین سوی بہانت بہانت   گن نا ہرا نون گن کا ہک پرانو ہے

گن۔ بھلائی، کمال، اوگن۔ برائی، دنی۔ یا آلہیٰ، کلجگ۔ موجودہ زمانہ، زمانہ کی تقسیم ست جگ، ترتیا، دواپر، اور کلجگ چار حصوں میں کی گئی ہے۔ پوتھی۔ کتاب، گیان۔ علم، ٹھٹھن۔ مذاق، چگل۔ چغلی، چپاؤ۔ بہتان، مان۔ عزت، ہیو۔ دل، ضمیر، پرانون۔ کم ہوا، گم ہوا، تخمین میں آیا۔

بھلائی کی بات تو کسی کو آتی نہیں۔ جسے دیکھو برائی کی باتیں بناتا ہے۔ الٰہی آخر اس زمانہ کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ علم و فن کا ہر طرف مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہر ایک چغلی اور بہتان میں مشغول ہے۔ قادر کہتا ہے کہ اس سے تو کچھ بھی نہ کہہ۔ دنیا کی ریت دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بہت بہتر ہے۔ میں نے خوب اچھی طرح غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کمال کی کمی نہیں ہے کمی ہے اس کے قدر دانوں کی۔

برج بھاشا کی نظم کا ایک مجموعہ برج مادھوری سار کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کی رائے ہے کہ رسکھان نہایت شستہ بولی میں کرشن جی کی تعریف میں کتا کرتا ہے۔

ڈرے سدا، چاہے نہ کچھو سہے سبے جو ہوئے   رہے ایک رس چاہکے پریم بکھانوں سوئے

پریم وہ ہے جو ہمیشہ ڈرتا رہے اور کسی امر کی خواہش نہ رکھے۔ جو کچھ گذرے اسے سہتا رہے صرف یار کے خیال میں مست رہے۔ بس یہی عشق ہے۔

ستیہ نارائن حال ہی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ انھیں موسیقی سے خاص ذوق تھا ایک موقع پر غایت درجہ موسیقی کے ساتھ انھوں نے رسکھان کے حسب ذیل کلام کو پڑھا تھا۔

یا لکوٹی اور کامریا پر راج تہوں پر کو تج ڈاروں   اٹھوں سدھ نو ندھ کو سکھ نند کی گائے چرائے بساروں
آنکھیں سون رسکھان کبے برج کے بن باگ تڑاگ نہاروں   کوٹن ہوں کل دھوت کے دھام کریل کے کنجن اوپر واروں

لکوٹی۔ چھوٹی چھڑی، کامریا۔ کلیم، کمبل، تہوں پر۔ تین لوک جن میں ساری ارض کو تقسیم کیا گیا ہے، تج ڈاروں۔ ترک کر دوں، سدھ۔ عظمت، و کمال، نو ندھ۔ ثروت، دولت، بساروں۔ بھول جاؤں، کبے۔ کب، باگ تڑاگ۔ باغ اور تالاب، نہاروں۔ دیکھوں، کوٹن۔ کروڑوں، کل دھوت۔ سونا، طلا، دھام۔ مقام، کریل۔ کانٹے دار ایک قسم کا درخت، کنج۔ گنج، درختوں کا جھرمٹ میں تو بھگوان کرشن کی اس چھڑی اور کملی پر تینوں عالم ترک کر دوں۔ اور اٹھوں سدھ اور نو ندھ کی لذت نند کی گائیں چرانے میں بھول جاؤں کاش میں اپنی آنکھوں سے برج کے جنگل، باغ اور تالاب دیکھ سکوں (شاعر نابینا تھا) میں اس خوبصورت کنج پر کروڑوں سونے سے بنے ہوئے مقام نثار کر دوں۔

مانس ہو تو وہی رسکھان بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن   جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو مجھارن
پاہن ہوں تو وہی گر کو جو دھرو کر چھتر پرندر دھارن   جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں وہی کالندی کول کدم کی ڈارن

مانس۔ انسان، بسوں۔ آباد ہوتی رہوں، پشو۔ جانور، حیوان، دھین۔ گائیں، پاہن۔ پتھر، گر۔ پہاڑ، پرندر۔ کرشن بھگوان، کھگ۔ پرند، کول۔ کنارے۔

اگر میں آدمی بنایا جاؤں تو برج اور گوکل کے گوالا کے ساتھ جا کر رہوں، اگر میری قسمت میں جانور ہونا ہے تو پھر ہر روز نند کی

گائیوں کے ساتھ چرا کروں۔ اگر میں پتھر بنوں تو اس پہاڑ کا جسے کرشن بھگوان نے چھتری کی طرح اپنے ہاتھ پر اٹھالیا تھا۔ اور اگر پرندہ ہونا میری قسمت میں لکھا ہو تو پھر کالندی کے کنارے کدنب کی ڈالیوں میں میرا آشیانہ ہو۔

خال کی تعریف اردو شعرا نے خوب کی ہے۔ سید مبارک علی بلگرامی اپنے کلام میں اسے ایک اچھوتے رنگ میں پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

سب جگ پیرت تلن، تھکیھ چنتہ یہ ہیر ۔۔۔ تو کپول کو ایک تل، سب جگ ڈاریو پیر

پیرہ پیرنا، تیل نکالنا۔ تکلیف دینا، تل۔ اجناس کی قسم سے ایک اور خال کو بھی کہتے ہیں، تو۔ تمھارے، کپول۔ چہرہ، رخسار۔ دنیا جہاں تل کو تیل کے لئے پیرتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ وہی تل جب تیرے رخسار پر آگیا تو اس نے سارے جہان کو پیر دیا ہے۔

دور مغلیہ میں چھوٹے بڑے بہت سے مسلمان شعرا نے ہندی میں کلام کہا۔ اکثر کا تو صرف نام اور تخلص ہی باقی ہے۔ شیخ عثمان جمال، طاہر۔ دلدار، شیخ وزیر، وغیرہم بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

بہادر شاہ کے ایک حاشیہ نشین عبدالرحمن نامی گذرے ہیں۔ انھوں نے (۷۰۱) دوہے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ایک یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پلکن میں راکھوں پیہی، پلک نہ جہاڑو سانگ ۔۔۔ پتری سوتے ہو نہی جن، ڈر پیت اپنے انگ

میں اپنے معشوق کی تصویر اپنی آنکھوں میں رکھتی ہوں۔ لحظہ بھر کے لئے جدا نہیں ہونے دیتی، پھر بھی ڈر یہ ہے کہ کہیں آنکھ کی پتلی بھی میری رقیب نہ بن جائے۔

سید نظام الدین بلگرامی اپنا تخلص مدھنائک کرتے تھے۔ غلام علی آزاد ان کی بابت فرماتے ہیں:۔

سید نظام الدین شہرۂ روزگار در موسیقی ہندی یگانۂ ادوار است در عہد خود ممتاز و کرم می زیست وصفت مروت و سخاوت بمرتبہ کمال داشت و ہموارہ خلق خدا می وجود حاتمی را رنگی تازہ می بخشد و در صحبت نکتہ سنجی و لطیفہ گوئی میر مجلس بہ او مسلم می شد۔

مدھنائک بلگرام سے بنارس بغرض تحصیل علم روانہ ہوئے دو تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اول ناد چندریکا، دوم مدھنائک سنگار۔ ایک مرتبہ ان بزرگ نے میگھ راگ گاکر خوب بارش کی۔ ۱۰۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

کاری کجراری انیاری جگ موہن کوں تن نیچ ماری رتی ترل تریری ہیں ۔۔۔ جیسی میں ساوک جاوک جل پھرت پھر کیں سو کیسے ہوں رہت نہ گھیری ہیں

لال مدھنائک سو میرول موہنی کوں ہٹ ہیری پنجر رہت نہ ہیری ہیں ۔۔۔ سالوکی سدھار سو بھاہار ہکار ایسی ہیں کی کھلونا کد ہوں نہ بھولتی تیری ہیں

کجراری۔ کاجل لگائے، انیاری۔ نوکدار، ترل چنچل، تریری۔ آنکھ کا گھومنا، ساوک کسی جانور کے چھوٹے بچے کو ساوک کہتے ہیں، ہیری۔ ہٹ کر۔

تیری کالی کاجل دار نوکیلی آنکھیں دنیا کو ہنستے ہوئے ایسی پھرتی ہیں جیسے کہ مچھلی کے بچے پانی میں پھرتے ہیں اور کسی کے روکے نہیں رک سکتے۔ مدھنائک کا دل اس جال سے بچائے پھر بھی نہیں بچتا۔ ان آنکھوں کی خوبصورتی تو دیکھو کہ یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہیں یا تیری پیاری پیاری آنکھیں ہیں۔

سید رحمت اللہ نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی ایک دوہا جو آنکھوں کی تعریف میں انھوں نے لکھا بہت ہی اچھا ہے۔

آن بان کو لسب ہیں نینن بان سمان ۔۔۔ دے لاگت سالت جو یہ دیکھت بیدھت پران

عوام آنکھوں کی بان (تیروں) سے مشابہت بتاتے ہیں، گر بان تو لگنے سے زخم پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے تو دیکھنے سے ہی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

ان کے ہمسر میر عبدالجلیل گذرے ہیں جنھوں نے اپنی تصنیف نکھ سکھ (سروپا) یادگار چھوڑی ہے۔ معشوق کی نزاکت طبع کا کیا ہی عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

پھلواری گھونگھٹ کی پاتین جات ― سمن پاس ن جائیں نہیں سُہات

کہتے ہیں پھولوں کی خوشبو بھی جب تک چھن کر آئے پسند خاطر نہیں ہے۔ اس لئے تو گھونگھٹ کا استعمال جائز رکھا گیا ہے۔

زبان کی شستگی، سلاست اور موسیقی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برج بھاشا میں رس کھان، رس لین کا درجہ بہت اعلیٰ قرار دیا جائے گا۔ رس لین کا پورا نام سید غلام نبی تھا۔ میر عبدالجلیل کے ہمشیر زادے اور بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۲۷ء میں انگ درپن اور ۱۷۳۱ء میں رس پربودھ ختم کی۔ چند نمونے ان کے کلام سے پیش کئے جاتے ہیں۔

اے من ریت بچتہے ریت نینن کی چیت ― بکھ کا جر بچ کھائے کے جیہ اورن کی لیت

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے دل ان کی آنکھوں کا عجیب طرز تو دیکھ خود تو زہریلا کاجر کھاتی ہیں اور دوسروں کے دل پر آفت ڈھاتی ہیں۔ ایک جگہ آنکھ کے کھلنے اور بند ہونے کی تشریح کرتے ہیں کہ بند ہونا تو ان کی ریت ہے مگر کھلتے وقت پریم کا اثر ہوتا ہے۔

کہلت پریم کے جور تے ، مندت نیم کی جور

ہم کہہ چکے ہیں کہ سوا سو مسلمان شعرا کا تذکرہ جنھوں نے بھاکھا میں نظم لکھی ہے۔ ایک مضمون میں لانا ناممکنات سے ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹا سا مضمون اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ آئندہ اس جانب کسی کی توجہ مبذول ہو اور یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی جائے کہ دکن کے اہل قلم نے کہاں تک اس ترقی میں حصہ لیا۔ بیجا پور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے علاوہ اب تک صرف ایک نام ہاشم بیجاپوری کا ملتا ہے۔ ابنائے وطن کا فرض ہے کہ اپنے بزرگوں کا نام دنیا میں جیتا جاگتا رکھنے کے لئے انھیں دنیا سے روشناس کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

میں اب اس مضمون کو سید برکت اللہ کے دو تین نمونے درج کرکے ختم کرتا ہوں۔

تم دیپک ہم پتنگ اجگت کہے سنائے ― من شمع جاں گدازم
بن دیکھے نہیں رہ سکوں دیکھے رہوں نہ جائے ― سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

پیمی بند و ترک ہیں ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت میں دیپ ایک ہیں بھائے

ہوں چکئی وا سندھ کی جہاں نہ سورج چند
رات دیس نہیں ہوت ہے نا دکھ نہیں آنند

بھاکھا کے مسلمان شعراء کی فہرست

الف
۱ اکبر
۲ ابراہیم عادل شاہ
۳ ابراہیم
۴ انور خاں
۵ احمد
۶ آصف خاں
۷ اعظم خاں
۸ میر احمد بلگرامی
۹ اعظم
۱۰ سید امیر علی
۱۱ الہ داد
۱۲ انشاء
۱۳ اکرم
(ب)
۱۴ بارک
۱۵ پیتم
۱۶ پریمی
۱۷ بختاور خاں
۱۸ سید برکت اللہ بلگرامی
(ج)
۱۹ جمال الدین
۲۰ جمال
(د)
۲۱ شہزادہ دانیال
۲۲ شہزادہ دارا شکوہ
۲۳ دلدار
۲۴ دانشمند خاں
۲۵ دین
(ھ)
۲۶ ہمت بہادر
۲۷ ہاشم بیجاپوری
۲۸ ہمت خاں
(و)
۲۹ شیخ وزیر
۳۰ وہاب
۳۱ واجد
۳۲ واحد
(ز)
۳۳ زین الدین
(حطی)
۳۴ خان
۳۵ خسرو
۳۶ حسین
۳۷ حاجی
۳۸ طاہر
۳۹ طالب شاہ
۴۰ طالب علی بلگرامی
۴۱ یعقوب خاں
۴۲ یوسف خاں
۴۳ یزدانی
۴۴ حسن مارہروی
۴۵ حسین
(ک)
۴۶ کبیر
۴۷ کریم
۴۸ کشور علی
۴۹ کاظم علی
(ل)
۵۰ لطیف
(م)
۵۱ مبارک
۵۲ ملک محمد جائسی
۵۳ محبوب
۵۴ میر رستم
۵۵ محمد
۵۶ مدہنالک
۵۷ مظہر جانِ جاناں
۵۸ میاں
۵۹ میرن
۶۰ میر
۶۱ مراد
۶۲ شاہ محمد
(ن)
۶۳ نور محمد
۶۴ نواز بلگرامی
۶۵ نجیبی
۶۶ غلام نبی
۶۷ نیاز
۶۸ نشاط
۶۹ مرزا روشن نظیر
۷۰ نجیب خاں
(س)
۷۱ سلطان
۷۲ سید پہاڑ
(ع)
۷۳ عالم
۷۴ عبدالرحیم خان خاناں
۷۵ عثمان
۷۶ عبدالرحمن
۷۷ عبدالجلیل بلگرامی
۷۸ عادل
۷۹ علیم
۸۰ علی
۸۱ محمد عارف بلگرامی
۸۲ خان عالم
۸۳ خان ملتان
۸۴ خان سلطان
۸۵ عبدالواحد ذوقی بلگرامی
(ف)
۸۶ فضائل خاں
۸۷ فرید
(ص)
۸۸ صاحب
(ق)
۸۹ قطبن
۹۰ قادر
۹۱ قاسم شاہ
(ر)
۹۲ رسکھان
۹۳ رس لین
۹۴ رجب علی
۹۵ سید رحمت اللہ بلگرامی
(ش)
۹۶ شیخ
۹۷ شاہ شفیع
۹۸ شاہ ہادی
۹۹ شیخ گدائی
۱۰۰ شیخ سلیمان
۱۰۱ شیخ شاہ محمد بلگرامی
(ت)
۱۰۲ تاج
۱۰۳ تیغ علی
۱۰۴ تراب
(ذ)
۱۰۵ ذوالقرنین

بی این چوبے

میرا ایک دوست

میرا ایک دوست ہے۔ کالج کا ساتھی۔ نہایت دلچسپ ظرافت کا پتلا۔ اگر تم اس کی بے تکلف صحبتوں میں بیٹھو تو وہ تمھیں اتنا ہنسائے گا کہ شاید تمھارے رخسار درد دینے لگیں۔ تم شاید اس کی زندگی پر رشک کرنے لگو گے۔ تم سمجھو گے کہ اس کی زندگی آلام و مصائب سے پاک اور مسرتوں سے لبریز ہے۔ لیکن مجھے اس کی زندگی کا ایک راز معلوم ہے۔ وہ راز جسے آج تک اس نے سوا میرے ہر ایک سے چھپا رکھا ہے۔

"آج میں تمھیں سب کچھ سنا دوں گا" اس نے کہا تھا "اس لئے نہیں کہ دنیا کے لئے درسِ عبرت ہو۔ اس لئے نہیں کہ بھٹکے ہوئے اس کو سن کر راستے پر آجائیں نہیں مجھے بڑے بڑے دعوے کرنے نہیں آتے۔ میں سناؤں گا صرف اس لئے کہ بس سنا دینا چاہتا ہوں۔ دل میں ایک جذبہ ہے جو رہ رہ کر مجبور کرتا ہے کہ میں سب کچھ سنا دوں تمام دنیا کو۔ دنیا کے تمام افراد کو — خاموش بہتی ہوئی ندیوں کو۔ سر پٹکتے ہوئے آبشاروں کو۔ اڑتے ہوئے بادلوں کو ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو جگمگاتے ہوئے چاند کو زمین کو آسمان کو — میں اپنی کتابِ زندگی کے اوراق کو بکھیر دینا چاہتا ہوں۔ تمام دنیا میں۔ کائنات میں۔ میں اپنی آواز کو پھیلا دینا چاہتا ہوں۔ فضائے بسیط میں۔ خلائے ارض و سما میں — لیکن نہیں۔ یہ اس کا وقت نہیں ہے۔ سوائے اپنا مذاق اڑا لینے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے اظہار کے لئے صرف وہی لمحہ مناسب ہے جس کے بعد زندگی میں دوسرا لمحہ آنے والا نہ ہو۔

تمھیں معلوم ہے نا۔ بلکہ اکثر احباب کو بھی کہ کالج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مجھے مجبوراً ٹیوشن کرنا پڑتا تھا۔ غریبوں کے لئے بھی تو ایک لے دے کر سہارا ہے۔ لیکن باوجود ٹیوشن کی سخت ترین ضرورت کے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بلا وجہ جھڑکا جاؤں اور خاموشی کے ساتھ سب کچھ سہتا رہوں۔"

"ہاں وہ بڑی خراب فطرت کا آدمی ہے" لوگ کہتے ہیں۔ "بھئی وہ بڑا مغرور شخص ہے بڑا احسان فراموش" لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پیچھے کیا حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ راز ہے جسے میں نے آج تک سینے میں محفوظ رکھا۔ لیکن آج تمھیں سنا رہا ہوں کہ شاید کچھ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے محض اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایسا نہیں کیا بلکہ عمداً۔ شاید وہ مجھے نکال دینا چاہتے تھے لیکن وہ کوئی الزام مجھ پر نہ دھر سکتے تھے۔ میں پابندی سے جاتا تھا۔ روحی جو بلا کی ذہین تھی اور جسے پڑھانے میں کبھی میں نے دقت محسوس نہیں کی کبھی فیل نہیں ہوئی۔ اس نے انعامات اور تمغے حاصل کئے۔ تم جانتے ہو ان دنوں میں نے کتنی تکالیف اٹھائی ہیں۔ روزانہ کالج جانا اور پھر اتنی دور کی چکر ٹیوشن کے لئے صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مجھے مسلسل دماغی محنت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں روحی کے ہاں برابر جایا کرتا تھا۔ سرما کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا، گرما کی جھلسا دینے والی دھوپ میں گرم لو کا مقابلہ کرتا ہوا، بجلی کی دل دہلا دینے والی گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کا سامنا کرتا ہوا پانی سے شرابور میں وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور شاید تم اندازہ نہ کر سکو کہ روحی کی معصوم بھولی بھالی باتوں میں میں ان تمام تکالیف کو کس آسانی سے فراموش کر دیا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر یہ ٹیوشن چھوٹ جائے تو پھر میرے لئے مصیبت کا سامنا ہو لیکن یہ بھی میں محسوس کرتا تھا کہ اس دن بھی جس دن میرے پاس وہاں نہ جانے کی کافی وجہ ہوتی تھی مجھے بغیر گئے چین نہ پڑتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ بہت دن ہو گئے یا صرف چند مجھے ٹھیک یاد نہیں میں نے گننے کی کوشش نہیں کی۔ تم جانتے ہو انسان کی فطرت کو۔ سمجھتا ہے کہ دنیا ایک ہی حالت پر قائم رہے گی۔ جانتا ہے دیکھتا ہے ہر روز بلکہ ہر لحظہ کہ دنیا بدل رہی ہے۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے۔

خود اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے خوش ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اُسے سمجھانا بھی چاہے تو وہ اسے سننے اور سمجھنے سے انکار کرنے لگتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ ابھی میری تعلیم کی تکمیل کو ایک سال باقی تھا کہ ایک انقلاب آیا۔ اس دلچسپی نے جو مجھے روحی سے اور روحی کو مجھ سے ہو چلی تھی۔ روحی کے والد کے دل میں شاید خوف پیدا کر دیا کہ کہیں یہ دلچسپیاں کچھ رنگ نہ لائیں۔ اور یہی اصل سبب ہے ان کے مجھے نکال دینے کی کوشش کرنے کا۔ یوں تو شروع ہی سے وہ کوئی ملنسار یا خلیق آدمی نہ تھے مگر ان دنوں ان کا طرز عمل ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

اُس دن جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ غصہ کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ بلا وجہ ہاں بالکل بلا وجہ انھوں نے مجھے اس طرح جھڑک دیا کہ میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں — تعجب کرتے ہو دوست! اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ ابھی زندگی میں تم نے قدم نہیں رکھا ہے۔ زمانہ تمھیں سب کچھ معلوم کرا دیگا۔ میں غریب زمانہ سے ابھی ناآشنا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ خون جوش کھانے لگا۔ مگر پھر بھی بغیر ایک حرف زبان سے نکالے خاموشی سے اٹھ کر سیدھے گھر چلا آیا اس ارادہ سے کہ اب یہاں پھر کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ ان کی تدبیر کارگر ہو گئی۔ میں نے اسے بہت آسان سمجھا تھا جب تک میں اور روحی ملتے رہے میں اس سے قطعی لاعلم رہا کہ اس سے ملنا میرے ضروریات زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ جس طرح کہ دولتمند انسان فاقہ کی تکلیف کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا جس طرح چشمے کے کنارے بسنے والا پیاس کو ایک معمولی خواہش تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی اس وقت اس سے جدائی کے بار کو محسوس نہ کیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی اس وقت کی حالت کو بیان کر سکیں جب یہ خیال آتا ہے کہ بغیر اس سے ملے بغیر اسے بتلائے ہوئے کہ روحی میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں میں چلا آیا۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ زندگی میرے لئے سوہان روح بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا خیال جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کوئی قلبی تعلق نہیں ہے مجھے راتوں کو چین سے نہ سونے دے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا خیال جسے اُس کا وجود سامنے آکر دبا دیا کرتا تھا اس سے دور ہوتے ہی میری زندگی پر چھا جائے گا۔ آگ کی دبی ہوئی چنگاری تیز ہو رہی ہے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ میرے خرمنِ عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ نہیں میری زندگی ہی بھسم ہو کر رہ جائے گی۔

روحی ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ دولت اس کے قدموں میں کھیل رہی ہے۔ سیکڑوں ایسے سامان اس کے گرد و پیش ہیں جو میرے خیال کو اگر وہ اس کے دل کے کسی گوشے میں موجود ہے بہت جلد نکال باہر کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جلد اور بہت جلد مجھے بھلا دے گی۔ یا ممکن ہے بھلا چکی ہو۔ اور شاید یہی بہتر بھی ہے۔ کیونکہ اب ہم دونوں دور ہو چکے ہیں۔ ایک ہی جگہ رہ کر بھی بہت دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شاید اب اس دنیا میں پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ لیکن میرے لئے اسے بھلا دینا ناممکن ہے۔ دل میں رہ رہ کر ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو مجھے مجبور کرتا ہے کہ کسی طرح اس سے مل لوں۔ لیکن غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس در پر پھر جاؤں جس سے اس بری طرح نکال دیا گیا۔ اسی ذہنی کشمکش میں اکثر میری تمام تمام راتیں گذر جاتی ہیں۔ کئی دفعہ راتوں کو ماں میری سسکیوں کی آواز پر چونک پڑی ہیں۔ اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے آنسو صاف کرتے پکڑ لیا ہے۔ لیکن دن کو اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے میں قہقہے لگاتا ہوں ہنستا ہوں ہنساتا ہوں۔ میری فطری ظرافت بالکل مردہ نہیں ہو گئی ہے۔ وہ میری بہت مدد کرتی ہے۔ اس طرح دنیا کے اسٹیج پر اس کے باوجود کہ میرا دل روتا رہتا ہے۔ ایک مسرور آدمی کا پلاٹ ادا کئے جاتا ہوں۔ لیکن یہ قہقہے مجھے بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ اور پھر رات میں مجھے آنسو بہا کر ان کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔

اُس کی آنکھیں آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ گلدان کے پھولوں پر وہ نظریں جمائے تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ ایسے میں دو دوست آگئے۔ اس نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ برج شروع ہوا پھر وہی میرا دوست تھا اور مذاق۔ وہی ہنسنا اور ہنسانا۔ لیکن آج پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اس کے قہقہے بناوٹی ہیں اور اس کا دل رو رہا ہے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز منظر عام پر آئے۔ اسے یقیناً بہت غصہ ہوگا لیکن اس کے اظہار خفگی سے قبل ہی میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔

محمد دلاور خاں مہدوی

سب رس اگست ۱۹۳۸ء

کِسان

انسانوں سے ویران اور فطرت کے مناظر سے آباد بالاگھاٹ کے دامن میں ایک درہ ہے اس میں سے ہوتا ہوا ایک راستہ انسانی آبادیوں کی طرف جاتا ہے جس سے کبھی کبھی صبح یا شام میں دو چار بیل گاڑیاں اور دو چار گھوڑے گذرتے ہیں۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ایک چشمہ بھی ہے جو خورداد اور تیر کے آتشی مہینوں میں پیاسے جانوروں کو سیراب کرتا ہے۔ تین تین میل دور کے جانور پانی کے لئے وہیں جمع ہوتے ہیں اور گھڑی بھر کے لئے ٹھیر کر واپس چلے جاتے ہیں۔ شاید آتشی مہینوں میں یہاں کی بہاریں لوٹتے ہوں۔

چشمہ ایک پرانے آم کے درخت کے نیچے ہے جس کی عمر کوئی نہیں بتلا سکتا اور جس کے آم کسی نے ابھی تک نہیں کھائے بوڑھا درخت ہمیشہ جوانی کی بہاریں بکھیرتا رہتا ہے اس کے ہمسائے نیم کے ان گنت درخت ہیں جو پتھر کو پگھلانے والی گرمیوں میں دلربایانہ اداؤں سے جھومتے رہتے ہیں مغربی سمت میں کچھ دور پر سنکیسر کے بے شمار درخت سرخ چادریں اوڑھے ہوئے بہار کی دلہن معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا اوپر نظر اٹھتی ہے تو "کانٹے سیوری" کا وہ عظیم الشان درخت نظر آتا ہے جو اطراف میں پچاس میل سے زیادہ تک اپنی رفعت کی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ شاید یہ فطرت کی اس چھوٹی سی سلطنت کا علم بردار ہو۔

میرا زیادہ وقت اسی جگہ گذرتا ہے۔ یہاں کا پتہ پتہ میری نظروں میں ہے۔ مجھے یہاں کی وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں ایک چرواہے کا بچہ مرگیا تھا اس کا واقعہ یوں ہے کہ وہ اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے "ناگ پھنی" کی ایک پیڑ کے قریب پہنچا۔ اس کو لوہے کی ایک کڑی پیڑ پر اس طرح پڑی نظر آئی گویا درخت کی جڑ زمین سے باہر نکلی اور پھر اندر مڑ گئی ہے اس نے کڑی اٹھائی جس کے ساتھ ہی لوہے کی زنجیر بھی تھی۔ اس نے زنجیر کھینچی اور کھینچتا گیا، کوئی بیس گز زنجیر کھینچ کر تھک گیا۔ زنجیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زرزراتی ہوئی اپنے مقام پر پہنچ گئی۔ لڑکا وحشت کے مارے زمین پر گر گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔ حسب معمول کڑی اب بھی پیڑ پر نظر آتی ہے لیکن اس کو چھونے کی کسی میں ہمت نہیں۔

اس کوہستانی سلسلے سے کچھ دور جانے کے بعد سیاہ زمین شروع ہوجاتی ہے اور ڈھونڈے سے نہ تو پتھر ملتا ہے اور نہ سایہ کے لئے درخت ان ابلتی گرمیوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیروں تلے ظلمات ہے اور سر پر غصیلا آفتاب ——— آفتابِ حشر، کسان اپنے جھونپڑیوں کی گز گز بھر کی اونچی دیواریں اسی ظلمات کو شرمانے والی مٹی سے بناتے ہیں لیکن بنیاد میں پتھر ڈالنے کے لئے اسی پہاڑی پر آتے ہیں۔

میں اپنی محبوب جگہ چشمے کے کنارے بیٹھا ——— "یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی" ——— گنگنا رہا تھا، دور پہاڑی کی نصف بلندی سے کچھ اوپر ایک بیل گاڑی نظر آئی، دو تین سیاہ اور تقریباً عریاں انسانی شکلیں اس میں پتھر بھر رہی تھیں گاڑی نصف سے زیادہ بھر چکی تھی گاڑی کے بیل اچانک پلٹ گئے۔ ان کا پلٹنا تھا کہ گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی دامن کی طرف چلی۔ آٹھ یا نو قلابازیوں کے بعد وہ ایک خاردار جھاڑی پر جاکر رک گئی۔ میں اس کے رکنے تک دوڑتا ہانپتا نصف سے زیادہ راستہ طے کرکے پہاڑ کی کچھ بلندی پر چڑھ چکا تھا میرے گاڑی کے قریب پہنچنے تک کسان بھی گاڑی کے پاس آگئے۔ وہ زیادہ شکستہ نہیں ہوئی تھی اور ابھی قابل استعمال تھی ہم سب نے اس کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کردیا۔ بیل جو پہلی ہی الٹن میں گاڑی سے الگ ہوگئے تھے لاکر لگادئے اور جنھوں نے اشارہ پاتے ہی گاڑی کو اوپر پہنچا دیا میں نے کسانوں سے پوچھا کہ وہ ان پتھروں کو کہاں لے جارہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ بارش کا پانی نالا بنتا ہوا کھیت میں سے بہتا ہے اور

ہر سال دو سال میں اس کا راستہ بدلنے کے لئے کھیت کے کنارے پتھر ڈال کر اس کی سطح برابر کرنی پڑتی ہے۔ اُف۔ غریب کسان اتنی محنت کے باوجود روٹی کے ایک ٹکڑے اور موٹی کھادی کی گز بھر دھجی کے لئے محتاج۔ اب میں

جس کھیت سے انساں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

جوشش سے پڑھتا ہوا اپنے "رکنا باد" کی طرف واپس ہوا۔

مغرب ہو رہی تھی اور میں وضو کرنے کے لئے قمیص کی آستین چڑھا رہا تھا کہ اڑدھڑ ادھڑ کی آوازیں سنائی دیں یہ تو روز ہی ہوتا تھا اس لئے میں نے کوئی توجہ نہ کی اور وضو کر لیا جب نماز کے لئے تکبیر کہہ رہا تھا تو ایک شخص میرے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ "میاں! میری گاڑی کا کتا ٹوٹ گیا ہے۔ اب میں کیا کروں" میں اس آدمی کو جانتا تھا اس لئے اس سے کہا کہ تم ہمارے کھیت تک جاؤ اور وہاں سے ہماری گاڑی لے آؤ۔ نشانی کے لئے میں نے اپنا ریشمی رومال اس کے حوالے کیا تاکہ میرے ملازمین میرے حکم کی تعمیل میں عجلت کریں میں نماز پڑھ کر اس کی گاڑی کی طرف چلا گیا جب گاڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ کتا بے ترتیب زینہ نما راستہ کی تاب نہ لاکر دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ تاریکی بڑھتی جارہی تھی اور میں تنہائی شدت سے محسوس کر رہا تھا فطرت کے مناظر ظلمت کے پردوں میں چھپے جارہے تھے "رکنا باد" میری نظروں میں ویران نظر آرہا تھا کیونکہ اب یہ مقام انسانوں اور فطرت کے مناظر دونوں سے بھی غیر آباد ہوتا جارہا تھا میری وحشت اس لئے بھی بڑھ رہی تھی کہ یہاں ناگ بھنی میں ایک شیر رہتا ہے اب اس کے پانی پینے کا وقت قریب آرہا تھا۔ مجھے اپنی اتنی زیادہ فکر نہ تھی جتنی غریب کسان کے بیلوں کی کیونکہ شیر آدم خوار نہ تھا اور اسی وجہ سے گاؤں کا بچہ بچہ بھی اس سے واقف تھا اس شیر کا شکار عموماً کتنے اندھے نحیف اور معذور گھوڑے گدھے اور زخمی ہرن تھے۔ کسی نے آج تک یہ نہیں سنا کہ اس نے کوئی طاقتور اور جوان جانور مارا ہو حالانکہ ایسے جانور اس پہاڑی کے دامن میں اور اوپر میدانوں میں چرتے رہتے تھے اس لئے کچھ ڈھارس بھی بندھتی کہ وہ اپنی عادت کے لحاظ سے ہمیں کچھ نہ کرے گا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ اڑدھڑ ادھڑ کی آواز سنائی دی اور چند لمحے بعد میری گاڑی لئے ہوئے چار آدمی آگئے۔ قندیل بھی ساتھ تھی۔ ان چاروں نے کپاس کے ان بوجھوں کو میری گاڑی میں منتقل کیا اور ساتھ لایا ہوا کتا ٹوٹے ہوئے کتے کی جگہ لگا دیا۔ اب ہم دونوں گاڑیاں لئے ہوئے اپنے کھیتوں پر آگئے۔ میں نے کسان سے کہا کہ آج کل کپاس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے پھر وہ فروخت کرنے میں کیوں عجلت کر رہا ہے اس نے کہا مجھے اس "ہفتے" کی تحصیل ادا کرنی ہے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں سوائے کپاس کی فروخت کے کوئی چارہ نہیں میں نے اس کا جواب سنا اور جگر تھامے ہوئے

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری — خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

گنگناتا ہوا گھر آگیا۔

اکبر صدیقی

غزل

نگۂ ناز پڑی دل پہ جو نشتر بن کر!
بہہ گیا خونِ دل آنکھوں سے سمندر بن کر

ہوں میں وہ بلبلِ ناشادِ گلستانِ الم
پھول بھی سر پہ برس پڑتے ہیں اخگر بن کر

شبِ فرقت میں مہِ نو نہ دکھا اپنی ضیا
کاٹتی ہے تری صورت مجھے خنجر بن کر

ہائے ناسازیٔ قسمت کا گلہ کس سے کریں
آپ ہی آپ بگڑتا ہے مقدر بن کر

ناز تھا جس دلِ ناداں پہ تجھ کو منصور
وہی پہلو میں کھٹکنے لگا نشتر بن کر

محمد احمد اللہ خاں منصور حیدرآبادی

فلمی افسانے کی خصوصیات

انسان میں تحقیق و تفتیش کا مادہ جبلی طور پر موجود ہے۔ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کا بڑا شایق ہوتا ہے اس کو آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی بھاتی ہے۔ حالانکہ اُس کی زندگی کا مطالعہ ہی اس کے لئے کافی عبرت آموز ثابت ہو سکتا ہے مگر اس کی طبیعت صرف زندگی کے واقعات و حالات سے سیر نہیں ہوتی۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قصہ اور کہانی کی ابتداء ہوی اور قدیم زمانے میں عرصے تک حکایتوں اور قصوں ہی کے ذریعے ہدایت و تعلیم دی جاتی رہی۔ ابتداء میں محض فرضی داستانوں اور دیو پری کی کہانیوں میں خاص لطف آتا تھا لیکن بتدریج عقل سلیم کی روشنی نمودار ہوتی گئی۔ آخر اب وہ زمانہ بھی آ گیا کہ افسانہ میں تا وقتیکہ زندگی کا اصلی رنگ اور سچے جذبات و خواہشات کا اظہار نہ ہو وہ ایک مہمل و بے اثر داستان معلوم ہوتا ہے۔

ڈرامہ کی اصلی غرض و غایت محض ایک افسانے کو عملی صورت میں پیش کر دینا ہے۔ چونکہ افسانوں سے محض وہی حظ اٹھا سکتے ہیں جو نوشت و خواند سے واقف ہوں ڈرامے سے لطف اندوز ہونے میں علمی کم مائیگی حارج و مانع نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے عوام کو ڈرامے سے زیادہ دلچسپی رہی پہلے پہل اس میں مذہبی رنگ کی چاشنی بھی تھی۔ اِس لئے تمام مہذب ملکوں میں مثلاً یونان، روما اور ہندوستان میں جہاں آریا قومیں آباد تھیں ڈرامہ کا زور ہوا اور موسیقی کے ساتھ یہہ اعلٰے فنونِ لطیفہ میں شمار ہونے لگا۔ اس کو مکمل فن اور علم کی صورت میں پیش کرنے کا فخر صرف ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔ چاہے ہندوستان والے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خود یورپ والے مانتے ہیں۔

فلم دراصل ڈرامے ہی کی ایک متحرک اور ناطق تصویر ہے۔ اس لئے فلمی افسانے میں بھی اِن تمام خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جو ایک عمدہ ڈرامے کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اب سوال یہہ رہتا ہے کہ عمدہ ڈرامہ یا فلمی افسانے کے لئے کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اس کے جواب میں لمبے چوڑے منطق کی ضرورت نہیں، معمولی سے آدمی بھی اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب ہم کہانی یا افسانہ کا خیال کرتے ہیں تو اس میں ایک مخصوص عنصر مضمر ہوتا ہے یعنی "**انسان کی عام اور ہمہ گیر دلچسپی کا تعلق**" پس ڈرامہ ہو یا فلمی افسانہ وہ بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا مقصد یہہ نہیں کہ فرضی و قیاسی باتوں کو اصلیت پر ترجیح دی جائے بلکہ اس کی مدد سے حقیقت کو صحیح لباس پہنا کر اس طرح سامنے کھڑا کر دیں کہ طبیعتیں اچاٹ نہ ہونے پائیں۔ ورنہ افسانے کی مثال ایک ایسی تصویر کی سی ہوگی جو صحیح تو ہے مگر قدرتی رنگ اور روپ سے عاری ہے یعنی ایک بے جان مرقع ہے جس کے مشاہدہ سے ہمارے محسوسات پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور قلوب نیکی و اصلاح قبول کرنے کے بدلے منغض ہو جاتے ہیں اس لئے افسانے میں چند باتیں لازمی طور پر عام اور ہمہ گیر دلچسپی قائم رکھنے کے لئے ایجاد طلب ہوتی ہیں مثلاً افسانے کی ترتیب۔ کردار کا نشو و نما اور تکمیل۔ ان تمام چیزوں کو اس عمدگی کے ساتھ پورا کیا جائے کہ نفسِ افسانے میں کوی نقص نہ آنے پائے۔ تصنع اصلیت و حقیقت کے نیچے دب جائے اور افسانے کے واقعات ایک حد تک عریاں حالت میں نظر آئیں یہہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ افسانے میں محض خیالات کی بلند پروازی دکھلانے کی بجائے اپنی گرد و پیش کی دنیا کا غائر مطالعہ کریں اور افسانے میں انھیں واقعات و کردار کو ترتیب دیں جو چشم دید ہوں۔ اور جن کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا ہو جس میں محض "وہم و خیال" سے کام نہ لیا جائے بلکہ قوتِ مشاہدہ غالب ہو یوں تو یہہ کام نہایت آسان معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہہ اس قدر آسان نہیں جتنا کہ بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص میں فطرت کے سمجھنے کی صلاحیت اور انسانی

جذبات و خیالات کا صحیح احساس نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی قابلیت اور دماغ و ذہن کو خاص طور پر ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلے تو ہندوستانی فلم اس وقت تک شیطان، بھوت، دیو، پری کے خلاف قیاس داستانوں پر مشتمل تھی اور اگر چند فلم سوشیل ہیں بھی تو افسانے کے مخصوص کردار اس دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ فرشتہ یا اس سے مختلف کوئی نوع ہیں یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ انسان عناصر اربعہ ہونے کی حیثیت سے اس میں معائب و محاسن ہونا لازم و ملزوم ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو کمال حاصل نہیں۔ معمولی طبائع کا تو ذکر ہی کیا مضبوط سے مضبوط کیرکٹر کے انسانوں کا قدم بھی بعض موقعوں پر ڈگمگا جاتا ہے مگر ہمارے فلموں میں بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی کو ہمیشہ عصمت و عفت کی دیوی اور ہیرو کو عاشق صادق نہایت دلیر اور سورما ظاہر کیا جاتا ہے فلمی افسانوں کے اکثر کردار انتہائی نازک موقعوں پر جب کہ طبائع انسانی کا انقلاب یقینی و لابدی ہے۔ وہ ثابت قدم نظر آتے ہیں جو فطرت بشری کے سراسر خلاف ہے۔ اس قسم کی فرضی و خیالی تصویریں نہایت معیوب و مہلک ہوتی ہیں کیونکہ اس سے ہم دھوکا اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فطرت انسانی کی اصلیت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ اور ایک باطل خیال دل و دماغ پر قائم ہو جاتا ہے جس کا اثر حقیقی طور پر ہمارے قول و فعل پر پڑ کر ہم کو راہ راست سے بھٹکا دیتا ہے۔

بعض حضرات افسانے کے واقعات کو فطرت کے مطابق پیش کر دینا مخرب اخلاق تصور کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے افسانے پسند کرتے ہیں جس میں برائی کی مذمت اور نیکی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر مبالغہ کے انتہائی درجے تک پہونچ گئے ہوں جس سے ناظرین کے دلوں پر اندر ہی اندر اس غلط وعظ و پند کا الٹا اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے خراب پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور صرف اس کی اچھی باتیں ظاہر کی جائیں جو یقیناً بعید از انصاف و خلاف فطرت ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانے کی اصلی غرض اصلاح ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے بعض مخصوص کرداروں کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی کمزوریوں سے کہیں زیادہ بھلائیوں کا اظہار کیا جائے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام کمزور پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف خوبیاں ہی ظاہر کی جائیں جس کی وجہ سے وہ اوصاف و اطوار بشریت سے بعید ہو جائیں۔ گو اکثر نقاد انگریزی فلموں اور افسانوں کو فطرت کے بالکل مطابق سمجھتے ہیں اور ان کی تعریف میں اخبارات و رسائل کے کالم سیاہ کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یورپ میں ایسے ڈراموں اور ناولوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جس میں مادی زندگی اور خوش آئند باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک نہیں ہو سکتے۔ البتہ اتنی خوبی ضرور ہوتی ہے کہ اس میں بظاہر کوئی بات خلاف فطرت نظر نہیں آتی وہ جھوٹ پر سچ کو اس طرح لپیٹتے ہیں جس طرح قرص کونین پر مٹھاس ہوتی ہے لیکن حلق سے نیچے اترتے ہی خون میں کڑواہٹ اثر کرنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں ریاکاری تہذیب کا شعار بن گئی ہے۔

بہر حال میں اس امر پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ وہی افسانہ کامیاب اور حقیقی معنی میں اصلاح کا حامی ہو سکتا ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے خواہ وہ واقعات شیریں ہوں یا تلخ البتہ ان کو زیب و زینت دے کر خوشنما اور پسندیدہ بنانا ضروری ہے مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسی میں سب سے بڑی پند و نصیحت ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ بلحاظ مذاق افسانوں کے طرز ادا میں تبدیلی ہو مگر ان کی فضیلت کا معیار اسی پر منحصر ہے کہ افسانے کے کردار فطرت و قدرت کے مطابق ہوں تاکہ عوام الناس اپنی اصلی صورت اس آئینہ میں دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے آصفیہ ڈرامیٹک اسوسیئیشن حیدرآباد میں ...... "Cinema is the mirror of the nation" (سینما قوم کے لئے آئینہ ہے) کے عنوان سے تقریر کی تھی جس کا ماحصل یہی تھا۔

"جس طرح آئینہ دیکھنے سے چہرے کی خوبی اور برائی بلاکم وکاست ہمارے سامنے آجاتی ہے اسی طرح فلم اور ڈرامے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ قوم کے معائب ومحاسن کی سچی ترجمانی کرے" سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے کہ افسانے کی ترتیب اور کردار کا نشو ونما وتکمیل ہی ایک ایک فلم کی کامیابی کے لیے نہایت لازمی چیز ہے اور اسی سے افسانہ نگاری کے کمال فن کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں اکثر کردار محض واقعات سے چسپاں کردئے جاتے ہیں اور ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے جس کی وجہ وہ بے اثر اور اکثر خطرناک ہوجاتے ہیں۔

جس طرح مصور ایک مرقع کھینچتا ہے تو پہلے گرد وپیش کے مناظر موقع ومحل کے لحاظ سے اتارتا ہے پھر اپنی تصویروں کو ان کے حسب حال ترتیب دے کر باہمی نسبت وتعلق اور ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یعنی دور کی چیزوں کو نزدیک کی چیزوں سے چھوٹی اور نزدیک کی چیزوں کو نمایاں کرکے تناسب اعضا میں فرق نہیں آنے دیتا بعینہ یہی حال افسانہ کی ترتیب وکردار کے نشو ونما کا ہے لیکن اس کے برعکس ہندوستانی فلموں کے کردار بالکل لغو طریقہ سے نمایاں کئے جاتے ہیں جس سے کسی قسم کا مفید نتیجہ مترتب نہیں ہوسکتا۔ اسی سلسلے میں مکالمہ کے متعلق بھی بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ مکالمہ ہی افسانہ اور ڈرامہ کی روح ہے۔ مکالمہ تحریر کرتے وقت موزوں الفاظ کا انتخاب ان کی مناسب نشست و ترتیب محاورات، استعارات وتشبیہات کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے اور یہہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کی ذراسی بھول چوک سے افسانے کے تمام اثرات زائل اور مطالب فوت ہوجاتے ہیں۔ مکالمہ نگار کو کردار کی فطرت کا نہایت دقیق مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کردار کے خیالات وجذبات کے اظہار میں کس قسم کے لہجے کس طرح کی عبارت استعمال کرے کہاں اختصار اور کہاں تفصیل سے کام لے زبان کیسی ہو خیالات کس طرح ادا کئے جائیں اور یہہ ایک نہایت ہی مشکل ودشوار امر ہے جس پر ہر کوئی قادر نہیں اس کے لئے بڑی زباں دانی اور خداداد قابلیت کی ضرورت ہے مکالمہ میں زیادہ تفصیل غیر ضروری ہوتی ہے کیونکہ زیادہ تر خیالات کا اظہار لب ولہجہ حرکات وسکنات کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ مکالمہ لکھتے وقت مکالمہ نویس کا فرض ہے کہ وہ کردار کی ہستی میں گم ہوجائے ورنہ ڈرامے کی روح غائب ہوجائے گی اور مکالمہ بے اثر ومضحکہ انگیز ہوجائے گا۔ مکالمہ کی غرض وغایت محض جملوں کو ترتیب دے کر مطلب ادا کردینا نہیں بلکہ اس میں ایک قوت، جوش اور ولولہ ہو جو اداکاری کے بعد دلوں پر نشتر کا کام کرے اور روح کو بیدار کردے۔ اور اس کا ہر لفظ ایک ایسا ترانہ ہو جس کے مسرت انگیز اور دردبھرے راگ سے اہل مجلس تڑپ اٹھیں۔

فلمی افسانے میں ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ ڈرامے اور فلمی افسانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح قصہ اور کہانی میں واقعات از اول تا آخر تمام باتوں کو راز میں رکھے بغیر بیان کردے جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈرامے میں تمام واقعات نمایاں کردئے جاتے ہیں۔ لیکن فلمی افسانے میں یہہ بات نہیں بلکہ اس کی ترتیب ناول کے طرز پر ہوتی ہے جس میں بعض باتوں کو راز میں رکھا جاتا ہے جس کا افشا خاتمہ پر ہوتا ہے اس قسم کی ترتیب نہایت مشکل ہے کیونکہ اس کے ذریعے افسانے کے تاثرات کو قوی بنادیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ عدم واقفیت کی بنا پر ہمارے فلمی افسانوں میں یہہ ترتیب بالکل ادھوری اور بے جوڑ ہوتی ہے جس سے کردار کی ساری خوبیاں دب جاتی ہیں اور فلم کا مقصد اصلی مفقود ہوجاتا ہے۔

اگر ہندوستانی فلموں کو میرے پیش کردہ معیار پر جانچا جائے تو شاید ہی کوئی ہندوستانی فلم حقیقی معنی میں فلم کہلانے کے قابل ہوگا۔ اس کا مطلب یہہ نہیں کہ ہندوستان میں قابل افسانہ نگاروں کی کمی ہے بلکہ فلم سازوں کی بدذوقی کی وجہ سے بہترین افسانہ نگار اس وقت تک اس طرف متوجہ نہیں ہوے اگر ہمارے فلم ساز خواب غفلت سے چونک کر ہندوستانی ادیبوں کی قدردانی اور عزت افزائی کا عملی طور پر ثبوت دیں تو کوئی وجہہ نہیں کہ ہندوستانی فلم بھی حقیقت میں فلم کہلانے کے مستحق نہ ہو جائیں ۔

محمد حسام الدین خاں غوری (سکندرآباد)

تجدیدِ شوق

یہہ بے قرار نظریں　　یہہ شرمسار نظریں
تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

روحِ خموش ہمدم بیدار ہو رہی ہے　　پھر دل کی آج دھڑکن غمخوار ہو رہی ہے
تاروں نے پھر الٹ دی رخ سے نقابِ رنگیں　　پھر گدگدا رہی ہے ان کو فضائے سیمیں!
کرنوں کا آسماں پھر جھولا بنا رہا ہے　　پینگوں سے پھر صبا کے ان کو جھلا رہا ہے
ایسے میں یاد میری ان کو ستا رہی تھی　　ہاں چھیڑ چھاڑ پچھلی یا یاد آ رہی تھی
ٹھکرا کے بندشوں کو بے تاب ہو کے آئیں　　آنکھیں ہیں سرخ کیوں یہہ شاید ہیں رو کے آئیں

تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

یہہ کہہ رہی ہیں مجھ سے اے کشتۂ محبت　　بیگانۂ حقیقت دیوانۂ محبت !!
دنیا فریب ناداں چل دور اس جہاں سے　　بے درد کی زمیں سے ظالم کے آسماں سے
نورِ شفق کے اندر دنیا نئی بسائیں　　قوسِ قزح سے آگے اپنا جہاں بنائیں
اِس دلنشیں جہاں میں اک باغ پھر سجائیں　　کرنوں کی ڈالیوں میں شبنم کے گل کھلائیں
اِس باغ میں ہمیشہ موجِ بہار آئے　　انساں کی قوتوں سے قدرت بھی جھینپ جائے
بے دردیاں جہاں کی واں ہم عناں نہ ہوں گی　　الفت کی داستانیں رسوا وہاں نہ ہوں گی

تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں
یہہ بے قرار نظریں　　یہہ شرمسار نظریں

نظر (حیدرآبادی)

شیطان کی آنت پر ایک نظر

"توقع" کے مطابق لیکن "توقع" کے خلاف ہمیں یہ مضمون وصول ہوا۔ توقع کے مطابق اس لئے کہ ہم "شیطان کی آنت" کے جواب کو ضروری تصور کرتے تھے اور توقع کے خلاف اِس لئے کہ اس میں سنجیدگی سے ہٹ کر وقتی جذبات کا اظہار کیا گیا۔ مذہب کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ موجودہ سماج کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شیطان کی آنت کا باعث مرد بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح ایک عورت ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں؟ "شیطان کی آنت" کے مصنف یا ان پر تبصرہ کرنے والے خواہ کچھ ہی کہیں لیکن ہم تو جاہل عورتوں اور مردوں کی ہرزہ سرائی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ـــــ اس لئے کہ وہ احمق بہت بڑا احمق ہے جو اپنی حماقتوں کو خاموشی میں دفن کر دیتا ہے۔ علم و حکمت کی عدم موجودگی میں جاہلوں کی یہ ہرزہ سرائی ہی بہت غنیمت ہے ـــــ ان کو علم و حکمت کے نکتے سکھائیے پھر ہمیں امید ہے کہ نہ "شیطان کی آنت" لکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت۔ (ادارہ)

رسالہ سب رس ۱۹۳۸ء جولائی میں ایک مضمون مسمیٰ بہ شیطان کی آنت میری نظر سے گذرا جو ہمارے ایک مسلم بھائی کا تصنیف کردہ ہے۔ ہمارے معزز بھائی نے اس مضمون میں جو انشاء نگاری کی ہے اور نسوانی کمزوریوں کا خاکہ کھینچا ہے اگر اس پر نظر غائر روشنی ڈالی جائے تو نہیں معلوم کہ ان اعتراضات کی ذمہ داری کن ہستیوں پر عاید ہوگی۔ قبل اس کے کہ کوئی اشتہار جاری کیا جائے یا ایسے مضامین طبع کئے جائیں کہ جس کے مطالعہ سے ناظرین کو نوٹس لینے کا موقع ملے۔ مضمون نگار صاحب کو چاہئے کہ اس کے نتیجہ پر غور کرے ورنہ (تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد) کا ہی مصداق بن جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ عورت بالطبع کمزور پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصد نہیں کہ وہ تمام عمر لاغر و لاعقل ہی رہے گی۔ دنیا کی ہر چیز کو صیقل کی ضرورت ہے۔ اگر بیش بہا جواہر کو بھی عمدہ تراش و خراش سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا جائے تو اس کی ظاہری حالت ایک معمولی پتھر سے سوا نہ ہوگی۔
اسی طرح انسان کا دماغ بھی صیقل گری کا محتاج ہے کیا عورت اور کیا مرد اگر کسی مرد کی پرورش بھی کسی تہہ خانہ میں یا مکان کی چار دیواری میں مقید رکھ کے کی جائے تو بلا مبالغہ وہ ایک گنوار اور جاہل عورت سے بھی بدتر نکلے گا ایام سلف میں حقوق نسوانی جس بری طرح پامال کئے جاتے تھے وہ کم محتاج بیان نہیں ہے۔ غریب عورتیں مردوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح محبوس و مقید رہتی تھیں جیسے کوئی بے بال و پر شکستہ پرندہ ظالم صیاد کے دام میں ہو۔
ان بے زبانوں کا کوئی حامی تھا نہ ہمدرد۔ زمانۂ جاہلیت کی رسم دختر کشی نے تو اس صنف نازک کا قلع قمع ہی کر رکھا تھا ان کی تعلیم و تربیت تو درکنار بیچاریاں اس بری طرح زندہ درگور کر دی جاتی تھیں کہ خدا کی پناہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک آیا تو ان مظلوموں کو جفا کار مردوں کے مظالم اور بیدردانہ موت سے نجات ملی اور اسی مسعود و مامون زمانے سے ان کی تعلیم و تربیت کا دور دورہ شروع ہوا اس ہادی برحق نے مظلوم کی دادرسی گمراہیوں کی رہبری کی اگر اور چندے آپ کا وجود مسعود اس ہستئ ناپائیدار میں ظہور پذیر نہ ہوتا تو شاید صفحہ دنیا پر ایک عورت کا بھی نام نظر نہ آتا۔
اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جہنم کے سات طبقے ان ظالم اور سیاہ کار مردوں سے بھرے جاتے جو فرقہ نسواں کی عدم موجودگی سے مرتکب جرائم نازیبا ہو کر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرتے۔ من بعد رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا گویا اس طرح سے دنیا کب کی معدوم ہو چکی ہوتی اور خدائی کا منشا بھی ادھورا رہ جاتا۔ لیکن خدائے عزوجل کو اپنی خدائی کا تماشا دکھانا منظور تھا۔ ان ظالموں کو ابدی مصیبت سے بچانے کے لئے رسول مقبول صلعم کو اپنا نبی برحق اور خلق کی شمع ہدایت بنا کر بھیجا۔ اس پر بھی متعدد گھرانے ایسے تھے جہاں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت

باعثِ ننگ و عار خیال کی جاتی تھی مجبور و محکوم عورتیں ستمگار مردوں کی نفسانیت کا تختۂ مشق سمجھی جاتی تھیں اور ان سے مویشیوں کی طرح بار برداری کا کام لیا جاتا تھا ایک زمانۂ دراز تک یہہ طبقہ یوں ہی نا روا مظالم اور نا زیبا جور و ستم کا شکار بنا رہا آخر ان بیکسوں کی فریاد کب تک خالی جاتی۔ اور ستم زدوں کی آہ کیونکر رنگ نہ لاتی خاک دہلی نے چند ایسے افراد پیش کئے جو اس محروم طبقے کے سچے حامی اور حقیقی جاں نثار نکلے جن کے اکثر نام مجھے یاد نہیں۔ جیسے راشد الخیری، نذیر احمد وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات کی سعی بلیغ نے فرقہ نسوان کا ڈوبتا ہوا بیڑا سنبھالا اور ان کی تعلیم و تربیت کا بارگراں اپنے دوش پر اٹھایا۔ ہر گھڑی ہر لحظہ تعلیم نسوان کا راگ گایا جن کی پُردرد صداؤں نے خوابِ غفلت میں سوئے والے مردوں کے جذبات خوابیدہ کو جگایا انجام کار حق بہ حق دار رسید کا مقولہ صادق آیا۔ مگر افسوس یہہ دور اس وقت آیا جب کہ دنیا درجۂ ختم تک پہونچ رہی ہے۔ (مجلس تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر۔ ماہم چنان در اول وصف تو ماندہ ایم) کے بہ مصداق آخری زمانے میں عورتوں نے ترقی کی باوجود اس قلیل مدت کے ان ہستیوں نے جو کارنمایاں کئے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ آج دنیا کا کوئی مرد یہہ نہیں بتا سکتا کہ عورتیں کج فہم۔ بے عقل۔ نالائق محض ہیں۔ ہماری رائے میں تو فی زمانہ مرد و عورت میں کوئی تخصیص باقی نہیں اگر کوئی مرد گرانجوٹ ہے تو عورت بھی اس کے قدم بہ قدم ہے اگر کوئی بڑی خدمت پر ممتاز ہے تو عورتیں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ شاعری۔ مضمون نگاری۔ تقاریر۔ وعظ پند۔ اشاعت اسلام۔ القصہ یہہ تمام خوبیاں مردہی کے حصے میں نہیں آئیں بلکہ عورتوں میں بھی اس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے غرض وہ کون سی خوبی ہے جو مرد کے لئے مخصوص اور عورت کے لئے محروم ہو۔ لہذا ہمارے اسلامی بھائی نے جو طبقۂ اناث کی کمزوری۔ جہالت اور بے مغزی کا اظہار اپنے مضمون میں فرمایا ہے کیا وہ یہہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مرد ان اوصاف سے متصف نہیں ہے۔ کیا مردوں کی مجلس میں اس قسم کی ہرزہ سرائی نہیں ہوا کرتی۔ ہوتی اور ضرور ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہاں تک کہ دفتر خلوت کا ہر ہر ورق احباب کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے یہہ ہماری انسانیت و شرافت سے بعید ہے کہ لغو اذکار کو قلمبند کریں لیکن میں پھر بھی یہہ کہوں گی کہ نہ دنیا کے تمام مرد ایسے ذلیل اور نہ تمام عورتیں۔

نہ ہر زن زنست و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ہر طبقے میں ضرور اچھے اور چند برے ہیں۔ الغرض مردوں کو چاہئے کہ اپنی مستورات کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخاست کا موقع دیں تاکہ وہ آداب مجلس سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سوسائٹی سے مطلب پردہ کی مخالفت نہیں ہے کیونکہ میں پردہ کی زبردست حامی ہوں۔ یہہ خیال سراسر غلط ہے کہ خواتین محفلوں میں بے سروپا گفتگو کرتی ہیں۔ ہاں جب ان کے معلومات ہی محدود ہوں اور گفتگو کا کوئی موضوع نہ ملے تو آخر ان کی قوتِ ناطقہ کس کام میں صرف ہوگی۔ اس لحاظ سے اس بے معنی قیل و قال کا الزام ان کے سرپرست مردوں ہی کے سر رہے گا۔ مرد سے ہمارا مقصد صرف شوہر نہیں ہے بلکہ۔ باپ۔ بھائی۔ بیٹا غرض کنبہ کے تمام مرد ہیں۔ علیٰ ہذا شارع اسلام کا بھی یہی فرمان واجب الاذعان ہے۔

لطف النساء بیگم آثمہ
بنت شمس العلماء شاطر مدراسی

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا گروپ



نشستہ سیدھے جانب سے :- (۱) مرزا محمد بیگ صاحب اول تعلقدار (۲) محمد مرتضی صاحب مرحوم سکریٹری کانفرنس (۳) محمد فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ (۴) سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر (۵) مسز سروجنی نائیڈو (۶) رائے بالمکند صاحب آنجہانی دکن ہائیکورٹ۔

استادہ دوسری صف میں :- (۱) حافظ محمد مظہر صاحب سکریٹری کانفرنس (۲) ایچ ایم سلطان صاحب مرحوم (۳) محمد برہان الدین صاحب منتظم دفتر کانفرنس (۴) غلام محمد صاحب مرحوم وکیل (۵) محمد مسیح الدین مرحوم وکیل (۶) محمد شمس الدین صاحب منصف وظیفہ یاب (۷) محمد غوث صاحب ایم اے ال ال بی۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کے لئے

ادارۂ ادبیات اُردو کے ماہ نامہ "سب رس" کا ضمیمہ

فہرست

تصاویر

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

پہلا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! یہ بہت نازک اور پُر خطر وقت ہے۔ یورپ میں ایک خونخوار اور خوں ریز جنگ ہو رہی ہے جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا بے وجہ و بے گناہ قتل کئے جا رہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیتِ رعایا کے اپنے فرض کو بکمال خوبی انجام دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت حضور انور خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی پُر خلوص دوستی کا حق ادا کر دیا جو انھیں اپنے آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے گا اور جبر و استبداد کو پائمال کرے گا۔ اس لئے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بے چینی اور پورا اطمینان حاصل ہے اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم آج اس نیک کام کو شروع کرنے والے ہیں اور اس تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں اور ہم سب کو اعلیٰ حضرت حضور پر نور خلد اللہ ملکہٗ کا تہ دل سے شکر گزار ہونا چاہئے کہ از راہِ مراحم خسروانہ اس مجلس کے انعقاد کی منظوری عطا فرمائی ....

....

حضرات! میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اس تعلیمی مجلس کے قیام سے ملک پر ایسا بڑا احسان کیا ہے کہ جس کا شکریہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ نسلیں بھی ادا کریں گی۔ میری رائے میں اگر اس ملک کے لئے سب سے بہتر اور سب سے مفید اور سب سے اعلیٰ کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ ایک ایسی ہی تعلیمی مجلس ہے اگرچہ یہ کام بہت پہلے شروع ہونا چاہئے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بہت دیر کی ہے لیکن ہم تاخیر کی تلافی ہم اپنی مستعدی جفاکشی اور محنت سے کر سکتے ہیں اور اگر یہ کام اسی جوش اور مستعدی کے ساتھ جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے نتائج کیسے عمدہ اور اس کے اثرات کیسے بے بہا پیدا ہوں گے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس مجلس کی صدارت کے لئے کسی صاحبِ علم و فضل کا انتخاب کیا جاتا جو اس خدمت کو مجھ سے بہتر اور زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دیتا۔ مجھے علم و فضل کا ہرگز دعویٰ نہیں ہے اور یہ میں بغیر کسی انکسار اور تصنع کے کہتا ہوں لیکن میں علم کا خدمت گزار ضرور ہوں۔ اور اس ناچیز خدمت گزاری پر مجھے فخر ہے میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منور ہو جائے۔ مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا۔ تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ اور میں نے اپنی بساط کے موافق ہمیشہ اس میں حصہ لیا اور جب سے میں اس ریاست میں ہوں مجھے سب سے زیادہ خیال تعلیم کا رہا۔ اور جب تک میں رہوں گا۔ میں ہمیشہ اس کی ترقی کو مدِّ نظر رکھوں گا اس لیے جو عزت کہ آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اول کی صدارت کی بخشی ہے اس کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا ....

....

حضرات! علاوہ ان اعلیٰ خوبیوں اور نیکیوں کے جو ہمیشہ عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی ہر زمانہ میں بہ لحاظ ضروریات وقت اور اقتضائے زمانہ بہت سی دوسری ایسی چیزیں اور بہت سے دوسرے ایسے کام ہیں جن کی قدر و منزلت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا درجہ نیکی اور ثواب تک پہونچ جاتا ہے۔ اگر اس زمانے کے حالات اور ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو اشاعتِ تعلیم اور

علم پھیلانا درحقیقت نیکی اور ثواب کا کام ہے اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ جہاد کا کام ہے۔ کیا جہالت اور ظلمت سے جنگ کرنا، تاریکی کو رفع کرنا اور علم کی روشنی پھیلانا جہاد نہیں ہے۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت پست ہے جہاں علم مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور جہاں ابھی لوگوں کو علم کی پوری قدر نہیں ہے ....

لیکن! حضرات، جہالت کی جڑ اس وقت تک نہیں کٹ سکتی جب تک علم کی اشاعت ہماری عورتوں اور لڑکیوں میں نہ ہو وہ ملک اور قوم کبھی تعلیم یافتہ اور شائستہ نہیں ہو سکتی۔ جس کے مرد تو علم حاصل کریں اور عورتیں علم سے بے بہرہ رہیں۔ گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک جسم ایسا ہے جو نصف تو صحیح سالم ہے اور نصف مفلوج؟ بچوں پر ماں باپ دونوں کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ماں کا اثر باپ سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں تو کیا اس کے ساتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاہل اور بے علم ماں کا اثر بچے پر اچھا پڑے گا؟ اگر وہ گودیں جن میں ہماری اولادیں پرورش پاتی ہیں جہاں وہ اخلاق و مذہب کا پہلا سبق سیکھتی ہیں جہاں اول اول ان کا کیرکٹر بنتا ہے۔ علم سے خالی ہیں تو پھر ہم کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ جب ہماری اولادیں اُن گودوں میں سے پرورش پاکر بڑھیں گی تو وہ حقیقی علم اخلاق سے آراستہ ہوں گی؟ ....

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں کتب خانوں نے ہمیشہ بڑا کام کیا ہے اور بڑے بڑے لوگ پیدا کئے ہیں۔ ہندوستان کتب خانوں کے لئے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں کتابوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور بعض بزرگوں اور خاندانوں کا ذخیرہ تو نہایت بیش بہا اور قابل رشک تھا اور اس زمانے میں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کتابوں کی آج کل اِس قدر کثرت ہوتی جاتی ہے کہ ان کا جمع کرنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ایک شخص اپنے مذاق کی کتابیں جمع کر سکتا ہے لیکن ہر فن و علم کی کتب کا جمع کرنا شخصی قدرت سے باہر اور اس لئے ضرور ہے کہ سرکار کی طرف سے یا باہمی کوشش سے جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے جائیں تاکہ طالب علم اطمینان خاطر سے اپنی فرصت کے وقت میں کتب کا مطالعہ کر سکیں۔ اور جنھیں خدا نے علمی ذوق اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ وہ جدید تحقیقات کا ڈول ڈالیں۔ اور اپنے ملک کے علم میں اضافہ کریں۔ اور جو لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہیں۔ انھیں بھی موقع ملے گا۔ اور ترغیب ہوگی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہوتے کے بعد مطالعہ کتب سے سچی خوشی اور فیض حاصل کریں۔ ایک اچھا کتب خانہ ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے اشاعت علم میں کتب خانہ مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں بہت سے لوگ جنھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی کتب خانوں کی بدولت بڑے آدمی بن گئے ہیں اور انھوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں کی ہیں۔

....

اگر ہم صاحب جاہ و مال اور صاحب حکومت کی عزت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر ہمیں صاحب علم کی بھی عزت کرنی چاہئے۔ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور علم کی اشاعت کرتے ہیں وہ ہماری عزت کے بدرجہا مستحق ہیں بہ نسبت

ان لوگوں کے جو مال و دولت کے جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک مدرس خواہ وہ کتنی ہی کم تنخواہ کا کیوں نہ ہو قابل وقعت ہے اس لئے کہ وہ ملک کی بڑی خدمت کررہا ہے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کا محسن ہے۔ ہمارا ملک استاد کی عزت کرنے میں ضرب المثل ہے اور ہمارے ہاں استاد کی عزت باپ سے زیادہ کی جاتی تھی۔ اور بلا شبہ وہ اس کا مستحق ہے دوسرے کم استطاعت اور ہونہار طلبہ کی مدد کرنا ہمارا بڑا فرض ہے۔ ان ہی کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں اور کیا معلوم کہ ان ہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کے لئے باعث فخر ہوں۔ ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے ملک کی مدد کرنا ہے ......

جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لئے بھی کریں۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں ہماری ساری حالتیں اور ساری امیدیں اپنے ملک سے وابستہ ہیں ملک کی فلاح میں ہماری فلاح اور ملک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے اس لئے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہئے اگر ہم میں اپنے ملک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ان خوفناک آفتوں سے بچنے کے لئے جو جہالت سے پیدا ہوتی ہے خلوص و ایثار جوش و صداقت سے کام لیں۔ جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں۔ ایثار و خلوص وہ خوبیاں ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہوگئیں۔ انھیں کوئی قوت ترقی سے نہیں روک سکتی ....

حضرات! وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور۔ اس لئے آؤ اب یک زبان و یک دل ہوکر اس مقدس کام کو شروع کریں۔ جس پر ہمارے ملک کی ترقی و اصلاح کا دارومدار ہے اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے ارادوں اور ہمتوں میں برکت دے اور ہم سب کو نیک توفیق عطا کرے۔ اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پرنور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی صحت و اقبال و عمر میں ترقی عطا فرمائے کیونکہ ان کی کامیابی میں ہماری کامیابی اور اُن کی عظمت و اقبال میں ہماری عزت و مسرت ہے۔ آمین

سر اکبر حیدری

نظم (عثمانیہ یونیورسٹی)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس ۱۳۳۶ف میں ایک کمسن لڑکے سید آصف الدین احمد طالب علم مدرسہ وسطانیہ نلگنڈہ نے عثمانیہ یونیورسٹی پر ایک نظم سناکر حاضرین کو محظوظ کیا چونکہ یہ جامعہ عثمانیہ پر پہلی نظم ہے اس لئے اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:۔

میر عثمان علی خاں رحم دل ہیں بادشاہ!
اس کے عہد معدلت میں خوش ہیں سب شام و پگاہ

حیدرآباد اور یونیورسٹی کا ہو قیام!
خوب سمجھیں آپ معمولی نہ تھا یہ کوئی کام

یہ نہ ہوتا۔ علم دوست ہوتا نہ اپنا بادشاہ
جانا پڑتا امتحاں دینے ہمیں میلوں کی راہ

اور کیا کیا اس سے آسانی ہوی کچھ ہے خبر
ہوں گے اُردو کی زباں میں جتنے ہیں علم و ہنر

پھر تو کیا آسان ہوگا ہم کو دنیا امتحاں
کیوں کہ ہر اک فن میں ہوگی مادری اپنی زباں

ملک کو مرہون منت ان کا رہنا چاہیے!
ان کو اپنا ناخدائے علم کہنا چاہئے!!

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

تیسرا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! اگر میں سنتِ بزرگانِ قوم کی تقلید کروں تو میرا فرض ہوگا کہ میں حامیانِ کانفرنس کے آگے اپنی نااہلی اور بے بضاعتی کا اظہار کرکے معذرت کروں اور ان کی نوازش کا شکریہ دل و جان سے ادا کروں کہ ان کی حسن عقیدت نے مجھ کو آج کے روز کرسئی صدارت سے معزز کیا مگر حضرات! آپ تعجب نہ فرمائیں کہ بعوض معذرت و تشکر کے میں خود اس وقت حامیان کانفرنس سے معذرت کا طلبگار ہوں کہ ان حضرات نے کیوں اور کس ضرورت سے ایسے ایک ضعیف مریض بے بصارت اور بے بصیرت شخص کا انتخاب آج کی صدارت کے واسطے کیا جو نہ فقط سرکاری خدمات سے تقریباً نصف صدی کی محنت و مشقت کے بعد وظیفہ پا چکا ہے بلکہ تمام دوسری دنیاوی گفت و شنید و تفکرات سے بلا وظیفہ بطور خود دست کش ہو چکا ہے ....

میری غرض و غایت اس مختصر تقریر سے یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم غلط اصول پر مبنی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود جہاں تک ممکن ہو ان اصول کی اصلاح کردیں اور حکومت کی نظر کو بھی تا بہ حدِ امکان اس طرف منعطف کریں اس کا طریقہ میرے نزدیک یہ ہوگا کہ اسکولوں میں تمام فنون مثل حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ انگریزی جو ایک اجنبی اور مشکل زبان ہے بطور ایک زبان کے تعلیم دی جائے اور اس کی تکمیل کی طرف بہت زیادہ توجہ کی جائے۔ محض طوطوں کی طرح ریڈروں کے رٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زبان سکھانے کے جدید طریقے اختیار کئے جائیں اور اس کے لئے روزانہ معقول اوقات اور خاص مدرس مقرر کئے جائیں مجھے یقین کامل ہے کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اسکولوں کی تعلیم کی تکمیل میں اس قدر وقت ضائع نہ ہوگا جس قدر اب ضائع ہوتا ہے اور طلبہ کی انگریزی دانی کے معیار میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ ذخیرۂ لغات انگریزی۔ صحت تلفظ وغیرہ میں بہت کچھ اضافہ ہو جائے گا اس کے علاوہ میری رائے ناقص میں اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو لڑکوں کو موجودہ حالت سے کم تر مدت میں اسکول کی تعلیم سے فراغت ہو جائے گی۔ کالجوں کی تعلیم میں بہت سے چھوٹے بڑے نقائص اب بھی باقی ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً رفتہ رفتہ ہو جائے گی۔ مگر مجھے دوؔ امور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا اس وقت بہت ضرور ہے۔

• امر اول یہ ہے کہ گویا کالجوں میں بوساطت زبان انگریزی علوم و فنون کی تعلیم بعض اعتبار سے مفید ہے مگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنے اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی۔ اور عام طور پر ہمارے ہم قوم، ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے۔ بلاد یورپ و امریکہ میں یہاں تک کہ مصر میں بھی جو ایک اسلامی ملک ہے علوم کی تحصیل میں کسی اجنبی زبان کی وساطت کی حاجت نہیں ہوتی۔ مصر میں بہت سی علمی کتابوں کا فرنچ اور انگلش زبانوں سے عربی میں

ترجمہ ہوگیا ہے اور ہوتا جاتا ہے ایک ہم ہند کے مسلمان ہی اس نعمت سے محروم ہیں۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنے جامع علیہ عثمانیہ کو جس میں خاص اُردو زبان واسطہ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے بحسب امید کامیابی ہوی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔ اور کامیابی کیوں نہ ہوگی جب کہ اس کی سرپرستی خود ہمارے شاہ جم جاہ نے منظور فرمائی ہے اور اس کو اپنے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے

دوسرا امر جس کی طرف کارپردازانِ جامع علیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامع کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں اور ہندو طلبہ کے واسطے سنسکرت کے درس تدریس کا بندوبست کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ چار پنج سالہ مدت تعلیم میں زبان انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی تکمیل ہو جائے اگر اساتذہ لائق ہوں اور طریقۂ تعلیم و نصاب کتب درست اختیار کیا جاوے تو مجھے یقین کلی ہے کہ ہمارا منشاء پورا ہو جائے گا۔ اور اگر فقط اُردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے۔ اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو امید اور انکی قوم کو ضرورت ہے ....

حضرات! میں اپنی لاطائل تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا آپ کی کانفرنس کے مقاصد بہت وسیع اور نہایت مفید ہیں خدا کرے کہ آپ ان مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں اور تمام ملک میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہو جائے۔ اور اہل ملک خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی حالت کی اصلاح کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جائیں سچ تو یہ ہے کہ اگر اس عہدِ معدلت مہد میں جب کہ ہم پر ایسے ظل اللہ کا سایہ پڑ رہا ہے جو ہمہ تن اور ہر وقت اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی فکر میں مصروف ہیں اور کوئی تجویز، کوئی استدعا، کوئی گزارش خصوصاً تعلیمی معاملات کے متعلق جس میں واقعی اور درست طور پر اہل ملک کی بہتری کی امید ہو کبھی رد نہیں ہوتی۔ آپ کی کانفرنس ملک میں تعلیم کا شوق اور اہل ملک میں اپنی اصلاح کا مذاق نہ پیدا کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ بجز ہماری شومیٔ قسمت کے اور کوئی اس کا ذمہ دار نہیں۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ حامیان کانفرنس اور نیز وہ بزرگانِ قوم جو شاید اتفاقاً کانفرنس میں شریک نہیں ہیں عملی طور پر کام کریں اور فقط فصیح و بلیغ تقریروں پر بھروسہ نہ کریں وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

عماد الملک سید حسین بلگرامی

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدۂ اورنگ آباد میں عبدالغنی خاں صاحب رافت نے ایک طویل نظم سنائی تھی جس کے چند شعر درج ذیل ہیں :-

تمھیں بتائیں عزیزو یہ انجمن کیا ہے — کہ جس پہ ملک کا خورد و بزرگ شیدا ہے
فلاحِ ملک کی بنیاد ہے یہہ کانفرنس — کہ روئداد سے اس کے یہ سب ہویدا ہے
دلیلِ راہ ترقی یہہ انجمن ہوگی — اسی کی ذات سے یہ بیڑا پار ہونا ہے
گزارشوں کو نصیب اس کی گر ہو سمعِ قبول — ہزار آفریں، کیا ملک تیرا کہنا ہے
یہی ہیں رافتِ دل خستہ کی تمنائیں ! — الٰہی اب تو بھلے دن ہمارے بھی آئیں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

دنیا کے بڑے سے بڑے کاموں کا آغاز عجز وانکسار کے ساتھ ہوا ہے ۔ ان کے بانی اپنے عاجزانہ خلوص اور کمزور سعی کی مدد سے اپنے شروع کئے ہوئے کاموں کو بہت جلد ارفع واعلیٰ مقام پر پہنچتے دیکھ کر متحیّر رہ جاتے ہیں کہ ان سے اتنے بڑے کام اس قدر جلد کیسے ہو سکے ۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی رسمی بنیاد دارالعلوم کے چند فارغ التحصیل طلبہ کے ہاتھوں سے ماہ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ میں رکھی گئی ۔ چنانچہ اس مہینے میں آپ کی ایک مختصر جماعت نے جلسہ کرکے تعلیمی کانفرنس قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اس کا نام حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس رکھا ۔ ان ابتدائی اجلاسوں میں شدومد کے ساتھ کام کرنے والوں میں مندرجہ ذیل علی الخصوص قابل ذکر ہیں :۔
مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم ۔ مولوی عبدالباسط صاحب ۔ مولوی رضی الدین صاحب کیفی مرحوم ۔ مولوی سید بہاءالدین صاحب شطاری مولوی جمال الدین صاحب مرحوم ۔

اس کے بعد دارالعلوم کے بعض اور نوجوانوں نے رسمی شرکت کی ۔ جن میں سے (میں اپنی ذاتی معلومات کے لحاظ سے کہہ سکتا ہوں کہ) مولوی میر اکبر علی صاحب ۔ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب ۔ مولوی شمس الدین صاحب ۔ مولوی محمد مظہر صاحب ۔ مولوی محمد عبدالسلام صاحب مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔

ظاہر ہے کہ سارے حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس کا کام چلانے کے لئے ایک مشرقی تعلیم کا ادارہ اگرچہ وہ اس وقت ملک میں انتہائی شہرت حاصل کرچکا تھا ، کافی رضاکار اور معاون پیدا نہیں کرسکتا تھا ۔ نوجوان بانیوں نے اپنے دائرہ کو وسعت دی اور ملک کے ہر حصے اور تعلیمی ادارے سے ارکان جمع کئے ۔ باہمی مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے بعد اعلیٰ عہدہ داران تعلیم وغیرہ سے بھی مدد اور ہمدردی حاصل کی گئی اور بالآخران کی زبردست سرپرستی میں ۲۷ ، ۲۸ فروردی ۱۳۲۴ف کو بمقام ٹاؤن ہال کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا ۔ اس مشہور جلسہ کی صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے (جو اُس وقت معتمد عدالت وکوتوالی و امور عامہ سرکار عالی تھے) قبول فرمائی ۔ معتمد کانفرنس مولوی مرتضیٰ صاحب مرحوم تھے ۔ انھوں نے انعقادِ ذیلی مجالس ، فراہمی عام ارکان وتقسیم کار کے ضمن میں جو محنت اٹھائی ہے اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو اس موقع پر ان کا شریکِ کار رہا ہو ۔ جلسہ نہایت شاندار اور کامیاب ثابت ہوا ۔ ملک میں تعلیم کے ساتھ عام دلچسپی پیدا ہوگئی ۔ علم دوست عہدہ داران سرکار عالی اور دائرۂ ملازمت سے باہر متمول اشخاص نے محسوس کیا کہ ملک تعلیم میں بمقابل دیگر ممالک وصوبہ جات ہند کے کس قدر پیچھے ہے اور اس نقص کو پبلک کس طرح خلوص نیت کے ساتھ مذہب وملت کے ظاہری قیود سے اپنے آپ کو آزاد رکھ کر دور کرسکتی ہے ۔ معلمین ومتعلمین کی بھی ہمت افزائی ہوی اور براہ راست ان کو اس کا انکشاف ہوا کہ

قوم کی ترقی بغیران کے باقاعدہ اور منظم اشتراک عمل کے ناممکن ہے۔
نادار طلبہ کے لئے کانفرنس کی جانب سے وظائف تعلیمی دئے جانے لگے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کانفرنس کی اس تعلیمی سرپرستی کو دیکھ کر ملک کے بعض ممتاز سرکاری اداروں نے نہ صرف کانفرنس کے پاس اپنے ہونہار طلبہ کی مالی امداد کی سفارش کی بلکہ اس سے متاثر ہو کر خود بھی سرکار اور دیگر ذرائع سے اپنے طلبہ کے لئے وظائف منظور کرائے۔ اس کانفرنس میں چونکہ ذمہ دار اشخاص نے اپنے ذاتی تجربہ اور وسیع معلومات کی بناء پر بتلایا تھا کہ زبان اردو تعلیم کے جملہ مدارج میں ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک اس تاریخی اجلاس کے بعد فطری طور پر بذریعہ زبان اردو اعلیٰ وفنی تعلیم حاصل کرنے پر ایک بڑی حد تک نہ صرف آمادہ ہوگیا بلکہ اصرار بھی کرنے لگا۔ گویا جامعۂ عثمانیہ کے مبارک قیام کے لئے راستہ صاف کرنے والی قوتوں کی فہرست میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی ایک اچھی جگہ حاصل ہے کانفرنس کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ اس کی وہ امداد ہے جس کی بدولت ملک کے اکثر غیر معمولی ذہین مگر کم خوش قسمت نوجوان میدان علم میں اپنے معراج کمال کو پہنچ سکے۔ ہندوستان بھر میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کو یہ عزت نصیب ہوی ہے کہ اس کی مالی اعانت سے ملک اس قدر کم مدت میں ایسے قابل اور صاحب کمال افراد پیدا کرسکا۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے تمام حضرات اور خصوصاً وہ ممتاز ہستیاں جنھوں نے کانفرنس کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی ریاضت و ذہانت طبعی سے ملک کی بہترین خدمت گزاری کا موقع عطا کیا۔ اب اپنی مرفہ الحالی اور کمال عروج کے زمانے میں اس ادارہ کا فیاضی وحق شناسی سے ہاتھ بٹائیں گے۔ ملک کا سب سے بڑا محسن اور مستحق سپاس وہی ہے جو نوجوانان ملک کے جسمانی دماغی و ذہنی ارتقاء کی کوشش کرتا ہے۔

محمد عبدالرحمٰن خاں

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں مرزا غلام مصطفےٰ صاحب رسؔا سوم تعلقدار اورنگ آباد نے ایک نظم سنائی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :—

مرحبا قوم کی آواز پر آنے والے
ہم ترے واسطے آنکھیں ہیں بچھانے والے

ہم اسی شخص کے قائل ہیں جو کچھ کرکے دکھائے
نوحۂ قوم تو لاکھوں ہیں سنانے والے

جذبیں کی ہیں زمانے نے ہزاروں لیکن
آج تک ہم ہیں وہی اگلے زمانے والے

سونے والوں پہ ہم الزام لگائیں کیونکر!
آپ سو جائیں جو سوتوں کے جگانے والے

ہے اگر منزل مقصود کو جانا تو اٹھو
بیٹھ کر جائیں گے کس طرح سے جانے والے

میر عثمان علی خاں رہیں آباد رسؔا
اپنے مالک کی ہیں ہم خیر منانے والے



مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے ملکی قومی اور علمی خدمات

مولوی محمد مرتضیٰ کو انتقال کئے ہوئے آج تیرہ ۱۳ سال ہوتے ہیں، یکم رجب ۱۳۴۲ھ کو ان کی رحلت ہوئی ہے، ہماری نئی نسل جو اب کالج سے فارغ ہو کر میدانِ عمل میں گام زن ہوئی ہے، یا وہ سپوت جو ہنوز تحصیلِ علم میں مصروف ہیں غالباً اُن کے نام اور کام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے یہاں مرحوم کے بعض کارناموں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ہماری نئی نسل ایک سچے محبِ وطن کے کارناموں سے آگاہ ہو کر ان کے نقشِ قدم کو اپنے لئے چراغِ ہدایت تصور کریں۔

شمالی ہندوستان کی طرح حیدرآباد میں بھی کئی نامور محبانِ وطن جلوہ نما ہوئے ہیں، جن کے کارنامے زندگیٔ جاوید کے مستحق ہیں۔ ملا عبدالقیوم مرحوم، مولوی عبدالقادر مرحوم، ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادیا، مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم حضرت کیفی، رائے بال مکند، مولوی عبدالسلام مرحوم وغیرہ وہ معزز ہستیاں تھیں جن کے کارنامے فراموش نہیں کئے جاسکتے، ان ہی محبِ وطن ہستیوں میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کا نام چوٹی پر نظر آتا ہے، مرحوم کے کارنامے تاریخِ دکن میں تابناک رہیں گے نسلیں ان پر فخر کریں گی، زمانہ ان کو مٹا سکے گا اور نہ حوادث اس کو محو کر سکیں گے۔

سطورِ ذیل سے معلوم ہوگا کہ مرحوم مرتضیٰ نے ملک اور وطن کی کیا خدمت انجام دی ہے، قوم اور مادرِ وطن کی بہبودی کیلئے کیا کام کئے ہیں۔

قلمروِ آصفی میں جامعہ کے قیام کی جدوجہد

قلمروِ آصفی میں توسیعِ تعلیم اور ایک مستقل یونیورسٹی کی ضرورت کی تحریک کو مرتضیٰ خاندان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے مختلف اوقات میں پیش کیا ہے، سب سے پہلے آج سے تقریباً نصف صدی پہلے راقم کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم سابق رجسٹرار بلدہ نے ایک طویل مضمون مخبرِ دکن میں شائع کیا تھا جس میں حیدرآباد کے لئے ایک یونیورسٹی کی تحریک سرکارِ عالی کے سامنے پیش کی تھی، مرحوم نے تفصیل کے ساتھ اعداد و شمار پیش کر کے بتایا تھا کہ سرکارِ عالی سررشتہ تعلیمات پر کس قدر رقم صرف کر رہی ہے، اور مزید کس قدر صرفے سے ایک یونیورسٹی قایم ہو سکتی ہے، اور مطلوبہ رقم کی سبیل سرکار کس قدر آسانی سے کر سکتی ہے، اور اس مستقل یونیورسٹی سے کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت یہ تحریک بہت قبل از وقت ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۳۳۲ھ میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم میدانِ عمل میں اُترے، ایک پمفلٹ "روحِ ترقی" کے نام سے شائع کیا، اس سوال کا جواب دیا گیا تھا کہ حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا۔ اس میں تفصیل کے ساتھ تعلیمی پستی کا اظہار کرتے ہوئے ایک جامعہ کی جانب توجہ دلائی تھی، اس کے بعض اقتباس حسبِ ذیل ہیں:۔

"نصاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سب سے اہم بحث یہ ہے کہ حیدرآباد کی عام تعلیمی زبان کونسی ہو، انگریزی یا اردو، موجودہ حالت سے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اصلی زبان انگریزی قرار دیگئی ہے، جس کی وجہ بظاہر یہی

معلوم ہوتی ہے کہ مغربی فنون، معاشرت، تمدن کا سیلاب جس زور شور سے بڑھ رہا ہے، اس لحاظ سے بتقلید برٹش انڈیا یہی سچی خیرخواہی ہے کہ ابنائے ملک کو اس سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل بنایا جائے۔ یہ خیال اگرچہ بظاہر درست پایا جاتا ہے لیکن سچائی اس کے بالکل خلاف بیان کرتی ہے ....

..... اردو زبان کی رفتار خود اس مغالطہ کو دور کر دیتی ہے، دیکھو یہ زبان جو خاص ملکی دکنی پیداوار ہے کب پھولنے لگی، اسی وقت سے جبکہ سیلاب مغرب کا تموج شروع ہوا، اور جیسے جیسے اس کی موجیں بلند ہوتی جاتی ہیں یہ سرپلی اور خوش آئند صدا بھی قوی بن رہی ہے، ابنائے ملک اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان کو تازہ رکھیں .... وہ دکن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو کی ضرورت سمجھی اور بندگان عالی کے عہد میمنت عہد میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان بنی .... اسی بنا پر اب حیدرآباد اردو کا اصلی مرکز ہو سکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اسی میں منحصر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے، اسی میں شاہ کی اطاعت ہے اور اسی میں ملک کی بہبودی، اردو عام تعلیم کے لئے کافی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے برخلاف بیانات محض لغو اس ہیں۔ (صفحہ ۲۵ و ۲۶)

عام تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اس طرح مرتبط ہونا چاہیئے کہ ایک دن نظام کالج کی جگہ نظام یونیورسٹی قائم ہو جائے، .... آج اگر ہم نظام یونیورسٹی کا نعرہ مارنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا اور اس لئے تا بمقدور ایسی تجویزیں کی گئی ہیں جو سہل الحصول بھی جا سکتی ہیں۔"

اس رسالہ "روح ترقی" کے شائع کرنے کے بعد مرحوم مرتضیٰ بالکل خاموش نہیں ہو گئے بلکہ وہ وقت کے منتظر رہے تا آنکہ ۱۳۳۲ف میں انھوں نے حیدرآباد میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، اس کے بعض مقاصد حسب ذیل تھے:۔

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

(د) ادنیٰ تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم سے بہ سہولت مرتبط رہنا ترقی کے لئے لازمی ہے، اس لئے اعلیٰ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے، اعلیٰ تعلیم کا ہمارے ہاتھ میں رہنا نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائیگی۔

(ھ) ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے .... کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے۔

مرحوم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم کے ذریعہ بھی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کرتے رہے، اور دارالعلوم کو ترقی دے کر جامعہ کے درجہ پر پہنچانے کی کوشش ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی چنانچہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر جو اڈریس نواب سالار جنگ بہادر (ثالث) مدارالمہام وقت کی خدمت میں

پیش کیا گیا تھا اس میں حسب ذیل استدعا بھی کی گئی ہے :۔

"ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم کی جائے یا بالفاظ دیگر یونیورسٹی قائم کی جائے"۔

اس کے بعد بھی انجمن طلبا قدیم دارالعلوم کے سالانہ جلسوں میں اس تحریک یا استدعا پر سرکار کو متوجہ کرتے رہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے (۶۳) سالہ جلسہ میں حسب ذیل تحریک کی گئی ہے :۔

"حقیقت میں یہ امر تازیانۂ عبرت ہے کہ حیدرآباد جہاں سب سے پہلے علوم قدیمہ و جدیدہ کے اجتماع کی کوشش دارالعلوم کے ذریعہ ۶۳ سال پیشتر شروع ہوئی، اس طویل عرصہ میں شہرۂ آفاق دارالعلوم بن جانے کے عوض ایسی حالت میں ہو کہ بالآخر دُور دُور سے اس کی ترقی کے لئے توجہ دلائی جائے۔ سال بھر پہلے جسٹس عبدالرحیم صاحب نے پونہ کانفرنس میں مشرقی یونیورسٹی کے لئے حیدرآباد کو توجہ دلائی اور ابھی حال میں ندوہ میں بھی ایک رزولیوشن ہمارے دارالعلوم کی یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا۔ اگرچہ دارالعلوم میں علوم جدیدہ و انگریزی ۶۳ برس پہلے سے شروع تھے اور اسی زمانہ میں اردو میں مغربی علوم و فنون کے تراجم کا کام بھی امیر کبیر شمس الامرا مرحوم کی توجہ سے معتد بہ ترقی پا چکا تھا۔ نیز طرز تعلیم کی اصلاح بھی مولوی عون الدین صاحب مرحوم کی بدولت دارالعلوم میں ایک مدت پیشتر عمل میں آچکی تھی، لیکن یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں۔ بہرکیف اب تاریکی میں اُجالا ہونے لگا ہے، دارالعلوم اپنی شایان شان مرتبہ کو پہنچنے کے قریب ہے، جس کے لئے جوبلی کے موقع پر توجہ دلائی گئی تھی کہ ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے، جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں، ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم ہو جائے یا بالفاظ دیگر جامعہ قائم کیا جائے"۔

ان تمام تفصیلات سے یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ مرحوم کو حیدرآباد میں **جامعہ** قائم ہونے کی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین یہی تھا کہ حیدرآباد میں ہماری **جامعہ** قائم ہو جائے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام

مرتضیٰ مرحوم کا دوسرا زریں کارنامہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہے، ۱۳۳۲ء میں مرحوم نے ہمدردان ملک و قوم کی خدمت میں ایک تحریک پیش کی اور اس میں ہماری تعلیمی پستی کا ذکر کرتے ہوئے اپیل کی کہ اس پستی کے دور کرنے کے لئے کمر ہمت چست کی جائے، اپیل کے بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مرحوم کو ہماری تعلیمی پستی کا کسقدر رنج تھا، اور کس طرح درد بھرے دل سے انھوں نے اپیل کی تھی :۔

"جیسے جیسے بلاد مغرب میں علمی مجالس کے ذریعہ سے باہمی اجتماع و تعاون کا زور بڑھتا گیا اسی نسبت سے ہماری علمی مجالس شخصیت کے بدنصیب قربان گاہ پر ذبح ہوتی گئیں۔ ہمارے علمی ولولے

دن بدن ماند ہوتے گئے' اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے' .... آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی بہت سے مولوی فاضل اور یم اے' بی اے نوجوانوں کی شکلیں نظر آ رہی ہیں' اگرچہ ایسے فارغ التحصیل افراد کی تعداد قلمرو آصفی کی عظیم الشان آبادی کے لحاظ سے جس قدر مختصر ہے وہ خود قابل افسوس ہے' لیکن اس سے زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد میں بھی باہم کوئی جہت جامعہ یا رابطہ علمی ایسا قائم نہیں ہے جس سے ملک کی ضرب المثل مردہ دلی دُور ہونے اور علمی جذبات کی نشو و نما میں مدد ملے' .... اگر اس تعداد سے کئی چند زیادہ گراجویٹ بھی پیدا ہو جائیں تو اس وقت بھی علمی تازگی جو منشاء تعلیم ہے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی اور علم کا گہوارہ ایسا مہیا نہ ہو جس کے لب جان بخش اور مسیحا نفسی کے کرشمے حیات جاودانی کا لطف بخشیں۔ اسی بناء پر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا ہے"

کانفرنس کے تین مقصد قرار دئیے گئے تھے یعنی :-

۱۔ ایک علمی سوسائٹی کا قیام جو وقتاً فوقتاً عام مجالس تقریروں اور علمی تحریرات کے ذریعہ علمی تازگی پیدا کرے۔

۲۔ قلمرو آصفی میں اشاعت تعلیم کی کوشش۔

۳۔ اصلاح تعلیم۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب ذیل نظام العمل مقرر کیا گیا تھا :-

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

(ب) حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ مرتب کرانا۔

(ج) نصاب تعلیم کا ایک موزوں و مناسب حال سلسلہ مہیا کرنا۔

(د) ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرنا۔

(ھ) جامعہ کے قیام کی تحریک۔

(و) تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

(ز) تعلیم طب کی طرف توجہ۔

(ح) تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ۔

مرحوم مرتضیٰ اپنی زندگی تک یعنی (۱۲) سال کانفرنس کے آنریری سکریٹری رہے' اس عرصہ میں (۸) سالانہ اجلاس ہوئے' سرکار عالی نے کئی تحریکات کو منظور فرمایا' اکاسی ہزار سات سو اڑسٹھ کی رقم کانفرنس کے فنڈ میں جمع ہوئی باون ہزار چار سو ساٹھ کے وظائف غیر مستطیع طلبہ کو دئیے گئے' اور اُنتیس ہزار تین سو آٹھ سلک باقی تھی۔

مرتضیٰ مرحوم کانفرنس کی رقم کی بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ حفاظت کرتے تھے۔ کبھی بلا منظوری ایک حبہ بھی اُنھوں نے خرچ نہیں کیا۔ وظائف کی ادائی اور اس کی بازیافت وصولی میں ان کو تلخ سے تلخ تجربات ہوئے'

کانفرنس کی ترقی میں قدم قدم پر مراحل اور مشکلات کا ان کو سامنا ہوا، مگر ایک پہاڑ کی طرح انھوں نے تمام مشکلات کا مقابلہ سینہ سپر ہوکر کیا، ہمت اور استقلال سے قدم آگے ہی بڑھاتے رہے اور ثابت کر دیا کہ ایک درد بھرا سچا دل اور بے ریا کیا نہیں کر سکتا۔

یہ خلاف واقعہ نہیں ہے کہ حیدرآباد کی تعلیمی ل چل، علمی چہل پہل، علم و فن کے ذوق و شوق کی جو گرم بازاری اب نظر آرہی ہے اس میں کانفرنس کا بڑا حصہ ہے۔

کانفرنس کے اعلیٰ خدمات کا اعتراف ملک کے دیگر ارباب قلم نے بھی کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں اس کے متعلق جو صراحت کی حسب ذیل ہے :-

"ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارک باد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد میں اردو کی ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملسکتی۔"

انجمن طلبا قدیم دار العلوم مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اپنی مادر تعلیمی (دار العلوم) سے بڑی محبت تھی، دار العلوم کی ترقی کے لئے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے۔ ۱۳۳۲ھ میں انجمن طلبا قدیم دار العلوم کے نام سے ایک انجمن قائم فرمائی تھی اور اپنے انتقال تک وہ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ان کی تمنا تھی کہ دار العلوم ترقی کر کے جامعہ کی صورت اختیار کر لے، اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے سعی پیہم برابر جاری رکھی اور نہایت مستعدی کے ساتھ دامے، درمے، قدمے اور قلمے جد و جہد کرتے رہے، بڑی حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی تھی۔

دار العلوم کی جدید تنظیم ہوئی، مدرسین کا جدید اسکیم منظور ہوا، کئی مستحقین دار العلوم کو اعلیٰ خدمات ملے، جامعہ عثمانیہ کے مجلس رفقا میں ان کے لئے جگہ معنون کی گئی، انجمن کی جانب سے کئی علمی اخلاقی کتابیں شائع ہوئیں۔ کئی مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ اصحاب نے انگریزی تعلیم پائی اور ان کے لئے ہائی اسکول کا امتحان قائم ہوا۔

بہر حال انجمن طلبا قدیم دار العلوم نے بھی ملک کی علمی ترقی اور علمی بیداری میں خاص حصہ لیا ہے، انجمن مذکور کے خدمات کے متعلق ڈاکٹر زور کے خیالات قابل ملاحظہ ہیں :-

"کارکنان انجمن اور خاص کر محمد مرتضیٰ مرحوم قابل ستایش ہیں کہ انھوں نے اپنے قریب قریب جملہ مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ اس حقیقت حال سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں اور ادبی جد و جہد انہی ارباب ہمت سے وابستہ تھیں، انہی کی زندہ دلی سے دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی نہایت خوش اسلوبی اور جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی، اور یہ غالباً حیدرآباد میں اپنی قسم کا پہلا علمی اجتماع تھا۔ انہی کی پے در پے صداؤں اور تحریکات نے جامعہ عثمانیہ اور دار التالیف و تراجم کے قیام میں مدد دی، انہی کی سرگرمیوں نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس جیسے مفید اور اہم ادارے کی بنیاد ڈالی اور انھیں نے حیدرآباد میں سب سے پہلے سلسلہ تالیف اردو قائم کر کے ملک میں نظیر پیدا کی۔"
(عہد عثمانی میں اردو کی ترقی صفحہ ۳۹)

ذاتی وظائف تعلیمی

یوں تو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن طلبا قدیم کے فنڈ سے وظائف تعلیمی مقرر تھے، مگر ان کی تعداد منظورہ ہوتی تھی، بلا منظوری مجلس منتخبہ وظائف کوئی وظیفہ جاری نہیں کیا جاتا تھا مگر اکثر مرتبہ ضروریات وغیرہ کے مدنظر جب کسی طالب علم کو وظیفہ نہیں مل سکتا یا اس کے تعلیمی ضروریات پورے نہیں ہوسکتے تو مرتضیٰ مرحوم اپنی ذات سے بھی ایسے نادار طلبہ کی خدمت کرتے تھے، ان کی ماہوار کا ایک بڑا حصہ اس قسم کے وظائف میں خرچ ہوتا تھا۔

مدرسۂ نظامیہ کی تنظیم میں مرحوم کا حصہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اگرچہ مدرسہ نظامیہ سے تعلیمی تعلق نہیں تھا، مگر مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم کے تعلقات کے باعث وہ مدرسہ نظامیہ سے دلچسپی لینے لگے، اس کے بعد چونکہ مدرسہ نظامیہ خالص دینی مدرسہ تھا اسلئے بھی ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا۔

مولانا انوار اللہ مرحوم کے آخر زمانہ میں جو تنظیم مدرسہ نظامیہ کی ہوئی تھی اس میں مرتضیٰ مرحوم کا بڑا حصہ تھا بلکہ تنظیم کا خاکہ بھی مرحوم کا مرتبہ تھا، نواب فضیلت جنگ کے انتقال کے بعد بھی مرحوم مدرسہ نظامیہ کی انتظامی مجلس میں شریک رہے اور اپنے انتقال تک دل سوزی اور انہماک کے ساتھ مدرسہ کے کاموں سے دلچسپی لیتے رہے۔

انجمن معین المسلمین، انجمن اشاعت العلوم وغیرہ

مولوی مرتضیٰ کو حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی سے دلچسپی تھی، ان کی دلی تمنا تھی کہ حیدرآباد ترقی کرکے معراج پر پہنچ جائے۔ اس لئے مرحوم ہر اس صدا پر لبیک کہتے تھے جو ملک کی ترقی، خوش حالی سے متعلق ہوتی، اسی بنا پر وہ کئی انجمنوں کے سرگرم رکن تھے اور نہایت جوش و خروش کیساتھ اس انجمن کے عملی کاموں میں حصہ لیا کرتے۔ اس قسم کے کئی انجمنیں ہیں جن میں سے معین المسلمین (جو بلا سودی قرضہ کی انجمن تھی) اور انجمن اشاعت العلوم قابل ذکر ہیں جن میں مرتضیٰ مرحوم نے خاص حصہ لیا ہے۔

حجاز ریلوے اور انجمن ہلال احمر

ملا عبدالقیوم مرحوم نے حجاز ریلوے کی تعمیر کے زمانہ میں چندہ کی اپیل کی تھی، یہ زمانہ مرتضیٰ مرحوم کی تعلیم کا تھا، مگر وہ اس زمانہ میں بھی نہایت سرگرمی سے ملا صاحب موصوف کو مدد دیتے رہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عام جمود کی حالت تھی، قومی کاموں سے بہت کم ہمدردی ہوتی تھی۔ مرحوم نے جس دلچسپی سے اس کام کو انجام دیا تھا اس کا ملا صاحب کو بھی اعتراف تھا — مرتضیٰ مرحوم جب سفر حجاز کو تشریف لے گئے تھے تو اس وقت انھوں نے حجاز ریلوے کے انتظامات وغیرہ کے متعلق کئی عربی مضامین قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کئے تھے۔ مرحوم کے یہ مضامین اسلامی ممالک میں خاص عزت کی نظر سے دیکھے گئے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ملا عبدالقیوم مرحوم کے فرزند ملا عبدالباسط صاحب نے انجمن ہلال احمر قائم کرکے مجروحین کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کی تھی اور حیدرآباد سے ایک لاکھ سے زیادہ رقم بھیجی گئی تھی، اس وقت بھی مرحوم مرتضیٰ ملا عبدالباسط کے دست و بازو کی حیثیت سے کام کرتے رہے، چنانچہ ملا صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

اوقاف مذہبی کی حفاظت اور انتظام

مولوی محمد مرتضیٰ اپنے انتقال کے چند سال پہلے مہتمم اوقاف کی خدمت پر مامور کئے گئے تھے، اگرچہ مرحوم نے اس خدمت کے فرایض کو ایک ملازم سرکار کی حیثیت سے انجام دیا ہے، مگر اس امر کا اظہار بلاخوف تردید کیا جاسکتا ہے کہ ان کو مذہبی اوقاف کی تباہی اور غیر متعلق امور میں اس کی آمدنی کے

خرچ کا بڑا ذریعہ تھا۔ وہ نہایت توجہ وانہماک کے ساتھ شب و روز محنت کرتے تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ اوقاف کی آمدنی جائز مصرف میں خرچ ہو اور اس سے ملک و قوم کی بہبودی ہو سکے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی شب و روز کی محنتِ شاقہ نے ان کی صحت پر بھی اثر کیا تھا۔

مرحوم کی ملازمت کا بڑا حصہ امور مذہبی کے سررشتہ سے رہا وہ متعلقہ کام کے علاوہ سررشتہ کا غیر متعلق کام بھی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔

رسالہ صحیفہ اور اخبار صحیفہ کی قلمی امداد

رسالہ صحیفہ، حیدرآباد کا قدیم ماہوار رسالہ تھا، اس کے مضمون نگاروں کا تقریباً تمام حصہ ملکی اصحاب پر مشتمل تھا۔ اس حیثیت سے یہ رسالہ ملک کا واحد رسالہ تھا۔ اس کے مضامین اعلیٰ اور بلند پایہ ہوتے تھے، ارباب علم و فن، اصحاب ذوق میں اس رسالہ کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ اس کے دلچسپ اور نیز معلومات مضامین، خاص و عام میں مقبول تھے ـــ اس رسالہ کے اڈیٹر اگرچہ اولاً کیفی مرحوم اور پھر مولانا اکبر علی صاحب تھے۔ مگر مولوی مرتضیٰ بھی اس رسالہ کے روح رواں تھے، ان کے کئی بلند پایہ اور محققانہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

رسالہ صحیفہ نے زمانہ ما بعد میں اخبار کی صورت اختیار کر لی اور آج تک جاری ہے، اس وقت کئی ایک دوسرے اخبار بھی جاری ہیں مگر اُس زمانہ میں صرف اخبار صحیفہ ہی ملک و قوم کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، صداقت، راستی و حق پرستی اس اخبار کی امتیازی شان تھی ـــ چونکہ اخبار صحیفہ ملک اور قوم کی زبان تصور کیا جاتا تھا اسلئے مرتضیٰ مرحوم بھی اخبار کی قلمی امداد اور نیک مشورہ سے دریغ نہ کرتے تھے، مولوی اکبر علی صاحب کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ اخبار صحیفہ اور رسالہ صحیفہ مرتضیٰ کا رہین منت ہے۔

تصنیف و تالیف

آخر پر ہم مولوی مرتضیٰ مرحوم کے تصانیف کا ذکر کرتے ہیں، یوں تو مرحوم کے شائع کردہ کتابوں کی تعداد بہت کم ہے، مگر مسودات شائع ہو جائیں تو اہل ملک کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تالیفی حیثیت سے بھی کس قدر بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم، علی گڈھ سے ایک رسالہ "معارف" کے نام سے شائع کرتے تھے، اُس زمانہ میں یہ رسالہ اپنے اعلیٰ معیار اور پسندیدہ مضامین کے لحاظ سے اردو زبان کا واحد رسالہ تھا ـــ مرتضیٰ مرحوم اس رسالہ کے خاص مضمون نگار تھے اور انکے کئی بلند پایہ مضامین اڈیٹر کی تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، یہ زمانہ مرحوم کے طالب علمی کا تھا۔ مرحوم کے اکثر مضامین اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان میں پہلی چیز ہوتی تھی، آپ کے سب مضامین تحقیقات اور انکشافات سے مملو ہوتے تھے، آپکی تاریخ دانی کے مدنظر علامہ شبلی نے آپ سے خواہش کی تھی کہ ان کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کریں ـــ رسالہ صحیفہ کے بھی آپ مضمون نگار تھے، اور آپ کے مضامین خاص اہمیت رکھتے تھے، آپ کے بعض مضامین کی صراحت بے محل نہیں ہو سکتی۔

(۱) تاریخ التاریخ ۔ انجمن ترقی اردو نے اس موضوع کی جانب متوجہ کیا تھا، کسی انگریزی داں نے اس پر توجہ نہیں کی، مرتضیٰ مرحوم نے اس عنوان پر ایک مقالہ مرتب کیا اور اخبار وکیل امرتسر نے اس کو شائع کیا ہے۔

(۲) "سسلی میں مسلمانوں کی حکومت" مرتضیٰ مرحوم وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس عنوان پر قلم اٹھایا اور ایک طویل مقالے کے ذریعہ اس پر روشنی ڈالی تھی، چنانچہ مولف تاریخ صقلیہ مولوی ریاست علی ندوی لکھتے ہیں :-

"اردو میں غالباً سب سے پہلے رسالہ معارف علی گڈھ میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب نے ۱۹۰۹ء میں ایک

سلسلہ مضامین لکھا جو اتاریخی کے اسی مجموعہ سے ماخوذ تھا" مولوی صاحب مرحوم کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے
انہی نے سب سے پہلی مرتبہ اردو میں سسلی کی تاریخ لکھنے کا قصد کیا" ہے۔

(۳) "سواحل ہند پر مسلمانوں کا توطن" رسالہ صحیفہ میں یہ مقالہ شائع ہوا تھا۔ اسکے پہلے اردو زبان میں اس عنوان پر کچھ مواد نہیں تھا (۴) سوانح قادر ولی (۵) سوانح باقر آگاہ (۶) سوانح قاضی بدالدولہ (۷) سوانح سالار جنگ۔ یہ تمام مضامین رسالہ صحیفہ میں شائع ہوئے ہیں، اور اپنے انکشافی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ (۸) تنقید سفرنامہ ابن جبیر بلحاظ فن تنقید یہ بلند پایہ مضمون ہے۔ (۹) سفرنامہ حجاز، اخبار صحیفہ میں آپ کا یہ سفرنامہ شائع ہوا ہے خاص انداز اور اہم معلومات کا گنجینہ ہے۔ (۱۰) "میلاد خاتم النبیین صلعم" انجمن طلبا رقدیم دار العلوم نے اس مقالہ کو شائع کیا ہے رسالت مآب صلعم کی یہ مختصر مگر جامع سوانح عمری ہے ــــ ان کے علاوہ آپ کے بیسیوں مضمون ہیں جو اخبارات مخبر دکن، جریدہ روزگار، نیر آصفی، اخبار صحیفہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں، آپ کے بعض عربی مضمون اخبار العدل قسطنطنیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی تین روداد یں بھی آپ کی مرتبہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو اہم کتابیں آپ کے زیر تالیف تھیں۔

(۱) "حیات تمدن" یہ خاندان آصفی کی مکمل تاریخ ہے، مرحوم نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ اسکو مرتب کر رہے تھے افسوس ہے کہ اس کا تکملہ نہیں ہوا۔ مرحوم کی زندگی میں اس کا ابتدائی حصہ رسالہ ترقی حیدرآباد میں شائع ہوا اور مرحوم کے بعد "عہد سلف" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے تاریخ ہند کا بہترین نچوڑ ہے، گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔

(۲) "تفسیر قرآن مجید" سرسید نے جس اصول پر تفسیر قرآں لکھنے کا ارادہ کیا تھا اسی اصول پر آپ تفسیر قلمبند کر رہے تھے یہ بھی مکمل نہ ہوسکی ــــ ان دونوں کتابوں کے علاوہ بعض اور مسودات بھی ہیں جو تاریخ و سوانح وغیرہ پر مشتمل ہیں، یہ سب شائع ہو جائیں تو مرحوم کے تصانیف کی پوری اہمیت واضح ہوسکتی ہے۔

اس تمام تفصیل سے بڑی حد تک مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے قومی خدمات کا حال معلوم ہوسکتا ہے، اس امر کا خیال رہے کہ مرحوم انگریزی کی کوئی ڈگری نہیں رکھتے تھے، وہ دار العلوم کے "مولوی فاضل" تھے، مذہب کی پابندی کے لحاظ سے وہ پورے "ملا" تھے "مولوی" تھے، مگر وہ پرانے زمانے کے ملا اور مولوی نہیں تھے بلکہ "روشن خیال" زمانہ کی رفتار سے باخبر، سیاسیات ملکی سے واقف تھے، اور ہر امر کے متعلق وہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔

آج سے پندرہ سال قبل ان سے بڑا کوئی قومی لیڈر حیدرآباد میں نہیں تھا۔ وہ جاہ اور مرتبہ سے دور، منکسر المزاج اور متواضع تھے، قومی خدمت سے ان کو عشق تھا۔ وہ صداقت، سچائی، خلوص سے اپنے مفوضہ کام کو انجام دیتے تھے۔

یہ امر کسقدر افسوسناک ہے کہ ان کے بعد انجمن طلبا رقدیم دار العلوم کا کوئی خبر لینے والا نہیں رہا۔ اور ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی وہ جوش اور خروش باقی نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ کانفرنس سے بہت سارے واقف بھی نہیں فقط

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو خدمات

اس کانفرنس کا خاکہ اصل میں انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم کی تشکیل کے ساتھ ہی بن چکا تھا اور اس کے لئے آج سے قریب قریب پچیس سال قبل ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ کو ایک تفصیلی اپیل حامیانِ تعلیم و بہی خواہانِ وطن کی خدمت میں روانہ کی گئی تھی۔ اس اپیل میں کانفرنس کے قیام کی ضرورت اور اس کے مقاصد وغیرہ کی نسبت وضاحت کی گئی تھی اور آخر میں اس کا پروگرام بھی درج تھا۔

کانفرنس کے تین مندرجہ مقاصد کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) قلمروِ آصفیہ میں کم از کم ایک علمی سوسائٹی تو ایسی ضروری ہے جو اس قلمرو کی جغرافی، تاریخی، ادبی تحقیقات کو وقتاً فوقتاً علمی دنیا کے روبرو پیش کرے، اور باشندگان قلمرو میں علمی تحقیقات کا ذوق شوق پیدا کرے۔ اُن کی مادری زبانوں کو علوم و فنون کے سرمایہ سے مالامال کردے جس کے بغیر یہ طے شدہ ہے کہ کوئی ملک حقیقی ترقی نہیں کرسکتا۔

(۲) اشاعت تعلیم کی کوشش۔ ایک کانفرنس کے ذریعہ سے مختلف شہروں اور قصبوں میں تعلیمی ہل چل اور توسیع دائرۂ تعلیم پیدا کرے۔

(۳) پبلک خود اپنی ضرورتوں پر غور کرکے تعلیم کی اصلاح کرے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے جو پروگرام کانفرنس کے مدنظر قرار دیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

الف۔ اردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم کئے جائیں جن کی قلمروِ آصفیہ میں سخت ضرورت ہے۔

ب۔ حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کے متعلق بکثرت تصانیف اردو میں مرتب کرائے جائیں۔

ج۔ نصابِ تعلیم کا ایک عمدہ سلسلہ خود کانفرنس اُردو میں مہیا کرے گی کیونکہ جب تک ملکی زبان میں تعلیم کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی ترقیٔ ملک کی امید بے سود ہے۔

د۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرائے گی اور کوشش کرے گی کہ اعلیٰ تعلیم خود اپنے ہاتھ میں ہو جو نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائے گی۔

ہ۔ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک

و۔ تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

ز۔ تعلیم طب کی طرف توجہ۔

ح۔ تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ وغیرہ۔

ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کے مقاصد اور پروگرام میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے نہایت غور و خوض کے بعد مفید ترین طریقے پیش کئے گئے۔

اس کانفرنس نے حیدرآباد کی تعلیمی اصلاح و ترقی اور دیگر ضروری امور کے لئے جو کوششیں اور کامیابیاں حاصل کیں ان کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم یہاں اجمالی طور پر کانفرنس کے صرف اُن ہی کارناموں کی طرف اشارہ کریں گے جو حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا باعث ہوئے۔

یوں تو کانفرنس کے جملہ اجلاسوں اور اُن کی کارروائیوں میں اردو زبان ہی استعمال کی گئی یہاں تک کہ مسز سروجنی نائڈو اور پروفیسر ولنکر نے بھی انگریزی کی جگہ اُردو ہی میں تقریریں کیں اور صرف یہی خصوصیت کس قدر اہم ہے کہ اگر کانفرنس اردو پر کوئی اور احسان عظیم نہ بھی کرتی تو اردو کی ترقی اور ذوق کے لئے یہی خدمت کافی تھی کیونکہ اس کانفرنس کے لئے ہر سال جو تحقیقی، تخلیقی اور اصلاحی مقالے اور پرچے لکھے گئے۔ استقبالیہ اور صدارتی خطبے قلمبند ہوئے، مختلف تحریکات وغیرہ کی نسبت تقریریں تیار کی گئیں اور پھر جو سالانہ تفصیلی رپورٹیں مرتب اور بعض شائع بھی ہوئیں، اُن سب کے ذریعہ اردو زبان کے ذخیرۂ ادب اور معلومات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا مگر اس ضمنی خدمت کے علاوہ کانفرنس کے دو چار کارنامے اتنے اہم ہیں کہ حیدرآباد کی موجودہ ترقیٔ اردو کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے پہلے سالانہ اجلاسوں ہی سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرانا شروع کیا اس کے جلد سے جلد قائم کرنے کی تحریکیں کیں، ساتھ ہی اُردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت پر زور دیا، اس کے علاوہ اس نے اپنے تقریباً ہر اجلاس میں اُردو کو ملک کا عام ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے قسم قسم کی ترکیبوں سے کام لیا اور آخر کار ثابت کر دکھایا کہ حیدرآباد اگر ترقی کر سکتا ہے تو اُردو ہی میں تعلیم و تعلّم کے ذریعہ سے۔

ایک مشرقی جامعہ کے قیام اور اردو تراجم و تالیف کے انتظام کی نسبت کانفرنس نے جو تحریکیں کیں اُن کا اجمالی تذکرہ یہ ہے:

جامعہ عثمانیہ ۔ ۱۳۳۳ھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جو اس وجہ سے نہایت اہم ہے اور تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جامعہ عثمانیہ زیادہ تر اسی کی چہل پہل اور تقریروں کے باعث بہت جلد ظہور میں آسکی۔

اس کانفرنس کی صدارت سر حیدر نواز جنگ بہادر جیسے فرد فرید نے کی جو اُس وقت معتمد تعلیمات تھے۔ انھوں نے ملک کے اِس عام رجحان اور شدتِ احساس کو محسوس کر کے اپنے خطبۂ افتتاحیہ ہی میں اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ :-

> "خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا" (روئداد کانفرنس صفحہ ۴۰)

صدر کے اس ہمت افزا بیان کے علاوہ دوران کانفرنس میں بعض تقریروں میں بھی اس کی طرف اشارے کئے گئے غرض پہلی کانفرنس نے یہ ثابت کر دیا کہ حیدرآباد تعلیمی ترقی کے لئے تیار ہو چکا ہے اور اب اہل ملک بیدار ہیں۔

ایک سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس اورنگ آباد میں ہوئے اور اس کی صدارت ملک کے فاضل سپوت مولوی شیخ محمد حبیب الدین مرحوم صدر محاسب سرکار عالی نے کی اور انھوں نے قیام جامعہ کی نسبت گذشتہ کانفرنس سے زیادہ مدلل اور ہمت افزا طریقہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ :-

"اس کانفرنس کے اجلاس کا یہ دوسرا سال ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی ترقی تعلیم کے اہم کام کے لئے انتہائی مقصد مرکوز خاطر رکھیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے متفقہ کوششیں کی جائیں۔ ہمارا مقصد اعلیٰ ترقی تعلیم تو ہے لیکن لفظ تعلیم بہت ہی شعبوں پر حاوی ہے۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانویہ، تعلیم ابتدائی، تعلیم نسواں، اخلاق جسمانی، صنعت وحرفت وزراعت وغیرہ کی تعلیم، یہ سب شعبے بجائے خود مکمل نہیں ہو سکتے جب تک ممالک محروسہ سرکار عالی میں بلحاظ حالات ملک ومقاصد رعایا برایا ایک جامع العلوم یعنی یونیورسٹی قائم نہ کی جائے۔ کیونکہ جب ہم اپنے ملک کی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں حاکم ومحکوم کی جداگانہ قوتیں نہیں ہیں اور ہماری حکومت ہم سے متباین اغراض نہیں رکھتی ہے، اور خوش بختی سے اس ریاست دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب صدیوں کے میل جول سے ممتزج ومرکب ہو گئی ہے، اور یہاں کے روشن دماغ حکمرانوں نے ہمیشہ کشادہ دلی اور فیاضی سے دونوں کی مدارات ودلجوئی ملحوظ رکھی ہے، پس یہ وہ پاک خطہ ہے جہاں جامع العلوم جیسی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام ہر طرح مناسب وموزوں ہے، جو مغربی علوم وفنون کی تعلیم اور اختراعات وایجادات کے مواقع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ کا مامن اور دلکش مسکن بن سکے اور جس میں مشرق کے مختلف علوم ادبیہ اور دقیق فلسفہ، حکمت اور تصوف اور حیرت انگیز اخلاقی ومذہبی تمدن اور تعجب خیز صنایع وبدایع قدیم کے خزائن فراہم کئے جا سکیں۔

دنیا میں انسانی جواہر معنوی کو کوئی چیز اس جوش سے ظہور میں نہیں لا سکتی، اور علما وفضلائے وقت کا مرکز نہیں بنا سکتی جیسی وہ یونیورسٹی بنا سکتی ہے جس کو ابنائے ملک اپنی سعی، اپنے اہتمام اپنے ملک کے پیسے اپنی دماغی محنت، اپنے علوئے ہمت، اپنی حکومت کے ذریعہ قائم کریں اور جس کو وہ اپنی یونیورسٹی کے نام سے پکاریں۔

چنانچہ ہماری اہم سایہ ریاست میسور ...... قیام یونیورسٹی پر رجوع ہے جس پر ملک کی اخلاقی ودماغی ترقی کا انحصار ہے۔ میری دلی تمنا اور پُرخلوص دعا اپنے ملک کے لئے بھی یہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں ہے جب ہمارے ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ہمارے یہاں کے بھی جامع العلوم کا سنگ بنیاد ہمارے ہردلعزیز علم پرور بادشاہ ظل اللہ میر عثمان علی خاں بہادر دام اقبالہٗ وزید اجلالہٗ کے دست مبارک سے رکھا جائے گا" (روئداد صفحہ ۳۳-۳۴)

چنانچہ مولوی حبیب الدین مرحوم کی پیشین گوئی اور پُرخلوص دعا اور اس کانفرنس کے اکثر مقررین مثلاً مسٹر وامن ام چندر نایک، مولوی اکبر علی، اور مسٹر ونلنگر کی خواہشیں دوسرے ہی سال پوری ہوئیں، جب کہ اہل ملک کے اس عام رجحان اور اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کی خاص علمی سرپرستیوں سے واقف ہونے کے بعد ایک نبض شناس اور صاحب ذوق ہستی نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے جو اس وقت معتمد تعلیمات تھے اعلیٰ حضرت حکیم السیاست کی خدمت میں ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ء

میں قیام جامعہ کی اجازت کے لئے عرض داشت پیش کی جس کے ملاحظہ کے بعد اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ :۔

"اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ عرض داشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا۔"

دارالترجمہ۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے پہلے ہی اجلاس میں یہ تحریک کی کہ "اس کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لئے یہ جلسہ سرکارعالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ محکمہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ بارہ ہزار بہترین علمی تراجم و تصانیف اُردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لئے منظور فرمائے جائیں۔" مولوی عبدالحق صاحب نے اس تحریک کو کانفرنس میں پیش کیا اور اُردو کی اہمیت اور ضرورتوں کے اظہار کے بعد اس کی طرف حسب ذیل الفاظ میں توجہ دلائی :۔

"کیا ایک ایسی زبان کو ترقی دینے اور زندہ رکھنے کے لئے جسے کروڑوں بندگان خدا بولتے ہیں بارہ ہزار سالانہ کچھ زیادہ رقم ہے؟ یہ کچھ بھی نہیں۔ اور اگر آپ اس تجویز کو منظور کریں اور سرکار سے درخواست کریں تو یقین ہے کہ سرکار ہماری التجا کو ضرور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی۔ سرکار نے اس سے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور صرف کثیر سے ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بعض وجوہ سے قائم نہ رہ سکا، شائد وہ قبل از وقت تھا لیکن اب اس کا وقت آگیا ہے لوگوں میں عام طور سے بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور پرجوش اصحاب اس کام کو کرنے کے لئے مستعد ہیں۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۷)

اس کی تائید بابو گیا پرشاد نے کی اور آخر کار وہ نہ صرف کانفرنس میں کامیاب ہوئی بلکہ سرکار نے بھی اس کی طرف کافی توجہ کی اور اس سلسلہ میں نصاب کی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجمن ترقی اردو کے تفویض کیا گیا۔

اس ضمن میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ :۔

"کانفرنس سرکارعالی کا شکر یہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اُردو میں علمی تراجم و تصانیف کی اشاعت کے لئے کانفرنس کی تحریک پر توجہ فرمائی۔ کانفرنس نہایت ادب کے ساتھ اس امر پر توجہ دلاتی ہے کہ جو رقم فی الحال سرکار سے بطور امداد ترقی علم دیجاتی ہے اس کا بہت قلیل حصہ اس مقصد یعنے اردو زبان میں تراجم و تصانیف علمی کی اشاعت میں صرف ہوتا ہے جو ضروریات ملک کے لحاظ سے بالکل غیر مکتفی ہے۔ اور اس لئے مکرر کانفرنس سرکار کی توجہ اس کام کی خاص امداد کے لئے مبذول کراتی ہے۔"

اس کی تحریک پنڈت کیشوراؤ صاحب نے کی اور تائید حافظ محمد مظہر صاحب نے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے واضح کیا:

"مجلس اصلاح نصاب امتحانات السنہ مشرقیہ نے جن کتابوں کا ترجمہ ہونا تجویز کیا ہے اور جو آئندہ شامل نصاب ہوں گی اُن کے متعلق انجمن ترقی اُردو نے اس مجلس کے ایما پر کام شروع کردیا ہے اور بہت جلد اس ضرورت کو پورا کردے گی لیکن اس کی تکمیل کے لئے انجمن کو سرکار سے مزید امداد ملنے کی ضرورت ہے۔"

(روئداد کانفرنس صفحہ ۶۵)

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال جب جامعہ عثمانیہ کی تشکیل ہونے لگی تو ایجوکیشنل کانفرنس کی یہ درخواست بھی منظور ہوگئی اور ۱۳۳۶ء م ۱۹۱۷ء میں ایک سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کردیا گیا جس کی نظامت مولوی عبدالحق صاحب کے تفویض کی گئی۔ اس میں پہلے صرف مغربی زبانوں ہی کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام کیا گیا تھا، مگر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے تیسرے اجلاس منعقدہ ماہ صفر ۱۳۳۶ء میں توجہ دلائی کہ:۔

"اس کانفرنس کی رائے میں سررشتہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے علوم مشرقیہ کے لئے بھی اُن کے اصلی ماخذوں سے اردو میں ترجمہ و تالیف کا انتظام ہونا چاہیئے۔"

اس کی تحریک کرتے وقت حافظ محمد مظہر نے کہا کہ:۔

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو اس امر کی اولیت حاصل ہے کہ پہلے پہل رائے عامہ کے سامنے اس نے یہ امر پیش کیا کہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دینا ممکن ہے اور اس کے بعد سے تمام ملک میں اور برٹش انڈیا میں یہ مسئلہ زیر بحث ہوگیا۔ یہ خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ سرکار عالی نے اس اصول کو تسلیم فرمالیا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہورہی ہے۔ اس اصول کو عملی حیثیت میں لانے کے لئے نیز ملک میں علوم و فنون کو ترقی دینے کے لئے پہلے اجلاس کانفرنس میں یہ استدعا بھی پیش کی گئی کہ ترجمہ و تالیف علوم و فنون کے لئے مخصوص سررشتۂ علوم و فنون قائم ہونا ضروری ہے...... ہم سب کو خوش ہونا چاہیئے کہ کانفرنس کی مجوزہ تحریکات میں سب سے پہلے یہ تحریک منظور ہوئی ہے اور حضرت بندگان عالی کے مرحمت شاہانہ سے شاندار اور وسیع پیمانے پر سررشتہ علوم و فنون قائم فرمادیا گیا ہے۔ ہم کو یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ صحیح اصول پر کام کریگا...... اس سررشتہ کے متعلق جیساکہ رزولیوشن سرکار عالی شائع شدہ سے واضح ہوتا ہے فی الحال صرف علوم مغربیہ کی تالیف و ترجمہ کا فرض عاید کیا گیا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ یا دوسرے الفاظ میں عربی، فارسی، سنسکرت میں جو علوم و فنون کے ذخیرے ہیں اُن کے اصل ماخذوں سے اُردو میں تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے اضافہ کیا جائے۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۵۲)

کانفرنس کی یہ تحریک بھی ناکام نہ رہی۔ دارالترجمہ میں مشرقی اور خاص کر عربی اور فارسی کتابوں کے تراجم کا بھی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ اس کام کے لئے نواب حیدریار جنگ نظم طباطبائی مرحوم، مولوی عبداللہ عمادی، مولوی ابوالخیر مودودی اور مولوی سید ابراہیم ندوی وغیرہ جیسے عربی و فارسی کے علما کا بھی تقرر کیا گیا۔

پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے "سائنس اور اس کی تعلیم کی ضرورت" پر

ایک مفید مضمون پڑھا اور اس میں سائنس کی ابتدائی تعلیم کے انتظام پر زور دیتے ہوئے زبان اُردو کی ضرورت کی نسبت حسب ذیل تجویز پیش کی :۔

"اپلائڈ کمسٹری، ٹکنیکل الکٹرسٹی، سیول اور میکانکل انجینرنگ کے ابتدائی مدارج کی ہمارے ملک میں ذرا سی کوشش سے نہایت عمدہ تعلیم ہو سکتی ہے...... ان سب فنون کی تعلیم نہایت آسانی سے اردو زبان میں ہو سکتی ہے حسب ضرورت کتابوں کے (جو جدید ترین طریقہ پر لکھی گئی ہوں) ترجمے بلا کسی شدید دقت کے تیار ہو سکتے ہیں۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۲۷)

صنعت و حرفت اور انجینرنگ کی اُردو تعلیم کے لئے کانفرنس کئی سال تک برابر کوشش کرتی رہی۔ پہلے سال یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں تعلیم صنعت و حرفت پر کافی توجہ کی ضرورت ہے...... انجینرنگ اسکول کو ترقی دے کر سیول مکانکل الکٹریکل انجینرنگ کی تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جانا مناسب ہے۔ جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بندوبست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اُردو میں ہونی چاہیئے۔" اس کے محرک خان محمد یوسف صاحب اور موید حافظ محمد مظہر صاحب تھے۔ موخرالذکر نے صنعت و حرفت کی نسبت نہایت وسیع معلومات کے اظہار کے بعد اردو تعلیم کی نسبت ان الفاظ میں تحریک کی :۔

"جو مدارس صنعت و حرفت آئندہ اضلاع میں قائم ہوں اُن میں بھی اُردو کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے کل کے اجلاس میں کانفرنس میں اس امر پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ تعلیم اُردو میں دینا کس قدر مفید ہے.... تعلیم اردو میں دینے کے لئے مقدم چیز کتابیں ہیں اور پھر پڑھانے والے...... ایسی کتابیں ہیں جن کا ترجمہ شمس العلما مولوی ذکا راللہ مرحوم نے اردو میں کر دیا ہے۔ انجنیری کے متعلق جو کتابیں ہیں وہ رڑکی کالج کا نصاب ہیں۔ رڑکی کالج کے نصاب کے کچھ حصہ کا اُردو ترجمہ خود رڑکی کالج میں سرکاری طور پر ہوا ہے...... دو تین کتابیں البتہ ترجمہ شدہ نہیں ہیں مگر ان کا بلکہ کل رڑکی کالج کے بقیہ حصہ غیر ترجمہ شدہ کا ترجمہ اُردو میں سرکار عالی کے صرف ایک حکم پر ہو جا سکتا ہے۔ رہا پڑھانے والے جب نواب مختار الملک مرحوم کے زمانہ میں ایسے اصحاب ملتے تھے جو اُردو میں تعلیم انجینرنگ دیا کرتے تھے۔ موجودہ اسٹاف مدرسہ اردو دانوں کا ہے وغیرہ۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۶۱)

دوسرے سال بھی اس موضوع سے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا گیا، جس کی تحریک کرتے ہوئے مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے فرمایا کہ :۔

"یہ رزولیوشن سال گذشتہ ایک حد تک سرکار سے منظور ہو چکا ہے، اب صرف اجرائی باقی ہے۔ سال گزشتہ کے رزولیوشن میں یہ بھی تحریک تھی کہ عام فائدہ کی غرض سے اس مدرسہ کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیئے...... اردو میں سائنس اور انجنیری کی تعلیم بالکل ممکن ہے انجنیری سائنس کا ایک شعبہ ہے اور اس میں ریاضی، فزکس، اور کمسٹری کی ضرورت ہے ان تینوں کی تعلیم اُردو میں ہو سکتی ہے۔" وغیرہ

سائنس وصنعت وحرفت، اور انجینیری کی اردو تعلیم کے ساتھ کانفرنس نے طب کی اردو تعلیم کی نسبت بھی تحریکیں پیش کیں۔ چنانچہ پہلے سال کی تحریک یہ ہے :۔

"کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچنے کی غرض سے کم از کم اسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اُردو میں ہونا مناسب ہے "

ڈاکٹر مرزا رضا خاں صاحب نے تحریک کے سلسلہ میں کہا کہ :۔

"مدرسہ طبابت میں فوراً اردو زبان میں تعلیم کا جاری ہونا نہایت ضروری امر ہے اور کم از کم فی الحال سب اسٹنٹ سرجن کی تعلیم اُردو ہی میں ہونا چاہیے، جس میں ملک کی بہبودی ہے۔

(روئداد کانفرنس صفحہ ۲۱۱)

پھر تفصیلی بحث کے بعد کہا کہ :۔

"اردو میں طبی تعلیم ہونے سے لوگ پہلے تو اپنی زبان میں لائق ہوں گے، پھر طبی علم کے سمجھنے کی قدرت بھی حاصل ہوگی۔ اور عام طور پر جو ترقی ہوگی اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی جن کا اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے زندہ نظائر موجود ہیں کہ جن لوگوں نے اردو زبان میں تعلیم پائی وہ کسی طور سے اپنے دوسرے ہم پیشہ ڈاکٹروں سے کم نہیں ہیں" (روئداد صفحہ ۲۱۳)

اس رزولیوشن کی مزید تائید محمد مرتضیٰ مرحوم نے کی اور کہا کہ :۔

"عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تعلیم طب کے لئے اردو میں مواد نہیں ہے، لیکن جب ستر سال پہلے ہمارے ملک میں تعلیم اُردو میں دیجاتی تھی اور جب اس تعلیم کی بدولت ایسے مکمل اور اعلیٰ نمونے اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں، جیسے ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر تو کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی معکوس کر کے ستر سال کے بعد یہ خیال کرنے لگیں کہ ہماری زبان بند ہوگئی۔ زبان دن بہ دن کھلتی جائے گی یا بند ہوگی ؟" (روئداد صفحہ ۲۱۴)

دوسری سالانہ کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ پھر پیش کیا گیا۔ اس کے محرک شیخ محی الدین صاحب اور موئید محمد مرتضیٰ مرحوم نے نہایت معقول اور مدلل تقریریں کیں جن کے اقتباسات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ گذشتہ سال بھر کے عرصہ میں کانفرنس نے اس بارے میں بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا۔ تحریک تھی :۔

"چونکہ علاقۂ سرکار عالی میں مشرقی امتحانات کا سلسلہ بھی قایم ہے اس لئے بلحاظ اس سلسلہ کے طلبہ کے، سب اسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے ایک جدید شعبہ کا امتحاناً کھولا جانا مناسب ہے "

اس کو پیش کر کے محرک نے مروجہ خامیوں کے تفصیلی تذکرہ کے بعد کہا کہ :۔

"اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سر دست یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انگریزی طبابت کو اردو کا جامہ پہنایا جائے

اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ انگریزی مدرسہ طبابت میں...... ایک جماعت امتحاناً ایسے طلبہ کی جاری کی جائے جو طبابت انگریزی کو بذریعہ زبان اردو حاصل کریں..... انگریزی کتب طبابت کے تراجم کا مہیا کرنا بلا شبہ ایک مشکل کام نظر آتا ہے لیکن جو معلومات کہ اطراف و اکناف ہند سے کانفرنس کے دفتر میں جمع ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بھی قریب قریب حل شدہ ہے۔ صوبۂ پنجاب و صوبۂ متحدہ کے مدرسہ طبیہ انگریزی کے ڈاکٹروں اور طبی افسروں کے جو آراء وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر اس طریقۂ تعلیم کے موافق ہیں مثلاً کل چالیس اصحاب میں سے صرف تین یا چار ایسے ہیں جو اس تعلیم انگریزی طبابت کو بذریعہ زبان اردو ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔ باقی چھتیس ۳۶ لائق ڈاکٹر اس انتظام کی ضرورت اور اہمیت کے صاف طور پر معترف ہیں..... ان ہی تحریرات میں صاف درج ہے کہ پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں انگریزی طبی مدرسہ کی سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم قریب پچاس سال تک بذریعہ اردو رہی ہے اور اردو تراجم اسی لئے موجود بھی ہیں۔"

(روئداد صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

محمد مرتضیٰ معتمد کانفرنس نے بھی اس کی تائید میں نہایت پرجوش تقریر کی۔

یہی تحریک ۱۳۲۶ء م ۱۹۰۸ء میں پھر پیش کی گئی اور سید محی الدین صاحب سرجن وظیفہ یاب نے طبیبوں اور طب کے مروجہ خطروں اور نقائص کے سلسلہ میں استدعا کی کہ:۔

"ایسی حالت میں ضرور ہے کہ سرکاری طور پر اس کی تعلیم کا اردو میں انتظام کیا جائے جیسے کہ پہلے تھا جس کے عمدہ نتائج مسلم ہیں۔" (روئداد کانفرنس ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۷)

ان علوم و فنون کے علاوہ اردو میں حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کے بارے میں بھی کانفرنس نے نہایت مفید تحریک کی اور اس کے محرک مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے بیان کیا کہ:۔

اردو زبان میں جہاں فنون کی کتابیں تصنیف کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہاں تاریخ و جغرافیہ دکن کی تالیف کا بھی انتظام ہو تو نہایت مناسب ہوگا۔ (روئداد کانفرنس صفحہ ۶۰)

اسی طرح تعلیم نسواں کی نسبت بھی تحریک پیش کی گئی کہ وہ زیادہ تر السنۂ ملکی کے ذریعہ سے ہونی چاہئے، مولوی سید خورشید علی صاحب نے اس تحریک کو پیش کرکے کہا کہ:۔

عورتوں نے اب تک تعلیم میں جو نمایاں ترقی نہیں کی اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو اپنی زبان میں اعلیٰ کتابیں نصیب نہ ہوئیں۔ (روئداد ۱۹۲۵ء صفحہ ۷۰)

یہ تو اردو زبان کو مختلف علوم و فنون وغیرہ کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے اور اس میں وسعت دینے کی نسبت تجاویز تھیں۔ آخر میں ایک اور تحریک کا ذکر ضروری ہے جو ملک کے اردو ذوق اور معلومات میں اضافہ کے لئے لازمی تھی چنانچہ تیسری سالانہ کانفرنس نے یہ تحریک پیش کی کہ:۔

"اس کانفرنس کی رائے میں کتب خانہ آصفیہ میں ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اردو تصانیف و تراجم سابقہ وحال کوشش کے ساتھ فراہم کئے جائیں"۔

اس کی تحریک مولوی عبدالحق صاحب نے کی اور کتب خانۂ آصفیہ کے مشرقی ذخیرۂ کتب کی ترقی کے سلسلہ میں کہا کہ:۔

"اس کتب خانہ میں سب سے کم ذخیرہ اردو زبان کا ہے۔ اردو زبان کی کتابوں کے متعلق کوئی ذریعۂ دریافت نہیں ہے اور اس وجہ سے بھی بہت بڑی دقت پیش آتی ہے۔ بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو میں لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن گمنامی میں پڑی ہیں، اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اگر سب کتابیں فراہم کی جائیں، اور اس طرح قدیم اردو کی کتابیں فراہم ہوجائیں تو کتب خانہ کی ایک عمدہ شاخ قائم ہوجائے گی۔ ضرورت ہے کہ اردو کتابوں کی ایک فہرست مرتب ہو جس سے معلوم ہوسکے کہ ہر مبحث پر کون کون کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ اگر اس طرح کتابیں ایک جگہ جمع ہوجائیں گی تو یہ بہت آسانی سے ممکن ہوگا کہ ایک شخص جس کو خدا نے کسی خاص فن کی مناسبت اور استعداد عطا کی ہے، صرف اردو کی کتابیں دیکھ کر تصنیف و تالیف کرسکے"۔

(روئداد صفحہ ۵۷)

ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارک باد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد کی اردو ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی اس ساری کامیابی کا سہرا اس کے ارباب حل و عقد کے سر ہے جنہوں نے نہایت خلوص، توجہ، محنت اور جراءت کے ساتھ اس اہم قومی اور اعزازی کام کو انجام دیا۔ اس کی مجلس انتظامی غیر معمولی خوش قسمت رہی کہ نواب سر حیدر نواز جنگ جیسا علم دوست، صاحب دل، اور ہمدرد صدر اس کو مل گیا، اور محمد مرتضیٰ مرحوم اور مولوی سید خورشید علی صاحب جیسے معتمدین۔ ان دونوں کا خلوص، سرگرمی اور ایثار تمام اہل ملک کے لئے لائق تقلید ہے۔

کانفرنس کے سرگرم اراکین میں مولوی اکبر علی صاحب، پروفیسر ولنکر صاحب، مولوی مرزا احمد بیگ صاحب، مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب، حافظ محمد مظہر صاحب، رضی الدین حسن کیفی مرحوم، امداد اللہ صدیقی صاحب، محمد عبدالعلی صاحب، وامن رام چندر نایک صاحب، ملا عبدالباسط صاحب، رائے بالمکند صاحب اور عبداللطیف خاں صاحب وغیرہ کے ناموں کو ملک کی آئندہ نسلیں ان کی قومی ہمدردی اور علمی مستعدی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔

سید محی الدین قادری زور

(نوٹ۔ اس مضمون کے اکثر اجزا میں نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" سے اخذ کئے ہیں۔)

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" ایک طرح پر "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کے سلسلہ میں قائم ہوئی۔ کیونکہ ایک تو اس کے بانی زیادہ تر وہی حضرات تھے، جو انجمن طلبائے قدیم کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھے، دوسرے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام سے متعلق ابتدائی امور پر غور کرنے کے لئے ۱۹۱۴ء (۱۳۲۳ف) میں، سب سے پہلا جو اجتماع ہوا تھا، اس کی کارروائیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع کے داعی، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے دل میں دارالعلوم کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ لیکن ابتدائی بحث و گفتگو کے بعد اس نوزائیدہ انجمن کی جو ہیئت مرتب ہوئی وہ وسیع تر اپیل کی مالک تھی۔

ملک کے علمی حلقوں میں، "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی فوری مقبولیت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ ملک کی عام ضرورت تھی، چنانچہ اس کے انعقاد کے ساتھ ہی ہر طبقے اور نقطۂ خیال کے علما اس میں حصہ لینے اور ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہوگئے۔

خانگی اداروں میں، "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی سی وسیع اور سنجیدہ انجمنیں ہندوستان میں کم ہی نظر آئیں گی۔ ایسے صحت بخش اصولوں پر اس نے کام کی ابتدا کی، کہ تھوڑے ہی عرصہ میں، یہ ملک کا اہم ترین غیر سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی۔ اس کی رائیں اور اس کی تحریکات، عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں وقعت رکھتی ہیں۔ اکثر تحریکات کو حکومت نے کشادہ پیشانی کے ساتھ پسند اور منظور کیا۔ کانفرنس کی اس کامیابی میں اس کے اراکین اور خصوصاً اس کے معتمد مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کی والہانہ سعی کو بہت بڑا دخل ہے۔

کانفرنس، اپنی مساعی اور کامیابیوں کو وقفوں وقفوں سے، ملک اور عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے، اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے۔ یہ اجلاس نہ صرف بلدہ، بلکہ اہالیان اضلاع کی خواہش پر، اضلاع میں بھی منعقد ہوتے رہے۔ اب تک اس طرح کے دس اجلاس ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۵ء میں بمقام حیدرآباد (ٹاؤن ہال) منعقد ہوا۔ اس کی صدارت، ملک کے مشہور مصلح تعلیم، نواب حیدر نواز جنگ بہادر (سر اکبر حیدری) نے کی۔ نواب صاحب اس زمانے میں معتمد تعلیم کے اس عہدہ پر فائز تھے۔ اس اولین اجتماع میں کئی مفید مضامین پڑھے گئے، اور کم سے کم دس اہم تحریکیں منظور کی گئیں۔ قیام جامعہ کی تحریک جو اس سے پہلے کئی دفعہ ابھر ابھر کر دب گئی تھی اس دفعہ پھر پیش ہوئی، خود صدر اجلاس نے جو افتتاحیہ خطبہ پڑھا تھا اس میں بھی اس امر پر خاص زور دیا گیا تھا۔ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے، صاحب صدر نے نری مغربی تعلیم کے غیر تشفی بخش نتائج کو نمایاں کیا اور ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر معین رائے کا اظہار کرتے ہوئے، حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے۔

"تقریباً ایک صدی کے تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم، ہمارے ملک کے لئے

مفید نہیں ہوسکتی، جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو، اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو، وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی، موجودہ زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے سود مند نہیں ہوسکتی۔ ایک، ہمیں ملک وقوم سے بیگانہ کردیتی ہے۔ دوسری، ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ اس لئے ضرور، اور لابد ہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔"

کانفرنس کے ایک سرگرم کارکن، مولوی محمد مظہر صاحب نے "تعلیم حیدرآباد" پر جو سیر حاصل مضمون پڑھا تھا، اس میں اعلیٰ تعلیم کی پستی کے اسباب میں سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ، ہماری تعلیم کی باگ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں۔

"سب سے اہم...... اور سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایک مکمل اور قطعی نظام العمل یا پروگرام سررشتہ تعلیم کا مرتب ہو۔ جس میں ملکی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا جائے .... جس طرح برٹش انڈیا کے ہر صوبے کی تعلیمی حالتیں، ضرورتیں باہم مختلف ہیں، اور اس کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ نظام العمل رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح ہماری سلطنت کی تعلیمی حالت اور ضروریات ایسے ہیں جو کسی ایک خاص صوبہ برٹش انڈیا سے مطابقت نہیں رکھتے .... یہ امر کہ سررشتۂ تعلیم حیدرآباد کی بنیاد ملک کی ضرورتوں پر رکھی جائے، کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ اس کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جب کہ بتیس (۳۲) سال قبل بصدارت حضرت غفراں مکاں، اسی باغ عام میں ایک دارالفنون قائم کرنے کے مسئلہ پر غور وخوض ہوا تھا۔ ہمارے ملک کی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ فی الحال ان متعلموں کی تعلیم جو ابتدائی درجہ پر ختم ہوجانے والی ہو، اُن کی مادری زبان میں دی جائے، اور ساتھ ہی اردو کی تعلیم بھی ان کو دی جائے۔ جن طلبا کا منشا ثانوی تعلیم سے آگے بڑھنے کا نہیں، اُن کی تعلیمی پہلی زبان اردو رہنی چاہیئے۔ اور جس قدر تعلیم علوم مثل حساب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبعیات وغیرہ اُن کو دی جائے، وہ بھی اردو ہی میں رہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی لٹریچر کی تعلیم لازمی ہے۔"[1]

اسی اجلاس میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے بھی اردو میں علوم وفنون کے تراجم کی شدید ضرورت پر پُر مغز تقریر کی اور حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کی تحریک پیش کی تھی، جس کی پُرزور تائید بابو گیا پرشاد وکیل نے کی۔ یہ دونوں تحریکیں جس قدر جلد بار آور ہوئیں، اس سے کانفرنس کی رائے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مستحق طلبہ کو، وظائف کے ذریعہ امداد دینے کی ایک تیسری تحریک پیش ہوئی تھی۔ جس کو کانفرنس نے فوراً منظور کرلیا۔ اور بڑی جانفشانی سے ایک وظیفہ فنڈ نہایت صحت بخش اصول پر قائم کیا۔ اس فنڈ سے غیر مستطیع طلبہ کو تعلیمی وظیفے دئے جاتے ہیں اور آج تک سینکڑوں طلبہ اس امداد سے فائدہ اٹھاچکے ہیں۔

اس وقت تک کانفرنس نے مختلف اوقات میں دس سالانہ اجلاس کئے۔ جن میں سے تین، یعنے دوسرا، پانچواں اور چھٹا علی الترتیب اورنگ آباد، لاتور اور پربھنی میں منعقد ہوئے اس سے اضلاع میں اشاعت تعلیم اور تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے کے

---

[1] روداد "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" اجلاس اول (۱۹۱۵ء)، صفحہ ۱۱۲ و صفحہ ۱۳۹

ایک ضروری مقصد میں کانفرنس کو بڑی کامیابی ہوئی۔

ان سالانہ جلسوں میں حقیقی مفید اور علمی تحریکیں منظور ہوئیں، اور ان کو روبراہ لانے میں کانفرنس نے جو کوششیں کیں۔ ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ممالک محروسہ کی تعلیم کے تقریباً ہر پہلو پر ان جلسوں میں اظہار خیال کئے گئے۔ اور جو تحریکیں منظور ہوئیں، ان کو آگے بڑھانے میں کانفرنس نے اپنے تمام وسائل سے کام لے کر تھوڑے سے ہی عرصہ میں ملک کی فضا کو تعلیمی دلچسپیوں کے روشناس کردیا۔ .... ہر سال بیسیوں غیر مستطیع طالب علم کانفرنس کے وظیفہ فنڈ سے امداد حاصل کرکے تعلیم جاری رکھنے کے قابل بن رہے ہیں۔

جس وقت کانفرنس قائم ہوئی تھی، ملک میں کوئی عام علمی یا تعلیمی مرکز موجود نہیں تھا۔ اسی لئے بسا اوقات کانفرنس کو، تعلیم کے علاوہ دوسرے علمی، اقتصادی یا سماجی مسائل کو بھی سمیٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن، چند سال سے، ملک کو ایک مخصوص جماعت یعنے "انجمن اساتذہ حیدرآباد" کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں، جو کارگزاری، کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی مفید ترین انجمن ثابت ہو چکی ہے۔ دوسری طرف "انجمن طیلسانیئن عثمانیہ" نے تعلیمی اور علمی معاملات کے علاوہ، سماجی، اقتصادی اور شہری خدمات کو بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے رہی ہے۔ ان انجمنوں کے قیام کے باعث کانفرنس کا بار کچھ ہلکا ہوگیا ہے، پچھلے چند سال سے اس کے اجلاس وقفوں سے منعقد ہو رہے ہیں، اور ان کی کارروائیوں کی نوعیت بھی زیادہ علمی ہوگئی۔

عبدالقادر سروری

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نیا دور

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک عرصۂ دراز سے نہایت خاموشی کے ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی میں علم کی اشاعت، نادار اور مستحق طلبہ کی مالی امداد اور اردو زبان کی ترقی کے لیے جو شاندار خدمات انجام دے رہی ہے اس کا تفصیلی حال ان مختلف مضامین میں ملے گا جو ادارۂ ادبیات اردو نے اس نمبر میں جمع کئے ہیں اگرچہ کانفرنس کے اجلاس کئی سال سے نہ ہوسکے اور عام طور پر اس کے چرچے نہیں رہے لیکن اس کا اساسی کام برابر جاری رہا اور سیکڑوں تشنگانِ علم نے اس کی مالی امداد سے مستفید ہوکر بحر علم سے سیراب ہوے اور اعلیٰ مدارج علمی حاصل کئے اور کر رہے ہیں اس کا یہ سلسلۂ امداد ابتدا سے لے کر اس وقت تک برابر جاری ہے اور بحمداللہ اس کی اس خصوصیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سال حال سے کانفرنس کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے سالانہ اجلاسوں کی بنا ڈالی جارہی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں جس کو کمیٹی بازی یا کانفرنس کا دور کہا جاتا ہے، سالانہ اجلاس یا کانفرنس وغیرہ رسمی چیزیں بن گئی ہیں لیکن جہاں تک ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلق ہے، وہ ایسی رسمی چیزوں سے بالکل مستثنیٰ رہی ہے۔ یہ کانفرنس قوم کی اس خاص سرگرمی سے تعلق رکھتی ہے جس کو فی الحقیقت "قوم ساز سرگرمی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی گزشتہ روایات اور پچھلے تمام اجلاس اس کے پروگرام کو آگے بڑھاتے اور اس کے دائرہ افادہ کو برابر وسیع کرتے رہے ہیں۔ اس کا لائحۂ عمل بالکل تعمیری اور ہر قسم کے تنگ نظرانہ خیالات اور مفادات سے الگ اور تعلیمی ہے اور جب تک کوئی ملک اور قوم جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں نہیں آئے گی اور تعلیم عام نہ ہوگی کسی قسم کی اصلاح و ترقی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گزشتہ اجلاسوں میں جس مقصد کے حصول کیلئے تحریکات اور قراردادیں منظور کیں تقریریں کرائیں نظمیں لکھائیں اور ہر کہ و مہ کو متوجہ کیا وہ تدریجی طور پر حاصل ہو رہا ہے۔ عہد عثمانی کے فیوض و برکات سے سارے ممالک محروسہ میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ نہ صرف صوبوں اور اضلاع کے مقامات مستقر پر مدرسے قائم ہوگئے ہیں بلکہ وسطانی، تحتانی اور ابتدائی مدارس ملک کے قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ہمارے علم پرور بادشاہ **اعلیٰ حضرت سلطان العلوم** کی توجہات شاہانہ سے جامعۂ عثمانیہ سی ملکی اور قومی جامعہ وجود میں آچکی ہے جو گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر اور برطانوی ہند کے تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں کیلئے نمونہ ہے۔ خود رعایائے ملک سرکار عالی میں بیداری اور تعلیم کا شوق عام طور پر پیدا ہوگیا ہے۔ نہ صرف مختلف مقامات پر مدرسوں کے قیام کیلئے آئے دن سرکار کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے بلکہ ابتدائی تعلیم کو جبری اور لازمی بنانے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے اور پبلک نمائندوں کی طرف سے اس کے دو مسودہ ہائے قانون بھی مجلس وضع آئین و قوانین میں پیش ہوچکے ہیں۔ خود سررشتہ تعلیمات نے بھی ملک کی تعلیمی پیمائش اور ضروریات کو فنی طور پر جانچ پڑتال کرکے ایک مسودۂ قانو

ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے سرکار عالی میں پیش کیا ہے اور اس وقت زیر غور ہے۔ گزشتہ چند سال سے طلبہ کی تعداد میں اس طرح روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے کہ سرکاری مدارس ہی نہیں بلکہ خانگی اداروں اور امدادی درسگاہوں میں عدم گنجایش سے طلبہ کو داخلہ نہیں مل رہا ہے۔ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے لئے ہر سال ملک کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد علی گڈھ اور دوسری جامعات میں شریک ہونے پر مجبور ہو رہی ہے۔

جہاں تک ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا تعلق ہے سررشتہ پوری کوشش اور جد و جہد سے موجودہ مدارس کے استحکام اور نئے مدارس کے قیام میں مصروف ہے۔ مختلف غیر ضروری مدات میں ہر سال جو کثیر رقم خرچ ہوتی تھی اس کی گنجایش سے اور بعض مدات کی کفایت شعارانہ تنظیم کے ذریعے ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہی بچت نکالی گئی اور اس کو ترقی تعلیم کے ضروری ابواب مثلاً قیام مدارس جدید پر صرف کیا جا رہا ہے۔ دوپہری طریقہ (شفٹ سسٹم) رائج کر کے مروجہ تعلیم کو زیادہ مستحکم بنانے کے علاوہ مدرسوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اساتذہ کو کم سے کم خرچ سے تربیت یافتہ بنانے کی کوشش بھی جاری ہے۔ پیشۂ دراست کے لئے موزوں اور کارآمد اشخاص کا انتخاب کرنے اور اس طرح بالواسطہ نتائج تعلیمی کو بہتر بنانے کے لئے امیدواران سررشتہ کا معائنہ کر کے ان کی صلاحیتوں اور موزونیت وغیرہ کی کافی جانچ کرنے کے بعد ان کو سررشتے میں ملازم رکھا جاتا ہے۔

خصوصی تعلیم کے مختلف شعبے بھی ارباب تعلیم کی توجہ سے محروم نہیں رہے۔ پست اقوام کے لئے صحت پرور طریقے پر جو جدید انتظامات کئے گئے ہیں وہ نہایت کامیاب اور حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں۔ ملک کے ان بدنصیب افراد کی تعلیم کے لئے جو گونگے، بہرے یا اندھے ہونے کی وجہہ سے عام طریقۂ تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتے اور جن کی طرف اس وقت تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ضروری تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ چند اساتذہ کو معذوروں کی تعلیم کے خاص خاص طریقوں کی تحصیل کے لئے کلکتہ بھیجا گیا ہے اور ان کی واپسی کے بعد عنقریب بلدۂ حیدرآباد میں معذوروں کے مدرسے قائم کئے جائیں گے۔ تعلیم بالغاں کی طرف بھی سرکار عالی متوجہ ہے اور اگرچہ اس کے لئے باضابطہ سرکاری مدارس قائم نہیں ہیں اور نہ اس غرض کے لئے عام مدارس روزینہ کی ضرورت ہے البتہ کافی تعداد میں امدادی مدرسے یا جماعتیں قائم کی گئی ہیں اور پبلک کی بے توجہی کے باوجود اس خصوص میں سرکاری مساعی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو دور کر کے اس کو علم کی روشنی سے منور کرنے کے لئے سررشتۂ تعلیمات متعدد دشواریوں کے باوجود جس توجہ اور جوشِ عمل سے کوشاں ہے اور جو تعمیری پروگرام اس کے پیش نظر ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تمام غیر سرکاری اور پبلک اداروں، علمی اور تعلیمی انجمنوں، سبھاؤں، دولت مند اور ذی ثروت شہریوں کا اولین فرض ہے کہ دامے درمے قدمے اس مفید کام میں مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور سررشتے کے پیش نظر پروگرام کی تکمیل میں ممکنہ تعاون و اتحاد عمل فرمائیں۔ خصوصاً ملک کی اس قدیم تعلیمی خدمت گزار انجمن یعنے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ اِس سلسلے میں اپنے تعاون سے دوسری انجمنوں اور اداروں کے لئے ایک نمونہ

ثابت ہوگی۔ اگر یہ کانفرنس جواب تک نادار اور غیر مستطیع طلبہ کو وظایف تعلیمی دے کر حصول تعلیم میں مدد دیتی رہی ہے اپنا دائرۂ عمل وسیع کرکے فی الوقت دو خاص امور اپنے پروگرام میں تحریک کرے اور ان کی تکمیل کے لئے ضروری جدوجہد کام میں لائے تو وہ یقیناً ایک ٹھوس اور تعمیری کام انجام دے گی اور اس سے سررشتۂ تعلیمات کے مقاصد کی بھی بہت کچھ پیش رفت ہوگی۔

تعلیم بالغاں اور پبلک کتب خانوں کا قیام ملک کی اہم تعلیمی ضروریات میں سے ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے مدنظر اگر ایک عمدہ تنظیم کے ساتھ مدارس شبینہ کے ذریعے ان پڑھ لوگوں کو خواندہ بنانے کی کوشش کی جائے تو اس سے نہ صرف موجودہ جہالت اور ناخواندگی میں معتد بہ کمی ہوجائے گی بلکہ آئندہ نسلوں کی ابتدائی تعلیم کے اچھے مواقع نکل آئیں گے موجودہ ان پڑھ والدین خود خواندہ بن کر اپنے بچوں کو بھی زیور علم سے آراستہ کرنے کے فواید سے آگاہ ہوجائیں گے۔ یہ کام گورنمنٹ سے زیادہ پبلک اور بلدیوں کے فرائض سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس جو قیل وقال اور شور وشغب پر ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتی رہی ہے اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے سکتی ہے۔

دوسری اہم ضرورت پبلک کتب خانوں کے قیام کا ہے۔ بہ حالت موجودہ عام تعلیم اور خصوصاً اضلاع وغیرہ میں جو ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے اس کے ایک حد تک بے اثر اور بے کار ثابت ہونے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ عمداً ایسا ہو رہا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی تعلیم اور ضروری خواندگی کی تحصیل کے بعد مدرسہ ترک کردیتے ہیں توسیع و ترقی علم کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھر رفتہ رفتہ ناخواندہ بن رہے ہیں۔ جہالت کی طرف عود کرنے کی یہ حالت متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ایک اہم مسئلہ بنی ہوی ہے وہاں بھی مختلف تدبیروں کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس تضیع تعلیم اور صحیح معنوں میں علم کی توسیع اور ترقی تعلیم کے لئے پبلک کتب خانوں اور مطالعہ گھروں کا قیام ناگزیر ہے خصوصاً اضلاع میں کتب خانوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ بلدہ حیدرآباد میں بھی ان کی موجودہ تعداد کسی طرح کافی نہیں ہے۔ اگر جگہ جگہ کتب خانے اور مطالعے خانے قائم کئے جائیں اور ان میں عام پسند، سلیس اور مفید معلومات بہم پہنچانے والی کتابیں، اخبار اور رسالے مہیا کئے جائیں تو پبلک میں خود بخود مطالعہ اور تحصیل معلومات کا شوق ترقی کرے گا اور بہت جلد مستحکم علمی ترقی عمل میں آئے گی

رفیق

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اردو کے اسالیب بیان

اردو نثر نگاری کی تاریخ ۔ انشا پردازوں کی نثر کے اسلوب اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے

طبع سوم ۱۷۶ صفحات قیمت ۱؎ ۸؍

اردو شہ پارے

آغاز اردو سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب (نظم و نثر) کا محققانہ تذکرہ معہ نمونہ کلام ۔ قدیم شعراء اور قدردانان اردو کی نایاب تصاویر

بڑی تقطیع ۔ ۳۴۰ صفحات مجلد قیمت ۱؎ ۸؍

روح تنقید

فن تنقید پر اردو ادب کی واحد مستند کتاب جو مختلف جامعات کے نصاب تعلیمی میں شامل ہے

طبع سوم

صفحات ۲۹۰ قیمت ۱؎ ۸؍

تنقیدی مقالات

روح تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے بہترین ادبی کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں ۔

طبع دوم

۲۹۶ صفحات مجلد قیمت ۱؎ ۸؍

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی

گزشتہ ربع صدی میں اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید اور مکمل تذکرہ جامعۂ عثمانیہ کی مستند تاریخ حیدرآباد کے جملہ خدمت گزاران اردو کی خدمات پر تبصرہ

۲۸۶ صفحات مجلد قیمت ۱؎ ۸؍

محمود غزنوی کی بزم ادب

غزنین کی فارسی شاعری اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ

صفحات ۱۱۷

قیمت عہ

ہندستانی لسانیات

اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح ۔ اپنے فن میں اردو کی پہلی کتاب اردو ہندی جھگڑے کی تاریخ ۔

قیمت عاں

ہندستانی صوتیات

(بزبان انگریزی)

اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جدید ترین عملی صوتیاتی آلوں اور گردونوں کے نتائج کے بچھتر فوٹو ۔ قیمت عاں ۸؍

فن انشا پردازی

مضمون نگاری اور انشا پردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے ۔ انشا پردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل

صفحات ۱۱۶ قیمت عہ ۸؍

طلسم تقدیر

زوال گولکنڈہ کے وقت کا نیم تاریخی افسانہ

طبع سوم

صفحات ۶۶

قیمت ۸؍

سیر گولکنڈہ

۱۶ افسانے ۔ ۱۲ تصاویر

گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو فسانوں کی شکل میں قطب شاہوں کی مختصر تاریخ

صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۵؍

گولکنڈے کے ہیرے

۱۶ افسانے ۔ ۸ تصاویر

سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ گولکنڈہ کے آخری دور کے متعلق نیم تاریخی افسانے

صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲؍

دفتر سب رس ۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں ۔



مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب

محمد عبد الرحمٰن خاں

اے آر سی اس- بی اس سی (لندن)، فیلو رائل اسٹرونامکل سوسائٹی صدر ایجوکیشنل کانفرنس

پروپاگنڈے کی دُنیا میں کھوٹے کھرے کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کو نام و نمود کی ہوس نہیں، وہ پھسڈی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کام کم اور شور زیادہ" زندگی کا اصول بن گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مرعوب کن ناموں کو نظر انداز کر کے صرف ٹھوس کارناموں کا موازنہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنے حقیقی مدارج کی روشنی میں شخصیتیں اُبھاگر ہو جاتی ہیں۔ کتنے خاموش خدمت گزار ایسے ہیں جو دنیائے نام و نمود سے ہٹ کر کام کو کام کی خاطر انجام دیتے ہیں؟ ان کے کام غرض سے آلودہ نہیں بلکہ خدمت گزاری ان کا مقصد ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوقِ کار میں ایک مسلسل تڑپ ہے اور ان کی لذتِ کاوش تشنگیٔ دنیا سے تلخ ہونے نہیں پاتی —— بہت کم ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں!

میرے نزدیک کسی کی عظمت کا اندازہ قائم کرنے کا معیار کون ہے؟ "نہیں بلکہ میں" اس نے کیا کیا؟" کی روشنی میں اس کی حقیقی عظمت تلاش کرتا ہوں۔ نام کو پس پردہ رکھ کر کام کا احترام میرا تنقیدی اصول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی کسوٹی پر کھوٹے اور کھرے کی صحیح جانچ ہو سکتی ہے۔

آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں۔ خان صاحب کا نام میں نے سب سے پہلی مرتبہ اُس وقت سنا جب میں فوقانی درجوں میں زیرِ تعلیم تھا اور ترقی کی اُمنگیں مجھے جامعہ عثمانیہ کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جب میں نے جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی تو ان کو پہلی مرتبہ دیکھا —— ہندوستان کی یہ بلند پایہ ہستی جس نے مشرق و مغرب سے اپنے ذوقِ علم کے لئے بہت کچھ حاصل کیا اور مشرق اور مغرب کو اپنے علم و فضل سے بہت کچھ دیا، میری نگاہوں کے سامنے تھی —— اس کے بعد وہ ایک سال تک کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر رہے لیکن بدقسمتی سے میں نے اُن سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا۔ اڈکل میٹ میں جامعہ کی منتقلی کے ساتھ ہی وہ وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔

اُن کی علیحدگی نے طلبائے کلیہ میں ایک الم انگیز ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ کلیہ کے ایک ہر دلعزیز صدر تھے اور جامعہ کی ترقی بڑی حد تک ان کے پرخلوص مساعی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن جب میں نے طلبہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں سُنیں تو مجھے دکن کے اس مایۂ ناز سپوت کی زندگی سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ان آنسوؤں کا سبب یہی ہے کہ ایک ہمدرد اور دیرینہ محسن بچھڑ گیا؟ —— کیا کوئی اور بھی؟؟ —— اسی تجسس میں جب میں نے ان کے کارناموں کے متعلق معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ یہ ماتم رسمی اور موقتی ماتم نہیں ہے بلکہ انسانی نفسیات سے ہٹ کر اپنے اندر ماضی اور مستقبل کی ایک کشمکش بھی رکھتا ہے۔ ہم سے وہ شخص بچھڑ رہا تھا جس نے ماضی کو تابناک بنایا تھا اور مستقبل کو تابناک تر بنا رہا تھا۔ اور ایسے وقت بچھڑ رہا تھا جب کہ ہم کو اس کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والے یا کام لینے والے مل ہی جاتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کا قحط الرجال ہے جو خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ دوسری خصوصیات سے قطع نظر مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب کی یہی ایک خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اس سے اُن کے احساس خدمت گزاری اور خلوصِ عمل کا بین ثبوت مل جا سکتا ہے۔ ایثار، ہمدردی اور عمل —— یہی تین اوصاف ہیں جو اُن کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

پہلا قدم اور مسلسل جادہ پیمائی۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب اکتوبر ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ میں ہوئی جب کہ نظام کالج کی صدارت مسٹر سیٹن کے تفویض تھی۔ بارہ برس کی عمر میں امتیاز اولیت کے ساتھ مڈل کامیاب کرکے سرکاری انعام پایا۔ فوقانی تعلیم کے دوران میں پیہم امتیازات حاصل کئے۔ بعض وقت طبیعیات میں ان کو صد فی صد نشانات ملے۔ اس طرح پروفیسر انڈرسن کی شفقت و ستائش کا مرکز بنے رہے۔ میٹرک ۱۹۰۶ء میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں مدراس یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ طیلسان حاصل کیا۔ ان تعلیمی امتیازات کے ساتھ کھیل کے میدانوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت رہی۔ انھوں نے بین المدارس اور بین الکلیاتی مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔

یوں تو ان کی زندگی ہمیشہ طالب علمانہ رہی ہے۔ انھوں نے طلبِ علم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے۔ وہ دنیائے جستجو میں ہمیشہ گام زن رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی مکتبی زندگی کا پہلو بھی اتنا روشن ہے کہ جس کو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک زندہ اور نصب العینی طالب علم کی حیثیت سے نہ صرف دماغی مشاغل میں اپنے آپ کو مصروف رکھا بلکہ جسمانی تربیت سے بھی غافل نہیں رہے۔

مسلوں کا انبار۔ طیلسان حاصل کرنے کے بعد خاں صاحب یوروپی وظیفہ کے مستحق تھے لیکن عمر کی تحدید نے ان کو اپنے اس حق سے محروم رکھا حالانکہ عماد الملک مرحوم اور پرنسپل سیٹن نے ان کے لئے پرزور سفارش کی تھی۔ تلافی کے طور پر بہت جلد سرجارج کاسن واکر کی کوشش سے محکمۂ فینانس میں ان کی خدمات حاصل کرلی گئیں جہاں وہ کئی ماہ تک کارگزار رہے۔ چوں کہ دفتری زندگی کی پیہم مشق میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی تباہی کا اندیشہ تھا اس لئے انھوں نے اسی راستہ کی طرف اپنا رخ کیا جو ان کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا تھا۔ ان کا ہر سانس مسلوں کے انبار سے نکل کر علمی وسعتوں میں لہرانا چاہتا تھا اس لئے وہ ایم اے (ریاضی) کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دفتر کی چار دیواری سے باہر نکل گئے۔

پھر مادرِ علمی کی آغوش میں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کا تقرر نظام کالج کی مددگاری سائنس پر ہوا۔ ڈاکٹر اگھورناتھ کی وظیفہ پر علیحدگی (اکتوبر ۱۹۰۸ء) سے مسٹر میک الوین کے تقرر (نومبر ۱۹۰۹ء) تک وہ شعبۂ سائنس کے ذمہ دار نگران رہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں وہ مددگار پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے یورپ سے واپس ہوئے تو ان کا تقرر نظام کالج کی پروفیسری پر ہوا۔ اور وہ سب سے پہلے ہندوستانی پروفیسر طبیعیات کی حیثیت سے جس نے نظام کالج کی پروفیسری کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت کیا۔ کام کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی سائنٹفک خدمات سے نہ صرف اس ادارہ کو بلکہ تمام حیدرآباد کو مستفید کیا۔ چنانچہ سائنس کے نئے تجربہ خانے ان ہی کے غور و فکر اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تمام مدارس میں سائنس کی تعلیم کو رواج دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

اس عرصہ میں وہ جامعۂ مدراس کی مجلس رفقائے مجلس امتحانات اس سے ملحقہ کلیوں کی کونسل کے رکن اور مجلس ممتحنین کے رکن اور صدر منتخب ہوتے رہے اور اکثر جامعاتِ ہند کی اعلیٰ جماعتوں کے ممتحن مقرر ہوئے۔

اس ملازمت میں انھیں نہ صرف اپنی معلومات سے طلبہ کو مستفید کرنے کا موقع ملا بلکہ ساتھ ساتھ وہ اپنی تشنگیٔ علم بھی بجھاتے رہے اور یہی وہ میدان تھا جس میں ان کو اپنی موزونیٔ طبع اور شوقِ علم کے باعث ترقی کی وسعتیں نظر آئیں۔

مغرب کی دنیا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے اور رائل کالج آف سائنس لندن میں شرکت کی۔ جہاں سے انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب امتیازات کے ساتھ دو ہی سال میں بی، ایس سی (آنرز) کی ڈگری حاصل کی اور ریاضی، مساحت، طبعیات، میکانیات، کیمیا، برق اور انجنیری کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کیں۔ خوش قسمتی سے وہاں انھیں پروفیسر کیلنڈر، آنریبل آر، جے، اسٹرٹ (موجودہ لارڈ ریالے) اے فاولر، ڈبلیو واٹس پیری ماتھر جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرین سائنس کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ جن سے ان کی قابلیت میں اضافہ ہوا۔

بی ایس سی کی تعلیم کے دوران میں وہ وائرلس کے لئے لندن یونیورسٹی کالج میں پروفیسر فلمنگ ایف، آر، ایس کے زیر تعلیم رہے اور ۱۹۱۳ء میں فزیکل سوسائٹی لندن کے رفیق منتخب کئے گئے۔

نیا طور۔ نئی برق تجلی ۔جامعہ عثمانیہ ابھی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس کا کاروان ایک رہنما کی تلاش میں تھا۔ اس کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک معمار کی ضرورت تھی جو ان پر ایک قصر تعمیر کرے۔ ایسے نازک وقت میں اس کے انتظام کی باگ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کے سپرد کی گئی۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ نیا تجربہ ہدف اعتراض بنا ہوا تھا لیکن خان صاحب نے اپنے دور صدارت میں اس کو مرکز ستائش بنا دیا۔ استہزا آمیز قہقہوں کی گونج ہوا میں دفن ہو کر رہ گئی اور ہر طرف سے قدر کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں اپنے وطن اور نونہالان وطن کا سچا درد ہے اور ان کے تجربوں نے ان میں "یقین محکم" پیدا کر دیا ہے — وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ترقی تعلیم، مادری زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں پوشیدہ ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ کے فرمان مبارک کی تعمیل میں (۱۹۲۴ء) صدارت کا جائزہ لیتے ہی انھوں نے جامعہ کے تمام پہلوؤں کی جانب توجہ کی۔ ملحقہ کالجوں کے قیام سے عثمانئین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ موجودہ شعبوں کو ترقی دی گئی اور نئے شعبے کھولے گئے۔ ایک "اسٹاف کلب" قائم کیا گیا جس کی ترقی یافتہ صورت اب بھی "یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے موجود ہے، کیمیا، ریاضی اور طبعیات کے تجربہ خانوں نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی اور ان کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ہر ایک جامعہ کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حیاتیات اور نباتیات کے دبستانوں کا افتتاح ہوا اور جدید طریقوں پر ان کے تجربہ خانے قائم کئے گئے۔ عمرانیات کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ فلسفہ، اردو، فارسی اور ریاضی کے ام، اے اور طبعیات، کیمیا، نباتیات اور حیاتیات کے ایم ایس سی کی جماعتیں کھولی گئیں۔ ام، اے اور ایم ایس سی میں تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی رہنمائی کے لئے اساتذہ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی اور اس کے بعد بھی تحقیقاتی کام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے وظائف جاری کئے گئے۔ جامعہ سے دو بلند پایہ رسالے نکلنے لگے۔ مجلۂ عثمانیہ میں طلبہ اور اساتذہ کے علمی و ادبی مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اور مجلہ تحقیقات علمیہ میں صرف نتائج تحقیق۔

ان طلبہ کے لئے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ممالک جانے کا خیال رکھتے ہوں، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ان میں طلبائے جامعہ کے علاوہ، اساتذہ اور بیرونی اصحاب کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی۔

کتب خانہ کی جدید تنظیم کر کے اس میں جدید ضروریات کے تحت ہزاروں کتابوں کا اضافہ کیا گیا تا کہ اس کا ذخیرہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبہ، اساتذہ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکے۔

ان کے دورِ صدارت میں جامعہ عثمانیہ کھیل کے میدانوں کا بھی مرد رہا۔ کھیل کے موزوں میدانوں کی عدم موجودگی کے باوجود وہ ہر سال پیہم کامیابیاں حاصل کرتا رہا اور مختلف بیرون خانہ اور اندرون خانہ کھیلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔ خصوصاً فٹ بال اور اس کے بعد چند سال تک کرکٹ کا معیار اس قدر بلند ہو گیا تھا، جس کا ردِّعمل آج کل نظر آتا ہے۔

ان کی کوششوں سے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں کئی ذیلی بزمیں قائم ہوئیں جو انجمن اتحاد کے علاوہ اپنے اپنے حلقہ میں علمی خدمات انجام دیتی ہیں۔ کلیہ کی مرکزی انجمن کے علاوہ اقامت خانوں میں بھی انجمنیں قائم تھیں جو معاشری اور علمی مشاغل میں معروف رہتی تھیں۔ ان تمام انجمنوں اور بزموں کے انتخابات موجودہ جمہوری طریقۂ انتخابات کے تحت عمل میں لائے گئے تاکہ طلبہ میں حرکت و حیات پیدا ہو اور وہ تربیت حاصل کر کے مستقبل کی جد و جہد میں کامیابی کے ساتھ حصہ لے سکیں۔

تجربہ بڑھانے کے لئے طلبہ کو ذمہ دارانہ خدمات دی گئیں۔ انجمنوں، اقامت خانوں اور مجلۂ عثمانیہ کے تمام کاروبار اساتذہ کے زیرِ نگرانی ان کے ہی سپرد کئے گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی سفر کے مواقع بہم پہنچائے گئے کہ بیرونِ ملک کی تحریکات سے واقفیت حاصل کی جائے۔

وطن سے باہر۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب جب یونیورسٹی کالج لندن کی جوبلی میں شرکت کے لئے لندن گئے تو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے متعلق ایک وسیع پروپگنڈا کیا اور ان کے خلوص و صداقت نے ان گنت دلوں میں جامعہ عثمانیہ کی عزت و احترام کے جذبات پیدا کر دیئے۔ انھوں نے مختلف جامعات یورپ کے اربابِ حل و عقد کے سامنے جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی نقطۂ نظر کی وضاحت کی جس کا نتیجہ خوش آئند نکلا۔ ڈاکٹر رضی الدین نے جو اس وقت وہاں موجود تھے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

> "میں بعض ملاقاتوں میں شریک تھا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں کہیں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی جامعہ کی عزت میں اضافہ ہو گیا ــــــ"

اب جب کہ یورپ کی تقریباً تمام جامعات نے رفتہ رفتہ ہماری جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کر لیا ہے ــــ کون نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کی محنتوں کا کافی دخل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی کئی کانفرنسوں اور مجالس میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی اور ہر جگہ اپنی لیاقت اور جامعہ کی افادیت کا سکہ منوا لیا۔

یہ سب کام انجام نہ پا سکتے اگر؟ داخلی استحکام کے علاوہ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی اپنے وقت کا کافی حصہ صرف کیا۔ وہ مجلس اعلیٰ اور مجلس رفقاء کے رکن اور وضع اصطلاحات کی کئی مجالس کے صدر رہ چکے ہیں۔ اور ۱۹۳۶ء میں شعبہ سائنس کے میر شعبہ منتخب کئے گئے۔ غالباً یہ امر اکثروں کے لئے باعثِ تعجب ہوگا کہ انتظامی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ایم ایس سی کے طلبہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ چنانچہ وداعی جلسہ کے موقع پر جو طلبائے جامعہ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا سپاس نامہ کے جواب میں کہا:ــــ

> "میں خدا کا بے حد ممنون ہوں کہ اس نے مجھ کو اعلیٰ تعلیم اور ملک کی دیگر اہم خدمات ادا کرنے کے غیر معمولی مواقع عطا فرمائے۔ شاید میں ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکتا، اگر مجھ کو ان کے ساتھ ساتھ ہمت اور عزم اور غیر معمولی صحت جسمانی بھی عطا نہ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ میں باوجود انتظامی کاروبار کے آپ کا

معلم بھی رہا ہوں اور اعلیٰ جماعتوں کے درسوں کی تیاری کا لطف (جس کا صحیح اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو تعلیم کا حقیقی معنوں میں دلدادہ ہے) سالہا سال تک اٹھایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کلیہ میں میری صدارت کے زمانے میں اتنے نئے شعبے اور انتہائی تعلیمی جماعتیں کھولی گئیں اور ریسرچ کا مشکل کام جس کا ہمارے پاس سابق میں فقدان تھا نہایت آسانی کے ساتھ انجام پاتا رہا۔ ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ ریسرچ جرنل کی پہلی جلد جب شائع ہوئی ہے تو اربابِ تنقید نے اس کا جس خوبی سے خیر مقدم کیا' اس سے جامعہ کا ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کام انجام نہ پا سکتے' اگر میں طلبہ اور اساتذہ کو اپنا ہمنوا اور حقیقی معنوں میں شریک اور ساتھی بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔"

حسنِ انتخاب۔ مستحق اور قابل طلبہ کے ساتھ خان صاحب کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں۔ ان کی جوہر شناسی کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ انھوں نے جن طلبہ کو یوروپی وظائف کے لئے منتخب کیا انھوں نے ملک سے باہر اپنے اعزاز کے ساتھ جامعہ کے اعزاز میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ انھیں جب کبھی موقع ملا تو انھوں نے طلبہ کی رہنمائی کے لئے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا جن کے دل میں جامعہ اور اس کے فرزندوں کا درد ہو۔ چنانچہ ان کے عہدِ صدارت میں اکثر عثمانیین کا تقرر جامعہ کے عہدوں پر ہوا اور اس طرح جامعہ کے فرزندوں کے لئے اپنی مادرِ علمی کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ نہ صرف ان عثمانیین کی ہمت افزائی کا باعث ہوا جن کی لیاقت اور قابلیت دوسروں کے لئے رہبری کا کام دے سکتی تھی بلکہ جامعہ کو بھی ایسے لوگ مل گئے جنھوں نے اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور جامعہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہ سر بہ فلک عمارتیں ——— یہ مینار و گنبد !! کالج کی عمارتیں شہر میں بکھری ہوئی تھیں۔ تعلیمی نظام الاوقات کی پیچیدگیوں کے علاوہ اس کی وجہ سے طلبہ کی برادری میں یک جہتی کا ماحول پیدا کرنے کے لئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ عثمانیہ کا خاص تمدن شہر کے شور و شغب میں اس انداز سے نشو و نما نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنی ایک علحدہ صورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے مولوی عبدالرحمن خان صاحب نے جامعہ کے اربابِ اقتدار کو بار بار اس کی جانب متوجہ کیا اور نہ صرف لفظی اور تحریری حد تک بلکہ عملی طور پر بھی اس سلسلے میں سعی کی۔ چنانچہ اڈک میٹ میں جامعہ کی منتقلی ان کی متواتر اور پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے جامعہ کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عارضی بلدالجامعہ کی تعمیر میں اپنے تجربات کی مدد سے قیمتی مشورے دئے اور اس کو اپنی نگرانی میں بسایا ——— جب تک جامعہ کی سر بہ فلک عمارتوں کے مینار و گنبد پر علم کا پرچم لہراتا رہے گا' ان کے در و دیوار عبدالرحمن خاں کے احسانات کا ترانہ خاموشی کے ساتھ الاپتے رہیں گے۔

"لڑکھڑاتی زبان"۔ یہ چند باتیں بر سبیل تذکرہ لکھ دی گئی ہیں ورنہ ان کی خدماتِ جامعہ پر ایک مستقل تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی خدمتیں اتنی محدود نہیں ہیں کہ صرف چند صفحوں پر بیان کر دی جائیں۔ ان کی یہی مخلصانہ خدمات تھیں جن سے متاثر ہو کر "سپاس نامہ" کے ذریعہ طلبائے جامعہ نے "لڑکھڑاتی زبان" سے کہا تھا کہ :-

"جامعہ عثمانیہ کی تشکیل اور اس کا قیام جامعاتِ ہند میں ایسی اجتہادی کوشش ہے جس کی علم برداری اور قیادت معمولی استعداد کے رہنما سے ممکن نہ تھی۔ پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں ہماری جامعہ نے مختلف ابتدائی دشوار گزار مراحل طے کر کے ہم عصر جامعات میں ایک اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی توسیع و ترقی اور اس کی

نشو و نما میں یوں تو بہت سے حضرات نے حصہ لیا، لیکن صدر کی حیثیت سے آپ نے دس سال کی مدت میں جن سچے جذبات اور اعلیٰ احساسات کے ساتھ جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں وہ جامعہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں ــ"

اس امر سے ہر شخص واقف ہے کہ جس وقت جناب والا نے کلیہ جامعہ عثمانیہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کلیہ کی حالت بالکل معمولی تھی، لیکن عالی جناب کی خدمت کا دور شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے اس کے فرزند مختلف محکموں میں طرح طرح کی خدمتیں انجام دینے کے قابل بن گئے۔ اس کے علاوہ ایک سب سے زیادہ خوش گوار اور حوصلہ افزا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کلیہ کے قابل فرزند اپنے اپنے مضامین میں کمال پیدا کرنے کے بعد اسی کلیہ میں معلمی کی کرسیوں پر متمکن ہونے لگے۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی ہمت افزائی عالی جناب کا مستقل نصب العین رہا ــ"

متعلم و معلم کے تعلقات کا مسئلہ نہایت نازک اور اہم ہے۔ اس رشتہ کا حقیقی معنوں میں قائم رکھنا بڑی حکمت عملی اور بلند حوصلگی کا کام ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ادارہ کے نظام کو بلند اور اعلیٰ اصول کے ساتھ قائم رکھنے کی کوشش کے دوران میں ارباب حل و عقد کو متعدد الجھنوں میں پھنس جانا پڑتا ہے، لیکن جناب والا کے حسنِ انتظام نے ثابت کر دیا کہ ایک صاحب رائے اور مدبر انسان، ایک ایسی درس گاہ کو بھی جس میں تقریباً سات آٹھ سو طالب علم تعلیم و تربیت پاتے ہوں بہ طریقِ احسن چلا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے صحیح نصب العین کو سمجھ لے۔ ایسے اہم کام کو آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، اس کا ثبوت کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ارتقا میں ملتا ہے ــ"

ہمارے کلیہ کی ترقی و توسیع اور اس کے طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور ان کے اخلاق و کردار کی درستی میں جناب والا نے جو کامیاب سعی فرمائی، وہ قابلِ ستایش ہے۔ ہم طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ کسی طرح اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری فلاح و بہبود اور بھلائی کے لئے عالی جناب نے محض ہمارے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی تکلیف اور ایثار سے کبھی دریغ نہیں فرمایا ــ"

طلبائے قدیم کی جانب سے بھی نواب فخر نواز جنگ بہادر نے ان کی اعلیٰ خدمات کا اسی طرح اعتراف کیا، اور اساتذہ صاحبان نے بھی ان کے حسن انتظام کو سراہتے ہوئے ان کی جدائی پر ملال کا اظہار کیا۔ ان تمام کا جواب دیتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے کہا تھا کہ:۔

"اگرچہ میرا تعلق اب جامعہ اور علی الخصوص کلیۂ جامعہ عثمانیہ سے منقطع ہو گیا ہے لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جہاں کہیں رہوں گا آپ کا اور جامعہ کا بہی خواہ رہوں گا اور آپ کے ارتقاء کو دیکھ کر خوشی حاصل کروں گا ــ"

یہ ہے ان کا مستحکم کردار ــ ایک باغبان جس نے اپنے ہاتھوں باغ کو سجایا ہو دور رہ کر بھی اس سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔

میں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران میں دیکھا ہے کہ وہ جامعہ کی ترقی سے مسرور ہوتے ہیں اور اس کے متعلق جب کبھی کوئی مایوس کن خبر ملتی ہے تو ان کے چہرہ پر بھی مایوسی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

احساسِ پستی کی شکست۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور دوسرے جلسوں میں انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعے سے بار بار اس کا یقین دلایا کہ اردو میں سائنٹفک علوم کی تعلیم بآسانی دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے عملی طور پر بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ ترقیٔ اردو کی تاریخ میں اس بیان کے بغیر ایک کمی رہ جائے گی کہ سائنٹفک علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے اولیں علمبرداروں میں مولوی عبدالرحمن خاں صاحب بھی ہیں۔ اگر وہ اس احساسِ پستی کو کہ اردو علمی و فنی علوم کے بار کی حریف نہیں ہو سکتی' دلوں سے نہیں نکال دیتے تو ممکن تھا کہ ایک زمانہ تک ہماری قومی زبان جو اپنی فطرت میں ایک لچک رکھتی ہے' افسانوں اور شاعری کے ذخیروں ہی میں دبی رہتی۔

تخلیقِ ادبیات کا دھارا۔ انھوں نے نہ صرف اردو کے علمی اور فنی پہلوؤں کو روشن کیا بلکہ تخلیقی ادب کو ترقی دینے میں بھی کوشش کی۔ چنانچہ عثمانیئن میں شاعری' افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کا شوق' ان ہی کی حوصلہ افزائیوں اور ذاتی دلچسپیوں کا مرہونِ احسان ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں بزمِ ڈرامہ ان ہی کی انفرادی کوشش اور بعض دوسرے اہلِ ذوق اصحاب کے تعاون سے قائم ہوئی اور اس بزم کی وجہ سے حیدرآباد میں اردو ڈرامہ نے جو فنی اور ادبی لحاظ سے ترقی کی ہے' اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ان کی صدارت کے زمانے میں کئی ایک اُردو ڈرامے جامعہ عثمانیہ کے اسٹیج پر کھیلے گئے اور ان کا اثر رفتہ رفتہ ان ڈرامائی کوششوں کا باعث ہوا جو آج کل وسعت اور امتیاز کے ساتھ جاری ہیں۔

کیا محض یہی؟ ایک بڑے ادارہ کے انتظامی کاروبار کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود انھوں نے تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت نکالا۔ ان کی اکثر تصانیف علمی دنیا میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ انھوں نے نور کی عملی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لئے علم المناظر کا ایک مفید آلہ بھی ایجاد کیا جس کے متعلق "جرنل آف سائنٹفک انسٹرومنٹس لندن" بابتہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تفصیلات شائع ہوئیں اور جس کو میاں چسٹر کے مسرس فلاٹرس اور گارنٹ تیار کرتے ہیں۔ ان کے بلند پایہ مضامین ہندوستان' یورپ اور امریکہ کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جامعہ کے لئے انھوں نے طبیعیات کی متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں آواز اور برق کے متعلق ان کی مترجمہ کتابیں اور ضمیمے اپنی جامعیت اور طرزِ بیان کی وجہ سے اس فن کی بہترین کتابوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ ریاضی سے متعلق بھی ان کی تالیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان سائنٹفک تحریروں کے معیار کے متعلق تو کوئی سائنس داں ہی بہتر رائے دے سکتا ہے' جہاں تک مجھ جیسے ناواقفِ سائنس کا تعلق ہے میں اس کے صرف ایک پہلو کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر سکتا ہوں اور وہ پہلو ان کا طرزِ ادا ہے۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے سائنس جیسے خالص فنی مضمون کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ ایک عامی بھی اس کی بعض اصطلاحوں سے واقف ہو کر اپنے لئے آسانی سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

یوں تو ان کی اکثر تحریریں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں' شائع ہوئی ہیں۔ چنانچہ "سب رس" کے کسی گذشتہ شمارہ میں ان کا مضمون "دورِ حاضرہ کے خطرات اور ان سے بچنے کی تدبیریں" نوجوانوں کے لئے ایک قیمتی پیام ہے' لیکن ان کا ڈرامہ

"ضمیمہ" ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے' ان کی نظر کی وسعت اور ان کی قدرت زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر کس قدر حاوی ہیں۔ "ضمیمہ" کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری کی تنقید "سب رس" کے پہلے شمارہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ان کی یہی غیر معمولی علمی وجاہت ہے جس کے باعث وہ امریکہ کی انجمن محققین شہاب ثاقب' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ اور بزم تشہیر سائنس کے رکن اور حیدرآباد کی سائنس ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے اور کئی عظیم الشان جلسوں اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۹۲۱ء کی صدارتیں ان کے تفویض کی گئیں۔

اب !!۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے صدارت کلیہ جامعہ عثمانیہ سے سبکدوش ہوتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

"میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ بقیہ عمر علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں صرف کروں' جامعہ کے باہر انفرادی کوشش سے اس قسم کا کام ہونا بہت مشکل ہے' لیکن ایک شخص کے لئے جس نے عمر بھر ہر حالت میں طالب علمانہ زندگی بسر کی ہو ایسے طریقۂ زندگی کا لطف ہی بالکل نرالا ہے"

چنانچہ وہ ہمیشہ علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی صدارت اور نظام کالج کی پروفیسری کے دوران میں تعلیمی مسائل سے ان کی ذاتی دلچسپی نے کئی تجربے حاصل کئے اور ناممکن تھا کہ ایک ہستی جس کی زندگی دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے عبارت ہو خاموش رہتی۔ چنانچہ وہ اپنے وسیع تجربوں سے مختلف تعلیمی اداروں کو مستفید کررہے ہیں۔ مدرسۂ آصفیہ' اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد اور مدرسہ اعزہ جیسے ترقی پرور اور کامیاب مدارس ان کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

اس سال وہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں اور کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ ان کی قابلانہ رہنمائی میں یہ کانفرنس جس نے ملک وملت کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں' اپنی گذشتہ روایات اور عظمتوں کو پھر حاصل کرلے گی۔

وہی کسوٹی۔ وہی جانچ۔ ہر چند میں نے اپنی وہ ذمہ داریاں بہ احسن الوجوہ پوری نہیں کیں جو مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کے کارناموں پر قلم اٹھانے سے عائد ہوجاتی ہیں۔ تاہم اجمالی طور پر میں نے ان کی باعمل زندگی اور ان کے قیمتی لمحوں کا ایک تصور پیش کردیا ہے۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ میں نے جس نام کی حقیقی عظمت اس کے کاموں میں تلاش کی ہے وہ ایک باعظمت ہستی ہے یا نہیں؟ —— "نہیں" کا گمان تک نہیں کیا جاسکتا۔

میکش

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن



سیّد رضی الدّین حسن کیفی

کیفی کی نظمیں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں

سرزمینِ دکن اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے۔ اس کی خاک سے سیکڑوں جگمگاتے تارے طلوع ہوئے جو آسمانِ شاعری پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ تحقیقات پوشیدہ سرمایوں پر سے نقاب اٹھتی جا رہی ہیں اور جیسے جیسے یہ نقاب اٹھتا جا رہا ہے حیرانیوں کے جلو میں نئے نئے انکشافات رونما ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ خیال بھی کہ قدیم دکھنی شاعری "گل و بلبل" کے بے سروپا افسانوں کا ایک طومار ہے' دُور ہوتا چلا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ' بانیٔ حیدرآباد کا ضخیم دیوان ثبوت دے سکتا ہے کہ آج سے تین سو برس پہلے کا دکنی شاعر بھی فطری شاعری سے غافل نہیں تھا۔ جذبات و احساسات صرف محبت سے متحرک نہیں ہوتے۔ زمانے کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں موضوع بھی بدل گئے ہیں لیکن شاعر کے دل کی دھڑکنیں اب بھی ان ہی احساسات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں جن کا وجود انسانی نفسیات کے باعث ناگزیر ہے۔ مبالغہ اور تصنع سے ہٹ کر صداقتِ شعری جن تخیلات کی تخلیق کرتی ہے وہ کہیں پست ہو کر اور کہیں بلند ہو کر دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کارواں منزل کی طرف

شوریت تھی، شاعر تھے، لیکن شاعری میں ایک جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ تخیلات تغزل اور تصوف میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ مشاہدہ و نظر کی حدیں زندگی سے دُور ہو کر خیالی دنیا میں محصور ہو گئی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سر سید احمد خاں کی حیات آفریں تحریکات نے قومی احساس پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا ۔۔ اور ناممکن تھا کہ شاعر جس کی اعجاز بیانی بعض وقت "جزو یست از پیغمبری" بن جاتی ہے اس حقیقت حال سے چشم پوشی کرتا۔ اس کی دنیائے اردو نے ایک کروٹ لی ۔ چند رندِ بدست "خیالی شاہد و شراب" کی محفل سے اٹھے اور انھوں نے قدیم پیالوں میں نئی شراب چھلکانی شروع کی۔ اس جرأت رندانہ کے ساتھ اٹھنے والوں میں مولوی حالی سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

دکن میں کیفی کی شاعری کا بول بالا تھا۔ فیض کے اثر، میکش کے تصوف اور داغ کے تغزل اور لطف زبان کے امتزاج سے انھوں نے اپنی شاعری میں ایک خاص رنگ پیدا کر لیا تھا۔ یاس کی وطنیت سے وہ متاثر ہی تھے۔ ایسے وقت حالی اور اکبر کے نغمے ایک پیام بیداری لئے ہوئے دکن میں پہنچے۔ اور ولی کے وطن کا یہی آزاد منش سپوت تھا جس نے سب سے پہلے ان نغموں میں اپنے ارتعاش دل کو جذب کر دیا اور اس طرح دکن کی موجودہ شاعری کا محرک اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

سر سید کی بانگ درا نے حیدرآباد میں بھی قومی خدمت گزاروں کا ایک کارواں پیدا کر دیا جو جستجوئے منزل میں سرگرم سفر ہو گیا۔ اسی کاروان میں کیفی بھی شریک ہو گئے۔ بعض ہمدرد اہل ملک کی کوششوں سے جب ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی تو اس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں کیفی کی نظمیں حرکت و حیات کی لہر دوڑا دیتی تھیں اور سننے والے ایک عزم عمل کے ساتھ محفل سے اٹھتے تھے۔

شاعر کی آواز در اصل دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ پھر کیفی جیسے شاعر کی آواز جس کے جذبات و احساسات کی عظمت ہزار ہا دلوں میں پوشیدہ تھی کس طرح بے اثر رہتی؟ چنانچہ دکن کے علمی نشاۃ ثانیہ کی ساری ہنگامہ آرائیوں میں ان کے ترنم نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

تصویر کا تاریک رخ

دار العلوم کی شصت سالہ جوبلی میں جو نواب سالار جنگ بہادر کے زیر صدارت منائی گئی تھی کیفی نے ایک طویل لیکن اثر آفریں نظم سنائی۔ اس نظم میں ایک جگہ انھوں نے موجودہ شاعری کے متعلق اپنے تصور کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

جو غزل گو ہیں وہ شہدے ہیں قصائد گو ہیں بھاٹ مرثیہ گو ہیں شکم پرور، رباعی گو خراب
شاعری کی علتِ غائی ہوئی تفریحِ طبع اور اب تفریح کے سامان ہیں بے حد و حساب
اک زمانہ تھا کہ شاعر صاحبِ تاثیر تھے آگ باگ ان سے کوئی ہوتا تھا کوئی آب آب
شاعر اپنے عہد کے لوگوں کی ہے گویا زباں لوگ جیسے ہوں گے اس کے شعر ہوں گے انتخاب
شاعری کا رنگ بھی بدلا زمانہ کی طرح زلفِ شب گوں کٹ گئی پھیکا پڑا لعلِ خوش آب
اب جو شاعر رہ گئے ہیں ان کی حالت ہے عجیب تین میں گنتی رہی، ان کی نہ تیرہ میں حساب
جذبہ و تاثیر و تخئیل و تلاشِ فکرِ شعر خود بخود گم کیوں نہ ہوں جب ہو دماغ و دل خراب

"دل و دماغ" کی اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے شاعروں کو ایک نئے راستے کی طرف گام زن کیا اور اس طرح قومی و ملی شاعری کے ذریعے اصلاحِ قوم کی طرف توجہ کی۔

تعلیم نامہ

جب حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ جلسہ ۴ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ کو زیر صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، منعقد ہوا تو باغ عامہ کے ٹاؤن ہال میں کیفی نے ایک ممتاز مجمع کے روبرو اپنی قومی نظم "تعلیم نامہ" سنائی۔ عشق و محبت کی داستانیں سنتے سنتے لوگ اکتا گئے تھے اور جب یہ نئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو گویا وہ چونک سے گئے۔

کیفی نے اس نظم میں تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نظم کی ابتدا میں وہ اربابِ ملک کے جمود کا خیال کر کے مایوس نظر آتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں یقین آفرینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

سنو میری سنو، توبہ گناہوں کی خدا شاہد کہ ہو سکتا ہے جو تم سے کسی سے ہو نہیں سکتا

وہ نمود و نمائش کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے بلکہ کمال کو عظمت کا سبب قرار دیتے ہیں اور اپنی ملت کو کمال حاصل کرنے کے لئے نصیحت کرتے ہیں۔

کمال انسان کو عالم سے کر دیتا ہے مستغنی خدا کے واسطے اے بھائیو سیکھو کمال اپنا

اس کے بعد وہ علم کا حقیقی تصور پیش کرتے ہیں اور تصور کی وضاحت کے پردے میں وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی مستقبل شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ علم کا نصب العین، ملازمت کے تنگ دائرہ کا پابند ہو گیا تھا اور حیات کے دوسرے شعبوں کی طرف کوئی رخ کرتا نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح اشاعتِ تعلیم کا مفہوم، تعلیم یافتہ بے روزگاری میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کیفی، اس نظم کے ذریعے سے علم کے کردار ساز مقصد کو واضح کرتے ہوئے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل کے متعلق کہتے ہیں۔

یہ سب کچھ سچ ہے کیفی کوئی تم سے یہ اگر پوچھے کہ بچوں کو کہاں کس طرح سے کیوں کر پڑھائیں کیا
جواب ایسے سوالوں کا نہیں ہے بحث سے خالی اسی کے واسطے قائم ہوئی ہے انجمن اس جا
کہ اہل الرائے و اہلِ علم و فضل و دانش و بینش اکٹھے ہو کے سوچیں ہم کو کرنا ہے کیا کیا؟
اسی دھن میں کئی دن سے تھے ہمدردانِ تعلیمی کہ اپنے ملک میں بھی ہو کمالِ علم کا چرچا
خدا کا شکر ہے تجویز اب یہ راس آئی ہے اسی کا آج یہ جلسہ ہوا ہے منعقد پہلا

غرض اس سے یہ ہے ہم کام کچھ کرنے لگیں ایسے کہ جن سے ہو ترقی حالتِ موجودہ میں پیدا

جامِ حیدری "تعلیم نما" کا اتنا اثر ہوا کہ اربابِ کانفرنس کے غیر معمولی اشتیاق کے پیشِ نظر راے بالمکند آنجہانی بی۔ اے کی خواہش پر جو اس وقت رکن ہائیکورٹ تھے کیفی کو اس کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ایک فی البدیہہ نظم سنانی پڑی۔ اس نظم کو سر اکبر حیدری کے نام سے معنون کیا گیا جس کے لئے سر اکبر نے کیفی کا تحریری شکریہ ادا کیا۔

پلا دو جامِ صہبائے کرامت ریز اے ساقی جھلک جس کی ہو مہر شان قطرہ جس کا ہو دریا

اس رندانہ ابتدا کے بعد وہ نظم کے آخری اشعار میں کانفرنس کے متعلق کہتے ہیں کہ

رہے تا دورِ ثانی آج کا جلسہ نگاہوں میں جو تجویزیں ہوئی ہیں پاس رکھنا پاس کچھ اُن کا

نگاکر اس کا چرکا اپنا ہم مشرب بنا لو تم جہاں مل جائے کوئی بھی ہو ہندو کیا مسلم کیا؟

آخری مصرعہ سے ان کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعر کا مذہب تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے‘ اس لئے اگر کیفی نے "کفر و ایمان" کو ایک ہی "مذہبِ انسانیت" کے دو مختلف شعبے خیال کئے ہوں تو اس نقطۂ خیال کی وسعت کو کون شک کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ واس کے علاوہ "ہندو کیا مسلمان کیا؟" میں ایجوکیشنل کانفرنس کا لائحہ عمل بھی پوشیدہ ہے اس لئے کہ یہ کانفرنس بلا تفریقِ مذہب و ملت کام کرنا چاہتی ہے۔

اس نظم سے کیفی کی روانیِ طبع کا پتہ بھی چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کس قدر موزوں‘ ان کی نظر کس قدر وسیع اور ان کی فکر کس قدر بلند تھی!

ناندیڑ میں صدا ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے ہی جلسے نے بلدہ میں ایک علمی چہل پہل پیدا کر دی اور اس کی تحریکوں نے بلدہ سے بڑھکر اضلاع کو بھی اپنے آغوش میں لینا شروع کیا۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارا ملک آج سے پچیس برس پیچھے تھا‘ شہر کے خوابیدہ باشندے نقل و حمل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی وجہ سے خارجی اور داخلی تحریکات سے ایک حد تک واقف ہی رہتے تھے۔

اس لئے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہی وہ انگڑائیاں لینے لگتے تھے لیکن دیہات کے ناواقف باشندوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

چنانچہ اس کانفرنس کا ایک وفد ناندیڑ گیا اور وہاں اس نے ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں بھی کیفی نے ایک نظم سنائی جس کے ذریعے سے انھوں نے کانفرنس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور اربابِ ناندیڑ کو ترقیِ تعلیم کی جانب متوجہ کیا۔

وہ ماضی پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

باتوں میں آج تک تو بہت وقت کھو چکے وہ وقت جا چکا وہ زمانہ گذر چکا

اب وقت آگیا ہے کہ ہمت کریں بلند ہر طرح اپنے ملک کی خدمت کریں ادا

اس کے بعد تعلیم کے مفاد کی وضاحت کے ساتھ ان محرومیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو تعلیم کے نہ ہونے سے اہلِ ملک کو نصیب تھیں۔

تعلیم پر ہے دار و مدارِ ترقیات تعلیم سے ہے نشو و نمائے گلِ بقا

تعلیم عام ہو تو ترقی نصیب ہو پھولے پھلے نہالِ طرب‘ نخلِ مدعا

تعلیم کے نہ ہونے سے ایسے ہوئے تباہ سرمایۂ سلف بھی تو ہم نے گنوا دیا

صنعت ہی وہ رہی نہ تجارت ہی وہ رہی ہیں اہلِ ملک جہل سے محتاج یا گدا

آخر میں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے رجحانات کو ظاہر کرتے ہوئے تعاونِ عمل کی اپیل کرتے ہیں۔

تعلیم عام کے لئے جلسے ہیں جا بجا کی ہے تو جہ از سرِ نو اہل ملک نے

"از سرِ نو" کہہ کر ماضی کی عظمتوں کی یاد دلائی ہے۔

۱ قائم ہے پایۂ تخت میں تعلیمی انجمن صدر اس کے حیدری ہیں سکتری ہیں مرتضیٰ خود دیں گے دوسروں سے دلائیں گے کچھ ہندو بھی ہو تو کیا ہے مسلماں بھی ہو تو کیا

۲ ناندیڑ میں بھی چاہیئے اک ایسی انجمن جو اس کی بے غرض ہو وہی اس کا مدعا سب جانتے ہیں قول جہاں کی ہو اس نے کام آ سکا وہاں بھی یہاں بھی لیا دیا

۳ اب اہل ملک حوصلہ مندی دکھائیں گے اپنی مدد خود آپ کریں گے بلا ریا اے اہلیانِ خطۂ ناندیڑ، دیتے جاؤ سمجھے تم اس کلام کو درویش کی صدا

رایت علم ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ میں جو مولوی شیخ حبیب الدین صاحب مرحوم بی اے صدر محاسب سرکار عالی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا کیفی نے پہلے جلسہ کی طرح ایک پر جوش نظم سنائی۔ یہ جلسہ اورنگ آباد میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوا تھا اورنگ آباد جیسے شہریت نواز اہم تاریخی مقام پر کیفی کا یہ نغمہ مستقبل کے لئے ماضی کی ایک آواز بازگشت تھا۔

اس نظم کی خصوصیت اس کا غیر معمولی جوش ہے۔ الفاظ سے بھی رجائیت کا جذبہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ابتدا، کی طرح ان میں قنوطیت نہیں پائی جاتی بلکہ حالات کے نقشے کو بدلتا ہوا دیکھ کر توقع اور یقین نے ناامیدیوں کو ٹھکرا دیا ہے۔

۱ ہم نے کیا ہے رایتِ علم و ہنر بلند آ جائے اس کے سامنے پست، ہر بلند پست و بلند دہر پہ شاہد ہے آفتاب ہے وقتِ شام پست تو وقتِ سحر بلند

۲ ہم کون ہیں ترقیٔ تعلیم ملک خواہ آواز جن کی پست ہے جن کی نظر بلند ہر فرد قوم قوم ہے کیا خورد کیا بزرگ اب اس میں پست قد ہو کوئی یا ہو سر بلند

۳ پستی بھی کام کی ہے بلندی بھی کام کی کب ہے جب کہ پست وقت پہ ہوں وقت پر بلند فی الجملہ ہم سلیقے سے جڑ جائیں ایک دگر تو پست ابتدا کی بھی نکلے خبر بلند

وہ حاضرین کی نفسیات کا مطالعہ کر کے اپنی طویل نظم کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک داستان سناتے ہیں اور اسی داستان سے تشبیہ کا بھی کام لیتے ہیں۔

۱ تم نے سنی ہے ایک افیمی کی داستان جس سر نگوں کے قصر کے تھے بام و در بلند نوکر سے اپنے اس نے کہا دیکھ کیا گرا؟ کیا بات ہے؟ ہوا ہے یہ کیا شور و شر بلند

۲ پینک میں ایک روز گرا اپنے بام سے آواز ایک دھم سے ہوئی مختصر بلند نوکر نے عرض کی کہ میاں آپ ہی گرے فرماتے ہیں یہ سن کے وہ آقائے سر بلند

۳ "جب ہم گرے تو ملتے بڑی سخت چوٹ آئی شور و بکا و گریہ ہوا بیشتر بلند"

توقع اور یقین کی دنیا میں بھی وہ ایک وقت گھبرا جاتے ہیں اور اس کی وجہ ان کا احساس پستی نہیں بلکہ ان لوگوں کی بے حسی ہے جن کو وہ "بے درد گوش ناشنوا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

بے درد گوش ناشنوا کہتے ہیں "خموش" خشائے درد دل ہے کہ "فریاد کر بلند" بیٹھا ہوا گلا ہے تو فریاد کیا کریں کیوں کر ہو کوئی طائرِ بے بال و پر بلند

فریاد میری کون سنے بے ٹھکانہ ہوں گویا کہ ایک طوطیٔ نقار خانہ ہوں

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔

ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اس انجمن کے لوگ پیدا ہوں جس کے ملک میں ہر ایک فن کے لوگ سرسبز ابر علم سے ہو کشورِ نظام ہوں بہار فضل و کمال اس چمن کے لوگ

یہ عام کوشش ہیں کہ تعلیم عام ہو سانچے میں علم و فن کے ڈھلیں سب دکن کے لوگ وہ وقت جلد آئے خدا وہ بھی دن دکھا جس دن کی آرزو میں ہیں اس انجمن کے لوگ

کوشش کرو کہ نام کے مانند کام ہو وہ کام ہو کہ جس سے زمانے میں نام ہو

آخری بند میں اپنے ملک کی عبرت ناک حالت کا نقشہ کھینچ کر اس میں درد کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ اہل ملک کے غرور ہمہ دانی نے ان کے حوصلوں میں کس قدر خامی پیدا کر دی ہے۔

خوش خوش اسی میں ہیں کہ کچھ آتا نہیں ہمیں   سر میں سمائی ہے سرِ اہلِ دول ہیں ہم   ان چھوٹی شیخیوں میں گرفتار و خوار ہیں   اپنے دماغ کے لئے وجہِ خلل ہیں ہم
اسلامیوں کو حسن ہم آہنگ زیب ہیں   ہندو سمجھ رہے ہیں کہ اب اجنبی ہیں ہم   کب تک رہے جبیں پہ یہ ٹیکا کلنک کا   دنیا میں کیا برائے شکارِ اجل ہیں ہم

آخر میں اپنا پیام سناتے ہیں اور اس پیام کے اثر کو عملی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

زندہ دلی کا کچھ تو نمونہ دکھاؤ تم   ثابت کرو کہ صاحبِ علم و عمل ہیں ہم   دیکھو ہیں کہ شعلۂ شمعِ شعور ہیں   رخشانیِ ستارۂ صبحِ ازل ہیں ہم

پرچمِ علم

ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ جلسہ سنہ ۱۳۴۲ف میں جو زیر صدارت نواب عماد الملک مرحوم ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا کیفی نے "پرچمِ علم" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔ اور اس شان کے ساتھ سنائی۔

پہلے بند میں وہ اہلِ ملک کی بے حسی کا پھر شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن شکوہ میں گزشتہ اثرات کا بھی ایک پہلو ہے۔

آواز ہم نے چیخ کے ناحق بلند کی   چبھتی ہے دل میں چپ بھی دلِ دردمند کی   آہ دلِ شکستہ کہاں گوشِ دل کہاں   تقدیر آزماتے ہیں ٹوٹی کمند کی
سُن لیجئے یہ ایک دکھی کی پکار ہے   صورت تو زہر کی ہے حلاوت ہے قند کی   سن لی جو بات آپ نے احسان آپ کا   سن کر کیا عمل بھی تو منت دوچند کی

عام لوگوں سے ہٹ کر ان لوگوں کا حال بھی عجیب ہے جن کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ "خود پسندی" ان کا شعار ہے اور "سستی" ان کا عمل۔

سوچو تو جہل و علم میں اب فرق کیا رہا   غفلت انھوں نے آپ نے سستی پسند کی   بے سود شاعری کی طرح وعظ و پند ہے   دیکھو جسے وہ اپنی جگہ خود پسند ہے

ان میں ایسے لوگوں کا بھی ایک گروہ ہے جن کے سروں میں "لیڈر" بننے کا سودا تو ہے لیکن ان کا جذبۂ عمل خلوص سے نا آشنا۔

ہر ایک اپنے زعم میں لیڈر ہے قوم کا   ہر ایک اپنی رائے میں اہلِ کمال ہے   پُرزور اختلاف ہے پُرجوش اغراض   دیکھو جو غور سے تو کڑی کا ابال ہے
پس یہ رفارم اور یہی ہے رفاہِ عام   اخلاص ہے حرام رعونت حلال ہے

"خود ساختہ قائدوں" کا یہ خاکہ اس قدر سچا ہے کہ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اس کے بعد ان کو اپنے وطن کے "سب سے بڑے محسن" یعنی اپنے بادشاہ کا خیال آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے احسانات اور عنایتوں کا وہ عزت واحترام کے بے پایاں جذبات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اہلِ ملک سے پوچھتے ہیں کہ کیا مالکِ مجازی کی یہ نوازشہائے پیہم اپنے اندر ایک درسِ عمل پوشیدہ نہیں رکھتیں؟ اگر احساسِ احسان مندی، فرائض شناسی میں مدد دے سکے تو وہ کہتے ہیں کہ:۔

کس حال میں ہماری ہے اولاد دیکھئے   تعلیم یافتوں کی بھی تعداد دیکھئے   ہم کس ہوا میں جیتے ہیں اس کو بھی سوچئے   کس طرح عمر ہوتی ہے برباد دیکھئے
سنجیدگی سے دل میں ذرا غور کیجئے   کیسی پڑی ہے ہم پہ یہ افتاد دیکھئے

تین سال کی اس متواتر چیخ پکار کے متعلق جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اسٹیج سے بلند ہو رہی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ:۔

کچھ نظم و نثر کی ہوئی تاثیر یا نہیں؟   کچھ آپ نے بھی سوچی ہے تدبیر یا نہیں؟   اتنے دنوں سے دیکھ رہے تھے جو آپ ہم   اس خواب کی بھی ہے کوئی تعبیر یا نہیں؟
یہ چیخ اور پکار بھی کچھ کام آئے گی   جاگے گی اہلِ ملک کی تقدیر یا نہیں؟   کب تک رہیں گے قعرِ مذلت میں سرنگوں   اٹھیں گے اپنے بل پہ زمیں گیر یا نہیں؟

اس کے بعد وہ ہمت بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مایوسیوں کے باوجود ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔

جب تک ہے دم میں دم کبھی ہمت نہ ہارنا   ٹوٹے جو کوہِ غم تو خوشی سے سہارنا   اے ممبرانِ انجمن اے بانیانِ خیر   ہم پھر یہی کہیں گے کہ ہمت نہ ہارنا
جب دکھ چکے ہیں پاؤں گزر گاہ میں   جس طرح جس طریق سے گذرے گذارنا   کیتی زمین ہمیں سفینے ہست گمش کن   تا ساعت براست بنوشان نوش کن

دامنِ آرزو

اسی سالانہ جلسہ کے دوسرے اجلاس میں سر اکبر حیدری اور نواب عماد الملک کی فرمائش پر انھوں نے یہ نظم سنائی۔ اس نظم میں کیفی نے اہل ملک کی اقتصادی حالت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں تعلیم بہت گراں خرچ ہوگئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس ایسے شریف لیکن نادار طلبہ کی اعانت کی طرف متوجہ ہوئی جو مالی الجھنوں کے باعث تعلیم کو خاطر خواہ طور پر حاصل نہیں کر سکتے۔ درد و اثر اس نظم میں جا بجا جھلکتا ہے۔ وہ فقیری کے بھیس میں تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں اور خوئے سوال کو برا نہیں سمجھتے اسی کے ساتھ سفارش کے اس عہد میں بااثر اصحاب سے اپنی گدائی کے لئے سفارش مانگتے ہیں۔

جناب حیدری صاحب ہوں یا عماد الملک　　سفارش اتنی کریں حاضرین سے اٹھ کر
کہ اس فقیر کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈالیں　　زبانِ پاک میں اللہ نے دیا ہے اثر
صدا فقیر کی گر تم سنو گے کیا ہو گا　　ذرا ادھر بھی نظر پھینکنا بھلا ہوگا

دردِ دل

کیفی سے جلنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو ان کو کسی طرح نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خلوص اور عمل کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹیں رہی ہیں۔ کیفی نے اسی جماعت کی اغیار پرستی سے متاثر ہو کر یہ نظم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے سالانہ جلسہ میں، جو زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمن خاں شیروانی آنریری سکرٹری آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۲، ۱۳ ذی حجہ کو منعقد ہوئی تھی، سنائی تھی۔ ان کو عداوتوں کا کوئی خوف نہیں اور نہ ستائش و صلہ کی پروا۔ ان کا کام خود انعام ہے۔ عید قربان کے دنوں میں ایثار و قربانی کا یہ پیکر کس شانِ استغنا کے ساتھ اپنی نظم سناتا ہے۔

خیمۂ ابر بھی ہے اوٹ میں خورشید بھی ہے　　کچھ چکا چوند بھی ہے کچھ ہوسِ دید بھی ہے
یاس کی یاس ہے امید کی امید بھی ہے　　کہ چھری تیز بھی ہے تہنیتِ عید بھی ہے
کٹنے والوں کے گلے ہیں کہ ادھر کٹتے ہیں　　حصے بخرے ہیں کہ بٹتے ہیں جدھر بٹتے ہیں
بھیڑ بکروں کو کیا ذبح تو کیا ظلم کیا　　ظلم جو اس کو سمجھتا ہے یہ ہے اس کی خطا
عید کا روز ہے ساقی مرے ساقی ادھر آ　　تیرے قربان مری جان پلا جلد پلا
کہ خیالاتِ پریشان چلے آتے ہیں　　مرے کھوئے ہوئے اوسان چلے آتے ہیں
بے خودی پردۂ اربابِ خرد ہے ساقی　　تیرے میخانے میں خیرات کی مد ہے ساقی
بے نیازانہ ادا کی کوئی حد ہے ساقی　　المدد المدد اب وقتِ مدد ہے ساقی
کب تک آخر ہدفِ اہلِ حسد کیفی ہو　　نیک ساقی ہو تو کس طرح سے بدکیفی ہو
کیوں حسد مجھ پہ کرے کوئی لیاقت والا　　کہ نہیں ہوں میں کوئی دولت و ثروت والا
ہاں مگر بات ہے اتنی کہ ہوں قسمت والا　　مرے ساقی نے بنایا ہے مجھے متوالا
بے خودی میں بھی مگر اتنی خبر رکھتی ہے　　کہ مجھے ایک زمانہ کی نظر تکتی ہے
نہیں معلوم کہ ہے مجھ سے کوئی کیوں بدظن　　آج تک میں نے کسی کو نہیں سمجھا دشمن
جانتے ہیں مجھے اک عمر سے اعیانِ دکن　　فخر ہے میرے لئے خدمتِ ابنائے وطن
للہ الحمد ملا ہے مجھے کیا خوب وطن　　حیدرآباد دکن ہے مرا محبوب وطن

آج تک امن سے چالیس برس اس میں رہا ... بزمِ عشرت میں رہا، علم کی مجلس میں رہا
نہ کھٹک بن کے کبھی دیدۂ نرگس میں رہا ... میں اسی طرح کا خود بن کے رہا جس میں رہا
عمر ہنس بول کے اب تک تو گزاری ہے یہاں ... آب و دانہ نہیں معلوم کہ لے جائے کہاں

اس کے بعد وہ اپنے وطن والوں سے یہ کہتے ہوئے کہ "خوش رہو ہم وطنو! میں نہ رہا تو نہ رہا" چند نصائح کرتے ہیں۔

ایک تو ترکِ رزائل ہے اسے یاد رکھو ... دوسرا کسبِ فضائل ہے اسے یاد رکھو
مختصر حسنِ شمائل ہے اسے یاد رکھو ... منبعِ عیب و ہنر دل ہے اسے یاد رکھو
شر بھی ہے خیر بھی ہے، مہر بھی ہے صبر بھی ہے ... بر بھی ہے بحر بھی ہے، موج بھی ہے لہر بھی ہے
بے حد و گنجِ جواہر کا تمسک سمجھو ... دل بڑی شئے ہے مری بات نہ بے تک سمجھو
برگِ گل سے بھی زیادہ اسے نازک سمجھو ... بارگاہِ صمدیت کا تبرک سمجھو
دل کسی کا نہ دکھایا تو بڑا کام کیا ... دل دکھوں کی جو خبر لی تو بڑا نام کیا
دل کشادہ ہے کبھی اور کبھی تنگ بھی ہے ... مایۂ صلح بھی ہے، معرکۂ جنگ بھی ہے
باعثِ نام بھی ہے، یہ سببِ ننگ بھی ہے ... موم کا موم بھی ہے سنگ کا یہ سنگ بھی ہے
اس سے ہے شادی و غم، عیش و الم وابستہ ... مختلف رنگ کے پھولوں کا ہے اک گلدستہ
دل میں اک درد ہے اظہار کروں یا نہ کروں ... دل سے اک آہ شرربار کروں یا نہ کروں
اپنا رخ جانبِ اغیار کروں یا نہ کروں ... نیند کے ماتوں کو بیدار کروں یا نہ کروں

دل کا رہ رہ کے تقاضا ہے کہ فریاد تو کر
نہ سنے کوئی مگر اپنا سبق یاد تو کر

چار سال کے جلسوں میں پڑھی ہوئی نظموں کا اگر ایک عمومی نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان میں تدریجی جوش کا مظاہرہ نمایاں نظر آئے گا۔ قومی زندگی کے راستے میں کیفی کے قدم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ان کا قومی جذبہ بھی ابھرتا گیا۔

افسوس ہے کہ پانچویں کانفرنس سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی آوازیں ختم ہو گئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے جو نقوش چھوڑے ہیں زمانہ کی کوئی کروٹ ان کو نہیں مٹا سکتی۔

کیفی ایک حقیقی شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میکش



زیر نگرانی

محمد حسام الدین خان غوری

مووی لینڈ

زیر ادارت

ایل۔ سی۔ یمبلا۔ بی۔ اے

صنعت فلمسازی کی اصلاح و ترقی کا علمبردار

صنعت فلمسازی کے ہر پہلو پر گرانمایہ مضامین
نگارخانوں کی رنگین و رومان خیز کہانیاں
مغربی شہکار مضامین کے تراجم
روح پر وجد طاری کرنے والی نظمیں

فلموں پر لاجواب تعمیری تنقیدی مقالات
فلمی زندگیوں کی اشک افشان داستانیں
تازہ ترین فلمی حالات و دلچسپ معلومات
اور دلپذیر و دلکش تصاویر

(سے مزین ہو کر)

ہر ماہ عیسوی کی پہلی تاریخ کو اسکا اردو ایڈیشن اور پندرہ تاریخ کو انگریزی ایڈیشن شائع ہوتا ہے۔

دونوں ایڈیشن کا سالانہ چندہ

للعہ/ ۸ (چار روپیہ آٹھ آنہ) مع محصول ڈاک

کسی ایک ایڈیشن کا سالانہ چندہ

عہ/ ۸ (دو روپیہ آٹھ آنہ) مع محصول ڈاک

(قیمت فی کاپی ۳/)

نوٹ:۔ مضمون نگار حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ جہاں تک ہو سکے مختصر جامع اور معیاری مضامین ارسال فرمایا کریں۔ جگہ کی قلت کے باعث طویل مضامین کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی ہے

ملنے کا پتہ

منیجر مووی لینڈ، متصل بنسی لال پیٹھ سکندرآباد دکن

بچوں سے

سب رس بچوں اور بچیوں کو مضمون لکھنے کے لئے "مدرسہ کا پہلا دن" عنوان دیا گیا تھا لیکن اب بہت کم مضمون وصول ہوے۔ سید سعید حامد (مدرسہ عالیہ) کا مضمون سب سے اچھا رہا جس کو اس شمارہ میں شایع کیا گیا ہے۔ آئندہ مہینے کے مضمون کا عنوان "طالب علم کے اخلاق" ہوگا۔ توقع ہے کہ یہ مضمون بہت دلچسپی سے لکھا جائے گا۔

"اقبال نمبر" کے انعامات کا تصفیہ ہو گیا ہے جو یہ ہے۔

۱۔ "اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی" از ح۔ انصاری متعلم رزیڈنسی مڈل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمید الدین صاحب مہتمم سب رس)

۲۔ "دوستوں کا مکالمہ" از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین احمد صاحب انصاری)

۳۔ "محسن قوم اقبال (نظم)" از لطیف النسا بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب)

یہ سب انعامات نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارۂ ادبیات اردو پہلی اگسٹ کو ادارہ کے سالانہ جلسہ میں تقسیم فرمائیں گے۔

پہیلیوں کے حل:۔

جولائی کے سب رس کی پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں۔ (الف) انڈا، مہتر، (ب) انڈا، ڈھول۔ (ج) چراغ۔

حسب ذیل سب رسی بھائیوں نے وقت پر حل روانہ کئے۔ حبیب شمس سٹی کالج (۳) محمد اسد اللہ خاں سٹی کالج (۳) لائق علی خاں سٹی کالج (۲) جن کے حل وقت کے اندر وصول نہیں ہوے ان کے نام درج نہیں کئے جاتے۔ کئی بچوں اور بچیوں نے نئی پہیلیاں بھی بھیجی ہیں لیکن آئندہ سے وہی نئی پہیلیاں چھاپی جائیں گی۔ جن کے ساتھ پہلی پہیلیوں کے حل بھی روانہ کئے گئے ہوں۔

انعامی معمہ:۔

سب رس کے معاون مسیح الدین خاں متین نے ایک انعامی معمہ بھیجا ہے جس کے حل پر ایک کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ کتاب وصول ہو چکی ہے۔ دوسرے سب رسی بھائی اور بہنیں بھی اسی طرح انعامی چیزیں بھیج کر سب رس کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں۔

ادارہ

اشارے آڑے

(۱) اس معمہ کا حل ـــــ میں شایع ہوگا۔
(۲) گولکنڈہ کا غدار وزیر (۳) ملکہ مصر کا نام (۴) موت کو خوشی کے ساتھ لبیک کہنے والا مسلم (۵) چہرہ کا خوبصورت حصہ (۶) آگرہ کی مشہور عمارت (۷) جس شخص کو اپنے ـــــ سے محبت نہیں ہوتی وہ کسی سے سچی محبت نہیں کر سکتا۔ (۸) سچا ـــــ وہ جس کو اپنی دھن میں کھانے پینے کی بھی پروہ نہ ہو..... (۹) بمعنی شیر ببر (۱۰) دار الحکومت۔

				ر		ص
ہ		م	ج		ی	۲
	ا			ل		۳ ذ
		ل		ب		۴ ا
			ا		خ	۵
			م		ا	۶
				ن		۷
			ر		ا	۸
			ف		ض	۹
					و	۱۰ ر

تارا

ای رات کو جگمگانے والے — اے دن کو نظر نہ آنے والے
بتلا تو مجھے کہ کون ہے تو — کیا رنگ ہے تیرا اور کیا بو
شعلہ ہے ذرا سا آگ کا ، یا — ننھا سا چراغ ہے خدا کا
او ننھے سے جگمگاتے تارے — سچ سچ یہ بتا دے مجھ کو پیارے
ہر رات کو یوں چمک چمک کر — چھپتا ہے کہاں تو صبح جا کر
ہر چند کہ دن میں تجھ کو ڈھونڈا — پایا نہ پتہ ترے مکاں کا
بس ہو تو میں آسماں پہ آؤں — اور توڑ کے تجھ کو ساتھ لاؤں
تو تو ہے مزے سے آسماں پر — دل میرا ترستا ہے یہاں پر
دم بھر کے لئے تو پاس آجا — بس ہاتھ میں آ کے پھر چلا جا

آنکھیں تری روشنی سے بھر لوں
کھیلوں ترے ساتھ، پیار کروں

لطیف النساء بیگم

کاش میں ایسا نہ کرتا

ایک سبق آموز افسانہ

جب میری عمر گیارہ سال کی تھی ایک نوجوان شخص ناصر نامی ہمارے پاس نوکر ہوا۔ یہ جوا بہت کھیلا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اسے دوسرے نوکروں کے ساتھ بھی کھیلتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھ میں بھی دن بدن جوئے کا شوق بڑھتا گیا۔ آخر کار میں نے ناصر کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اگر میں کسی دن ہار جاتا تو والدہ کے روپیوں کے صندوق سے ایک دو روپے تو ضرور اڑا لیتا۔ میری عادت اس قدر بڑھ گئی کہ میں اگر کسی دن نہ کھیلتا تو میری طبیعت کسی نامعلوم وجہ سے کبیدہ ہو جاتی۔ میری اس خفیہ کارروائی سے میرے والدین بالکل واقف نہ تھے۔ اور اگر کسی دن میرے پاس بہت پیسے رہتے تو وہ کبھی یہ بھی خیال نہ کرتے کہ مجھے کہاں سے ملے ہیں اور کس نے دئے۔

—— ۲ ——

جمعہ کا دن تھا۔ تعطیل تھی اور میں بہت خوش تھا کہ آج خوب موقع ملے گا۔ میں اور ناصر کوٹھے پر چڑھ گئے اور تاش کھیلنے

سب مل
لگئے۔ آج کا ایسا منحوس دن تھا کہ میں نے ایک پیسہ بھی نہ جیتا جو کچھ بھی تھا ہار گیا۔ میں اپنی قسمت کو بار بار کوسنے لگا۔ اور پیسے فراہم کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ مگر بے سود ناچار میں نے مجبور ہو کر ناصر سے کچھ قرض لیا مگر وہ بھی ہار گیا۔

۳

ایک دن کا ذکر ہے کہ شام کے وقت والد صاحب کے پاس کہیں سے تقریباً چار سو روپے آئے۔ والد نے مجھے رقم دے کر کہا کہ تجوری میں رکھ آؤ۔ میں نے رقم لی اور تجوری میں رکھنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ روپیوں کو دیکھتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا اور جوا کھیلنے کے لئے بکمال چالاکی دس روپے نکال لئے اور باقی روپے تجوری میں۔ میں نے چرائے ہوئے روپے اپنے کمرے میں میز کی دراز میں رکھ دیے۔ کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہاں تک کہ دنیا و مافیہا کا کچھ دھیان نہ رہا۔

۴

جب رات کو والدین نے روپیوں کا حساب کیا تو دس روپے کم نکلے۔ والد کا گمان مجھ پر تھا مگر والدہ نے کہا کہ میرا لڑکا ہرگز چور نہیں ہو سکتا آخر کار والدین نے میرا تمام کمرہ ڈھونڈھ ڈالا۔ اور روپے میز کی دراز سے مل گئے۔ والدین غصے سے لال پیلے ہو گئے مگر رات کا وقت تھا مجھ کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

۵

صبح کو اٹھا ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتہ کیا۔ اور کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک مجھے کل والے روپے یاد آئے۔ مگر دیکھا تو میز کی دراز خالی خولی تھی۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ملازمہ نے آکر کہا کہ آپ کو آبا جان بلاتے ہیں۔
میں سمجھ گیا کہ ضرور میری چوری پکڑی گئی۔ اور والد ہی نے دراز سے روپے نکال لئے ہیں "مجبوری کا دوسرا نام صبر" ڈرتا ڈرتا والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والد نے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور کہنے لگے کہ تمہارے پاس دس روپے کہاں سے آئے۔ میں نے صاف انکار کیا۔ مگر والدین نے مجھے بہت ڈرایا اور مجھے اپنے جرم کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ اس واقعہ سے میرے ضمیر نے مجھ پر بہت کچھ لعنت، ملامت، اور نفریں کی اور میں نے پورے طور پر عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی جوے کی نوبت میں نہ پھنسوں گا۔

۶

اس واقعہ کو گزرے ہوئے پورے دس سال ہوتے ہیں اور میاں ناصر تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ والد بھی ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔
اب میری عمر ۲۱ سال کی ہے میں والدہ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ آج کل میرے گھر کے کاروبار اعلیٰ پیمانہ سے چل رہے ہیں۔ میرا جوا نہ کھیلنے کا عہد اب بھی قائم ہے۔ کبھی کبھار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ میں کچھ روپیہ لگاؤں مگر ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور ہر جواری سے اس سبق آموز واقعہ کے پڑھنے کی استدعا کرتا ہوں۔

محمد کمال خاں متعلم
(مدرسہ عالیہ)

نظام ساگر کی سیر

ہم نے نظام ساگر کو تین دن کے لئے جانے کی ٹھانی تھی اور ضروری انتظام کے بعد ایک دن موٹر میں ہم چھ آدمی روانہ ہوئے۔ میرے سوا امی جان بڑے اور چھوٹے ماموں اور بڑی آپا بھی تھیں۔ کھانے کی بہت سی مزے مزے کی چیزیں ساتھ تھیں اور ہم نے ایک کیمرا بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ راستے میں ہم بڑے خوش تھے کبھی گاتے تھے کبھی ہنستے تھے اور طرح طرح کے مناظر دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا کہ ہمارے ملک میں کیسے کیسے خوشنما مناظر موجود ہیں۔ جب ہم (۶۰) میل کا سفر طے کر چکے تو بہت سے ایک ٹائر پھٹا خیر خدا کا شکر ہے۔ کہ ہمارے پاس ایک زائد ٹائر تھا کہ وقت ضرورت کام آئے۔ میرے بڑے ماموں جو بڑے مذاقی ہیں انھوں نے جب دیکھا کہ ہم سب سوائے امی کے اتر کر ٹائر لگانے میں شوفر کی مدد کر رہے تھے۔ تو انھوں نے جلدی سے ہماری ایک تصویر لے لی جب دوسرا ٹائر درست ہوگیا تو پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا اب سب خوش اور اطمینان کے ساتھ جا رہے تھے۔ خدا کی شان دیکھئے کہ (۳) میل بھی طے نہ ہوئے تھے کہ پھر پھٹ سے وہی ٹائر پھٹا جو درست کرکے لگایا گیا تھا۔ اب تو سب کے ہوش جاتے رہے۔ اور خاص کر ڈرائیور کی حالت دگر گوں ہوگئی۔ ہم سب املی کے ایک پیڑ تلے بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ہماری اس جماعت میں ایک میں ہی سب سے کم عمر تھی وہی مذاقی ماموں صاحب نے مجھے ڈرانا شروع کیا اور کہا کہ رات کو اگر ہمیں یہیں رہنا پڑے تو کہاں ٹیک گے۔ اور پاس روشنی بھی نہیں ہے۔ اگر جنگلی جانور حملہ کرے تو کیا ہوگا بہرحال اس طرح کی ڈراؤنی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ادھر دو آدمی گزرے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا یہاں قریب میں کوئی گاؤں ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سے ۴ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کوم کور ہے سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سب کو ناگوار گزرا کہ موٹر کو اس طرح ڈھکیلتے ہوئے لے جائیں۔ لیکن مجبوری تھی سب موٹر میں بیٹھ گئے سوا ان دو اور بچارے ماموں کے جو دھوپ میں موٹر کے ساتھ ساتھ ٹائروں کی طرف نظر جمائے چل رہے تھے۔ دھوپ کی تیزی اور بھوک سے چڑچڑاہٹ اور بات بات پر غصہ آتا تھا۔ گاؤں والوں کا موٹر کو دیکھ کر ہنسنا تو اور بھی غضب ڈھا رہا تھا پانچ میل کی رفتار سے موٹر ٹھکتے ٹھکتے چل رہی تھی بعض وقت ہم بھی ہنستے اور بعض وقت موٹر کی حالت پر ترس کھاتے تھے۔ کہ اس کی بنڈی سے بدتر حالت بن گئی ہے۔ خدا خدا کرکے وہ گاؤں آگیا اور ہم نے ایک گھنے درخت کے نیچے موٹر روک لی۔ درخت کے سامنے ہی ایک بہت بڑی پرانی مسجد تھی اور مسجد کے قریب ہی ایک بہت وسیع تالاب تھا جس کا کٹہ ایک میل کا ہوگا ہم نے مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھایا لیکن کھانا کس کے حلق سے اترتا تھا جب کہ واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے ایک بڑے میاں گذرے امی جان کے دل میں یہ آیا کہ اب یہاں رہنا نہیں ہو سکتا کھانا رکھ کر کیا فائدہ اس غریب مسلمان بوڑھے کو دے کر ثواب حاصل کریں اور اگر اللہ میاں خوش ہو گئے تو شاید جانے کی کوئی صورت کر دیں۔ انھوں نے اپنا ارادہ ہم پر ظاہر کیا ہمیں بھی یہ بات پسند آئی اور ہم نے بڑے میاں کو بلا کر کھانا دیا اور کھانے سے فراغت پا کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ اور سب کے سب ان کو نانا کہہ کر پکارنے لگے۔ باتوں باتوں میں ہم نے معلوم

کرلیا کہ وہاں بھی سرکاری بس آتی ہے۔ یہ سن کر سب کو ذرا تسکین ہوی جب ہماری واپسی کی خوشی ہوتی تو موٹر کی فکر ہوتی کہ معلوم کتنے دن اس کو یہاں پڑے رہنا ہوگا۔ دوسرا دن انگریزی مہینوں کا نیا سال تھا۔ ٹائروں کی دکانیں بند ہونے کا ڈر تھا۔ اس سے بھی زیادہ ڈر یہ تھا کہ اگر ابا کو خبر ہوگئی کہ موٹر جنگل میں پڑی ہے۔۔۔۔۔۔ تو پھر غضب ہوجائے گا۔ جب ناما موٹر کی تسلی دیتے تو کوئی اور گاؤں والا آکر کچھ اور خبر سناتا کہ کبھی موٹر آتی ہے۔ اور کبھی نہیں آتی۔ ناما نے یہ بھی سنایا کہ بعض وقت لوگوں کی کثرت سے موٹر والا موٹر نہیں روکتا۔ یہ سنتے ہی ہم سب ڈر گئے۔ ناما سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں شیر بھی آیا کرتے ہیں اور کئی مرتبہ آکر کتوں کو کھا گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی اب تو ڈر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ناما نے سب کو ہمت دلائی کہ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ سب وہیں رات کو سونا اور صبح کو چلے جانا۔ یہ سن کر ہمارا خوف جاتا رہا۔ ناما بڑے بکواسی تھے اپنی بہادریوں کا ذکر اور ادھر ادھر کی دوسری باتیں کرتے رہے۔ اگر اب جو بس کا ذکر کرتے تو ہم کو بالکل ڈر نہ ہوتا کیونکہ ناما کے گھر کا بھروسہ تھا۔ امی جان کو مسجد میں چھوڑ کر ہم سب تالاب پر گئے۔ وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اچھے منظروں کی تصویریں لیں۔ امی کے بلانے پر ہم تالاب سے واپس آئے اور ایک نئی خبر ناما کی زبانی سنی کہ بس کوئی پانچ بجے آئے گی۔ یہ سنتے ہی ہم نے چلنے کی تیاری شروع کی۔ بچھونے باندھتے تھے اور دوسرے کام میں جب ہم مصروف تھے۔ تو چھوٹے ماموں نے پھر ایک تصویر بطور یادگار لے لی۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ وہ پوری صاف نہیں آئی کچھ حصہ سیاہ پڑ گیا۔ جانے سے پہلے ہم نے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا کہ موٹر کی حفاظت کرتے رہنا اور ہم وہاں تمہارے پاس پہنچتے ہی ٹائر بھیج دیں گے۔ بچا ہوا سب کھانا ہم اس کے حوالے کردیا اور بس کے انتظار میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انتظار میں ساڑھے پانچ کے قریب ہوگئے۔ ادھر سے ایک گاؤں کا آدمی آیا اور باتوں باتوں میں اس سے معلوم ہوا۔ کہ بس (۶) بجے آئے گی یہ سن کر ناما پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے ہم سے جھوٹ کہا۔ پھر ناما آکر کہنے لگے کہ آپ کو بس لے جاکر ایک جگہ پر چھوڑے گی جہاں ایک دوسری بس آپ کے انتظار میں رہے گی اور وہ آپ کو لے جاکر ایک اسٹیشن پر چھوڑے گی جہاں سے آپ ریل کے ذریعہ حیدرآباد پہنچ سکیں گے۔ شام ہو رہی تھی اور ہم موٹروں کی آواز پر چونکتے جاتے تھے کہ شاید بس آرہی ہوگی انتظار کرتے کرتے ہم سب ناامید ہوگئے تھے۔ خیر ساڑھے چھ بجے جو بس کی آواز ہمارے کانوں میں آئی سب ایک دم آئی بس کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ امی نے ماموں کو کہا کہ جاکر دیکھیں کہ بس بھری ہوی تو نہیں ہے۔ انھوں نے خوشی سے آکر کہا کہ بس میں چند لوگ ہیں ہم سب مردانہ حصہ میں بیٹھ گئے۔ سوائے امی اور بڑی آپا کے جو زنانہ حصے میں بیٹھ گئیں۔ بس ہمیں اسٹیشن پر لے جاکر چھوڑی ٹکٹ لے کر ریل میں سوار ہوئے اور پھر کاچی گوڑہ اسٹیشن پر گیارہ بجے پہنچے گھر جانے کے لئے کسی موٹر کی بہت تلاش کی گئی لیکن کوئی ٹکسی نہیں ملی مجبوراً ٹانگہ میں بیٹھ کر چرخ چوں چرخ چوں کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو ساڑھے گیارہ ہوئے تھے اور پھاٹک بند تھی دروازہ خوب مار، شور وغل لیا چوکیدار نیند سے چونک کر آیا اور پھاٹک کھولا جب وہ ہمیں ٹانگہ میں دیکھا تو حیران تھا کیا معاملہ ہے۔ جب ہم اندر گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ خالہ جان اور ایک ماما کمرے کے دروازے بند کر کے سو رہے ہیں۔ ہم جاکر دروازہ کھٹکھٹائے تو ڈرتے ڈرتے انھوں نے دروازہ کھولا اور ہمیں اتنی جلد واپس ہوتے دیکھ کر بہت حیران ہوئے جب ہم نے اپنا پورا قصہ سنایا تو سب کے ہنستے ہنستے پیٹوں میں بل پڑ گئے صبح کو

موٹر کی فکر ہوئی تو خیال آیا کہ موٹر جنگل میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کو فوراً کسی طرح سے منگوانا چاہیئے۔ ابا جان کو جب معلوم ہوا تو وہ اس وقت دادا کی موٹر میں جاکر دو نئے ٹائر اور ٹیوب خرید کر لائے اور ایک ٹکسی موٹر منگوا کر اس میں بھجوا دیے ایک نوکر کو بھی ساتھ کیا ہم یہاں اپنی موٹر واپس آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شام کے سات بجے موٹر خیر خوبی کے ساتھ پہنچی۔ مگر ڈرائیور بہت تھکا ہوا اور دنیا سے بیزار نظر آتا تھا۔ ایسے مزوں سے ہمارا نظام ساگر کا سفر ختم ہوا۔

مظفر سلطانہ (سنیٹ جارجز گرامر اسکول)

بالاحصار

بنایا ہے کیا خوب مٹی کا گھر
مرے بھائی جاں ہیں بڑے کاریگر
بنا کیسا پیارا یہ گھر واہ وا
نہ ہوگا محل کوئی اس شان کا
لگایا ہے کیا خوب بھورے کا رنگ
جو دیکھے اسے بس وہ ہوجائے دنگ
کرو بھائی جاں صاف چوٹی کو یوں
لگادو بس اب چار اس پر ستوں
پڑے اس پہ چھپر جو اک گھاس کا
تو آئے نظر پھر یہ کیسا بھلا

نہ مٹی کا گھر ہے نہ ہے یہ محل
لگاکر ستوں گھر بنائیں گے کل
بس اک چاندنی پھر بنائیں گے ہم
منڈیر ایک اس پر لگائیں گے ہم
نہیں تم کو ننھی ذرا بھی قرار
بناتا ہوں میں دیکھو بالاحصار

لطیف النسا بیگم

لطیفہ

لڑکا:۔ دادا جان کیا آپ کی عینک سے ہر چھوٹی چیز بڑی معلوم ہوتی ہے؟

دادا:۔ ہاں بیٹا۔

لڑکا:۔ اچھا تو دادا جان جب آپ مجھ کوئی چیز دیا کریں تو برائے مہربانی عینک اتار کر دیا کیجیے۔

مرزا محمد ارشد مختار بیگ دہلوی

نانی اور انکی شریر نواسی

خداوندکریم ہماری نانی اماں کو سلامت رکھے جو ہروقت ہمارے لئے اسباب تفریح مہیا کرتی رہتی ہیں۔ مزاج کی بھی اللہ رکھے عجیب ہیں۔ یوں تو والدہ صاحبہ کی سگی والدہ نہیں، بلکہ رضائی والدہ ہیں۔ مگر چونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس لئے وہ شروع ہی سے ہمارے ہاں رہتی ہیں۔ وہ کسی ضرورت سے اپنے کسی عزیز کے ہاں چلی بھی جاتی ہیں تو دل بہت ہی اداس رہتا ہے۔ مجھے خاص طور پر ان سے بہت دلچسپی ہے اگرچہ وہ ہر وقت مجھ پر برستی رہتی ہیں مگر ان کو مجھ کچھ محبت بھی ہے۔ ہماری نانی اماں کو خیر سے دکھائی بھی کم دیتا ہے، اس لئے آپ ہر وقت عینک چڑھائی رہتی ہیں۔ اور جب کوئی ان کے سامنے ہنستا ہے تو ان کو سخت غصہ آتا ہے۔ اور جب روٹھتی ہیں تو ان کا منانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ان کے آگے مٹھائی لاکر رکھ دے تو وہ فوراً من جاتی ہیں۔

ایک اور بات ان کے متعلق قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان کو شیشے کے گلاس سے سخت دشمنی ہے اور اگر کوئی بھولے بسرے شیشے کے گلاس میں پانی دیدے تو وہ اپنی توہین خیال کرتی ہیں۔ ایک دن کا ذکر سنیئے کہ میں نانی اماں کے پاس بیٹھی ان کو بنا رہی تھی۔ نانی اماں بیٹھی کرتہ سی رہی تھیں۔ اور خیر سے عینک بھی لگائے ہوئے تھیں۔ سوئی میں تاگا کسی طرح نہ ڈالا جاتا تھا آخر میں نے پرو دیا۔ انھوں نے جو سینا شروع کیا تو گرہ لگانی یاد نہیں رہی۔ اور جونہی سوئی کو کھینچا تو تاگا تمام کپڑے سے نکل آیا۔ خدا جانے کتنی بار انھوں نے ایسا کیا۔ آخر مجھ سے ہنسی نہ رک سکی اور میں بے اختیار ہنس پڑی۔ میں نے کہا نانی اماں گرہ تو لگا لو تو وہ الٹی خفا ہو گئیں۔ کیونکہ ان کی سمجھ میں میرا مطلب نہیں آیا میں جو کہتی کہ گرہ لگالو تو وہ گز اٹھا کر کرتا ناپ لیتی تھیں اور کہتی سولہ ہی گرہ تو ہے اسے کتنی بار ناپوں وہ میرے لفظ "گرہ" کا مطلب نہ سمجھی تھیں۔ جب ناپتیں تو مجھے اور زیادہ ہنسی آتی تھی اور ان کا غصہ بڑھتا۔ اتنے میں اوپر سے والدہ صاحبہ نے آواز دی کہ تمھاری نانی اماں کیا کر رہی ہیں ان سے کہنا کہ پہلے ذرا چائے پی لیں۔ میں نے جواب دیا وہ دجّال والی گدی سی رہی ہیں، گرہ لگانی یاد نہیں رہتی اور جب میں گرہ لگانے کو کہتی ہوں تو کرتہ اٹھا کر ناپ لیتی ہیں۔ میرے اس کہنے پر نانی اماں بس آگ بگولا ہو گئیں اور لگیں مجھے صلواتیں سنانی اور اس کے بعد سے تو وہ اس قدر خفا ہو گئیں کہ چار پانچ روز تک قطعی نہ بولیں اور میرا سامنے آنا بھی انھیں ناگوار گزرتا تھا۔

اتفاق کی بات دو چار دن بعد ہی ان کے سر میں سخت درد ہوا سب لوگ ان کے پاس جا بیٹھے، میں بھی پہنچی اور کہا نانی اماں تمھارا سر دبا دوں لیکن انھوں نے مجھے سخت غصے سے پرے ہٹا دیا مجھے کچھ ہنسی آگئی اور میں اپنے کمرے میں چلی گئی آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں ان کے کمرے میں پھر آگئی۔ ہمشیرہ صاحبہ ان کا سر دبا رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور آہستہ سے کہا نانی اماں دودھ پئیں گی لاؤں؟ دودھ کا نام سنتے ہی نانی اماں کے دل کی کلی کھل گئی اور کہنے لگیں کہ بی سامنے تو آ تیری صورت دیکھنے کو جی ترس گیا۔ خیر میں سامنے آگئی تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ہاں

بیٹی وہ دودھ کہاں بہلاؤ۔ میں جلدی سے جاکر دودھ لے آئی تو وہ من گئیں۔ خیر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اور سنیے ایک روز نانی اماں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا کہ بیٹی ذرا ایک گلاس پانی اور تھوڑی سی چینی لا دو مجھے پھر شرارت سوجھی اور میں ایک شیشے کے گلاس میں پانی اور ایک پلیٹ میں چینی لے آئی۔ اور کہا لو نانی اماں یہ۔ نانی اماں آئیں تو جائیں کہاں گلاس میرے ہاتھ سے لیا اس زور سے پھینکا کہ چور چور ہو گیا۔ اور لگیں مجھ پر خفا ہونے۔ میں نے فوراً چینی کی پلیٹ آگے کرتے ہوئے کہا لیجیے شکر۔ وہ فوراً ہنس پڑیں اور کہا بیٹی برا نہ مانیو میں ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ ہاں ہماری نانی اماں کو نرم چیز زیادہ پسند ہے ہر ایک چیز کو پہلے دبا کر دیکھتی ہیں اور پھر کھاتی ہیں ایک دفعہ ہماری ایک جگہ دعوت تھی نانی اماں بھی ہمارے ساتھ تھیں اگر ان کو نہ لے جاتے تو اپنے ہی جانے کی کس کو امید تھی دعوت میں ہم پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد کھانا چنا گیا مختلف قسم کے کھانے تھے مٹھائی بھی تھی۔ کھانا جو شروع ہوا تو نانی اماں نے سب سے پہلے مٹھائی پر ہاتھ ڈالا میں بیچ میں شرارت سے بول اٹھی نانی اماں دیکھ کر کھائیے۔

نانی اماں۔ کیا دیکھ کر کھاؤں؟

میں۔ یہی کہ پہلے اسے دبا کر دیکھ لیں۔ نانی اماں نے یہی کیا کہ گلاب جامن کو دبا کر دیکھا، دبانا ہی تھا کہ شیرے کی پچکاری تمام ان کے کرتے دوپٹے پر۔

میں۔ نانی اماں دیکھا اس میں سے کیا نکلا؟ ذرا اور دبا کر صاف کر لیجئے نہ معلوم اس میں کیا بلا بھری ہوئی ہے۔ نانی اماں میری شرارت کو نہ سمجھیں اور دبایا تو شیرہ گردن پر گرا۔

گلاب جامن تو خیر انھوں نے چورا ملیدہ کر کے کھا لیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد نانی اماں کا ریشمی دوپٹہ اور کارگے کا کرتہ چپک کر گلے کا ہار ہو گیا ادھر گردن پر شیرہ سوکھ کر کھال تڑخنے لگی۔ چنانچہ ان کا غضبی نقطہ مجھ پر نازل ہوا اور لگیں بے نقط سنانے میں گھبرائی اور اماں سے کہا جلدی چلو ورنہ یہ زیادہ برس پڑیں گی اور خواہ مخواہ کرکری ہوگی۔

غرض ہم گھر آئے اور ان کے کپڑے بدلوائے تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ خدائے تعالیٰ انھیں زندہ رکھے عجب طرفہ معجون ہیں اور روزانہ ہمارے لئے ہنسی دل لگی کے سامان فراہم کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہماری بھی دعا ہے ؎

وہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ارجمند ریحانہ (از دہلی)

کام کی باتیں

(دوسری قسط)

(۱) کمینوں کے ساتھ بیٹھنے میں علمیت کا خون ہوتا ہے۔ برابروں کے ساتھ برابری حاصل ہوتی ہے۔ اور بڑے لوگوں کے ساتھ بندگی۔ (ہتوپادیشہ)

(۲) اپنے دل کو غم و الم سے دور رکھو۔ اور اس تکلیف کا خیال نہ کرو جو ابھی نازل نہ ہوئی ہو۔ (فردوسی)

(۳) کوئی شخص دنیا میں باقی رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔ سوائے اس کے جس نے نیک نام چھوڑا ہو۔ (سعدیؒ)

سیدہ عظیم النساء بیگم (از میسور)

طلسمی قالین

ایک بادشاہ کے تین[۳] بیٹے تھے۔ سب میں بڑے کا نام قمرؔ منجھلے کا نام انورؔ اور چھوٹے کا نام اظہرؔ تھا۔ یہ تینوں اپنی چچا زاد بہن قیصر سلطانہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔

قیصر سلطانہ اپنے زمانے میں حسن و لنواز کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی اُس کی نقرئی اور بے عیب پیشانی شکن سے پاک صاف چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتی تھی ناک سیدھی بے عیب جسم نازک اور سڈول تھا۔ تینوں شاہ زادے اس ارضی حور سے دلی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنی جانیں اُس مہ جبیں پر قربان کرنے کو تیار تھے۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اُس کی الوداعی سنہری کرنیں سر سبز درختوں اور شفاف پانی کی لہروں پر پڑ کر نہایت دلفریب اور دلکش معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہی وقت اِن دلدادگانِ حسن کے لئے نہایت پر خطر ثابت ہوا۔ یعنی بادشاہ نے تینوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تمھارے دلی حالات سے واقف ہوں۔ تم تینوں شاہ زادے اور میرے لخت جگر ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں قیصر سلطانہ کا ہاتھ دے کر بقیہ دو کا دل دکھاؤں۔ اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم میں سے جو سب سے بہتر تحفہ میرے لئے لائے گا وہی قیصر سلطانہ کا شوہر ہوگا۔ تم لوگ سفر کرو اور ٹھیک ایک برس بعد ایک ہی تاریخ کو اپنے تحائف میرے روبرو پیش کرو۔ شاہزادوں نے باپ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور دوسرے دن تینوں مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ قمرؔ شہر طوس پہونچا جہاں ایک دن شام کے وقت بازار میں اس نے مجمع کثیر دیکھا۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ ایک قالین فروخت ہو رہا ہے۔ پینتیس[۳۵] ہزار اشرفیوں تک دام لگ چکے ہیں مگر قالین فروش کہتا ہے کہ چالیس[۴۰] ہزار سے ایک کوڑی کم نہ ہوگی۔ قمرؔ نے قالین کی صفت دریافت کی تو قالین فروش نے کہا کہ حضور یہ طلسمی قالین ہے۔ صفت اس میں یہ ہے کہ حضور اس پر بیٹھ کر جس مقام کا تصور فرمائیں خواہ وہ مقام کیسا ہی دور دراز ہو پلک جھپکاتے یہ قالین آپ کو وہاں پہونچا دے گا۔ قمرؔ قالین کی یہ صفت سُن کر پھولا نہ سمایا اور سوچا کہ اس سے بہتر تحفہ اب دستیاب نہ ہوگا۔ بے تامل چالیس ہزار اشرفیوں میں اُسے خرید لیا۔ اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں جہاں مقیم تھا عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا کیونکہ واپسی میں ابھی بہت دیر تھی۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ دوسرے بھائی انورؔ کو بھی پیش آیا وہ سفر کی مصیبتیں سہتا ہوا ازتیور پہونچا وہاں بازار میں ایسے ایک شخص دوربین بیچتا ہوا ملا انورؔ نے قیمت دریافت کی شخص مذکور نے کہا کہ پینتالیس[۴۵] ہزار اشرفیاں انورؔ معمولی سی دوربین کی یہ قیمت سُن کر ہکا بکا ہو گیا مگر اس شخص نے کہا اس دوربین کے ذریعہ آپ گھر بیٹھے تمام عالم کی سیر کر سکتے اگر باور نہ ہو تو امتحان کیجیے انورؔ نے دوربین اس کے ہاتھ سے لے کر پہلے اپنی محبوبہ شاہ زادی قیصر سلطانہ اُس کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو دیکھا دوربین بیچنے والا سچا ثابت ہوا اسے وہ سب لوگ جن کو وہ دیکھنا چاہتا تھا اس طرح نظر آئے گویا وہ اس کے پاس ہی موجود ہیں۔ انورؔ یہ نایاب تحفہ پا کر بےحد خوش ہوا فوراً منہ مانگی قیمت ادا کر کے دوربین خرید لی اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں تکان سفر دور کرنے کی خاطر مقیم رہا۔

تیسرا بھائی اظہر زیتان پہونچا اُس نے وہاں کے بازار میں ایک میوہ فروش کو ایک سیب بیچتے ہوے دیکھا قیمت دریافت کی تو میوہ فروش نے پچاس ہزار اشرفیاں بتائیں اظہر ایک سیب کی یہ قیمت سن کر حیران سا ہوا تو میوہ فروش نے اُس سیب کی یہ خاصیت بیان کی کہ جس بیمار کو اس کا ایک ٹکڑا کھلا دیجئے خواہ اُس کی حالت کیسی ہی خراب ہو چکی ہو مگر ایک گھنٹے کے اندر بیمار تندرست ہو جائے گا۔ اظہر نے پہلے اسی شہر میں سیب کا امتحان کیا اور پھر پچاس ہزار اشرفیاں دے کر وہ سیب خرید لیا۔

جب ان کی واپسی میں تین مہینے باقی رہ گئے تو تینوں بھائی ایک شہر کی کارواں سرا میں جہاں جُدا ہونے سے پہلے ملنے کا قول و قرار کر چکے تھے ملے ہر شخص نے اپنے اپنے تحفہ کا ذکر کیا۔ اور فرداً فرداً ایک نے دوسرے کو مبارک باد دی تھوڑی دیر بعد قمر نے انور سے کہا کہ بھائی عرصے سے ہمیں اپنے والدین کی خبر نہیں ملی ذرا تم اپنی طلسمی دور بین سے دیکھو کہ اُن کا کیا حال ہے۔ انور نے صندوق سے دور بین نکالی اور دیکھ کر کہا ارے بڑا غضب ہوا جس کے لئے ہم لوگوں نے وطن چھوڑا والدین سے جدائی اختیار کی وہی (قیصر سلطانہ) دم توڑ رہی ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے یہ سن کر قمر اور اظہر نے بھائی کے ہاتھ سے دور بین چھین لی دیکھتے کیا ہیں کہ فی الحقیقت قیصر سلطانہ بستر مرگ پر دراز اور کوئی دم کی مہمان ہے۔ قمر نے کہا کہ بھائیو تاخیر کا موقع نہیں تم دونوں میرے طلسمی قالین پر بیٹھ جاؤ دم کے دم میں قیصر سلطانہ کے پاس پہنچے جاتے ہو یہ کہہ کر اس نے اپنا قالین بہ عجلت بچھایا انور اور اظہر بھی اپنا اپنا طلسمی تحفہ لے کر اس پر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کی دیر تھی پلک جھپکنے میں تو شاید کچھ دیر بھی ہوتی ہو۔ مگر ان کو پہونچنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی۔ سب نے اپنے آپ کو اپنے محل کی چھت پر پایا۔ تینوں بھائی دوڑ کر قیصر سلطانہ کے کمرے میں گئے۔ جہاں بادشاہ اور ان کی ماں بھی موجود تھی۔ دونوں کو بیٹوں کے خلاف توقع آجانے پر حیرت آمیز خوشی ہوی۔ اظہر نے فوراً اپنے طلسمی سیب سے ایک ٹکڑا کاٹ کر مریضہ کو دیا جس کے کھاتے ہی اس کے بے رنگ چہرے پر صحت کی سرخی دوڑ گئی اور چند منٹ میں قیصر سلطانہ تندرستوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی اس نے بھی بھائیوں کو دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ شاہی محل میں جہاں کچھ دیر پہلے موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔

بادشاہ نے بیٹوں کو گلے سے لگایا اور اُن کے سفر کے حالات سنے تینوں شاہزادوں نے اپنے اپنے طلسمی تحفے باپ کو نذر دیئے بادشاہ ان تحفوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ فی الحقیقت یہ تحفے لاجواب ہیں مگر افسوس کہ میں اب بھی تم میں سے کسی کو بقیہ دو پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ انور کی دور بین کی بدولت تم قیصر سلطانہ کی نازک حالت سے آگاہ ہوے قمر کی قالین کی بدولت چشم زدن میں دور دراز مقام سے یہاں تک پہونچے اظہر کے سیب نے اُس کی جان بچائی۔ اس صورت سے مجھ پر اور میری بھتیجی پر تم تینوں کا برابر احسان ہے اب معاملے کے تصفیہ کی میں کوئی اور صورت نکالوں گا۔ تم تینوں اب اپنی اپنی جگہ جا کر آرام کرو۔

مرزا مظفر الدین احمد صادق
(چادر گھاٹ ہائی اسکول)

مردانے موسیٰ جانی

ایک چیونٹی اور چوہیا میں بڑی دوستی تھی۔ چیونٹی کا نام مورچہ جانی اور چوہیا کا نام موسیٰ جانی تھا۔ ایک دن چیونٹی چکی پیسنے بیٹھی اور چکی میں خود پس گئی۔ چوہیا کو اپنے دوست کی بیوقت موت کا بڑا رنج ہوا اور خاک سر پر ڈال ایک برگد کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

درخت نے چوہیا کا یہ حال دیکھ کر پوچھا "کیوں خاک بر سر موسیٰ؟" چوہیا نے جواب دیا "خاک بر سر موسیٰ مردانے مورچہ جانی مرجائیں، ہم مرجائیں؟" یہ سن کر درخت نے اپنے سب پتے گرا دیے۔ ایک کوا ادھر سے اڑتا آیا اور درخت پر جا بیٹھا۔ درخت کے پتے گرے ہوئے دیکھ کر اس نے پوچھا "کیوں درخت بارکند؟ کیوں درخت بارکند؟" درخت نے کہا۔

درخت بارکند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

کوے نے یہ بات سنی تو کیا کام کیا کہ اپنے بال و پر سب نوچ کھسوٹ ڈالے۔

جب یہ ندی کنارے پانی پینے گیا تو ندی نے کوے کو بے بال و پر ایک مضغۂ گوشت بنا دیکھ کر حقیقت حال دریافت کیا کہ "کیوں قلادہ چنگی منگی؟ کیوں قلادہ چنگی منگی؟" کوے نے جواب دیا۔

"قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

پانی جو تھا وہ یہ سنتے ہی بہہ نکلا۔ پاس ایک کسان کا گیہوں کا کھیت تھا اس میں بہہ گر گیا۔ گیہوں نے کہا "کیوں آیا تیرا پیرا؟ کیوں آیا تیرا پیرا؟" پانی نے کہا۔

"آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

یہ سنتے ہی گیہوں جتنے تھے پٹ پٹ گر پڑے۔ کسان جو کھیت میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گیہوں جو کچھ دیر آگے لہلہا رہے تھے سب گرے پڑے ہیں۔ اس نے پوچھا "کیوں گندا گرتی پڑتی؟ کیوں گندا گرتی پڑتی؟" گیہوں نے کہا۔

گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں"

کسان نے بیلدستہ جو اس کے ہاتھ میں تھا اٹھا کر اپنے پاؤں پر مار لیا۔ کسان کی بیٹی عاشقاں جو باپ کے لئے روٹی لایا کرتی تھی ادھر آنکلی۔ اس نے باپ کا جو یہ حال دیکھا تو پوچھا "کیوں بابا بیلدستہ کنی؟" باپ نے جواب دیا۔

"بابا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

بیٹی جو تھیں یہ سنتے ہی جھٹ زمین پر لوٹ گئیں۔ ماں نے

بیٹی کو خاک میں غلطاں دیکھا تو پوچھا "کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی؟ کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی؟ عاشقاں بولی۔

"عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

ماں تے روٹی پکانے کے لئے توا گرم کیا تھا اس پر جھٹ سے جا بیٹھیں۔ اتنے میں پڑوسن تکوا درست کروانے آئی۔ وہاں کیا دیکھتی ہے کہ عاشقاں کی ماں توے پر سوار بیٹھی ہیں؟ اس نے پوچھا کیوں عاشقاں مادراں تواکند؟ کیوں عاشقاں مادراں تواکند؟ عاشقاں کی ماں بولیں۔

"عاشقاں مادراں تواکند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

پڑوسن نے سنتے ہی ہو دو عزم میں تکوا اٹھا کر اپنی ناک میں گھسیڑ لیا جب پڑوسن گھر سے باہر نکلیں تو لوگوں نے کہا "کیوں پڑوسن تکواکند کیوں پڑوسن تکواکند" پڑوسن نے جواب دیا۔

"پڑوسن تکواکند
عاشقاں مادراں تواکند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

یہ سننا تھا کہ سارے گاؤں کے لوگ مردانے مورچہ جانی کی حسرت ناک موت پر آنسو بہانے لگے اور اس کے غم میں سوگوار ہوے۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے بھی ماتمی لباس زیب تن کیا اور امرائے عظام و تمام رعایا کو حکم دیا کہ مردانے مورچہ جانی کی بے وقت موت پر اظہار تاسف کریں اور چالیس دن تک اس کا سوگ کریں۔

غرض جب چالیس دن ختم ہوے تو تمام شہر نے سوگ بڑھایا۔ درخت کی نئی کونپلیں پھوٹیں۔ کوّے کے بال و پر نکل آئے۔ دریا اپنی روانی میں پہلے کی طرح چلنے لگی۔ گیہوں سب بٹور لئے گئے۔ عاشقاں اور اس کے ماں باپ اپنے دکھ درد سے چنگے ہوگئے۔ پڑوسن کی ناک کا زخم سوکھ گیا لیکن چوہیا نے مورچہ جانی کے غم میں سر پر خاک ڈالنا نہ چھوڑا اور اسی طرح تمام عمر گنوا دی۔

سکینہ بیگم

(بیگم پیٹھ)

مدرسے کا پہلا دن

۱۸ جون اور پیر کا روز ہمارے اسکول کا پہلا دن تھا صبح ہی صبح امی نے جگایا۔ میں پھر سو گیا۔ میں سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ مگر بات یہ تھی کہ رات میں ہماری پھوپی کی چوتھی تھی۔ کنبہ کے اکثر بچے جمع تھے بڑی رات تک ادودھم مچی رہی۔ دیر سے سونا ملا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ چوتھی کھیلنے کی اجازت نہ ملی اور رسم سے پہلے سلا دیئے گئے ورنہ ہم نے تو رات بھر جاگنے کی ٹھانی تھی۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ارجمند نے آکر جگایا۔ وہ تیار ہو چکی تھی۔ میں نے بھی جلد جلد غسل کر کے کپڑے بدلے اور ناشتہ کر کے تیار ہو گیا۔ بابا ابھی تک نماز پڑھ رہے تھے۔ امی مریم کو حروف سمجھا رہی تھیں۔ ارجمند سبق دوہرا رہی تھی۔ میں نے بھی اپنا بیگ سنبھالا۔ آٹھ بجے ہم بابا کو خدا حافظ کہہ کر اور مریم، نرجس کو پیار کر کے سوار ہوئے اور چند منٹ میں اسکول پہونچ گئے۔

میں امی جان اور ارجمند بی بی کو محبوبیہ میں چھوڑ کر عالیہ پہونچا تو بہت سے بچے آچکے تھے۔ اور الگ الگ ٹولیوں میں پھر رہے تھے۔ میں بھی اپنی جماعت کی ٹولی میں جا ملا۔ تھوڑی دیر میں سارے لڑکے آگئے اور آپس میں ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے لگے۔ ہماری رپورٹ گھر پر آئی تھی۔ جن بچوں کی رپورٹ پر "ترقی دی گئی" (Promoted) لکھا تھا وہ تو بہت خوش بحال تھے۔ لیکن جن کی رپورٹ پر یہ جملہ نہ تھا وہ بہت غمگین اور اداس نظر آتے تھے۔ ہم کو ان کی مایوسی سے رنج ہوا اور ہم نے اپنے امکان بھر ان کے خوش کرنے کی کوشش کی۔ میرے ساتھی اپنے انعامات کا بھی ذکر کر رہے تھے جو ان کی کامیابی پر انہیں ان کے والدین نے دیے تھے۔ ایک نے کہا "مجھے بابا نے ایک خوبصورت ہوائی جہاز لا دیا ہے" دوسرے نے کہا "مجھے بڑی پیاری بائیسکل ملی ہے"۔ میری باری پر میں نے کہا کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملا کیونکہ میں اس بار اول نہیں آسکا۔ ہاں جب اوّل آتا ہوں تو امی اور بابا دونوں انعام دیتے ہیں۔ یہ چھوٹا فونٹن پن مجھے اس لئے ملا ہے کہ کردار اور اخلاق کی نسبت اچھی رپورٹ آئی ہے۔ میرے ساتھیوں نے چھوٹے بلوبرڈ کو باری باری سے دیکھا اور مختلف رائیں قائم کیں۔

پھر ہم نے ان بچوں کو دیکھا جو دوسرے مدرسوں سے عالیہ میں شریک ہونے آئے تھے۔ وہ بے چارے کچھ پریشان سے تھے کیونکہ انھیں پھر امتحان دینا تھا اور پچاس فیصدی نمبر لینے تھے۔ بعض بچے انھیں یہ کہہ کر اور بھی ڈرا رہے تھے کہ جو بچہ نوّے سے کم نمبر لیتا ہے وہ اس مدرسہ سے واپس کر دیا جاتا ہے۔

اتنے میں حاضری کی گھنٹی بجی اور پورا ہائی اسکول جمع ہو گیا۔ احمد علی خاں صاحب نے نئی جماعتوں کے لحاظ سے بچوں کے نام پڑھے اور میں حاضری کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسری جماعت (سکنڈ فارم) میں چلا گیا۔ وہاں ہم کو ڈسک درست کرنے اور اپنے اپنے نمبر لگانے پڑے۔ پھر حبیب اللہ صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے کامیابی کی مبارک باد دی ہم سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ مختلف سوالات بھی کیے اور صحیح جوابات پر شاباش بھی دی۔

کھانے کی چھٹی میں ہم باہر آئے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ بچے نئی جماعتوں میں جا کر بہت خوش تھے۔ مدرسے کا پہلا دن ہونے سے اسباق بھی باقاعدہ نہ تھے۔ پرائمری کے بچے اچھل کود رہے تھے۔ جھولوں اور پھسل بندوں پر بچوں کا ہجوم تھا۔ کئی پھیری والے بھی آگئے تھے۔ کوئی "چورن مزے دار" کی آواز دے رہا تھا تو کوئی "کافی گرم" پکار رہا تھا۔ کہیں میٹھی گولیاں بک رہی تھیں

توکہیں چنے والا اپنی ہنڈی لئے کھڑا تھا۔ میرے ساتھی اور دوسرے بچے مختلف چیزیں لے لے کر کھانے لگے۔ لیکن میں اور ایسے بچے جن کے پاس پیسے نہ تھے دوسری طرف کھیلنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اور بچے بھی آ گئے اور ہم سب ملکر دوڑنے کودنے لگے کالج کے بچے بھی دو دو چار چار ملکر پھر رہے تھے۔ جب کوئی جان پہچان کا بڑا لڑکا ادھر سے گزرتا تو "اچھے ہو سعید" پوچھ لیتا اور میں "جی اچھا ہوں" کہہ کر سلام کرلیتا تھا۔ جب تھوڑا وقت رہ گیا تو ہم نے جلد جلد کھانا کھایا اور گھنٹی پر جماعتوں میں پہونچے تھوڑی دیر بعد ہم کو جماعت کا ٹائم ٹیبل ملا اور کتابوں کی فہرست۔ ہم نے کورس کی کتابوں کے نام نقل کئے اور ٹائم ٹیبل اتارا۔ پھر ہمیں چھٹی مل گئی۔ ہم باہر آتے ہی نئے بچوں کا نتیجہ دریافت کرنے اس طرف پہونچے۔ بعض بچوں کو مدرسے کے فارم مل گئے تھے مگر اکثر نہیں لئے گئے تھے۔ جس پر ان کے ساتھ والے خفا نظر آتے تھے۔ ہم نے ان لڑکوں سے باتیں کیں اور سوالات کی بوچھار شروع کردی "جی آپ کا نام" "آپ کے والد کا اسم شریف" "کہاں رہتے ہیں آپ" "آپ کون سے اسکول سے آئے ہیں جناب" "آپ کیا پڑھتے تھے وہاں" "اردو کی کونسی کتاب؟" "اور انگریزی کی؟" "حساب میں کیا کیا سکھاتے ہیں وہاں" وغیرہ جب وہ بے چارے جواب دیتے دیتے اور ہم پوچھتے پوچھتے تھک گئے تو پھر ہائی اسکول کا میدان تھا اور ہم۔ خوب دوڑے۔ کھیلے کودے۔ فٹ بال لون ہاٹ۔ لنگوچہ۔ بھیڑ بکری یہ ہمارے خاص کھیل ہیں۔ اس کے سوا املی کے جھاڑوں پر چڑھے۔ جھاڑ بندر کھیلا۔ ریت پر کلا بٹیاں کھائیں۔ پھسل بنڈوں پر اپنا اپنا کمال دکھایا۔ بعض ساتھیوں کو ستایا بھی۔ ڈرنے والوں کو زبردستی پھسل بنڈوں پر سے ڈھکیلا جھولوں پر بٹھا کر بڑے بڑے جھوکے دیے۔ پھر سب ریت پر بیٹھ گئے اور یہ ترانہ خوب لہک لہک کر گایا۔

ہم ہیں پودے ملک دکن کے توڑنے والے رسم کہن کے
ہم ہیں بندے اپنے وطن کے بننے والے تن من دھن کے

دیس پہ مرنا کام ہمارا
دیس پہ مرنا کام ہمارا

غرض بڑا مزا آیا۔ چار بجے امی کو لینے محبوبہ گیا۔ امی نے پوچھا "دن کیسا گزرا مرے لال" میں نے جواب دیا "مدرسہ چھوڑنے جی نہ چاہتا تھا۔ امی۔ آپ کے خیال سے آنا پڑا" امی نے کہا تم بڑے اچھے بچے ہو سعید ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت کو سمجھنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

گھر آنے کے بعد بھی بعض شرارتیں یاد آ آکر ہنساتی رہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے چا وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ عابد بھائی نے انجمن (انجمن بہبودیٔ اطفال) کی چند نئی کتابیں بتائیں جو ابھی روز آئی تھیں۔ میز پر "پیام تعلیم" "سب رس" "نونہال" اور "آیا" کے تازہ پرچے رکھے تھے۔ چونکہ بارش کم کم ہو رہی تھی ہم سب بہن بھائی دیر تک وہیں پڑھتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سات بجے کھانا کھایا۔ کچھ دیر دالان میں ٹہلتا رہا۔ ہوم ورک تو تھا نہیں۔ بچھونے پر لیٹ کر "ترکوں کی کہانیاں" پڑھنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ یہ ہے میرے مدرسے کے پہلے دن کی سچی سچی روداد۔

سید سعید (مدرسہ عالیہ)

اخبار بینی

اخبار بینی کا ذوق آئے دن بڑھتا جارہا ہے اور دنیا کے ہر حصے میں روزانہ کئی صفحے روزنامے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جارہا ہے۔ ان اخباروں کے ذریعہ سے ملک کے ہر فرد بشر تک علم کی روشنی پہنچائی جاتی ہے۔ اور لوگوں کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ آج کل اخباروں میں اکثر حالات حاضرہ جن میں سیاسی سماجی اور معاشرتی حالات شامل ہیں زیادہ دلچسپی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں کیونکہ عوام کا رجحان اسی طرف زیادہ ہے بعض اخباروں میں محض سیاسی پروپگنڈے ہوتے ہیں۔ مگر ہماری نظروں میں وہی اخبار اور رسائل قابل قدر ہیں جن میں سماجی معاشی اور معاشرتی اصلاحی امور پر بحث کرنے کے بعد ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ کر عوام الناس کو ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں ان پر عمل کر کے میدان ترقی میں گامزن ہو جاتی ہیں۔

اب ہم پر اخبارات کی اہمیت واضح ہو گئی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر طالب علم کو جو اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور حالات حاضرہ سے واقف رہ کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اپنی قوم و وطن کو اگر کچھ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اخبار بینی کا ذوق پیدا کرے جس سے اس کے ذہنی اور عملی قوتیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اس کے علم و قابلیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے جو لڑکا اخبار پڑھنے کا عادی ہے وہ اپنے ساتھیوں میں ایک امتیاز پیدا کر لیتا ہے۔

ہمارے شہر میں بھی بہت سے اخبار و رسائل روزانہ شائع ہوا کرتے ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے مفید ہے۔ یہاں جتنے اخبار شائع ہوتے ہیں وہ سب اپنی خصوصیت سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسائل جن میں طلبا کی دلچسپی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار و ماہوار شائع ہوتے ہیں۔ ان میں "سب رس" بچوں کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کے لئے شائع ہوتا ہے جس میں بچوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ میں اس کو خاص طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

محمد عبد المنعم صدیقی (متعلم سٹی کالج)

کالج کی علیحدگی پر

مدرسہ سے جدا ہوا کالج
شوکت و شان لے گیا کالج
پہلے چھوٹا سا ایک پودا تھا
بڑھتے بڑھتے شجر ہوا کالج
جب ثمر کی طرح ہوا تیار
ٹہنیوں سے جدا ہوا کالج
ہم سے کالج کی سب بڑی بہنیں
چھٹ گئیں جب الگ ہوا کالج
ساری دنیا میں نام ہو اس کا
اعلیٰ ہر ایک کام ہو اس کا

منیر فاطمہ (زنانہ ہائی سکول)

ادارۂ ادبیات اردو

کے

قواعد و مقاصد

یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں معتمد کی تحریک اور دیگر موسسین کے تعاون سے قائم ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے، نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھایا جائے اور حیدرآباد کی علمی و ادبی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے۔

مجلس موسسین

ادارہ کے مقاصد کو روبہ عمل لانے، اس کی ترقی و اشاعت کے ذرائع پر غور کرنے، اس کے جمع و خرچ کی نگرانی، اور علمی و ادبی امور میں مشورہ دینے کا کام مجلس موسسین کے سپرد ہے۔ یہ مجلس جن پانچ اصحاب پر مشتمل ہے وہ ادارہ کے موسسین ہیں۔

قواعد و ضوابط

مجلس موسسین نے ادارہ کے حسب ذیل قواعد و ضوابط معین کئے ہیں:۔

(۱) سرپرست وہ ہوں گے جو ایک ہزار روپے یکمشت یا ایک سو روپیہ سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کی خدمت میں تمام مطبوعات ادارہ بلا قیمت پیش کی جائنگی۔

(۲) معاون وہ ہوں گے جو ڈھائی سو روپے یکمشت یا پچیس (۲۵) روپے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کو سال بسال مطبوعات ادارہ بلا قیمت دی جائنگی۔

(۳) رفیق وہ ہوں گے جن کی علمی و ادبی خدمات مستند سمجھی گئی ہوں، یا جو ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں غیر معمولی حصہ لیتے ہوں جن کے اعتراف میں مجلس موسسین ان کو رفیق منتخب کرے گی۔

(۴) رکن وہ ہوں گے جو پچاس روپے یکمشت یا چھ روپیہ سالانہ دیں۔ ان کو ادارہ کے جملہ مطبوعات و رسائل رعایتی قیمت پر دئے جائیں گے۔

ہمارے پچھلے معمہ کا نتیجہ و صحیح سربمہر حل

5	42	25
44	29	4
23	6	43

(۱) سردار جیون سنگھ صاحب بی۔ اے امرتسر، ڈاکٹر ایم۔ ایس جگو نوشہرہ اور مس سرور بانو صاحبہ گمہوڑہ کے صحیح حل وصول ہوئے۔ اس لئے (۲۰۰۰) روپیہ صحیح حل کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۲) سب سے زیادہ حل (۶۶) سردار جیون سنگھ صاحب کے وصول ہوئے اس لئے (۱۵۰۰) روپے کا دوسرا انعام ان کو ملا۔

(۳) ۲۰ جون تک سب سے زیادہ حل سردار صاحب کے تھے۔ اس لئے مزید (۱۰۰۰) کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۴) ۲۱ جون اور ۱۵ جولائی کے درمیان سب سے زیادہ اور دوسرے نمبر پر ڈاکٹر جگو صاحب کے حل ۲۲ وصول ہوئے اس لئے ہر دو انعامات (۱۰۰۰) روپے اور (۵۰۰) روپے ان کو دئے گئے۔

نوٹ :۔ (۱) واضح ہو کہ محترمہ مس سرور بانو کا صرف ایک حل وصول ہوا تھا۔ وہ صحیح تھا اس لئے وہ اول نمبر کے انعام کی مستحق ہوئیں۔

(۲) بعض نام نہاد اشخاص نے یوں ہی نام رکھ کر ہمارے معمہ کو حرف بحرف نقل کر کے اخبارات میں مشتہر کیا ہے۔ اس لئے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ایسے نام نہاد ۳/ روپے کرایہ والے مکان کے کرایہ داروں کے دھوکے میں نہ پھنسیں جو ایسے ہی دھوکہ دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ برٹش بزنس کارپوریشن کی اپنی بلڈنگ ہے اس لئے آپ کا لگایا ہوا روپیہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس لئے آج ہی معمہ نمبر ۶ میں شمولیت فرما کر گرانقدر انعامات حاصل کریں۔

معمہ نمبر ۶ — گورنمنٹ کی طرف سے منظور شدہ — معمہ نمبر ۶

بنک میں سربمہر حل رکھا گیا ہے۔ جو ۷ اگست ۱۹۳۸ء کو ممبران کے عام اجلاس میں کھولا جائیگا اجلاس میں شمولیت کیلئے مقامی شرفا، مدیران اخبارات مسلم لیگ، احسان، زمیندار، ٹریبون، سول ملٹری گزٹ، نیرنگ، رومان، اختر، زمزم وغیرہ کو مدعو کیا جائیگا جو ممبران نتیجہ کے موقعہ پر حاضر ہونا چاہیں۔ اپنے خرچ پر تشریف لا سکتے ہیں۔

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ	مبلغ دس ہزار روپیہ نقد انعام Rs10,000	داخلہ کی آخری تاریخ ۷ اگست ۱۹۳۸ء

پہلا انعام (۵۰۰۰) روپیہ صحیح حل والے کو دوسرا انعام (۳۰۰۰) روپیہ سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو تیسرا انعام (۱۰۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں دوسرے نمبر پر ہوگا چوتھا انعام (۷۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں تیسرے نمبر پر ہوگا پانچواں انعام (۳۰۰) روپیہ اس کو دیا جائے گا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں چوتھے۔

	9	

ترکیب حل :۔ سامنے دیئے ہوئے ۹ خانے مربع میں خالی خانوں کو ہندسوں سے اسطرح پر کریں۔ کہ دائیں بائیں اوپر نیچے اور ترچھے غرض کہ جس طرف سے بھی شمار کریں ہر قطار کا مجموعہ ۲۷ ہو۔ جو ہندسہ آپ چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ کسر یا ۰ استعمال نہ ہوگا

فیس داخلہ و شرائط :۔ فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک سے زائد بھی آپ جسقدر حل بھیجنا چاہیں سفید کاغذ پر بھیج سکتے ہیں اور فیس داخلہ بحساب ایک روپیہ فی حل بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ رسید منی آرڈر حل کے ہمراہ ارسال کریں مشکوک حل غلط تصور ہوں گے درست اور مستحق انعام حل وہ ہوگا جو ہمارے سربمہر حل سے خانہ بخانہ اور ہندسہ بہندسہ مطابقت کریگا۔ جو بنک میں سربمہر امانت رکھ دیا گیا ہے۔ تقسیم انعامات موصول شدہ حلوں کی تعداد کے مطابق بعد وضع اخراجات ہو گی۔ ایک سے زائد درست حل ہونے کی صورت میں صحیح حل کی رقم مساوی تقسیم کی جائیگی منیجر معمہ کا فیصلہ ہر حالت میں قطعی اور قانونی طور پر قابل تسلیم ہوگا۔ یہ اس معمہ کی واضح شرط ہے۔ وصول شدہ فیس کسی صورت میں واپس نہ ہو گی۔ نتیجہ منگوانے کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال کریں۔

آخری تاریخ :۔ ۷ اگست ۱۹۳۸ء تک سب حل دفتر میں پہنچ جانے چاہیں۔ اسی روز شام کو ایک کھلے اجلاس میں اخبارات کے ایڈیٹروں، مقامی شرفا اور شامل ہونے والے ممبروں کی موجودگی میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ اگر آپ نتیجہ میں شمولیت کرنا چاہیں۔ تو بخوشی کر سکتے ہیں۔ آپ آنے کی اطلاع ۷ اگست تک بھیج دیں۔ فیس شمولیت نتیجہ ۳/ روپیہ ہوگی۔ انعامات ۲۳ اگست کو روانہ کئے جائیں گے۔

ترسیل فیس و حل کا پتہ

منیجر صاحب برٹش (انڈیا) بزنس کارپوریشن ۱۰ فاروق روڈ لاہور

مئی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات جامعہ

بیوہ ۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں ۔ اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ قیمت مجلد عہ

بنی اسرائیل کا چاند ۔ مصنفہ رائڈر ہیگرڈ ۔ مترجمہ عبدالمجید حیرت بی اے علیگ۔ فرعون کا دور حکومت شاہزادہ سیٹی ولی عہد سلطنت کی عدل و انصاف کے لئے معزولی۔ عبرانیوں پر مظالم۔ ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے۔ مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی۔ فرعون کی معہ لشکر غرقابی۔ اور سیٹی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان۔ قیمت مجلد عاں

ضرب الامثال ۔ از خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی۔ یہ ۸۰ ضرب الامثال کا مجموعہ ہے جس میں ایسے ضرب الامثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کما حقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی۔ قیمت ۸ر

دلی کی دو سو برس کی تاریخ ۔ یہ اردو اکاڈمی کا ایک مقالہ ہے۔ اس میں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے۔ اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ۔ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

عقاب ۔ از رقیہ ریحانہ۔ یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔ ذرا ابو خاں کی بکری کو تو دیکھو یہ بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتی۔ لڑتے لڑتے مر جاتی ہے۔ لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا پسند نہیں کرتی۔ قیمت ۴ر

چنبیلی ۔ یہ چھوٹے بچوں کے لئے آسان زبان میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ قیمت ۲ر

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد، اضلاع اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوئی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

رباعیات امجد حصہ اول	عہ/
رباعیات امجد حصہ دوم	عہ/
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجدی پیوند	عہ
نذر امجد	۱/
حج امجد	عال
میاں بیوی کی کہانی	۴/
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	سے
گلستان امجد	سے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

ارباب نثر اردو	عال
گلشن گفتار	۱۲/
فتوحات میر	عال
ابتدائی فارسی	۱۲/
یادگار ولی	عال

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ارمغان عزیز	عال
متاع سخن	۱۲/

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

اردو کے اسالیب بیان	۴/
اردو شہ پارے	ے/
روح تنقید	۱۲/
تنقیدی مقالات	۳/
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عہ/
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عال
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	عال
فن انشا پردازی	۴/
طلسم تقدیر	۸/
سیر گولکنڈہ	۱۵/
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲/

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبد القادر صاحب سروری

دنیائے افسانہ	عہ/
کردار اور شاعری	عہ/
جدید اردو شاعری	عال/
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۱/
انگریزی افسانے	عہ/

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

خیالات آزاد جلد اول	۴/
خیالات آزاد جلد دوم	عہ

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	سے/
خواتین عہد عثمانی	عہ/
حضرت امجد کی شاعری	۱۲/
مکتوبات امجد	۱۲/
رہبر سفر یورپ	۱۲/
ذکر نبی	۱۲/

باہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد
مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا

اشاعت کتب ادارہ

گذشتہ سات سال کے عرصہ میں ادارہ نے حسب ذیل چند کتابیں شائع کیں۔

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری :۔ از میر حسن صاحب ایم اے قیمت عہ

ٹیگور اور انکی شاعری :۔ از مخدوم محی الدین صاحب ایم اے قیمت عہ

ہوش کے ناخن (ڈرامہ) :۔ از میر حسن اور مخدوم محی الدین صاحبان قیمت ۱۲

یوسف ہندی قید فرنگ میں :۔ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی۔ قیمت ۸

مرقع سخن (جلد اول) :۔ دکن کے پچیس ۲۵ شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت عہ

مرقع سخن (جلد دوم) :۔ مرقع سخن کا دوسرا حصہ ہے جس میں پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت عہ

سراج سخن :۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ قیمت ۱۲

ایمان سخن :۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ نے عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرا شیر محمد خان ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے ۱۲

فیض سخن :۔ میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور اسکے ساتھ ان کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۱۲

بادۂ سخن :۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ قیمت ۱۲

کیفِ سخن :۔ حضرت کیفی ایک بوقلمون طبیعت کے سخن گو ہیں۔ ڈاکٹر زور نے کیف سخن کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات آفرین مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲

متاع سخن :۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر فصیح الملک داغ کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرے کے ساتھ ان کے کلام کا لطیف انتخاب شائع کیا ہے۔ قیمت ۱۲

نقد سخن :۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطہ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔ قیمت عہ

نذر ولی :۔ اس میں دکن کی چار خواتین انشاپرداز کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت عمر

گریۂ تبسم :۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور انکا کلام بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر زور کا دیباچہ عمومی اور پروفیسر عبدالقادر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ عہ

دسمبر ۱۹۸۲ع

سب رس



نشان ثبت آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹر نمبر (M3950) ۴۲/۱۲/۱۱

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

کا

ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش

بہ اہتمام

خواجہ حمید الدین شاہد

مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ "رفعت منزل" خیریت آباد سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارۂ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے۔ جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
شہر متصل شہر سے باہر پیشگی ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر متصل شہر سے باہر پیشگی ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲ر اقبال نمبر ۱۴ر

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارۂ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس بی انشا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کاشیخ گھانسی بازار

اضلاع مسٹر محمد فخر الدین ارمان (روضہ شیخ) گلبرگہ شریف

جلد ۱ — دسمبر ۱۹۳۸ء — شمارہ ۱۲

تصویر پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی ام۔ اے (آکسن) صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ مقابل صفحہ ۵۲

فہرست مضامین

سب رس جنوری ۱۹۳۹ء کا مرقع دکن نمبر

سب رس اپنا نیا سال ایک ایسی عظیم الشان کوشش سے شروع کر رہا ہے جو دکن کی تاریخ کو نہایت ہی صحیح نقطۂ نظر سے سب سے پہلی دفعہ علمی دنیا میں روشناس کرے گی۔ اس میں جو مضامین نظم و نثر درج ہیں وہ تحقیق و تنقید اور ادب عالیہ کے اعلیٰ معیار کے لحاظ سے بھی نہایت گراں مایہ ہیں۔ ان کی فہرست کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ یہاں صرف خاص خاص مشاہیر کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں جن کی نادر تصویریں اس مرقع میں درج ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ دکن کی جملہ سلطنتوں کی تاریخیں اور بہت سے ایسے مشاہیر دکن کے حالات اور کارناموں کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ جن کی تصویریں نہیں دی جاسکیں۔

سلطنت بہمنیہ کے مشاہیر کی تصاویر اب تک کسی کو نہیں ملی تھیں۔ لیکن اس مرقع میں دو نادر تصویریں شامل ہیں۔

سلطنت احمد نگر کے مشاہیر میں صرف چاند سلطانہ کی تصویر چھپی ہے۔ لیکن دکن نمبر میں اس ہیروئین کی ایک عجیب و غریب شہسواری کی تصویر کے علاوہ اور دو مشاہیر کی تصویریں ہیں۔

سلطنت بیجاپور کے مشاہیر کی بارہ نہایت اعلیٰ تصاویر ہیں جن میں اکثر پہلی دفعہ چھپ رہی ہیں۔

سلطنت گولکنڈہ کے مشاہیر کی تصویریں خاص اہتمام سے مہیا کر کے ان کے بلاک بنالئے گئے ہیں۔ کیونکہ حیدرآباد دکن کی کوئی تاریخ اس دور کی سرگذشت کو واضح کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس دور کے بائیس ۲۲ مشاہیر کی تصویریں اس مرقع میں شامل ہیں۔

سلطنت آصفیہ کے اکثر مشاہیر کی تصویریں اس سے پہلے بھی چھپی ہیں۔ لیکن اس مرقع میں تصویروں کے انتخاب میں خاص معیار ملحوظ رکھا گیا ہے اور اچھی تصویریں پیش کرنے کے علاوہ انہی پچیس ۲۵ مشاہیر کی تصویریں منتخب کی گئی ہیں جنھوں نے اس ملک کی گذشتہ دو سو سال کی تاریخ میں بڑا حصہ لیا ہے۔

بہرحال صحیح معنوں میں یہ ایک مستند تاریخی مرقع ہے۔ اور توقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد دکن کی صحیح تاریخ پیش نظر ہو جائیگی۔ اور آئندہ کے لئے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

ان مشاہیر کی تصویروں کے سوا قدیم تاریخی گروپ اور دکن کے ہر دور کی تمدنی یادگاروں، قلعوں، مسجدوں، مندروں، مقبروں، مشہور عمارتوں اور تالابوں کی بھی تصویریں اس مرقع میں شریک رہیں گی۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے دور حکومت کی ہمہ جہتی ترقیوں کے متعلق مستند مضامین کے علاوہ دکن کے مختلف مقامات اور واقعات پر دلچسپ مضامین اور افسانے اور نظمیں بھی شریک ہیں۔

یہ مرقع ایک محدود تعداد میں چھاپا جا رہا ہے اور سب رس کے صرف سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا۔ ششماہی خریداروں یا دوسرے اصحاب کو دو روپئے میں ملے گا۔ سب رس کے سالانہ خریدار بھی صرف فبروری ۱۹۳۹ء تک اس کو حاصل کر سکیں گے جو اصحاب فبروری کے بعد خریدار ہوں گے ان کو شاید یہ نہ مل سکے گا۔

مہتمم سب رس

اداریہ

یہ سب رس کے پہلے سال کا آخری شمارہ ہے۔ سب رس کے قدر دانوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کا ہر پرچہ وقت پر شایع ہونے کے علاوہ صحیح معنوں میں سب رس تھا۔ اس میں ہر ایک کی دلچسپی کے کچھ نہ کچھ سامان پیدا کئے گئے" اور ہر ماہ طرح طرح کے رس کچھ اس طرح پیش ہوئے کہ مختلف خیال اور مختلف ذوق کے اصحاب بھی اس کو اپنا ہی سمجھتے رہے۔

ملک کے ہر نقطۂ خیال کے اہل قلم اصحاب و خواتین کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز مقامات کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے مضامین اور نظمیں سب رس میں اشاعت کے لئے کثرت سے وصول ہوئیں اور برابر چھپتی رہیں۔ اور اس طرح یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سب رس کی رسائی دور دور تک ہوگئی اور اس کے خریداروں اور قدر دانوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کے باہر رہتے ہیں۔

اس رسالہ کے ساتھ ہم سال بھر کے مضامین نظم و نثر اور تصویروں کی فہرست علیحدہ شایع کرکے روانہ کر رہے ہیں تاکہ جو اصحاب پورے سال کے پرچوں کی جلد بنانا چاہیں وہ اس مکمل فہرست کو ابتدا میں لگالیں۔ لیکن جلد بناتے وقت سب رس کے سرورق علیحدہ نہ کئے جائیں تو مناسب ہے۔ بالعموم رسالوں کی جلد بندی کے وقت ایسا کیا جاتا ہے۔ ہر نمبر کی طرح سب رس کے سرورق بھی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خاص اہتمام اور بڑے صرفہ سے تیار کرائے جاتے ہیں۔

سب رس خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر خلیل، اور مسٹر تراب کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے بڑے یا بچوں کے سب رس کے لئے نہایت دیدہ زیب سرورق تیار کئے اور کر رہے ہیں۔ اسی طرح محبوب شریف صاحب (مالک محبوبیہ کارخانہ جلد سازی) کی تعریف بھی ضروری ہے کہ انھوں نے ادارہ کی فرمائش پر سب رس کے لئے نئی نئی وضع کے مضبوط اور خوشنما گرد پوش تیار کئے جن میں پورے سال کے بارہ رسالے محفوظ کئے جا سکتے ہیں۔

طلبہ اور بچوں کے حصہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ سال بھر میں جن کے چھ مضمون شایع ہوں گے ان کو سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ چھ مضمون کسی کے بھی نہیں چھپے۔ اس لئے جن جن کے پانچ مضمون چھپے انہی میں یہ انعام تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی، معین الدین احمد انصاری، محمود علی، اور مسیح الدین خاں متین انعامات کے مستحق ہیں اور دفتر سے اپنے انعام حاصل کریں۔

ہم نے گذشتہ پرچہ کے اداریہ میں لکھا تھا کہ مولانا سیماب کی نظم مزدور کسی اور نام سے بھیج دی گئی تھی۔ لیکن اب اس بارے میں عزیز فاطمہ صاحبہ کی معذرت وصول ہوئی ہے کہ وہ اس نظم کو بھیجتے وقت اپنے نام کے آگے مرسلہ لکھنا بھول گئی تھیں۔ چونکہ سب رس میں پہلے بھی اس طرح بعض منقولہ نظمیں چھپی تھیں اس لئے ان کو بھی اپنی پسند کی نظم نقل کرکے بھیجنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے معذرت نامہ کے شایع کرنے پر اصرار کیا ہے لیکن اس کا تذکرہ ہی کافی ہے۔

اس شمارہ میں پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی کی تصویر شایع کی جارہی ہے۔ جنھوں نے گذشتہ چھ ماہ یورپ کی سیر و سیاحت میں گذارے جہاں وہ "علوم تاریخ کی پنج سالہ بین الاقوامی آٹھویں کانگریس" میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ہندوستان سے اس تقریب میں صرف دو ہی نمایندے شریک تھے۔ مشہور مؤرخ فادر ہراس اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔

اس کانگریس نے مشرق بعیدہ کے امور کے لئے بیس مشہور و معروف اصحاب کی جو مجلس منتخب کی ہے اس کا پروفیسر شیروانی صاحب کو بھی رکن بنالیا ہے۔ انھوں نے کانگریس میں جو مقالہ پڑھا وہ اس عنوان پر تھا "اسلامی سیاسی تحقیق اور اس کا درجہ علوم سیاسی میں"

یہ پرچہ اپنی اہمیت کی وجہ سے کانگریس کے اکیڈیمک سیشن کے پہلے ہی دن رکھا گیا تھا۔ اور اس کے سنانے کے لئے چالیس منٹ اور اس پر بحث و مباحثہ کے لئے بیس منٹ دئے گئے۔ پروفیسر شیروانی کو کانگریس نے اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا جو تاریخ ہند کو مختلف عصری اور ذیلی حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس اعزاز کے علاوہ پروفیسر صاحب علوم تاریخی کی اس بین الاقوامی مجلس عاملہ کے بھی رکن قرار دئے گئے ہیں جو آئندہ پنج سالہ کانگریس تک کام کرتی رہے گی۔ ان اعزازات پر ادارہ پروفیسر شیروانی صاحب اور جامعہ عثمانیہ کو مبارک باد دیتا ہے اور شیروانی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے تاثرات سفر یورپ سب رس میں چھپنے کے لئے روانہ فرمائے۔

اس مہینہ میں ادارہ ایک اور نئی کتاب "مدراس میں اردو" شایع کر رہا ہے۔ اس کے مصنف مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی ہیں جن کی "دکن میں اردو" ایک کتاب آفریں کتاب ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد ہی ہندستان کے مختلف صوبوں کے اصحاب کو اپنے اپنے صوبہ کی اردو خدمات پر نظر ڈالنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ دو کتابیں یعنی حافظ محمود خاں شیروانی کی "پنجاب میں اردو" اور نواب نصیر حسین خاں خیال کی "مغل اور اردو" شایع ہو چکی ہیں۔

ہاشمی صاحب نے مدراس میں اردو لکھ کر ایک کمی کو پورا کر دیا ہے۔ صوبہ مدراس میں اردو صدیوں سے مروج ہے اور وہاں بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں ان سب کے متعلق بہت مستند معلومات پیش کی گئی ہیں۔ جو اصحاب اردو زبان اور ادب کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے ضرور مستفید ہوں گے۔

اس سال یعنی ۱۹۳۸ء میں ادارہ نے چار کتابیں شایع کیں۔ نند ولی۔ گریہ و تبسم۔ من کی دنیا۔ مدراس میں اردو۔ چاروں کے موضوع بالکل مختلف ہیں لیکن ہر کتاب مفید اور دلچسپ ہے۔ اور اردو زبان اور ادب میں اضافہ کا باعث ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ سال ادارہ اس سے زیادہ کتابیں شایع کر سکے گا۔

سب رس کا جنوری نمبر مملکت دکن کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق مفید، دلچسپ، اور مستند معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ مبارک دور عثمانی میں اور زیادہ تر جشن سیمین عثمانی کے سلسلہ میں کئی کتابیں اور رسالے ایسے شایع ہوئے ہیں جن میں ان موضوعوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن سب رس کے دکن نمبر کو ملک اور ادارۂ ادبیات اردو کے شایاں اعلیٰ معیار پر مرتب کیا جا رہا ہے۔ یہ نمبر دکن کے سیاسی، سماجی، اور تمدنی حالات کی ایک مستند اور شگفتہ تاریخ ہونے کے علاوہ مستقبل کے لئے ایک ایسا رہبر ثابت ہوگا جس کی رہنمائی میں عہد حاضر کی بعض گتھیاں سلجھ سکتی سکتی ہیں۔ اس میں تاریخ دکن کے جملہ پہلوؤں پر ذمہ دار اور موزوں و مستند اصحاب سے مضامین اور مقالے تیار کر کے شایع کئے جا رہے ہیں اور ان کے علاوہ زمانۂ قدیم سے آج تک کے سلاطین و امرائے دکن کی ایسی نادر و کمیاب تصویریں بھی شایع کی جا رہی ہیں جن میں سے نصف کے قریب تو بالکل پہلی دفعہ شایع ہو رہی ہیں۔ اور ایسے مشاہیر کی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں اس سرزمین کی سیاسی اور تمدنی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا تھا۔ ان تصاویر کے لئے ادارہ نواب سالار جنگ بہادر کا ممنون منت ہے۔ کیونکہ یہ سب نواب صاحب ممدوح ہی کے گراں بہا خزائن فنون لطیفہ کی بیش قیمت قدیم قلمی تصویروں سے حاصل ہوئی ہیں۔ اگر نواب سالار جنگ بہادر کی ذاتی توجہ اور خاص دلچسپی شامل نہ ہوتی تو ادارہ کہاں آب و تاب کے ساتھ سب رس دکن نمبر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔

یہ مرقع دکن سالانہ خریداروں کو تو مفت دیا جائے گا لیکن صرف ایک پرچہ علیحدہ خریدا جائے تو دو روپیے سے کم قیمت میں نہ ملے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس نمبر کی محض تصویروں کی لاگت اس قیمت سے زیادہ ہے۔

سب رس اپنے قدردانوں سے متوقع ہے کہ وہ آئندہ سال بھی اپنی خریداری جاری رکھیں گے اور اپنے اعزہ و احباب کو بھی اس کا خریدار بنائیں گے۔ کیونکہ جتنے زیادہ خریدار ہوں گے اتنا ہی سب رس کی زیب و زینت میں اضافہ ہوگا۔ اس امر کے اظہار کی تو شاید ضرورت نہیں کہ یہ رسالہ جو اردو داں اصحاب میں علم و ادب کے ذوق کو عام کرنے کی خاطر نکالا جا رہا ہے۔ اس سے ادارہ یا اس کے کارکن کوئی ذاتی منفعت نہیں حاصل کرنا چاہتے۔ اس نے ایک سال ہی میں حیدرآباد میں کافی علمی و ادبی چہل پہل پیدا کر دی ہے اور یقین ہے کہ آئندہ سال اس کی دلچسپیاں اور دائرہ اثر اور بھی وسیع ہو جائے گا۔

اس مہینہ حیدرآباد میں سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ مرحوم سب رس کی معاون اور اردو کی مشہور انشا پرداز خاتون محترمہ صغرا بیگم صاحبہ کے شوہر اور خود بھی ایک اچھے مصنف اور شاعر تھے۔ چنانچہ ان کی ایک رباعی اس شمارہ میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس جانگداز غم و الم میں ادارہ محترمہ موصوفہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

ادارہ

مشرق کے قائد اعظم غازی مصطفیٰ کمال اتاترک مرحوم کی وفات حسرت آیات تمام مشرق کے لئے باعث رنج و الم ہے۔ افسوس ہے کہ یہ شمارہ تیار ہو چکا تھا ورنہ سب رس میں بھی اتاترک مرحوم کے متعلق بعض مضامین اور نظمیں ضرور شریک کی جاتیں۔ فی الحال جناب ماہر القادری صاحب کی ایک نظم درج ہے یہ اس نمایندہ جلسہ میں سنائی گئی تھی جو باشندگانِ حیدرآباد کی جانب سے ۱۰ ار نومبر کو پیالس ٹاکیز میں منعقد ہوا۔

صدقے تری جرارت کے سمجھایا زمانہ کو — تلوار کے سایہ میں رازِ مے و میخانہ
جس مے کی حلاوت نے ترکی کو کیا زندہ — اس مے کا ادھر بھی دے ساقی کوئی پیمانہ
سطوت کا تری نغمہ توپوں کے دہانوں پر — آزادیٔ کابل ہے شائد ترا افسانہ
تو مرد مجاہد ہے، تو غازیٔ ملت ہے — بھاری ہے زمانہ پر ایک عشوۂ ترکانہ

ثنا خواں ہیں صلیبوں کی زبانیں — تری وحدت پرستی کا فسانہ
تعالی اللہ! تری شانِ جلالت — لرزتا ہے شکوہ کافرانہ
ترا ہر کارنامہ غیر فانی — بدل دی تو نے تاریخ زمانہ
غلاموں کی نمازوں سے مقدس — ترا سجدہ بہ طرزِ غازیانہ

تو نے بتایا سارے جہاں کو — اک مرد غازی دنیا پہ بھاری
طاقت کے آگے جھکتی ہے سطوت — بیکار ہیں سب فریاد و زاری
مردان کامل، یارانِ سادہ — کرتے ہیں شب کو اختر شماری
غازی کی راتیں مشغول گئی ہیں — ہر سانس گویا اک سعیٔ جاری

رباعیات

جب غم سے دل و دماغ پھٹ جاتے ہیں — احباب بھی منہ پھیر کے ہٹ جاتے ہیں
دل کو، کیا کیا سکونِ دل ملتا ہے — جب سارے تعلقات کٹ جاتے ہیں

۲

جب، سازِ نفس سے سوز جھڑ جاتا ہے — فولاد سا سخت دل بھی مڑ جاتا ہے
جب گرتی ہے کڑکڑا کے غم کی بجلی — سرمایۂ ہوش، بھک سے اڑ جاتا ہے

امجد

غزلیات

نالہ مرا چمن میں ستم ڈھا کے رہ گیا — جو گل کھلا وہ آہ سے مرجھا کے رہ گیا
اتنا تو میکشوں کی دعا نے کیا اثر — میخانے پر اک ابرِ سیہ چھا کے رہ گیا
لایا گلِ مراد نہ جھونکا نسیم کا — دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا
سیلابِ اشک سے مجھے تسکین تو کیا ہوئی — کچھ اور آگ سینے میں بھڑکا کے رہ گیا
صورت جو محتسب کی نظر آ گئی مجھے — پینا کجا، شراب کا غم کھا کے رہ گیا
چلتے ہوئے چمن سے وہ بادِ صبا کے ساتھ — میں ساتھ ان کے نقشِ کفِ پا کے رہ گیا
اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسین — تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا
رندوں نے پی شراب تو جام و سبو کی طرح — مستی میں ایک ایک سے ٹکرا کے رہ گیا
تعریفِ حشر اس نے جو پوچھی تو میں جلیل
قصۂ شبِ فراق کا دہرا کے رہ گیا

فصاحت جنگ جلیل

(۲)

اضطرابِ اہلِ دل جیسے کہ نامعلوم ہے — ان کا طرزِ بے نیازی کس قدر معصوم ہے
لذتِ ذوقِ وفا سے فطرتاً محروم ہے — حسن کہتے ہیں جسے ظالم نہیں مظلوم ہے
کاش! پروانوں کی جرأت رنگِ محفل دیکھتی — بزم میں اک ابتری ہے شمع بھی مغموم ہے
مسکراہٹ ان کی دلکش ہو گئی کیا کیجئے — ان کی پیشانی پہ ان کا حالِ دل مرقوم ہے
آپ سن بھی لیں تو فرصت غور کرنے کی کہاں — عشق کا افسانہ تو مفہوم در مفہوم ہے
کیا اسی کا نام ہے ماہر محبت ۲ آل
میں ہوں اب اور سوگواریٔ دلِ مرحوم ہے

ماہر القادری

کیا لکھیں؟

جب کبھی میں نے اپنے احباب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو ان کا جواب ہمیشہ اس سوال کی شکل میں نمودار ہوتا رہا کہ "کیا لکھیں"؟
یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری زبان کی اخباری اور رسالہ جاتی زندگی ابھی عالم طفولیت میں ہے ورنہ یہ مسئلہ ایک حد تک خود بخود حل ہو جاتا۔ اور میرے احباب اگر وہ غیر معمولی طور پر کسی خاص مضمون کے ماہر نہوں ایسے موضوع سے اپنی تحریروں کی ابتداء کرتے جو عام پڑھنے لکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہو۔

ابھی ہم میں سے بہت سے حضرات کو دنیا کی روزمرہ زندگی کی معمولی باتوں ہی کے متعلق معلومات کی ضرورت ہے اور بجائے اس کے اطراف واکناف کی چیزوں پر کچھ لکھا جائے دور دراز کی اشیاء اور لاینحل مسائل پر قلم فرسائی کرنا نہ صرف اپنی قوتوں کو برباد کرنا بلکہ اپنے ملک قوم اور زبان کو دھوکا دینا ہے۔

ہمارے اکثر ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان جب کبھی قلم اٹھاتے ہیں تو ایسے موضوع اختیار کرتے ہیں جن کو صرف علماء اور مخصوصین ہی سمجھ سکتے ہیں، اور جن کی جگہ انسائیکلوپیڈیا ہی میں ہو سکتی ہے نہ کہ اخبار و رسائل میں، یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ حیدرآباد یا دہلی کا ایک اہل قلم "یونانی مجسموں" "فرانسیسی اخلاقی معیار" "جرمنی کی معاشرتی زندگی" یا "میکسیکو اور پیکانی رسم الخط" پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے۔ اور اگر نہیں لکھتا ہے تو "حیدرآباد اور دہلی کے آثار قدیمہ" "مغلوں یا قطب شاہوں کی تعمیری خصوصیات" "ہماری موجودہ معاشرت کے نقائص" یا "اردو رسم الخط میں اصلاحیں" جیسے موضوعوں پر جن پر مضامین ہی نہیں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں!
ایک قدیم طرز کے حیدرآبادی عالم جنھوں نے اردو میں کتابیں لکھ کر اس کی یقیناً خدمت کی ہے کھجور کی کاشت پر مسوط کتاب لکھتے ہیں لیکن خدا کے کسی بندہ کو اس امر کی توفیق نہیں ہوتی کہ آم یا خربوزے یا سیتاپھل (شریفہ) پر کوئی مضمون یا کتاب لکھے۔
اکثر اوقات دوستوں اور عزیزوں سے گفتگو کرنے کے دوران ہی میں اچھے اچھے موضوع ہاتھ آ جاتے ہیں۔ کوئی ایک لفظ ہی بعض وقت خیالات کا ایک سیلاب پیدا کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موضوع ہر سمت سے نکلے نظر آتے ہیں اگر آپ کی نظر تیز ہو اور آپ کا ذہن اشیاء کا عکس لینے کے لئے تیار رہے۔

دن رات کے کام کاج اور کھیل کود کا ہر پہلو موضوع پیش کرنے کے غیر محدود امکانات اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھائے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے شہر یا گاؤں ہی پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنے مضمون آپ کے ذہن میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، مثلاً

۱۔ ہمارے شہر کی اہم تجارت۔ ۲۔ اس کی دلچسپیاں۔ ۳۔ اس کے بہترین مناظر۔ ۴۔ اس کی سواریاں۔ ۵۔ اس کی سب سے بڑی سڑک۔ ۶۔ ہمارے ہم وطن شعراء۔ ۷۔ نثر نگار۔ ۸۔ نقاش۔ ۹۔ امراء۔ ۱۰۔ بادشاہ۔ ۱۱۔ فقیر۔ ۱۲۔ عمارتیں۔ ۱۳۔ باغ۔ ۱۴۔ محلوں اور

عمارتوں کے عجیب و غریب نام - ۱۵- رسم و رواج - ۱۶- قدیم روایتیں - ۱۷- عید اور تہوار وغیرہ -

اگر آپ حسن اتفاق سے کسی قدیم شہر کے باشندے ہوں تو آپ کو ہر ویرانے میں سبزہ کے ساتھ ساتھ مضمونوں اور فسانوں کے خاکے بھی اگتے ہوئے نظر آئیں گے۔ قدیم آبادیاں فسانوں کے خاکوں سے بھری پڑی ہیں۔ خصوصاً دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور۔ وہ شہر جن کے در و دیوار عظمت ماضی سے صدیوں ہم آغوش رہ چکے ہوں، قصوں کے سر جیون سرچشمے ہیں۔ اگر آپ کا محلہ یا اس کا قرب و جوار اور آپ کی روزمرہ کی گذرگاہیں کسی موضوع یا افسانوی خاکے سے آپ کی ضیافت کرتی نظر نہیں آتیں تو آپ ٹہلتے ٹہلتے یا گاڑی میں ذرا دور نکل جائیے اور پھر ذوق نظر اور قوت گوش سے کام لیجئے آپ شاید ہی محروم واپس ہوسکیں۔ فسانوں کے نہیں تو کم از کم مضامین کے خاکے تو آپ کو ضرور دستیاب ہو جائیں گے۔

۲ اگر آپ کو اپنے شہر کی کسی چیز کی نسبت کچھ لکھنے کا شوق نہیں ہے تو موضوع حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک لفظ لے لیجئے اور دیکھئے سیکڑوں عنوان آپ کے سامنے کھیلتے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ "عورت" کو لیجئے اور دیکھئے اس کے ساتھ کتنے عنوان آپ کے ذہن میں آگئے۔ مثلاً

ا ۱۔ عورت پردہ میں - ۲- بے پردہ عورتیں - ۳- صحیح اسلامی پردہ - ۴- ہندوستان اور پردہ - ۵- پردہ کی ضرورت - ۶- پس پردہ ۷- بے پردہ یورپ - ۸- اگر آج پردہ اٹھ جائے -

ب ۱- صحیح بیوی - ۲- بیوی جو مرد کو مرد بناتی ہے - ۳- بیویاں کیا جانتی ہیں - ۴- انتظام خانہ داری - ۵- ہوشیار بیویاں اور بے وقوف مرد - ۶- ہوشیار مرد اور بے وقوف بیویاں - ۷- مشہور بیویاں - ۸- مشہور آدمیوں کی بیویاں - ۹- بیوی کی ضرورت - ۱۰- مصنوعی بیویاں - ۱۱- چار بیویاں -

ج ۱- صحیح ماں - ۲- مشہور مائیں - ۳- مشہور آدمیوں کی مائیں - ۴- ماں کی ممتا - ۵- بچوں کی پرورش -

د ۱ کام کی عورتیں - ۲- رقاص عورتیں - ۳- مشہور طوائف - ۴- بھولارن - ۵- پنوارٹن - ۶- مامائیں - ۷- مالنیں - ۸- جلد باز عورتیں ۹- کل کی لڑکیاں - ۱۰- قدیم وضع کی عورتیں - ۱۱- حسین عورتیں - ۱۲- راز دار عورت - ۱۳- علمی عورتیں - ۱۴- کھلاڑی لڑکیاں - ۱۵- مردنما عورتیں - ۱۶- مردانہ عورتیں -

یہ مکمل فہرست نہیں ہے اور نہ کوئی ایک شخص اس کی تکمیل کرسکتا ہے۔ اور اس کے پیش کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ آج ہی بسم اللہ کہہ کر ان تمام عنوانوں پر مضمون نگاری کا قصد شروع کردیں۔ یہ اور اس قسم کے کئی عنوانوں میں سے اپنے لئے انتخاب کرتے وقت مضمون نگار بہت سوں کو رد کر دیتا ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ان کی نسبت اس کی معلومات کم ہوں۔

ان میں سے بعض عنوانات پر لکھنے کے لئے ذاتی تجربہ کی ضرورت ہے، اور بعضوں کی نسبت دوستوں یا اہل پیشہ اور ماہرین سے گفتگو کے دوران میں بہت سے نکتے حل ہوسکتے ہیں۔ ان زندہ ذریعوں کے علاوہ فنی کتابوں، انسائیکلوپیڈیا اور اس قسم کی دوسری معلوماتی تحریروں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں بھی اسی فصل کے سلسلہ میں ایک ضمیمہ کے طور پر ایسے سیکڑوں عنوان پیش کئے گئے ہیں جو دلچسپ اور کامیاب مضمونوں، افسانوں بلکہ کتابوں کے موضوع بن سکتے ہیں ۔

لکھنے کے لئے موضوع حاصل کرنے کا ایک اور مفید طریقہ یہہ ہے کہ ہمیشہ ایک نوٹ بک ساتھ رکھی جائے اور اس میں قصوں یا مضمونوں کے متعلق جو بھی خیال آپ کے ذہن میں آئے اس کو فوراً قلمبند کرلیجئے تاکہ کسی وقت اس سے کام لے سکیں ۔

اگر نوٹ بک ساتھ نہو تو کسی کاغذ کے ٹکڑے پر ایک آدھ لفظ لکھ رکھنا بھی نہایت سودمند ثابت ہوگا ۔ اپنے حافظہ پر کبھی بھروسہ نہ کیجئے ۔ یہہ بہت ممکن ہے کہ کوئی خیال اس وقت تو آپ کے ذہن میں موجود بلکہ واضح ہو ۔ لیکن آدھ گھنٹے کے بعد بالکل غائب ہوجائے ذہنی نقوش سے زیادہ تحریری نقوش پر اعتماد رکھئے ۔ موقع اور وقت پر صرف ایک لفظ یا اشارہ قلمبند کرلینا کافی ہے اور پھر جہاں آپ کو فرصت ملے پورے خیال کو لکھ ڈالئے ۔ لیکن اس دفعہ بھی ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہ ڈالئے ۔ ورنہ کام میں ایک طرح کی مصنوعیت پیدا ہوجائے گی ۔

بعض دفعہ رات میں جب نیند اچاٹ ہوجاتی ہے اور انسان بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا ہے اس کا دماغ غیر ارادی طور پر قسم قسم کے مضمونوں اور قصوں کے خاکے پیش کرتا جاتا ہے ۔ اس وقت اگر دلچسپ خیال مل جائے تو اس کو جانے نہ دیجئے ۔ اس کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کیجئے کہ آپ کا تخیل اس پر روشنی ڈالتا رہے ۔ اور اگر اس طریقہ کار سے کوئی کام کے مکالمے ترکیبیں یا جملے پیدا ہوتے جائیں تو اُن کو فوراً لکھ ڈالئے ۔ ہوشیار انشا پرداز بستر کے قریب ہمیشہ کاغذ اور پنسل رکھا کرتے ہیں بعض اصحاب کے ذہن میں صبح نیند سے بیدار ہونے کے بعد ناولوں، نظموں اور مضمونوں کے متعلق خیالات پیدا ہوتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اُن کی نسبت اسی وقت ایک آدہ لفظ لکھ لیتے ہوں ۔

غرض اگر آپ سلیقہ اور اصول کے ساتھ خیالات کو قلمبند کرکے جمع کرتے جائیں تو چند مہینوں میں ایک نہایت اچھے ذخیرہ کے شاد کام مالک ہوجائیں گے اور کبھی خاکوں اور موضوعوں سے محروم نہ رہ سکیں گے ۔

ان موضوعوں سے متعلق جن سے آپ کو دلچسپی ہو انگریزی اور اردو اخباروں کے تراشوں (کٹنگز) یا ایسی عبارتوں کو جو افسانوں یا مضمونوں کے امکانات پیش کرتی ہوں جمع کرتے رہئے ۔ پھر ان تمام کو سادہ کاغذ پر چپکا کر محفوظ کرلیجئے اور فرصت کے اوقات میں ان کو مضمون وار ترتیب دیتے رہئے اگر ہوسکے تو "نیوز پیپر کٹنگ البم" خرید لائیے اور ان تراشوں کو اس میں محفوظ کرلیجئے ۔

(ماخوذ از فن انشا پردازی)

سید محی الدین قادری زور

رباعی

اے گل یہہ بتا تجھ میں بو کس کی ہے
دل لینا لپٹ لپٹ کے خو کس کی ہے
باغوں میں جو جا کے خاک اڑاتی ہے نسیم
اب تک نہ کھلا کہ جستجو کس کی ہے

سید ہمایوں مرزا

فرزندان دارالعلوم کی علمی خدمات پر ایک نظر

(دوسری قسط)

نثر نگاران | نثر نگارانِ دارالعلوم کی تعداد شاعروں سے زیادہ ہے، فرزندان دارالعلوم کے تصنیفات کا پتہ چلانا کوئی آسان امر نہیں ہر البتہ مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

دور اول کے نثر نگاروں میں ملا عبدالقیوم مرحوم، مرزا مہدی خاں کوکب اور نواب قادر نواز جنگ کے نام پیش پیش ہیں، ملا عبدالقیوم مرحوم کا نام حیدرآباد کے علمی اور قومی اسٹیج سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔ انھوں نے "استدعا تعلیم جبری" کے نام سے ایک نہایت ضخیم رپورٹ شائع کی تھی۔ یہ کتاب معلومات کا ایک کافی ذخیرہ رکھتی ہے اور اپنے زمانے کی قابلِ قدر کتاب ہے، ملا صاحب نے اس وقت جبری تعلیم کی استدعا کی تھی جب کہ ہندوستان کے مشہور مصلح قوم کو کھلے کی آواز بھی ہنوز بلند نہیں ہوئی تھی۔ ملا صاحب کے دیگر تصانیف اور ان کے بیش بہا علمی اور اخلاقی مضمون بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مرزا مہدی خاں کوکب وہ پہلے شخص ہیں جو دارالعلوم کی تعلیم کے بعد یورپ تشریف لے گئے اور وہاں سے علم معدنیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ کی کتاب "گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالی" قابل قدر معلومات کا گنجینہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے دیگر تصانیف اور تراجم بھی اُردو زبان میں بیش بہا اضافہ کا موجب ہیں۔

قادر نواز جنگ مرحوم کو شاعری کے ساتھ نثر نگاری کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ "شیراز کی مہربانو" اور "دشمنِ جاں" دو اخلاقی ناول آپ کی یادگار ہیں، ثانی الذکر کتاب میں شراب کی مذمت اور اس کے برے نتائج کی تفصیل کی گئی ہے۔

اس دور کے کئی اور بھی نثر نگار ہیں کہ ہم ان کے کارناموں سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس لئے تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

دوسرے دور کے نثر نگاروں کی صرف فہرست بھی خاصی طویل ہوسکتی ہے۔ یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے اس دور کے نثر نگاروں نے مختلف علوم و فنون میں اپنی قوت فکر اور زورِ قلم کا اظہار کیا ہے، ادب، اخلاق، تاریخ، فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، ریاضی اور کلام غرض مختلف فنون میں ان کے تصانیف ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولوی جمال الدین نوری مرحوم۔ مولوی غلام مصطفےٰ ذہین مرحوم۔ شاعری کے ساتھ نثر نگاری میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے نوری مرحوم کی کتاب شرح دیوان غالب ایک قابل قدر ضخیم کتاب ہے افسوس کہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی۔ ذہین مرحوم کے اخلاقی مضامین اور کتابیں لائق ستائش ہیں۔

مولانا عبدالقدیر صدیقی کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن سے آپ کی نثر کا پوری طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے،

حضرت امجد نے نظم کی طرح نثر کے میدان میں بھی جولانی دکھائی ہے آپ کی کتابیں جمال امجد، حج امجد، حکایات امجد، گلستان امجد نثر اردو کے انمول نگینے ہیں۔

جمال امجد آپ کی خود نوشتہ سوانح زندگی ہے، گر یہ ایسی سوانح ہے جس میں تصوف اور حقائق کا خزانہ جمع کردیا گیا ہے۔

معرفت اور حقیقت کا دریا بہا دیا ہے، فلسفہ اور حکمت کا مخزن بنا دیا ہے، اسی طرح گلستان امجد جو سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہے مگر اس کی حالت ترجمہ کی نہیں بلکہ تصنیف کی ہوگئی ہے، جس میں سعدی کی نظم و نثر کا تو نثر میں ترجمہ کیا ہے اور موقع بہ موقع اپنی رباعیات، قطعات وغیرہ درج کئے ہیں جس کے باعث ترجمہ کی شان باقی نہیں رہی ہے ۔

اس دور کے نثر نگاروں میں مولوی مرتضیٰ مرحوم کا نام بھی درخشاں نظر آتا ہے، آپ کے تاریخی اور تعلیمی مضامین اپنی آپ نظیر ہیں، تاریخی مقالات جو جدید اصول کے لحاظ سے تنقیدی پہلو پر لکھے گئے ہوں ان کے دکن میں آپ ہی موجد ہیں، آپ کی کتاب روح تمدن، جو سلطنت آصفیہ کی تاریخ ہے مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی اور اب اس کا ایک حصہ عہد سلف کے نام سے شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے آپ کی تاریخی معلومات کا کیا درجہ ہے، روح ترقی، تاریخ التاریخ، میلاد خاتم النبی، سوانح باقر آگاہ، وغیرہ آپ کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں ان کے علاوہ معارف علی گڈھ اور صحیفہ حیدرآباد دکن وغیرہ میں آپ کے بیسیوں مقالے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں ۔

اس دور کے نثر نگاروں میں مولوی عبدالباسط اور مولوی اکبر علی بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں، مولوی عبدالباسط جو ملا عبدالقیوم مرحوم کے تیسرے فرزند ہیں اپنے والد بزرگوار کی طرح دارالعلوم سے استفادہ کیا اور اپنے عمدہ ادبی اور تاریخی مضامین کے لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔ رسالہ صحیفہ میں آپ کے قابل قدر مضامین عام طور سے دلچسپی سے دیکھے جاتے تھے، مولوی محمد اکبر علی مہتمم اخبار صحیفہ بھی اپنی ادبی قابلیت سے مشہور ہیں رسالہ صحیفہ اور پھر اخبار صحیفہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے جو نام آوری آپ نے حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں ہے ایک عربی ناول کا ترجمہ بھی آپ نے معجزۂ محبت کے نام سے شائع فرمایا ہے،

مولوی شمس الدین صدیقی صاحب اور مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب بھی اسی دور کے نثر نگار ہیں، صدیقی صاحب کے چھوٹے چھوٹے اخلاقی اور اصلاحی رسالے اور عندلیب صاحب کی کئی ایک مذہبی کتابیں نثر اردو میں قابل قدر اضافے ہیں ۔

اس دور کے ایک مشہور مضمون نگار مولوی محمد مظہر ہیں[1] آپ کی تصنیف "قلمرو آصفی کی دولت" سلطنت آصفی کی دولت و ثروت، صنعت و حرفت کی معلومات کا گنجینہ ہے، یہ کتاب حضرت غفران مکاں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی چہل سالہ جوبلی کی نمائش میں پیش ہوئی تھی اور آپ کو اس پر انعام ملا تھا۔ مظہر صاحب کی دوسری کتابیں بھی ہیں مثلاً اخلاق رسالت پناہی وغیرہ اس کے علاوہ آپ کے کثیر مضامین رسالہ اور اخبار صحیفہ میں شائع ہوئے ہیں، حیدرآباد کی سیاسی، تعلیمی، علمی، صنعتی وغیرہ معلومات پر جس قدر آپ کو عبور حاصل ہے وہ بہت کم اصحاب کو ہوگا۔

اس دور کے ایک نثر نگار عبدالرزاق بسمل ہیں، ان کی کتابیں تذکرۂ جمیل، اور صنف نازک مقبولیت حاصل کرچکی ہیں ان کا رسالہ شہاب کئی سال سے ملک کی خدمت گزاری میں مصروف ہے ۔

اس دور کے اور بھی کئی نثر نگار ہیں مثلاً مولوی اکرام علی صاحب، مولوی محمد نصیر الدین صاحب، مولوی قادر مرتضیٰ حسین صاحب وغیرہم

---

[1] مولوی حافظ محمد مظہر صاحب، مولوی مرتضیٰ مرحوم سابق سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس کے بھائی ہیں، اور اب کانفرنس کے سکریٹری آپ ہی ہیں ۔

طوالت کے خوف سے سب کی صراحت نظر انداز کی جاتی ہے۔

دار العلوم کے تیسرے دور کے بھی کئی ایک نثر نگار میدان عمل میں گام زن ہیں، مثلاً مولوی حسام الدین صاحب فاضل، مولوی عبدالرب صاحب کوکب اڈیٹر رسالہ اتالیق، مولوی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالسلام مرحوم وغیرہ،

مولوی حسام الدین صاحب اپنے وعظ کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں، مولوی عبدالرب نے بزم انجم کے نام سے اردو میں علم ہئیت پر قابل قدر رسالہ شائع کیا ہے اور اپنے رسالہ اتالیق کے ذریعہ ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ مولوی عبدالغفار صاحب کی کئی کتابیں اخلاقی اور اصلاحی شائع ہوئی ہیں۔ مرحوم عبدالسلام کی کئی تصانیف ہیں اس کے علاوہ ان کے بیسیوں مضامین ملک کے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مرحوم کی بے وقت جوان موت ایک افسوس ناک واقعہ ہے، ملک کی اور دار العلوم کی بڑی بڑی امیدیں مرحوم سے وابستہ تھیں۔

راقم الحروف کو بھی دار العلوم کے تیسرے دور سے ہی تعلق ہے، میری مطبوعہ کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) دکن میں اردو (اس کے اب تک تین اڈیشن شائع ہوے ہیں، تیسرا اڈیشن بالکل جدید تالیف کی حیثیت رکھتا ہے) (۲) نجم الثاقب (شافعی فقہ) (۳) رہبر سفر یورپ (۴) یورپ میں دکھنی مخطوطات (۵) حضرت امجد کی شاعری (۶) مکتوبات امجد (۷) خواتین عہد عثمانی (۸) ذکر نبی (۹) خیابان نسوان (۱۰) دفتر دیوانی کے اردو مخطوطات کی فہرست (۱۱) سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری ان کے علاوہ چند اور کتابیں عنقریب شائع ہونے والی ہیں مثلاً (۱) مقالات ہاشمی حصہ اول و دوم (۲) مدراس میں اردو (۳) صغرا بیگم کے موسومہ خطوط وغیرہ۔

دار العلوم کے چوتھے دور کے طلبہ کو چونکہ جامعۂ عثمانیہ سے تعلق ہے اس لئے ان کے کارناموں کی صراحت ہمارے موضوع سے باہر ہے

صحافت } اخباروں اور رسالوں کی اڈیٹری بھی ایک بہت بڑی علمی خدمت ہے لہٰذا اس کی صراحت بھی اس موقع پر ضروری ہے فرزندان دار العلوم نے اس حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیئے ہیں، جو اصحاب اس زمرہ میں شامل ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولوی سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے رسالہ صحیفہ جاری کیا تھا "انجمن معارف" کی زیر نگرانی یہہ رسالہ شائع ہوا کرتا تھا۔

(۲) مولوی محمد اکبر علی صاحب۔ انجمن معارف کے شکست ہونے کے بعد مولوی اکبر علی صاحب اس رسالے کے اڈیٹر بنے، کئی سال تک یہہ رسالہ ماہوار شائع ہوتا رہا۔ اس میں عموماً اہل دکن اور خصوصاً فرزندان دار العلوم کے علمی، اخلاقی، تاریخی، فلسفی، ادبی وغیرہ مضامین شائع ہوتے تھے یہہ رسالہ اپنے بیش بہا مضامین کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں خاص وقعت رکھتا تھا۔ اس کے دلچسپ اور پر از معلومات مضمون عام اور خاص میں مقبولیت رکھتے تھے۔

چند سال کے بعد رسالہ نے روزانہ اخبار کی صورت حاصل کی جنگ ٹرکی اور بلقان کے زمانے میں اس اخبار نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی۔ اس زمانے میں سوائے منشیر دکن اور صحیفہ کے کوئی دوسرا روزانہ اخبار نہیں تھا۔ اخبار صحیفہ نے ملک کی جو خدمت کی ہے وہ ہر آئینہ لائق ستائش ہے۔

(۳) مولوی عبدالباسط صاحب فرزند ملا عبدالقیوم مرحوم نے "معارف" کے نام سے ایک روزانہ اخبار شائع فرمایا تھا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ (۴) مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب، ایک پندرہ روزہ اخبار "واعظ" کے نام سے شائع کرتے ہیں، یہہ اخبار پہلے ماہوار رسالہ کی صورت میں شائع ہوا کرتا تھا، اس کے بعد یہہ پندرہ روزہ اخبار کی صورت میں منتقل ہوا، اس میں مذہبی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں، عموماً اہل اسلام خصوصاً دیہات کے مسلمانوں کی اصلاح اس رسالہ کا نصب العین ہے اور اپنے مقصد میں کامیابی کی پوری کوشش کرتا ہے۔ (۵) مولوی عبدالرب کوکب، ایک ماہوار رسالہ بچوں کے لئے "اتالیق" کے نام سے شائع کرتے تھے، سرکار عالی کی جانب سے مدارس میں تقسیم ہوتا تھا۔ (۶) مدرسہ دارالعلوم سے ایک رسالہ مولوی عبدالواسع مرحوم سابق پروفیسر عثمانیہ کالج کی اڈیٹری اور راقم کے اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس رسالہ کا نام "ثمرۃ الادب" تھا کیونکہ دارالعلوم کالج کی یونین انجمن ثمرۃ الادب کی جانب سے یہہ شائع ہوتا تھا۔ بعض طلبہ اور پروفیسران دارالعلوم کے مضامین اس میں شائع ہوے ہیں، ایک سال کے بعد یہہ رسالہ بند ہوگیا۔ (۷) بسمل صاحب کئی سال سے رسالہ شہاب شائع کر رہے ہیں جو اپنی پابندی وقت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے، اُردو زبان کی خدمت گزاری اور "بلدیہ" کی خدمت اس کا نصب العین ہے۔

بہرحال فرزندان دارالعلوم نے صحافت کے میدان میں پوری جولانی دکھائی ہے اور ان کو اس میں کامیابی بھی ہوی ہے۔

علمی انجمنیں

متخرجین دارالعلوم نے علمی انجمنوں کے ذریعے بھی ملک کی کافی خدمت انجام دی ہے، اس کی پوری تفصیل ہمارے اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ بطرز نوٹ کچھ صراحت کردی جاتی ہے:۔

ملا عبدالقیوم مرحوم نے نواب عماد الملک مرحوم کے ساتھ شریک ہوکر "دائرۃ المعارف" کی بنیاد ڈالی اور اپنے ذاتی صرفوں سے اس کی ابتداء فرمائی، اس ادارہ کا مقصد یہہ تھا کہ نایاب عربی کتابوں کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے۔

اس ادارہ نے جو ترقی حاصل کی ہے اس کو اہل ملک نے بچشم خود چند ماہ پہلے دیکھ لیا ہے جب کہ سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا جو ادارہ کہ صرف ذاتی صرفہ سے قائم ہوا تھا وہ اب سرکار عالی کی توجہ سے پانچ لاکھ کے مستقل سرمایہ سے کام کر رہا ہے، اور اب تک (۹۰) کتابیں جن کی تقریباً دو سَو جلدیں ہوتی ہیں شایع ہوچکی ہیں، نہ صرف ہندوستان بلکہ بلاد اسلامیہ اور یورپ میں بھی اس ادارہ کی کافی شہرت ہے،

انجمن معارف، ملا صاحب مرحوم کی سرپرستی میں دارالعلوم کے چند نوجوانوں نے ایک علمی انجمن بنام "انجمن معارف" قائم کی تھی اس میں علمی لکچر ہوتے تھے اور ایک علمی رسالہ صحیفہ شائع ہوتا تھا۔

دارالعلوم ہی کے فرزند نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی، جب تک مولوی مرتضیٰ مرحوم زندہ رہے کانفرنس کو ترقی دینے میں مصروف رہے ان کے بعد کانفرنس پر مردنی چھاگئی تھی مگر اب پھر دارالعلوم ہی کے فرزندوں محمد مظہر، مرزا محمد بیگ صاحب، حبیب الرحمن صاحب وغیرہ کی کوشش سے دوبارہ بیدار ہوکر کام کررہی ہے، چنانچہ گزشتہ مہر میں اس کے اجلاس ہوچکے ہیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی اور ملک میں علمی بیداری پیدا کرنے اور جامعہ عثمانیہ کے

قیام میں جو کچھ جدوجہد اس نے کی ہے اس کی تفصیل کا یہہ موقع نہیں ہے

فرزندان دارالعلوم نے "انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم" بھی قائم کی تھی نادار طلبہ کو وظائف دینا، متخرجین دارالعلوم کو انگریزی کی تعلیم دلانا اور عموماً تعلیمی اور خصوصاً دارالعلوم کے تعلیمی امور کی جانب سرکار کو متوجہ کرنا اس انجمن کا مقصد اعظم تھا۔

مرتضیٰ مرحوم کی زندگی تک یہہ انجمن بھی اپنے مقاصد میں پوری طرح سرگرم رہی، اس کے سالانہ اجلاس خصوصاً دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کا علمی جلسہ حیدرآباد کے علمی جلسوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا جو اپنی شان شوکت اور نوعیت کے لحاظ سے پہلا جلسہ تھا۔

مرحوم عبدالسلام نے انجمن اساتذہ کلبرگہ کی بنیاد قائم کی تھی جس نے اب کانفرنس اساتذہ کی صورت حاصل کرلی ہے جو ملک کی ایک کامیاب تعلیمی کانفرنس خیال کی جاتی ہے۔

عبدالسلام مرحوم نے اور بھی کئی علمی، اخلاقی اور مذہبی انجمنیں قائم کی تھیں اور اپنی زندگی تک وہ ملک کی خدمت گزاری میں معروف و منہمک رہے، مرحوم کا نام ہی "انجمن گر" رکھ دیا گیا تھا۔

انجمن ثمرۃ الادب بھی دارالعلوم ہی کے طلبہ کی انجمن تھی، ملک کی علمی بیداری میں اس انجمن کا بھی حصہ ہے، عام علمی اخلاقی طبی جلسوں کی بنیاد اسی انجمن کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔

اس طرح فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کثیر ہیں، جن کی تفصیل اور صراحت دشوار ہے، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی تالیف "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کا ذکر بھی جابجا کیا ہے اور ان کے علمی کارناموں کے معترف اور مداح ہیں۔

یہہ ہے فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کی مختصر روئداد جو حیدرآباد کی علمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

نصیر الدین ہاشمی

غزل

آنسو نہ کبھی بہائیں گے ہم
کیا دل کی لگی بجھائیں گے ہم

گھبرا کے کہیں بھی جائیں گے ہم
پھر تیرے ہی در پہ آئیں گے ہم

دیوانہ بنا دیا ہے تم نے!
دنیا کو بہت ہنسائیں گے ہم

جب اپنی شکست مان لیں گے
اس دن سے نظر نہ آئیں گے ہم

گرویدہ ہے وجہہ بے قراری
نظریں ہی نہیں اٹھائیں گے ہم

جب آئے گی یاد چھیڑ ان کی
روتے میں بھی مسکرائیں گے ہم

تم لاکھ دکھاؤ بے نیازی
طالبؔ ہیں ضرور آئیں گے ہم

محمد طالب حسینی

تعلیمی سفر یورپ

(ڈائری کے دو ورق)

روز یکشنبہ ۱۲ر جون ۱۹۳۷ء آج کل یہاں اُجالا بہت جلد ہوجاتا ہے اور سویرے ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتی رہتی ہوں کہ آخر کیا وقت ہوگیا ہوگا۔ آج ہم اس وقت تک کہیں باہر نہیں گئے۔ چونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم بہت دور جائیں گے مسز وتا نے آرام کے لئے وقت دیا ہے۔ علاوہ اس کے آج اتوار کا دن بھی ہے اور تمام بڑی بڑی دکانیں اور ادارات بند رہتے ہیں۔ غرض کہ ہماری قیام گاہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا اور ہم کو فرانس کے سیاسی حالات سنائے گئے۔ فاضل مقرر نے آغاز تقریر ہی میں فرمایا۔ یورپ ایسا کوربخت ملک ہے کہ اس میں اتحاد عنقا ہو رہا ہے۔ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ساتھ ہی ہر ملک کی تہذیب بھی جداگانہ ہے۔ آزادی اور اقتدار کی زد میں صدیوں سے کشمکش چلی آرہی ہے اور ہنوز سکون نصیب نہیں ہوا۔ بعض اوقات یہی ہیجان یہاں انقلاب کی صورت میں نمودار ہوتا رہا۔

سنہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب عظیم نے فرانس کی کایا پلٹ دی اور اس کے بے انتہا تاثرات میں سے زیادہ اہمیت اُن اقتصادی، اخلاقی و دماغی ترقیوں اور آزادی کو دی جاتی ہے جس نے قوم کے رگ و ریشہ میں ایسا تموج برقی پیدا کردیا اور انھوں نے یہ جان لیا کہ زیست کا دوسرا نام آزادی ہے اور مساوات و اخوت و حریت کے بلند نعروں سے تمام ملک کو جگا دیا۔ فرانس کی آبادی پچاس فی صدی شہری اور پچاس فی صد ہا مزارعین پر مشتمل ہے۔ غلہ کی کاشت بس اس قدر ہوتی ہے کہ تمام ملک کے لئے کافی ہوجائے۔ فرانس بیرون ملک کی درآمد کا محتاج نہیں۔ برعکس اس کے اگر انگلستان سے ممالک خارجہ و نوآبادیات قطع تعلق کرلیں اور اناج کی درآمد روک دی جائے تو اہل ملک کو فاقہ کشی کی نوبت آجائے۔ فرانس کے باشندوں کے دل فرقہ وارانہ تعصب سے صاف ہوتے ہیں جس کا بیّن ثبوت اس امر سے ہوتا ہے کہ ممالک خارجہ سے لوگ آتے ہیں اور فرانس میں سکونت پذیر ہوجاتے ہیں اور ملک کا تمدن اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اہل فرانس صرف صلح پسند ہی نہیں بلکہ دخل در معقولات سے حتی الامکان کنارہ کش رہتے ہیں اور اپنی آزادی میں وہ خود غرض نہیں ہیں بلکہ اوروں کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ حقوقِ انسانی کی حفاظت ان کا فرضِ اوّلین ہے۔ فرانس میں بہت سی سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ اشتراکی جماعت زیادہ طاقتور نہیں اور عورتوں کو اب تک حق رائے دہندگی نہیں دیا گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود انھوں نے کبھی مطالبہ ہی نہیں کیا وہ گھریلو کاموں سے زیادہ اُنس و دلچسپی رکھتی ہیں اور شوہروں سے موافقت کا یہ حال کہ باہم شیر و شکر رہتی ہیں اور یونہی تمام حقوق حاصل ہوجاتے ہیں ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں رہتا۔ اختتام تقریر پر مباحثہ کے لئے وقفہ دیا گیا اور آخر میں مسز وتا نے مقرر کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب ملکر شاہی محل دیکھنے گئے جس کی تعمیر لوئی چہاردہم کے عہد میں ہوئی تھی۔ رہنما نے تبلایا کہ جب بادشاہ شکار کھیلنے نکلتا تو اکثر وہیں جاکر ٹھیرتا تھا۔ اس شکارگاہ میں بتدریج کمرے بنتے گئے اور قلیل عرصہ میں ایک رفیع الشان محل کھڑا ہوگیا فی الحقیقت بادشاہ کے رہائش کے کمرے، دربار کا ہال، کھانے کے اور استراحت کے کمرے بہت نفیس ہیں

کپڑے بدلنے کا بہت بڑا کمرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جلیل القدر ڈیوک علی الصباح بادشاہ کو کپڑے پہنانے حاضر ہوتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ رہتا تھا اور سب اس کی رونق افروزی کے منتظر رہتے۔ بادشاہ کو لباس پہنانے کا اعزاز نہایت اہم سمجھا جاتا تھا۔ ایسے افراد منتخب ہوتے تھے جن سے بے تکلفی ہوتی تھی اور ذیشان بھی ہوتے تھے۔ لوئی کی والدہ اور بیوی کے کمرے اپنی پاکیزگی اور نفاست میں بے مثل ہیں۔

قصرِ شاہی کی دیواریں تمام گلکاری اور تصاویر سے مزیّن کی گئی ہیں۔ لیکن ہر جگہ بادشاہ کی تصویر زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ٹوپی میں سفید پروں کا طرّہ لگا ہوا ہے۔ بادشاہ کی والدہ کے کمروں میں لوئی کے لڑکپن کی تصویریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ نہایت دانشمند خاتون تھی اور اس نے اپنے فرزند ارجمند کی تربیت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا لیکن لوئی کے کردار کی ایک کمزوری کو دور نہ کر سکی۔ اُس میں اور اس کی بیوی میں اتفاق پیدا کرنے کی کوئی تدبیر اس کو سجھائی نہ دی۔ ان دونوں میں ان بن رہتی تھی کیونکہ لوئی حسین لڑکیوں کا شیدا تھا۔ ملکہ ناراض، اداس اور چڑچڑی رہا کرتی تھی اور تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ ان لڑکیوں کی رہائش کے لئے متعدد چھوٹے چھوٹے کمرے بنوائے گئے تھے۔ یہاں کا باغ بہت پرانا ہے۔ فلک بوس درختوں کے سایہ میں نشستیں بنی ہیں اور کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ لوگ آکر بیٹھتے ہیں اور سبزہ زار و گلہائے رنگین کے تختوں اور فواروں کے فرحت بخش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۱۴ جون دوشنبہ۔ ناشتہ کے بعد ہم سب بازاروں کی سیر کو روانہ ہوئے۔ اس قدر بڑی بڑی دکانیں ہوتی ہیں کہ اگر انسان پہلی دفعہ تنہا جائے تو مشکل سے باہر نکل سکے۔ ہزارہا چیزیں قرینے سے رکھی ہوتی ہیں اور ہر ایک پر قیمت کی چِٹھی لگی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں بھی اچھی دکانیں ہیں لیکن اتنے بڑے پیمانہ پر نہیں۔ ہم سب نے کچھ نہ کچھ خریدا۔ ہمارے پنجابی رفیقوں نے بہت سی ایسی چیزوں پر زرِ کثیر صرف کیا جو اکثر غیر ضروری تھیں۔

مسز دتا نے موٹریں تیار رکھی تھیں دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب ایک نہایت دلآویز مقام کی جانب روانہ ہوئے۔ پیرس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک نیا قایم شدہ مدرسہ ہے۔

آج کے نظام العمل میں اس اسکول کے معاینہ کو خاص جگہ دی گئی تھی۔ اتفاق سے ہمارا گزر خوشنما چمن اور گلزاروں پر سے ہوا جس طرف نظر اٹھاتے گلاب ہی گلاب دکھلائی دیتے نہایت خوش رنگ اور تر و تازہ۔ درخت اور بیلیں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ سرخ سفید پیازی و زرد گلاب کے گچھے اپنی رعنائیوں اور حسن آرائیوں سے دلکش نظارہ پیش کرکے تماشائیوں کو گرویدہ بنا رہے تھے۔ اس معصوم نشاطِ زندگی سے محظوظ ہونے والوں کا جی چاہتا تھا کہ اس فردوس مثال گلستان میں اتر پڑیں اور اُن گلوں کو دیر تک گھورتے رہیں تاکہ ان کا نقشہ نظروں میں جم جائے اور تا دیر باقی رہے۔ اتنے میں ہمارے ساتھیوں کے ایک گروہ نے یک بیک گانا شروع کر دیا "جیون کا سکھ آج پر بھو جیون کا سکھ آج" یہ غزل ختم ہونے بھی نہ پائی تھی کہ بمبئی والے رفیقوں نے تان لگایا۔

"If there is any trouble let us S.M.I.L.E.

مناظرِ قدرت کے عبور سے ادھر آنکھوں کو فرحت حاصل ہو رہی تھی۔ ادھر سامعہ نوازی سے دل میں سرور۔ غرض کہ فضا عجیب پُرکیف نظافت سے مملو ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے کا سفر ایک آن میں گذر گیا اور ہماری بس مدرسہ کی پھاٹک پر جا کھڑی ہوئی۔ مدرسہ کی عمارت بلندی پر ہے اور بجائے سیڑھیوں کے ڈھلوان سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ باقی آئندہ

مسز صوفی

میری سوچ

کبھی میں بھی جواں تھا سوچتا ہوں　　رگوں میں خوں رواں تھا سوچتا ہوں
خدا جانے کہاں بجلی گری تھی　　کہاں پر آشیاں تھا سوچتا ہوں
کبھی اے دوست کاشانہ بھی میرا　　چمن زارِ جناں تھا سوچتا ہوں
کوئی لمحہ بھی اپنی زندگی کا　　حیاتِ جاوداں تھا سوچتا ہوں
حقیقت میں کبھی پہلو میں دل تھا　　کہ اک وہم و گماں تھا سوچتا ہوں
وہ الطافِ کریمانہ تھے ان کے　　کہ میرا امتحاں تھا سوچتا ہوں
میں رویا تھا۔ گر دامن مرا کیوں؟　　کمل گلستاں تھا سوچتا ہوں
فلک پر تھا دماغ اور سرزمیں پر　　میں سجدہ میں کہاں تھا سوچتا ہوں
مرا دردِ محبت بھی کسی دم　　مرا آرام جاں تھا سوچتا ہوں
یہی اب سوچ باقی رہ گئی ہے　　کہاں پر ہوں کہاں تھا سوچتا ہوں

شور عابدی
(گلبرگہ)

ملّاجی کا مکتب

بسلسلۂ گزشتہ

ہاں! یہ بات کہنا بھول گیا کہ ملّاجی کو دیکھتے ہی سب نے مل کر السلام علیکم کا ایک نعرہ ضرور مارا اور انھوں نے اس کا جواب اس طرح کھینچ تان کر دیا کہ گویا کوئی بدّو نخلستان میں کھڑا ہوا اونٹوں کے بچوں کو پانی پلا رہا ہے۔

ملّاجی کا کسیرۂ کی طرح پھیلا ہوا سر، غلافی آنکھیں، آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ، لمبی ڈاڑھی کچھ سرخ، کچھ سپید اور کچھ کالی خاصی قوس قزح کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ ملّاجی نے ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیا، پہلے تو مسکرائے پھر فرمایا کہ بیٹا، شیرینی نہیں لائے؟ ہم نے کہا کہ جی نہیں! اماں جان نے کہا ہے کہ کل لے جانا۔ ملّاجی نے کہا کہ اچھا بیٹا! پھر کل ہی پڑھائی بھی شروع کر دینا، آج ایک طرف بیٹھ کر یہاں کی پڑھائی کا طریقہ دیکھ لو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ہم نے کہا کہ مناسب ہے۔ اور کھسک کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

اس کے بعد ملّاجی نے اٹھ کر ایک محراب کا پٹ کھولا اور کچھ عملی تعلیم دینے کا سامان نکالا۔ اس میں ایک تو چوب دستیوں کا سیٹ تھا جو پانچ یا چھ چھوٹی چھوٹی لکڑیوں پر مشتمل تھا اور ایک تسموں کا سیٹ تھا، جو سب چھوٹے بڑے ملا کر تعداد میں تقریباً چھ یا سات تھے۔ ان میں ایک تسمہ تقریباً دو فٹ کا تھا، دوسرا تین فٹ کا، چوتھا چار فٹ کا ہو گیا تھا۔ دوسری

ایک اور چھوٹی سی شئے تھی جو ڈفلی یا دف کے قبیل سے تھی، پھر دو رسیاں، کچھ سنگ ریزے اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں تھیں جن کو ملاجی نے اپنے سامنے اس طرح چن دیا تھا، جس طرح مداری تماشا کرنے سے پیشتر تمام سامان اپنے آگے جما لیا کرتا ہے۔

ملاجی کے بعض اشیاء پر خیال ہوتا تھا کہ وہ شاید فیروبل کے تحائف ہیں بعض پر گمان ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر منٹسوری کے تعلیمی آلات ہیں جو حواس کی تربیت کے لئے ملاجی نے جمع کر لئے ہیں اور بقیہ یعنی ڈف، کنکر، رسی اور تسموں وغیرہ پر شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید العزڈ بینیے کے تیار کئے ہوئے آلات ہیں جو بچوں کی ذہنی پیمائش کرنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ سامان نہ تو معصلات کی ناپ تول کرنے کے لئے تھا اور نہ ذہنی پیمائش کے لئے تھا بلکہ وہ تمام آلات جسمانی اصلاح کرنے کے لئے تھے یعنی اگر کوئی لڑکا نزدیک ہے اور زیادہ طاقتور ہے تو اس کے لئے چھوٹی چوب دستی استعمال کی جاتی تھی۔ ذرا کمزور ہے تو تسمہ سے مرمت کی جاتی تھی، ذرا دور ہے تو بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ اور اگر بھاگ رہا ہے تو سب سے آخری نمبر کی بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ استعمال کیا جاتا تھا اور جب وہ مکتب سے نکل کر صحن تک پہنچ جاتا تو ڈف بجا دیا جاتا تھا تاکہ وہ الارم سگنل کا کام دے اور تمام مکتب کے لڑکے بہ یک وقت اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑیں اور ڈنڈا ڈولی کر کے اسے مکتب میں ادھر اٹھا لائیں۔ پھر تو جسمانی حواس ناپنے کے دوسرے آلات استعمال کئے جاتے تھے، یعنی زنجیر اور لکڑی کا کندا، زنجیر کا سرا ٹانگ میں باندھ کر کندا کاندھے پر دھر دیا جاتا تھا اور وہ حضرت دو چار گھنٹے تک گدھے کی طرح لدے ہوئے سیدھے کھڑے رہتے تھے۔ کبھی دیوار سے پیٹھ کا سہارا دے کر ذرا جھکا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اور وہ کرسی بنے ہوئے دو ایک گھنٹے تک اسی طرح کھڑے رہتے تھے، کبھی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو چارپائی کے پایوں کے نیچے دبا کر پٹی پر کسی مسنڈے کو بٹھا دیا جاتا تھا، کبھی ہاتھوں کو پاؤں میں سے نکال کر دونوں کان پکڑوائے جاتے تھے اور لیول قائم رکھنے کے لئے ان کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا بدھنا یا ایک تختی رکھ دی جاتی تھی۔ اس طرح وہ حضرت گھنٹے دو گھنٹے تک مرغ بنے ہوئے کھڑے رہتے تھے اور کبھی رسی سے دونوں ہاتھ باندھ کر ان کو ٹاٹ پر اس طرح کھینچ دیا جاتا تھا کہ نہ تو ان کے پاؤں زمین پر پوری طرح ٹکے رہتے تھے۔ نہ ادھر رہتے تھے۔ غرض یہ کہ ایسے بہت سے طلسم اور چٹکلے موجود تھے جن سے لڑکوں کی کھال نرم کر دی جاتی تھی اور ٹیڑھا راستہ چلنے والوں کو جنتر میں کھینچ کر تکلے کی طرح سیدھا کر دیا جاتا تھا۔ بظاہر ملاجی نہایت بردبار، سلیم الطبع اور رحم دل واقع ہوئے تھے اس لئے، ہم نے دیکھا کہ تعلیمی آلات جمانے کے دوران میں ہمارے ملاجی کے لڑکے گھر میں سے نکل کر مکتب میں نازل ہو گئے۔ یہ لونڈے تعداد میں شاید بارہ تھے جو چار نفر فی استانی ماں کے حساب سے اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ وہ ملاجی پر گدھ کی طرح گرے۔ کسی نے ان کی مونچھوں کے بالوں کا جائزہ لے لیا، کسی نے ڈاڑھی کو مٹھیوں میں بھر بھر کر ناپنا شروع کر دیا، کوئی پیٹھ پر جونک کی طرح چمٹ گیا۔ کسی نے ان کی کھوپڑی کا رقبہ نکالنا شروع کر دیا، کوئی پیٹ سے بندر کی طرح لپٹ گیا اور کوئی ان کی گود میں قلابازیاں کھانے لگا۔ ملاجی کی یہ محبت اپنی اس لیمیٹڈ کمپنی اینڈ سنس تک ہی محدود تھی مگر جو بچے کہ پڑھنے آتے تھے ان کے متعلق بجز چند موقعوں کے ملاجی اس اصول پر عمل کرتے تھے کہ "جور استاد بہ ز مہر پدر" وہ چند موقعے عید، بقرعید، محرم اور شب برات کے تھے کہ ملاجی لڑکوں سے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ دیکھو بیٹا! ہم نے مفلس، نادار، یتیموں اور یسیروں کے لئے بیت المال کھولا ہے۔ بکرا ذبح ہوتے ہی کھال خود لا کر یہاں پہنچا دینا۔ کسی سے کہتے تھے کہ بیٹا! ذرا حلوا زیادہ لانا، ہمارے گھر میں رات کو مردے کثرت سے آئیں گے، غرض یہ کہ اسی طرح مختلف موسموں پر مختلف موسمی فرمائشیں اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور جہاں شب برات وغیرہ ختم ہوئی اور ملاجی ترش رو اور کڑوے

ہوجاتے تھے۔ ہاں تو ملّاجی نے وہ تمام جسم کے رقبہ ناپنے کے آلات سامنے چن دئیے اور اپنا ذرا حلق صاف کرکے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھی پھر کیا تھا، مکتب کے لونڈوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر بے تحاشا چلانا شروع کردیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکا ابتدائی قاعدہ لئے ہوئے سامنے آیا۔ قاعدہ تو چھوٹا سا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اُسے پڑھاتے وقت چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ اس قاعدہ کے مصنف نے، اس میں دنیا بھر کے طریقے بھر دئیے ہیں، یعنی طریق الصوت بھی ہے، طریق تہجی بھی ہے، طریقۂ راست بھی ہے طریقہ بالواسطہ بھی ہے، طریقہ ریتکشانی بھی ہے اور طریقہ تراکزی بھی ہے، صرف شرط یہ ہے کہ پڑھانے والا اُستاد اور تجربہ کار ہو تو یقین کامل ہے کہ بچہ ایک مہینہ اندر باہر ہی معلم الملکوت کے بھی کان کترنے لگتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ اس میں کل لے دے کے ۲۸ حروف اور شاید دس بارہ تختیاں ہیں مگر ان کا تلفظ کرتے وقت کبھی تو ملّاجی کا سینہ پھول کر لقا کبوتر کی طرح دہرا ہوجاتا تھا، کبھی جوش میں آکر وہ اپنا پوٹا زمین پر ٹیک دیتے تھے، کبھی آنکھیں بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہوجاتی تھیں، کبھی گلے کی رگیں پھول کر الگ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی وہ ناک ہی ناک میں غن غنا کر حرف اس طرح ادا کرتے تھے کہ گویا کوئی استاد ستار کے تار پردے پر کھینچ کر مینڈکاری کررہا ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ دیکھو یہ حروف صفیرہ ہیں چڑیا کی طرح آواز نکالو، کبھی کہتے تھے کہ یہ حروف حلقی ہیں، حلق سے ادا کرو، مگر لڑکوں کی سمجھ میں خاک بھی نہ آتا تھا۔ وہ لڑکے صرف "دیکھو بولو" کے اصول پر ان کا منہ تکتے تھے اور اسی طرح منہ بنا بنا کر ان کا منہ چڑاتے رہتے تھے۔ اس پر ہمارے ملّاجی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کرتے کبھی چوب دستی چلاتے اور کبھی تسمہ کو استعمال فرماتے رہتے تھے۔ ملّاجی کے نعروں اور بچوں کی آوازوں سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ تسموں اور چوب دستی کی چیرہ دستیوں سے جی دہلنے لگا اور ہم پریشان تھے کہ کب چھٹی ملے اور کب ہم اپنے گھر چل دیں مگر ملّاجی ہم سے بھی زیادہ کائیاں تھے، وہ آج کل کے جدید استادوں کی طرح نہ تھے کہ لڑکے درجہ میں بیٹھے ہوئے دوسرے کاموں میں مشغول رہیں اور ماسٹر صاحب کو خبر تک نہ ہو۔ ہمارے ملّاجی کی توجہ لفظوں کے مخرج کی طرف بھی رہتی تھی، تلفظ کرتے وقت آنکھیں بند بھی رہتی تھیں مگر نظریں کویوں کے سوراخوں میں سے نکل کر دنبالہ دار سرمہ کے خطوط سے گذرتی ہوئی بچوں کے دلوں کا بھید لیتی رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زبان چلنے سے اول ہاتھ اور ہاتھ چلنے سے پیشتر انیس[19] نمبر کا تسمہ یا قمچی چلنا شروع کردیتی تھی، جس نمبر کا لڑکا جس سزا کا مستحق ہے۔

خدا خدا کرکے ظہر کا وقت آیا اور ملّاجی نے نماز شروع کردی۔ ہم بھی پر تول رہے تھے اور بڑی دیر سے منہ میں گھنگنیاں بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ موقع پایا تو ذرا اٹھ کر ایک لڑکے سے اُس ڈف کی حقیقت پوچھنے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ ملّاجی رکوع میں گئے اور دونوں ٹانگوں کے بیچ میں سے سر نکال کر ہم کو باتوں میں مصروف دیکھا تو وہیں سے للکار کر فرمایا کہ "او نئے لونڈے میں نے تجھ کو دیکھ لیا ہے۔ نماز سے فراغت کروں تو دیکھ پھر تیری کیسی گت بناتا ہوں" یہ سُن کر ہمارے ہاتھ پاؤں سُن ہوگئے، ذرا سنبھلے تو ساڑھے چھ فٹ والے تسمہ، ڈف، ڈنگا ڈولی اور اس زنجیر والے لکڑی کے کندے کا خیال آیا تو بس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، پھر وہاں سے جو چھو ہوئے تو سیدھے گھر میں آکر دم لیا۔ اماں جان سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور توبہ کی کہ آئندہ سے پھر کبھی مکتب نہ جائیں گے یا تو کسی مدرسے میں شریک ہوجائیں گے یا یہی لنگور کی دم والا قاعدہ پڑھتے رہیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

خودکشی

"سنئیے خاں صاحب آپ تھرڈ کلاس کے مسافر ہیں۔ آپ کو جگہ دینی ہوگی۔ یہ کوئی بات ہے کہ آپ تو آرام سے سوتے رہیں اور ہمیں بیٹھنے کے لئے جگہ تک نہ ملے۔" شراب میں مست نووارد نے درشت لہجہ میں کہا۔ "کیا معنی" خاں صاحب نے اپنے سر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"معنی یہی کہ تھرڈ کلاس کے مسافروں کو جب کہ مسافروں کی کثرت ہو سونے کا حق حاصل نہیں۔ اگر آپ کو آرام ہی کرنا ہو تو سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیجئے۔" "واللہ کیا بات کہی ہے تم نے بھی۔ شائد تھرڈ کلاس کے مسافر انسان نہیں ——— ارے بھائی حیوان بھی آرام کرتے ہیں ہم تو خیر انسان ہیں"۔ خاں صاحب نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ریلوے قانون ہے آپ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔" "ہشت۔ قانون؟ اس کی پابندی کرنے والے اُلو اور تم بھی اُلو ——— جاؤ ہم نہیں اٹھتا۔" خان صاحب نے تیور بدلا کر کہا۔ "خاں صاحب زبان سنبھالئے آپ نے اُلو کیا سمجھ کر کہہ دیا۔" نووارد کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا تھا۔ "سمجھنا کیا اُلو ہی تو رات کو نہیں سوتے تمھاری طرح جاگتے رہتے ہیں۔" میں شروع سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں یہ گفتگو ہاتھا پائی کی صورت نہ اختیار کرلے نووارد کو اپنے قریب بمشکل جگہ دی اور اس طرح سے ہم دونوں اُلو بنے بیٹھے رہے اور خاں صاحب انسان بنے خراٹوں کی تانیں اڑا رہے تھے۔ نووارد نشہ میں چُور تھا اور اس کا لباس اس بات کو واضح کر رہا تھا کہ وہ ایک غریب آدمی ہے۔ قد تقریباً پانچ فٹ لانبا چھریرا بدن گندمی رنگ خشخشی ڈاڑھی بڑی بڑی سرخ آنکھیں جن سے غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ڈسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی حد سے زیادہ فیاضی سے کام لے رہی تھی۔ باوجودیکہ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن جسم سُن ہوگیا تھا۔ ریل کے مسافر مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نووارد ایک معمولی قسم کے کمبل میں جو اس سخت سردی کے لئے ناکافی تھا۔ بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ اس شخص کے ساتھ مجھے کیوں ہمدردی ہوگئی تھی۔ "لیجئے اسے اوڑھ لیجئے سردی زیادہ ہے" میں نے اپنی رضائی دیتے ہوئے کہا۔ نووارد میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ میرے چہرے کو معمہ سمجھ کر اس کے حل کرنے میں معروف تھا۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے شکریہ ادا کیا۔ اور رضائی میں خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ "آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں" کچھ دیر بعد نووارد نے سوال کیا۔ "میں حیدرآباد جاؤں گا اور جناب" "میں ——— میں بھی آپ کا حیدرآباد تک ساتھ دوں گا۔" "خوب ——— سگریٹ پیجئے۔" میں نے اپنے سگریٹ کیس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا مجھے اس کی عادت نہیں۔" شرابی نے اپنے کوٹ کی جیب سے شراب کا شیشہ نکالتے ہوئے کہا۔ ڈبہ کے اور دوسرے مسافر حیرت کی نظروں سے اس کو گھورنے لگے۔ نووارد نے شراب کے چند گھونٹ پی کر شیشے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سگریٹ کا عادی اس لئے نہیں ہوں کہ وہ میرے لئے اتنے زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے جتنی کہ یہ تلخ شراب۔"

موجودہ حالت میں میں نے بھی بہتر سمجھا کہ اس شرابی کے منہ نہ لگوں کیونکہ سب مسافر اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شرابی نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "میرے مہربان معاف کرنا۔ ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہو رہی ہو لیکن کیا آپ میرا ایک شبہ دور کرسکتے ہیں۔" اجنبی نے ہر لفظ پر ٹھہرتے ہوئے کہا۔ "فرمائیے میں اپنی انتہائی کوشش آپکے شبہ کو دور کرنے کے لئے صرف کروں گا۔" "اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کروں میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟" ایسا شخص جس کو قطعی میں نے اب تک نہیں دیکھا وہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے لئے یہ بے تکا جملہ سخت متحیر کن تھا۔ "معاف کرنا میں نے آج سے پہلے

آپ کو دیکھا تک نہیں اس کے بعد جاننے اور نہ جاننے کا سوال ہی بے معنی ہے؟" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا "مجھے اس کی امید تھی اور ہاں ایسے شخص کو آپ واقعی نہیں پہچان سکے جس کو آپ نے بہت کم دیکھا ہے۔ خیر ــــ میرا خیال ہے آپ سلیم کو تو اتنا جلد نہیں بھول سکتے ہیں" "سلیم ــــ ان سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اگرچہ ان سے میں بہت کم ملا ہوں اور ــــ اخاہ ــ میرے دوست اِس سوال کا کیا مطلب تھا۔ کیا اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آپ ہی وہ سلیم ہیں جن کی شناخت میں بہت آسانی سے کر سکتا ہوں ــــ فرمایئے دوست آپ اپنے خیالات کو بہت ہی محدود الفاظ میں ظاہر کر رہے ہیں میرے لئے ان کا سمجھنا قدرے دشوار ہے بہتر تو یہ ہے کہ آپ صاف صاف اپنے مطلب کو واضح کر دیں؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔" زمانہ ہر چیز میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ خرابی صحت کی وجہ سے مجھ میں بہت ساری تبدیلیاں ہو گئی ہوں لیکن میں ہوں وہی سلیم جس کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں" میں نے بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کیا میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی جب میرے دماغ نے بھولی ہوئی صورت کو پہچان لیا۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی میں نے بدحواسی میں اس سے سوال کیا "تعجب۔ مجھے تو یہ خبر ملی تھی کہ آپ مر چکے ہیں؟" "ممکن ہے آپ نے ایسا سنا ہو لیکن میں اسی آرزو میں اب تک جی رہا ہوں شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ــــ مسٹر رحیم آپ کو شناخت کرنے میں مجھے بھی بہت دقت ہوئی۔ مگر اتنی نہیں جتنی کہ آپ کو ہوئی؟" "لیکن یہ تو فرمایئے کہ آپ غائب کہاں ہو گئے تھے۔ یہ دو سال کا طویل عرصہ آپ نے کس طرح اور کہاں گذارا۔ میں نے آپ کی تلاش میں کتنی کوشش صرف کی لیکن رائیگاں گئی؟" اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی افسردگی دوڑ گئی۔" "میں بہت جلد آپ کو ان باتوں سے باخبر کر دوں گا لیکن یہ تو فرمایئے۔ کیا آپ کی اہلیہ" ثریا" بھی آپ کی ہم سفر ہیں" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ اِس سوال سے ایکدم میری حالت دگرگوں ہو گئی اور میری آواز پست؟" آپکا اِس سوال سے ــــ" "بالکل ٹھیک"۔ اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" میں شرابی ہوں لیکن ایک شریف انسان اور پھر ثریا ــــ آپ تو جانتے ہی ہیں ــــ میں صرف ایک مرتبہ ان سے ملنا چاہتا ہوں اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ گزرے" میں نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" ان سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں! آخر کس لئے؟" میرے اس سوال کا جواب اس کے بڑے بڑے آنسو تھے۔ اس نے ایک لانبی سانس کھینچی اور آہستہ سے کہا" دوست میں اب کچھ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا ہوں مجھے یقین نہیں کہ زندگی اب آئندہ میرا ساتھ دے گی۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ ثریا کا دیدار نصیب ہو جائے اور ــــ ہاں یہ میری زندگی کے چند اہم ترین دنوں کا روزنامچہ ہے جس کو میری آرزو ہے کہ ثریا کے حوالہ کر دوں" سلیم نے اپنی جیب سے ایک کاپی نکالتے ہوئے کہا" مسٹر رحیم صرف چند منٹ میں میری یہ آخری تمنائیں پوری ہو جائیں گی۔ میں صرف اسی ارادہ سے حیدرآباد آ رہا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا کہ آپ بھی" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ــــ" اچھا یہ دیکھیئے۔ کیا آپ مجھے اپنا روزنامچہ دیکھنے کا موقعہ دے سکتے ہیں؟" "کیوں نہیں اس میں کچھ ایسی بات نہیں جو آپ کو ثریا سے بدگمان ہونے کا موقع دے ــــ وہ تو دیوی ہے ــ لیجئے" سلیم نے روزنامچہ کے چند خاص اوراق کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا" انھیں پڑھ لیجئے یہ میرے روزنامچہ کا نچوڑ ہے ــــ لیکن سنئے مجھے ایک دفعہ ثریا سے ضرور ملا دیجئے۔ یہ میری آپ سے التجا ہے" سلیم نے یہ کہتے ہوئے شراب کی بوتل منہ سے لگالی میری نظریں بے تابی سے روزنامچہ کی تحریر پر دوڑ رہی تھیں۔

سب رس

کشمیر کی ایک شام

موسم بہار کے شگفتہ پھولوں جیسی نازک اور خوبصورت' نسیم صبح کی چھیڑ چھاڑ سے جھوم جھوم کر چٹکنے والی کلی کی طرح چلبلی اور شوخ کویل کی کوک کی طرح بولنے والی حسین ثریا آج اپنے سڈول اور بلوریں جسم کو سیاہ بالوں کے فرکوٹ میں لپٹے ہوئے کتنی بھلی دکھائی دیتی تھی ۔۔۔ اس کا گلاب کی پتی جیسا شگفتہ اور نازک چہرہ سیاہ فرکوٹ اور سیاہ گیسوؤں کے درمیان ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سیاہ بادلوں میں سے جھانکنے والا بدر کامل ۔۔۔ کاش اس وقت وہاں کوئی مصور موجود ہوتا ۔۔۔ اس کی نظر میں ایک ایسی تصویر کے لئے سامان مہیا کر دیتی جو اس کی زندگی کی شاہکار تصویر ہوتی ۔۔۔ لیکن وہاں تو صرف میں موجود تھا ۔۔۔ وہ مصور جو اپنے دل کے مندر میں تصور کے آب و گل سے محبت کے ایک دیوتا کا مجسمہ تیار کر سکتا ہے لیکن لوگ اُسے مصور نہیں سمجھ سکتے ۔۔۔ دیوتا کے درشن اور اس کی پوجا کرنے کا صرف اس کے موجد اور اس کے پجاری ہی کو حق ہے اور دوسرے اُس کو دیکھنے کے لئے نظر پیدا کر سکتے ہیں اور نہ پوجنے کے لئے دل ۔۔۔ صرف ایک پجاری کا ایک دیوتا نہ کبھی ٹوٹنے والا اور نہ کبھی مسمار ہونے والا ۔۔۔ لیکن ہاں میں بھول گیا ۔۔۔ مندر کی موجودگی پر ہی دیوتا کے وجود کا انحصار ہے ۔ ثریا کا تو میں پجاری ہوں اور وہ دیوی ۔۔۔ اس خیال کے ظاہر کرنے میں مجھے خوف کیوں ہو جب کہ یہ میرا ذاتی اور معقول خیال ہے اور جو صرف میرے روزنامچہ میں درج کیا جا رہا ہے۔

ہاں اگر ایسا ہوتا کہ کسی مشہور رسالہ میں میرا روزنامچہ شائع ہوتا تو ممکن ہے دنیا والے مجھے دیوانہ یا مجنون اور مولوی کافر یا ملحد کہہ دیتے ۔۔۔ لیکن مجھے ان روکھے پھیکے مولویوں اور واعظوں سے تو سخت نفرت ہے ۔۔۔ یہ کیا جانیں کہ عبادت کا مفہوم کیا ہے ۔ مجھے ان سے مطلق خوف نہیں ۔۔۔ کیونکہ آج ثریا نے بھی اپنے گانے میں میرے اس خیال کی تائید کی ہے پھر میں کیوں نہ کہوں کہ " اے ثریا تری یاد میری عبادت ہے " ۔۔۔ ندی کے بیچ ۔۔۔ سورج کی چمکدار روشنی میں ہچکولے لینے والی کشتی میں ۔۔۔ پجاری اور دیوتا ۔۔۔ کنارے سے بہت دور جہاں صرف متلاطم پانی کی موجوں سے پیدا ہونے والا نقرئی دھیما شور ۔۔۔ اور شکار نہ ملنے پر غصہ میں چیختے ہوئے سمندر پر منڈلانے والے سفید بگلوں کا مسلسل شور ۔۔۔ اس کے ساتھ میری پیاری ثریا کا جادو اثر عربی گیت ۔۔۔ اُس کی بلوریں گردن کی نیلی رگیں پھول جاتی ہیں ۔ جب وہ تان کھینچتی تھی ۔۔۔ اس کی محبت اور درد سے بھری ہوئی آواز نیلگوں سمندر اور برف پوش پہاڑیوں کی ہوا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی ۔۔۔ میں اس منظر کو اس گیت کو نہیں بھول سکتا ۔۔۔ کتنے پیارے اشعار تھے ۔۔۔

" اے میری محبوبہ ۔۔۔ تیری یاد میری عبادت ہے "

مغرب کو ۔۔۔ سمندر کے کنارے ۔۔۔ جب کہ مسرور اور بے فکر انسان تفریح میں مشغول ہوتے ہیں ۔۔۔ اس وقت جب کہ سورج دن بھر کے سفر سے تھک کر زرد اور ماند پڑ جاتا ہے ۔ ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ بالکل اُسی وقت ۔۔۔ لوگ مجھے گھورتے ہوئے گذر جاتے ہیں ۔۔۔ میری نظریں مسلسل ایک ہی طرف جمی رہتی ہیں ۔۔۔ اور میں فکر مع طرازن' بت بنا ہوا رہتا ہوں ۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ ۔۔۔ اس لئے کہ " اے میری محبوبہ ۔۔۔ تیری یاد میری عبادت ہے " (باقی آئندہ)

خلیل اللہ

غریب الوطنی

دشمن کو نہ ہو رنج غریب الوطنی کا
لہراتا ہے ہر رہ پہ مسلّم راہ زنی کا
پھولوں کو ہنر یاد ہے ناوک فگنی کا
کلیوں میں بھی انداز ہے برچھے کی انی کا
فرقت کے عوض ہوتا ہے دل خون چمن میں
غنچوں کی مہک آگ لگاتی ہے بدن میں

برسات میں جب جھوم کے آتی ہیں گھٹائیں
مینا نے لٹاتی ہوی پھرتی ہیں ہوائیں
کہتی ہیں چلو عیش کے دریا میں نہائیں
غم کو خس و خاشاک کے مانند بہائیں
دل خرمنِ باطل کو جلانے نہیں دیتا
شعلہ ہے مگر آگ لگانے نہیں دیتا

قاتل ہیں مسافر کے لئے چاندنی راتیں
بے نور نظر آتی ہیں تاروں کی براتیں
ہر گام پہ یاد آتی ہیں احباب کی باتیں
کھاتی ہے خرد، دل سے ہر اک چال پہ ماتیں
رخ زرد ہی رہتا ہے سدا شمس و قمر کا
بھاتا نہیں انداز کوئی شام و سحر کا

تنہائی تو معراجِ مصائب ہے سفر میں
ہوک اٹھتی ہے دل میں تو کبھی درد جگر میں
ہر سانس پہ شعلے سے بھڑک اٹھتے ہیں سر میں
اک آن بہلتا نہیں جی آٹھ پہر میں
دم بھر کے لئے پلکِ گرفتہ نہیں جھکتی
سونے میں بھی اشکوں کی روانی نہیں رکتی

گل ہی نہیں، یاد آتا ہے ہر خار وطن کا
آنکھوں میں کھٹکتا ہے ہر اک پھول چمن کا
مہتاب کی ضو رنگ دکھاتی ہے کفن کا
جھولے پہ تو ہوتا ہے گماں، دار و رسن کا
منظر کبھی پردیس کا بھاتا نہیں کوئی
جز یادِ وطن دل کو بھاتا نہیں کوئی

دو دن میں بدل جاتی ہے پیری میں جوانی
آتی ہی نہیں یاد محبت کی کہانی
رہتی نہیں نوروں پہ طبیعت کی روانی
ہوتی ہے قتیلِ غمِ دل سحر بیانی
دل محفلِ عشرت سے تعلق نہیں رکھتا
ہوں شمس و قمر ساتھ مگر جی نہیں ٹکتا

خوش بخت ہیں، ناواقفِ آفاتِ زمانہ
دل جن کے نہیں، ناوکِ دوری کا نشانہ
ہے وردِ زباں حسن و محبت کا ترانہ
آنکھوں سے جھلکتی ہے مئے عیش شبانہ
جوبن گل و ریحاں کا نکھرتا ہے چمن میں
فردوس میں رہتے ہیں، جو رہتے ہیں وطن میں

سکندر علی وجد

ایک ضعیفہ کی تمنا

آؤ بیٹا! ادھر آؤ — دیکھو ہم ماں بیٹی تمہارا کتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں، صبح سے ہم سراپا نگاہ بن کر تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں، اب تم آگئے بیٹا! جاں نواز سبز تو ہم میں جان آگئی — آج تمہاری منگیتر نے کہا کہ تم جنگ میں جا رہے ہو مانو، یہ سننا ہی تھا کہ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، میرا نصیبا جاگ اٹھا، میری برسوں کی آرزو، کہ میرے کوئی بیٹا نہیں، پوری ہوگئی، مجھے خدا نے یہ دن دکھلایا۔

— ہاں تو کہو، افسر جنگ نے تمہارا انتخاب کر لیا؟ ڈاکٹر نے تمہاری تصدیق کر دی؟ — تم نیچی نگاہیں کئے آہستہ آہستہ کیوں قدم بڑھا رہے ہو بیٹا!؟ — میں جانتی ہوں، ہم بیکسوں کا خیال تمہیں ستا رہا ہے، دل بھاری نہ کرو — تمہیں معلوم ہے میرے لال!؟ ہمارے ارمان، ہماری آرزوئیں قوم کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہیں — ان ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ ہمارے دل بھر آئے ہیں — نہیں، بیٹا! یہ خوشی کے آنسو ہیں، آج ہم بے حد خوش ہیں — ہماری خوشی کی انتہا نہیں ہے، کیونکہ ہماری بہنوں نے مادر وطن کی آغوش میں ایسے تحفے پیش کئے ہیں جو ثریا کی طرح باہم متصل ہوں گے، جن کا نور بوڑھوں کا عصا ہوگا، تو بچوں کا نگہبان — جن کی روشنی بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی، تو کمزوروں اور مفلسوں کے دامنوں کو ہیروں اور موتیوں سے بھر دے گی، وہ شجاعت اور امتیاز کے میدان میں حق و صداقت انسانیت اور ملنساری کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔

ادھر آؤ بیٹا! بہادروں کی طرح، سینہ تانے، میرے قریب آؤ، اور کہو کہ تمہارا انتخاب ہوگیا، اور پھر میں تمہیں اپنے سینے سے لگالوں اور اپنے بزرگوں کی روحوں کو پکاروں کہ وہ آئیں، اور تمہیں اپنی آغوش میں بھینچ بھینچ کر اپنے نبرد آزما بازوؤں کی قوت تمہارے شانوں میں بھر دیں، اور تم — ہاں تم، ایک بہادر سپاہی کے جواں مرد بیٹے، کل سورماؤں کی صف میں طبل جنگ کی آواز سے اپنے قلب کی آواز ہم آہنگ کئے آگے آگے چلے جا رہے ہو گے، شہیدان وطن کی روحیں آگے بڑھ بڑھ کر تمہارے قدم لیں گی — اور ہم بیکس ماں، بیٹی کی آتمائیں تم پر نچھاور ہوتی رہیں گی۔

— تم جب میدانِ جنگ سے فتح و کامرانی کا سہرا پہنے لوٹو گے تو تمہارے استقبال کو قوم کی لڑکیاں اپنے اپنے تحفے ہاتھوں میں لئے آگے بڑھیں گی، اور تمہاری مردانگی و شجاعت کے راگ گاتی تمہاری مدح و ثنا کرتی تمہیں گھر لائیں گی، — اور تمہاری منگیتر تمہارے قدموں میں وہ انمول تحفہ پیش کرے گی، جو، تمہارے، اور صرف تمہارے لئے ہی مخصوص ہوگا —

— ہاں، تم جا سکتے ہو، ہم دونوں تمہیں الوداع کہنے کے لئے دل و جان سے راضی ہیں، ہمارے دل پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تم جاؤ اور آئندہ نسلوں کے لئے آزادی کا باب کھول دو۔

— مجھے یقین ہے کہ تم ظالم و غاصب حریفوں کے چھکے چھڑا دو گے — تم یہ ثابت کر کے دکھا دو گے کہ حق و صداقت اسے کہتے ہیں۔ تمہاری رگوں میں بہادر شہیدوں کا خون دوڑ رہا ہے، تم اُن کی شجاعت کا نمونہ ہو، — تم کیا نہیں کر سکتے!!

تم جیسے ہی فرزندوں کے ہاتھوں قوم کی کامیابی ہے ـــــ اس کا وقار تمہارے ہی دم سے ہے ـــــ تمہارے ہی ہاتھوں قوم کا پرچم وطن کے سینے پر لہرا سکتا ہے ـــــ!!

اکبر سہیل

نظر آیا

وحشت میں عجب رنگِ بیاباں نظر آیا
ہر خار ہم آغوشِ گریباں نظر آیا

ظاہر نظر آیا کبھی پنہاں نظر آیا
ہر رنگ سے تو جلوۂ جاناں نظر آیا

اس شان سے وہ جلوہ بداماں نظر آیا
جس نے اسے دیکھا وہی حیراں نظر آیا

ہم مر بھی چکے، ختم ہوا قصۂ ہستی
اب کیا ہے اگر کوئی پشیماں نظر آیا

وہ آئے عیادت کو تو چمکی مری قسمت
روشن سرِ بالیں مہِ تاباں نظر آیا

پھر برہمی دوست کے آثار ہیں پیدا
الجھا ہوا پھر تارِ رگِ جاں نظر آیا

عشرت میں بھی انجام کی تلخی رہی شامل
ہر حال میں انسان پریشاں نظر آیا

اللہ رے نیرنگیٔ رفتارِ زمانہ
خنداں جسے سمجھا وہی گریاں نظر آیا

کل ان کی معیت میں عجب شانِ چمن تھی
ہر پھول کا انداز غزل خواں نظر آیا

آباد کرو میکدۂ ہستی و مستی
پھر روح کی خلوت میں وہ مہماں نظر آیا

دیکھا کچھ اس انداز سے اس شوخ نظر نے
ہر ذرۂ عالم مجھے رقصاں نظر آیا

منظرؔ کہ ترے لطف پہ تھی زندگی اس کی
ہر حال میں شرمندۂ احساں نظر آیا

منظر صدیقی اکبر آبادی

نجمہ سے

مجھے خبر بھی نہ تھی نجمہ کہ وقت کا ایک لمحہ میری زندگی میں یوں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اُف مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے وہ زمانہ کا ایک لمحہ جس میں ایک دوست سے گفتگو کرتے کرتے تم سے ملنے کے سامان مہیا ہو گئے۔ اتفاقاً محض اتفاقاً ہماری ملاقات ہو گئی۔ اور پھر صبح کہ ہم روز ملنے لگے۔ یاد ہے نجمہ میں کس پابندی سے تمھارے ہاں آتا تھا۔ ملازم رخصت لیتا ہے۔ طالب علم چھٹیاں مناتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی تمھارے ہاں آنے میں تساہل نہیں کیا۔ ہاں ہاں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا مقصد محض تم سے ملنا اور گفتگو کرنا نہ ہوتا تھا۔ میرے اغراض بھی وابستہ تھے۔ لیکن کیا تم مانو گی کہ اس دن بھی جس دن میرے پاس تمھارے ہاں نہ آنے کی کافی وجہ موجود ہوتی تھی، مجھے نہ معلوم کیوں تمھارے ہاں آئے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ سرما کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا، گرما کی جھلسا دینے والی دھوپ میں گرم لُو اُس کا مقابلہ کرتا ہوا۔ برسات میں بجلی کی دل دہلا دینے والی گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کا سامنا کرتا ہوا پانی سے شرابور میں تمھارے پاس آکر ہی دم لیتا تھا۔ اور جب مجھے معلوم ہوتا کہ تم میرا انتظار کر رہی تھیں تو شاید تم نہ سمجھ سکو کہ میں کس آسانی سے اپنے مصائب کو فراموش کر دیا کرتا تھا۔

نجمہ ہم اسی طرح ملتے رہے۔ بے روک ٹوک۔ بہت عرصہ تک۔ یا صرف چند دن۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ میں نے گننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تم جانتی ہو انسان کی فطرت کو۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا ایک ہی حالت پر قائم رہے گی۔ جانتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ہر روز بلکہ ہر لحظہ دنیا بدل رہی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی اسے سمجھانے کی کوشش بھی کرے تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ تم اور میں ایک دن الگ الگ ہو جائیں گے۔ آخر نجمہ وہ منحوس گھڑی آئی۔ میں غصہ میں بھرا ہوا تمھارے گھر سے نکل گیا۔ میرا خون جوش کھا رہا تھا۔ گو بظاہر میں خاموش تھا۔ یقیناً نجمہ تم فراخ دلی سے ملتی تھیں۔ ایک ہمدرد اور خلیق کی طرح۔ لیکن اُف۔ وہ الفاظ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ میں اپنی بے عزتی کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ تم کو یاد ہیں نجمہ وہ الفاظ؟ جن کو سن کر تم بھی چونک سی پڑی تھیں۔ اور باری باری سے مجھے اور ان کو دیکھنے لگی تھیں۔ جن الفاظ کو سن کر میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس ارادہ کے ساتھ گو اس وقت تم سمجھ نہ سکی ہوں گی اور نہ اس کی متوقع ہوں گی کہ پھر کبھی یہاں قدم نہ رکھوں گا۔

میں نے اسے بہت سہل جانا تھا۔ نجمہ جب تک تم سے مل سکتا تھا۔ میں اس سے قطعی لاعلم رہا کہ تم سے ملنا میرے ضروریاتِ زندگی میں ہوا پانی اور غذا کی طرح شامل ہو گیا ہے۔ جس طرح دولتمند انسان بھوک کی تکلیف کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا جس طرح چشمہ کے کنارے بیٹھنے والا پیاس کو ایک معمولی خواہش تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے اس وقت تم سے جدائی کے بار کو محسوس نہ کیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی اس وقت کی حالت کو بیان کر سکیں جس وقت مجھے یہ خیال آتا ہے کہ بغیر تم سے کہے ہوئے۔ بغیر تمھیں بتائے ہوئے کہ اب تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں، میں چلا آیا۔ نجمہ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ زندگی میرے لئے سوہانِ روح بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی یاد جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کوئی قلبی تعلق نہیں ہے۔ مجھے راتوں کو چین سے نہ سونے دیگی۔

مجھے خبر نہ تھی کہ تمہارا خیال جس کو تمہارا وجود سامنے آکر دبا دیا کرتا تھا تم سے دور ہوتے ہی میری زندگی پر چھا جائے گا۔ سینہ میں آگ کی دبی ہوئی چنگاری تیز ہو رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ میرے خرمن عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ نہیں میری زندگی ہی بھسم ہو جائے گی۔

نجمہ تم متمول خاندان کی چشم و چراغ ہو۔ دولت تمہارے قدموں میں کھیل رہی ہے۔ سیکڑوں ایسے سامان تمہارے گرد و پیش ہیں جو میرے خیال کو، اگر وہ تمہارے دل کے کسی گوشہ میں موجود ہے، بہت جلد نکال باہر کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں تم جلد اور بہت جلد مجھے بھول جاؤ گی۔ شائد اب تک بھول بھی چکی ہو۔ ہاں بہتر بھی یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں۔ کیونکہ ہم دور، دور ہو گئے ہیں۔ ایک ہی جگہ رہ کر بھی بہت دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شائد اب اس دنیا میں ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

محمد دلاور خاں مہدوی

وطن کے نام

نہ ملالِ جور و ستم تجھے، نہ خیالِ لطف و کرم تجھے
کیا کس کے فسونِ ستم گری نے اسیرِ ناز و نعم تجھے

تری بے خودی میں اثر نہیں، تجھے خودگری کی نظر نہیں
نہ قبولِ ذوقِ طرب تجھے، نہ عزیز لذتِ غم تجھے

ترے حوصلوں کا اثر ہے یہ، تری ہمتوں کا ثمر ہے یہ
کیا غیر کے خنجرِ ناز نے جو شکارِ جور و ستم تجھے

گل و غنچۂ طرفِ چمن، تری بے حسی پہ ہیں خندہ زن
نہ گمانِ راحتِ دل ترا، نہ یقینِ رنج و الم تجھے

ترا شعلۂ جاں ہی بجھا ہوا، ترا سوز و اثر ہی مٹا ہوا
نہ مجالِ شکوۂ آرزو، نہ فغانِ شوق کا دم تجھے

کبھی سوچتا بھی ہے اے وطن کہ یہ شوقِ راحتِ انجمن
لئے جا رہی ہی کہاں کہاں، یہ فضائے رحم و کرم تجھے

ترے رنگ نمود پہ غور کر، تری شانِ وجود پہ غور کر
کہ ملا ہے خونِ دل و جگر سے یہ بادۂ جامِ جم تجھے

یہ صلہ ہے رحمتِ عشق کا، یہ نگہ ہے چشمِ خلوص کی
نظر آ رہی ہے ملی ہوئی جو رہِ خدا و صنم تجھے

تو صداقتوں پہ نگاہ رکھ، تو صداقتوں ہی سے راہ رکھ
یہ وفا سے اپنی بنائیں گی کبھی رشکِ باغِ ارم تجھے

تو انہیں کی منزلِ شوق بن، تو انہیں کا رہبرِ ذوق بن
جو ملیں گے رہروِ زندہ دل، شبِ معرفت تیز قدم تجھے

باقی

ظفر الدولہ

(ایک تاریخی قصہ)

غدر سے پہلے جب ہندوستان میں مردی و مردانگی کا زور و شور تھا' ہندوستانیوں کے دل و دماغ غلامانہ ذہنیت کے دباؤ سے آزاد تھے' ریاست حیدرآباد کے ایک ضلع اندور (موجودہ نظام آباد) کے کسی قصبے میں ایک شریف سپاہی رہتا تھا۔ سرباز خاں اس کا نام تھا، آدمی تھا نوجوان اور جواں مرد۔ سپہ گری اس کو آباواجداد سے حصے میں ملی تھی' طبیعت میں نیزے کی طرح راستی اور زبان میں تلوار کی سی تیزی موجود تھی۔ آسمان کی سختیاں خاموشی کے ساتھ سہہ جاتا لیکن زبان کی سختی اس سے برداشت نہ کی جاتی۔ جہاں کہیں ملازم ہوا افسروں سے اَن بَن ہو گئی۔ وہ اس کی نازک مزاجی سے ناخوش' یہ ان کی نازک دماغی کا شاکی۔ چار دن جم کر کسی سرکار میں نوکری نہ کر سکتا' ملازمت چھوڑ چھاڑ کر گھر میں آ بیٹھتا۔ آذوقہ ختم ہونے لگتا تو مجبوراً پھر تلاشِ معاش میں نکلتا۔

ایک مرتبہ یوں ہی خاں صاحب نوکری چھوڑ چھاڑ گھر کی چار دیواری میں محصور تھے کہ تنہائی سے جی گھبرانے لگا' اختلاج کے علاج میں کسی نباضِ دہر نے "بیاہ" کا نسخہ تجویز کیا۔ خاں صاحب نے فوراً شادی کر لی۔ چندے آرام سے گذری' بالآخر تنگی محسوس ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ظفر الدولہ حضور نظام کی طرف سے نرمل کے قلعہ دار تھے۔ قلعہ میں معقول انتظام تھا' رعایا خوش حال تھی، فوج میں چُنے ہوئے کارآزمودہ جرار سپاہیوں کے قدر داں مشہور تھے۔ تنگی میں بسر ہونے لگی تو بی بی نے سرباز خاں سے کہا "بے کار بیٹھے رہنے سے بہتر یہ ہے کہ کسی اچھی سرکار میں نوکری کر لیجئے۔" جواب دیا "نوکری کسی سرکار کی ہو' اچھی نہیں ہوتی۔" کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن ضروریات کے اقتضا اور بی بی کے بار بار سمجھانے سے خاں صاحب ایک روز سویرے ہی ناشتہ کر ہتھیار باندھ "نرمل" کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ آدمی تھے وجیہہ قدآور اور مضبوط، قلعے پر پہنچے تو سنتری نے حالات دریافت کر کے فوراً قلعے میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

پوچھتے پوچھتے سردار فوج کے ڈیرے پر پہنچے انھوں نے دفتر میں چہرہ لکھوانے کو کہا۔ یہاں میر منشی نے ضروری اندراجات لینے کے لئے منشی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے نام پوچھا' خاں صاحب نے تبلا دیا۔ پوچھا "کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔" کہا "ہاں" منشی نے کہا "پھر تو تبلائیے آپ کی بی بی کا کیا نام ہے؟" بس یہ پوچھنا ہی تھا کہ خاں صاحب غصے سے لال ہو گئے۔ داڑھی کے بال قواعد داں سپاہیوں کی طرح اپنی اپنی جگہ اٹنشن ہو گئے۔ ہاتھ تلوار کے قبضے پر جا پڑا۔ منشی جی گھبرا گئے عاجزی سے کہنے لگے "صاحب! ہمیں نواب ظفر الدولہ کا یہی حکم ہے۔ آپ کو اگر نوکری منظور ہو تو سوال کا جواب دیجئے ورنہ آپ مختار ہیں اور ہم مجبور۔"

خاں صاحب نے جو سنا کہ نواب صاحب کا "یہی حکم ہے" تو بگڑ کر کہنے لگے "بی بی کا نام تو یاد نہیں سالے کا نام لکھ لو۔" منشی نے کہا ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور کڑک کر کہا "ہمیں تمھاری ضرورتوں کی کچھ پرواہ نہیں سوال کیا ہے تو جواب بھی سن لو اور تمھارے نواب کو سنا دو' انکار کرو گے تو یاد رکھو تن پر سر نہ ہوگا۔" خاں صاحب کو شمشیر بکف اور خشمگیں پا کر منشی صاحب کے ہوش اڑ گئے' ڈرتے ڈرتے قلم اٹھایا اور کہا "فرمائیے جناب آپ کے سالے کا اسم مبارک؟" سپاہی نے فاتحانہ انداز میں آواز پر زور دیتے ہوئے کہا "ظفر الدولہ" نام سن کر منشی جی کے اوسان ہی تو خطا ہو گئے قلم ہاتھ سے گر پڑا' آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خاں صاحب نے ڈانٹ جو بتائی تو وہ گدی چھوڑ کے بھاگے خاں صاحب بھی تیغ بکف ان کے تعاقب میں چلے۔ دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر

سپاہیوں نے گھیر لیا۔ شور و غل سن کر ظفر الدولہ خود ہی محل سے نکل آئے۔ منشی نے ہاتھ جوڑ کر ڈرتے ڈرتے حالات گوش گذار کئے۔ اور خاں صاحب غصے میں بھرے سپاہیانہ انداز میں بے خوف ڈٹے کھڑے رہے۔

ظفر الدولہ نے انھیں سر سے پاؤں تک جرأت آزما نگاہوں سے دیکھا۔ سپاہی جب بالکل ہی متاثر نہ ہوا تو مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے اور کہا "بھائی صاحب خوب آئے، میں تو آپ کا منتظر ہی تھا۔ کہئے آپ کو تنخواہ کیا ملے؟" خاں صاحب نے تن کر جواب دیا "تنخواہ و نخواہ تو تم اپنے ہی پاس رکھو، ہم سالے کی نوکری نہیں کرتے۔" یہ کہا اور بے رخی سے پلٹ کر جانے لگے۔ سپاہیوں نے چاہا کہ بڑھ کر روک لیں مگر ظفر الدولہ نے اشارے سے سب کو منع کیا۔ سپاہی ان کی نظروں میں جچ گیا تھا، انھوں نے اپنے ایک جاسوس کو حکم دیا کہ اس کے حالات اور قیام گاہ کا پتہ لگا کر اطلاع دے۔

ظفر الدولہ ادھر محل میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب ادھر جھلائے ہوئے اپنے گھر پہنچے، غصے میں تو تھے ہی بی بی پر برس پڑے۔ عورت تھی مزاج داں سمجھی کہ کہیں سے الجھ کر آئے ہیں۔ پہلے تو نرم باتوں سے انھیں ٹھنڈا کیا جب ذرا راہ پر آئے تو دسترخوان بچھا کھانا کھلایا، پینے کو حقہ بھر کے دیا اور پاؤں دبانے کے بہانے پاس جا بیٹھی۔ چاہتی تھی کہ واقعات دریافت کرے مگر ابھی کچھ پوچھنے بھی نہ پائی تھی کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ خاں صاحب نے بلند آواز سے پوچھا "کون؟" جواب ملا "ظفر الدولہ" پوچھا "کیا کام ہے؟" کہا "اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہوں" خاں صاحب نے بی بی سے کہا "اٹھ دروازہ کھول دے۔ تیرا بھائی تجھ سے ملنے آیا ہے۔"

ظفر الدولہ اندر داخل ہوئے۔ منہ بولی بہن کو سلام کیا، بہنوی صاحب کو دیکھا کہ چارپائی پر دراز دیوار کی طرف منہ کئے حقہ پی رہے ہیں۔ ان سے تو نہ بولے بہن سے کہا "تعجب ہے اس قدر قریب رہ کر بھی تم نے ہمیں اپنے حالات سے مطلع نہیں کیا اور تکلیف اٹھاتی رہیں۔ خیر! لو آج سے سو روپیہ تمھارا درماہہ مقرر ہوا ہے۔ یہ رقم برابر ماہ بماہ تم کو پہنچتی رہے گی۔ اپنی حالت درست کرو اور بھائی صاحب کے لئے آرام کے سامان مہیا کرو۔" روپیوں کی تھیلی چٹائی پر رکھ "خدا حافظ" کہہ کر ظفر الدولہ رخصت ہوئے۔

بی بی نے تھیلی اٹھا شوہر کے سامنے رکھی۔ انھوں نے اٹھا صحن میں پھینک دی اور کہا "مجھے اس سے کیا سروکار تیرے بھائی نے دی ہے تو ہی اسے سنبھال۔"

بی بی نے روپے قبضے میں کئے اور گھر کی حالت درست کرنے میں آہستہ آہستہ خرچ کرنے لگی۔ دو چار مہینے میں گھر کی یہ صورت بنی کہ گھوڑا، پالکی، نوکر، چاکر اندر باہر نظر آنے لگے۔ عزت سے بسر ہونے لگی۔ چند سال اسی طرح گزرے اس عرصے میں دو لڑکے بھی اللہ نے دئے۔ تنخواہ بغیر مانگے ظفر الدولہ خود وقت پر پہنچا جاتے تھے۔ جو کچھ کہنا ہوتا بہن سے کہتے بہنوئی سے کچھ نہ بولتے۔

یہ حال دیکھ کر حاسدوں اور بے کاروں نے "چہ می گوئیاں" شروع کیں۔ ظفر الدولہ پر غائبانہ پھبتیاں اڑائی جانے لگیں "مفت کے بہنوی کی خوب مدارات ہو رہی ہے۔ یہی حال رہا تو بہنوئیوں کی کمی نہیں رہے گی۔" یہ خبریں ظفر الدولہ کے کانوں تک بھی پہنچتیں۔ مگر وہ زمانے کا سرد و گرم چکھے ہوئے تھے سنی ان سنی کر دیتے اور اپنے عمل میں فرق نہ آنے دیتے۔

اتفاق سے کسی راجہ نے ریاست سے بغاوت کی اور خراج موقوف کر دیا۔ ظفر الدولہ کے نام سرکار نظام کا فرمان پہنچا کہ راجہ پر چڑھائی کر کے خراج وصول کر لائیں۔ تعمیلاً ظفر الدولہ فوج لے کر روانہ ہوئے مگر خاں صاحب کو اطلاع نہ دی۔ اب تو لوگوں کو

منہ کھولنے کا اور بھی موقع ملا۔ ہر طرف ذکر اذکار ہونے لگے کہ لو صاحب! بہنوئی تو خوب ملے، بغیر نوکری کے تنخواہ کھا رہے ہیں۔ لڑائی کے دن بھی ان سے کام نہیں لیا جاتا۔ شاید بہن کے رنڈاپے کا اندیشہ ہے۔ ظفر الدولہ ان باتوں کی پرواہ نہ کرتے کبھی اگر کچھ کہتے تو یہ کہتے کہ "میں نے اس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔"

ادھر ختم ماہ پر جب ظفر الدولہ بہن سے ملنے نہ گئے اور آدمی کے ذریعے تنخواہ گھر پہنچی تو سربازخاں نے بی بی سے پوچھا "کیا بات ہے اب کے تمھارے بھائی نہیں آئے؟" اس نے کہا "خدا انھیں خیر خوبی سے واپس لائے وہ تو راجہ سرتاب کے مقابل جنگ کو گئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہا "اب ہم پر چین اور آرام حرام ہے۔" فوراً سلاح جنگ پہنی گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ بی بی نے پوچھا "کیا قصد ہے؟" جواب دیا "بس اب حقِ نمک ادا کرنے کا وقت آگیا۔ تمھارے بھائی کے احسانات سے سبکدوش ہونا ہے۔ ہم تو اب پلٹ کر آنے کے نہیں، تم ان بچوں سے ذرا خبردار رہنا۔ لو خدا حافظ۔" یہ کہا اور جلدی سے رخصت ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

ظفر الدولہ ادھر راجہ سرتاب کے مقابل فوج ڈالے پڑے تھے۔ رسل و رسائل کے ذریعے معاملات کو رو براہ لانے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن بے سود، راجہ بے لڑے خراج دینے پر تیار نہ تھا، مجبوراً جنگ کی ٹھیری۔ آغاز جنگ سے پہلے ظفر الدولہ کی فوج سے ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق نکلا، راجہ کی فوج کے مقابل پہنچ کر اس نے باگ کھینچی اور کڑک کر آواز دی کہ تم لوگ ظفر الدولہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے اس کی فوج کا ایک ایک سپاہی تمھاری تمام فوج پر بھاری ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ صلح کرو ورنہ یاد رکھو پچھتاؤ گے۔" راجہ کی فوج میں سے ایک زبردست جوان بے چین ہو کر نکلا اور سخت جواب دیا۔ سپاہی جھلا گیا۔ اور گھوڑے کو ڈپٹ کر اس زور سے نیزہ مارا کہ زرہ کو توڑ کر سینے کے پار ہو گیا۔ بات کی بات میں مخالف کو مار کر جیدار سپاہی تنہا راجہ کی پوری فوج پر جا پڑا اور دم کے دم سیکڑوں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔ نبرد آزمائی میں اس کو اس وجہ کمال تھا کہ جس طرف حملہ کرتا صفوں کی صفیں صاف ہو جاتیں۔ ہر حملے میں راجہ سے قریب ہوتا جاتا تھا کہ گویا اس نے پہلے ہی سے ہاتھی کو تاک رکھا تھا۔ اب راجہ اور سپاہی میں صرف ایک صف حائل تھی۔ سپاہی نے جان توڑ حملہ کیا اور صف کو چیر کر گھوڑے کو ہاتھی پر جا ڈالا۔ جاندار گھوڑے نے مالک کے اشارے پر سیدھا ہو کر دونوں اگلے پاؤں ہاتھی کے پیٹ پر جما دیئے۔ سپاہی نے رکابوں پر کھڑے ہو کر نیزے کا بھرپور ہاتھ راجہ پر چھوڑا۔ راجہ صاحب جھک نہ جاتے تو فیصلہ ہی تھا۔ نیزہ گردن کے عقبی حصے کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ دوسرا وار کرنے سے پہلے ہاتھی نے گھوڑے کو سونڈ میں جکڑ کر کھینچ لیا اور سوار سمیت پاؤں تلے روند ڈالا۔

جان تو بچ گئی مگر راجہ کے حواس برجا نہ تھے۔ خیال کیا کہ ایسے ایسے "سر پھرے" دو ایک ہی جوان ظفر الدولہ کی فوج سے اور نکلے تو جان کی خیر نہیں۔ فوراً سفید جھنڈی دکھائی گئی یہ صلح کی علامت تھی قاصد دوڑے شرائط صلح طے ہونے لگے۔ خراج اور فوج کشی کے اخراجات کے علاوہ جرمانے میں رقم خطیر ظفر الدولہ کے ہاتھ لگی۔ شرائط صلح کے طے ہوتے ہی ظفر الدولہ نے دریافت کیا کہ آخر وہ کون بہادر تھا جس نے آن کی آن میں جنگ کا نقشہ بدل ڈالا؟ نعش منگوائی گئی۔ ڈھاٹا کھلا تو سربازخاں کی صورت نظر پڑی لوگوں کو تعجب تھا ظفر الدولہ جوش محبت و وفا سے بے چین ہو گئے۔ میت کے سر و پیشانی پر بوسے دینے لگے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ظفر الدولہ سپاہی کا ہے کو ہوتا اگر تیرے پہچاننے میں اس سے غلطی ہوتی۔"

میر محمد نقی رضوی

سائنس

لفظ سائنس لاطینی لفظ سائنشیہ (scientia) سے مشتق ہے جس کے معنی "علم" کے ہیں او سائنشیہ کا ماخذ "سائیو" (scio) ہے جس کے معنی "جاننا" ہے سائنس ہر قسم کے علوم پر حاوی ہے۔ جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ فی زمانہ اس کے مفہوم نے ایک خوفناک وسعت اختیار کرلی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس کے معانی طبیعات کیمیا وغیرہ دو چار علوم تک محدود ہیں۔ لیکن عالموں اور محققوں اور فلسفیوں کے نزدیک سائنس زمین و آسمان کے باقاعدہ اور یقینی حالات پر حاوی ہے جن کو انسان نے اپنی تحقیق اور تجسس سے معلوم کئے ہیں اور یہاں تک اسے وسعت دی ہے کہ اپنے جسم اور دل اپنی عقل اپنے کردار اپنی طرز معاشرت اور اپنے جملہ تعلقات کو اسی کے تابع کردیا ہے۔ سائنس تبحر علم ہے۔ جس کے کنارے اور عمق کی حد نہیں ہے۔ سائنس خلا اجرام فلکی ارکین نظام شمسی تارے چاند وغیرہ سب ہستیاں اس کے اندر مقید ہوگئی ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر کا قول سائنس کیا ہے۔ سائنس علم عامہ کے ارتقائے اعلیٰ کا نام ہے اگر اس سے انحراف کیا جائے تو اس کے ساتھ ہر قسم کے علم سے انکار کرنا لازم آتا ہے۔ علوم روزآنہ زندگی کے تجربوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جیسے وہ نامعلوم طور پر بڑھتے ہیں اسی طرح وہ زیادہ دور افتادہ اور پیچیدہ تجربوں پر حاوی ہوجاتے ہیں..... کوئی خط کھینچ کر یہ کہنا محال ہے کہ سائنس یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

جب ہم مظاہر و موجودات کی اندرونی ترتیب و باقاعدگی کے علم معینہ کو سائنس کے نام سے پکارتے ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ قاعدے کے انکشاف سے اس فاسد خیال کو صدمہ پہنچے جو عدم ترتیب کی باعث عوام کے دلوں میں سنی سنائی باتوں سے قائم ہوجاتا ہے۔ جب تجربہ سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ فلاں اسباب سے فلاں نتائج پیدا ہوجاتے ہیں تو دل سے ان اشخاص کے توسط کا وہم دور ہوجاتا ہے جو ان کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔

سائنس وہ علم ہے جو قاعدہ اور قانون کے تابع ہے جس کے جملہ شعبے اور مطالب معقول ضوابط کے مطیع رہتے ہیں۔ اس میں عامیانہ علم میں یعنی ایک معمولی آدمی اور ایک محقق عالم کے علم یعنی معلومات میں اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کے خیالات اور معلومات پھوہڑ عورت کے گھر کے مانند ہیں جو ہر قسم کے قرینہ اور سلیقہ سے بیگانہ ہے برعکس اس کے موخرالذکر کا علم جنرل مرچنٹ کی دوکان کی طرح ہے جہاں ہر ایک شئے قرینہ کے ساتھ دھری رہتی ہے جب گاہک آتا ہے تو حسب خواہش اپنی ضرورت کی چیز لیجاتا ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں ہر قسم کے واقعات اور حالات سے دوچار ہوتے ہیں اہل نظر اور صاحب فکر انہیں غور سے دیکھتا اور بھالتا ہے۔ ہزاروں واقعات کو دیر تک مشاہدہ کرکے استخراج نتائج کرتا ہے اور ان سے مستفید ہوتا ہے یہ علم اور یہ نتائج اس کے ذہن میں مستقل صورت ممکنہ اختیار کر لیتے ہیں اور علم کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ سائنس ہے۔

۲۔ ہکسلے پروفیسر ہنری ٹامس ہکسلے ایک نہایت مشہور جید عالم تھے جن کی مساعی سے ڈارون کے مسایل اور خیالات کو انگلستان میں اس قدر شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں "میری رائے میں سائنس صرف

تربیت یافتہ اور منضبط عقل کا نام ہے تربیت یافتہ اور معمولی عقل میں وہی فرق ہے جو ایک قواعد داں و آزمودہ کار سپاہی اور نوآموز رنگروٹ میں ہوتا ہے ان دونوں کے طریقِ عمل میں بھی وہی اختلاف ہے جو ایک مہذب شمشیر زن اور وحشی کی جنگ آزمائی میں ہوتا ہے۔

۳۔ ڈیوک آف ارگایل جارج ڈگلس ڈیوک آف ارگایل ایک نہایت مشہور عالم تھے آپ فرماتے ہیں:۔ "ایک سے زائد اشیاء کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ ہماری قوتوں سے ان کا کیا علاقہ ہے۔ یہ سائنس یا علم ہے۔ یعنی موجودات کے باہمی تعلقات اور نیز ان کے اور ہمارے درمیانی تعلقات کا نام سائنس ہے ہمارا علم محدود ہے اور سائنس اشیاء کے چند باہمی تعلقات اور نیز ان کے نظام عالم کے علاقہ تک محدود ہے۔ مشابہت میں اختلاف اور اختلاف کے درمیان مشابہت معلوم کرنا بجائے خود ایک قسم کا ادراک اور موجودات کے حقیقی تعلقات کا علم ہے اور یہ عقلی عمل سائنس سے متعلق ہے"۔

ایک اور عالم کہتا ہے" سائنس موجودات کی ابتداء اور ہستی کے نظریہ کا نام ہے۔ مشہور عالم جارج لوئیس کہتا ہے کہ خصوصیات کے وسیلہ سے جو مختلف کلیات حاصل کئے جاتے ہیں انھیں کسی ضابطہ یا نظام کے تابع کرنا سائنس ہے۔ مظاہرہ کے قاعدہ کے علوم کو قانون کی صورت دینا سائنس کا کام ہے اس کے وسیلہ سے معمولی علم اور واقعات ایک علم کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مظاہرہ کے قانون کی توجیہہ بھی اسی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انہیں تقاضر اور تسلسل کے قواعد کے تابع کرتا ہے اور خاص حقایق و واقعات کے عام تصورات کی جماعت بندی کرتا ہے۔ الغرض سائنس علم اور معلومات بہم پہونچاتا ہے سائنس ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ قوائے طبعی کے تصادم سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں اور دوسری طرف ہم ان سے مدد لیکر کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قواعد قدرتی کے علم اور ان کے قاعدوں سے واقفیت پیدا کرکے انسان نے ان سے حسب منشا رکام لینا شروع کردیا ہے۔ برقی اور مقناطیسی قوتوں سے کیسے حیرت انگیز کام ہو رہے ہیں۔ پانی انسان کی معروفیتوں کے کتنے شعبوں پر حاوی ہے یہ سب سائنس کے ظہورات ہیں سائنس نظام عالم کے متعلق تصورات اور خیالات بہم پہونچاتا ہے۔ موجودات کے تمام تغیرات اور تبدیلیات اس کے زیر فرمان رہتے ہیں۔ اس کی مملکت صرف عالم مرئی تک ہے اس کے آگے رہنا امکان سے باہر ہے۔

پروفیسر ہکسلے ایک اور جگہ سائنس کی تشریح یوں کرتے ہیں۔ سائنس قوانین قدرت کے اس علم کا نام ہے جو مشاہدہ تجربہ اور استدلال (استقرائی و استخراجی و تمثیلی) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسی واضح جامع اور عام فہم تشریح ملنا دشوار ہے۔ وہی عالم پھر آگے چل کر کہتا ہے کہ ہر قسم کے صحیح اور واضح علم کا نام سائنس ہے یعنی علم چاہے کسی قسم کا ہو اگر اس کے اصول اور ضوابط نہایت معقولیت سے قائم کئے گئے ہوں تو وہ سائنس کی ذیل میں شمار ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر الگز نڈریل نے سائنس کی یوں تشریح کی ہے سائنس اس علم کا نام ہے جو ضابطہ کے تابع ہو اور نظام میں مقید ہو علم کیا ہے۔ علم اس صورت متکنہ کا نام ہے جو ہم اشیاء اور موجودات کی بابت قایم کرتے اس میں ایک طرف تو عالم اور دوسری طرف معلوم (جانی ہوئی شئے) ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان جو تعلق پایا جاتا ہے وہ علم ہے ایک سادہ لوح آدمی سورج کی نسبت یہ خیال رکھتا ہے کہ ایک بڑا گولا ہے جو صبح کو مشرق سے نکلتا ہے اسے روشنی اور گرمی پہونچاتا ہے اور شام کو مغرب میں پہاڑوں ٹیلوں یا درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ جاتا ہے مگر صاحبِ فکر اور مشاقِ علم اسے دیکھ کر

سوالات پوچھتا ہے سورج کیا ہے اس سے روشنی اور حرارت کس طرح پیدا ہوتی ہے کیا یہ بذات خود کرۂ نار و نور ہے۔ یہ کس چیز سے بنا ہے وغیرہ پھر وہ ان سوالات کا جواب باصواب بہم پہونچانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے دیکھنے میں آتی ہے مگر وہ ایک قاعدہ اور کسی معیار کو مدنظر رکھتا ہے جس سے اپنے قیاس کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کرتا ہے۔ اس طریقے سے جو علم وہ آفتاب کی نسبت حاصل کرتا ہے وہ باقاعدہ یعنی معقول علم ہوگا۔ کیونکہ اس کے حصول میں اس نے مقررہ قاعدہ سے کام لیا ہے اور اس قسم کے علم کو سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

"سائنس کا کیا مقصد ہے"

سائنس کے مفہوم و معانی پر بحث کرنے کے بعد اب اس کے مقصد اولیٰ کی طرف رجوع ہونا مناسب ہے۔ ارسطاطالیس کہتا ہے (سائنس) تجربات کی وسیع تعداد سے شروع ہوتا ہے۔ سائنس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ عالم کا (جس کا ادراک عقل انسانی کے لئے ممکن ہے) واضح اور معقول حال بیان کرے۔

پروفیسر ٹامسن اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ سائنس کا مقصد تجربہ کے غیر شخصی واقعات کو قابل تصدیق الفاظ میں حتی الوسع نہایت عام فہم پیرایہ اور حتی الامکان نہایت مکمل و مفصل طریقہ اور وضاحت سے بیان کرنا ہے۔ یہ عقلی ترکیب اور دنیا کا عملی نمونہ خیال ہے یہ عالم کے حالات کو اسی ڈھنگ سے بیان کرتا ہے کہ تجربہ سے ان کی تائید ہوسکتی ہے۔ سائنس عالم کے قابل فہم حقایق سے بحث کرتا ہے روحانی اور طبعی ہر دو عملوں سے اس کا واسطہ ہے یعنی انسان اور کائنات دونوں کے حالات سائنس تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ الغرض کوئی ایسی شئے اس کے حلقہ وسعت سے بعید نہیں رہ سکتی جو اس کے طریقہ تحقیق کی زد میں آسکتی ہے۔

سائنس کا نفس مضمون وہ حقایق و واقعات ہیں جو تجربے میں آتے ہیں اور جن کی تصدیق و تائید ہوسکتی ہے۔

(۱) سب سے پہلے اصل واقعات اور فرضی حالات میں خوب ہوشیاری سے امتیاز کرنا لازم آتا ہے اس کے بعد سائنس کا طریقہ عمل ممکن ہوتا ہے۔

(۲) سائنس اصلی واقعات سے سروکار رکھتا ہے اس سے یہ مراد ہے کہ واقعات جو ہیں کائنات کے اندر اپنی طبعی صورت میں نظر آتے ہیں۔

(۳) سائنس نے اپنے واسطے یہ قاعدہ مقرر کرلیا ہے کہ وہ صرف ایسے واقعات سے سروکار رکھتا ہے جن کی تشریح و تائید ممکن ہے جن امور کو بخوبی بیان نہ کیا جا سکے یا جن کی اصلیت کی تصدیق نہ ہوسکے۔ سائنس انہیں نظر انداز کرتا ہے مثلاً تجربوں سے صرف ایک ہی شخص دوچار ہوا ہے دوسرے لوگ ان کی ماہیت اور اصلیت سے بالکل بیگانہ ہیں جیسے مظاہر روحانی ارواح کو دیکھنا یا اُن سے گفتگو کرنا زندہ اشخاص کو خاص موقعوں پر اپنے مکان سے بہت دور رکھنا وغیرہ یا کسی سیاح کا یہ بیان کرنا کہ اس نے آسٹریلیا کے وسطی جنگلوں میں ایک گوری پست قد وحشی قوم کو دیکھا ہے۔ سائنس اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ جب تک اس کی تصدیق دیگر معتبر وسایل سے نہ ہوسکے۔

سائنس کا کام موجودات کے اسباب معلوم کرنا بھی ہے سلسلہ اسباب و نتائج علت و تعلل کی ماہیت کا کھوج مبداء عالم اور نیز یہ کہ موجودات عالم اور مختلف النوع کا ایک ہی آغاز ہے یا ایک سے زیادہ ان سب معاملات پر بحث کرنا بھی سائنس کا کام ہے۔ الغرض سائنس کا مقصد کائنات اور مافیہا کا علم حاصل کرنا ہے۔ قدرت کے اندر ہزار ہا قسم کی اشیاء میں ان کے تعلقات باہمی اور وہ قوانین جن سے جملہ تعلقات اور تغیرات عمل میں آتے ہیں نیز مختلف ہستیوں کی اصلیت معلوم کرنا بھی اس کا کام ہے۔ الغرض بے جان اشیاء اور معدنیات نباتات حیوانات اور نوع انسان سب کے سب سائنس کی مملکت کے باشندے ہیں۔

"سائنس کے طریقے"

سائنس کا طریقہ تحقیق یعنی کسی ہستی کے صحیح اور واضح علم حاصل کرنے کا ڈھنگ نیا نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو صدیوں سے علمی دنیا میں رائج چلا آتا ہے ارسطاطالیس کے زمانہ میں تین طرح سے استدلال کرکے استخراج نتائج کیا جاتا تھا یعنی کسی امر کی سچائی یا کذب دریافت کرنے کے حسب ذیل ڈھنگ مروج تھے۔

(۱) خاص امر سے خاص امر کی طرف استدلال کرکے خاص نتیجہ اخذ کرنا جیسے استدلال تمثیلی یعنی (Analogical Reasoning) کہتے ہیں۔

(۲) خصوصیات سے کلیات کی طرف دلیل کرنا اسے دلیل استخراجی (Deductive Reasoning) کے نام سے پکارا جاتا ہے ان کی مثالیں دینا ضروری ہے۔ بعض فلکی عالم کہتے ہیں کہ مریخ آباد ہے وہاں جاکر کسی نے نہیں دیکھا ہے مگر استدلال تمثیلی کی بناء پر اس بات کو تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ آبادی کے واسطے جن شرائط اور حالات کا ہونا اس زمین پر لازم ہے وہ مریخ میں بھی پائے جاتے ہیں سب چھوٹی لڑکیاں گڑیوں کی بیحد شایق ہوتی ہیں یہ قاعدۂ کلیہ ہزار پانچ سو لڑکیوں کی کیفیت اور شوق کو مشاہدہ کرنے کے بعد قایم کیا گیا ہے اور یہ استدلال استقرائی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ سب چھوٹی لڑکیاں گڑیا کی شایق ہوتی ہیں اس لئے پاربتی بھی جو ایک چھوٹی لڑکی ہے گڑیا کی شایق ہوگی یہ نتیجہ استدلال استخراجی سے اخذ ہوا ہے۔

تحقیقات کے طریقہ استقرا کا بانی " بیکن " تھا اس نے پہلے اس امر پر زور دیا تھا کہ قدرت کے خاص حالات کو مشاہدہ کرنے کے بعد قاعدۂ کلیہ یا اصول قایم ہونا چاہیے زمانہ حال کے سائنس داں اسی اصول کے پابند ہیں۔ " نیوٹن " نے اسی قاعدہ پر عمل پیرا ہوکر کشش کا قانون معلوم کیا تھا اور قرار دیا تھا کہ یہ عالمگیر ہے اور جملہ اجسام ایک دوسرے کی کشش قبول کرتے ہیں۔ " ڈاروِن " نے اسی کو ملحوظ رکھ کر قاعدہ انتخاب طبعی (Natural selection) جہد الحیواۃ (Struggle for Existence) بقائے بہترین (Survival of the fittest) وغیرہ قوانین دریافت کئے تھے استقراری قوت (Persistence of force) تحویل قوت بقاء حرکت اور عدم فنائے مادہ کے مسایل بھی اسی طریقہ تحقیق سے وضع ہوئے تھے استدلال (Conservation of Energy) استخراجی کے وسیلہ سے ارباب سائنس ماضی اور مستقبل کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں فلکیات کے متعلق میں وہ کچھ مدت بعد دریافت ہوا تھا اسی طرح اگر کسی دمدار ستارے کو تین مرتبہ مشاہدہ کیا جائے تو بعد ازاں استخراج سے کام لے کر اس کے نمودار ہونے کی پیشگوئی ہوسکتی ہے۔ مگر استخراج سے مغالطہ کا بھی امکان ہے مثلاً ارسطاطالیس نے جو قدیم زمانہ کا سب سے بڑا فلاسفر اور محقق تھا ایک مرتبہ اس طرح

استدلال کرکے فقط نتیجہ نکالا تھا ستارے قدیم ہیں ان کی حرکت بھی قدیم ہونا چاہیئے اور حرکت استمراری گول ہونا چاہیئے۔ اس میں سے یہ ظاہر ہے کہ ستارے زمین کے گرد حلقوں میں گھومتے ہیں۔

یہاں سائینس کے جملہ طریقوں پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے جیسے ریاضی طریقہ استدلال (Mathematical) تجربی (Empirical) تمثیلی (Explanatory) اور تحقیقی (Verificatory) طریقہ میں جن کا خصوصیات سے ذکر کیا گیا ہے مگر دو باتوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ بعض وقت اہم نتیجہ آپ سے آپ ذہن کے اندر موجود ہوتا ہے اور آدمی کو استدلال یا تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ عملاً استقرار اور استخراج ایک دوسرے سے نہایت پیچیدہ طور پر ملے ہوئے ہیں جب آدمی مشاہدہ کرکے واقعات جمع کرتا ہے۔ اور ان سے کوئی خاص نتیجہ نکالنا چاہتا ہے تو ان دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے عقل کبھی آگے جاتی ہے اور کبھی پیچھے لوٹتی ہے۔ سائینس کے انکشافات بڑے بڑے اہل دماغ اور غیر معمولی ذہین آدمیوں کی فوری سوجھ سے عمل میں آئے ہیں مگر زیادہ تر نظر غائر اور شوق کے سہارے یہ بڑا بار لگا ہے۔ چیزوں کو خوب ہوشیاری سے دیکھنے کا شوق اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی تمنا سائینس کی دریافتوں کے لئے لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اگر کسی مسئلہ کو سائینسی طریقہ سے حل کرنا چاہو تو سب سے پہلے اس کے متعلق معلومات واقعات بہم پہنچاؤ یعنی بڑی احتیاط درستی بے تعصبی اور قابلیت کے ساتھ مشاہدہ کرو اور اس میں خوردبین فوٹوگرافی وغیرہ آلات سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ دوسروں کی باتوں کو من وعن باور مت کرو اشیاء کا عرض و طول عمق و ارتفاع بھی بڑی صحت کے ساتھ ناپنا ضروری ہے الغرض اپنے تجربہ اور مشاہدہ میں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی نظر انداز مت کرو جب معلومات بہم پہنچ جائیں تو پھر ان کی تقسیم و ترتیب لگاؤ یعنی یہ دیکھو کہ ان میں کتنا اختلاف اور کتنی مطابقت پائی جاتی ہے ایک قسم کی باتوں کو الگ کرو یعنی درمیانی تعلقات معلوم کرنے کی کوشش کرو اور یہ کام بھی بڑی ہوشیاری اور خوبی سے کرنا چاہیئے ورنہ مغالطہ کا اندیشہ ہے جہاں ضرورت ہے۔ نشر کیمیائی سے کام لینا چاہیئے بعض وقت محقق کے دل میں از خود ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ نظریہ قایم کرکے اس کے متعلق ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے تجربہ سے کام لیتا ہے۔ مثلاً برقی صدمہ کا پودوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ آلہ کی مدد سے برق پیدا کرکے پودوں پر ڈالو اور اس کا اثر مشاہدہ کرکے رائے قایم کرو نظریہ یا خیال کو جب چاہو قائم کرلو مگر اس کی صحت و تائید واقعات سے ہونی چاہیئے۔ جب یہ ہو جائے تو پھر اس نظریہ کو اصول یا قاعدہ کی صورت میں نہایت عام فہم مگر جامع طریقہ سے بیان کیا جاتا ہے یعنی نئے حقائق کو کسی پرانے قاعدے کے تابع کر دیا جاتا ہے اور وہ سائینس کے قاعدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سائینسی طریقہ تحقیق و استدلال کے لئے ضروری ہے کہ مشاہدہ سے کام لیا جائے مشاہدہ غور اور احتیاط سے ہونا چاہیئے۔ تجربہ بھی لابدی ہے۔ بہت سے مختلف واقعات کو یکجا جمع کرکے انھیں تقسیم کرو اور پھر ان سے نتائج اخذ کرو جب اس کی تصدیق و تصحیح ہو جائے تو پھر اسے ضابطہ یا قاعدہ یا اصول کی صورت دو سائینس میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بچے کی طرح سچے دل سے حق کا متلاشی رہے اور واقعات و معلومات کی بنا پر نتیجہ نکالنے اور تب اپنی رائے قایم کرے۔ تعصب اور طرفداری کو ذرا دخل نہ دے صرف راستی اور حق کو ملحوظ خاطر رکھے۔

سید بشیر الدین نظامی

کتبۂ مزارِ سلطان ٹیپو شہیدؒ (والیٔ میسور)

تری فرمانروائی کا ہے چرچا بادشاہوں میں
ترے طرزِ جہانبانی کا شہرہ کج کلاہوں میں

بہادر کانپتے ہیں نام سن کر رزم میں تیرا
جگر اس کا ہے جس نے تجھ کو دیکھا رزمگاہوں میں

مثال ایسی کہاں ڈھونڈیں نظیر ایسی کہاں پائیں
جو صوفی صوفیوں میں بادشاہ ہو بادشاہوں میں

بتائیں کیا، وہ کیا تھا تیرا عہدِ معدلت گستر
اگر نوشیرواں ہوتا تو ہوتا دادخواہوں میں

حمایت نے تری ان کو کیا بے خوف خطرے سے
جنھیں دیکھا تھا لٹتے دن دہاڑ شاہراہوں میں

ترا ذہنِ رسا تھا قوتِ ایجاد کا مالک
قوانینِ کہن جچتے نہ تھے تیری نگاہوں میں

شکوہِ قیصر، وشانِ فریدوں، شوکتِ دارا
ترا پرچم، ترے ماہی مراتب، تیرا نقارا

سریر آرائے نوبت اوج بخشِ تاجِ سلطانی
پناہِ بے پناہاں چترِ رحمت ظلِ سبحانی

معینِ امتِ مرحوم، شانِ ملتِ بیضا
فروغِ دینِ مصطفوی، ضیائے شمعِ ایمانی

تری ہیبت سے اکثر رخ بدلتا تھا ہواؤں کا
تری دہشت سے اٹھتی تھی نہ دریاؤں میں طغیانی

گذاری عمر اپنی تو نے بے دینوں کے نرغے میں
تجھے جمعیتِ خاطر رہی اکثر پریشانی

تجھے اغیار نے اپنے جگر کی پھانس ہی سمجھا
مگر افسوس اپنوں نے نہ تیری قدر پہچانی

بہے گی اک نہ اک دن پھر ترے سیلابِ سطوت میں
خس و خاشاک بن کر اہلِ یورپ کی ستم رانی

ابھی باقی ہے اس کی گونج جو کہتا تھا تو اکثر
صد و سی سال سے گیدڑ کے اک دن شیر کا بہتر

مبارک ہو ترے نقشِ قدم کو کہکشاں ہونا
زمیں پر خطۂ میسور رشکِ آسماں ہونا

مبارک اے زبانِ حضرتِ ٹیپو مبارک ہو
تجھے قانونِ قدرت کا حقیقی ترجماں ہونا

نسیمِ حضرتِ والا کا ادنیٰ فیض ہے یہ بھی
خزاں دیدہ چمن وقفِ بہارِ جاوداں ہونا

ترا مہرِ کرم تھا علم و فن پر یوں ضیا افگن
کہ ہر ذرے کو آیا بدر بن کر ضو فشاں ہونا

"کرشنا راج ساگر" کیوں نہ اب ممنون ہو تیرا
سکھایا تو نے اس کی موج کو رواں ہونا رواں ہونا

اسی سے خطۂ میسور کی ہے گلشن آرائی
تھا ہر ہر خار کی قسمت میں اک اک گلستاں ہونا

میسور کا کرشنا راج ساگر بند بالکل سلطان ٹیپو کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ ایک کتبہ دستیاب ہوا جس پر سلطان کا فرمان کندہ ہے جس میں کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت پر ایک دستورالعمل مرتب کیا گیا تھا۔ آج اس کتبہ کو بند کے ایک نمایاں حصے پر نصب کیا گیا ہے۔

دکن میں "سوتھ کاویری"[1] اک عالم جس کو کہتا ہے
وہ فیضِ جاریہ لگ کر ترے قدموں سے بہتا ہے

غلامی جن کی فطرت میں تھی وہ آزاد کیا ہوتے
ہیں ساری عمر بیٹھے شومیٔ تقدیر کو روتے

ہوا تھا پارہ پارہ جن کے ہاتھوں دامنِ غیرت
وہ پشیمانی سے ہیں داغِ ندامت آج سب دھوتے

سکوں حاصل ہوا دم بھر نہ گردش میں غلامی کی
جو دکھ دیتے ہیں اپنوں کو وہ سکھ کی نیند کیا سوتے

اگر احساس ہوتا اپنی آبائی غلامی کا
نہ یوں غیروں سے مل کر وہ متاعِ حریت کھوتے

قریں تر ہو چکی تھی منزلِ مقصود آزادی
ترے دشمن نہ تیری راہ میں کانٹے اگر بوتے

بھلا کیا خاک ہوتی آبیاری نخلِ ملت کی
ہوئے سب بند جب سرچشمۂ امید کے سوتے

لبوں پر دم ہے اب تک دم تری غیرت کا بھرتے ہیں
ندامت رنگ لائی ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

اگر دنیا نہ یاری تیری سطوت کا وجود اب تک
مثال بو نہ رہتا اپنا رنگِ ہست و بود اب تک

ذرا کروٹ تو لے جاگ اٹھے قسمت نوعِ انساں کی
ترے آرام سے ہے ہند پر طاری جمود اب تک

ستم گاری میں چرخِ کینہ پرور کی نہ فرق آیا
دکھاتا ہے زمانے بھر کو یہ چشمِ کبود اب تک

رواداری کی پھونکی روح تو نے جسمِ عالم میں
ترا دم بھر رہے ہیں کیا مسلماں کیا ہنود اب تک

وہ گہوارہ امانت جس میں پلتی تھی خدائی کی
وہ گودی کھیلتی ہے جس میں فطرت کی نمود اب تک

وہ رقبہ درحقیقت تھا جو منزل گاہِ آزادی
وہ نقشہ حریت کے جس میں شامل ہیں حدود اب تک

غلام آباد ہیں اب اس میں غداروں کی بستی ہے
ستم گاروں کی مکاروں کی عیاروں کی بستی ہے

احمد عبد القیوم (عارف)

غزل

ابو المنیر مشتاق قریشی
(بنگلوری)

جستجوئے نار تھی یا نورِ یزداں کی تلاش
پُر صداقت تھی مگر موسیٔ عمراں کی تلاش

محشرستانِ نوا میں ہے ترنم کی ہوس
گلشنِ اندوہ میں گلہائے خنداں کی تلاش

چارہ گر بے سود ہیں تیری یہ ساری کاوشیں
درد پر مرتا ہوں میں اور تجھ کو درماں کی تلاش

بزمِ امکاں میں جو ہے مستور تیرے دل میں ہے
خلوتِ دل ہی میں کر حسنِ نمایاں کی تلاش

رازِ فطرت ذرے ذرے سے ہے عالم آشکار
پھر دلِ عارف کو ہے کس رازِ پنہاں کی تلاش

---

[1] دریائے سوتھ کاویری سلطان ٹیپو شہیدؒ کے مزار کے پائین ہو کر بہتا ہے۔

گنگا کا ایک نظارہ

سرِ شام کا دھندلکا غضب کی تاریکیوں کے ہجوم میں غائب ہو رہا تھا۔ مقدس بنارس کے مناور اندھیرے میں چھپے جا رہے تھے۔ —— کہر پھیلنے لگی تھی اور ظلمت و تاریکی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تاریکیوں اور ظلمت کے اسی سمے میں ایک ہندو دوشیزہ اپنے دل میں پریم اور محبت کے جذبات کی ایک وسیع دنیا لئے ہوئے ساحل پر آئی —— اس نے کنول کے ایک پتے پر شمع جلا کے سطح آب پر تیرنے کے لئے چھوڑ دی —— اُس مست شباب کا نہرہ گداز حسن لاکھوں کی تھکی ہوئی آنکھوں میں نیند انڈیل رہا تھا —— اس کا خیال اس کے پردیس گئے ہوئے ساجن کی یاد میں محو تھا —— اُس کا ساجن بہت دور —— پردیس گیا ہوا تھا —— اب تک واپس نہیں آیا تھا —— یہ بہتی ہوئی شمع اب اس کی زندگانی کی تفسیر ہوگی۔

شمع بہی جا رہی تھی —— نازنین اس بھیانک اندھیرے میں شمع کو دیکھ رہی تھی —— شمع کی لَو ہوا کے بیباک حملوں سے دلیرانہ لڑ رہی تھی —— ہوا کے پیہم حملے اور کمزور ہوتی ہوئی شمع تھے اس حسینہ کے قلب و جگر میں گریہ و اضطراب کا ایک محشر بپا کیا تھا۔ —— رنج و الم کے جذبات سے وہ سوگوار ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری متاع فنا کی گود میں دکھائی دے رہی تھی کہ فوراً ہی ہوا کے تیز و تند جھونکے نے شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ بڑا ہی قاتل نظارہ تھا —— ایک برا شگون اس کے محبوب کی دائمی جدائی کا یقین دلا رہا تھا —— وہ اپنی پھوٹی قسمت پر اپنے محبوب کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی ——

اس کے رنج و غم میں گنگا کی پُرشور موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر گریہ و الم کا طوفان بپا کر رہی تھیں —— اس شدت سے ڈر کر ستارے بادلوں کے پیچھے جا چھپے تھے —— اور شورِ قیامت بپا تھا۔

(ماخوذ از رچرڈسن)

غزل

زلف بدوش اور بھی آرنگِ سرور کی قسم
منزلِ یار دوست میں ضبط کا ماجرا نہ پوچھ
عشق کی شان دیکھ لی حسن کی آن دیکھ لی
ایسی بھی ایک ساعتِ حسن تمام آئی تھی
اے بتِ حسن آفریں! محو نیاز عشق ہوں
کاوشِ بے نشاط کے ذوق کا حال کچھ نہ پوچھ

محبوب حسن جگر

تجھ کو فروغ رنگ و بو اپنے غرور کی قسم
درد بھی تھک کے رہ گیا قلب سرور کی قسم
لطفِ حیات پا لیا تیرے حضور کی قسم
میں بھی تمام حسن تھا شعلۂ طور کی قسم
صرفِ نیاز ہے جبیں تیرے ظہور کی قسم
آج وہ مست مست ہے چشم سرور کی قسم

کاوش

دوستی کا راز

دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی شئے کی ضرورت سے زیادہ طلب ہوتی ہے اور جب یہہ طلب اپنی حد سے آگے نکل جائے تو آدمی کچھ کھویا ہوا سا نظر آتا ہے۔ ایسی طلب کو " بینیا " کہا جائے تو ہرج نہ ہوگا۔ ایک کا مطمحٔ نظر صرف سیم وزر ہے۔ دوسرا حسن کا دیوانہ ہے۔ یعنی سارے سیم وزر کو حسن پر قربان کرنے تلا ہے۔ تیسرا کتابوں کا عاشق ہے۔ اس کے نزدیک دولت ڈھلتی ہوئی چھاؤں اور حسن سطحی دھوکا ہے۔ چوتھا شاعر ہے۔ تمام عمر حسن کی قصیدہ گوئی کرتا ہے اور فلک کو گالیاں دیتا رہتا ہے۔ لیکن اگر حسن و عشق کسی کوچہ میں تنہا بھٹکتے ہوئے مل جائیں تو ان دونوں کو اپنے دیوان پر سے وار دے۔ کوئی صرف شہرت کا بھوکا ہے۔ کبھی بلدیہ کی رکنیت کے لئے نام پیش کرکے آخر وقت دوسرے کے حق میں دست بردار ہوجاتا ہے کہ کم از کم اخبارات میں یہہ خبر کئی دن تک شائع ہوتی رہے کہ فلاں صاحب نے اپنا نام واپس لے لیا۔ بعض معرکتہ الآرا سیاسی مسائل پر رائے زنی کرنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اگر شہرت کسی مسئلہ کی مخالفت کے ذریعے سے ملتی ہو تو پھر ملک میں اس مسئلہ کے سب سے زبردست حریف آپ ہی ہیں۔ بہرحال ان کے علاوہ ایک شخص ایسا ہے جس کا دل دوستوں کے لئے وقف ہے۔ وہ بغیر دوستوں کے جی نہیں سکتا۔ رات تنہا بسر کرتا ہے تنہائی بھی خواب کی حد تک۔ ورنہ وہ دوستوں سے نہیں چھوٹ سکتا اور نہ دوست اس سے چھوٹ سکتے ہیں۔ ہر وقت آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کے ملاقات کے کمرہ میں کوئی نہ کوئی بزرگوار دھرے ہوئے ہیں اگر تصدیق کرنی ہو تو کبھی غریب خانہ پر تشریف لائیے۔

جناب والا دوست! تو دوست کا آپ پاس کیا مفہوم ہے؟ کیا دو تین مرتبہ سلام علیکم کا جس شخص نے گردن لٹکا کر جواب دیا ہو، وہ دوست ہے؟ یا چلتی ہوئی ریل میں ایک دوسرے سے آپ کہاں جارہے ہیں؟ اور پھر جواب میں یہہ کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ پوچھنے کے بعد دوستی ہوجاتی ہے؟ یا راستہ چلتے ہوئے اپنا "دوست" سمجھ کر کسی اجنبی کی پیٹھ پر دستِ محبت دراز کرتے ہوئے کہ "ٹھیرو بھائی بشیر کہاں جارہے ہو" اور پھر فوراً ہی "معاف فرمائیے غلط فہمی ہوگئی" کہنے کے بعد کیا دوستی کا عہد و پیماں ہوجاتا ہے؟ یا اندھیری رات میں بائیسکل کا لیمپ جلانے کے لئے کسی راہ چلتے بھلے مانس کو روک کر کہیں کہ ذرا دیا سلائی (بقول ایک صاحب کے "کاڑی") کی ڈبیہ تو دیجئے کیا اس احسان کے معاوضہ میں آپ دوستی کو ڈبیہ میں بند کرکے واپس کریں گے۔ یا پھر امتحان گاہ میں ریاضی کا پرچہ حل کرتے ہوئے آپ کے سامنے بیٹھنے والا اپنی کاپی اس طرح رکھے کہ آپ کو جواب علانیہ نظر آرہا ہو تو کیا یہہ محسن بھی دوست بن سکتا ہے؟

ممکن ہے ان میں سے کوئی ایک آپ کی دوستی کے معیار پر پورا اتر سکے۔ لیکن معاف فرمائیے میں اس قسم کی دوستی سے بچتا ہوں میں نہایت اطمینان سے بلکہ فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرا معیارِ انتخاب بہت بلند ہے۔ ہر وہ شخص جو مجھ سے ملتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اسے اس اصرار کا کوئی حق حاصل نہیں کہ میں بھی اسے اپنا دوست سمجھوں۔ وہ معیار کیا ہے؟ تو یہہ

میری زندگی کا راز ہے اور ظاہر ہے کہ راز عام طور پر نہیں بتائے جاتے اور پھر یہہ بھی ہے کہ بعض باتوں کے دہرانے سے ان کی تاثیر میں کمی ہو جاتی ہے بہرحال میری دوستی کا معیار انتخاب کی جس بلندی پر ہے وہاں تک سطحی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ اور یہی وجہہ ہے کہ جہاں مجھے ہزارہا طلباء میں سالہا سال رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں صرف تین' چار دوست پیدا کر سکا

یادش بخیر! علی گڈھ کی زندہ سرزمین میں میں نے پانچ سال گذارے۔ لیکن اس مدت میں صرف تین دوست مجھے ملے۔ یعنی احمد وحید اور اقبال۔ ہم تینوں میں کتنا گہرا ربط تھا!! یوں سمجھ لیجئے کہ یا تو یہہ تین ہستیاں میری ذات میں مدغم ہو گئی تھیں' یا میں ان تینوں میں جذب ہو گیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا' پڑھنا' لکھنا' چلنا' پھرنا سب ایک ساتھ عرصے تک ملے رہے۔ لیکن کیا مجال کہ کسی روز کسی کی ابرو میں شکن تک پڑی ہو۔ وجہہ یہہ کہ ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف' ہر ایک خوش مذاق موقع و محل شناس' علمی ذوق کا حامل اور پھر بحث و مباحثہ کا خوگر! جب چار خوش مذاق یکجا ہوں اور سلسلۂ سخن ٹوٹنے نہ پائے تو بتائیے کتنا لطف آتا ہے...... کم سخن شخص شاید دوستی کو دلچسپ بنا نہیں سکتا۔

چھٹیوں کی راتیں ہیں اور چاند کی روپہلی روشنی میں مارسٹن کورٹ' کے احاطے میں چارپائیاں بچھی ہوی ہیں۔ ایک رامپوری دوست کی ہارمونیم نوازی پر ایک خوش گلو کا غالب پر سر دھنناکہ

رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم نوا کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بس سمجھے کہ ہر شخص وارفتہ ہو کر جھوم رہا ہے اور دو تین زبردستی جھوم رہے ہیں۔ بہرکیف ایک کیف اور بے خودی کا عالم طاری ہے۔ ادھر ہارمانی ختم ہوئی اور ہم نے اطراف نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب لحافیں تان کر سو رہے ہیں۔ احمد نے مجھ سے صیغۂ راز میں کہا " اس غیر شاعرانہ حرکت کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔ ہم بیوقوف تو تھے نہیں کہ اتنی رات گئے یوں ہی جاگتے رہے اور یہہ سب چین سے خراٹے مار رہے ہیں۔ میں نے کہا" تو پھر کارروائی شروع کرنی چاہئیے" کارروائی یہہ تھی کہ ڈائننگ ہال سے پندرہ' بیس صراحیاں لائی گئیں اور پھر تکمیل ضابطہ کے لئے ان میں سرخ رنگ گھولا گیا اور تھوڑی دیر بعد تڑاخ پڑاخ اور غافلوں کی چیخ و پکار سے مارسٹن کورٹ کی ساکت فضا گویا کسی ریلوے جنکشن کی چہل پہل اور دوڑ دھوپ میں تبدیل ہو گئی۔ ہر شخص اپنی چارپائی پر مرغِ آبی بنا ہوا تھا . زندہ دلی بھی دوستی کا جزو لاینفک ہے

چار دوست اطمینان سے بیٹھے ہوے ہیں۔ بات یہاں تک پہونچی کہ ہندوستان میں سیاسی انقلاب سے پہلے معاشی انقلاب کی ضرورت ہے بس سمجھ لیجئے کہ سب محمدؐ علی جناح اور جواہر لال نہرو ہیں۔ چاروں میں سے ہر ایک معقولیت کے ساتھ دلائل پیش کر رہا ہے۔ اور دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے خوب زور زور سے چیخ کر اپنی بات منوا رہا ہے۔ ایک ۱۸۵۷ء کی تاریخ سے بحث کر رہا ہے۔ دوسرا اکبر کے عہد سے لے کر آج تک کے معاشی تغیرات بتلا رہا ہے۔ احمد نے تو ایک مرتبہ محمد تغلق کے عہد سے ہندوستانی سیاسیات کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بحث زوروں پر ہے یہاں تک کہ ایک اجنبی شخص یقین کرے کہ یہہ لوگ سول نافرمانی کے سلسلہ میں ضرور گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ بہرحال بحث اپنی منزلیں تیزی سے ختم کرتی ہوی اس نقطہ پر پہونچی کہ انسان بے لوث محبت کر سکتا ہے یا نہیں ؟

علی گڑھ کا ایک بورڈنگ جس کے کمرہ نمبر ۵ میں میں رہتا تھا۔

اب ہر شخص محبت کی تعریف اور اس کے اقسام بتا رہا ہے۔ لیکن کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ معاشیات اور سیاسیات کے چکر سے نکل کر محبت کے دروازہ میں کب داخل ہوے۔

دوست وہ ہے جو دوست کی غلطی کو اپنی غلطی سمجھے اور یہی بات ہم چاروں میں تھی۔ دہلی سے علی گڈھ واپس ہو رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے دہلی پلیٹ فارم نمبر ۴ سے گاڑی چھوٹتی ہے۔ ابھی خرید و فروخت میں ہی تھے کہ چاندنی چوک کے گھنٹہ گھر نے پونے گیارہ بجائے اب پندرہ منٹ میں اسٹیشن پہونچنا ہے۔ اتفاق سے کوئی تانگہ بھی نہیں ملا۔ میں نے کہا وقت ضرورت کھلی سڑک پر ڈبل مارچ جائز ہے سب نے اتفاق کیا۔ اور ہانپتے ہوے اسٹیشن پہونچے۔ وہاں کی گھڑیال گیارہ بجا رہی تھی۔ ریلوے پل کو عبور کر کے پلیٹ فارم کے دونوں جانب گاڑیاں کھڑی ہیں اور دونوں کے انجن سیٹی دے رہے ہیں۔ میں نے احمد سے کہا "آگے بڑھ کر دریافت کرلو۔ کونسی گاڑی علی گڈھ جا رہی ہے پلیٹ فارم کے اس طرف کی یا اس طرف کی" میں صبح ہی معلوم کر چکا ہوں۔ احمد نے یقین آمیز لہجہ میں بائیں طرف ہاتھ بتاتے ہوے کہا علی گڈھ کی گاڑی اس طرف کی ہے۔ ہم احمد کے ساتھ ساتھ انٹر کلاس کی طرف لپکے۔ سوء اتفاق ڈبہ خالی تھا۔ اندر داخل ہوے اور برتھ پر دراز ہوگئے۔ دہلی سے علی گڈھ ستر میل کا فاصلہ ہے اور راستہ میں صرف دو جگہ گاڑی ٹھیرتی ہے۔ یعنی غازی آباد اور خورجہ پر۔ تیسرا اسٹیشن علی گڈھ ہے اور یہہ سفر کوئی ڈھائی گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ بہر حال گاڑی روانہ ہوی اور کوئی گھنٹہ بھر بعد آئی اقبال نے اطمینان کا سانس لیتے ہوے کہا "شکر ہے غازی آباد آگیا۔ وحید نے کہا" ایک بڑا گنڈم خورجہ بھی تو ہے" میں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ خیر گاڑی چلی اور کچھ دیر بعد رکی۔ احمد نے کہا" تو میاں علی گڈھ کی ہوا آنے لگی۔ یہہ تمام گفتگو برتھ پر لیٹے لیٹے ہو رہی تھی۔ کسی نے جھانک کر تک نہ دیکھا کہ غازی آباد کی کیا کیفیت ہے اور خواجہ کا کیا عالم ہے۔ ایک گھنٹہ کی شیطانی چال کے بعد گاڑی رکی اور ہم برتھ سے کود کر دروازہ کی طرف پہونچے۔ مگر عجیب منظر نظر آیا۔ یا للعجب! نہ وہ علی گڈھ کا اونچا پلیٹ فارم ہے اور نہ وہ ماحول۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ لیکن فوراً ہی بات سمجھ میں آگئی یعنی ہم دہلی سے ڈیرہ ڈون جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ خیر یہہ پریشانی ختم بھی نہ ہوی تھی کہ تھوڑے سے فاصلہ پر جناب ٹکٹ انسپکٹر صاحب استقبال کو آتے ہوئے نظر آئے انسپکٹر کو آتا دیکھ کر ہم نے ڈیرہ ڈون کے فوجی کالج پر بحث شروع کر دی۔ انسپکٹر پاس کھڑا ہوا ٹکٹ مانگنے لگا۔ احمد نے وحید کو مخاطب کرتے ہوے کہا پینتیس کروڑ کی آبادی میں ایک فوجی کالج اور وہ بھی ڈیرہ ڈون میں کافی نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں نہ ہر شہر میں ایک ایک فوجی کالج قائم کیا جائے ؟ ٹھیک ہے مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ آخر کیوں نہ ہر شہر میں ایک ایک فوجی کالج قائم کر دیا جائے۔ اقبال نے انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرتے ہوے کہا۔ انسپکٹر ہاتھ چھڑا کر ٹکٹ مانگنے والا ہی تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب پہونچا کر اس کو مزید سوال و جواب سے روکتے ہوے وحید سے کہا "ہر مقام کی آب و ہوا مختلف ہوتی ہے فوجیوں کے لئے بالخصوص کھلا اور سرد مقام چاہئے تاکہ ان سے خوب کس کر محنت کی جاسکے جس طرح اس اسٹیشن کی ناموافق آب و ہوا میں ہم بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ کیا کبھی علی گڈھ کے اسٹیشن پر بھی اس طرح بے چین ہوے تھے ......؟ اچھا تو آپ سب علی گڈھ کے ہیں ؟ ٹکٹ انسپکٹر گویا دشمنی کی نظر سے دیکھتے ہوے کہا۔ فوراً ٹکٹ بتائیے۔" بات یہہ ہے ماسٹر" احمد نے انسپکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوے کہا۔" آج ایک لطیفہ یہہ ہوا کہ

دہلی پلیٹ فارم نمبر ۴ پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ علی گڈہ پہونچانے والی گاڑی کی بجائے عجلت سے ہم اس گاڑی میں بیٹھ گئے تاکہ آج آپ کے مہمان رہیں، دیکھئے خدا کی کیا مصلحت ہے انسپکٹر دعوت کا رقعہ مانگنے والا ہی تھا کہ وحید نے کہا "ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ کبھی آپ سے غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی ہم سے۔ اس دنیا میں کوئی کام خدا کے کاموں سے اس قدر ملتا جلتا نہیں ہے جس قدر یہہ کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کر دیں۔ مگر..... آپ پہلے ٹکٹ بتائیے..... یہہ اسٹیشن ہے اور سرکاری معاملہ ہے۔ اقبال نے کلی طور پر سمجھاتے ہوے کہا" ہم اس لئے عرض کر رہے ہیں کہ یہہ دنیا ہے اور دنیا میں یہہ ایک اسٹیشن ہے۔ ورنہ معلوم ہے قیامت کے دن آپ کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ اور ہم کہاں ہوں گے۔ اس روز نہ آپ ہم سے ٹکٹ مانگ سکیں گے اور نہ ہم آپ کو بتا سکیں گے۔

"اچھا یہہ تو بتائیے" میں نے دوستانہ لہجہ میں انسپکٹر سے کہا" یہاں سے واپسی کی گاڑی کب ملے گی؟ بیچارہ انسپکٹر بھی پگھل گیا اور مسکراہٹ کے ساتھ ارشاد ہوا۔ خوب دلگی رہی۔ اچھا آپ لوگ بیٹھ تو جائیے۔ انسپکٹر نے ایک بڑی بنچ منگائی اور ہم سب بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ دو بجے گاڑی آئے گی۔ اس میں بیٹھ کر ہم کو ہاپڑ (یہہ وہی ہاپڑ ہے جس کے بڑے بڑے پاپڑ مشہور ہیں) جانا پڑے گا۔ وہاں صبح گیارہ بجے گاڑی ملے گی۔ اس میں چل کر ہم دو بجے غازی آباد پہونچیں گے۔ ہاپڑ والی گاڑی آگئی ہم انسپکٹر اور اسٹیشن ماسٹر کو خدا حافظ کہتے ہوے روانہ ہوے اور پروگرام کے مطابق دوسرے دن ۵ بجے علی گڈہ پہونچے۔ سفر بے حد دلچسپ رہا۔ بالخصوص اس وقت جب کہ ہم ہاپڑ کے اسٹیشن پر مولوی عبدالحق صاحب کی اُردو کی زبردست خدمات کا ذکر کرتے ہوے سفر کی صعوبتوں کو بالکل بھول چکے تھے اور یہہ محسوس کر رہے تھے کہ ہاپڑ میں اردو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور ہم اس میں شرکت کی غرض سے آئے ہوے ہیں۔ سفر دلچسپ کیوں نہ رہتا؟ ہر شخص غلطی کا شکار تھا...... دوست کی غلطی کو اپنی غلطی سمجھنا غالباً دوستی کا ایک اہم راز ہے۔

محمد منیر الدین

غزل

عقابِ مہر کی پروازِ بے باکانہ جاری ہے
منازل کی بلندی اور پستی اعتباری ہے

سمندر ہے کرشمہ اتصالِ قطرۂ پیہم کا
قرار و صبر میں مضمر گہر کی آب داری ہے

نہ بخشی قوتِ پیوستگی آتش کو قدرت نے
کہ شورِ برتری شعلہ کی ہر اک رگ میں ساری ہے

ادائے فرض میں آتش بجاں ذرات کے دل میں
اسی توفیق سے عالم کو حاصل استواری ہے

عمل اور فکر کی وحدت سے ہے پیوستگی حاصل
وگرنہ زندگی کو زندگی کہنا بھی خواری ہے

نظر کی لغزشوں کو حائلِ راہِ خرد مت کر
وہ رخشِ زندگی ہے یہہ عنانِ شہ سواری ہے

ہیں پابندِ فریبِ آگہی ہم آہؔ خوش خوش ہیں
مسافر کو وگرنہ فرصتِ اختر شماری ہے؟

مس میمونہ بیگم آہؔ

ص۱ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کا وطن۔

حقیقی مسرت

دنیا میں ہزاروں ہستیاں "مسرتِ حقیقی" کی تلاش و جستجو میں مجروح ہو چکی ہیں جس طرح پھول کے حاصل کرنے میں نوکِ خار سے دو چار ہونا لازمی ہے اسی طرح مسرت تک پہونچنے کے لئے ان چار مہیب عناصر کو مغلوب کرنا پڑتا ہے جو مسرت کو گھیرے ہوئے ہیں یعنی "ہوس و محبت" "امید و بیم" یہی عناصر ہیں جن سے دل کا خمیر بنایا گیا ہے۔ جو دل کی کائنات پر بالترتیب اپنے پورے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ہوس" اپنے آئینۂ فریب کی شعاعیں دل پر ڈالتی ہے ان بظاہر روشن مگر دشمنِ نور شعاعوں کی ساحرانہ قوتوں کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ "روح مسرت" بے حس اور منجمد ہو جاتی ہے خوف ہوتا ہے کہ یہہ بے حسی اور انجماد اس کی فنا کا باعث نہ ہو جائے اسی وقت "بیم" کی سحر شکن شعاعیں ہوس کے لئے وہ کام کرتی ہیں جو رات کی تاریک اور خوفناک فضا کے ساتھ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی "روحِ مسرت" جاگ اٹھتی ہے مگر "ہوس و بیم" کی زنجیروں میں جکڑی ہوی "دل" دو خوفناک دشمنوں کے نرغے میں پھنسا ہوا دل طائر مجبور مگر انسان کے سینہ کی کمزور میں اس طائر کی وحشتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہ تھیں۔

کسی کی ہمت افزا نظروں نے انسان کو تسکین دی ان کشاکشوں کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا۔ وحشی دل کو رام کیا۔ اب دل سینے کے اندر بے چین نہ تھا محبت کی گہرائیوں میں امید موہوم کے چند شرارے ترقی کر کے تیقن کی شعاعیں بن چکی تھیں۔ رات کی تاریک فضا مشرق سے نکلتے ہوئے خطوطِ مطلع سے فنا ہوتی ہے۔ "بیم و ہوس" فنا ہو گئے تیقن کی شعاعوں ہیں۔ آہ کمزور دل۔ مجبور دل۔ ایک زمانے کی کشاکش کے بعد اس ایقان کی روشنی میں مضبوط اور مختار دل بن گیا۔

انسان کے دل کے ساتھ یہہ چاروں عناصر وجود میں آئے کمزور عقل کا کمزور دل مسرت کے بہلانے سے بہل گیا اور یہہ سمجھ بیٹھا کہ ہوس و بیم فنا ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے۔ افسوس وہ یہہ بھول گیا کہ ان چیزوں کا تعلق اس کے خمیر سے ہے۔ جس طرح موسم سرما میں پرندوں کی خوش الحان آواز نہیں سنائی دیتی مگر یہہ چیز پرندوں کے عدم پر دلیل نہیں ہو سکتی۔ یہہ کہہ سکتے ہیں "ہوس و بیم" کے اثرات فنا ہو گئے۔ "ہوس و محبت" "امید و بیم" دل کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

احمد علی اکبر راز قاسمی

(ماخوذ از انگریزی)

آپ دنیا کے جھگڑوں سے تنگ آ گئے ہوں گے۔ تن کی دنیا اگر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑنا چاہتے ہوں تو "من کی دنیا" میں داخل ہو جائیے۔ "من کی دنیا" جناب رشید قریشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو "ادارۂ ادبیات اردو" کی طرف سے اسی ماہ خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے بالکل سچ کہا ہے کہ ع تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن ۔ قیمت مجلد (عه)

بہارِ خراماں

میری زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی لمحہ وہ تھا جب کہ میں نے تمھیں دیکھا۔ تم ہاں تم ایک "بہارِ خراماں" باغ میں روِش پر ٹہل رہی تھیں۔ مسحور کن فضا کی رنگینیوں میں تم گویا گم ہو کر رہ گئی تھیں تمھیں کیا خبر تھی کہ کوئی تمھیں دیکھ رہا ہے۔ تم ایک ٹوکری میں پھول چن رہی تھیں۔ اور جب تم گلاب توڑنے لگیں تو ایک کانٹا تمہاری پھول سی انگلی میں چبھ گیا تمہاری زبان سے بے اختیار "اف" کی آواز نکلی تم نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور سارے پھول پھینک دئیے۔ ہاں! اور تم دونوں ہاتھ سرہانے لے کر لہلہاتے ہوئے سبزے پر لیٹ گئیں اور کچھ گنگنانے لگیں ....!

کوئل برابر والے درخت پر سے کوکو کی صدا بلند کر رہی تھی تھوڑی دیر تک تم نے اس کا نغمہ سنا لیکن پھر خدا جانے تمہارے دل میں کیا خیال آیا تم نے ایک پتھر کھینچ مارا اور کوئل اڑ گئی.......!

حوض پر تم نے تھوڑی دیر خاموش اور ساکت پانی میں اپنے جمال کی تصویر دیکھی لیکن نہ جانے کیوں تم نے اس ساکت پانی کو ہلا دیا اور فاتحانہ انداز میں ہنستی ہوئی حوض کی سیڑھیاں اتر کر سبزے پر بے تحاشہ بھاگنے لگیں....

تمہاری ہر ادا میرے لئے تیر تھی۔ تمہاری ہر حرکت پر میں تڑپ اٹھتا تھا۔ تتلی کو پکڑنے میں جب تم ناکام رہیں تو تم نے اپنے ہاتھ کو کاٹا پیر جھٹکے تمہارا انداز اور بھولا پن دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر تم سے لپٹ جاؤں لیکن میں دل پر جبر کئے دور ہی سے کھڑا تمہارے حسنِ دلفریب کا نظارا کرتا رہا۔

ہوا کی معمولی سی تیزی پر تم اتنی پریشان ہو گئیں کہ دو منٹ بھی تم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور سیڑھیاں چڑھ کر مکان میں داخل ہو گئیں اور جاتے جاتے میرا سرمایۂ حیات ساتھ لیتی گئیں۔ میں حیران اور مبہوت بنا بالکل بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا خدا جانے کتنی دیر تک۔!! لیکن بادِ تند کے ایک جھونکے نے مجھے اپنی بے خبری سے چونکا دیا۔ ہاں۔ بادِ تند کے جھونکے نے جو تمہارے توڑے ہوئے پھول اڑائے لئے جا رہا تھا۔ میں بے اختیار دوڑا پھول جمع کئے اور ان کا ایک ہار بنایا اور آخر میں ایک بہت بڑا سرخ گلاب توڑا اور اس میں ایک کانٹا چبھو دیا گویا یہ تمہارے تیرِ نظر اور میرے خون شدہ دل کی تصویر تھی۔ میں نے اس گلاب کو بھی ہار میں ایسے مقام پر کہ جب تم ہار پہنو تو یہ تصویر تمہارے سامنے رہے، لگا دیا اور اس مقام پر رکھ دیا جہاں تم پہلے پہل بیٹھی تھیں اور پھر وہاں سے ہٹ گیا اور تمہارے انتظار میں اپنے مقام پر کھڑا ہو گیا

تم تھوڑی دیر بعد آئیں تم نے حیرت سے ہار کو دیکھا، اٹھایا جب تمہاری نظر اس گلاب پر پڑی تو تم نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا، اور پھر پھول پر نظر ڈالی کانٹا کھینچ پھینک دیا، ایک قہقہہ لگایا اور پھر تم نے وہ ہار گلے میں ڈال لیا۔

"عشق کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا ہدیہ بارگاہِ حسن میں قبول کر لیا جائے"

عباس عابدی

ہاسٹل

پجاری "معصوموں کی بستی" میں دوبارہ داخل ہوا، جہاں ایک نئی قسم کی فضا نظر آرہی تھی بعض نونہالوں کے متعلق اسے معلوم ہوا کہ وہ "فارغ التحصیل" ہو چکے ہیں اور اب اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گذارنے کے لئے تلاشِ روزگار کی فکر میں ہیں بعض لڑکے ماں باپ کی آنکھوں سے دور محض حصولِ علم کے شوق میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ اور ایک نئی دنیا میں زندگی گذارتے ہوئے کچھ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن یہہ لڑکے تھوڑی سی مدت کے بعد اِس ماحول میں ایک نیا لطف پائیں گے

پجاری نے ایک لڑکے کو دیکھا جو بالکل نئے آئے ہوے تھے۔ کسی قیدی ہرن کی طرح ماحول کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہوے قیامت خیز اداؤں سے وہ بےخبری میں ایک عالم کو گرویدہ کر رہے تھے۔ چال ڈھال، بات چیت ہر چیز سے بے نیازی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایک دن نہ معلوم وہ کس خیال میں اخبار بینی کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے ان کے مطالعہ میں کوئی خلل انداز نہیں ہوا۔ پجاری نے انھیں سلام کیا۔ آنکھوں کے اشارے سے انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کچھ پریشان سے ہو گئے۔ پجاری نے ان کو چائے نوشی کے لئے مدعو کیا۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے کہا "میں نہیں آتا، آپ جائیے نا" اسی لہجہ میں پجاری نے عرض کیا "چائے پینے میں کاہے کا تکلف ہے بھلا، چلئے نا" "جی میں نہیں آتا۔ آپ جائیے نا"۔ پجاری نے ان کی دل شکنی کے خیال سے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اس انکار پر اسے بے حد تعجب ہوا کہ "اس قدر شرمانے والے عملی زندگی میں کس طرح کامیاب ہو سکیں گے"۔

پجاری نے اچھے شاعر کی نسبت دریافت کیا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ پجاری کو یہہ سن کر بے حد افسوس ہوا کہ اس کا "اچھا شاعر" امتحان میں ناکام ہونے کی وجہہ سے دوبارہ اِس فردوسی بستی میں داخل نہ ہو سکا۔ پجاری نے امتحانی طریقہ پر قیاس آرائی کی کہ "قابلیت کے اصلی جوہر دو تین گھنٹوں کے لکھے ہوے چند کاغذوں میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتے۔ یہہ ہو سکتا ہے کہ ایک اوسط قابلیت کا لڑکا نصاب کی کتابوں اور پروفیسروں کی لکھائی ہوئی یادداشتوں کی مدد سے امتحانی سوالات بہت اچھے طریقہ سے حل کر دے۔ لیکن اس طرح اس کی بناوٹی قابلیت کا بھانڈا نہیں پھوٹ سکتا۔ وہ ایک پڑھائی ہوی چیز کو گراما فون کے ریکارڈ کی مانند محض دوہرا دیتا ہے"۔

اچھا شاعر، اصغر "ایک غلط لیکن ضروری اصول" کی بنا پر بےکیف زندگی گذارنے پر مجبور تھا۔ "معصوموں کی بستی" سے قطع تعلق اس کے لئے سائبیریا کو جلا وطن ہونے کے برابر تھا "معصوموں کی بستی" اس کے بغیر ویران نظر آتی تھی۔

پجاری نے ایک نئے لڑکے، لطیف سے ملاقات کی۔ یہہ اصغر کے سب سے زیادہ گہرے دوست تھے۔ ان کی دوستی نے اصغر کو ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ امتحان کی ناکامی کے باعث اصغر اب اپنے اکیلے دوست سے بھی جدا ہونے کے لئے مجبور تھا۔ گھر کی چار دیواری کے اندر اصغر کی زندگی اس شعر کی تفسیر تھی۔

گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں   انھیں کی یاد میری زندگی ہے

ایک مرتبہ سرِ شام اپنے چند طاقاتیوں کے ہمراہ "معصوموں کی بستی" کا نیا رنگ ڈھنگ دیکھنے چلے آئے۔ نئے لڑکوں سے ملنے جلنے میں اصغر کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ لطیف سے اطمینان کے ساتھ مل سکتے۔ گھر واپس ہوتے ہوئے انھوں نے لطیف کو خداحافظ کہنا چاہا۔ اصغر کا یہہ بیگانہ پن لطیف کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اصغر اس کا سب کچھ تھا۔ اصغر کے بغیر اسے کسی چیز میں دلچسپی نہ تھی محبت کی توہین وہ کسی صورت گوارا نہ کرسکا۔ اس نے غم و غصہ سے مخبوط الحواس ہوکر اصغر کو گالیاں دی۔ طرح طرح سے اسے ذلیل کیا اصغر نے صفائی کی کوشش کی عدیم الفرصت ہونے کا عذر پیش کیا لیکن لطیف نے اس کی کسی بات کا خیال نہ کیا۔ وہ سمجھتے رہے کہ اصغر نے ان کو قصداً ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

ہم چشموں میں اس طرح ذلیل ہونے کے بعد اصغر بادلِ ناخواستہ اپنے گھر واپس ہوا۔ پجاری نے اصغر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

اصغر کے جانے کے بعد لطیف نے محسوس کیا کہ اس نے ناحق اپنے معصوم دوست کو بری طرح تکلیف پہنچائی۔ انھوں نے روحانی تکلیف اور ذہنی اذیت کے زیر اثر مسلسل دو گھنٹے تک نہ تھمنے والے آنسو بہائے۔ وہ حقیقی معنوں میں شرمندہ تھے۔ دوسرے دن پجاری نے دیکھا اصغر اور لطیف کی آپس میں صفائی ہوگئی ہے۔ دونوں کے دلوں میں رات کی ناچاقی کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ آس پاس کے لڑکے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے گویا اتنی شدید لڑائی کے بعد ان کو ایک دوسرے سے اس قدر جلد نہ ملنا چاہئے تھا۔ پجاری کا خیال اِن لڑکوں سے مختلف تھا۔ اسے دو روٹھے ہوئے دلوں کو ملتے دیکھ کر حقیقی مسرت حاصل ہورہی تھی پجاری نے دیکھا اس کے "مقدس دیوتا" اِس ملاپ پر مسکرا رہے ہیں۔ دیوتا کی جنت کی خوبصورت پریاں اُن پر پھول برسا رہی ہیں گویا وہ اس قدر جمیل غصہ اور اس کے بعد اتنے دلچسپ ملاپ سے بے حد متاثر ہیں۔

پجاری نے "معصوموں کی بستی" میں رہتے ہوئے یہاں کے نونہالوں کے عادات و خصائل کا بغور مشاہدہ کیا۔ شروع سال کے ابتدائی تین مہینوں تک یہہ لڑکے نصاب کی کتابوں کی طرف کم متوجہ ہوتے۔ ان کا زیادہ وقت کھیل کود اور گپ شپ میں بسر ہوتا۔ امتحان سے دو ماہ پیشتر یہہ لڑکے کتابوں کے ڈھیر میں گم ہوجاتے۔ انتہائی انہماک کا یہہ زمانہ بھی بے حد دلچسپ ہوتا۔ آپس میں گپ شپ کرنے کی بجائے یہہ لڑکے مختلف علمی مباحث پر گفتگو کرتے۔ ہر لڑکا اپنی معلومات سے دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا۔

امتحان کو صرف پندرہ دن باقی تھے۔ رات کے سات بجے ہی سے تمام لڑکے پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ پجاری بھی ایک کمرے میں بیٹھا "اختر کی ڈائری"[1] کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گیارہ بجنے کے بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص ستار بجا رہا ہے اور دھیمی آواز میں گاتے ہوئے موسیقی کا ساحرانہ اثر دکھانا چاہتا ہے۔ پجاری کی طرح تمام لڑکے بھی اس دلچسپ خلل اندازی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کتابوں سے دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش میں ناکام ہوکر وہ کمروں سے باہر نکل آئے۔ پجاری نے دیکھا ایک لڑکا تانبے کے لوٹے پر

---

[1] مسٹر اشفاق حسین ایم اے (عثمانیہ) کا ادبی شہ کار۔ جو مجلہ عثمانیہ کی کسی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔

انگلیوں سے ستار کی آواز پیدا کر رہا ہے۔ وہ گا رہا تھا:-

جاؤ بہت باتیں نہ بناؤ ۔ جاؤ تمھیں پہچان گئی ۔ ہاں! جاؤ، تمھیں پہچان گئی

ان مختصر سے لفظوں میں اس لڑکے نے کتنی موسیقی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ بہت سے لڑکے اس کے ساتھ گانے میں شریک ہو گئے۔ باقی افراد اپنی وجدانی کیفیت مختلف طریقوں سے ظاہر کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ "موسیقی کا دیوتا" گا رہا ہے اور دنیا اس کے نغمہ میں کھوئی ہوئی ہے۔ سارا ماحول شعریت میں ڈوب گیا تھا۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں سفید چاندنی کا فرش ان کو باہر نکلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ گاتے، بجاتے، جھومتے اور رقص کرتے سب کے سب "موسیقی کے دیوتا" کے ساتھ باہر نکل آئے پجاری بھی ان دلچسپیوں میں شریک ہو گیا۔ دنیا میں اتنی پر لطف رات کبھی اس نے بسر نہ کی تھی۔ "موسیقی کے دیوتا" کی خدمت میں پجاری نے عقیدت کے انمول پھول پیش کئے اور کہا "تم جیسا شوخ طبع اور رنگین مزاج لڑکا اپنی ذات سے ایک انجمن ہے جہاں بیٹھ جاؤ گے محفل کو رنگین بنا دوگے":

بارش کا موسم کتنا خوش گوار ہوتا ہے۔ سرد ہوائیں ہلکی ہلکی پھوار کس قدر فرحت بخش ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ فطرت کے پرستار ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن شہر میں رہنے والے بے وقت کی بارش سے اکثر شاکی نظر آتے ہیں۔ موسلا دھار پانی، راستوں کا کیچڑ ان کے کاروبار میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بارش سے خوش نہیں ہوتے لیکن "معصوموں کی بستی" کے نونہال اس پریشان کن موسم میں بھی اپنے لئے خاصی دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔

موسلا دھار بارش کے وقت کمروں میں گرم گرم چاء تیار ہوتی ہے چاء نہ پینے والے بھی اس "آب حیات" سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ چاء اڑانے اور کچھ دیر آپس میں گپ شپ کرنے کے بعد ان کو پانی سے کھیلنے کی سوجھتی ہے۔ اس کھیل کی ابتدا اس طور پر ہوتی کہ ایک لڑکا اپنے کسی دوست کو کیچڑ اور پانی میں زبردستی نہلا دیتا۔ وہ دوست اپنے ساتھی کے غسل صحت کی تجویز کرتے۔ یہ عمل اس تیزی سے جاری رہتا کہ اس دن "معصوموں کی بستی" کے تمام افراد بند دیواروں کی بجائے کھلے میدان میں کپڑوں سمیت نہا لیتے جو بزرگ کسی قدر متین بن کر کمرہ میں روپوش ہو جانا چاہتے تو پھر ان کی خیر نہیں ہوتی۔ لڑکے ان کا کمرہ بند رہنے کی رکاوٹ کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ کھڑکی، روشن دان ہر طرف سے ان کے کمرے میں کیچڑ اور پانی کی موسلا دھار بارش ہونے لگتی۔ پجاری نے دیکھا ایک صاحب جو کچھ نہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے تھے، کمرے میں قلعہ بند ہو گئے۔ ان کو سمجھایا گیا کہ وہ ہتیار ڈال دیں۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ حسب معمول بہت تیزی سے کیچڑ اور پانی کی ان کے قلعہ پر گولہ باری ہونے لگی۔ تنگ آکر انھوں نے کمرے کا پھاٹک کھول دیا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے مچھردان باندھنے کا ڈنڈا دو چار بار ہوا میں اس طرح گھمایا گویا وہ مقابلہ پر آمادہ ہیں۔ لڑکے ان کو کیا مانتے ان کا ڈنڈا تو ایک طرف رہا۔ ڈنڈے کی زد سے باہر رہ کر لڑکوں نے جوان کو سنگ بار کرنا شروع کیا تو بے چارے ڈنڈا چھوڑ کر آنکھوں کی حفاظت کرنے لگے۔ ڈنڈا چھن جانے سے وہ بے بس ہو گئے۔ اس کے بعد لڑکوں نے ان کے ساتھ جو روادارانہ سلوک کیا۔ اس کا

بخوبی اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے بچپن کی شرارتوں پر سنجیدگی، متانت اور بزرگانہ تقدس کا پردہ ڈھانکنے والے ہر لڑکے کے ساتھ یہی طریق عمل اختیار کیا جاتا۔

پجاری نے چند ایسے لڑکوں کو بھی دیکھا جو اس ہنگامے میں حصہ لیتے ہوے شرماتے تھے۔ لیکن وہ بھی اچھی طرح سے بھگا کر چھوڑے گئے۔ اتنی رعایت البتہ ان کے ساتھ کی گئی کہ کیچڑ ملائے بغیر صرف پانی سے ان کو نہلایا گیا۔ لیکن یہہ عمل بھی ان شعلہ بدن افراد کے لئے بہت زیادہ تھا۔ پانی میں بھیگنے کے بعد کپڑے ان کے جسم سے پیوست ہوگئے تھے اور وہ اپنی نیم عریانی سے کوہ طور کا ایک نیا منظر پیش کرتے ہوے پریشان تھے۔ اس پریشانی میں کتنی شعریت تھی اسے پجاری کے علاوہ بہت سی رنگین طبیعتوں نے بھی یقینی طور پر محسوس کیا ہوگا۔

امتحان ختم ہو جانے کے بعد تمام لڑکے چھٹیوں میں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں سوسائٹی، دوستی اور محبت دنیا کی یہہ تین سب سے بڑی نعمتیں ان کو اپنی فردوسی بستی کے اندر میسر رہتی ہیں۔ یہاں سے جدائی کا خیال ان کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے دل کو اس طرح سمجھا لیتے ہیں کہ یہہ مفارقت عارضی ہے تھوڑے ہی دنوں میں ہم یہاں واپس آجائیں گے۔

پجاری نے "موسیقی کے دیوتا" کو دیکھا جس کا "معصوموں کی بستی" میں قیام کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اب وہ مجبور تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس جنت ارضی کو خیرباد کہہ دے۔ آٹھ سال اس نے یہاں گذارے تھے حسرت اور شادمانی کے آٹھ سال کتنی جلدی ختم ہوگئے۔ اب اس کی زندگی مسلسل کاوشوں اور تلاش روزگار کی تھکا دینی والی جدوجہد میں بسر ہوگی۔

اس ہونہار سپوت کو کبھی کسی نے رنجیدہ نہ دیکھا تبسم اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے پاس مسرت اور قہقہوں کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے جسے وہ مستقبل سے لاپروا ہوکر دوستوں کے ساتھ لٹا دینے پر تلا ہوا ہے۔ اب وہ کتنا مغموم تھا۔ پجاری نے کہنے کو اسے تسلی تو دی لیکن اس کی جدائی پر وہ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔

پجاری نے اس عرصہ میں کئی مقامات دیکھ ڈالے تھے لیکن "معصوموں کی بستی" سے پجاری کو اتنی دلبستگی ہوگئی تھی کہ وہ تقریباً یہاں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ معصوم لڑکوں کے ساتھ زندگی گذارتے ہوے وہ اپنے دیوتا اور وطن سے بے خبر تھا۔ پجاری نے دنیا میں اب تک کسی کو مصیبت زدہ یا پریشان حال نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب تمام لڑکے کھانے سے فارغ ہوکر اپنے کمروں کو واپس ہو رہے تھے۔ پجاری نے دیکھا طعام خانے سے باہر دسترخوان صاف کئے جا رہے ہیں اور دسترخوان کی چند چبائی ہوئی ہڈیوں اور جلی ہوئی روٹی کے چند ٹکڑوں پر قبضہ پانے کے لئے آس پاس کے کتے جھپٹنے لگے۔ ان بے زبان جانوروں کے ساتھ انسانوں کے چند بچے بھی دوڑے دوڑے چلے آئے۔ دھوپ کی تمازت نے ان کے سارے جسم کو کوئلہ کی طرح سیاہ کر دیا۔ پیٹ بھر کھانا ملنے سے

ان کے چہرہ پر انتہائی مایوسی ٹپک رہی تھی ۔ پجاری کو وہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آئے جن پر گویا کھال چڑھا دی گئی ۔ دسترخوان کے الوانِ نعمت حاصل کرنے کے لئے ان معصوم بچوں کی کتوں سے لڑائی ہونے لگی ۔ کتوں پر فتح یاب ہونے کے بعد مال غنیمت میں چند جھوٹے نوالے ہاتھ آئے ۔ ان کو پاکر یہہ لڑکے کتنے خوش تھے ۔ کتنا دردناک نظارہ اور انسانیت کی کتنی المناک توہین پجاری کے آنسو نکل آئے ۔ اس نے آخر اپنے دل کو اس طرح تسلی دی فطرت کے اٹل توانین کے سامنے انسان کا کچھ بس نہیں چل سکتا ۔ ان بچوں کے ذریعے قدرت ' دنیا والوں کو قناعت اور شکر گذاری کا درس دینا چاہتی ہے "

پجاری نے کئی سال ان معصوم لڑکوں کے ساتھ گذارے ۔ اب اس کے مقدس دیوتا نے اسے واپس بلایا تھا "معصوموں کی بستی" سے روانہ ہوتے وقت وہ کتنا ملول نظر آرہا تھا ۔ جاتے ہوے اس نے تمام لڑکوں کو دعا دی اور کہا ۔ "میں یہاں سے چلا تو جارہا ہوں لیکن مجھے" ع جنت میں بھی یاد آئیں گے یہہ چند مہینے ۔

پجاری

تم کو معلوم نہیں ؟

رات کو چرخ پہ دیکھا ہے ستاروں کا سماں ؟
ان میں دیکھی ہے تڑپ ؟
یہہ مرے قلب کی دھڑکن ہے ۔ مرا سوز نہاں
ان کی دنیا میں چھپا !
تم کو معلوم نہیں !

تم نے دیکھی ہے کبھی ساغر رنگیں میں شراب ؟
اس میں دیکھی ہے جھلک ؟
یا گلستاں میں کبھی دیکھا ہے رنگین گلاب ؟
خون ہے دل کا مرے !
تم کو معلوم نہیں !

مضطرب موجوں کا دریا میں وہ پرجوش خرام
تم نے دیکھا ہے کبھی ؟
لب ساحل سے ہر اک موج کا وہ رقص دوام
مرے جذبات ہیں وہ !
تم کو معلوم نہیں !

تم نے دیکھا ہے ہواؤں کا کبھی رقص و سرود ؟
ان کی آواز سنی ؟
میرے جذبات سے معمور ہے بس ان کا وجود
ان کا ہنگامہ تمام !
تم کو معلوم نہیں !

دیکھتے ہو کبھی آئینے میں آنکھوں کا خمار ؟
ایک پوشیدہ سرور ؟
ان میں مضمر ہے مری بس مری الفت کی بہار
میری الفت کا ظہور !
تم کو معلوم نہیں !

سعادت علی

تاثرات سفر یورپ بمبئی سے بندر سعید تک

حکومت آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی مہربانی سے مجھے ٹھیک چوبیس سال بعد یورپ جانے کا موقع ملا۔ سیکڑوں ہندوستانی یورپ کو جاتے ہیں۔ بعض طالب علمانہ حیثیت سے، بعض تفریح طبع کے واسطے، اور یہ تعداد اب روز افزوں ہے۔ اسی لئے یہ سفر اس قدر عام ہوگیا ہے کہ اب اس کے حالات لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ گو میں ہندوستان کو صرف چار ماہ باہر رہا لیکن اس دوران میں بعض ایسے گوناگون مشاہدے ہوئے کہ انھیں مختصراً بیان کردینا ممکن ہے کہ دوسروں کے باعث دلچسپی ہو۔ جہاز کے سفر کے حالات سے اکثر لوگ واقف ہوں گے۔ لیکن تقریباً نصف صدی میں اس سفر میں جو فرق نظر آیا وہ اس قدر بدیہی تھا کہ اس کا تھوڑا بہت ذکر مناسب ہے۔

ہمارا جہاز اطالوی لائن کا کونتے بیانکا مانو (”ایر سپیڈ وسٹ“) نامی تھا اور تقریباً ۱۸ ہزار ٹن وزنی تھا۔ پچیس سال پہلے یورپ اور ہندوستان کے درمیان آنے جانے والا جہاز اس وزن کا تو کیا اس سے آدھے وزن کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ جہاز کیا تھا کسی محل یا کم از کم کسی عظیم الشان ہوٹل کے مانند تھا اور نیچے سے اوپر تک سات منزلیں تھیں۔ اطالوی جہازوں کا کھانا انگریزی جہازوں سے بہت بہتر ہوتا ہے، چنانچہ دوپہر اور رات کے کھانے میں کم از کم ۲۰، ۲۵ مختلف قسم کی اشیاء ہوتی تھیں، اور بعض مرتبہ یہ طے کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کونسی چیز لی جائے اور کونسی چھوڑی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک جہاز میں رہے ”مرزا سرگزشت“ بہت ہی یاد آئے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے طبی ”معائنہ“ ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ صبح کو جاتے وقت اس معائنے میں کیا کیا دقتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں، اور بمبئی کے معائنہ سے چھٹکارا ہوا تھا تو کامران میں معائنے اور قرنطینے کی صعوبتیں اٹھانی پڑی تھیں، اور کہاں اس ”معائنے“ میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہوگا کہ جہاز پر سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔ جہاز میں بیٹھتے ہی انسان گویا اپنے آپ کو یورپ میں محسوس کرنے لگتا ہے اور یوروپی تمدن میں جو بھی اچھی یا بری باتیں ہیں وہ سب سامنے آجاتی ہیں۔ جہاز کے لنگر اٹھاتے ہی جو فرق مجھے جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد کے تمدن میں نظر آیا وہ مسافروں کی عریانی تھی۔ جہاز میں اوپر والے عرشے پر جو شناور گاہ تھی، ہر وقت اس کے چاروں طرف عورتوں، مردوں، بچوں، بچیوں کا جمگھٹ رہتا تھا، اور بہت سی عورتیں محض ایک چولی اور جانگیا پہنے، پیٹ اور پیٹھ کھلی ہوئی، کرسیوں پر بیٹھی، کچھ بچھا کر تختہ پر لیٹی، مرد ننگ دھڑنگ محض ایک تنگ جانگیا پہنے چہل کرتے نظر آتے تھے۔ اس ”دو جزی“ اور یک جزی ست“ اور عریانی میں محض درجہ کا فرق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یوروپی تمدن کی حیرت انگیز دورخی ان کی روزآنہ زندگی سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف عیش وعشرت کو انھوں نے روزمرہ کا گویا معمول بنا لیا ہے، دوسری طرف مرد عورت اور بچہ ہر طرح کی مشکلات برداشت کرنے کا عادی بن رہا ہے تاکہ ملک پر وقت پڑے، یا خود اپنی عزت اور ناموس کا سوال پیدا ہو تو سب آرام و آسائش، عیش وعشرت کو بھول جائے اور واقعاً تن، من، دھن اپنی ذات کے یا ملت کے ناموس کے لئے قربان کردے۔

جہاز کے ان انتظامات میں جو حکمیاتی اکتشافات کی بدولت ہوتے تھے، روزآنہ اخبار کا اجرا بھی ہے۔ لاسلکی کے ذریعے تقریباً ہر وقت خبریں آتی رہتی تھیں، جنھیں باضابطہ اخبار کی شکل میں طبع کرکے چار پانچ تقسیم کردیا جاتا تھا۔ اور ایسا انتظام تھا کہ



پروفسر ہارون خان صاحب شروانی
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

دنیا میں جو واقعات کسی روز پیش آتے ہیں، اسی روز اخبار میں چھپ جاتے اور مسافروں کو معلوم ہو جاتا کہ دنیا میں آج کیا کیا ہو رہا ہے۔ یہ جہاز کے اخبار کا حال ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کے کتنے مستقل اخبارات ہیں جن میں دنیا کے واقعات ہر روز چھپتے ہوں۔ جہاز کے مختلف حصوں میں بھونپو ("آلہ مکبر الصوت") لگا ہوا ہے جس میں اٹلی کی نشر گاہوں کے نشریات براہ راست آتے رہتے ہیں۔

۵ر جون کو شام کے چار بجے سب سے اوپر کے عرشے پر بینڈ بجا اور اطالوی جھنڈے کو سلامی دی گئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ۱۸۴۸ء میں کارلو البرٹو شاہ ساردانیہ نے جو دستور اپنی رعایا کو دیا تھا۔ اس کی سالگرہ ہے۔ یہ سلطنت ساردانیہ بڑھتے بڑھتے ۱۸۶۱ء میں ملوکیت اطالیہ بن گئی اور سردانی دستور مسولینی کے برسرِ اقتدار ہونے تک جوں کا توں ہی رہا۔ لیکن فاشی جماعت برسرِ اقتدار ہونے کے بعد دستور کی صورت ایسی مسخ ہوگئی ہے کہ گویا ۱۸۴۸ء کی دستاویز کا پتہ نشان بھی نہیں رہا۔ تاہم ہر سال جون کے پہلے ہفتے کو تمام اٹلی میں خوشیاں منائی جاتیں اور جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے، اور ہمارے جہاز میں بھی اسی سنت پر عمل ہوا۔

۶ر جون کو عرب کی پہاڑیاں نظر آنی شروع ہوگئیں اور ۱۱ بجے کے قریب جہاز عدن پر ہو کر گزرا۔ جہاز عدن پر رکا نہیں بلکہ اس انگریزی مقبوضے سے کتراتا ہوا نکل گیا۔ عدن سے دو گھنٹے کے بعد یمن کی پہاڑیاں نظر آنی شروع ہوگئیں جن پر اس وقت اٹلی کا دانت ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ یہ عرب، جہاں کے باشندوں نے سیکڑوں، ہزاروں میل جا کر اپنی نوآبادیاں اور مقبوضات قائم کئے، اب ایسا بے دست و پا ہوگیا ہے کہ جیسے نعوذ باللہ کسی مردہ جانور کا بے جان لاشہ پڑا ہو اور چاروں طرف سے اس کا گوشت کھانے کے لئے گدھ اور چیلیں ٹوٹ پڑی ہوں۔ ہم ہندوستانی وقت بے وقت ابن سعود اور دنیا بھر کے مسلمان فرمانرواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ان کو کن کن بھیڑیوں سے واسطہ پڑتا ہے اور کس کس طرح وہ دھمکیوں، تدبیروں، خوشامدوں، لڑائیوں اور سب سے زیادہ خدا کی مہربانیوں سے اپنے ملکوں کی کہیں پوری، کہیں ادھوری آزادی محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں! باب المندب کو عبور کر کے شام کے وقت جہاز عصاب کے بندرگاہ پر ٹھیرا۔ عصاب اطالوی اریتریا کا بندرگاہ ہے اور یہاں سے حبشہ کے مستقر، سابق شہنشاہ حبشہ کے پایۂ تخت عدیس ابابا کو براہ راست سڑک جاتی ہے۔ ہمارا جہاز اس لئے رکا تھا کہ اطالوی گورنر جنرل حبشہ، ڈیوک آوستا، جو شاہ اٹلی کے چچا زاد بھائی ہیں۔ ہمارے جہاز پر سوار ہو جائیں۔

۷ر جون کو جہاز مصوع پہونچا جو اطالوی اریتریا کا مستقر ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ حبشہ کے دوران میں حبشیوں کا خون چوسنے کے لئے اطالوی سامان جنگ، طیارے اور موٹریں جمع ہوئی تھیں۔ جہاز پر سے تو ہم میں سے کسی کو نہیں اترنے دیا گیا، لیکن عرشے ہی پر سے ایک دل فگار نظارہ سامنے آیا وہ، وہ یہ کہ تقریباً سوا سو صومالی مسلمان تالیاں بجاتے، ناچتے، غل مچاتے جہاز کے سامنے آئے اور اس طرح ڈیوک آوستا کو گویا سواگت کیا۔ اس غول کا سالار ایک اطالوی تھا۔ اور یہ بچارے صومالی اس کے اشارے پر سرکس کے جانوروں کی طرح ناچ رہے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سب چوچلے بالکل مصنوعی ہے اور یہ بچارے غریب صومالی اپنے پیٹ سے مجبور ہو کر سلامی دے رہے ہیں اور اپنا تماشا دکھا رہے ہیں۔ اس شہر میں پہلی مرتبہ فاشی نشان (تبر اور تیر بندھے ہوئے) دیکھا جو جگہ جگہ منقوش تھا، اور ہر موٹر پر اطالوی سہ رنگی

علم آور میں تہنیت بیانی ہے جہاز کے سب اطالوی ایک دوسرے کو بلکہ ہمیں بھی ایک خاص انداز سے ہاتھ آگے کو اونچا کرکے مخصوص فاشی طریقے سے سلام کرنے لگے۔

دوسرے دن صبح ہی سے خشکی جہاز کے دونوں طرف نظر آنا شروع ہوگئی، ایک طرف ساحل عرب (ایشیا ر) اور دوسری جانب ساحل مصر (افریقہ) اور ساڑھے پانچ بجے ہم سوئیس پہونچ گئے۔ .... یہ شہر رات کے وقت ایک خوبصورت ہار کے مانند معلوم ہوتا ہے جس میں بجلی کے سیکڑوں ننھے ہیروں کے مانند جگمگا رہے ہوں۔ سبز ہلال تین تارے والے مصری علم اڑای ہوی کشتیاں جن میں سے کسی پر (POLICE) اور کسی پر (DOCTOR) لکھا تھا جہاز کے قریب آئیں اور معائنہ کرکے چلی گئیں۔ مصری اشیاء بیچنے والے بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی چیزیں بیچنے کے لئے آئے۔ ہمارا جہاز نہایت اونچا اور بڑا تھا، اوپر تک اشیاء کا پہونچنا محال تھا، اس لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ ایک لمبی رسی لے کر اس کا ایک کنارہ اوپر پھینک دیا، دوسرے کنارے میں ٹوکری باندھی اور اس کے ذریعے سے اشیاء اوپر اور دام نیچے آنے جانے لگے۔ ساڑھے سات بجے شام جہاز نہر سوئیس میں داخل ہوا، جو دنیا کی عظیم ترین شاہراہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جگہ جگہ گودیاں بنی ہیں کہ دوسرا جہاز آئے تو ایک گودی میں چلا جائے۔ مصری طرف کنارے کنارے ریل جاتی ہے۔ القنطرہ پر (جس کے معنی ہی پل کے ہیں) ایک پل ہے اور یہاں سے ریل فلسطین، استنبول اور یورپ جاتی ہے۔ یہ پل جہازوں کے لئے اٹھا دیا جاتا ہے۔

بندر سعید ایک نہایت خوش منظر اور پر فضا شہر ہے۔ اس کا سنگ بنیاد مؤسس نہر سوئیس یعنی فرڈیننڈ ڈی لیسپس کے ہاتھوں ۱۸۵۹ء میں رکھا گیا تھا اور اب اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ شہر بہت ہی پردیسی ہے اور دنیا کا کوئی حصہ مشکل سے ایسا ہوگا جس کے باشندے اس میں نظر نہ آتے ہوں، چنانچہ ہمارے ہندو بھائیوں کی بھی دو تین دوکانیں ہیں، جنھیں خود یہاں کے باشندے "کفار" کہتے ہیں۔ جہاز والوں نے مسافروں کو پورٹ سعید کی سیر کرانے کا بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ یعنی ہر پندرہ منٹ پر ایک دخانی کشتی مسافروں کو لے کر کنارے جاتی اور اسی عرصے میں واپس آتی تھی۔

پورٹ سعید کے لوگ عام طور پر بڑے چالاک اور فطرتی۔ اور دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ اصل میں یہاں کی آبادی میں اصل مصری عنصر بہت کم ہے۔ بلکہ یونانیوں، اطالویوں وغیرہ نے یہاں کی زندگی کو گندا کر رکھا ہے۔ چیزیں بیچنے والے ایک ایک کے چھ چھ مانگتے اور ایک ایک میں دیتے ہیں اور یہ کیفیت اچھی بڑی دوکانوں میں بھی ہے۔ چنانچہ خریدار نہایت آسانی سے لٹ سکتا ہے۔ چمڑے پر نہایت خوبصورت کام ہوتا ہے اور چرمی اشیاء حیرت انگیز طور پر کم قیمت میں مل جاتی ہیں۔ جہاز نے تقریباً ۹ بجے شام کے پورٹ سعید اور مشرق کو خیرباد کہا اور بحیرۂ روم میں داخل ہوگیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۱ جون کو شام کے وقت جزیرۂ کریٹ نظر آنے لگا۔ جس پر ۱۹۱۳ء تک ترکوں کا قبضہ تھا اور باوجودیکہ اس سنہ میں ترکوں نے یونانیوں کو ہر جگہ جنگ میں نیچا دکھایا لیکن یہ جزیرہ دراصل پہلے جبراً ترکوں سے چھین لیا، اور جنگ عظیم کے بعد اس پر کلیۃً یونان کا قبضہ ہوگیا۔ (باقی آئندہ)

ہارون خاں شیروانی

افلاطون

یونان کے سب سے زبردست فلسفی سقراط کا نام آج صرف دو وجوہ سے زندہ ہے ایک اس کے محاسن اخلاق کی وجہ سے اور دوسرے اس کی سحر بیانی سے جس کی بدولت اس نے اپنے زمانے کے مدبرین و مفکرین کو موہ لیا تھا، برخلاف اس کے مصلح اعظم افلاطون کا نام صرف اس کی تصانیف کی وجہ سے باقی ہے اور انہیں تصانیف کی وجہ سے اس کے استاد سقراط کو حیات جاوید نصیب ہوئی لیکن جہاں افلاطون نے اپنی تحریرات میں سقراط کی عظیم تر شخصیت کے بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہیں اس نے خود اپنی ہستی کو بہت پس پشت ڈال دیا ہے۔

افلاطون کی زندگی

افلاطون ایک نہایت امیر گھرانے کا لڑکا تھا اس کا تعلق ماں اور باپ دونوں کی جانب سے "تو ددوکس" سے جا ملتا تھا یہی وجہ تھی کہ جہاں اور امیروں اور اعلیٰ خاندانوں کے لڑکے سقراط کے پاس فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی علمی استعداد کو بڑھانے آتے تھے وہیں افلاطون بھی جا پہونچتا لیکن اس کا مقصد اوروں سے بالکل جداگانہ تھا۔ وہ سقراط کے علمی مباحث کو نہایت غور سے سنتا رہتا تھا اس کو سقراط سے ایک روحانی لگاؤ تھا اور وہ اپنے استاد کا بے حد شیدا تھا۔

سقراط کی موت نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا اس وقت اس کی عمر ۲۵ اور ۳۰ سال کے درمیان تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ سقراط کی موت کے المناک سانحہ کے بعد ہی افلاطون نے ایتھنز کو خیرباد کہا۔ اپنی زندگی کے اس نے جو اصول بنائے تھے ان میں یک لخت تبدیلی ہوگئی حتیٰ کہ اس نے اپنے نام و نمود کو خیرباد کہا۔

ابتداءً اسے اپنی امارت اور جاہ و ثروت کا احساس تھا لیکن اپنے عزیز استاد کی موت نے اس کے دل میں ایک نئی خلش کو ابھارا اور اسے یہ دھن لگ گئی کہ کسی نہ کسی طرح ان علمی مباحث کے مختلف پہلوؤں کو ضبط تحریر میں لائے جن کو سقراط نے دنیا کے آگے تخیلی صورت میں پیش کیا تھا۔ اپنی پیش نظر چیز کو اس نے باقاعدہ رسائل کی صورت میں تصنیف نہیں کیا بلکہ اسے علماء کے مکالموں کی شکل میں پیش کیا ہے جن کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

مکالمے سقراط اور اسی عہد کی مشہور شخصیتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان مکالموں میں متعدد مشاہیر کے نام ہمیں نظر آتے ہیں جو افلاطون کے زمانے میں ایتھنز میں موجود تھے۔ ان میں افلاطون نے خود اپنے نام کو صرف تین مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ بھی اشارۃً و کنایۃً

ان مباحث میں سب سے زیادہ مشہور بحث "جمہوریت" کی ہے جس میں افلاطون کے دو بھائی گلاکن اور اڈیمانٹس سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اس کے مکالموں میں سب سے زیادہ اہمیت بھی اسی مکالمے کو حاصل ہے۔

افلاطون کے مکالموں کا مطالعہ کرنا گویا فلسفہ اور ادب کا درس حاصل کرنا ہے کیونکہ یہ مکالمے مفکرانہ و مدبرانہ دلائل سے بھرے پڑے ہیں اور لحاظ زبان یونانی ادب میں یہ چوٹی کے مخطوطات میں شمار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ میں زبان کی بہت سی خوبیاں

زائل ہوجاتی ہیں باوجود اس کے خیلے کے ترجمے "جشن" اور جوویٹ کے ترجمے "جمہوریت" میں بے شمار ادبی خوبیاں پائی جاتی ہیں فائز مطالعہ کرنے والوں کے لئے ان مکالموں سے صرف ایک منتخب مکالمہ افلاطون کی دماغی قابلیت اور ادبی مہارت کے ظاہر کرنے کو بہت کافی ہے اس کے علاوہ اس کے نقطۂ نگاہ سے سقراط کی عظیم ترین شخصیت کا انکشاف ہوتا ہے۔

مکالمے مکالموں کی کل تعداد پینتیس ۳۵ ہے جن سے چوبیس ۲۴ کے متعلق علما کی متفقہ رائے ہے کہ ان کو افلاطون ہی نے تصنیف کئے ہیں باقی کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ ان کا مصنف افلاطون ہے لیکن بعض نقاد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔ سب سے آسان مکالمہ "معذرت" ہے موجودہ حالت میں یہ مکالمہ نہیں کہلایا جاسکتا بلکہ سقراط کی ان دلچسپ تقاریر کا مجموعہ ہے جو اس نے ایتھنز کے ججوں کے سامنے کی تھیں۔

"کریٹو" "گارجیاس" اور "جمہوریت" کی ابتدائی چار جلدوں کا شمار اس کی آسان تحریرات میں ہوسکتا ہے۔ افلاطون کا مطالعہ کرنا آسان کام نہیں اس کے بعض مخطوطات مثلاً "پرمینائڈس" "صوفی" "سیاس" "فائلیبس" اور "جمہوریت" کے کچھ حصص کے مطالعہ کے لئے خاص دلچسپی اعلیٰ مذاق اور بے حد توجہ کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے وہ مکالمے جن میں ادبیت اور ٹھوس علمیت کی طرف کم توجہ کی گئی ہے افلاطون کے مطالعہ کے مبتدیوں کے لئے مفید ہیں اور کسی قدر دلچسپ بھی لیکن بعض مواقع پر افلاطون جیسا عظیم شخص بھی اپنے جزیرے اٹلانٹس کی محبت کے اظہار میں ان قدیم اور ناقابل یقین عقائد کے اظہار سے باز نہیں رہتا جن سے یونان کا سارا مایۂ ناز ادب بھرا پڑا ہے۔

سید ابوالفضل العباس

شاعر کی کائنات

میں بحرِ شاعری کی منتہی گہرائیوں میں تھا
تخیل کا ٹھکانا عرش کی بالائیوں میں تھا

مجسم شاعری تھا میں فنا فی الشاعری ہوکر
کمائی تھی حیاتِ نو حیات اولیں کھو کر

میں کامل تھا نہ تھی اب مجھ میں باقی کوئی معذوری
مری تخلیق کی تام خدا غایت ہوی پوری

کسی دن بارگہ میں اس نے مجھ کو یاد فرمایا
سر تسلیم خم میرا بصد عجز و نیاز آیا!

دفاتر شاعری کے پیش کر کے عرض کی میں نے
الٰہی کر دیا تکمیل فرضِ منصبی میں نے

خدا نے کن نکالا ہر شعر پر کہتا گیا "ہوجا"
ہوی پھر کائناتِ شاعری اک آن میں پیدا

جو جیتی جاگتی ہیں پردۂ قدرت پہ تصویریں
ہیں میرے خوابہائے شاعری کی نیک تعبیریں

دامودر پنت ذکی
(کوہیر)

روٹی کی محنت

دنیا میں بے روزگاری کی وبا سُرعت سے پھیلی جارہی ہے۔ بے روزگاروں میں اَن پڑھوں سے زیادہ تعلیم یافتہ پائے جاتے ہیں۔ حکومتیں مختلف تدبیریں سوچ رہی ہیں کہ خطرہ سے دوچار ہونے سے پہلے خطرہ کا ازالہ ہوجائے۔ یوں تو تمام ممالک میں بے روزگاری کے اسباب یکساں ہیں لیکن ہمارے ملک ہندوستان کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ یہاں گھٹیا اور بڑھیا پیشوں کی تفریق نے ایسا ستم ڈھایا کہ پڑھا لکھا فرقہ مفلوج ہوکر رہ گیا۔ بیکار دماغ شیطان کی جولانگاہ ہے۔ بغیر محنت روپیہ کمانے کی نت نئی چالیں سوچتا رہتا ہے۔ بیکاری ہر رنگ میں بُری ہے۔ لیکن بدترین اس وقت ہو جاتی جب انسان اپنی خود داری اور شخصیت کھو کر سب کا محتاج بن جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی قوی تر ہاتھ اٹھے اور معاشرہ کی سب سے بڑی برائی کو نیکی سے بدل دے۔

۲

دیکھنے والی آنکھوں کو محنت کی بلندیاں دکھلانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ آنکھ والے اندھوں پر محنت کی عظمت جتانا ضروری ہے۔ اُن کو یہ بتانا ہے کہ کس طرح محنت نے ایک عالم منتشر کو عالم نظم اور لاکھوں مربع میل میں پھیلی ہوئی دنیا کو سکیڑ کر ایک بستی بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ محنت اسرار سربستہ کھول کھول کر قدرت کو مسخر کرتی جارہی ہے۔ اگر محنت کا وسیع مفہوم بھی نہ لیا جائے تو اُس کی قوتِ اعجاز میں فرق نہیں آتا۔ وہ ایک قانونِ حیات ہے جو افراد اور قوموں کو ترقی کی راہ پر لگاتار رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی روح ہے جس کے بغیر نہ تو جسم کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اور نہ دماغ اپنے جواہر اُگل سکتا ہے۔

۳

ذاتی محنت کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ نکموں اور اپاہجوں کو کسی اور جنت کی دعوت دی جائے۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت، ترکہ میں ملی ہوئی یا بخشی ہوئی دولت سے زیادہ دیرپا اور مسرت بخش ہوتی ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے لگائے ہوئے درختوں کے پھل، بازار سے خریدے ہوئے یا تحفتہً ملے ہوئے پھلوں سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔ وہ امید کے رس سے خوش رنگ اور بوئے وفا سے دلفریب بن جاتے ہیں۔ محنت، امیر و غریب سب کو کرنی چاہئے۔ دولت مندوں کو بھی اپنے عیش کے معاوضہ میں سماج کی فلاح کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ محبتِ انسانی کا پہلا اصول یہی ہے کہ بھوکوں کو کھانا، ننگوں کو کپڑا اور دکھیوں کو سکھ چین دیا جائے۔

۴

انسان کی سب سے بڑی احتیاج روٹی ہے۔ وہ اپنا پیٹ سب سے پہلے بھرنا چاہتا ہے۔ یہ خود غرضی سب میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ زمین سے بھی چشمہ اُبل کر پہلے اپنی سطح سیراب کرتا ہے پھر اُن گڈھوں کو پانی دیتا ہے جہاں چوپائے آکر پیاس بجھاتے ہیں۔ دنیا کے پہلے دن سے لے کر آج تک روٹی کا سوال موت و زندگی کا سوال بنا رہا۔ کیا اس کشمکش سے نجات پانا ممکن ہے؟ ہاں ممکن ہے۔ بشرطیکہ ذی ثروت انسان اپنے سوا دوسروں کو بھی ذی روح مخلوق سمجھیں اور اپنی بے اندازہ دولت کو زمین کے پیٹ سے نکال کر بیکاروں کا پیٹ بھرنے کی فکر کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ خیرات کریں۔ خیرات ایک غیر دلچسپ فعل ہے۔ ایک سے دو اور دو سے چار بنانے کا مشغلہ بہت دلچسپ ہے۔

اور یہ مشغلہ نیکی بن جائے گا اگر نکمے کام کے آدمی بن جائیں اور اُن کے لئے روزی کی راہیں کھل جائیں۔

۵

روٹی کی محنت تفریق اور نفرت کو مٹا دیتی ہے۔ یہ نوع انسان کے بکھرے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انہیں نئی زندگی بخشتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب لوگ اپنی روٹی آپ کمانے لگ جائیں گے مفلسی کی ذلت بھی مٹتی جائے گی۔ دغابازی اور بدمعاشی کا کہیں نام و نشان نہ رہے گا۔ اور معاش کی خاطر عزت و آبرو بیچنے کی حاجت نہ ہوگی۔ جو لوگ محنت سے روٹی کمانا نہیں چاہتے وہ اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتے ہیں یا مرنے والے باپ یا بھائی کے ترکہ پر نظر لگائے رہتے ہیں۔ جہاں یہ سہارے نہ ہوں وہاں لطیفۂ غیبی کا انتظار رہتا ہے اور اس سے بھی مایوسی ہو تو گردشِ ایام اور کج رفتاریِ فلک کا شکوہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے ناسمجھوں کو کون سمجھائے کہ سکندر بختی اَن تھک محنت کا دوسرا نام ہے۔ کارنیگی اور فورڈ ایک دن میں خداوندانِ زر نہیں بنے۔ اُن کی ساری عمر کام کرتے گذری اور کبھی اُن کو ادنیٰ محنت سے عار نہ ہوا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ محنت میں صرف افادہ کی کمی بیشی کا فرق ہے۔ کڑی دھوپ میں سڑک پر پتھر توڑنے والے مزدور اور پارلیمنٹ میں سر جوڑ کر معاملاتِ ملکی پر غور کرنے والے وزیر کے کام کی قدر و منزلت یکساں ہیں۔ دونوں ملک کی ترقی کی عمارت میں اینٹ پر اینٹ رکھ رہے ہیں۔

۶

سچی بھوک کبھی پاپ کا رستہ نہیں دکھاتی۔ وہ انسان کو حقایق سے دوچار کر کے باعزت زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ وہ بزدل کی قبر نہیں بنتی۔ اُس کی فطرت میں حرکت پذیری ہے اور حرکت ہی میں اسے مزا آتا ہے۔

جو انسان مصائب سے منہ موڑ کر تنہائی میں پناہ لیتے ہیں وہ اپنے عذاب میں کچھ اضافہ ہی کر لیتے ہیں۔ بیکاری اور تنہائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مشقت اور مصیبت نہیں۔ کاہل ہمیشہ کسی نہ کسی حیلے کام ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اصول یہ ہے کہ "ماضی نے دھوکا دیا! حال پریشان کرتا ہے، مستقبل ڈراتا ہے۔"

۷

فضول کام کو اہم سمجھ کر انجام دینا بیہودگی ہے۔ چیخ پکار اور نمایش میں قوت صرف کرنا لاحاصل ہے۔ کام خاموشی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور حقیقی خاموشی اپنے آپ کو اُس کام میں کھو دینے سے پیدا ہوگی۔

زندگی کی دوڑ شروع ہو چکی۔ تم ابھی جوتے ہی کے بند کس رہے ہو۔

دوڑو اور اُڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑ کر اُن کی ساری دولت نچوڑ لو!

محمد امیر
(اورنگ آبادی)

بچیوں کی تعلیم و تربیت

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہے، ہماری موجودہ زندگی میں یہ مسئلہ نہایت اہم اور کافی غور و فکر کا محتاج ہے، لڑکیوں کی با اصول تعلیم اور صحیح تربیت بہ نسبت لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے زیادہ اہم اور ضروری ہے، ہماری وہ لڑکیاں جو مستقبل قریب میں "بیوی" اور "ماں" بننے والی ہیں اگر زیورِ علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ نہ ہوں تو ان میں اپنے ماحول کی ضروریات کو سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت نہ ہوگی اور نہ وہ اپنی اولاد کی صحیح اصول پر پرورش و تربیت کر سکیں گی، یہ سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں، بیویوں اور ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کی نشو و نما کا دار و مدار اور ان کے ارتقاء کا راز صحیح اور با اصول تعلیم نسواں میں مضمر ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ عہدِ ماضی کی خواتین کی روحانی صفات اور دورِ حاضر کے قابلِ تقلید خیالات کے اتصال کی ایک زندہ مثال بنیں، ان میں مشرقی شرم و حیا، ایثار و وفا، وطن پرستی، اطاعت، محنت، ہمدردی اور خودداری کے اعلیٰ جذبات ہوں، ہماری لڑکیوں کو قدیم حسن و خوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم و تہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے، ہمارے ملک کی لاکھوں لڑکیوں میں سے صرف پچاس ہزار لڑکیاں اس وقت نسوانی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی ہیں، ان میں سے معدودے چند ایسی خوش قسمت لڑکیاں ہوں گی جن کی اخلاقی تربیت بھی صحیح اصول پر ہو رہی ہو، جب تک ہر لڑکی صحیح تعلیم و تربیت یافتہ نہ ہو، ہماری قوم کا مستقبل اسی طرح تاریک رہے گا۔ اور ہمارے نوجوانوں کو بیاہ کے وقت بیویوں کے انتخاب میں اُن ہی دشواریوں سے سابقہ پڑتا رہے گا جو اب تک پیش آتی رہی ہیں۔ انھیں عموماً برائے نام پڑھی لکھی، اچھائی اور برائی کی تمیز سے بیگانہ، آغوشِ جہالت میں پروان چڑھی ہوئی، مغرب کی اندھی تقلید کے بھنور میں چکر کھاتی ہوئی لڑکیوں میں سے اپنی شریکِ حیات کا انتخاب کرنا ہوگا ظاہر ہے کہ اس قسم کی لڑکی جب رفیقِ زندگی بنے گی تو وہ اپنے شوہر کے جذبات اور احساسات کا کس حد تک احترام کرے گی۔ اس کی زندگی کی الجھنوں کو کہاں تک سلجھائے گی۔ اور اس کی آمد و خرچ کے توازن کو کس درجہ تک گرنے نہ دے گی، ایسی علم و عمل سے بے بہرہ ماؤں کی گود میں ہمارے بچے تنک مزاج، خود پسند، نافرمان، عیش پرست، نکمے اور مسرف ہو کر ہماری قوم کی پستی اور نکبت کا باعث ہوتے رہیں گے۔

ذی فہم والدین اپنی اولاد کو دنیاداری اور معیشت کے اصول سمجھانے کی امکانی کوشش کرتے ہیں، مگر شاید ہی کوئی باپ ایسا ہوگا۔ جس نے اپنے "لختِ جگر" کو اپنی بیوی کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آنے اور اس کی جائز خواہشات کو بحدِ امکان پورا کرنے کی تعلیم دی ہو! کتنی مائیں ایسی ہوں گی جو اپنی "لاڈلی" لڑکیوں کی نسبت یہ کہہ سکتی ہیں کہ انھوں نے ان کو اپنے شوہروں سے محبت کرنے، ان کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے اور ان کی خدمت، اطاعت، و فرماں برداری کو اپنا نصب العین بنانے کا عملی سبق پڑھایا ہے!! لڑکوں اور لڑکیوں کو ایسی اہم اور ضروری تربیت سے بیگانہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں آئے دن اَن بَن رہتی ہے اور بات بات پر جھڑپ ہو جاتی ہے۔ شکر رنجیاں اور خانہ جنگیاں ہونے لگتی ہیں اور یہ نا اتفاقیاں بڑھتے بڑھتے ایک دن خلع اور طلاق کی نوبت لے آتی ہیں۔

موجودہ نظام تعلیم میں لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم کو کچھ ایسا خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ اس قسم کی تعلیم سے لڑکیوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا، تعلیم نسواں کی درس گاہوں کے قیام سے پہلے ان کے مخصوص نصاب کی ترتیب و تکمیل بہت ضروری تھی، جس بنیاد پر عمارت قایم ہونے والی تھی اس کا مضبوط اور مستحکم ہونا از بس لازم تھا مگر اس مرحلہ کے طے کرنے سے پہلے عمارت کی تعمیر آغاز کر دی گئی، لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا تقریباً ایک ہی نصاب قرار پایا، لڑکیوں کے لئے ان کی مخصوص ضرورتوں اور فرائض کے مدنظر ایک علیحدہ نصاب بنانے کی شدید ضرورت تھی۔ موجودہ نصاب پر جو تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہ نہ تو ہماری لڑکیوں کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے اور نہ ہمارے حالات اور معاشرت کے موافق ہے، باوجود ان کمزوریوں کے وہ اس قدر گراں بھی ہے کہ ملک کا غریب طبقہ اپنی لڑکیوں کو اس سے مستفیض نہیں کر سکتا، اب اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ماہرین تعلیم و حامیان تعلیم نسواں نہایت پسندیدہ اور موزوں اسلوب پر تعلیم نسواں کا جدید نصاب تیار کریں۔

جس قوم سے اس کی قومیت اور تمدن نکل گیا ہو اور اس کی خصوصیات نابود ہو گئی ہوں وہ گویا دنیا سے مٹ گئی، اس کا عدم و وجود یکساں ہے۔ ہر قوم اپنی خصوصیات کی وجہ سے اقوام عالم سے اپنا فرق منواتی ہے، یہ خصوصیت ایسی ہے جس کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے، موجودہ نصاب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس حد تک ہماری قومی روایات اور خصوصیات کو نصاب میں جگہ دی گئی ہے اور ہماری مخصوص تواریخ کو کہاں تک طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے، اپنی تواریخ اور روایات سے فائدہ اٹھانے کے عوض غیروں کی تواریخ اور روایات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اپنے مشاہیر اور اسلاف کے تذکروں سے نصاب کو بڑی حد تک محروم کر دیا گیا ہے مگر دوسری اقوام کے مشاہیر کے تذکروں سے ہماری درسی کتابیں بھری پڑی ہیں، ضروری اجزائے تعلیم کو ترک کر کے بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں نصاب میں شامل کر دی گئی ہیں جن سے بجز اس کے کہ لڑکیوں کے نازک اور کمزور دماغوں پر خواہ مخواہ بار پڑے اور کوئی فائدہ کی امید نظر نہیں آتی۔

عام طور پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا مفہوم صرف ان کو کتابیں پڑھانا ہے، لڑکوں کی طرح ان کو بھی ریاضی اور جبر و مقابلہ کے ادق سوالات بتا کر اقلیدس کی عجیب و غریب ٹیڑھی ترچھی شکلیں سکھا کر اور تاریخ و جغرافیہ رٹا کر ان کی صحت و تندرستی کو غارت کیا جاتا ہے، اس کے عوض اگر انھیں انگریزی اور مادری زبان میں لکھنے پڑھنے کی کافی مشق کے ساتھ امور خانہ داری، گھریلو حساب، حفظان صحت، مبادیات مذہب، اخلاق و دستکاری، یکوان کی عملی تعلیم، بچوں کی پرورش اور تربیت کے طریقے، ابتدائی سائینس، ملکی تاریخ و جغرافیہ اور سوزن کاری کی تعلیم دی جائے تو ایک لڑکی اچھی بیوی اور ماں بن کر ملک اور قوم کی بہت کچھ خدمت کر سکتی ہے۔ اور اپنی گود میں پلنے والی نسلوں کو بام ترقی پر پہنچا سکتی ہے۔

لڑکوں کی طرح اسکول اور کالجوں میں تعلیم پاکر وہ اپنے مخصوص امتحانات میں تو کامیاب ہو جاتی ہیں مگر اپنے فرائض کو بھولنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک اپنی "نسائیت" بھی کھو بیٹھتی ہیں، ابھی وہ ابتدائی تعلیم کے مدارج بھی طے کرنے نہیں پاتیں کہ ان کو آزادی حاصل کرنے کا خیال گدگدانے لگتا ہے، یہ نتیجہ تعلیم کا نہیں بلکہ ناقص تربیت اور اس ماحول کا ہے جس میں وہ تعلیم پانے بھیجی جاتی ہیں، عام طور پر اسکول اور کالج کی فضا میں ان کو اکثر اپنی صنف کے ایسے افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ اپنی نام نہاد آزادی کی اشاعت کرتی ہیں، لڑکیوں کو اسکول بھیج کر والدین ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق اپنی ساری ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، نہ وہ ان کی اخلاقی تربیت کی طرف توجہ کرتے ہیں نہ مذہبی تعلیم کی طرف، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اسکول یا کالج کی تعلیم ختم کر چکتی ہیں تو ان کے دلوں میں نہ والدین کی محبت باقی رہتی ہے نہ مذہب کی عظمت، اپنی لیاقت اور قابلیت کے گھمنڈ میں وہ والدین کو عقل و سمجھ سے بے بہرہ سمجھ کر جو من میں آئے کرنے لگتی ہیں اور ان کو کٹ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں، یہ بیچارے اُس وقت "سعدی از دست خویشتن فریاد" کی

صدا بلند کرتے ہیں اور "ٹنگ ٹنگ دیم دوم ڈیکٹیم" سنے بیٹھے رہتے ہیں، ہندوستان کے اسکول اور کالج زیادہ تر اسی قسم کی "تعلیم یافتہ" لڑکیاں پیدا کر رہے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد صرف "ملازمت" نہ ہونا چاہئے، یہ واقعہ ہے کہ جدید تعلیم کا مقصد یہی قرار دیا گیا ہے مگر اس مقصد میں ہمیں کس حد تک کامیابی ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے! ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان تلاش ملازمت میں دردر کی ٹھوکریں کھاتے مہذب گداگر بن کر حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں ان کی قیمت آئے دن گرتی ہی جا رہی ہے، اس تلخ تجربہ کے بعد ہمیں چاہئے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے معاملہ میں عاقبت اندیشی سے کام لیں، لڑکوں کی طرح ان کی زندگی کو بھی ناخوشگوار بنا کر ان کی صحت و تندرستی، اطمینان قلب اور گھر کی پرسکون زندگی کو برباد نہ کریں۔

تعلیم کا مقصد صرف "تعلیم" سمجھا جاتا ہے "تعلیم اور تدریس" میں نمایاں فرق ہے، ہمارے مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ وہ "تدریس" ہے، اس کو تعلیم نہیں کہہ سکتے! اچھے اخلاق اور عمدہ کردار کتابوں سے نہیں، صحیح جذبات اور بلند احساسات سے حاصل ہوتے ہیں، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اخلاقی تربیت بھی شامل ہو، جس طرح ابتدائی تعلیم سنگ بنیاد ہے اعلیٰ تعلیم کا، اسی طرح بچپن کی اخلاقی تربیت سیرت سازی اور اچھے خصائل کی بنیاد ہے، بہترین کردار کی تعمیر اسی عمر میں ہوتی ہے۔

ہماری قوم کی تباہی اور ادبار کے اسباب صرف جہالت اور تعلیم کی کمی نہیں ہے، اس میں ہمارے اخلاقی افلاس کو بھی بڑا دخل ہے۔ جو ہمارے مالی افلاس سے بہت زیادہ خطرناک اور عبرتناک ہے اور اپنے اندر ہمارے لئے اقسام کی تباہ کاریاں رکھتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جب ہم اس افلاس میں مبتلا ہوئے دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے، نہ دین کے رہے نہ دنیا کے!

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے!!

ہمارا فرض اولین یہ ہونا چاہئے کہ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی ہم اپنے بچوں میں عمدہ خصائل اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں، مذہب کی عظمت اور قوم کی خدمت کا ان میں احساس پیدا کریں، وطن پرستی اور ایثار کے جذبات کو ان کے اندر بیدار کریں، جن قوموں نے ترقی کی ہے اور دنیا میں عروج حاصل کیا ہے، انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا یہی اصول قرار دیا ہے، وہ اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی تعلیم و تربیت دیتی ہیں کہ وہ زندگی کی کشمکش میں ثابت قدم رہ کر اپنے ملک اور قوم کی اس طرح خدمت کرتے ہیں کہ "زندۂ جاوید" ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنے زرین کارنامے صفحۂ تاریخ پر چھوڑ جاتے ہیں، ان ہی کے لئے یہ دعویٰ کرنا جائز ہے کہ

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!"

مرزا سیف علی خاں

سالانہ خریدارانِ سب رس سے

جن اصحاب کا چندہ ڈسمبر ۱۹۳۸ء میں ختم ہوتا ہے۔ وہ براہ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں کہ جنوری ۱۹۳۹ء کا پرچہ (دکن نمبر) ایک سال کے لئے وی پی کر دیا جائے یا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کیا جائے گا۔ اگر کوئی صاحب ۱۹۳۹ء کے لئے پرچہ جاری رکھنا نہ چاہتے ہوں تو وہ دفتر کو مطلع کر دیں تاکہ پرچہ وی پی نہ کیا جائے۔ اگر ۴ر جنوری ۱۹۳۹ء تک کوئی اطلاع وصول نہ ہوگی تو یہ تصور کر لیا جائے گا کہ پرچہ کو جاری رکھنا منظور ہے۔ اور جنوری ۱۹۳۹ء کا پرچہ وی پی کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔

مہتمم

صنفیت کی ابتداء

اس امر کے خیال کے لئے کافی وجوہات ہیں کہ صنفیت کی ابتدا اجاتی تولید سے ہوئی ہے۔ مثلاً (Synchytrium endobioticum) ایک طفیلی پودا ہے جو گوبھی کے پودے پر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ سادہ حالتوں میں (S. endobioticum) کے ایک صنفی عضویہ کو جب غذا وغیرہ کافی میسر آتی رہتی ہے تو وہ اس طرح اجاتی تولید کرتا ہے کہ ہر ام خلیہ تقسیم کرکے دو دختر خلیوں میں تبدیل ہو جاتا۔ اور پھر یہ تقسیم عرصہ دراز تک جاری رہتی ہے اس طرح عضویوں کی تعداد میں ہندسی اضافہ کیا جاتا ہے لیکن اس عضویے کی سوانح میں ایک دلچسپ دور اس وقت آتا ہے جب گوبھی کا پودا بیماری کی کثرت کی وجہ سے سوکھنے اور مرنے لگتا ہے۔

ایسی صورت میں پودے میں ترشئی مادوں کی افراط اور غذائی مادوں کی کمی (S. endobioticum) کو غذا کے میسر کرنے میں دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ ان حالات میں خلیے اجاتی تقسیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ ایک خاص طور کوشش کرتے ہیں یعنی نحیف و ناتوان خلیے جو مزید تقسیم کے قابل نہیں آپس میں جوڑے جوڑے سے ملنے لگتے ہیں۔ ان کے ملاپ سے نخزایہ اور مرکزے متحد ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک جسم حاصل ہوتا ہے جو جگتہ ہے۔ یہ جگتہ کم و بیش خفتہ رہ کر پھر موسم بہار میں اپھٹا اور نیا عضویہ پیدا کرتا ہے جو پھر تقسیم سے افزائش نسل جاری رکھتا ہے

اسی طرح (Copromonas) میں بھی جو ایک یکخلوی عضویہ ہے۔ افزائش تعداد اجاتی تولید کے ذریعہ ہوتی ہے لیکن جب کبھی واسطے (Media) میں کوئی معدنی نمک ملا دیا جائے یا ایسی ہی تبدیلی کی جائے یا غذائی مادے کم کر دئے جائیں یا عضویے مسلسل تقسیموں سے کمزور ہو جائیں تو یہ ہوتا ہے کہ دو خلیے ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ ان کے ہدبہ (Cilia) جو عضویوں کے اعضائے حرکت ہیں اندر کھینچ لئے جاتے ان کی درمیانی دیوار جذب ہو جاتی اور ان کے نخزمائی مادے مع مرکزوں کے مل جاتے ہیں اور جگتہ حاصل ہوتا ہے اس جگتے کی مزید تقسیم سے جو خلئے حاصل ہوتے ہیں وہ آیا پھر آزاد (Copromonas) کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اجاتی تولید کے ذریعہ

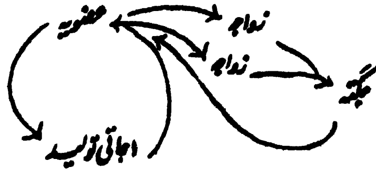


افزائش نسل کرتے ہیں یا پھر دو دو ملاپ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان ملاپ کرنے والے عضویوں کو ہم زواجے (Gametes) اور اس عمل کو جاتی یا صنفی تولید کہہ سکتے ہیں۔ ٹھیک یہی کیفیت نباتات میں جن سے (Chlamydomonas) کی ہے معمولی حالتوں میں اگر غذا کافی میسر آئے تو پودا عرصہ لامتناہی کے لئے اجاتی تقسیم کرتا رہتا ہے اور اس طرح اپنے خلوی مائیہ کی تقسیم سے نئے عضویے بناتا رہتا ہے لیکن اگر اس عضویے کو اس نمکین محلول سے نکال کر جس میں اس کی کاشت کی گئی تھی معمولی سادہ پانی میں منتقل کیا جائے تو پھر عضویے سے جو دختر خلئے نمودار ہوتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ ذاتی طور پر زندگی گذار سکیں نیز یہ نسبتاً چھوٹی جسامت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح تولیدی اور معمولی خلیوں میں پہلی بار تمیز نظر آتی ہے۔ اس لئے دو دو مل کر یہ آپس میں ملاپ (Copulation) کرتے اور اس صنفی عمل سے جگتہ پیدا کرتے ہیں جو بڑھ کر پھر نئے عضویے بنا سکتا ہے۔

لہٰذا ان مثالوں سے ہم حسب ذیل نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

سب بسم
دسمبر ۱۹۳۵ء

سادہ یکخلوی عضویوں میں جاتی تولید یا صنفی تولید معمولی سوانح زندگی کی ایک مستثنیٰ شکل کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اور خاص حالات کے تحت اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔



اس ضمن میں یہ خیال صحیح نہیں کہ صنفیت اور تولید میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے بعض وقت صنفیت کی موجودگی میں تولید کا اصل مفہوم باقی نہیں رہتا یعنی بجائے افزائش تعداد کے افراد کی تعداد میں کمی ہونے لگتی ہے۔

لہذا ابتدائی ماہرین کا یہ خیال کہ صنفیت کی ابتداء افزائش نسل کے لئے ہوئی ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مثلاً الجی کا ایک رکن (Cylindrocystis) میں عموماً افزائش نسل اجاتی تولید کے ذریعہ وقوع میں آتی ہے۔ لیکن جب کبھی اس عضویے میں صنفی کا عمل ہوتا ہے تو دو عضویے آپس میں ملاپ کرتے ہیں جگتہ پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ جگتہ کم و بیش ایک عرصہ تک سستاتی حالت گزارنیکے بعد نمو پاکر (Cylindrocystis) کا ایک نیا رکن بناتا ہے اس مثال سے یہ امر واضح ہے کہ یہاں دو عضویوں کے ملاپ سے صرف ایک عضویہ حاصل ہوا۔ چہ جائیکہ تولید سے مراد افزائش نسل ہونا چاہئے تھا اور وہ تولید تولید نہ ہوئی جہاں کمی واقع ہو مزید یہ کہ جس عرصہ میں جگتہ سستاتی حالت گذارتا رہتا ہے یہ دو عضویے تقسیموں کے ذریعہ عضویوں کی کئی نسلیں پیدا کر چکے ہوتے۔

ظاہر ہے کہ ان عضویوں کی سوانح میں صنفیت کا ظہور موزوں حالات کے تحت ضروری نہیں کیونکہ افزائش نسل بغیر صنف کے بھی عرصہ دراز تک ہو سکتی ہے بلکہ معمولی سادہ زندگی میں غیر معمولی ماحول کے تحت مثلاً تخفیف غذائیت یا کاشت کی نلیوں کو سیاہ کپڑوں وغیرہ سے ڈھانکنے پر صنفیت کے مظاہر کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بنا بریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاتی تولید یا صنفی تولید سادہ حالتوں میں پودے کی سوانح حیات کے لئے ضروری نہیں۔

کچھ عرصہ قبل صنفیت کی تفہیم کے لئے نظریہ تشبیب (Theory of Rejuvenescence) پیش کیا جاتا تھا۔ اس نظریہ کے حاملوں کا یہ خیال تھا کہ ایک عرصہ تک نباتی یا اجاتی تولید کرنے کے بعد مسلسل تقسیموں کی وجہ سے عضویہ اس قابل نہیں رہتا کہ مزید تقسیم کر سکے وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرکزے ملاپ کر کے اک ایسا عضویہ پیدا کرتے ہیں جو اس مرکزی ملاپ کی وجہ سے نمو کی نئی قوتیں لے کر آتا ہے۔

چنانچہ اس صورت میں کسی عضویے کی نسلی تاریخ میں یہ ضروری ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی جاتی تولید ضرور کرے۔ مگر حقیقت پوچھئے تو مذکورہ بالا نظریہ واقعات کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا مثلاً (Chlamydomonas) پر تجربے کرتے ہوئے بعض محققین نے یہ کیا کہ حتی الامکان عضویوں کو صنفی تولید سے باز رکھا۔ وہ اس طرح کہ اجاتی تقسیم کے بعد فوراً ہی دختر عضویوں کو یا تو علیحدہ کر دیا گیا یا ان کے واسطوں میں ایسی کیمیائی تبدیلیاں کی گئیں کہ جاتی یا صنفی تولید ممکن ہی نہ ہو سکے چنانچہ اس صحت میں دیکھا گیا عضویے پانچ چھ سال تک مسلسل بغیر کسی جاتی تولید کے اپنی قوت اور عزیزیت کے ساتھ زندہ رہے اور ان سے ہزارہا نسلیں حاصل

ہو سکیں مزید برآں بعض وقت ذواجوں کی اچھوت پیدائش کے ذریعہ بڑھکر بغیر کسی ملاپ کے آزادانہ پودا بناتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ناکمل یا کمزور عضویوں نے نئی نسل کی ابتدا کی تھی۔

مذکورہ بالا بحث سے دو اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ تولید کے لئے صنفیت کی ضرورت نہیں اس لئے کئی اعلیٰ اور ادنیٰ عضویوں مثلاً Copromonas، Chlamydomonas، Paramecium معمولی Canna ، نیشکر، اروی آلو گلاب وغیرہ میں وہ اباتی یا نباتی طور پر جاری ہے۔ اور اس سے برابر افزائش نسل ہو رہی ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ جہاں کہیں بھی جاتی تولید پائی جاتی ہے اس کو مصنوعی تجربوں کے ذریعہ بآسانی دور حیات میں سے نکال دیا جاسکتا ہے۔ اور اس سے عضویے کی سوانح زندگی پر کوئی غیر معمولی اثر مترتب نہیں ہوتا۔

لہذا صنفیت اور تولید دو علیحدہ علیحدہ مظاہر ہیں جو دوران ارتقاء میں ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔

مہندر راج سکسینہ

ہم دونوں

عشق کو گدگدائیں ہم دونوں — آؤ پھر مسکرائیں ہم دونوں
ہر نظر میں سما گئے ہیں گل — اور گلوں میں سمائیں ہم دونوں
اے ستارو ذرا سا ہٹ جاؤ — چاندنی سے نہائیں ہم دونوں
چھوڑ دیں اس جہان کے منظر — اپنی دنیا بسائیں ہم دونوں
کھل رہے ہیں محبتوں کے پھول — آؤ گجرے بنائیں ہم دونوں
کل تو ہنسنے پہ ہنس دیئے عالم — آج پھر مسکرائیں ہم دونوں

تم بھی آجاؤ پھر مرے قصریؔ
اپنے جلوے لٹائیں ہم دونوں

سید صابر حسین قصری
(کانپور)

تبصرے

باغی

از جاذب قریشی بی اے آنرز دہلوی قیمت عہ ملنے کا پتہ ایوان اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ یہ جناب جاذب کی باغیانہ نظموں کا مجموعہ ہے جو چھوٹی سائز کے (۱۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف عنوانات مثلاً مزدور اور سرمایہ دار، مذہب اور اس کے اجارہ دار، وطنیت اور سیاسیات حاضرہ اور ماحل کے تحت متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں جن کی نوعیت خود ان عنوانوں سے ظاہر ہے۔ جناب جاذب دہلوی نے غالب دہلوی کی طرح عام موضوعوں سے ہٹ کر جدت طرازی سے کام لیا ہے اور اپنے لئے ایک نیا میدان ڈھونڈھ نکالا جس پر آج کل کے نوجوان ادیب اور شاعر طبع آزمائی کرنے کو معیشن سمجھ رہے ہیں اور اسی وجہ سے ان میں سے اکثر بھٹکتے بھی جا رہے ہیں۔ جاذب صاحب اس راہ میں ایک حد تک کامیاب شاعر معلوم ہوتے ہیں اور ان کے کلام کا مطالعہ بعض بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو سیدھے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

شاعر اپنے زمانہ کا ترجمان ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اردو شاعری اگر سیاسیات حاضرہ سے متاثر ہو رہی ہو تو کوئی تعجب نہیں لیکن ادیبوں اور شاعروں کو موقتی آندھیوں اور سیلابوں میں نہ بہنا چاہیئے ورنہ ان کے کلام میں بھی اخباروں کے اداریوں اور وقتیہ مراسلات سے زیادہ وقعت اور جان نہ پیدا ہو سکے گی۔ جناب جاذب کی دو چار نظمیں اسی رنگ کی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر باقی کلام قابل مطالعہ اور دلچسپ ہے۔

ترِیاہٹ اور دو ڈرامے

مرتبہ آغا محمد اشرف صاحب ایم اے قیمت ۴ر ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس نے ایک سلسلہ تعلیم بالغان قائم کیا ہے جس میں نہایت دلچسپ اور مفید چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔ تریاہٹ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ بڈھے طوطوں کو پڑھانا بہت مشکل ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ کچھ عرصے سے ہندوستان میں یہ تحریک عام ہوتی جا رہی ہے۔ اور کام کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر توقع پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہو سکتی ہے اور مستقبل قریب میں بالغوں کی تعلیم کے لئے نصاب مقرر کرنے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ جو اصحاب ملک میں تعلیم کو عام کرنے کے حامی ہیں انہیں چاہئے کہ اس قسم کی کتابوں کی قدر کریں تاکہ مولفوں اور ناشروں کی ہمت افزائی ہو اور اردو ادب میں اس قسم کی کتابوں کی کمی باقی نہ رہے۔

تریاہٹ میں اور دو ڈرامے (۱) کبڑے کا قاتل (۲) ابوالحسن شامل ہیں۔ یہ دونوں مشرق کے قدیم ذخیرۂ قصص الف لیلیٰ سے ماخوذ ہیں اور ان کو آغا احمد حسن صاحب نے نہایت خوبی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ ان تمام ڈراموں کا اسلوب نہایت سلیس اور زبان بیحد رواں ہے۔ قصے بہت دلچسپ ہیں اور عام تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

عَدلِ جہانگیری

از پروفیسر محمد مبارز علوی صاحب فاقی ایم اے قیمت عاں ملنے کا پتہ دفتر البیان محمود نگر لکھنو۔ یہ ایک فارسی مثنوی ہے جس میں فاضل مصنف نے شہنشاہ جہانگیر کے ایک یادگار زمانہ انصاف کو نظم کیا ہے۔ جہانگیر نے ایک کھتری قوم کی ہندو بیوہ کے معاملہ میں مسلمان کوتوال شہر کے خلاف تصفیہ کیا اور بغیر کسی مذہبی یا وضع داری یا تعصب کے مظلومہ کی دادرسی کی تھی۔ اس موضوع کو انتخاب کر کے مصنف نے حالات وقت کے پیش نظر نہایت مفید اور ضروری کام انجام دیا ہے۔ اس زمانے میں ملک کے بعض بد نفس افراد اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ سے ایسے واقعات کو چن چن کر پیش کیا جائے جن سے مذہبی تعصب اور دل شکنیوں میں اضافہ ہو۔ ایسی کوششوں کی سدباب کی بیحد ضرورت ہے اور اس کا ایک مستحسن طریقہ یہی ہے جس کو مولانائے فاقی نے اختیار کیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ بڑا اچھا کیا کہ اس کتاب کو اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کے نام گرامی سے منسوب کیا ہے جن کا دور حیدرآباد کی تاریخ میں عدل گستری کے لحاظ سے عہد جہانگیری کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

کتاب کے آغاز میں ایک فہرست دی ہے جس میں ان بائیس مضامین کے عنوانات مثلاً زنجیر عدل، استفسار شہنشاہ، بازگشت مستغیثہ، عتاب شہنشاہ بر کوتوال گنہگار، کوتوال طلب کردن شہنشاہ پیرزن را، اور شادمانی اہل شہر بعدل شہنشاہ وغیرہ لکھے گئے ہیں۔

ق

بچوں سے

یہ سب رس کے پہلے سال کا آخری شمارہ ہے۔ جنوری سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ سب رس اپنے قدر دان بچوں اور بچیوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ آئندہ سال بھی اپنی خریداری جاری رکھیں گے۔ اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی اس کا خریدار بنائیں۔ کیونکہ جتنے زیادہ خریدار ہوں گے۔ اتنا ہی بچوں کے سب رس کی زیب و زینت میں اضافہ ہوگا اور تصویریں بھی چھپ سکیں گی۔

ہم نے اعلان کیا تھا کہ سال بھر میں جن کے چھ مضمون شائع ہوں گے ان کو سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ چھ مضمون کسی کے بھی نہیں چھپے۔ اس لئے جن جن کے پانچ مضمون چھپے انہی میں یہ انعام تقسیم کردیئے جاتے ہیں۔ اس طرح شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی معین الدین احمد انصاری محمود علی اور مسیح الدین خاں متین انعامات کے مستحق ہیں اور دفتر سے اپنے انعام حاصل کریں۔

حسب ذیل اصحاب نے دریاؤں کے نام بوجھے۔

"دریاؤں کے نام : مہانندا۔ کرشنا۔ بھیما۔ پورنا۔"

۱۔ سید لائق علی خاں (سٹی کالج)، ۲۔ رحیم النساء بیگم (بشیر آباد)، ۳۔ سید قاضی الدین (سٹی کالج) ۴۔ مرزا مسیح الدین بیگ (سٹی کالج) ۵۔ مس اقبال سلیم الدین ۶۔ سید محمود علی (سٹی کالج)، ۷۔ بدر النساء بیگم (مغل پورہ) ۸۔ سید غضنفر علی (سٹی کالج)، ۹۔ حبیب شمس (سٹی کالج) ۱۰۔ محمد نیر وحید الدین (سٹی کالج) ۱۱۔ سید اعجاز علی (گرامر اسکول)۔

"ادارہ"

(انعامی معمہ)

۱	ر									
۲	ج									
۳س			س							
۴ڑ		ف	ڑ							
۵	و		م		س					
۶	و	ل		ن	ب					
۷ڑ		ڑ		و		ی	ہ			
۸م			ف		ک		ڑ			
۹	ڑ	ٹ		س			ڑ		ہ	
۱۰اس			ڑ		ڑ	ل		ا		م

اس معمہ کے حل وہی حضرات روانہ کریں جو اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ صحیح حل پر ایک کتاب انعام دی جائے گی۔

انعام کا تصفیہ ادارہ کے تفویض ہے۔

آڑے اشارے

۱۔ سمندر سے —— نکالے جاتے ہیں۔

۲۔ موسم باراں میں ہر —— سرسبز ہوتا ہے۔

۳۔ حیدرآباد کا مشہور رسالہ —— بچوں کی خدمت کرتا ہے۔

۴۔ جو حاکم اپنے —— دلی محبت نہیں رکھتا وہ اپنی رعیت سے سچی محبت نہیں کرسکتا۔

۵۔ امریکہ کا پتہ لگانے والا پہلا شخص —— گذرا ہے۔

۶۔ بیجاپور کی ایک عمارت جس کا نام —— ہے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

۷۔ ایشیائے کوچک کا دوسرا نام —— ہے۔

۸۔ ان دنوں —— کی وفات پر ماتم کیا جا رہا ہے۔

۹۔ احمد نگر کی مشہور شہزادی —— تھی جس کی بہادری تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

۱۰۔ موجودہ فرمانروائے دکن کا خطاب —— ہے۔

غلام مجتبیٰ قمر

ملکِ خوش حال کی شہزادی
(بسلسلۂ گذشتہ)

تیسرا منظر

لوگ ادھر سے اُدھر جا رہے ہیں۔ آمد و رفت میں بدنظمی ہے
سیکلیں بغیر قندیل کے ہیں بہت شور ہے۔ پہلی سڑک کی آواز
آتی ہے۔ لاپروا خاں جوان کے درمیان ہے۔
اب ہم ان کو ثابت کر دکھائیں گے کہ ہماری موجودگی میں
ان کا ہر قاعدہ اور قانون بیکار ہے۔
پہلا لڑکا۔ میں جدھر چاہوں جاؤں گا سمت کی قید میرے لیے نہیں۔
دوسرا لڑکا۔ میں گولہ گلیوں میں ضرور کھیلوں گا۔ کیونکہ ان کے
قواعد میں اس کے خلاف حکم ہے۔
تیسرا لڑکا۔ جس کی سیکل ہے۔ میں قندیل ہرگز نہیں لگاؤں گا۔
بڑی سی بڑی قوت بھی اس پر مجبور نہیں کر سکتی۔
لاپروا خاں۔ بہادرو۔ آفریں ہے تمھاری بہادری پر ہم کو آج
دنیا کی کوئی قوت بھی زیر نہیں کر سکتی۔ اب تم تیار ہو جاؤ اور حملہ
بول دو۔ سیٹی بجاتا ہے۔ اور سامنے سے دوسری سیٹی ہوتے ہی
دوسری جماعت اسٹیج پر آتی ہے۔ جوں ہی کہ یہ بے ترتیبی سے
حملہ کرتے ہیں۔ وہ اطراف سے گھیر لیتے ہیں اور ان کی روشنی سے
ان کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ بر چھے لگا دیئے جاتے ہیں۔
پولیس کانسٹبل۔ اب تم ہل نہیں سکتے۔ بتاؤ اب ہماری اطاعت
منظور ہے۔
لاپروا خاں۔ جی ہاں حضور۔
سب۔ سرکار ہم کو جانے دیجئے
تاکید بیگم۔ اب تم میرے حکم کی بجا آوری کیا کرو گے۔
سب۔ دل و جان سے۔ (آنکھ اور کان) کیا تم سب کو میری
اطاعت منظور ہے۔ سب۔ بسر و چشم۔

روشنی۔ کیا تم اب بھی بغیر میرے سیکل چلاؤ گے۔
سب۔ ہرگز نہیں۔
سب شہزادی سے۔ شہزادی سلامت اب ہم قاعدہ کی پابندی
کرنا فرض سمجھیں گے۔ اور آیندہ سے کبھی بھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔
شہزادی۔ یاد رکھو اگر آئندہ ہوا تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔
لاپروا خاں۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کبھی ایسی شکایت کا
موقع نہ ملے گا۔
شہزادی۔ اچھا ان کو چھوڑ دو۔
شہزادی۔ بہادر سپاہیو میں تمھاری اس کامیابی پر مبارک باد
دیتی ہوں۔ اس بارے میں بہادر جنرل اور میاں حامد خاص شکریے
مستحق ہیں۔
میرا فریضہ ہے کہ حامد کے احسان کا کچھ نہ کچھ بدلا دوں۔ اس لئے
یہ مناسب ہے کہ حامد اپنے ساتھ خوش طبعی کو لے جائیں۔
تاکہ کبھی کوئی مصیبت کا منحوس چہرہ نہ دیکھے۔
سب۔ شہزادی سلامت زندہ باد۔
حامد زندہ باد۔
جنرل زندہ باد۔

پردہ

شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)

خریداران سب رس سے

جن اصحاب کے پرچوں پر سرخ نشان ہے اُن کا
چندہ ختم ہو چکا ہے۔
براہ کرم دوسرے سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر
روانہ فرمائیں یا وی پی کرنے کے لئے دفتر کو مطلع کریں۔

مہتمم

ایک پرلطف واقعہ

کچھ دن پہلے ہم لوگ سیر کو گئے تھے۔ وہاں ایک اور بیگم تشریف لائیں۔ پہلے میں نے ان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ بیگم صاحبہ نے آتے ہی سوال کیا کہ بی بی آپ ضرور اسکول جاتی ہوں گی؟ میں نے کہا ہاں جاتی ہوں۔ پھر دریافت کیا "کون سے اسکول کو؟" میں نے اسکول کا نام بتلایا۔ انھوں نے فوراً کہا "اوہو اس سے تو میں خوب واقف ہوں۔ اسکول کی جتنی انگریز استادنیاں ہیں ان سب کے نام گنواؤں؟" نام کے ساتھ ان کے صفات بھی بیان کئے۔ دیکھنے سے لایق معلوم ہوتی تھیں۔

اب تک تو میں صرف جواب دے رہی تھی اب میں نے کہا "کیا آپ ہمارے اسکول ہی کی پڑھی ہوئی ہیں؟" کہنے لگیں "نہیں بی بی میں بمبئی یونیورسٹی سے ہوں" اس کے بعد اپنے مختلف قصے سنانے شروع کئے۔ جن میں قابل ذکر پردہ کے متعلق تھا۔ ان کی عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ دیکھنے میں لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ گورا رنگ دبلی پتلی لانبا قد بہت لانبا نہیں! انتہائی فیشن ایبل۔ آپ کھلی موٹر میں تشریف لائی تھیں۔ اور فرماتی تھیں آپ کے شوہر پردہ کے بہت پابند ہیں۔ میرے ہمراہ امی بھی تھیں۔ امی نے ان کے شوہر کا نام دریافت کیا تو شرمانے لگیں۔ امی کو بڑی ہنسی آئی کہ کھلی موٹر میں آئی ہیں لیکن صاحب کا نام بتلاتے ہوئے شرماتی ہیں۔ بعد کو میں نے خود ان کا نام دریافت کیا۔ تو وہ اپنا نام بھی بتلاتے ہوئے ہچکچانے لگیں۔ اس کے بعد انھوں نے میرا نام پوچھا ابا کا نام دریافت کیا عہدہ دریافت کیا سکونت دریافت کی میں نے پورا پتہ بتلا دیا۔

اب میرے کپڑوں کی تعریف شروع ہوئی۔ میرے جسم پر کسی قسم کا زیور تو تھا نہیں۔ صرف ایک انگوٹھی تھی جس کو میں بہت عزیز رکھتی تھی۔ اس پر میرے نام کا سرحرف (عـ) بہت پاکیزہ بنا ہوا تھا۔ بیگم نے اس کو بہت ہی تعریفی نظروں سے دیکھا اور میری انگلی سے نکال کر خود اپنی انگلی میں پہن لیا۔ کہنے لگیں "بی بی تمھاری انگلی برابر ہے" تھوڑی دیر پہنے رہیں اس کے بعد نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگیں "اگر یہ سونے کی نہ ہوتی تو میں بطور نشانی تم سے ضرور لے لیتی" اس وقت انگوٹھی میری انگلی میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "کونسی بڑی چیز ہے لیجئے اپنے پاس رہنے دیجئے" ابھی میرا آخری نقطہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میری انگلی سے خود ہی اتار لیا۔ اور میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ نہ معلوم میرا یہ فعل اخلاقاً درست تھا یا نہیں۔ میں نے تفریحاً کہہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ایسا کہہ دوں تو کیا برائی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے جواب میں کہہ دیں گی! "نہیں بی بی میں نے تم سے یوں ہی مذاق میں کہا تھا" الٹا وہ اپنی انگلی میں پہن وہاں سے چمپت ہوگئیں۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ قیمتی نہ تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ کی یہ حرکت تمام عمر یاد رہے گی۔ گھر آنے کے بعد میں کچھ چپ سی تھی۔ مجھے اپنی انگوٹھی کے جانے کا افسوس نہ تھا۔ بلکہ ہنسی آرہی تھی۔ اب خیال آیا کہ اسی لئے وہ اپنا نام بتلانا نہیں چاہتی تھیں۔ کاش میں ان کے نام سے واقف ہوجاتی۔ اب میرے اکثر دوست مجھے کہتے ہیں کہ تمھاری انگوٹھی کیا ہوئی۔ مجبوراً مجھے یہ قصہ دُہرانا پڑتا ہے۔

بھائیوں اور بہنوں نے مجھے تنگ کر دیا۔ میں نے کہا "برا کیا ہے آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع تو مل گیا......۔ آیندہ مجھے خیال رہےگا چھوٹی سی چیز میں نصیحت ہوگئی۔ اور معلوم ہوگیا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی آباد ہیں۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنا نام اور پتہ نہیں بتلاتے۔

عزیز فاطمہ ضیاء الدین

مصیبت میں صبر

مصیبت میں رنج کرنا عبودیت کی شان کے خلاف ہے۔ رنج و مصیبت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اور نہ کوئی ہلکا کرسکتا ہے۔ بلکہ الٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو چاہئے کہ جتنی بھی تکلیف ہو اس میں صبر کرے۔ بعض خدا کے بندے ایسے ہیں کہ ذراسی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اور پریشان ہوجاتے ہیں اور موت کی دعائیں کرتے ہیں' خدا کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ بعض تو خودکشی بھی کرلیتے ہیں۔ بعض بندے ایسے بھی ہیں جو مصیبت میں ہر وقت صبر سے کام لیتے ہیں۔ ان پر کتنی سخت سے سخت مصیبت نازل ہو' خاموشی سے برداشت کرلیتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں ہمارے پیارے رسول صلعم کو مخالفین بہت ہی اذیتیں دیتے تھے۔ راستہ میں کانٹے بچھادیتے تھے۔ جس سے آنحضرت صلعم کے پائے مبارک زخمی ہوجاتے تھے۔ پھر بھی خدا کے پیارے رسول زبان سے اُف نہ کرتے اور بارگاہ ایزدی میں ان کو نیک توفیق عطا ہونے کے لئے دعا فرماتے تھے۔ مصیبت خدائے تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اور وہی اس کو رفع کرتا ہے۔

مصیبت سے جو بڑا فائدہ انسان کو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ مصیبت دل میں عجز و انکسار کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے۔ مصیبت کے وقت انسان خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

مس بی فخرالدین

کلی کی فریاد

آہ ظالم! میری محدود زندگی کی اس قدر جلد شام نہ کر! ابھی میری زندگی کی یہ پہلی صبح ہے جس صبح کو میری آرزوؤں اور میری زندگی کی ابتدا کا یہ پہلا ورق ہے۔ میں ابھی ابھی اس انجان دیس میں آئی ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ یہاں کیسے کیسے مزے ہیں ــــــ رہنے دے ــــــ! مجھے ابھی رہنے دے!!! ظالم! کیا تیرے ہاتھ میری تباہی و بربادی کے لئے بنائے گئے ہیں! کیا قسمت نے مجھے اس لئے یہاں چھوڑا ہے کہ تیرے ظالم ہاتھ آن کی آن میں مجھے فنا کردیں! نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ــــــ!! قدرت کبھی ظالم نہیں ہوتی ــــــ قدرت نے تجھے کبھی اتنی طاقت نہیں دی کہ کسی کمزور چیز پر اپنا ہاتھ صاف کرے! ظالم تیری یہ بھول ہے کہ تجھ میں بھی کچھ قدرت و طاقت ہے ــــــ اس فضول خیال کو چھوڑ دے۔ اس تکبر و غرور کو دور کر جو تجھے بہت جلد فنا کردے گا۔

دیکھ تیرے ظالم ہاتھ لمحہ بہ لمحہ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ رک جا جلد رک! کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری غفلت میری

سب میں
زندگی کا خاتمہ کر دے۔

کلی کی فریاد ظالم انسان کے نزدیک کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اس نے فوراً توڑ لیا ــــ بس ــــ آہ! کلی کی محدود زندگی کی شام ہوگئی۔

محمود علی

یورپ کے مشہور حکماء

بچو!! آج میں تم سے ایسے واقعات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جس کو پڑھ کر اگر تم چاہو تو ہمت اور استقلال پیدا کر سکتے ہو۔ اور ایسے کارنامے نمایاں کر سکتے ہو جن کا اب میں ذکر کروں گی۔ پڑھو غور سے پڑھو اور ان انمول ہستیوں کے زرین کارناموں کا مطالعہ کر کے خود بھی اس قابل بننے کی کوشش کرو جنھوں نے صرف ہماری اور تمھاری خاطر اپنے کو برباد کر دیا یہاں تک کہ ساری عمر اسی میں صرف کر دی۔

حکیم بقراط حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سب سے فاضل طبیب اگر کوئی مانا جاتا تھا تو وہ بقراط تھا۔ یہ ایک یونانی شخص تھا۔ جو ایشائے کوچک میں جزیرہ کوس میں حضرت مسیح سے تقریباً ۴۶۰ برس پیشتر پیدا ہوا۔ بقراط کے پہلے جتنے بھی طبیب گذرے وہ بالکل یہ نہ جانتے تھے کہ انسان کا دل حرکت کیسے کرتا ہے اور یہ پھیپھڑوں کا فعل کیا ہے لیکن بقراط نے سخت محنت سے تجربہ و مشاہدے کے بعد ایک نئے نظام طب کی بنیاد قائم کی اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ امراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیمار کے سینے پر کان رکھ کر آوازیں سنی چاہئیں ان آوازوں کے متعلق اس نے بعض قواعد بھی بنائے لیکن اصول کا پورا پورا فائدہ برٹنی کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر لائنک نے "ستھوسکوپ" کو ایجاد کر کے ظاہر کیا جس کا آج کل ہر ڈاکٹر مرہون منت ہے۔

جان ہنٹر یہ ایک نہایت ہی مشہور شخص تھا جس کے شاگردوں میں ایک ایڈورڈ جینر بہت ہی قابل نکلا جس نے چیچک کے ٹیکے کی ایجاد کر کے شہرت لازوال حاصل کی وہ ۱۷۴۹ء میں انگلستان میں پیدا ہوا اور ہنٹر سے تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن میں مقیم رہا اور چیچک کے ٹیکے کے لئے غور کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے پوری کامیابی حاصل کر لی۔ اس عظیم الشان ایجاد کی بنا پر جینر نے بہت ہی عزت پائی اور انگلستان کی پارلیمنٹ نے اسے تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپیہ انعام دیا۔

گاٹ فریڈ ولیم لائب نیٹز یہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا ما، جولائی ۱۶۴۶ء میں لائپزگ کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ ہمیشہ ان مضامین کا مطالعہ کرتا جو عام طالب علموں کے نزدیک خشک اور بے مزہ ہوتے ہیں۔ ۱۶۵۲ء میں اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کی ماں نے اجازت دے دی کہ خاندان کے کتب خانے میں جتنی چاہے کتابیں پڑھ لے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ پندرہ برس کی عمر میں پہنچا تو یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ کیمسٹری، فلسفہ، قانون، سیاسیات و دینیات میں کافی تعلیم حاصل کی اور بہت جلد جرمنی کے بڑے بڑے آدمیوں سے شناسائی پیدا کر لی۔ اسی زمانے میں فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم

بعض جرمن ریاستوں میں حملہ کرنے کی تجویزیں سوچ رہا تھا۔ لیکن لائب نیٹز نے ایک کتاب لکھی جس میں فرانس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مصر پر حملہ کرے اس میں شک نہیں کہ اس پر ترک اور مصری بہت ناراض ہوئے لیکن جرمنی کے سر سے بلا ٹل گئی کیونکہ فرانس کا بادشاہ مصر کی فتح کے خواب دیکھنے لگا اور جرمنی پر حملہ کرنے سے باز رہا۔

ہمبولٹ

یہ علم حیوانات کا بہت بڑا ماہر گذرا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ آج کل کی زندگی کے رازوں کو بے نقاب کردے۔ جب وہ فریبرگ کی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا اسے جارج فارسٹر کی شناسائی حاصل ہوئی جو کپتان کک کے ساتھ بڑے بڑے لمبے بحری سفر طے کرکے واپس ہوا تھا جب ہمبولٹ نے اس کے سفر کے حالات سنے تو سیر و سفر کا بے پناہ شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس کو ۳۰ برس کی عمر تک سفر کا موقع نہ ملا کیونکہ اس زمانہ میں فرانسیسی لڑائیاں خوب زوروں پر تھیں ۱۷۹۸ء میں نپولین نے اس تجویز پر عمل کرنا چاہا جو لائب نیٹز نے لوئی چہاردہم کو سمجھائی تھی یعنی مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ ہمبولٹ اس کے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن عین روانگی کے وقت معلوم ہوا کہ جہاز میں اس کے لئے جگہ نہیں رہی ہے۔ آخر کار اسے ہسپانیہ کے جہاز پر سفر کرنا پڑا ہمبولٹ نے جنوبی امریکہ پہنچکر وینیزویلا، کولمبیا، اکویڈر، وغیرہ میں خوب سیاحت کی پانچ سال تک رہ کر وہاں کے حالات معلوم کرتا رہا اور عجیب غریب پرندوں اور جانوروں کے حالات معلوم کئے جنوبی امریکہ کے دریا میں برقی مچھلی کا حال بھی جس کے جسم کو ہاتھ لگانے سے بجلی کا سا جھٹکا لگتا ہے اسی نے معلوم کیا۔ جن سے یورپ والے اب تک بے خبر تھے۔ ہمبولٹ نے آورنی نوکو، ایزن اور ان کے معاون دریاؤں میں بھی بہت کچھ سفر کیا اور اسی سفر میں اس کے دائیں بازو میں ایک قسم کا زہر سرایت کر گیا جس سے اس کا بازو عمر بھر کے لئے بیکار ہوگیا جب یورپ واپس آیا تو بہت سی عجائبات کا ذخیرہ ساتھ لایا۔ اس کی زندگی کے آخری ۳۰ سال برلن میں گذرے جہاں اس نے ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔ اسے پیرس سے محبت تھی اور کبھی کبھی چپ چاپ وہاں چلا جاتا تاکہ سکون اور خاموشی کے ساتھ کام کرسکے۔ اس کا ایک بڈھا نوکر سوئزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی سیدھا سادہ اور پکا وفادار تھا۔ عمر بھر وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا جب لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ ہمبولٹ پیرس میں ہے تو ملاقات کی غرض سے اس کے مکان پر آتے لیکن بڈھا نوکر ان سے اس طرح صاف کہہ دیتا "ہاں پروفیسر ہمبولٹ اندر ہیں لیکن انھوں نے مجھے یہی کہنے کا حکم دے رکھا ہے کہ وہ اندر نہیں ہیں"۔

تم نے سنا ہوگا اور بغیر سنا ہوگا فلموں میں اکثر ایسے جملے استعمال کئے جاتے ہیں جو صرف مذاق پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمبولٹ کا بڈھا نوکر حقیقت میں سچ بولنے کا عادی تھا۔ اس طرح کہہ دیا کرتا۔

منیر سلطانہ

باغ میں صبح کا وقت

شانِ خدا کو آکر دیکھو
خوش ہے کتنا باغ کا مالی
گل سے بلبل بول رہی ہے
چڑیاں چوں چوں بول رہی ہیں

باغ کو جھوم جا کر دیکھو
دیکھ کے گلشن کی ہریالی
رازِ دلی سب کھول رہی ہے
گویا موتی رول رہی ہیں

محمد معین الدین جنیدی
متعلم مدرسہ موسن پورہ گلبرگہ

خرگوش کا ایک ہونٹ کیوں کٹا ہوا ہوتا ہے

کیا تمہیں معلوم ہے کہ خرگوش کا ہونٹ کٹا ہوا کیوں ہوتا ہے۔ جاپانی بچوں کا یہ خیال ہے :-

جاپان سے کچھ دور پر ایک جزیرے میں کئی سو سال پہلے ایک خرگوش رہا کرتا تھا۔ یہ خرگوش روز اس جزیرے پر بھاگا کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اُس جزیرہ کے چپے چپے سے واقف ہوگیا۔ اُس کو اِس بات کی بے حد خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سمندر کے اُس پار پہنچ جائے اور شہر جاپان کو بھی دیکھ لے۔ مگر وہ غریب تیرنا نہ جانتا تھا۔ اُس سے کوئی تدبیر بن نہ پڑی۔ آخر تنگ آکر اُس نے جزیرے میں گھومنا شروع کیا کہ شاید کوئی جہاز یا کشتی دکھائی دے۔ تھوڑے دن تک وہ یونہی پھرتا رہا لیکن کوئی جہاز اُسے نظر نہ آیا۔ ایک روز بجائے جہاز کے اسے ایک مگرمچھ کا سر پانی کے اوپر دکھائی دیا۔ مگرمچھ کو دیکھتے ہی اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ مگرمچھ سے اس پار لے جانے کو کہے تو ممکن ہے کہ وہ اسے ہڑپ کر جائے۔ اس لئے اس نے نہایت حکمت عملی سے کام لیا۔ مگرمچھ سے کہا۔

" جناب مگرمچھ صاحب کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اِس سمندر میں کتنے مگرمچھ ہیں ؟"

مگرمچھ۔ " نہیں "

خرگوش۔ " میں نے یہ سنا ہے کہ اس جزیرے میں جو خرگوش ہیں اُن کی تعداد اِس سمندر کے مگرمچھوں کی تعداد سے زیادہ ہے "

مگرمچھ۔ " ہرگز نہیں۔ میں اس پر تم سے شرط بد سکتا ہوں۔ مگرمچھوں کی تعداد زیادہ ہے ؟"

خرگوش۔ " اور میں بھی شرط بد سکتا ہوں کہ خرگوشوں کی تعداد زیادہ ہے۔ خیر اگر ایسا ہی ہے تو جاؤ جتنے مگرمچھ ہیں انھیں بلالاؤ اور قطار بناؤ۔ میں ہر ایک کی پیٹھ پر سے چلوں گا اور گنتا جاؤں گا کہ کتنے مگرمچھ ہیں۔ مگرمچھ فوراً خرگوش کی باتوں میں آگیا۔ جا کر جتنے مگرمچھ تھے سب کو بُلا لایا۔ خرگوش یہ دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مگرمچھوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

" اچھا اب تم لوگ ایک قطار باندھو تاکہ میں تمھیں گن سکوں۔" مگرمچھوں نے حکم کی تعمیل کی اور اُن کی قطار اِس جزیرے سے برابر جاپان کے ساحل تک پہنچ گئی۔

اب خرگوش ایک کی پیٹھ پر سے دوسرے کی پیٹھ پر اچکتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا۔ یہاں آکر پلٹا اور مگرمچھوں سے کہنے لگا۔

" اے مہربان مگرمچھو یہ تم نے بڑی عنایت کی کہ میرے لئے آسانی سے ایک پل بنا دیا اور میں چاہتا بھی یہی تھا ؟"

اِس کے بعد وہ اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ اُس کا اوپر کا ہونٹ پھٹ گیا اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اُس کی اولاد کا ایک ہونٹ کٹا ہوا ہوتا ہے۔

ش

(سٹی کالج)

بعض بچوں کو شکایت ہے کہ ان کے مضمون نہیں چھپتے۔ ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اچھے مضمون باری باری سے ضرور چھپتے ہیں۔ ان کا نمبر بھی آئیگا۔ وہ اچھے مضمون بھیجتے رہیں۔

بنسریا

پچھلے پہر کا وقت تھا۔ اور صبح کاذب کے آثار شفق پر نمایاں ہو رہے تھے کہ میں اپنے بستر سے جاگ اٹھا۔ میرے کانوں میں ایک سریلی آواز آ رہی تھی جس کے اثر سے میں بالکل بے قابو ہو گیا۔ ہر چند اٹھنے کی کوشش کی لیکن جو محویت اس سریلے نغمے نے طاری کر دی تھی۔ اس نے کبھی اجازت نہ دی کہ میں اس کے لطف سے محروم رہوں۔ بہت دیر تک میں اپنے بستر پر سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میرے جسم میں روح نہیں ہے۔ وہ بالکل ساکت ہے۔ صرف دل کی دھڑکن کی آواز آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ سریلی آواز دور ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ یک بیک خاموش ہو گئی۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوی۔ میں اپنے بستر سے اٹھا۔ اور باہر نکل کر دیکھا۔ تو ایک فقیر ہاتھ میں بنسری لئے ہوئے کچھ فاصلے پر نظر آیا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گیا اور اس سے التجا کی کہ وہ ایک بار وہی نغمہ الاپے لیکن اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میری صورت دیکھتا رہا۔ میں نے مکرر درخواست کی۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ وہ برابر مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

میں نے جو غور سے دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں۔ میں اس کو اپنے گھر لایا اس وقت کچھ کچھ صبح ہو گئی تھی۔ پرندانِ خوش الحان صناع ازل کی تعریف کے راگ الاپ رہے تھے۔ کوئل کی کوک پپیہے کی پیہو پیہو اور فاختہ کی ہو حق سے بادہ نوشان معرفت مست و بیخود ہو رہے تھے۔ چمن میں ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ میں وہیں اس فقیر کو ہمراہ لئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا اور مجھے بھی اس کو چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی سخت ترین رنج و غم محسوس کر رہا ہے۔ میں اس حالت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ایک بارگی اپنے سر کو جنبش دی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں اس کی اس حرکت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے پھر اپنا سر نیچا کر لیا اور اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ درختوں پہ ہر قسم کے پرندے نغمہ زن تھے۔ بلبل ہزار داستان اپنی نوا سنجی سے کائنات کے ذرے ذرے کو مست و بے خود بنا رہی تھی۔ لیکن فقیر نے کسی طرف توجہ نہیں کی۔ اور خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس مہرِ خاموشی کو یہ کہتے ہوئے توڑا۔

"شاہ صاحب کیا آپ بانسری بجائیے گا"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اپنی بانسری کی طرف میں نے پھر بانسری بجانے کی درخواست کی اس بار بانسری ہاتھ میں لے کر

"پپیہا کا ہے ُپا وت شور"

بجانا شروع کیا۔ کائنات کا ہر ذرہ عالم محویت میں اس حرمان نصیب کی خوش الحان آواز سن رہا تھا۔ درختوں پر پرندے خاموش ہو چکے تھے۔ نسیم سحر کے جھونکے کبھی کبھی درختوں سے گستاخی کر جاتے تھے۔ میں بیخودی کے عالم میں بیٹھا۔ شاہ صاحب کی راگنی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب خورشید عالمتاب کے آتشیں رخسار سے نقاب الٹنے کا وقت قریب آیا تو اس نے بانسری بجانی بند کر دی اور جانا چاہا۔ لیکن میں نے اس کا راستہ روکا۔ اس نے ایک بارگی غم آگین لہجے میں کہا "دوست مجھے جانے دو" اس کی آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے جواب دیا۔

"نہیں کچھ تو کہئے۔ کیا آپ کو یہاں آنا گوارا نہیں تھا"

"نہیں دوست" (اس نے کہا) اور پھر خاموش ہو گیا۔

"میں نے بہت اصرار کیا اور پوچھا کہ آپ کیوں غمگین ہیں۔

"کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے   نہ سنو اے خدا شیون کسی کا"

پھر اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "دوست ہمارے غم کی داستان سن کر آپ کیا کریں گے۔ یہ بہت دردناک ہے۔ آپ اس کو رہنے دیجئے۔ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

وہ یہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے وہ کوئی ایسا زیادہ معمر نہ تھا۔ بلکہ ابھی جوان تھا۔ اس کی عمر تقریباً تیس پینتیس کی ہوگی۔ اس کی گفتگو سن کر میں بھی پسیج گیا۔ میں نے کرر بصد اصرار سے پوچھا کہ شاہ صاحب آپ نے کس لئے ایسا حال بنا رکھا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ کچھ تو آگاہ فرمائیے۔ اس نے آنسو اپنے دامن سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی کسی زمانہ میں متمول تھا میرے والد شہر کے نامور لوگوں میں سے تھے۔ لیکن آپ یہ خیال نہ کیجئے کہ میں اپنی بدچلنی کی وجہ سے اس حال کو پہنچا ہوں" اس نے ذرا سا دم لیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

"مجھ سے ایک بھول ہو گئی۔ غلطی ہوئی جس کی سزا مجھے اس طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرنا ملی ہے۔ دوست یہ دنیا فانی ہے۔ سراب ہے، حباب ہے، اس دنیا میں انسان سکھی نہیں رہ سکتا یہ دنیا جس کو ہم دنیا سمجھے ہوئے ہیں۔ دنیا نہیں ہے بلکہ مصائب و تکالیف کی آماج گاہ ہے۔ یہ ایک بحر ذخار ہے جس میں ہمیشہ تموجی کیفیت رہتی ہے۔ اس سے پار اترنا ہر انسان کا کام نہیں۔ ہر مشکل کو آسان اور کڑی کو سہل سمجھ کر برداشت کئے جانا صرف مستقل مزاجوں کا کام ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہنا شروع کیا۔ "دوست! مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ ہاں محبت! صرف محبت ہی نہیں۔ پاک محبت!! ہم آپس میں ایک جان دو قالب تھے۔ دوست! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے والد کا تمول میری محبت میں حائل ہو کر میری محبوبہ سے مجھے دور کر دے گا۔ تو میں کسی غریب کے گھر جنم لیتا۔ یا میں ایسی غلطی کرنے سے باز رہتا۔ لیکن دوست! محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں یہ معلوم نہیں کر سکا۔ کہ مجھے اس لڑکی سے کیوں اتنی محبت ہو گئی۔ جس وقت ہماری جان پہچان ہوئی اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔ ہم آپس میں ہمیشہ مل جل کر کھیلا کودا کرتے تھے۔

بچپن ہی سے کیوپڈ کا ایک چھوٹا سا پیکان ہمارے دل میں پیوست تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری عمر کے ساتھ ساتھ ہماری محبت میں استواری پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہم اس محبت کی مضبوط زنجیروں سے جکڑ دئے گئے جس سے مرتے دم تک چھٹکارا نظر نہیں آتا۔ شاید مرنے کے بعد آرام ہو"

وہ برابر رو رہا تھا۔ اس پر رقت طاری تھی۔ اس نے پہلے یہ شعر پڑھا اور پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہمارے اقربا چاہتے تھے کہ میں متمول گھرانے میں شادی کروں لیکن وہ میرے رازہائے سربستہ سے بالکل واقف نہیں تھے۔ اِدھر میں اپنی زندگی کو خوش گوار خوابوں سے سنوار رہا تھا۔ اور اُدھر وہ میرے حسرتوں پر پانی پھیرنا اور میرے ارمانوں کا خون کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس کے متعلق مجھ سے تذکرہ آیا۔ میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس پر سب کے سب بگڑ گئے۔ میں خاموش ہو رہا۔ ایک مرتبہ میں نے والدہ کو تنہا پاکر اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں حمیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کو میری والدہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں کہ یہ بالکل نامناسب ہے اور ہم کبھی ایسا ہونے نہ دیں گے۔ کیونکہ وہ ایک غریب زمیندار کی لڑکی ہے اور تمھارے والد شہر کے عزت داروں میں ہیں وہ کبھی اس رشتے کو گوارا نہیں کریں گے۔ میں نے سن کر کہا کہ یہ تو میری زندگی کا سوال ہے اس میں والد صاحب کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن اس پر بھی نفی میں جواب پاکر میں خاموش ہو رہا۔ پھر ایک بار اس نے آنسو پونچھا اور کہنا شروع کیا۔ دوست! یہ خبر رفتہ رفتہ حمیدہ تک پہنچ گئی ایک دن وہ مجھے مل کر کہنے لگی۔ راشد میں تم سے ایک بات کہوں گی۔ بشرطیکہ تم یہ وعدہ کرو کہ اس پر ثابت قدم رہو گے۔ میں نے اس کو یقین دلایا۔ وہ کہنے لگی۔ راشد میں نے معلوم کیا ہے کہ تمھارے والد ہمارے ہونے والے رشتہ کے خلاف ہیں اور آج کل تم پر بہت کچھ سختیاں ہو رہی ہیں۔ دیکھو راشد۔ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتی ہوں کہ تم اپنی شادی اپنے والدین کے حسب منشاء کرلو۔ تم اپنی زندگی کو تلخ نہ بناؤ۔ میرا خیال ترک کردو اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پچھتانا ہوگا۔" اس کے ہچکی بندھ گئی تھی وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو رہی میں نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا" تھوڑا پانی پی لیجیے گا۔" اس نے پانی پی کر پھر کہنا شروع کیا۔

" میں نے اس کو اس بات کا یقین دلایا کہ تم مطمئن رہو میں اپنی زندگی کبھی تلخ نہیں بناؤں گا۔ لیکن دوست! افسوس کہ اس نے اس کا مفہوم بالکل برعکس سمجھا۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے ایک خط ملا۔ جو حمیدہ کا لکھا ہوا تھا۔

راشد:- خوب کی سیر پھرے پھول چنے شاد رہے ۔۔۔ باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

" مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں تم سے نہیں مل سکی۔ اور نہ آئندہ تم سے ملنے کی کوئی توقع ہے کیونکہ میں اس دنیا کو خیرباد کہہ رہی ہوں۔ اور میں اُس دنیا کے سفر کے لئے کمر باندھ رہی ہوں وجہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آسکتا۔ راشد اگر مجھ سے تم کو کوئی رنج ہوا ہو تو معاف کرو۔" تمھاری حمیدہ

دوست! یہ خط پڑھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے دنیا اندھیری نظر آنے لگی۔ میرے عقل و ہوش گم ہوگئے۔ سجھائی نہ دیتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میری آئندہ دنیا کا صرف ایک چراغ تھا جو سحر ہونے سے پہلے گل ہوگیا۔ میری خوشی کی دنیا غم سے بدل گئی۔ وہ دل جس میں کسی کا تصور رہا کرتا تھا اب ماتم کدہ بن گیا ہے۔ اس میں ناسور پڑھ گئے ہیں۔"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا" پھر وہ کہاں چلی گئی"؟

کہاں چلی گئی دوست!!" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا" وہ اس دنیا سے گذر گئی۔ اس نے خودکشی کرلی اور مجھے اس دنیا میں رنج و محن کا شکار بنادیا۔"

اس واقعہ کے بعد میں نے اپنے گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ اور اپنے مکان اور ملک کو ایک حسرت بھری نظر سے دیکھ کر چل کھڑا ہوا۔

جس کو آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے دوست!! یہ کہتے ہوئے اس پر غشی طاری ہوگئی میں نے اس کو سنبھالتے ہوئے اسی پلنگ پر لٹا دیا جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ عرصے بعد اس کو ہوش آیا۔ تو میں نے یہ التجا کی کہ آج وہ میرا مہمان ہے۔ بہت مجبور کرنے پر وہ رضامند ہوا۔

ہم دونوں دن بھر ساتھ رہے میں نے ممکنہ کوشش کی کہ وہ اپنے اس در بدر پھرنے کے ارادے سے باز رہے لیکن بقول داغ مرحوم :-　　جو رہِ عشق میں قدم رکھے، وہ نشیب و فراز کیا جانے

ہم دونوں شام کے کھانے کے بعد ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر رخصت ہوئے۔ میں نے باہر والے حصے میں ایک حجرہ میں اس کے لئے شب بسر کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں جب شاہ صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو حجرہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ شاہ صاحب چلے گئے تھے۔ بستر کے قریب جب گیا تو مجھے شاہ صاحب کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا۔

میرے مشفق دوست۔

آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔

مجھے مجبوراً آپ سے بغیر ملے کے رخصت ہونا پڑا ہے۔ اس وجہ سے کہ مجھے خوف ہے کہ آپ کہیں مجھے آج بھی نہ روک لیں۔ دوست آپ نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے اس آوارہ گردی کے خیال سے باز رہوں لیکن دوست۔ جس کی دنیا اجڑ گئی ہو جس کی حسرت و ارمان پیوند خاک ہوگئی ہوں۔ جو دنیا میں کوئی سہارا نہیں رکھتا ہو جس کی خوشی کی دنیا غم سے بدل گئی ہو اس کو ایسی ہی زندگی بسر کرنا چاہیئے۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

خیر اندیش

راشد

طالب علم کے اخلاق

میر ظہور اللہ خاں
مدرسہ عالیہ

علم سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ علم کے حاصل کرنے کے بعد آدمی اچھے اخلاق سیکھتا ہے اور شائستہ بن جاتا ہے۔ متانت، سنجیدگی، راست بازی، خاکساری، شیریں کلامی، جیسی بہترین اور نیک خصلتیں علم کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ طالب علم کا دائرۂ اخلاق بہت وسیع ہے۔ معلم کا ادب و احترام کرنا طالب علم کا اخلاقی فریضہ ہے۔ اور انسانیت کا بھی یہی تقاضہ ہے۔ حکما نے کہا ہے کہ "استاد روحانی باپ ہے جو اپنے علم سے طالب علموں کی تربیت کرتا ہے۔ اس لئے طالب علم کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی باپ کی طرح روحانی باپ یعنی استاد کی عزت و حرمت کرے"

استاد کی خدمت اور اطاعت کے بغیر طالب علم استاد کی علمی معلومات سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ سچائی طالب علم کے لئے ایک اچھی صفت ہے جو تمام برائیوں سے بچاتی ہے۔ طالب علم کی اچھی عادتوں میں سے ایک عادت صفائی بھی ہے۔ اس کے علاوہ طالب علم اپنی کتابوں کو حسنِ سلیقہ سے صاف پاک رکھتا ہے اور اصولِ حفظانِ صحت کے ذریعہ اپنی تندرستی کو برقرار رکھتا ہے۔

غرض کہ علم کی وجہ سے بیسیوں اخلاق طالب علم کے رگ و ریشہ میں داخل ہوجاتے ہیں اور وہ با اخلاق فرد بشر کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اور سچا طالب علم بتدریج منازلِ ترقی کو طے کرتا ہوا زینۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے

غلام مجتبیٰ قمر (بیدر)

شیر اور چوہا

کسی جنگل میں شیر سوتا تھا ایک چوہا اُدھر کو آ نکلا
شیر پر کودنے لگا چوہا فتنہ جو سو رہا تھا جاگ اُٹھا
شیر کہنے لگا پکڑ کے اُسے مار ڈالوں گا دیکھ اب میں تجھے
یوں لگا کہنے شیر سے چوہا بخش دیجے مجھے شہ والا
آج اگر بخش دو۔ کبھی نہ کبھی کام آؤں گا آپ کے میں بھی
شیر چوہے پہ خوب ہنسا اور چوہے کو اُس نے چھوڑ دیا
کہتے ہیں ایک دن شکاری نے شیر کو پھانسا دام میں۔ اپنے
شیر گھبرا کے گڑگڑانے لگا سر پہ سارا جہاں اُٹھانے لگا
جب کہ چوہے نے اُس کا شور سنا بل سے اپنی وہ جھٹ نکل آیا
شیر کو دام میں جو یوں دیکھا جلدی جلدی اُسے کترنے لگا
جال کو آن میں کتر پھینکا اپنے محسن کو بس چھڑا ہی لیا
شکریہ شیر جب بجا لایا سن کے چوہے نے پھر یہ اُس سے کہا
اے شہنشاہ یہ خیال نہ کر کہ نہیں سر بلند دست نگر
آپ ہم ہیں یہاں سبھی محتاج آپ کل کام آئے اور میں آج
اس جہاں میں نہیں خدا کے سوا کام جس کو نہ ہو کسی سے پڑا
دل لگی کی نہیں کہانی یہ بلکہ عبرت کی ہے نشانی یہ

سید شاہ یعقوب حسین قادری
(مفید الانام ہائی اسکول)

کسان

صبح کاذب ہے۔ آنے والے دن کا پیام ہے۔ بادِ صبا اپنی ٹھنڈی موجوں سے کھیتوں کو لہلہاتی ہے۔ شبنم خوشنما موتیوں کی مالا سبزہ زاروں کے گلے میں پہنا رہی ہے۔ گلزاروں میں نسیم صبح کلیوں کو پیام زندگی دے رہی ہے۔ کلیوں کی آنکھیں کھلیں اور مسکراتے ہوئے چہروں سے باغ کا حسن دوبالا ہوگیا۔ پرندے سبزہ زاروں، گلزاروں میں پیام زندگی کا نغمہ الاپ رہے ہیں۔ کسان اپنی نئی زندگی اور نئے دن کی تمنائیں لئے ہل کاندھے پر رکھے، بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیت کی طرف چلا۔ مشرق کی جانب آسمان پر افق کی شعاعوں میں شباب کی رنگینیاں حسن کی فتنہ پردازیاں کسان کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں کہ اس بھولے بھالے کو کس طرح دامِ محبت میں پھانس جائے مگر وہ ان تمام چیزوں سے بے خبر اپنے کھیت پر پہونچ ہی گیا۔ اور خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ وہ اپنی محنت و مشقت کا واحد سرمایہ "اناج" خوشی خوشی خاک میں بکھیرتا ہے اور بارانِ رحمت کی طرف نظر لگائے رہتا ہے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتی ہیں تو اس کی عید ہوتی ہے خوشی و مسرت کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی کا حال یہ کہ اس کو اپنی قسمت اور خدا کی رحمت پر کامل یقین ہے اور اس کو اس کا یقین کامل ہے کہ وہ اپنی محنت کے پھل سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ مگر خوش ہے کہ دنیا اور اس کی آنے والی نسلیں فیض پاتی ہیں۔ یوں ہی دنیا چل رہی ہے۔ اور قانون ہے کہ ایک محنت کرے اور دوسرا پھل پائے۔

محمد عبد الحکیم قریشی

احسان فراموشی

(ترجمہ)

اے موسمِ سرما کی تند ہوا تو چل اور نہ تھم۔ تو اس قدر تکلیف دہ نہیں ہے جیسی کہ انسان کی احسان فراموشی۔ تیرے دانت اس قدر تیز نہیں کیونکہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ اگرچہ تیری تکلیف کا اثر ہم ضرور محسوس کرتے ہیں مگر یہ اثر دل سے بہت جلد غائب ہو جاتا ہے لیکن انسان کی احسان فراموشی کا زخم ہمیشہ دل میں رہتا ہے اور تکلیف دیتا ہے۔

دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے اور یہاں کے خود غرض دوستوں سے محبت کرنا حماقت ہے۔ پس آؤ خوشیاں منائیں اور گائیں ـــــ یہ زندگی سب سے بہتر ہے۔

اے سخت اور نامہربان آسمان تو سرد ہوتا چلا جا مگر تو تکلیف دہ نہیں ہے۔

اے سرد ہوا تو اگرچہ ہم کو سردی میں منجمد کر دیتی ہے مگر تیرا یہ طیش اس قدر زہریلا نہیں ہے جتنا کہ ایک دوست کا احسان فراموش کر دینا۔

دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے اور یہاں کے خود غرض دوستوں سے محبت کرنا حماقت ہے۔ پس آؤ خوشیاں منائیں اور گائیں ـــــ یہ زندگی سب سے بہتر ہے۔ (شکسپیر)

سردار النساء بیگم صدیقی

دوستوں کی دلچسپ گفتگو

حامد۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں۔ آج کل کیسے گذرتی ہے۔
محمود۔ خدا کا شکر ہے خاصی گزر رہی ہے۔
حامد۔ خیر یہ تو اچھی بات ہے۔
محمود۔ نہیں جی اچھی کہاں؟ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔
حامد۔ افسوس یہ تو برا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ زیادہ برا تو نہیں ہوا۔ کیونکہ ترکہ میں انھوں نے میرے لئے بہت سی جائداد چھوڑی ہے۔
حامد۔ یہ تو اچھا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ بہت اچھا بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ جتنے مویشی والد صاحب نے چھوڑے تھے سب مر گئے۔
حامد۔ بہت برا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ برا تو نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے ان مویشیوں کا بیمہ کرا رکھا تھا۔
حامد۔ خیر یہ تو بہت اچھا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ اچھا نہیں ہوا۔ کیونکہ بیمہ کمپنی کی عمارت میں آگ لگ گئی اور ڈائرکٹر اس میں جل کر مر گیا۔
حامد۔ اوہو یہ تو بہت برا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ برا نہیں ہوا کیونکہ میں نے ڈائرکٹر کی بیوی سے شادی کر لی۔
حامد۔ خیر یہ تو اچھا ہوا۔
محمود۔ کیا خاک اچھا ہوا یہ عورت بڑی بدزبان اور سخت مزاج نکلی۔
حامد۔ افسوس یہ تو برا ہوا۔
محمود۔ نہیں جی ایسا کچھ زیادہ برا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے پاس کافی دولت تھی۔
حامد۔ خیر یہ تو بہت اچھا ہوا۔
محمود۔ نہیں کچھ بھی اچھا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس نے ایک دن غصہ میں گھر کو آگ لگا دی۔
حامد۔ افسوس یہ تو بہت ہی بہت برا ہوا۔
محمود۔ سب برا ہوا لیکن یہی تو اچھا ہوا کہ وہ کم بخت عورت بھی اسی میں جل مری اور اب اس کی ساری دولت میرے قبضہ میں ہے۔
اور اب میں عیش کرتا اور مزے اڑاتا ہوں۔

سرور ظفر

کام کی باتیں

۱۔ جو شخص مجھے کسی برے کام سے ڈراتا ہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو مجھے کسی امر کا مژدہ سناتا ہے۔ (حضرت علیؓ)
۲۔ دنیا میں بڑی بڑی مصیبتیں ہیں لیکن سب سے بڑی مصیبت قومی بے حرمتی ہے۔ (امرسن)
۳۔ زبانی دعویٰ کرنا سہل ہے۔ مگر کام کر کے دکھا دینا ہی آدمی کی قابلیت کی آزمائش ہے۔ (رامائن)

سیدہ عظیم النساء بیگم

پرستان

خدا مجھ کو دیدے جو پر چھوٹے چھوٹے
چلا جاؤں بس میں پرستان اڑ کے

وہاں جا کے پریوں کے بچوں سے کھیلوں
پرستان کی ساری چیزوں کو دیکھوں

کنارے پہ نہروں کے کھیلوں کبھی میں
تو سبزے پہ جنگل کے لوٹوں کبھی میں

مزے سے پھروں کھاتا باغوں کے میوے
اور اڑتا پھروں تتلیوں کے میں پیچھے

کبھی ساتھ پریوں کے بچوں کے ناچوں
کبھی بیٹھ کر ناچ پریوں کا دیکھوں

ابھی جو میں امرود کے پیڑ پر تھا
ابھی اڑ کے بیری کی شاخوں پہ پہونچا

جو دم میں پہاڑوں کی چوٹی پہ پہنچوں
تو اک آن کی آن میں نیچے اتروں

کبھی آسماں کی پھروں سیر کرتا
کبھی چاند تاروں کا دیکھوں تماشا

جو آئے مجھے یاد امّی کی اپنی
پرستاں سے لوں راہ پھر اپنے گھر کی

میں گھر رات کے وقت چپکے سے آؤں
اسی نیم کے پیڑ پر بیٹھ جاؤں

لئے گود میں ننھی بی بی کو امّی
مری یاد میں ہوں گی چپ چاپ بیٹھی

جو پوچھے گی ننھی کہ بھیا کہاں ہے
کہیں گی کہ آنکھوں سے میری نہاں ہے

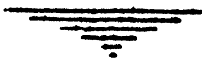
نہ جانے مرا لال کس جا گیا ہے
وہ کیوں اپنی امّی سے اتنا خفا ہے

تو بس پیڑ سے اتروں میں چپکے چپکے
گلے سے لپٹ جاؤں امّی کے جا کے

کہوں بخش دیجے قصور اب ہمارا
لو امّی یہ حاضر ہے بچہ تمہارا

لطیف النساء بیگم

سب رس ۱۹۳۸ء کی تصویروں اور مضامین کی فہرست



افسانے، قصے، اور کہانیاں

ڈرامے

مزاحیہ مضامین

تاریخی مضامین

علمی و ادبی مضامین

مفید اور عام دلچسپی کے مضامین

نظمیں

سلام اور مرثیے

غزلیں

تنقیدیں

۵۳۵ ایشیا بابتہ اکتوبر، نومبر، دسمبر	پ - چ	فروری		۵۶۰ مسلمان اور تجارت	میکش	مئی	۷۹
۵۳۶ شمس معنوی	اکبر صدیقی	مارچ	۱۳۶	۵۶۱ کہکشاں	〃	〃	۷۹
۵۳۷ المعلم جوبلی نمبر	〃	〃	۱۳۷	۵۶۲ روزنامہ مشیر ہند	〃	〃	۷۹
۵۳۸ فن انشا پردازی	رشید قریشی	〃	۱۳۸	۵۶۳ اُردو ہفتہ وار بمبئی	〃	〃	۷۹
۵۳۹ سخنوران بلند فکر	نصیر الدین ہاشمی	〃	۱۳۹	۵۶۴ تاریخ عدالت آصفی	اکبر صدیقی	〃	۸۰
۵۴۰ حسن کے دونوں رخ	میکش	〃	۱۴۲	۵۶۵ مقالہ	شاہد	〃	۸۰
۵۴۱ مجلہ طیلسانین عثمانیہ				۵۶۶ کلامِ نسواں	〃	جولائی	۳۹
۵۴۲ ہمایوں کا مشاعرہ نمبر	میکش	اپریل	۶۶	۵۶۷ اسلامی طب	میکش	〃	۳۹
۵۴۳ شاعر	〃	〃	۶۶	۵۶۸ طب قدیم اور طب جدید	〃	〃	۴۰
۵۴۴ ماہنامہ شہاب	〃	〃	۶۶	۵۶۹ علامہ اقبال	〃	ستمبر	۶۴
۵۴۵ طوفان	〃	〃	۶۶	۵۷۰ نارجیلستان	〃	〃	۶۴
۵۴۶ اسلام اور حق خلع	شیخ چاند مرحوم	〃	۶۷	۵۷۱ عارف	〃	〃	۶۵
۵۴۷ حکیم دکن	میکش	〃	۶۷	۵۷۲ زیب النساء	〃	〃	۶۵
۵۴۸ ختم نبوت اور قادیانیت	〃	〃	۶۸	۵۷۳ کاک ٹیل	〃	اکتوبر	۷۳
۵۴۹ تین افسانے	〃	〃	۶۸	۵۷۴ صور اسرافیل	〃	〃	۷۳
۵۵۰ پرانی اور نئی تعلیم	قادری	〃	۶۸	۵۷۵ بلاغ	〃	〃	۷۳
۵۵۱ کلام ایجاز	〃	〃	۶۹	۵۷۶ زیب النساء	〃	〃	۷۳
۵۵۲ فہرس	〃	〃	۶۹	۵۷۷ طلوع اسلام	〃	〃	۷۳
۵۵۳ دی حیدرآباد ڈومینینس	اکبر صدیقی	مئی	۷۷	۵۷۸ مجلہ نظامیہ	اکبر صدیقی	نومبر	۵۷
۵۵۴ آصفی کہانیاں	〃	〃	۷۷	۵۷۹ اربعہ عناصر	رشید قریشی	〃	۵۷
۵۵۵ المنظور کربلا نمبر	〃	〃	۷۷	۵۸۰ ظفر کا سفر	〃	〃	۵۷
۵۵۶ مرقع اصلاح حال	〃	〃	۷۸	۵۸۱ جوئبار	〃	〃	۵۷
۵۵۷ پہلا تراب کار	〃	〃	۷۸	۵۸۲ باغی	قادری	دسمبر	۶۵
۵۵۸ خیابانِ نسواں	〃	〃	۷۸	۵۸۳ تریاہٹ اور دو ڈرامے	〃	〃	۶۵
۵۵۹ انتظام کتب خانہ	〃	〃	۷۸	۵۸۴ عدل جہانگیری	〃	〃	۶۵

رشید قریشی

سب رس سب کی نظر میں

خدا کے فضل و کرم سے سب رس کا پہلا سال قریب الختم ہے گذشتہ دس مہینوں میں سب رس کے قدردانوں نے طرح طرح سے اس کی ہمت افزائی کی، وقتاً فوقتاً دفتر میں ایسے خطوط اور رائیں بھی وصول ہوتی گئیں جن کے چھاپنے کے لئے ہمیں ہر ماہ سب رس کے چند صفحے وقف کر دینے پڑتے اس لئے ہم نے اب تک گریز کیا۔ اب چونکہ سال ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ معاصر رسالوں اور اخباروں کی رایوں اور دوسرے ہمدردوں کی نظموں کا اس موقع پر انتخاب شائع کر دیا جائے، اسی لئے یہاں دس رائیں اور بارہ "۱۲" نظمیں شائع کی جا رہی ہیں۔ سب رس کی تعریف میں بہت سی نظمیں وصول ہوئیں جن میں سے اکثر ہمارے کمسن قدردانوں کا نتیجۂ فکر ہیں ان میں جو شائع ہونے کے قابل نظر آئیں وہ اس وقت چھاپ دی جا رہی ہیں بقیہ نہیں چھپینگی اور آئندہ کے بارے میں بھی اس امر کا اعلان کر دینا ضروری ہے کہ سب رس کے قدردان بچے اور بچیاں سب رس کی تعریف میں نظمیں اور رباعیاں لکھنے کی جگہ دلچسپ قصے، کہانیاں یا علمی و ادبی مضامین اور نظمیں لکھ کر روانہ کریں تو بہتر ہے (سب رس)

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو — مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امر ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہی کہ "سب رس" لے لو

امجد

اُردو۔ سہ ماہی اورنگ آباد۔ معتمد انجمن ترقی اُردو۔ حیدرآباد میں اُردو کی ترقی اور علم و ادب کی ارزانی کے باوجود اپنے رسائل کا ایک بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "سب رس" نکالا گیا ہے۔ یہہ ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد یہہ ہے کہ ایسے دلچسپ اور عام فہم مضامین شائع کئے جائیں کہ جنھیں عام و خاص سب پڑھ سکیں۔ ..

سب رس کی ایک اور خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس کا ایک حصہ بچوں کے لئے وقف ہے جس میں ان کی دلچسپی کے مضامین، طرح طرح کی معلومات، نظمیں، کہانیاں، پہیلیاں، لطیفے اور چٹکلے ہوتے ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ تصاویر بھی شائع کی جاتی ہیں

(اُردو اپریل سنہ ۱۹۳۸ء)

ادب لطیف ۔ ماہنامہ لاہور۔ اڈیٹر صاحب نے مضامین کی ترتیب میں حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ تقریباً تمام مضامین نظم و نثر خوب ہیں .... رسالہ کے آخر میں بچوں اور طلبہ کے لئے بھی مضامین درج ہیں۔ یہہ تنوع رسالہ کی افادی حیثیت پر خاص اثر ڈالتا ہے۔ رسالہ میں تصاویر بھی ہیں۔

(ادب لطیف فروری سنہ ۱۹۳۷ء)

سب رس سب رس سب رس سب رس سب رس

سب رس ہیں کوئی ایسا ہے میٹھا کب رس
خود نسخہ کے نام سے چکاں ہے جب رس
سب کا سب رس ہی رس ہے سب رس ہیں رحیم
سب خلق ہے تر زباں کہ "سب رس سب رس"

رحیم (منشی فاضل)

المعلم ۔ ماہنامہ حیدرآباد ۔ ہمارے ملک کے نوجوان ۔ اہل قلم نہایت تیزی کے ساتھ اپنے قدم میدانِ صحافت میں آگے بڑھاتے چلے جارہے ہیں اور دامے درمے، قدمے سخنے، ہرطرح اردو زبان کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں ..... سب رس کے ادارے نے بوڑھے، جوان اور بچوں کو الفاظ کے ذریعے اظہارِ خیال کا موقع دیا ہے ۔ عوام کے لئے یہ مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے اچھے ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا بہرحال بحیثیت مجموعی یہ رسالہ بہت امید افزا ہے یقین ہے کہ ہماری ریاست پر ایسا چھائے گا کہ بیرونی ملک کے عامیانہ مذاق کے رسالوں کے لئے دروازہ بند ہوجائے گا۔

المعلم (اسفندار ۱۳۴۶ف)

کیسا اچھا نام ہے تیرا — نام کے جیسا کام ہے تیرا
تیرے قصے تیرے مضموں — کیسے اچھے کیسے موزوں
سچی سچی نظمیں تیری — اچھی اچھی غزلیں تیری
پڑھتا ہے تجھ کو بچہ بوڑھا — تو ہے سب کے دل کا اجالا
جب تو آجاتا ہے گھر پر — خوشی کی موجیں دل کے اندر
پابندی سے آتا ہے تو! — سب کے دل کو بھاتا ہے تو
چندہ کم مضمون زیادہ — شوق سے پڑھنے سب آمادہ
تو ہے خوب موثر پرچہ — ہر گھر میں ہے تیرا چرچہ
سدا یوں ہی تو آتے رہنا
گیت ہمارے گاتے رہنا

سید اسد علی شرف (مدرسہ عالیہ)

شاہ کار ۔ ماہنامہ لاہور ۔ "سب رس" ہر لحاظ سے کامیاب پرچہ ہے اور اس کے مضامین کا تنوع قابلِ داد ہے ۔ ہر شخص کے مذاق کی کوئی نہ کوئی چیز مہیا کردی گئی ہے ۔ امید ہے کہ یہ رسالہ خوب ترقی کرے گا اور پبلک اس کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔

(شاہ کار ۔ ۱۹۳۸ء)

ساقی۔ ماہ نامہ دہلی "سب رس" عروسِ جمیل و لباسِ حریر کی تغیرین کر جلوہ گر ہوا ہے۔ مضامین میں ہر عمر اور ہر مذاق کے لوگوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ زبان بھی جہاں تک ہو سکا آسان رکھی گئی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین جمع کئے گئے ہیں حصہ نظم بھی نثر کے مقابلہ میں بے جوڑ نہیں ہے۔ یہہ غنیمت ہے کہ سیاسی اور مذہبی مضامین "سب رس" کی پالسی سے خارج ہیں۔

ساقی مارچ ۱۹۳۸ء

مریضِ جہل کے حق میں یہہ داروئے شفا ہوگا
جنھیں ہے علم کا ذوق ان کے حق میں منتہا ہوگا
بجیں گے رات دن ڈنکے جہاں میں سب رس کی عظمت کے
متین اپنا یہہ سب رس آگے مل کر جانے کیا ہوگا

محمد مسیح الدین خاں اقبال متین

پیام - روزنامہ حیدرآباد - "سب رس" ادارۂ ادبیات کی کوششوں کا ایک ثمر نورس ہے اور ہم کو اتنی بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہہ ماہ نامہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے حیدرآباد کی موجودہ ادبی فضا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ مضامین کا معیار بلا شبہ بلند ہے۔ حیدرآباد کے مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین ماہ نامہ کے صفحات پر اہلِ ذوق کو دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں۔ تاریخی، علمی اور خالص ادبی مضامین کے بعض دلچسپ نمونے ان صفحات پر نظر آتے ہیں ماہ نامہ کی ایک خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس میں چند صفحات بچوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ہم تہہ دل سے اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک کی ادبی صحبتوں میں اس کو بہت جلد ایک معیاری حیثیت حاصل ہو جائے گی

پیام - مورخہ ۲۵ ر فبروری ۱۹۳۸ء

سب رس (ادارۂ ادبیات اُردو کا ماہ نامہ۔ شمارہ اگست ۱۹۳۸ء) ہم کو یہہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ملک کا یہہ نیا ماہ نامہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور اس کی اشاعتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کامیابی کے ساتھ کی جا رہی ہیں۔ پیش نظر شمارہ کے مضامین کی نوعیت پر ان مستحسن کوششوں کا اچھا اثر پڑا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے ظریفانہ مضامین نے بھی ان صفحات کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ ہم اس ماہ نامہ کی ترقی کے متمنی ہیں اور یہہ امید رکھتے ہیں کہ اگر اس کی ترقی کی موجودہ رفتار قائم رہی تو وہ ایک دن حیدرآباد کا بہترین ادبی رسالہ بن سکتا ہے۔ اس کے علم دوست سرپرست ڈاکٹر زورؔ اور اس کے قابل مدیر جناب میکشؔ کے مذاق سلیم کو اس امر کی ضمانت ہونا چاہیئے۔

روزنامہ پیام - بابتہ ۱۶ ر مہر ۱۳۴۷ ف

شان ہند ۔ ہفتہ وار بمبئی ۔ رسالہ سب رس ہمارے سامنے اپنا اقبال نمبر لے کر حاضر ہے ۔ براعۃ استہلال کے طور پر چغتائی آرٹ کی رنگین تصویر متعلقہ رباعی علامہ مرحوم پیش کی گئی ہے جو نہ صرف نظر فریب بلکہ دیدہ زیب بھی ہے طباعت اور کتابت پر خاص توجہ دی گئی ہے مضامین کا معیار بہت بلند ہے شاعر مشرق کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر جی کھول کر بحث کی گئی ہے ۔ سرورق رنگ دار آرٹ پیپر پر ہے جو ترجمان حقیقت کی درویشانہ تصویر سے مزین ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف سب رس اقبال نمبر کی قیمت عہ ہے ۔

"شان ہند" ۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء

ہے زور کی کوشش کا نتیجہ سب رس
ہر علم معارف میں ہے یکتا سب رس
میکش سا مدیر جب ملا ہے اس کو
کیونکر نہ ہو پھر بلند و بالا سب رس

میر حسن علی خاں تمین

مشیر دکن ۔ روزنامہ حیدر آباد ۔ اس نمبر میں نظم و نثر مضامین کے ۳۴ عنوانات ہیں جو سب کے سب دلچسپ ب مطالعہ ہیں مضمون نگاروں میں سب کے سب اچھے اہل قلم ہیں ۔ مشہور مضمون نگار خواتین کے مضامین کا بھی ایک حصہ شامل ہے ۔ مضامین کے انتخاب میں بڑی وسعت نظر سے کام لیا گیا ہے اور ہر ذوق کے مضامین خاص ترتیب کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں جس سے پرچہ میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے اور پرچہ ہر طبقہ کے مطالعہ کے قابل بن گیا ہے ۔

ملک کے بچوں کے مفاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ۔ ان کے لئے بھی آخر میں ۱۶ صفحوں کا ایک ضمیمہ شامل ہے جو علحدہ بھی شائع ہوتا رہے گا ۔ کارکنان ادارہ کی یہہ کوشش بے حد پسندیدہ ہے کیونکہ یہی بچے ہیں جو آئندہ چل کر ملک و قوم کے رہنما بنیں گے ۔ ہماری رائے میں اس ضمیمہ کی ہر بچے والے گھر میں ضرور رسائی ہونی چاہئے اس پرچے میں ہمیں ایک دوسری قابل ذکر اور لایق تعریف بات یہہ نظر آئی کہ ملک کی تعلیم یافتہ خواتین کو بھی اس پرچے کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت کا موقع دیا گیا ہے اور بہت سے صفحات ان کے لئے وقف کئے گئے ہیں ۔

پرچے کی لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہیں ۔

مشیر دکن مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء

سب رس ہمارے سب رس اے سب سے اچھے سب رس
تورا مبر ہمارا ممنون ہم ہیں تیرے
ہوٹل میں ذکر تیرا دفتر میں تیرے چرچے
یعنی ہر ایک کا تو سب پر کرم ہیں تیرے
ملکِ دکن میں تو ہو اشہرت نہ ہو تو کیونکر ؟
صدہا ادیب و شاعر خادم ہم ہیں تیرے
باغ ادب میں تیرے ہردم بہار ہی ہو !
ان کی دعا یہی ہے جو دم بہ دم ہیں تیرے

منیر سلطانہ بہار (فوقانیہ مچھلی کمان)

شاعر۔ ماہ نامہ آگرہ۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے حال ہی میں ایک بہترین ماہ نامہ شائع ہونا شروع ہوا ہے یہ اس کا تیسرا نمبر ہے جسے محرم نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے اکثر اخبارات کے محرم نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے کے خیال میں رسالوں میں یہ پہلا "محرم نمبر" ہے جسے اسی قدر مکمل اور احسن طریقہ پر شائع کیا گیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

شاعر آگرہ اپریل ۱۹۳۸ء

ہاں باغِ ادب کا یہہ ثمر ہے نورس
جو رکھتے ہیں ذوق ان کو ہی مرغوب از بس
ہیں اور بھی دنیا میں رسیلے میوے
سب کے رس اس میں ہیں یہہ ہے سب رس

محمود عبدالماجد ماجد (طالب علم مدرسہ فوقانیہ محبوب نگر)

پھل ایک کرو فرض تم ایسا بچّو — جس میں کہ الگ الگ مزے کا رس ہو
بس ویسے ہی مضمون ہیں اس میں موجود — سب رس نہ کہو اس کو تو پھر کیا ہے کہو

ماجد

ہندستانی. تماہی الہ آباد۔
سب رس کے ذریعے ایسا ادب پیش کرنا، جس سے انسانوں کو پہچاننے اور سماج کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا ولولہ پیدا ہو بلاشبہ ایسا بلند مطمحِ نظر ہے، جس سے امید ہے کہ ایک طرف سماج کی ترقی میں مدد ملے گی اور دوسری طرف انسانیت کے ہمدم اور غمگسار ادیب پیدا ہوں گے۔ رسالہ اپنے قابل مدیر کی نگرانی میں اس مقصد میں خاص کامیاب ہے
ہندستانی۔ اپریل ۱۹۳۸ء

کس قدر خوب ہے دلکش ہے دل آرا سب رس — روح پرور ہے عجب تیرا نظارا سب رس
چشم بد دور ترقی پہ ترقی ہو تجھے — اور چمکے تری قسمت کا ستارا سب رس
تجھ کو ہم وطنوں کے خدمات کا حاصل ہے شرف — ان کی تحریروں کا ہی تجھ میں نظارا سب رس
تجھ میں سامان ہر اک طبع کی تفریح کے ہیں — تو بڑوں کو ہے پسند بچوں کو پیارا سب رس
ترے اوراق میں پوشیدہ ہے علمی دنیا — دولت علم کا مخزن ہے ہمارا سب رس
نظم رنگین جو ہے، نثر بصیرت افروز — اور معمے بھی ہے بجھواتا ہمارا سب رس
اک رسالہ کے لئے چاہیئے جتنے جوہر — پیش کرتا ہے وہ سب تیرا شمارا سب رس
آرزو ہے یہہ دعا ہے، یہہ تمنا اپنی! — نجم گھر گھر نظر آئے یہہ ہمارا سب رس

احمد الدین نجم حیدرآبادی (سرپاٹیہ)

۷۸۶

ہمت نہیں یہ حاصل ہو زمانہ کا چکر
ہم جانے جو کچھ ہے سو وہی سب رس سے ہو
کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہو ادھر عالم سارے
تمنا ہے ادب کا یہاں سب رس سے ہو

رحمت حیدرآبادی

اردو کو سدا ہند میں سب رس میں بنا دوں — تحدید زباں کی ہے جو بنیاد ہلا دوں

عالم میں جو خاموشی ہے اک دھوم مچا دوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

پھر ہند میں پیغام سخن سب کو سنا دوں — پھر علم کے دریا بھی دکن ہی سے بہا دوں

اک شور سے سوئی ہوئی دنیا کو جگا دوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

سید مرتضیٰ مجتہدی (نظام آباد)

ہے زور کا احسان دکن والوں پر	مشہور یہی ہر کس و ناکس میں ہے
میکش کی رگوں میں تھی جو بجلی رقصاں	وہ بن کے شراب علم "سب رس" میں ہے
گل ہائے مضامین و خیالات کا رس	شاہد ہو مری آنکھ کہ "سب رس" میں ہے
ہر سانس مری لے کے نکلتی ہے شمیم	اب سارا گلستاں مرے بس میں ہے

شمیم

سب رس نے اپنے پہلے سال ہی تین خاص نمبر شایع کئے محرم نمبر۔ اقبال نمبر۔ اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نمبر۔ یہہ تینوں خاص طور پر کامیاب ثابت ہوے۔ اگرچہ یہہ خریداروں کو مفت دیئے گئے لیکن جو سالانہ خریدار نہیں ہیں ان کو ۱۲؍ ، عمہ ۔ اور ۸؍ میں دئے گئے۔ اسی طرح ۱۹۳۹ء میں بھی سب رس کے کئی خاص نمبر شایع ہوں گے جن میں سے پہلا سالگرہ نمبر دو سو سے زیادہ صفحات اور پچاس سے زیادہ نایاب تاریخی تصاویر پر مشتمل ہوگا سالانہ خریداروں کو مفت ملے گا اور جو خریدار نہ ہوں ان کو عاں روپے میں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی لاگت پر ہزاروں روپے صرف کئے جا رہے ہیں۔

سب رس کا سالانہ چندہ للعہ روپے ہے

خواجہ حمید الدین شاہد

اخراجات ڈاک بہ ذمہ خریدار

دفتر ادارۂ ادبیات اردو۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن
